

تشریحات رمذی

تشریحات
ترمذی

تالیف

حضرت مولانا کمال الدین المسترشد
خادم الاطویش النبویہ
جامعہ اسلامیہ مخزن العلوم

جلد ششم

قلیسی کن خانہ
مقابل آرام باغ کراچی



تَشْرِیحاتِ تَرْمذی

تَالیف
حضرت مولانا کمال الدین المسترشد
استاذ المدیثہ جامعہ اسلامیہ کلکتہ کراچی

جلد ششم

قدیمی کتب خانہ
مقابلہ آلاءِ تاریخِ ہندوستان

کلکتہ (۱۹۷۸ء)

جملہ حقوق بحق قدیمی کتب خانہ محفوظ ہیں۔

تَشْرِیحِ حَاجَاتِ اَبْرَہَامِیَّ

حضرت مولانا کمال الدین المسترشد

مولانا شمس الحق 0300-2426745

نام کتاب:

تالیف:

کمپوزنگ:

ناشر

قدیمی کتب خانہ

مقابل آفریغ کراچی

021-32627608

021-32623782

فون

فہرست ابواب تشریحات ترمذی

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	فہرست ابواب تشریحات ترمذی	۳	۲۰	باب ماجاء فی کراہیۃ اکل الثوم واصل	۳۵
۲	ابواب الاطعمۃ		۲۱	باب ماجاء فی الرخصۃ فی اکل	
	عن رسول اللہ ﷺ	۱۲		الثوم مطبوخا	۳۸
۳	باب ماجاء علی ما کان یأکل النبی ﷺ	۱۳	۲۲	باب ماجاء فی تخمیر الالبانہ واطفاء	
۴	کری اور میز پر کھانا	۱۶		السراج والنار عند المنام	۳۹
۵	قائدہ نمبر ۱	۱۷	۲۳	باب ماجاء فی کراہیۃ القرآن بین اترین	۵۲
۶	قائدہ نمبر ۲	۱۷	۲۴	باب ماجاء فی استحباب اتمر	۵۳
۷	باب ماجاء فی اکل الارنب	۱۸	۲۵	باب ماجاء فی الحمد علی الطعام	
۸	باب ماجاء فی اکل الفص	۲۰		اذا فرغ منه	۵۵
۹	گوشت کھانے کا حکم	۲۰	۲۶	باب ماجاء فی الاکل مع الجودہ	۵۷
۱۰	باب ماجاء فی اکل الضج	۲۳	۲۷	جذام کیا ہے؟	۵۷
۱۱	باب ماجاء فی اکل لحوم الخیل	۲۷	۲۸	باب ماجاء ان المؤمن یاکل فی معی واحد	۶۰
۱۲	باب ماجاء فی لحوم الحمر الاحلیۃ	۳۰	۲۹	باب ماجاء فی طعام الواحد یحکی الاثنین	۶۲
۱۳	باب ماجاء فی الاکل فی آدمیہ والکفار	۳۲	۳۰	باب ماجاء فی اکل الجواد	۶۳
۱۴	باب ماجاء فی لفغۃ حسوت فی الحسن	۳۴	۳۱	باب ماجاء فی اکل لحوم الجملۃ والبانہا	۶۵
۱۵	باب ماجاء فی اشئ عن الاکل		۳۲	باب ماجاء فی اکل الدجاج	۶۸
	والشراب بالشمال	۳۶	۳۳	قاری مرغیوں کا حکم	۶۹
۱۶	آداب	۳۸	۳۴	باب ماجاء فی اکل الخبازی	۷۰
۱۷	باب ماجاء فی لعق الاصابع بعد الاکل	۳۹	۳۵	باب ماجاء فی اکل الشواء	۷۱
۱۸	باب ماجاء فی المتترۃ تمسک	۴۱	۳۶	باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل متکئا	۷۳
۱۹	باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل من		۳۷	باب ماجاء فی حب النبی ﷺ	
	وسط الطعام	۴۳		الخلو اءوالعسل	۷۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۳۸	باب ماجاء فی اکثر الریة	۷۸	۵۸	مسئله	۱۰۳
۳۹	باب ماجاء فی نفس الشری	۸۰	۵۹	ابواب الاشریة	۱۰۵
۴۰	افضل کون؟	۸۱	۶۰	باب ماجاء فی شارب الخمر	۱۰۵
۴۱	باب ماجاء انھما اللھم نھما	۸۲	۶۱	اشربا شرب کے ولالکل	۱۰۶
۴۲	باب ماجاء عن انبی علیہ السلام فی الریة		۶۲	حقیقہ کی دلیل	۱۰۷
	فی قطع اللھم بالسنین	۸۳	۶۳	جوابات	۱۰۷
۴۳	باب ماجاء ان ینھم احب ال		۶۴	دوسری بحث	۱۰۸
	رسول اللہ ﷺ؟	۸۴	۶۵	ادویات اور پر قوم میں شامل کیا	
۴۴	باب ماجاء فی الخن	۸۶		جاننے والا 'الکھول'	۱۱۰
۴۵	باب ماجاء فی اکل الطیخ بالمرطب	۸۷	۶۶	تیسری بات	۱۱۰
۴۶	باب ماجاء فی اکل القثاء بالمرطب	۸۹	۶۷	باب ماجاء ان کل مسکر حرام	۱۱۳
۴۷	باب ماجاء فی شرب ابوال الایں	۸۹	۶۸	باب ماجاء ما اسکر کثیرہ فتلیلہ حرام	۱۱۴
۴۸	باب الوضوء قبل الطعام وبعده	۸۹	۶۹	باب ماجاء فی نھیز الخمر	۱۱۵
۴۹	باب ماجاء فی ترک الوضوء قبل الطعام	۹۱	۷۰	باب ماجاء فی کراہیۃ النبیذ فی	
۵۰	باب ماجاء فی اکل الدباء	۹۳		نہذ بآء، الفخر و المستم	۹۷
۵۱	باب ماجاء فی اکل الزیت	۹۵	۷۱	باب ماجاء فی الریة النہذ	
۵۲	باب ماجاء فی اکل مع المملوک	۹۶		فی الظروف	۱۱۹
۵۳	باب ماجاء فی فضل الطعام	۹۷	۷۲	باب ماجاء فی الانتہاء فی الریاء	۱۲۰
۵۴	آداب سلام	۹۸	۷۳	باب ماجاء فی الخوب السی - نھذ	
۵۵	باب ماجاء فی فضل العشاء	۹۹		منہا الخمر	۱۲۲
۵۶	باب ماجاء فی التسمیۃ علی الطعام	۱۰۰	۷۴	باب ماجاء فی خلط البسر و الخمر	۱۲۳
۵۷	باب ماجاء فی کراہیۃ البیوت		۷۵	باب ماجاء فی کراہیۃ الشرب فی	
	وفی یدہ ریح الخمر	۱۰۳		آئینہ الذهب والفضۃ	۱۲۴

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۷۶	سونے چاندی کا استعمال	۱۲۵	۹۷	باب ماجاء فی بر الخیالہ	۱۵۶
۷۷	مطلق کعبہ مذموم نہیں	۱۲۷	۹۸	باب ماجاء فی دعاء الوالدین	۱۵۹
۷۸	باب ماجاء فی انہی عن الشرب قائمًا	۱۲۹	۹۹	باب ماجاء فی حق الوالدین	۱۶۱
۷۹	باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائمًا	۱۳۰	۱۰۰	باب ماجاء فی تقصیر الرحم	۱۶۲
۸۰	باب ماجاء فی التنفس فی الاماء	۱۳۳	۱۰۱	باب ماجاء فی صلۃ الرحم	۱۶۳
۸۱	باب ما ذکر فی الشرب یفسین	۱۳۳	۱۰۲	صلہ رحمی کرنے کا طریقہ	۱۶۵
۸۲	باب ماجاء فی کراہیۃ الخمر فی الشراب	۱۳۵	۱۰۳	باب ماجاء فی حب الولد	۱۶۶
۸۳	باب ماجاء فی کراہیۃ التنفس فی الاماء	۱۳۶	۱۰۴	باب ماجاء فی رحمۃ الولد	۱۶۸
۸۴	باب ماجاء فی انہی عن منشاء الاستحیۃ	۱۳۷	۱۰۵	باب ماجاء فی الذنوب علی البنات	۱۶۹
۸۵	باب ماجاء فی الرخصة فی ذاک	۱۳۸	۱۰۶	باب ماجاء فی رحمۃ الیتیم وکفالتہ	۱۷۳
۸۶	باب ماجاء ان الامہین احق بالشرب	۱۳۹	۱۰۷	باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان	۱۷۵
۸۷	باب ماجاء ان ساقی القوم آخراً شراباً	۱۴۲	۱۰۸	باب ماجاء فی رحمۃ الناس	۱۷۷
۸۸	باب ماجاء ای الشراب کان احب		۱۰۹	باب ماجاء فی الصبیۃ	۱۷۹
	الی رسول اللہ ﷺ	۱۴۳	۱۱۰	باب ماجاء فی حقیۃ المسلم علی المسلم	۱۸۱
۸۹	ابواب البر والصلۃ		۱۱۱	باب جاء فی السر علی المسلمین	۱۸۳
	عن رسول اللہ ﷺ	۱۴۴	۱۱۲	باب جاء فی الذب عن المسلم	۱۸۶
۹۰	باب ماجاء فی بر الوالدین	۱۴۴	۱۱۳	باب ماجاء فی کراہیۃ النحر للمسلم	۱۸۷
۹۱	ماں باپ کے مختلف حقوق	۱۴۶	۱۱۴	باب ماجاء فی موساۃ الاخ	۱۸۹
۹۲	باب منہ	۱۴۷	۱۱۵	باب ماجاء فی الغیۃ	۱۹۱
۹۳	باب ماجاء من افضل فی رضا الوالدین	۱۴۹	۱۱۶	باب ماجاء فی المحمد	۱۹۳
۹۴	مسئلہ	۱۵۱	۱۱۷	باب ماجاء فی التباغض	۱۹۶
۹۵	باب ماجاء فی حقوق الوالدین	۱۵۲	۱۱۸	باب ماجاء فی اصلاح ذات البین	۱۹۸
۹۶	باب ماجاء فی اکرام صدیق الوالد	۱۵۵	۱۱۹	باب ماجاء فی الحیاۃ والنفس	۲۰۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۱۲۰	باب ماجاء فی حق الجوار	۲۰۳	۱۳۰	مہمان کی ذمہ داری	۲۳۹
۱۲۱	بمسائگی کے چند اہم حقوق	۲۰۶	۱۳۱	باب ماجاء فی اسحق علی الارملة والتیم	۲۴۰
۱۲۲	باب ماجاء فی الا حصن الی الخادم	۲۰۷	۱۳۲	باب ماجاء فی طلاقہ الیہ ومن ابشر	۲۴۱
۱۲۳	باب انھن عن ضرب الخدم وشمھن	۲۱۰	۱۳۳	باب ماجاء فی المصدق والنکذب	۲۴۲
۱۲۴	باب ماجاء فی ادب الخادم	۲۱۱	۱۳۴	باب ماجاء فی الخش	۲۴۳
۱۲۵	باب ماجاء فی العقوبۃ الخادم	۲۱۲	۱۳۵	باب ماجاء فی اللغو	۲۴۶
۱۲۶	باب ماجاء فی ادب الولد	۲۱۳	۱۳۶	باب ماجاء فی اقامہ نسب	۲۴۹
۱۲۷	باب ماجاء فی قبول المصدق		۱۳۷	باب ماجاء فی دعوی الارش ناحیہ	
	والکفاۃ علیہا	۲۱۵		بظہر الغیب	۲۵۱
۱۲۸	باب ماجاء فی الشکر من احسن الرکب	۲۱۷	۱۳۸	باب ماجاء فی الشتم	۲۵۱
۱۲۹	باب ماجاء فی منافع المعروف	۲۱۸	۱۳۹	باب ماجاء فی قول المعروف	۲۵۳
۱۳۰	باب ماجاء فی المحی	۲۱۹	۱۴۰	باب ماجاء فی فضل المملوک السارح	۲۵۵
۱۳۱	باب ماجاء فی اہلۃ الاوی عن طریق	۲۲۰	۱۴۱	باب ماجاء فی معاشرۃ الناس	۲۵۷
۱۳۲	باب ماجاء ان الجالس بالاناء	۲۲۱	۱۴۲	باب ماجاء فی ظن الشوء	۲۵۸
۱۳۳	باب ماجاء فی السقاء	۲۲۲	۱۴۳	باب ماجاء فی المزاج	۲۶۰
۱۳۴	باب ماجاء فی البطل	۲۲۶	۱۴۴	باب ماجاء فی المراء	۲۶۱
۱۳۵	باب ماجاء فی التذقۃ علی الاہل	۲۳۲	۱۴۵	باب ماجاء فی المداۃ	۲۷۰
۱۳۶	باب ماجاء فی الضیافۃ وغایۃ الضیافۃ		۱۴۶	کفار سے تعلقات کی نوعیت	۲۷۲
	کم ہو؟	۲۳۳	۱۴۷	باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والنفق	۲۷۳
۱۳۷	محمد عربی پر ایمان عقیدہ کالازی		۱۴۸	باب ماجاء فی الکبر	۲۷۵
	جز ہے	۲۳۵	۱۴۹	کبر و تکبر اور اسباب	۲۷۶
۱۳۸	اکرام ضیف	۲۳۷	۱۵۰	حدیث باب کا مطلب	۲۷۷
۱۳۹	ضیافت کا حکم	۲۳۷	۱۵۱	باب ماجاء فی حسن الخلق	۲۸۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۶۲	باب ماجاء فی الاحسان والعفو	۲۸۲	۱۸۵	باب ماجاء فی تکلیف المؤمن	۳۲۳
۱۶۳	باب ماجاء فی زیارة الاخوان	۲۸۵	۱۸۶	باب ماجاء فی التجارب	۳۲۵
۱۶۴	باب ماجاء فی النبیاء	۲۸۶	۱۸۷	باب ماجاء فی التفتیح برہانہ علیہ	۳۲۷
۱۶۵	باب ماجاء فی الثانیۃ النحلیۃ	۲۸۷	۱۸۸	باب ماجاء فی الثناء بالمعروف	۳۲۹
۱۶۶	باب ماجاء فی ارفق	۲۹۱	۱۸۹	ابواب الطب	
۱۶۷	باب ماجاء فی دعوة المظلوم	۲۹۲		عن رسول اللہ ﷺ	۳۳۱
۱۶۸	باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ	۲۹۳	۱۹۰	طب کاشوت	۳۳۱
۱۶۹	باب ماجاء فی حسن العہد	۲۹۷	۱۹۱	باب ماجاء فی الحمیۃ	۳۳۲
۱۷۰	باب ماجاء فی معالی الاخلاق	۲۹۸	۱۹۲	مرض الحق ہونے سے قبل پرہیز	
۱۷۱	باب ماجاء فی الملعن والملعن	۳۰۱		اور دوا کا حکم	۳۳۳
۱۷۲	باب ماجاء فی کثرة الغضب	۳۰۱	۱۹۳	باب ماجاء فی البداء والاحتساب	۳۳۶
۱۷۳	باب ماجاء فی کظم الغیظ	۳۰۳	۱۹۴	باب ماجاء فی تطعم المريض	۳۳۸
۱۷۴	باب ماجاء فی اجال الکبیر	۳۰۵	۱۹۵	باب ماجاء فی انحر صراخکم	
۱۷۵	باب ماجاء فی المحبۃ جریں	۳۰۶		طی الطعام بالشراب	۳۴۰
۱۷۶	باب ماجاء فی الصبر	۳۰۸	۱۹۶	باب ماجاء فی بحۃ السوداء	۳۴۲
۱۷۷	باب ماجاء فی ذی الوجھین	۳۱۱	۱۹۷	باب ماجاء فی شرب الوال الابل	۳۴۳
۱۷۸	باب ماجاء فی انعام	۳۱۲	۱۹۸	باب ماجاء فی قتل نفسہ بسم او غیرہ	۳۴۴
۱۷۹	مخبری اور جاسوسی	۳۱۳	۱۹۹	تسمیہ	۳۴۶
۱۸۰	باب ماجاء فی البھی	۳۱۶	۲۰۰	خود کشی حرام ہے	۳۴۶
۱۸۱	باب ماجاء ان من الیمان بحرا	۳۱۸	۲۰۱	باب ماجاء فی کراهیۃ الدواہ بالمسک	۳۴۸
۱۸۲	باب ماجاء فی التواضع	۳۱۹	۲۰۲	باب ماجاء فی السوط وغیرہ	۳۵۰
۱۸۳	باب ماجاء فی الظلم	۳۲۱	۲۰۳	باب ماجاء فی کراهیۃ الکھن	۳۵۳
۱۸۴	باب ماجاء فی ترک العیب للعدو	۳۲۲	۲۰۴	باب ماجاء فی الرخصۃ فی ذاک	۳۵۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۳۹۴	باب ماہ فی الحسل	۳۵۷	۳۹۵	باب ماہ فی انجالت	۳۵۷
۳۹۶	باب	۳۶۰	۳۹۶	باب ماہ فی الداوی بالبخار	۳۶۰
۳۹۶	باب	۳۶۱	۳۹۷	باب ماہ فی کراہیۃ الرقیۃ	۳۶۱
۳۹۸	باب الداوی بالمرہ	۳۶۱	۳۹۸	باب ماہ فی الرخصۃ فی ذالک	۳۶۱
۳۹۹	جدید تحقیق	۳۶۱	۳۹۹	دونوں بابوں کی تشریح	۳۶۱
۴۰۰	باب	۳۶۳	۴۰۰	باب ماہ فی الرقیۃ بالمعوذتین	۳۶۳
	ابواب الفرائض	۳۶۳	۴۰۱	باب ماہ فی الرقیۃ من العین	۳۶۳
۴۰۱	عن رسول اللہ ﷺ	۳۶۶	۴۰۲	باب ماہ فی العین من العین	۳۶۶
۴۰۱	باب ماہ فی من ترک ما یقلوہ	۳۶۶	۴۰۳	باب ماہ فی اندا جرجی العوی	۳۶۶
۴۰۳	باب ماہ فی تعلیم الفرائض	۳۶۷	۴۰۴	باب ماہ فی الرقیۃ والادویۃ	۳۶۷
۴۰۴	باب ماہ فی میراث البنات	۳۶۷	۴۰۵	باب ماہ فی الخلفاء والعمو	۳۶۷
	باب ماہ فی میراث بنت النہی	۳۶۷	۴۰۶	قائدہ	۳۶۷
۴۰۶	مع بنت الثعلب	۳۶۸	۴۰۷	باب ماہ فی اجراء الحسن	۳۶۸
	باب ماہ فی میراث الاخوة	۳۶۸	۴۰۸	محبوبہ نمبر ۱	۳۶۸
۴۰۸	من الاب والام	۳۶۸	۴۰۹	حبیبہ نمبر ۲	۳۶۸
۴۱۰	باب میراث البنین مع البنات	۳۶۹	۴۱۰	باب ماہ فی کراہیۃ التعلیق	۳۶۹
۴۱۱	باب ماہ فی میراث الاخوات	۳۶۹	۴۱۱	باب ماہ فی تحریکات فی المراء	۳۶۹
۴۱۲	باب ماہ فی میراث العصبۃ	۳۶۹	۴۱۲	بخار کے لئے غسل، جدید تحقیق	۳۶۹
۴۱۳	باب ماہ فی میراث الجد	۳۶۹	۴۱۳	کی روشنی میں	۳۶۹
۴۱۶	باب ماہ فی میراث الجد	۳۶۹	۴۱۶	باب ماہ فی الغیلۃ	۳۶۹
۴۱۸	باب ماہ فی میراث الجد مع النہی	۳۶۹	۴۱۸	باب ماہ فی رداء ذات الحجب	۳۶۹
۴۱۹	باب ماہ فی میراث الخال	۳۶۹	۴۱۹	باب	۳۶۹
	باب ماہ فی الذی یموت ویس	۳۶۹	۴۲۰	باب ماہ فی السنۃ	۳۶۹
۴۲۰	لدارث	۳۶۹			

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار	صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۳۳۹	باب	۲۶۳	۳۳۲	باب فی میراث المولی الاصل	۲۳۷
	ابواب الولاء والہبۃ	۲۶۵		باب ماجاء فی ابطال الخیرات بین	۲۳۸
۳۵۰	عن رسول اللہ ﷺ		۳۳۲	المسلم والکافر	
۳۵۰	باب ماجاء ان الولاء لمن احق	۲۶۶		آج کے اہل بدعت کی درامت	۲۳۹
۳۵۲	باب اشی عن بیع الولاء وھبۃ	۲۶۷	۳۳۵	ومناعت کا حکم	
	باب ماجاء فی من تولى غیر موالیہ	۲۶۸	۳۳۷	حبیب	۲۵۰
۳۵۳	اداء الی غیر اہل		۳۳۸	باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل	۲۵۱
۳۵۷	باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده	۲۶۹		باب ماجاء فی میراث المرأة من	۲۵۲
۳۵۹	باب ماجاء فی القاتل	۲۷۰	۳۳۹	دیۃ زوجھا	
	باب ماجاء فی است النبی ﷺ	۲۷۱		باب ماجاء ان الخیرات للورث	۲۵۳
۳۶۲	علی الحدیث		۳۴۰	والعقل للوصیہ (علی العصبۃ)	
۳۶۳	باب ماجاء فی کرمیۃ الرجول فی الوصیۃ	۲۷۲	۳۴۲	باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل	۲۵۴
	ابواب القدر	۲۷۳	۳۴۳	باب من یرث الولاء	۲۵۵
۳۶۳	عن رسول اللہ ﷺ			ابواب الوصایا	۲۵۶
	باب ماجاء من التشدید فی الخوض	۲۷۴	۳۴۶	عن رسول اللہ ﷺ	
۳۶۶	فی القدر		۳۴۶	باب ماجاء فی الوصیۃ بالثلث	۲۵۷
۳۶۷	باب	۲۷۵		باب ماجاء فی الضرر فی الوصیۃ	۲۵۸
۳۷۱	باب ماجاء فی الشقاء والسعادۃ	۲۷۶	۳۴۷	باب ماجاء فی الخیر علی الوصیۃ	۲۵۹
۳۷۳	باب ماجاء ان الاعمال بالخواتیم	۲۷۷	۳۴۸	باب ماجاء ان النبی ﷺ لم یوص	۲۶۰
۳۷۸	باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرۃ	۲۷۸	۳۴۹	باب لا وصیۃ لوارث	۲۶۱
۳۸۲	باب ماجاء لا یرد القدر الا دعاء	۲۷۹	۳۴۹	باب ماجاء ید آیالہ بن قبل الوصیۃ	۲۶۲
۳۸۳	باب ماجاء ان القلوب بین اصحابی الرمن	۲۸۰		باب ماجاء فی الرجل ینصدق	۲۶۳
	باب ماجاء ان اللہ کتب کتابا	۲۸۱		او یحقق عند الموت	
۳۸۴	لاھل الجنۃ والنار		۳۴۷		

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۸۲	باب ماجاء لاندوی ولا حمارہ ولا سفر	۲۸۷	۲۹۹	باب النبی عن یحییٰ بن ابی السیف مسلول	۵۱۳
۲۸۳	باب ماجاء فی الایمان بالقدر		۳۰۰	باب من سئل ان یفعل فی ذمۃ اللہ	
	خیر وشرہ	۲۸۹		غزابل	۵۱۴
۲۸۴	باب ماجاء ان النفس تموت حیث		۳۰۱	باب ماجاء فی ذرہم الجحیم	۵۱۵
	ما کتب لها	۲۹۰	۳۰۲	جماعت سے مراد کون ہیں؟	۵۱۸
۲۸۵	باب ماجاء لا ترقی الرقی والنداء		۳۰۳	باب ماجاء فی نزول العذاب اذا	
	من قدر الله طینا	۲۹۱		تغییر المنکر	۵۲۲
۲۸۶	باب ماجاء فی القدرۃ	۲۹۲	۳۰۴	باب ماجاء فی الامر بالمعروف	
۲۸۷	بیان مذاہب	۲۹۳		واحشی عن المنکر	۵۲۴
۲۸۸	وایکل	۲۹۴	۳۰۵	باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید	
۲۸۹	باب	۲۹۷		او باللسان وبالقلم	۵۲۸
۲۹۰	باب ماجاء فی الرضا بالقتناء	۲۹۸	۳۰۶	دل سے برا سمجھنے کا مطلب	۵۳۰
۲۹۱	باب	۵۰۰	۳۰۷	باب منہ	۵۳۱
۲۹۲	مخطوط	۵۰۳	۳۰۸	باب افضل الجہنم کاتب عدل	
۲۹۳	متعدد روایات میں تطبیق	۵۰۴		مندیستہ ان جاکر	۵۳۳
۲۹۴	ابواب الفتن		۳۰۹	باب سوال النبی ﷺ عما فی امۃ	۵۳۳
	عن رسول اللہ ﷺ	۵۰۶	۳۱۰	باب ماجاء فی الرجل یموت فی الفتن	۵۳۷
۲۹۵	باب ماجاء لا یحکم رجم امری مسلم		۳۱۱	ربہائیت اور عزت نشینی میں فرق	۵۳۸
	الا باحدی ثلاث	۵۰۶	۳۱۲	باب ماجاء فی رفع الامانۃ	۵۴۱
۲۹۶	باب ماجاء فی تحريم الدماء والاموال	۵۰۹	۳۱۳	باب لیس کہیں کسٹن من کان قہلکم	۵۴۲
۲۹۷	باب ماجاء لا یحکم المسلم ان یردع مسلما	۵۱۱	۳۱۴	اشکال	۵۴۸
۲۹۸	باب ماجاء فی اشارة الرجل		۳۱۵	حل	۵۴۸
	علی اخیہ بالاستیاح	۵۱۲	۳۱۶	باب ماجاء فی کلام الشیخ	۵۴۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۳۱۷	باب ماجاء فی اشتقاق القمر	۵۵۰	۳۲۸	باب ماجاء فی اطل الشام	۵۷۷
۳۱۸	باب ماجاء فی الخسف	۵۵۲	۳۲۹	باب لا تردوا بعدی کفاراً نہ ضرب	
۳۱۹	باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها	۵۵۸		بعد حکم رقاب بعض	۵۷۹
۳۲۰	و اصولی اعتراضات اور ان کے		۳۳۰	باب ماجاء ان تكون هذه الساعة فيما	
	اصولی جوابات	۵۵۹		خير من التائم	۵۷۹
۳۲۱	زمین گول ہے	۵۵۹	۳۳۱	باب ماجاء شکون هذه كقطع	
۳۲۲	نیوٹن کا اصول	۵۶۰		اللیل المظلم	۵۸۱
۳۲۳	علم طبیعیات کے قوانین کا جائزہ	۵۶۱	۳۳۲	باب ماجاء فی المخرج	۵۸۵
۳۲۴	باب ماجاء فی خروج یا جوع وما جوع	۵۶۲	۳۳۳	باب ماجاء فی اتقاد السیف من الخشب	۵۸۸
۳۲۵	باب ماجاء فی صفة المارتة	۵۶۹		تمت فهرس المجلد السادس	
۳۲۶	باب ماجاء فی الاثرۃ	۵۷۱		وبلیہ المجلد السابع اوله	
۳۲۷	باب ما اخبرنا به عن اصحابنا			"باب ماجاء فی امراط الساعة"	
	کامن الی یوم القیامۃ	۵۷۳		(ان شاء اللہ)	



”المجلد الثانی“ من الجامع للحافظ الامام ابی عیسیٰ الترمذی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً

ابواب الاطعمه

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اطعمہ، طعام کی جمع ہے جس کے معنی کھانے اور خوراک کے ہیں یعنی بروہ چیز جو کھائی جائے اور جسم کی
بتہ اس پر مدار ہو تاہم اہل حجاز اور اہل عراق، م طور پر اس کا اطلاق گیسوں پر کرتے ہیں۔
اس، دودھ، ع، م، میں پچھنے، قوت حاصل کرنے اور لذت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں جس سے بعد
تسمیہ واضح ہو جاتی ہے۔

چونکہ طعام کے معنی میں کافی توسع ہے لہذا بھی اور اصطلاحاً بھی، اس لئے مشروبات پر بھی اس کا اطلاق
ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۳۹ میں ہے ”فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي“، ومن لم يطعمه فانه
منی الآیۃ۔

(حضرت طاووت نے فرمایا تو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ
بیشک میرا ہے)

چنانچہ خطیب المفسرین ابوسعود ”ومن لم يطعمه“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں ”ومن لم يطعمه“ ای
نم یدقہ، من طعام الشئ اذا ذاقہ ما کولاً کان او مشروباً او غیرهما، یعنی طعام الشئ اس وقت بولا جاتا ہے
جب کسی چیز کو چکھا جائے خواہ وہ چیز کھانے کی ہو یا پینے کی، پھر اس کی تائید میں ایک شعر بھی ذکر کیا ہے، گو کہ
یہاں پچھنے سے مراد گھنا ہے کیونکہ زبان پر رکھنے کو چکھنا کہتے ہیں مگر اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (تذکر)

علیٰ ہذا قرآن کی اس آیت پر پادری کا اعتراض غلط ہے کہ بجائے ”لم يطعمه“ کے ”لم یشربہ“ کہنا
چاہئے تھا، اور وجہ غلطی ظاہر ہے کہ اس نے طعام کو صرف کھانے کی اشیاء تک محدود سمجھ کر اعتراض کیا ہے۔

ویسے تو بہت سی اشیاء ہیں جنہیں کھایا جاتا ہے اور کھایا جاسکتا ہے، مگر شرعی اعتبار سے صرف وہ اشیاء

قابل تغذی اور قابل تناول ہیں جو انسانی مقصد میں معاون ثابت ہوتی ہیں یا کم از کم مضر نہیں، چونکہ ہر انسان کا نصب العین اللہ عز وجل کی خوشنودی کا حصول ہونا چاہئے اور یہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اعمال اور اخلاق حسنہ سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے اور یہی انسان کی خلقت کا بھی مقصد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت میں بھی یہ شامل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”وَيُحْيِلُ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ“۔ (سورۃ الاعراف: ۱۵۷) (اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں)

لہذا جو اشیاء قوت علمیہ اور قوت عملیہ کے بڑھانے کا ذریعہ ہیں وہ تو جائز ہیں اور جو ان دونوں قوتوں کو ضرر پہنچائے وہ ناجائز ہوگی، چنانچہ مسکرات و منشیات قوت علمیہ کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے اور درندے وغیرہ قوت عملیہ کو ضرر رساں ہونے کی بناء پر حرام و ممنوع قرار دے دیئے گئے۔

کسی چیز کی تحریم سے غرض تنگی پیدا کرنا ہرگز نہیں بلکہ انسان کو گندے اعمال و اخلاق سے بچانا ہے لہذا اگر کوئی چیز کلی طور پر خراب ہے تو شریعت نے اسے بالکلیہ حرام قرار دیا ہے جیسا کہ خنزیر اور باقی درندہ، اور جو چیز عمومی و مجموعی طور پر پاک ہے مگر اس میں فاسد اور گندہ مادہ ہے تو اس کا فقط وہی گندہ حصہ ممنوع قرار دیا ہے جیسے دم مسفوح لہذا حلال جانور کا وہ خون جو رگوں میں ہوتا ہے اور چلتا رہتا ہے اسے خارج کرنے کا حکم دیا کہ اس میں ایسی باطنی سمیت و جراثیم پائے جاتے ہیں کہ ان سے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں تاہم بعض اشیاء میں خوبیاں و خامیاں دونوں شریک ہوتی ہیں ایسی چیزوں کو تا پسندیدہ اور مکر وہ قرار دے دیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی برکات کا مشاہدہ آج کی دنیا میں کوئی مشکل نہیں۔ آج جتنی نئی نئی گندی بیماریاں جنم لیتی ہیں تو ان کا نقطہ آغاز وہ ممالک ہوتے ہیں جہاں اسلامی طریقہ سے کھانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا گوکہ مسلمانوں کی لاپرواہی یا اختلاف کی وجہ سے وہ امراض اسلامی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں مگر شروعات بہر حال غیر اسلامی ممالک سے ہوتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تو پوری زندگی مشعل راہ اور ہلاکتوں سے بچنے کا محفوظ ترین راستہ ہے جس پر چلنا دین و دنیا دونوں کی حفاظت کی ضمانت ہے، تاہم ابواب الاطعمہ اور ابواب الاشربہ اور ان کے مابعد کے ابواب حیات طیبہ اپنانے کے ذریعہ ابواب ہیں ان کی ایک ایک کیمت اور ایک ایک کیفیت تمام دنیا کے طبیبوں اور ڈاکٹروں کے تجربات و ہدایات سے زیادہ قابل توجہ اور قابل عمل ہے۔

باب ماجاء علی ما کان يأکل النبی ﷺ ؟

عن انس رضی اللہ عنہ قال: ما أكل النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی حیوان ولا سُکرَجِہ ولا حُبْزَہ مرفق الحدیث۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سسئی پر نہیں کھایا اور نہ چھوٹی طشتری میں کھایا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چپاتی پکائی گئی۔ میں (انس راوی) نے قادیان سے کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس چیز پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے؟ انہوں نے فرمایا چیز سے کہ دسترخوان پر۔

لغات: قولہ ”حیوان“ بکسر الخاء بروزن نلاج اور یہی لغت مشہور ہے تاہم خاء کا ضمہ پڑھنا بھی جائز ہے یعنی بروزن غراب، یہ معرب ہے اگرچہ قدیم لغت عربی میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے، یہ عمومًا وحاش کی بنی ہوئی بلکہ پیتل کی بنی ہوئی میز نما چوکی ہوتی تھی یا یوں کہا جاسکے کہ چھوٹا سا تخت ہوتا تھا جس پر کھانا رکھنے سے زیادہ جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، چونکہ اسکے اصل مادہ میں خیانت کے معنی پائے جاتے ہیں جس کے معنی نقصان اور کم کرنے کے ہیں اسلئے اسکو خوان سے مستثنیٰ کیا گیا کہ اس پر کھانے کی جو چیز رکھی جاتی ہے وہ کم اور ناقص ہو جاتی ہے بلکہ کبھی ختم بھی ہو جاتی ہے۔

قولہ ”سُکرَجِہ“ بضم السین والکاف والراء المشددة یعنی پے درپے تین ضمّوں اور راء کی تشدید اور جیم کے فتح کے ساتھ، چھوٹی رکابی اور تھالی کو کہتے ہیں جس میں اکثر پٹنی، راستہ اور کھتی چیزیں رکھی جاتی ہیں، جن سے کھانے کی خواہش بڑھ جاتی ہے، یہ بھی فارسی کا لفظ ہے۔

قولہ ”ولا حُبْزَہ“ صیغہ مجہول ہے۔ قولہ ”لہ“ ای للنبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

قولہ ”مرفق“ باب تفعیل ترتیب سے اسم مفعول کا صیغہ ہے رفقت کے معنی نرم اور نازک کے ہیں چونکہ چپاتی بھی نرم و نازک ہوتی ہے اسلئے اس کو مرفق سے تعبیر کیا۔ قولہ ”فعلی ما“ ای فعلی ای شیء۔ اس نئے پر تو کوئی اشکال نہیں لیکن بعض روایات میں ”فعلام“ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرف جر جب ”ما“ استفہامیہ پر داخل ہو جائے تو کثرت استعمال کی وجہ سے الف گر جاتا ہے گو کہ الف پڑھنا اور باقی رکھنا بھی جائز ہے۔

قولہ ”السُفَر“ بضم السین وفتح الفاء ”سفرة“ کی جمع ہے جو دراصل مسافر کیلئے گول دسترخوان میں لپیٹے ہوئے کھانے کو کہتے ہیں مگر پھر اس کا طلاق چڑے کے دسترخوان پر اور پھر مزید توسع سے مطلق دسترخوان

پر ہونے لگا خواہ وہ کپڑے وغیرہ کا کیوں نہ ہو۔

تشریح:- چونکہ اسلام ایک معتدل دین کا نام ہے اسلئے اس کا ہر فعل و عمل افراط و تفریط کے درمیان ہوتا ہے، کھانے کے اصول سے بھی اس کی نمایاں خصوصیت عیاں ہے کہ زمین پر کھانا رکھنے سے ایک طرف نسیان کا امکان رہتا ہے اور دوسری جانب جانوروں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے جبکہ کسی اونچی چیز پر رکھ کر کھائے سے متکبرین کی مشابہت لازم آتی ہے کیونکہ یہ لوگ راحت و سہولت اور زیادہ کھانے کی غرض سے زمین سے اونچا کرنے کی خاطر میز و منار تخت پر کھانا رکھ کر کھاتے تاکہ سینہ اور منہ کے قریب ہو۔ اس سے بچتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو دونوں برائیوں کے درمیان ہے چونکہ ہر فضیلت دور ذلتوں کے درمیان ہوتی ہے لہذا کہا جائے گا کہ دسترخوان بچھا کر اس پر کھانا میا نہ و عادلانہ طریقہ ہے۔ اس سے ایک طرف تواضع حاصل کی جاسکتی ہے اور دوسری جانب جانوروں اور متکبرین کی مشابہت سے بچا جاسکتا ہے۔ نیز کھانے اور فائدے کی چیز کی توہین بھی نہیں کرنی چاہئے لہذا کھانا زمین پر بلا دسترخوان رکھ کر نہیں کھانا چاہئے اسی طرح اگر لقمہ یا کوئی ٹکڑا گرے گا تو بجائے مٹی کے دسترخوان پر گرے گا جسے اٹھا کر کھانا عین ممکن ہوگا۔ البتہ اگر کوئی مانع خوراک ہو جیسے آئسکریم یا چائے وغیرہ تو چونکہ وہ برتن اور پیالہ وغیرہ میں ہوا کرتی ہے اسلئے دسترخوان بچھانے کی ضرورت نہیں الایہ کہ نیچے قالین وغیرہ ہوا اور اس پر گرنے کا امکان ہو، بخلاف روٹی وغیرہ کے کہ اسے نیچے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں اگر روٹی کسی پلیٹ وغیرہ میں رکھے اور سالن کسی دوسری پلیٹ میں یا تریہ ہو تو پھر بھی اگر احتیاط سے کھائے اور زمین پر گرنے سے بچے تو دسترخوان کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک چھوٹی پلیٹوں اور پیالوں میں کھانے کا تعلق ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان میں نہ کھانے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ عربوں میں عموماً مل کر کھانے کا معمول تھا اور عموماً اس کیلئے بڑے پیالوں اور تھالوں کا استعمال ہوتا تھا، علیٰ ہذا یہ طریقہ پھر سنن زوائد میں شامل ہوگا۔ مگر دوسری وجہ جو سیاق حدیث سے معلوم ہوتی ہے اور زیادہ قرین قیاس ہے وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تواضع پسند تھی اور متکبرین کے طور و طریقوں سے اجتناب فرماتے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ کھانے کا نہ صرف یہ کہ شوق نہ تھا بلکہ خود بھی کم تناول فرماتے اور قلیل پر اکتفاء کرنے کی تلقین بھی فرماتے تھے، جیسا کہ ان شاء اللہ ابواب الزہد سے معلوم ہو جائیگا۔ چونکہ طہشتی کا استعمال یا اس وقت ہوتا ہے جب بہت ساری چیزیں دسترخوان پر موجود ہوں اور تھوڑا تھوڑا کر کے سب کو چکھنا مقصود ہو جیسے آج کل کی دعوتوں میں ہوتا ہے یا پھر سلاخ چٹنی وغیرہ

کے زور سے زیادہ کھانا مراد ہو تو یہ چیز بلاشبہ شرعاً ناپسندیدہ ہے۔

چنانچہ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں:

”الاتساع فی الشهوات من المکروہات وقد نعی اللہ علی قوم ذالک فی کتابہ
العزیز فقال: اذہبت طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بها^۱ وكذلك
التبسط فی المہیات والتبعر فی الماکل والموائد والتجمع بالالوان والفواکہ
والتقلل هو المحمود والتواضع هو المحبوب۔“

غرض کھانے کا مقصد عبادت پر قدرت حاصل کرنا اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا استعمال و شکر یہ
ہونا چاہئے اس سے مراد بوجھل ہونا اور محتذ ذمہ ہونا نہ چاہئے ”فان عباد اللہ لیسوا بمتعین“^۲ اور یہی
وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چپاتی یا میدے کی نرم روٹی کا انتظام نہیں ہوتا تھا اہتمام تو بڑی چیز ہے بلکہ
اکثر جو کے آنے میں پھونک کر بھوسا اڑا دیا جاتا اور باقی پکایا جاتا ایسے میں مرقق اور نرم روٹی کہاں تیار ہو سکتی تھی
بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بھی پھلنیوں سے خالی تھے، وہ واقعی اللہ والے تھے۔

کرسی اور میز پر کھانا:

چونکہ آج کل اکثر مواضع میں کرسی اور میز کا استعمال عام ہو گیا ہے اس لئے میز پر کھانا اگرچہ علت تشبیہ
کی بناء پر تو ممنوع یا مکروہ نہیں ہے کیونکہ جو مشابہت ناجائز ہے وہ مقید ہے اسکے ساتھ جو غیر قوم کی خصوصیت
ہو اور تشبیہ کے قصد و ارادہ سے اختیار کیا جائے جیسا کہ در مختار ”باب ما یفسد الصلوۃ وما یکرہ فیہا“ میں ہے:

”فان التشبیہ بہم (ای باہل الکتاب) لا یکرہ فی کل شیء بل فی المذموم
وفیما یقصد بہ التشبیہ کما فی البحر۔“

اس پر علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

”فقد اشار الی ان صورة المتشابهة فیما تتعلق بہ صلاح العباد لا یضر۔“

(شامی صفحہ ۱۶۲۳ ج ۱ ص ۱۶۲۳)

باب ماجاء علی ما کان یا کل النبی ﷺ

۱۔ سورة الاحقاف رقم آیت: ۲۰۔ ۲۔ رواہ احمد فی مسندہ ص: ۳۲۲ ج: ۶ رقم حدیث: ۲۱۲۰۰ ”ایای
والتعم، فان عباد اللہ لیسوا بالمتعین“ ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۱۰۲ ج: ۳ دار الکتب العلمیہ بیروت۔

البتہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کی حکمت تو واضح اور خاکساری کو اپنانا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ زمین ہی پر بیٹھ کر اور مل کر کھایا جائے۔ اگر ہوٹلوں میں ہم اس طرز کو اپنانے سے قاصر ہیں تو اپنے گھروں اور اختیار کی جگہوں میں تو اس پر آسانی خود بھی عمل کر سکتے ہیں اور دوسروں سے بھی کروا سکتے ہیں۔

فائدہ نمبر ۱: حکمت اور علت میں فرق یہ ہے کہ علت کے ساتھ حکم کا طرد اور عکس ہوتا ہے یعنی اگر علت دور اور ختم ہو جائے تو حکم بھی رفع ہو جاتا ہے اور اگر علت پھر لوٹ آئے تو حکم بھی لوٹ آتا ہے جیسے مسائل عرفیہ وغیرہ کا ضابطہ ہے۔

مگر حکمت چونکہ دائمی چیز ہوتی ہے اس لئے یہاں طرد و عکس والی تفصیل نہیں چلتی، علیٰ ہذا زمین پر بیٹھ کر کھانے کی حکمت تو واضح کی بناء پر بہر کیف افضل و مطلوب ہے، اگر اسکے ساتھ میز پر یا کھڑے ہو کر کھانے میں تکبر یا تشہ کی علت ہو تو پھر زمین پر بیٹھنا لازم ہو جاتا ہے کہ علت و حکمت دونوں جمع ہو گئیں۔

فائدہ نمبر ۲: جس طرح کھانا ادنیٰ رکھ کر منہ کے قریب کرنا مکروہ ہے اسی طرح یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ خود تو اونچی جگہ پر بیٹھ جائے اور کھانا نیچے رکھے مثلاً خود بستر پر بیٹھے اور کھانا زمین پر رکھے کیونکہ دسترخوان اتنا موٹا نہیں ہوتا کہ اسے بستر کے برابر کر دے۔ اسی طرح اگر چار پائی پر کھانا ہو تو کھانا پائنتی کی طرف نہ رکھے بلکہ خود پائنتی کی جانب بیٹھنا چاہئے کھانے کے بعد پہلے دسترخوان اٹھوایا جائے پھر خود اٹھے۔

میرے پاس بعض اوقات مہمان آتے ہیں ہم کھانا کمرے کے درمیان میں دسترخوان پر رکھ لیتے ہیں تاکہ ایک تو اٹھ کر کھانے کے پاس جانا پڑے، دوم یہ کہ کھانا ہم سے نیچے یہ ہو مگر بعض مہمان بچوں سے کہتے ہیں کہ دسترخوان یہاں نشستوں والے بستروں پر لاؤ، اس طرح وہ خود اوپر رہتے ہیں اور کھانا نسبتاً نیچے اور لطف یہ کہ جب میں کھانے کے برابر قالین پر بیٹھتا ہوں تو بعض حضرات اوپر بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہم حیا کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے مگر مہمان کو چاہئے کہ جس طرح اہل خانہ کریں اور بالخصوص جب اس میں مصلحت بھی پیش نظر ہو تو اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔

قولہ "هذا حديث حسن غريب" قال ابن العربي في العارضة الحديث صحيح خرجه

البخاری۔^۱

باب ماجاء فی اکل الارنب

عن هشام بن زيد قال سمعت انساً يقول أنفجنا رنباً بعر الظهران فسمي أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم علفها فادر كنها فاخذتها.... الخ -

حضرت هشام بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہم نے مر الظہر ان نامی جگہ میں ایک خرگوش کو بھڑکایا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے میں نے اسکو تباہ کر کے پکڑ لیا پھر اسکو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا، تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اسے چھماق کے پتھر سے ذبح کر دیا پھر اسکی ران یا ران کا بالائی حصہ (یعنی کولہا) مجھے دے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھایا۔ میں (راوی ہشام) نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھایا؟ انھوں نے کہا کہ قبول فرمایا تھا۔

لغات :- ”انفجنا“ جمع شکم کا صیغہ ہے جس کے معنی خرگوش کو بھڑکا کر نکالنے کے ہیں ”نفج الارنب“ اس وقت کہا جاتا ہے جب خرگوش اُکسائے جانے پر بھڑک کر بھاگنے لگے جیسے ”نفجت الریح“ ہوا کے تیزی سے چلنے کو کہا جاتا ہے، غرض ہم نے اسے چھپنے کی جگہ سے نکال باہر کر دیا۔

قولہ ”بمر وہ“ چھماق کے پتھر کو کہا جاتا ہے جب اسے دوسرے پتھر پر مارا جاتا ہے تو اس سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں اور جب اسے توڑا جائے تو اس میں تیز دھار بنتی ہے۔ ہم بچپن میں رات کو کبھی کبھی اندھیرے میں اس سے آگ نکال کر کھیلتے تھے اور جب پرندے مارتے اور چاقو نہ ہوتا یا مچھلی شکار کرتے تو اس پتھر سے چاقو کا کام لیتے جو بڑا آسان ہوتا ہے۔

قولہ ”او بور سکھا“ بفتح واو جبکہ کسرہ بھی جائز ہے اسی طرح راء بھی مکسور اور ساکن دونوں صحیح ہے، ران کے بالائی حصے اور کولہ کی ہڈی کو کہتے ہیں، اور اسکی جمع اور اک آتی ہے۔

تشریح :- حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ردائف کے سوابقات سب کے نزدیک خرگوش حلال ہے۔ باب کی حدیث حلت کی دلیل ہے پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا ”فبعث معی“ اس کی تائید کیلئے ہے کہ یہ محض سُنی ہوئی بات نہیں بلکہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے قبول کرتے ہوئے پیغم خود دیکھا ہے، پھر تعبیر کی اس تفسیر کو تعارض نہ سمجھا جائے کہ پہلے کہا ”فاکله“ اور پھر فرمایا ”قبلة“ کیونکہ قبول کرنا لازم ہے اور

کھانا جائز ہونا لازم ہے، تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصرف اور تحیر شعبہ نے کیا ہے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کھانے کی نسبت روایت بالمعنی ہے اور یہ کوئی کذب اور جھوٹ نہیں کیونکہ اگر خرگوش حلال نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسکو ہرگز قبول نہ فرماتے بلکہ اسکو ہاتھ بھی نہ لگاتے، بہر حال اس بارے میں مزید روایات بھی وارد ہوئی ہیں مثلاً (نسائی ۱) میں ہے کہ ایک اعرابی نے بنا ہوا خرگوش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود تو نہیں کھایا البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کھانے کو کہا اس کے مقابلے میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو کراہیت پر دلالت کرے اور یہ جو ترمذی نے نقل کیا ہے ”انہ اندمی“ کہ اسکو خون آتا ہے تو یہ عدم جواز یا کراہیت کی علت نہیں ہو سکتا بلکہ خون پہننے سے تو ماقبی صاف ہو جاتا ہے ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ طبیعت اسکو پسند نہیں کرتی وہ الگ شے ہے یعنی طبعی کراہیت ہے نہ کہ شرعی۔

علامہ یحییٰ اور امام نووی فرماتے ہیں کہ ان کے بعد اور باقی سب علماء کے نزدیک خرگوش حلال ہے سوائے عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اور عمرہؓ کے، شاید امام ترمذی ”وقد كره بعض اهل العلم... الخ“ میں ان کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، باقی شاہ صاحبؒ نے جو نسبت روافض کی طرف کی ہے ممکن ہے کہ ان کا قول بھی کراہیت کا ہو۔ واللہ اعلم

ابن العربی ”عارضۃ الاحوذی“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے شکار کے تعاقب میں بھاگنے اور دوڑنے کا جواز معلوم ہوا اگرچہ اس میں گرنے کا خطرہ رہتا ہے مگر طلب رزق میں ایسا کرنا جائز ہے، بظاہر اس خرگوش میں دوسرے لوگ بھی شریک ہونے چاہئے تھے مگر ہو سکتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسے اکیلے ہی پکڑا ہو یعنی کسی کی مدد کے بغیر، حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے ربیب تھے مگر پہلے حضرت طلحہ کے پاس لانے کی وجہ شاید یہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دور ہوں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عظیم شخصیت کی خدمت میں معمولی ہدیہ بھیجنا جائز ہے۔ کذا فی العارضہ

باب ماجاء فی اکل الارنب

۱ سنن نسائی ص ۱۹۷ ج ۲: الارنب ”کتاب الصيد والذباح“

۲ کذا فی فتح الباری ص ۸۲۶ ج ۹ ”کتاب الذباح والصيد“

باب ماجاء فی اکل الضب

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن اکل الضب فقال لا اكله ولا احرّمہ۔

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گوہ کے کھانے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ تو میں اسے کھاتا ہوں اور نہ حرام قرار دیتا ہوں۔“

لغات :- قولہ ”الضب“ الفتح الضاد وتشدید الباء ایک چالاک جنگلی جانور ہے جو زمین میں بل بنا کر رہتا ہے، اردو میں اسے ”گوہ“ کہتے ہیں مادہ کیلئے ”ضبة“ آتا ہے، اور اسکی جمع ”ضباب“ و ”اضب“ آتی ہے فارسی میں اسے ”سوساز“ اور پشتو میں اسے ”سمسارہ“ کہتے ہیں۔

تشریح :- گوہ وضع قطع کے لحاظ سے گرگٹ کی مانند ہے البتہ گوہ کافی بڑی ہوتی ہے، ابن خالویہ کہتے ہیں کہ گوہ کی عمر سات سو برس تک ہوتی ہے، خشک علاقوں میں پائی جاتی ہے، مشہور ہے کہ یہ پانی نہیں پیتی اور چالیس دنوں میں ایک قطرہ پیشاب کرتی ہے، گویا ٹھنڈی ہوا سے اس کی اندرونی خشکی و حرارت دور ہو جاتی ہے، اپنے رہنے کیلئے مختلف سمتوں سے بل بنا کر ایک سے داخل ہو کر عموماً دوسرے سے نکل جاتی ہے، اور یہ بے ضرر جانور ہے، بعض چور لوگ اسکو چوری کی واردات کیلئے پالتے بھی ہیں کیونکہ اس میں اتنی طاقت ہے کہ جب ایک دفعہ کسی چیز پر اپنے پنجے چڑکا دے تو اسے پھر کوئی انسان جدا نہیں کر سکتا اس لئے یہ لوگ اس کی دم کے ساتھ رتی باندھ کر دیوار پر چڑھاتے ہیں اور پھر جب وہ دیوار پر چڑھ جاتی ہے تو وہ رتی کھینچ لیتے ہیں اس طرح یہ چمک جاتی ہے اور وہ اسی رتی پر چڑھ کر دیوار سے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

بچپن کا واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ گاؤں کے لڑکوں نے اسے ایک بل میں پھنسا یا تھا اندر جگہ کم تھی اس لئے اس کی دم باہر رہ گئی، لڑکوں نے مل کر اسے کھینچا مگر وہ نہ نکال سکے پھر آگ جلادی گئی مگر وہ پھر بھی نہیں نکلی بالآخر اسکی دم کٹ گئی جو انتہائی مضبوط ہوتی ہے مگر گوہ کسی حال میں نہ نکلی۔

گوہ کھانے کا حکم :- قولہ ”وفد اختلاف اهل العلم فی اکل الضب“ الخ مجموعی اعتبار سے اس بارے میں دو قول ہیں (۱) مکروہ (۲) جائز غیر مکروہ۔ پہلا قول حنفیہ کا ہے اور دوسرا ائمہ ثلاثہ و اہل ظواہر کا۔

پھر حضرت شاہ صاحب ”عرف الشذی“ میں فرماتے ہیں کہ ہمارے حنفی فقہاء نے کراہت تحریمی کو اختیار کیا ہے جبکہ

احناف کے محدثین نے تنزیہی کو۔ چنانچہ حاشیہ پر جہاں ملا علی قاریؒ نے امام محمدؒ کا قول نقل کیا ہے تو وہاں اس کو احتیاط سے مقید کیا ہے "قال محمد قد جاء في اكله اختلاف واما نحن فلانرى ان يوسل له قال الغارني اي احتياطاً للعارض الادلة" الخ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملا علی قاریؒ گراہت کو تنزیہ پر محمول کرنا چاہتے ہیں۔

جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "كلوا" بصیغہ امر جیسا کہ مسلمؒ کی روایت میں ہے گو کہ خود تناول کرنے سے انکار فرمایا کیونکہ مکہ میں گوہ کھانے کی عادت نہ تھی کہ وہاں یہ نہیں پائی جاتی ہے۔

یا پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یہ حرام ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لاولكن لم يمكن مريض قومي فاجدني اعافه" جیسا کہ بخاری شریفؒ میں ہے یعنی یہ حرام تو نہیں مگر مجھے اس سے گھن آتی ہے کہ یہ ہماری قوم کی سر زمین میں نہیں پائی جاتی ہے، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ اس ارشاد کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے تناول فرمایا۔ حدیث الباب میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا آكله ولا أخرتمه" علاوہ ازیں بھی اس مضمون کی صحیح احادیث موجود ہیں۔^۱

ان روایات سے اس کی حلت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر گوہ جائز نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم "كلوا واطعموا" نہ فرماتے اور "لا احرمه" کبھی نہ کہتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیان تحریم و تحلیل پر مامور تھے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست خوان پر اسے کھایا جاتا۔ اس لئے امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے^۲ اور قاضی عیاضؒ کی نقل پر اعتراض کیا جنہوں نے بعض علماء کی طرف حرمت کی نسبت کی ہے، غرض ان روایات سابقہ کی وجہ سے بقول امام نوویؒ حرام کہنا خلاف منصوص ہے ہاں حنفیہ سے

باب ما جاء في أكل الضب

۱۔ كذا في الموطأ للإمام محمد ص: ۲۸۵ باب أكل الضب "كتاب الصيد والذبائح، إدارة المحرم لا هو۔

۲۔ صحيح مسلم ص: ۱۵۱ باب إباحة الضب "كتاب الصيد والذبائح الخ"۔

۳۔ انظر فتح الباری ص: ۸۴۷ ج: ۹ وفم حدیث: ۵۵۳۷، قديمی کتب خانہ۔

۴۔ كذا في مجمع الزوائد ص: ۳۶۵۳۳ ج: ۳ "كتاب الصيد والذبائح" دار الكتب العلمیہ بیروت۔

۵۔ النووی علی مسلم ص: ۱۵۱ ج: ۲ باب إباحة الضب۔

مگر اہیت کا قول ثابت ہے۔ ان کے دلائل درج ذیل ہیں۔

(۱) امام ترمذی نے فی الباب میں ابوسعید اور ثابت بن ولید رضی اللہ عنہما کی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا تو یہ حدیثیں بالترتیب مسلم^۱، مسند احمد، ابن ماجہ اور ابوداؤد و نسائی میں ہیں۔ ان میں گوہ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو اسرائیل کی ایک قوم جانوروں کی شکل میں مسخ ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ کون سے جانور ہیں۔ حافظ نے فتح الباری میں فرمایا "وسندہ صحیح"۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ امکان ظاہر کرنا کہ شاید گوہ وہی مسخ شدہ امت ہو، جو اس کی رذالت کی علامت ہے کیونکہ مسخ رذیل چیز کی شکل میں ہوتا ہے جیسے بندر اور خنزیر، باقی یہ کہنا کہ مسخ شدہ قوم باقی نہیں رہتی اور نہ ہی اس کی نسل پیدا ہوتی ہے تو یہ بات اگرچہ مشہور ہے مگر ابن العربی نے عارضہ میں اسے سختی سے رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں عقل سے تو معلوم نہیں کی جاسکتیں اور نقل صحیح اس بارے میں کوئی نہیں چنانچہ وہ اس بحث کے اصول نمبر پانچ میں لکھتے ہیں:

"الحامسة قولهم ان الممسوح لا تنسل دعوى، وهذا امر لا يعلم بالعقل

وانما طريق معرفته الشرع وليس فى ذلك اثري قول عليه۔"

المستعرض کرتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت باطنی اعتبار سے مسخ ہو چکی ہے پھر بھی ان کی نسلیں پیدا ہوتی ہیں تو ظاہری مسوخ کی نسل پیدا ہونے سے کیا چیز مانع ہے؟ پھر اس حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسوخ کی نسل در نسل بقاء میں کوئی واضح مانع نہیں ہے "ان امة من بنى اسرائيل مسخت ذوات فى الارض وانى لا ادرى اى الدواب هى" (ابوداؤد و نسائی و مسلم) اس کا سیاق بتلا رہا ہے کہ مسوخ کی بقاء ممکن ہے ورنہ تو اس تغلیل کی پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ مسلم^۲ کی روایت اس مقصد پر زیادہ ناظم ہے "قال ائسى رسول الله صلى الله عليه وسلم بضرب فائى ان ياكل منه وقال: لا ادرى لعله من القرون التى مسخت۔"

۱۔ صحیح مسلم ص: ۱۵۲ ج: ۲ باب اباحة الضب، مسند احمد ص: ۴۷۶ ج: ۳ رقم حدیث ۱۱۲۶۰۔ سر اس ماجہ

ص: ۶۳۳ باب الضب "ابواب الصيد" عن ثابت بن دہبع، سنن نسائی ص: ۱۹۸ ج: ۲ "الضب" کتاب الصيد، سن

ابی داؤد ص: ۱۷۹ ج: ۲ باب فی اكل الضب "کتاب الاطعمة"۔ بحوالہ بالا۔

۲۔ صحیح مسلم ص: ۱۵۱ ج: ۲ "کتاب الصيد والذبائح"

(۲) مسند احمد، ابوداؤد، اور طحاوی وغیرہ میں عبد الرحمن بن حسنہ کی روایت ہے۔

”وفیه.. انهم طبعوا منها (ای من الضباب) فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان

امة من بنی اسرائیل مسخت دواب الارض فاعشى ان تكون هذه فاکفوها“۔

حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں ”وسنده علی شرط الشيخین الا الضحاک فلم

یخرجہ“۔^{۱۱}

طریق استدلال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاڈیاں النواذین اس کو ناپسند کرنے کی بنا پر ہی ممکن

ہے۔

بجوزین ان روایات میں یوں تطبیق دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو نہ کھائی مگر اس سے منع بھی نہیں فرمایا ہے جس سے صحت معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی کیونکہ اس کے بارے میں امت مسوخ کا خدشہ ظاہر کرنا عام علت ہے، اس لئے خفیہ کہتے ہیں کہ عدم تحریم سے متعلق جتنی بھی روایات ہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توقف پر محمول ہیں یعنی اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف سکوت عنہا اشیاء بذات خود مباح بھی ہو سکتی ہیں بلکہ بہت سے علماء کے نزدیک تو اشیاء میں اصل اباحت ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نہیں روکا۔ پھر جب بنی اسرائیل کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رخ کا پتہ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاڈیاں النواذین۔ اور اہم بات یہ ہے کہ جب حلت و حرمت میں شک ہو جائے تو ترجیح حرمت کو ہوتی ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے۔

نیز گواہ ایک کر یہ المنظر جانور بھی ہے اس لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر تھوکا، عارضۃ الاحوی میں ہے ”روی مسلم و ابوداؤد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما قدیم الیہ الضب تبرق“۔^{۱۲} اور جہاں تک صاحب تحفۃ الاحوی کا یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی

۹ مسند احمد ص: ۲۱۹ ج: ۵ حدیث: ۱۷۳۰۳، ایضاً أخرجه ابو یعلیٰ فی مسنده برقم: ۹۳۱، مجمع الروائد ص: ۳۳ ج: ۳، ۱۱ ابوداؤد ص: ۱۷۶ ج: ۲ باب فی آکل الطیب ”کتاب الاطعمہ، عن ثابت بن دینہ وفیه قال ان اعمن بنی اسرائیل مسخت دواب فی الارض والی لادری ای الدواب هی الخ۔ ۱۲ فتح الباری ص: ۸۳۰ ج: ۹ ”کتاب الدجاج والصيد“۔ ۱۳ لم اجدہ بلغظہ فی مسلم واللہ اعلم وعلمہ ام۔ الحنفی عفی عنہ، سنن ابی داؤد ص: ۶۸ ج: ۲ باب ما یقول اذا شرب اللبن، کتاب الاشریہ۔

احادیث تحلیل کی روایات پر مقدم ہیں کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھا کہ مسوخ کی نسل نہیں رہتی اور جب معلوم ہوا تو نبی کی علت ختم ہو گئی اور ابن حجر کی بات بھی کچھ اس طرح ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ مسوخ کی نسل باقی نہیں رہتی؟ اوپر ابن العربی کی بات نقل کی گئی ہے کہ اس دعویٰ پر کوئی قابل اعتماد اثر نہیں لہذا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور منہج کی احادیث کو مقدم کہنا محض دعویٰ ہے۔ اور امام نووی کا دعویٰ اجماع علی الحکمت بھی صحیح نہیں کہ خود حافظ نے اسے رد کیا ہے کہ ابن المذہب نے حضرت علیؓ سے اس کے خلاف قول نقل کیا ہے تو حضرت علیؓ کی مخالفت کے ہوتے ہوئے اجماع کیسے ممکن ہے؟ (کذا فی حاشیۃ الکوکبؒ) علاوہ ازیں ترمذی کی نقل نوویؒ کی نقل پر بہر حال مقدم ہے۔

باب ماجاء فی اکل الضبع

”عن ابی عمار قال قلت لجابر: الضبع أصیئعی؟ قال نعم قلت أکلها؟ قال نعم قلت أقالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال نعم۔“

حضرت ابن ابی عمار فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ آیا تجھ شکار ہے انہوں نے فرمایا: ہاں میں نے کہا اسے کھا سکتے ہوں فرمایا ہاں میں نے عرض کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔

لغات:- ”ضبع“ بفتح ضاد اور ضمہ باء اسے فارسی میں کفتار اور ہندی وارو میں میں ہنڈا یا بٹو کہتے ہیں۔ ایک معروف درندہ ہے جو انسانی گوشت کو بہت پسند کرتا ہے اس لئے یہ مردہ اور سوئے ہوئے انسانوں کو شکار کرتا رہتا ہے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ سوئے ہوئے شخص پر اس کا حملہ بڑا عجیب ہوتا ہے یہ اس کے سر کی جانب آتا ہے پہلے سر کے نیچے جگہ کھودتا ہے جب اس کا سر نیچے ہو جاتا ہے اور گلہ اچھی طرح کھل جاتا ہے تو یک دم سے اپنی داڑھیوں سے آٹا ٹاٹا گلہ کاٹتا ہے۔

”وہی تغرس آدمی ولكن حدیعة (دھوکے سے پھاڑتا ہے) ... الی... اذ انام وصفة الفتراسها انھا تأتیه من قبل رأسه فتحتفر الارض حتی یحیل رأسه

وہر زحلقة فتححم بانيا بها عليه وتفره في لحظة۔

قولہ ”اصیدھی“ ہمزہ استفہامیہ مصدر پر داخل ہے جوئی للمفعول ہے۔ قولہ ”اکلھا“ ہمزہ کے مد کے ساتھ کیونکہ استفہامیہ ہمزہ قطعیہ پر داخل ہے۔ قولہ ”اقالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ اقالہ کی ضمیر میں ایک احتمال یہ ہے کہ ”الضبع اصیدھی“ کی طرف راجع ہو مگر یہ خلاف ظاہر ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مذکورہ قول کی طرف عائد ہو اس صورت میں یہ مطلب حنفیہ کے خلاف بنتا ہے جس کا جواب آ رہا ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث ابواب الحج ”باب ما جاء فی الضبع بصیہا المحرم“ میں بھی گزری ہے اس کی بعض شرح (تشریحات جلد سوم ص ۵۰۳، ۵۰۵) پر دیکھی جاسکتی ہے۔ بچو کے حلال اور حرام ہونے کی حیثیت بھی ائمہ کے درمیان متنازع رہی ہے۔ شوافع وحنابلہ اور اہل ظواہر کے نزدیک بچو حلال ہے جبکہ حنفیہ و مالکیہ اور سعید بن المسیب کے ہاں حلال نہیں پھر حنفیہ کے نزدیک تو حرام ہے جبکہ امام مالک کے نزدیک مکروہ (تحریمی) ہے۔

بجوزین کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔ نیز امام شافعی فرماتے ہیں کہ بچو کا گوشت ہمیشہ صفا اور مردہ کے درمیان بکتا رہا ہے مگر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا ہے جو اس کے حلال ہونے کی دلیل ہے۔ مانعین کا استدلال ترمذی میں باب کی دوسری حدیث سے ظاہر تو ہے مگر اس پر فریق اول کی طرف یہ اعتراض ہے کہ اس میں دو راوی شکلم فیہا ہیں جیسا کہ ترمذی نے فرمایا ”وقد تکلم بعض اهل الحديث فی استدلال وعبدالکریم“ الخ گو کہ اس کا جواب ہو سکتا ہے مگر اس سے زیادہ قوی دلیل قرآن کی آیت اور مسلم شریف کی مشہور حدیث ہے (۱) قال اللہ تعالیٰ ”وَنُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَايِثَ“۔^۱ اور بچو کے خبیث ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جو مردوں کو بھی معاف نہیں کرتا۔ (۲) ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع وعن کل ذی مخلب من الطیر“۔^۲

ابن القیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ اس بارے میں کہ داڑھ والے جانور حرام ہیں احادیث حدیث اتر تک پہنچتی ہیں ”وقد تواترت الآثار عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنہی عن اکل کل ذی

باب ما جاء فی اکل الضبع

۱۔ سورة الاعراف آیت ۱۵۷۔ ۲۔ صحیح مسلم ص ۱۴۷ ج ۲ باب تحریم اکل کل ذی ناب من السباع الخ ”کتاب الصيد والجنات“ ایضاً راجع للتفصیل اعلاء السنن ص ۱۶۳ تا ۱۶۹ ج ۱ باب ما جاء فی الضبع۔

ناب من السباع وصحت صحة لامطعن فيها "الخ باقی قاضی شوکاٹی کا اسے ذی ناب سے خارج کرنا صحیح نہیں کہ اس کے ذی ناب ہونے میں کسی نے شک نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ابن قیم کا اسے سباع سے باہر کرنا بھی بے معنی کوشش ہے کہ درندگی اس کی مشہور صفت ہے لہذا ابن قیم کا یہ استدلال الٹا ہوا کہ حرمت کا دار و مدار دو وصفوں پر مبنی ہے ایک یہ کہ وہ ذی ناب ہو اور دوم یہ کہ وہ ایسے سباع میں سے ہو جو از خود حملہ آور ہو جبکہ بچہ میں صرف ذی ناب ہونے کا وصف پایا جاتا ہے۔

"فانه انما حرم ما شتمل على الوصفين ان يكون له ناب وان يكون من السباع العادية بطبعها كالاسد... واما الضبع فانما ليها احد الوصفين وهو كونها ذات ناب وليست من السباع العادية" الخ۔ (تحفة عن الاعلام)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کو کسی بھی حالت میں خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ معاف نہ کرنے والا جانور درندہ اور سبع نہیں تو پھر تو کوئی چیز بھی سباع میں سے نہیں اس لئے ابن العربیؒ ایسے لوگوں کی بات پر سخت تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان پر تعجب ہے جو گیدڑ اور لومڑی کو تو حرام کہتے ہیں حالانکہ وہ مرغی پھنز کر کھانے والے درندے ہیں جبکہ بچو کو حلال قرار دیتے ہیں دراصل حالیکہ وہ سوئے ہوئے انسان کو پھاڑ کر کھاتا ہے "وعجباً لمن يحرم الثعلب وهو يفترس الدجاج ويبيع الضبع وهي تفترس الأدمى اذ انما"۔ (عارضة الاحوزی)

لہذا ہم کہتے ہیں کہ اولاً تو باب کی حدیث بچو کی حلت پر صریح نہیں کیونکہ اس میں "اقالہ" کی ضمیر "أصبذھی" کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور اس سے تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ثانیاً اگر اسے مقول کی طرف راجع مانیں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ یہ حضرت جابرؓ کا اپنا گمان ہے کہ انہوں نے اس کے شکار ہونے سے حلال ہونا مستحب کیا علیٰ ہذا یہ قرآن کی اس مذکورہ آیت اور مندرجہ بالا مشہور بلکہ متواتر حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ یہ حدیث ابوداؤدؒ میں بھی آئی ہے مگر اس میں کھانے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ فقط یہ الفاظ ہیں "فقال هو صید ویجعل فیہ كبش اذا صاده المحرم" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے صید محرم کے لئے جزاء کے حکم کے طور پر قرار دیا گیا ویسے تو عام سباع بھی اصیاد ہوتے ہیں۔

صيد الملوك ارناب و تعالب و اذار كبش فصيدى الابطال

حالانکہ بھرنے اور لومڑی کے حلال ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں اس لئے ابن العربی "عارضہ میں لکھتے ہیں" "والحزاء فیہ عندنا أغلب والتحریم فیہ اغلب"۔ بہر حال یہ ایک واحد حدیث ہے جو صریح بھی نہیں لہذا یہ درندوں اور خبائث کی حرمت کے بارے میں نصوص قطعیہ کے لئے ناسخ یا مخصص نہیں بن سکتی خاص طور پر جب مقابلہ بھی محرم سے ہو۔ واللہ اعلم

ملفوظ "ناب" کو اردو میں کچلی کہتے ہیں جس کے معنی نوک دار دانت کے ہیں جو سامنے کے چار دانتوں کے برابر والے آٹنے سامنے دو دانت ہوتے ہیں درندوں کے یہ دونوں دانت نوکیلی اور نمایاں ہوتے ہیں جن سے دوسرے جانداروں کو پھاڑتے اور کاٹتے ہیں اسے کٹنا دانت بھی کہتے ہیں۔ جبکہ خلب نوک دار اور نوکیلی چنگل، ناخن اور پنچے کو کہتے ہیں۔ جو پرندے دوسرے پرندوں کو شکار کرتے ہیں ان کے پنچے نوک دار اور بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، وہ انہی سے چیزوں کو پکڑ کر کھاتے ہیں۔ چونکہ درندگی ایک معیوب وصف ہے اس لئے ایسے جانور انسانوں پر حرام کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان کے اخلاق انسان پر اثر انداز نہ ہوں۔

قولہ "وعبدالکریم بن مالک الحزری ثقہ" چونکہ اس نام کے دو راوی تھے جب امام ترمذی نے ایک کی تصحیف نقل فرمائی تو دفع اشتباہ کے لئے دوسرے کی توثیق کی وضاحت فرمائی اور ساتھ ساتھ دونوں کی نسبت بھی تھلا دی۔

باب ماجاء فی اکل لحوم الخیل

"عن حابر قال أطلعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم لحوم الخيل ونهانا عن لحوم

الخمر"۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت حابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور گدھوں کے گوشت کھانے سے ہم کو منع فرمایا۔

تشریح:- گھوڑے کا گوشت حل و عدم حل کے حوالے سے متنازع ہے تاہم یہ اختلاف سابقہ دونوں بابوں کے اختلاف کی نسبت کم ہے، جمہور علماء یعنی شافعیہ، حنابلہ، صاہبین اور بعض صحابہ کرام و تابعین کے نزدیک گھوڑے کا گوشت بلا کراہت جائز ہے۔ جبکہ ابن عباس، حکم، امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک مکروہ

ہے۔ (کذا نقلہ النووی فی شرح مسلم^۱) پھر بعض مالکیہ اور بعض حنفیہ کے نزدیک کراہت تشریحی ہے جبکہ بعض حنفیہ اور محققین کے نزدیک تحریمی ہے۔ علامہ بیہقی نے امام صاحبؒ کی طرف تحریم و تنزیہ دونوں کی نسبت کی ہے جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے عرف الشذی میں تشریحی کو مختار کہا ہے بلکہ درمختار نے امام صاحبؒ سے مرض وفات میں رجوع نقل کیا ہے۔ (کذا فی العرف) مجوزین کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔ اسی طرح حضرت اسماعیل کی حدیث جس کی طرف ”وفی الباب“ میں اشارہ ہے۔ اور صحیحین^۲ میں مروی ہے بھی ان کی قوی دلیل ہے ”قالت دبحنا علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرسأونحن بالمدينة فأكلناه“۔
ماہین کی دلیل سورہ نحلؑ کی آیات ہیں۔

”والانعام خلقها لكم فيها ذبائح و منافع ومنها تأكلون و لكم فيها جمال حين تريحون و حين تسرحون و تحمّل أنفالكم التي بليد لم تكونوا بلغيه إلا يسقي الأنفس ان ربكم لوروف رحيم و الخيل والبغال والحمير لتركبوها وزينة و يخلق ما لا تعلمون (آیات: ۸۴-۸۵)“

طریق استدلال اس طرح ہے کہ پہلے چوپایوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے تین انعامات کا ذکر فرمایا (۱) لباس (۲) کھانے کا اور (۳) مال برداری کا انعام پھر گھوڑوں، خجروں اور گدھوں کے حوالے سے دو انعامات کا ذکر فرمایا ایک سواری اور ہر دوم زینت کا۔ اگر ان کا کھانا جائز ہوتا تو است ضرور ذکر کیا جاتا کیونکہ قرآن اللہ حکیم کا کلام ہے اور غذا ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بڑے انعام کو چھوڑ دیا جائے اور نہ بڑے کم درجے کے انعامات کا تذکرہ کروایا جائے، خاص کر جبکہ مقام امتنان کا ہے، اگر گدھے، خچر اور گھوڑے کے حکم میں فرق ہوتا تو گھوڑے کو الگ ذکر کروایا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ گھوڑے کا گوشت کھانے کے راوی ہیں جیسا کہ دارقطنی کی روایت میں ہے لیکن خود ان کا مذہب کراہت کا ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے نقل کیا ہے۔ اس لئے

باب ما جاء في أكل لحوم الخيل

۱۔ النووی علی مسلم ص: ۱۵۰ ج: ۲۔ باب اباحة أكل لحم الخيل ”كتاب الصيد والذبائح“
۲۔ صحیح بخاری ص: ۸۲۹ ج: ۲۔ باب لحوم الخيل ”كتاب الصيد والذبائح“ ایضاً فتح الباری ص: ۷۹۸ ج: ۹۔ باب النحر والذبیح ”كتاب الذبائح والصيد، صحیح مسلم ص: ۱۵۰ ج: ۲۔ باب اباحة لحم الخيل.
۳۔ سورۃ النحل آیت: ۸۵ یا ۸۴۔

ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس نکتہ کو سوائے امام مالکؒ کے کوئی نہ سمجھے گا "اعتظیم فیہمہ وسعة غلبہ"۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان سے قبل رئیس المفسرین حضرت ابن عباسؓ بھی اس بار کی کو سمجھ چکے تھے۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ حلت کے بارے میں تمام احادیث کو حالت ضرورت پر حمل کیا جائے گا کیونکہ گھوڑے کھانے کا عام معمول نہ تھا، اس طرح احادیث کا مطلب اور قرآن کا نظم نکرانے سے بچ جائیں گے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ آیت میں دونوں اقسام کو ایک بنانا فصاحت سے معارضہ اور نفعت پر اعتراض ہے۔ علاوہ ازیں گھوڑا ایک جہادی جانور ہے اس لئے اس کے گوشت کی اباحت سے آئمہ جہاد کی تقصیل بلکہ انقطاع کا خطرہ ہے۔ گھوڑے کی وفاداری کا عالم یہ ہے کہ وہ مالک کے اشارے پر ہر خطرہ کی جگہ میں گھس جاتا ہے بلکہ کبھی تو اپنے مالک کو بچانے کے لئے جان پر کھیل کر وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ آج کل جہاد اگرچہ گھوڑوں کے ذریعہ نہیں ہوتا اور مذکورہ علت مفقود ہے تاہم چونکہ بنیادی وجہ سورہ نحل کی آیات کا نظم ہے اس لئے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا لہذا کراہت بدستور باقی رہے گی۔ واللہ اعلم

علاوہ ازیں خچر کی حرمت پر اجماع ہے جبکہ جانور اپنی ماں کے تابع ہوتے ہیں پس اگر گھوڑی حلال ہوتی تو خچر بھی حلال ہوتا۔ نیز ابوداؤدؒ کے میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی روایت ہے۔

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن اکل لحوم الحیل والبیغال
والحمیر (الحديث) وایضاً أخرجه النسائی وابن ماجہ ^۵ والطحاوی۔

اس روایت میں اگرچہ صالح بن حکم پر امام بخاریؒ نے اعتراض کیا ہے "فیہ نظر" کہہ کر مگر ابوداؤد نے اس پر سکوت کیا ہے جو کم از کم تائید کے درجہ میں قابل استدلال ہے، تاہم ابوداؤد کے بعض نسخوں میں امام ابوداؤد نے اس کو منسوخ ضرور کہا ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ ممانعت منسوخ نہیں بلکہ اباحت کا منسوخ ہونا رائج ہے جیسا کہ گدھوں کے گوشت کا حکم ہے یا پھر ابن العربیؒ کے قول کے مطابق اباحت کی روایات ضرورت پر محمول ہیں اس کی تائید امام زہریؒ کے قول سے بھی ہوتی ہے کافی البذل:

"انه قال ما علمنا الحیل اكلت الا فی حصار (قلعہ)۔ وعن الحسن انه قال كان

مع متن ابی داؤد ص: ۱۷۵ ج: ۲ باب فی اكل لحوم الحیل "كتاب الاطعمه.

۵ متن نسائی ص: ۱۹۸ ج: ۲ تحریم اكل لحوم الحیل "كتاب الصيد والذباح" متن ابن ماجہ ص: ۲۳۰ باب لحوم البغال قبل ابواب الصيد.

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کلون الخیل فی مغازیہم۔^۱

(بذل ص ۳۵۵ ج ۵)

عارضۃ الاحوذی میں ہے۔

”وفی الصحيح انہم ما دخلوا خیر الاوہم جباع^۲ فلاححة بتلك الحالة علی الاطلاق وحديث اسماء قضية فی عين فتحتمل الضرورة والذي يتحققه ان ذلك كان نادراً ولم یکن معتاداً وبهذا التقدير یصح نظم القرآن وتستمر الاحادیث علی سبیل بیان۔

باب ماجاء فی لحوم الحمر الاہلیة

”عن علی قال نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن متعة النساء زمّن خبیرو عن لحوم الحمر الاہلیة“۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے (نکاح) متعہ سے خیر کے زمانہ میں منع فرمایا اور پالتو گدھوں کے گوشت سے بھی۔

لغات :- ”متعة النساء“ سے مراد نکاح متعہ ہے جس کی تفصیل ابواب النکاح میں گذری ہے۔
قولہ ”الحمر الاہلیة“ حمر بضم حاء کی جمع ہے جیسے کتب اور کتاب۔ قولہ ”الاہلیة“ آہل بالمذمانوس، پالتو اور گھریلو جانور کو کہتے ہیں یہی معنی حمار انسی کے بھی ہیں جو کہ اگلی روایت کے اخیر میں ہے اس قید سے وحشی سے احتراز کرنا مقصود ہے کیونکہ جنگلی گدھا حلال ہے۔

تشریح :- امام نووی^۱ شرح مسلم^۲ میں لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ کے علاوہ باقی سب علماء پالتو گدھے کی تحریم پر متفق ہیں۔ البتہ مالکیہ سے اس بارے میں تین روایات ہیں جن میں تیسری روایت کراہت کی ہے۔ تاہم

۱۔ رواہ ابن ابی شیبہ فی مسنده ص: ۵۳۹ ج: ۵ ”کتاب الاطعمہ“ دار الفکر بیروت۔

۲۔ کذا فی مصنف ابن ابی شیبہ عن البراء قال اصاب الناس یوم خبیر جوع شدید الخ ص: ۵۳۱ ج: ۵ فی الحمر الاہلیة ”کتاب الاطعمہ“ بعضاً من کبری للبیہقی ص: ۳۱۹ ج: ۱۲ ”کتاب الضحایا“ حفظ الرحمن الحنفی، ندوة العلم

باب ماجاء فی لحوم الحمر الاہلیة

۱۔ النووی علی مسلم ص: ۱۳۹ ج: ۲ باب تحریم اکل لحم الحمر الانسیة ”کتاب الصيد والمذبح“

ابن العربی نے عارضہ میں میں صرف دو قول نقل کئے ہیں ایک حلال ہونے کا۔ اور دوسرا حرام ہونے کا۔ اور ترجیح حرمت کو دی ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں ہے "ان اللہ ورسولہ بنہاکم عن لحوم الحمر الاہلیۃ فانہا رجس"۔^۱

جو حضرات جواز کے قائل ہیں دراصل ان کو خیبر واسلے دن اس نبی کی علت میں تردید ہے کیونکہ اس میں یہ بھی امکان ہے کہ یہ نجس ہونے کی بناء پر ہو جیسا اوپر بخاری شریف کی روایت میں اس کی تصریح ذکر ہوئی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علت مال برداری کی ضرورت ہو۔ یا صحابہ کرامؓ نے نجس نکالنے سے پہلے ہی ان کو ذبح کیا ہو۔ یا وہ گدھے گندگی کھانے والے (جلالہ) ہوں۔ علاوہ ازیں اس آیت میں "فُلْ لَّا اَجِدُ فِیْہَا اَحْسٰی السِّیِّئِ مُخْرِطًا عَلٰی طَاعِمٍ یَطْعَمُہٗ اِلَّا اَن یَّکُوْنَ مِیْتًا اَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا وَّلَحْمِ خَنزِیْرٍ فَاِنَّہٗ رَجِسٌ" لہذا یہ۔^۲ تین محرمات کے علاوہ کوئی چیز مذکور نہیں۔

مابین کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا بخاری شریف کی روایت میں اس پر رجس کا اطلاق کیا گیا ہے لہذا یہی علت متعین ہے اور چونکہ یہ ایسی علت ہے جو دائم اور باقی ہے لہذا یہ صرف خیبر کے گدھوں کی تخصیص کی بناء پر نہیں کہا گیا۔ اسی طرح حنفیہ نے گھوڑوں کی تحریم پر قرآن کی جس آیت سے جس انداز سے استدلال کیا ہے بعینہ وہی استدلال یہاں بھی کیا جائے گا۔

جہاں تک مجوزین کے ترذد کا تعلق ہے تو بخاری شریف کی سابقہ روایت کے بعد اس ترذد کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اور جو آیت انہوں نے پیش کی ہے تو اس کا مطلب اگرچہ بظاہر حصر ہے لیکن اس کا پس منظر ملحوظ رکھنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان کی غرض کے مناقضہ کے طور پر نازل ہوئی ہے اس سے حصر مقصود نہیں۔ چونکہ کفار ان چیزوں کو حرام کہتے جن کو اللہ نے حلال کیا تھا جیسے حام، بحیرہ اور سائبہ وغیرہ اور یہ کام ضد و عناد کی وجہ سے کرتے تو اللہ نے مذکورہ آیت بطور مضادہ کے نازل فرمائی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی آپ سے کہدے "لا تأکل الیوم حلاوۃ" آج تم میٹھا مت کھاؤ تو آپ جواب میں کہتے ہیں "لا تأکل الیوم الاحلاوۃ" تو یہاں مطلب حصر نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں آج ضرور میٹھا کھاؤں گا۔ (کذا حققہ السیوطی فی الاتقان نقلًا عن الامام الشافعی ص: ۳۸، ۳۹)

۱۔ رواہ البخاری ص: ۸۳۰ ج: ۲ فی کتاب الذبائح والصيد باب لحوم الحمر الأنسیۃ فتح الباری ص: ۸۱۵ ج: ۹۔

۲۔ سورۃ الانعام آیت: ۱۳۶۔

دوسری روایت:- ”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرم یوم خیبر کل

ذی ناب من السباع والمجتمعة والحمائر الانسی۔“

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن ہر چمکی والے درندے اور نشانہ کے لئے روکے گئے جانور اور پالتو گدھوں کو حرام قرار دیا ہے۔

لغات:- ”المجتمعة“ بضم المیم، یعنی بضم المیم وفتح الجیم وتشدید الاء، المستقوتہ۔ لغوی اعتبار سے جسم کے معنی ہیں کسی جانور یا انسان کا زمین سے سینہ لگا کر چلنا۔ لیکن یہاں مجتمہ سے مراد وہ جانور ہے جس کو نشانہ بازی کی مشق کے لئے باندھ لیا جائے جو عموماً پرندوں اور خرگوش کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسا جانور جس کو باندھ کر نشانہ بنایا جائے اور بغیر ذبح اختیاری کے مر جائے وہ حرام ہے لیکن اگر اسے مرنے سے پہلے ذبح بھی کر لیا جائے تو اس کا گوشت حلال ہے تاہم مکروہ ہے کیونکہ یہ ذبح کابل نہیں۔ یا پھر یہ سخن سکریہ ہے کہ ایسا کرنا ظلم بھی ہے اور جانور کے ضیاع کا اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ بغیر ذبح کے مر جائے۔

قولہ ”وانما ذکر واحرفاً واحداً“ یعنی محمد بن عمرو سے روایت کرنے والے باقی شاگرد اس حدیث کا صرف یہ حصہ روایت کرتے ہیں ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع“ دوس باقی حصہ یعنی مجتمہ اور حرمانی کا ذکر نہیں کرتے ہیں گویا یہ زائدہ کا تفرقہ ہے مگر زائدہ چونکہ ثقہ ہے اس لئے حدیث صحیح ہے۔

باب ماجاء فی الأکل فی انیۃ الکفار

”عن ابی ثعلبۃ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن فئور المحسوس قال

انقروا غسلاً واطبخوا فیهما ونہی عن کل سبع ذی ناب۔“

حضرت ابو ثعلبہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجوس کی دیگوں کے بارے میں پوچھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو دھو کر صاف کرو اور ان میں پکاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دھاڑ والے درندے (کھانے) سے روکا۔

لغات:- قولہ ”فئور“ قد رکی جمع ہے قد ر بکسرۃ قاف ہاعڑی، دیگی، دیچی اور پکانے کے برتن کو کہتے ہیں بقولہ ”المحسوس“ چاند سورج اور آگ کی عبادت کرنے والے یعنی روشنی کے بخاری۔ آتش پرستی ایران

کا قدیم مذہب ہے ان کا بڑا مذہبی پیشوا زروشت تھا۔ قولہ ”انقوہا“ انقاء سے امر کا صیغہ ہے یعنی انہیں دھو کر صاف کر لیا کریں اور (بعد ازاں) ان میں کھانا پکا لیا کریں۔

تشریح:- جمہور فقہاء کے نزدیک اگر کفار کے برتن دھولے جائیں تو ان میں کھانا پکانا اور کھانا، اسی طرح غسل اور وضوء کرنا سب جائز ہیں مگر طبعی ناپسندیدگی بدستور باقی رہے گی۔ جہاں تک دھوئے بغیر استعمال کا تعلق ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ لوگ خمر اور خنزیر یا میتہ وغیرہ حرام اور نجس اشیاء کا استعمال کرتے ہوں تو پھر ان کا استعمال بغیر دھوئے جائز نہیں، چونکہ ان اشیاء کا استعمال ضروری نہیں اس لئے یہ دیکھا جائے گا کہ کس جگہ کے کفار صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے ہیں اور کس جگہ کے نہیں رکھتے، پس جہاں ان کی عادت اشیاء محرمہ کے استعمال کی ہوگی وہاں ان کے برتنوں سے اجتناب لازمی ہوگا لہذا جہاں وہ ان اشیاء کا استعمال نہ کرتے ہوں وہاں بلا غسل ان کے برتن مستعمل کئے جاسکتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کی ملکیت یا استعمال بذات خود بائع من الطہارت یا مزمل طہارت نہیں بلکہ گندی اشیاء کا استعمال ہی محرم ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے کپڑے پاک ہیں۔ ہاں ان کے مستعمل کپڑے دھونے چاہئے کہ وہ استنجاء کا خیال نہیں کرتے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر وہ خود دھوئے تو وہ بھی قابل استعمال ہیں، جیسے ان کے ہونٹوں کے برتن اور گھروں کے دھوئے ہوئے اوانی کیونکہ من حیث الانسان ہر آدمی صاف پانی سے برتن وغیرہ دھوتا ہے لہذا ہمیں دوبارہ دھونے کی ضرورت نہیں۔

دوسری حدیث:- حضرت ابو ثعلبہ خثنیؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا اللہ کے رسول! ہم اہل کتاب کے علاقہ میں رہتے ہیں تو کیا ہم ان کی ہانڈیوں میں کھانا پکا سکتے ہیں اور ان کے برتنوں میں پانی پی سکتے ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ان برتنوں کے علاوہ کوئی اور برتن نہ ملے تو ان کو پانی سے دھولو پھر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم شکار کی زمین میں رہتے ہیں اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنا سہا ہوا (شکاری) کتا چھوڑ دو اور اللہ کا نام لو، اور وہ کسی جانور کو مار ڈالے تو اسے کھا لو اور اگر وہ کتا سہا ہوا (شکاری) نہ ہو تو ذبح کی صورت میں کھا لو اور جب اپنا تیر پھٹک لو اور اللہ کا نام لو اور اس سے کوئی جانور مر جائے تو اسے بھی کھاؤ۔

لغات:- قولہ ”فار حضوہا“ حافیہ قوت پر ہے فتح الحاء ای اغسلوہا۔ قولہ ”المکلب“ ای المسلط علی الصيد یعنی معلّم اور شکاری کتا۔ باقی تفصیل ابواب الصيد کے شروع میں گزری ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی الفارة تموت فی السمن

”عن میمونۃ ان فارة وقعت فی سمن فماتت فسنل عنها النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال القوها و ما حولها فکلوه“۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک چوبیا گھی میں گر گئی اور مر گئی پس اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے پھینک دو اور اس کے ارد گرد کو (ماقی کو) پھر کھاؤ۔

لغات :- قولہ ”فارة“ الف اور ہمزہ دونوں کے ساتھ پڑھنا صحیح ہے چوبیا کو کہتے ہیں مذکر کے لئے فار بغیر تاء کے مستعمل ہوتا ہے۔ قولہ ”فی سمن“ گھی۔ لفظ ہنتمہ سین اور سکون میم پڑھا جائے گا۔ جبکہ بکسرہ سین وفتحہ میم موناً پے کو کہا جاتا ہے۔ قولہ ”و ما حولها“ ہا کی ضمیر فارة کی طرف عائد ہے جبکہ ما حول سے مراد چوبیا کی ارد گرد والی جگہ ہے یعنی اس کا بدن جس جس حصہ سے مس ہو چکا ہو اور احتیاطاً تھوڑا زیادہ بھی پھینکا جائے۔

تشریح :- اگر گھی وغیرہ مانع قابل انجماد اشیاء میں چوبیا وغیرہ گر کر مر جائے تو جمہور کے نزدیک اگر وہ منجس نہ ہو تو نجس ہو جاتا ہے تاہم اگر وہ منجس نہ ہو تو صرف وہ حصہ ناپاک تصور کیا جائے گا جو چوبے کے بدن سے متاثر ہوا ہے لہذا متاثرہ حصہ پھینکنے کے بعد باقی پاک ہوگا۔ جبکہ بعض اہل ظواہر، امام اوزاعی اور امام زہری کے نزدیک گھی خواہ جامد ہو یا بہنے والا دونوں صورتوں میں اس کے آس پاس والے حصہ کو پھینک دیا جائے تو باقی پاک رہتا ہے۔ امام بخاری بھی اس کے قائل ہیں۔ مالکیہ کے نزدیک اگرچہ پانی کی نجاست کا دار و مدار تغیر احد الاوصاف پر ہے لیکن مانع اشیاء پانی سے مختلف ہیں اس لئے ابن حبیب مالکی اس کو نجس اور امام مالک مکروہ کہتے ہیں جیسا کہ عارضۃ الاحوذی میں ہے۔ جو حضرات گھی کے مانع اور منجس حالتوں میں فرق نہیں کرتے وہ حدیث باب کے اطلاق سے استدلال کرتے ہیں کہ اس میں جامد کی قید نہیں۔ لیکن جمہور کہتے ہیں کہ اول تو بعض روایات میں یہ فرق کیا گیا ہے جیسا کہ ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث ہے ’اذا وقعت الفارة فی السمن فان کان حامداً فالقوها و ما حولها وان کان مائعاً فلا تقربوه‘۔ ابن حبان وغیرہ

باب ماجاء فی الفارة تموت فی السمن

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۱ ج: ۲ باب فی الفارة تقع فی السمن ”کتاب الاطعمه“

نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اگر بالفرض یہ روایت صحیح نہ بھی ہو تو ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ یہ فرق ناگزیر ہے کیونکہ ماحول کا اطلاق ہی جامد کا تعین کرتا ہے کیونکہ مانع میں تو ماحول متصور ہے لیکن اس کا اخراج متحقق نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ جب اس میں چوہا گرے گا تو وہ جبہ تک پہنچے گا اور سارے گھی کو متاثر کرے گا نیز جب ایک حصہ کو نکالا جائے گا تو وہ خلا خود بخود بڑھ ہوگا پس اس کا اخراج نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بات خود ابن العربی مالکی نے بھی تسلیم کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”الثالثة: فقال المفسرون ”القوہا و ماحولہا“ یدل علی انہ جامد اذ لو کان مائعاً

لما کان حول۔“ (عارفہ)

پھر جمہور کا آپس میں اختلاف ہے کہ آیا اس گھی سے کھانے کے علاوہ دوسرا استفادہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو حنفیہ کے نزدیک اس کی بیخ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مشتری کو بتلایا جائے کہ اس میں چوہا گرا اور مرا ہے۔ اسی طرح چراغ جلانے اور کشتیوں پر ملنے کا کام بھی اس سے لیا جاسکتا ہے۔ اور یہی ایک روایت امام شافعی سے بھی ہے۔ (کمانی اٹھ) جبکہ ابن العربی نے امام مالک سے نقل کیا ہے کہ مسجد کے علاوہ چراغ جلانے کا انتفاع جائز ہے۔ خود ابن العربی کہتے ہیں کہ اس سے چراغ جلانا اور اس کے لئے بیچنا جائز ہے۔ (کذافی عارضۃ الاحوذی) علی ہذا امام مالک و احمد اور ایک روایت میں امام شافعی کے نزدیک اس کی بیخ جائز نہیں گویا کہ ان کے نزدیک مطلق انتفاع سے روکا گیا۔ جبکہ فریقہ اول کے نزدیک ”فلا تقربوہ“ کا امر صرف کھانے سے روکنے کے لئے ہے۔ بذل الجود میں ہے کہ امر حادث کی نسبت اقرب اوقات کی طرف کی جائے گی یہ ضابطہ اس حدیث سے فقہاء نے مستنبط کیا ہے کیونکہ جب گھی میں چوہا مرنے کا علم ہوا اور اس وقت گھی منجمد تھا تو اس میں اگرچہ یہ احتمال تھا کہ گرتے وقت گھی مانع ہو لیکن اس کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تدبر

قولہ ”وحدیث ابن عباس عن میمونۃ الصبح“ یعنی یہ حدیث امام زہری سے دو طرح مروی ہے ایک میں حضرت میمونہؓ کا ذکر نہیں ہے بلکہ ابن عباسؓ کی منادات میں سے ہے، جیسا کہ اس سے سابقہ عبارت میں امام ترمذی نے فرمایا ”وقد روی هذا الحدیث عن الزہری“ اس جبکہ حدیث ابوشبابہ والی سند میں یہ ”عن ابن عباس عن میمونہ“ ہے اور یہی یعنی ”کونہ عن ابن عباس عن میمونہ“ زیادہ صحیح ہے۔

قولہ ”وروی معمر عن الزہری عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرۃ“ یعنی معمر نے اس کو ابو ہریرہؓ کی مسانید میں ذکر کیا ہے جبکہ یہ حضرت میمونؓ کی منادات میں سے ہے اس پر امام بخاریؒ کا قول نقل کر کے معمر کی خطا کی تصریح کی ہے۔

باب ماجاء فی النہی عن الأکل والشرب بالشمال

”عن عبد اللہ بن عمران النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یأکل احدکم بشمالہ ولا یشرب بشمالہ فان الشیطان یأکل بشمالہ ویشرب بشمالہ۔“

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک بائیں ہاتھ سے نہ کھائے اور نہ ہی بائیں ہاتھ سے پیئے کیونکہ شیطان اپنے بائیں (ہاتھ) سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔

تشریح:- اللہ تبارک و تعالیٰ نے بعض اشیاء معزز و محترم بنائی ہیں۔ جبکہ بعض چیزیں خفیس قسم کی ہیں ان میں سے طیب، طیب کے مناسب ہیں اور اذنی، اذنی کے۔ چونکہ یمن، شمال سے افضل ہے اس لئے جتنے اچھے کام ہیں وہ دائیں ہاتھ سے سرانجام دینے چاہئے جبکہ ایسے کام جو اگرچہ طبعی طور پر ناگوار ہوں لیکن ان کی انجام دہی ایک مجبوری ہو وہ بائیں ہاتھ سے انجام دینے چاہئے جیسے استنجاء وغیرہ۔

چونکہ کھانا پینا اور رزق کی جملہ اشیاء محترم ہیں اس لئے ان کا تناول سیدھے ہاتھ کا وظیفہ مقرر ہے، علاوہ ازیں اٹنا ہاتھ ناک صاف کرنے اور استنجاء وغیرہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے تو اس سے کھانے کے دوران ذہن اس طرف بھی جاسکتا ہے اور پاکیزہ انسان اس چیز کو بہت ناپسند کرتے ہیں، اور طبعی طور پر معدہ ایسی چیزوں کو جن کی رغبت کم ہو، غم نہیں کر پاتا بلکہ بسا اوقات تو واپس بھی پھینکتا ہے اس لئے شریعت مطہرہ میں کھانے پینے کے لئے دایاں ہاتھ مختص ہے تاہم اس اختصاص کی نوعیت میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ظاہر یہ کہ نزدیک بائیں ہاتھ سے کھانا حرام ہے آدمی پر واجب ہے کہ وہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور پیئے الا یہ کہ اسے کوئی عذر لاحق ہو۔ جبکہ جمہور کے نزدیک یمن سے کھانا پینا مستحب ہے۔ حافظ عراقیؒ نے شرح ترمذیؒ میں اکثر شافعیہ سے بھی یہی نقل کیا ہے امام غزالیؒ اور امام نوویؒ نے اس پر جزم کیا ہے البتہ قاضی شوکانیؒ نے امام شافعیؒ سے وجوب نقل کیا ہے۔

قائلین وجوب کا استدلال ان روایات سے ہیں جن میں یا تو امر کا صیغہ آیا ہے یا پھر شمال سے کھانے پر وعید وارد ہوئی ہے اور یہ دونوں وجوب کی علامات ہیں چنانچہ صحیحین^۱ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”كنت في حجر رسول الله صلى الله عليه وسلم وكانت يدي تطيش في

الصحفة فقال لي: يا غلام سمع الله وكل بيمينك وكل بمبايليك“

یعنی میں ادھر ادھر سے لیکر کھا رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ، سیدھے ہاتھ سے کھا اور اپنے آگے سے کھایا کرو! اور مسلم^۲ میں روایت ہے کہ ایک آدمی بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اسے منع کر کے فرمایا ”كُلْ بيمينك“ اس نے کہا ”لا استطعت“ (یہ کہنا تکبر کی وجہ سے تھا کہ میں دائیں سے نہیں کھا سکتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدو عاؤے کر فرمایا) ”قال لا استطعت فمارفعتها الي فيه بعد“، یعنی اس بدو عا کا اثر یہ ہوا کہ وہ شخص سیدھے ہاتھ کے انقراع سے اور اس سے کھانے کی استطاعت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ اسی طرح باب کی حدیث میں بھی بائیں ہاتھ سے کھانے کے بارے میں سخت شاعت کا اظہار کیا گیا ہے۔

پھر باب کی حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک طبی نے جیسا کہ محشی نے نقل کیا ہے یعنی شیطان اٹنے ہاتھ سے کھانے پر آمادہ کرتا ہے گویا شیطان خود کھانا پیتا نہیں بلکہ اپنے دوستوں کو غلط طریقے سے کھانے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن ابن العربی^۳ نے عارضہ میں اس توجیہ پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ علیٰ ہذا اس کا ظاہری مطلب ہی صحیح ہے کیونکہ شیطاں کا کھانا صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ (کمانی عارضۃ الاحوذی)

جمہور کا استدلال:- بایاں ہاتھ اگرچہ دائیں سے کتر ہے مگر دھو کر صاف کرنے سے قابل استعمال بن جاتا ہے کیونکہ بذات خود اس میں کوئی گندگی کی چیز نہیں پائی جاتی البتہ اس کا درجہ یحییٰ سے کم ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ وہ کھانے پینے کے لئے بالکل نا قابل استعمال ہے اور اس سے کھانا حرام ہے صحیح نہیں حضور

باب ماجاء في النهي عن الأكل والشرب بالشمال

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۱۰ ج: ۲ باب التسمية على الطعام والأكل باليمين ”كتاب الاطعمة“، صحیح مسلم ص: ۱۷۲

ج: ۲ باب آداب الطعام والشراب الخ ”كتاب الاشرية“، صحیح مسلم ص: ۱۷۲ ج: ۲ ”كتاب الاشرية“

صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یمن سے کھانے کو پسند اور شمال سے ناپسند فرماتے اس کا مقتضی کراہت ہے نہ کہ حرمت۔ مثلاً بخاری شریفؒ کی حدیث ہے۔

”كان النبي صلى الله عليه وسلم يعجبه الثمين في نعله وثر جلّه وطهوره وفي شانه كله“
سنن ابی داؤدؒ میں ہے۔

”عن عائشةؓ كانت يدرسول الله صلى الله عليه وسلم اليمين لطهوره وطعامه
وكانت يده اليسرى لخلاله وما كان من اذى“۔ وغير ذلك من الاحاديث۔

لہذا جن حضرات نے وجوب یمن اور حرمت تیسرے پر جو روایات پیش کی ہیں، ہم ان کو تذبذب و استحباب یمن اور کراہیت اکل بال شمال پر محمول کرتے ہیں چنانچہ باب کی مذکورہ حدیث کے بارے میں امام نوویؒ کی شرح مسلم میں لکھتے ہیں ”فيه استحباب الأكل والشرب باليمين وكراهتهما بالشمال وقد زادنا نفع الاخذوا الاطعاء الخ“۔ (مسلم ص ۶۷۱ ج ۱)

باقی رہا یہ مسئلہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ سے کھانے والے کے لئے بدعا فرمائی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بلا غدر نظر انداز کیا جس سے معارف کی صورت بن گئی اور وہ بدعا کا مستحق ٹھہرا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں ”وفى هذا الحديث جواز الدعاء على من خالف الحكم الشرعي بلا عذر“۔ (حوالہ بالا) اَللّٰكِب الدري میں ہے کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کفار وغیرہ کی مشابہت بہر حال مذموم ہے خواہ وہ عمل کی جگہ میں موجود نہ بھی ہوں کیونکہ شیطان وہاں محسوس نہ تھا مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھپ سے منع فرمایا۔ لہذا اگر کسی ہستی یا شہر میں یہود وغیرہ نہ بھی ہوں تب بھی ان کی مشابہت ممنوع ہے۔

آداب:- امام نوویؒ کی شرح مسلم میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کی مندرجہ بالا حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

”وفى هذا الحديث بيان ثلاث سنن من سنن الاكل، (۱) وهى التسمية
(۲) والاكل باليمين... (۳) والثالثة الاكل معايله۔

ج ۶۱: باب اليمين في دخول المسجد وغيره "كتاب الصلوة" ايضاً ص ۲۹ ج ۱ باب الوضوء،
ايضاً ص ۸۱۰ ج ۲ "كتاب الاطعمة" ج ۱ سنن ابی داؤد ص ۶: باب كراهية من الذكر باليمين "كتاب الطهارة"

یعنی شروع میں بسم اللہ پڑھنا، داہنے ہاتھ سے کھانا اور اپنے ہی آگے سے کھانا مسنون ہیں کیونکہ دوسرے کے استعمال کی جگہ سے کھانا سوء معاشرہ اور ترک مروت ہے کہ کبھی دوسرا آدمی اس سے گھن محسوس کرتا ہے خاص کر مانع اشیاء میں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ ہر حالت میں اس پر عمل ہو سکتا ہے حتیٰ کہ کھانے پینے کے وقت بھی۔ اس سے کھانے کے آداب کی تعلیم سکھانا بھی ثابت ہوئی جبکہ باب کی حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وفیه انه ینبغی احتساب الافعال الّتی تشبه افعال الشیاطین وان للشیطان

یلین“۔ (نودی شرح مسلم ص: ۲۰ ج: ۲)

علاوہ ازیں یہ کہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہئے اگر شروع میں بسم اللہ بھول جائے تو کھانے کے دوران ”بسم اللہ اولہ و آخرہ“ کہہ لے۔ کیا بارتق کے کنارے سے کھانا چاہئے نچ سے نہیں۔ اگر بارتق میں مختلف اشیاء ہوں تو مرضی کے مطابق جہاں سے جی چاہے اٹھالے۔ اسی طرح حکم دسترخوان کا بھی ہے۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے کیونکہ یہ تدبیر منزل کے خلاف ہے۔ عورتوں کا مزاج ہوتا ہے کہ اس کے کسی کام پر اعتراض اس کو سخت تکلیف سے دوچار کرتا ہے۔ سب کو مل کر کھانا چاہئے۔ (نقش قدم بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم) کچھ مزید آداب و احکام اگلے ابواب میں بیان ہوں گے۔

باب ماجاء فی لعق الاصابع بعد الاکل

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اکل احدکم فلیلتق اصابعہ

فانہ لا یدری فی ایتھن البرکۃ“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایک کھائے تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ برکت ان میں سے کس والی میں ہے۔

لغات:- ”فلیلتق“ یہ امر کا صیغہ ہے لعق باب سغ سے چاٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ قولہ ”البرکۃ“ خیر اور زیادتی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد تغذی اور نفع ہے چونکہ تو وضع اور ثواب سب نفع اور فائدہ کی چیزیں ہیں اس لئے انگلیوں کے چاٹنے کو حصول برکت کا سبب قرار دیا۔

تشریح:- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب آدمی کھانے سے فارغ ہو جائے تو اپنی انگلیاں چاٹ

لے کیونکہ کھانے کے بعض اجزاء میں برکت ہوتی ہے اور نہ جانے وہ برکت کس جزء میں پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ ان انگلیوں میں ہو، جیسا کہ گرے ہوئے لقمے اور پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے میں بھی یہ احتمال پایا جاتا ہے لہذا اس احتمال کے پیش نظر ان تینوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ علاوہ ازیں اگر وہ ان انگلیوں کو چاٹنے بغیر تو یہ وغیرہ سے صاف کرتا ہے تو اس کا خراب ہونا یقینی ہے۔ اور اگر دھوتا ہے تو اس میں کھانے کا ضیاع اور بے ادبی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس عمل سے وہ تکبر سے بچ سکتا ہے اس لئے یہ علاج سے کم نہیں۔

اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید ہوئی جو انگلیوں کے چاٹنے کو عیب سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے انگلیاں لعاب آلود ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے منہ میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں لگتا اس سے بذات خود آدمی کو یاد رکھنے والے کو گھن آتی ہے، لیکن اس کا یہ مسئلہ قابل التفات نہیں کیونکہ یہ لوگ کھانے میں جھج کا استعمال کرتے ہیں اور اسے بار بار منہ میں داخل کرتے ہیں پھر وہی لعاب آلود جھج کھانے میں بھی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح دانتوں کی صفائی کے لئے برش کا استعمال کرتے ہیں اور پھر اسے پھینکتے نہیں بلکہ رکھ کر دوبارہ و سہ بارہ استعمال کرتے ہیں جب اس سے گھن نہیں آتی تو معلوم ہوا کہ اصل علت گھن کی لعاب نہیں بلکہ عادت کا نہ ہونا ہے چونکہ جھج کی عادت ان لوگوں کو پڑ چکی ہے اس لئے اس سے کوئی گھن نہیں کرتے جبکہ انگلیوں کے استعمال کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے عار محسوس کرتے ہیں۔ رہا دوسرے کا گھن کرنا تو یہ اس وقت ہے جب کھانے کے دوران انگلیوں کو بار بار چاٹا رہے جو نہیں ہونا چاہئے اگر بالکل اختتام پر ایک آدمی اپنی انگلیوں کو چاٹتا ہے اور پھر وہ ہاتھ کھانے میں نہیں ڈالتا تو اس سے نفرت محض نفسیات پر مبنی ہے پھر تو آدمی کو ناک سے بھی گھن آتی چاہئے اور کوئی آدمی دوسرے کے سامنے کھانے کا قابل نہیں ہونا چاہئے بلکہ انسان میں اور بھی بہت سی اشیاء ہیں جو قابل نفرت ہیں۔ اگر ان وساوس کی رعایت کی جائے تو اجتماعیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔

اس باب میں بھی سابقہ باب کی طرح اختلاف ہے۔ اختلاف اور استدلالات کی نوعیت بھی وہی ہے۔ اہل غلو ہر چاہنے کو واجب جبکہ جمہور مستحب کہتے ہیں۔

پھر طبرانی نے کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیوں سے کھاتے انگوٹھے، سیمہ

باب ماجاء فی لعق الاصابع بعد الاکل

۱۔ کذا فی مجمع الزوائد ص: ۵۰ ج: ۵ رقم حدیث: ۴۹۲۳ "کتاب الاطعمہ" عن عامر بن ربيعة ان النبی ﷺ کان يأکل بثلاث اصابع ويعلقهن اذ فرغ، ايضاً ص: ۱۹ ج: ۵ حدیث: ۴۹۳۱۔ الحنفی علیٰ عہ

اور درمیان کی بڑی انگلی۔ علی ہذا چاٹنے کی ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے وسطی کو چاٹ لے پھر شہادت کی انگلی اور اخیر میں انگوٹھے کو جبکہ ان کا باطن منہ کی طرف ہو۔ تاہم عارضۃً الاحوذی میں ہے کہ بوقت ضرورت پانچ انگلیوں کو بھی استعمال کرنا جائز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کی بوٹی ہاتھ سے تناول فرمائی ہے جو تین انگلیوں سے نہیں ہو سکتا۔ چاٹنے کے بعد ہاتھ کو کسی کپڑے سے خشک بھی کیا جاسکتا ہے اور دھویا بھی جاسکتا ہے خصوصاً اگر کھانے میں چکنائٹ یا مٹھاس ہو تو دھونا اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے کیونکہ نہ دھونے کی صورت میں ہاتھ پر کھیاں بیٹھیں گی اور سونے کی حالت میں کوئی موزی کیڑے مکوڑے بھی کاٹ سکتے ہیں۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے ہاتھ کو سوتے میں چوہے نے کاٹ لیا ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے:

”مَنْ نَامَ وَفِي يَدَيْهِ غَمْرٌ (گوشت کی خوشبو) وَلَمْ يَغْسِلْهُ فَاصَابَهُ شَيْءٌ فَلَا يَلُومَنَّ الْإِنْفُسَةَ“۔ (باب فی غسل الیدین من الطعام، کتاب الاطعمہ ۱)

یعنی جو آدمی ہاتھ دھوئے بغیر سو جائے اور اس کے ہاتھ پر گوشت کی بو ہو (یا چکنائٹ مثلاً) اور اسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ سوائے اپنے آپ کے کسی اور کو ملامت نہ کرے کیونکہ غلطی اپنی ہی ہے۔

باب ماجاء فی اللقمة تسقط

”عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اكل احدکم طعاماً انسقطت لقمته فليمت ما رآه منها لم ليطلعها ولا يدعها للشيطان“۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک کھانا کھا رہا ہو اور اس سے لقمہ گر جائے تو اس سے وہ چیز ہٹا دے جو اسے تشویش میں مبتلا کر رہی ہے پھر اسے کھالے اور اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے۔

نکات:۔ فقہالہ ”لقمہ“ التقمہ النبی، کسی چیز کے نگل لینے کو کہتے ہیں کمافی الایۃ ”فالتقمہ الحوت وهو مُلیم“۔ لقمہ کھانے کی وہ مقدار کہلاتی ہے جو ایک ہی دفعہ کھائی جانے والی ہو جسے نوال کہتے ہیں۔

فولہ "فلیحط" بضم الیاء و کسر المیم امانۃ سے امر کا صیغہ ہے یعنی دور کر دے۔ قولہ "ما رابہ" فلیحط کا مفعول یہ ہے "راب" اور "اراب" شک اور تشویش میں ڈالنا۔ "رب" اور "ربیہ" شک و شبہ، گمان اور تہمت کو کہتے ہیں۔

تشریح:- یعنی اگر اس نوال کے ساتھ کوئی ایسی چیز لگ گئی ہو جو ناگواری طبع کا باعث ہو بشرطیکہ وہ نجس نہ ہو تو اسے صاف کر کے کھالینے چاہئے۔ جبکہ نجاست لگنے کی صورت میں اسے کھانا جائز نہ ہوگا الا یہ کہ اسے دھو باجائے۔ اور اگر دھونے کے قابل نہ ہو تو کسی جانور ملی وغیرہ کو کھلایا جائے۔ بہر حال پوری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ کھانا کسی طرح ضائع نہ ہو خواہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

قولہ "ولا یبدعہا للشیطان" کا لقمہ گرنے کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں کبھی آدمی بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا شروع کرتا ہے اس صورت میں یہ شیطان کی مداخلت سے بھی گر سکتا ہے جبکہ کبھی کسی اور سبب سے بھی گر سکتا ہے، پس اگر پہلی صورت ہو تو پھر اس جملے کا مطلب واضح ہے کہ شیطان کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کے اموال ضائع کر دے اس میں وہ کامیاب نہ ہونے پائے۔ اور دوسری صورت میں جب وہ خود گرا ہو مطلب یہ ہونا کہ ایسے نوال کو چھوڑنے کی وجہ سے لاپرواہی، تحقیر، نفرت اور تکبر ہوتا ہے جو شیطانِ اخلاقی ہے چونکہ شیطان اس سے خوش ہو جاتا ہے لہذا اسے چھوڑ کر شیطان کو خوش نہ کیا جائے۔

حدیث آخر:- "عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اکل طعاما لقی اصابعہ الثلث وقال اذا وقعت نعمة احدکم فلیحط عنہا الا ذی ولیا کلہا ولا یبدعہا للشیطان و امر انان تَسْلُت الصُحُفَةَ وقال انکم لاتارون فی ائی طعامکم البرکۃ"۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھانا تناول فرمائیے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو اس سے قابل کوفت چیز یعنی عیب کو صاف کر کے اس کو کھالے اور شیطان کے لئے اس کو نہ چھوڑے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو رکابی کے صاف کرنے کا حکم دیا اور فرمایا تمہیں نہیں پتہ کہ تمہارے کھانے کے کس حصہ میں برکت ہے۔

لغات:- قولہ "الا ذی" اذی الشی، اذی و اذاقو اذیۃ گنداہونے، تکلیف اور نقصان کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد لقمہ کے ساتھ لگی ہوئی ایسی چیز ہے جس کے ہوتے ہوئے آدمی وہ لقمہ خوشی سے نہیں کھا سکتا جیسے کنکری اور مٹی وغیرہ۔ قولہ "تَسْلُت" سلت الصُحُفَةَ باب نصر سے برتن کو انگلی وغیرہ سے چاٹنے اور صاف کرنے

کو کہتے ہیں۔ قولہ "الصحنۃ" وہ برتن جس میں تقریباً پانچ آدمی کھانا کھا سکیں۔ اس سے بڑا قصبہ کہلاتا ہے جس میں بیک وقت دس آدمی کھا سکتے ہیں اور سب سے بڑے طباق کو ہفت کہتے ہیں۔

تشریح:۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے جیسا کہ سابقہ باب میں گزرا ہے چونکہ عام کھانا تین انگلیوں سے کھایا جاسکتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین پر اکتفا فرماتے ورنہ وہ کھانا جیسے چاول اور بڑی ہڈی وغیرہ جس میں باقی انگلیوں سے مدد لی جاتی ہے، اس میں جتنی انگلیاں آلودہ ہو جائیں سب کو چاٹنا ضروری ہوگا۔

غرض یہاں پر تین چیزوں کا بیان ہے، گرے ہوئے لقمہ کو صاف کر کے کھالیا جائے، انگلیوں کو چاٹ لیا جائے اور رکابی اور برتن کو بھی چاٹ کر صاف کیا جائے ان تینوں کی علت یہ بتلا دی کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کھانے کے کس حصہ میں ہے۔ برکت لغت میں زیادتی اور خیر ملنے کو کہتے ہیں۔ یہاں برکت سے مراد کھانے کے منافع ہیں جیسے بھرپور غذا، عبادت کی طاقت اور کھانے کا موافق ہونا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ آدمی جو کھانا کھاتا ہے اس میں برکت تو ہوتی ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کس جزء میں ہے جو کھالیا اس میں یا جو برتن میں باقی ہے اور انگلیوں پر لگا ہوا ہے یا پھر گرے ہوئے نوالہ میں؟ لہذا تحصیل برکت کی غرض سے ان سب کا اہتمام کرنا چاہئے نیز اس میں کھانے کو ضیاع سے بھی بچایا جاسکتا ہے۔ تاہم ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہاں کوئی دوسرا کھانے والا موجود ہو تو اس کے لئے برتن میں کھانا چھوڑنا زیادہ بہتر ہے۔ غرض ہم برتن میں اتنا سالن نکالیں جو ہم بآسانی ختم کر بھی سکیں لیکن اگر زیادہ ہو یا کسی اور کو ضرورت ہو یا ضرورت تو نہ ہو لیکن اسے یقین ہو کہ اگر برتن میں سالن وغیرہ بچ جائے تو ضائع نہ ہوگا بلکہ کوئی دوسرا کھالے گا تو اس صورت میں صرف برتن کو صاف کرنے کی غرض سے سالن کو ختم کر لینا ضروری نہ سمجھا جائے ہاں سالن ختم ہو گیا اب صرف برتن صاف کرنے کا مرحلہ باقی ہے تو اسے صاف کر لینا چاہئے۔ اگر کسی علاقے میں مہمان کے سامنے زیادہ کھانا رکھنے کا رواج ہو یا کھانے پینے والا محترم سمجھا جاتا ہو تو ایسی صورت میں کچھ بچا کر چھوڑنا افضل ہے۔ قالہ النووی فی شرح مسلم

اسی طرح اگر لقمہ گر جائے اور اس کے ساتھ اتنی مٹی وغیرہ لگ جائے کہ اسے صاف کرنے میں مشقت ہو تو بوجہ تحقیر و تکبر اگرچہ چھوڑنا جائز نہیں مگر مشقت سے بچنے کی غرض سے اسے اٹھا کر کسی جانور کو جیسے پرندوں وغیرہ کو کھلایا جائے تو اس میں بھی ان شاء اللہ حرج نہ ہوگا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دسترخوان پر جو چاول کے دانے وغیرہ تھوڑا بہت کھانا گر جاتا ہے اسے پکھرے

میں نہیں پھینکنا چاہئے بلکہ ایسی جگہ ڈالنا چاہئے جہاں سے پرندے وغیرہ کھا سکیں۔

تیسری حدیث :- حضرت ام عاصم فرماتی ہیں کہ حضرت نبیؐ الخیرؑ ہمارے یہاں تشریف لے آئے اور ہم ایک پیالے میں کھانا کھا رہے تھے تو انہوں نے ہم سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی کہ جس نے کسی برتن میں کھانا کھایا اور پھر اسے چاٹ کر صاف کیا تو وہ برتن اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

فائدہ :- ”باب ماجاء فی فضل الحجر الاسود والركن والمقام“ (تشریحات ص: ۶۱ ج: ۴) میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی احادیث کو ظاہر پر حمل کرنا اول ہے اور اس میں کوئی استبعاد بھی نہیں ہے کیونکہ ہر چیز میں اللہ نے کچھ نہ کچھ شعور رکھا ہے اور بولنے کی صلاحیت بھی، اسی بنا پر ہر چیز اللہ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے آج کل تو لو با بھی بولتا ہے۔

بعض حضرات نے اس کو سمیت کے معنی پر محمول کیا ہے کہ پلیٹ وغیرہ کو صاف کرنا تو واضح اور متشرع ہونے کا عمل ہے جس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اس کا سبب برتن بنتا ہے اس لئے نسبت مجازاً اس کی طرف کی گئی۔ واللہ اعلم وعلیہ اتم

باب ماجاء فی کراہیۃ الأکل من وسط الطعام

”عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان البرکۃ تنزل وسط الطعام فکلوا من حافیہ ولا تأکلوا من وسطہ“۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک برکت کھانے کے درمیان اترتی ہے لہذا اس کے کناروں سے کھاؤ اور بیچ سے مت کھاؤ!

لغات :- قولہ ”وسط“ یہ لفظ بسکون السین اور فتح السین دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے تاہم فتح کی صورت میں اس کا اطلاق بالکل درمیان پر ہوتا ہے۔ جبکہ سکون کی حالت میں طرفین کے درمیان پورے حصے کو کہا جاتا ہے اس لئے کہتے ہیں ”المتحرك ساکن والساکن متحرك“۔

قولہ ”حافیہ“ حالت کا مشبہ ہے ناک کی تشبیہ اور تخفیف دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے کنارہ کو کہتے ہیں۔

تشریح :- اس حدیث میں ایک اور ادب کھانے کا بتلادیا کہ کھانا ہمیشہ ایک جانب سے لینا چاہئے

درمیان سے نہیں خواہ چاول، ٹرید اور سالن وغیرہ ہو یا خشک روٹی۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بیج میں برکت نازل ہوتی ہے۔ اس برکت سے مراد اضافہ بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ بہت سی صحیح احادیث سے متعدد واقعات ثابت ہیں اور دیگر فوائد بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے کنارے سے کھانا عقل کے بھی موافق ہے اور فطرت کے بھی۔ نیز کنارہ سے کھانے کی صورت میں اگر ہاتھ سے کچھ گرے گا تو اس کے آگے والے حصے میں گرے گا جو دوسروں کے لئے سبب ناگواری نہ ہوگا جبکہ درمیان میں ہاتھ مارنے سے انقطاع برکت بھی ہوگا اور دوسروں کی ناگواری طبع کا سبب بھی بنے گا۔ پھر درمیانی حصہ پر نزول برکت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ”حیر الامور او سطہا“ کے بموجب افضل بھی ہے اور مشترک بھی۔ بہر حال اس حدیث کے مطابق کھانا درمیان سے نہیں کھانا چاہئے۔ بلکہ اپنے آگے سے ہی کھالینا چاہئے درمیان سے کھانا مکروہ ہے بلکہ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں اس آدمی کے لئے جو اس حکم سے واقف ہو حرام قرار دیا ہے۔ اگر برتن میں مختلف اشیاء ہوں جیسے کئے ہوئے مختلف پھل ہوں تو جو مرضی ہو اٹھالے۔ تاہم اس میں بھی مذکورہ ضابطے کو ملحوظ رکھے اور کوشش یہ ہونی چاہئے کہ درمیانی حصہ اخیر تک محفوظ رہے۔ چونکہ مشکوٰۃ وغیرہ کی روایت میں ”کلوا من جوانبہا“ کے الفاظ آئے ہیں۔ لہذا اس حدیث مذکور میں تنبیہ کے صیغے سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ اکل الثوم والبصل

”عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اکل من هذه قال اول مرة الثوم ثم قال الثوم والبصل والکراث فلا یقرینافی مساجدنا“۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اس سے کھایا پہلی مرتبہ فرمایا ”لہسن“ پھر فرمایا لہسن، پیاز اور گند نے میں سے تو وہ ہرگز ہماری مسجدوں میں ہمارے قریب نہ ہو۔

لغات: فقوله ”الثوم“ بضم ”ث“ ثاء ”لہسن“ فقوله ”البصل“ بوزن حجر و شجر پیاز۔ فقوله ”الکراث“ بوزن رمان گندنا۔ جس کے پتے پیاز اور لہسن کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں اور ہاضم اور بھوک بڑھانے والے

باب ماجاء فی کراہیۃ الأکل من وسط الطعام

۱۔ کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۸ ج: ۵ ”کتاب الاطعمہ“، مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۵۸ ج: ۵ ”کتاب الاطعمہ“

ہوتے ہیں۔

تشریح: الثوم وغیرہ کو مجرور پڑھا جائے گا پھر "فقال" قول "سرة الثوم" الخ یہ شک اور تردید راوی کی ہے جیسا کہ ابن حجر نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

جمہور علماء کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ یہ اشیاء بذات خود حلال ہیں مگر بدبو کی علت کی بنا پر یہ فرشتوں اور لوگوں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں اس لئے جو شخص ان کو کھالے یا اس طرح کی کوئی بدبودار شے استعمال کرے جیسے سگریٹ اور بدبو والی دوا وغیرہ تو جب تک بدبو کا ازالہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک مسجد میں آنا مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح ان اجتماعات میں بھی وہ شرکت نہ کرے جہاں لوگ جمع ہو جاتے ہیں خصوصاً عبادت کی غرض سے منعقد اجتماعات جیسے عید گاہیں اور جناز گاہیں وغیرہ۔ چونکہ محقق قول کے مطابق جماعت کی نماز واجب ہے اس لئے جماعت سے کچھ پہلے بھی ان اشیاء کا استعمال مکروہ ہے ہاں وقت زیادہ ہو یا اسے کھا کر کسی طرح بدبو کا ازالہ ہو سکتا ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

بہت سے حضرات نے غیر اختیاری بدبو کو بھی اس حکم میں شامل کر کے اسے مسجد میں جانے سے منع کیا ہے جیسے منہ کی بدبو، یا بدن پر کوئی ایسے پھنسیاں ہوں جو بدبودار ہوں یا وہ کوئی ایسا کام کرتا ہو جس سے اس کے کپڑے بدبودار بنتے ہوں جیسے جڑے اور پھلیوں سے بننے والے دانے کی فیکٹری میں کام کرنے والے وہ مزدور جن کو اس سے بچنا مشکل ہو۔

پھر جمہور کے نزدیک یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ تمام مساجد کو شامل ہے۔

اس کے برعکس عام ظاہر یہ ہے کہ نزدیک یہ اشیاء بذات خود حرام ہیں کیونکہ یہ نماز باجماعت سے مانع ہیں جو ان کے نزدیک فرض عین ہے چونکہ مقدمہ حرام، حرام ہوتا ہے اس لئے یہ اشیاء حرام ہی ہوں گی۔ نیز قاضی عیاضؒ نے بعض اہل علم سے نقل کیا ہے کہ یہ حکم صرف مسجد نبوی تک محدود ہے کیونکہ بعض روایات^۱ میں لفظ "مسجدنا" مفرد کے صیغے کے ساتھ آیا ہے پس یہ دو مسئلے اختلافی ہو گئے۔

پہلے مسئلے میں جمہور کے دلائل وہ روایات ہیں جو امام ترمذیؒ نے اگلے باب میں نقل کی ہیں۔ علاوہ

باب ماجاء فی کراهیۃ اکل الثوم والبصل

۱۔ کذا فی مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۱ ج: ۵ "کتاب الاطعمہ"، مجمع الزوائد ص: ۴۳ ج: ۵ "باب فی اکل الثوم والبصل" کتاب الاطعمہ.

ازیں ابوداؤدؒ کے کی متعدد روایات اور صحیحینؒ کی احادیث اس بارے میں صریح ہیں کہ یہ اشیاء حلال ہیں گوکہ ان پر خبیث کا اطلاق ہوا ہے مگر اس سے مراد حرمیت نہیں بلکہ ناگواری طبع کا موجب ہے۔ اور جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو جہور کہتے ہیں کہ ”مساجد“ کا لفظ جیسا کہ حدیث باب میں ہے یا ”فلا یقربن المساجد“ کا صیغہ جیسا کہ ابوداؤدؒ میں ہے مطلق مسجد پر ناطق ہے لہذا جن روایات میں لفظ ”مسجد“ مفرد کا صیغہ آیا ہے اس سے مراد جس مسجد لی جائے گی۔ اس پوری بحث کا خلاصہ بذل المجہود میں یوں بیان کیا گیا ہے:

”وهذا الحديث والاحادیث التي فی الباب تدل علی ان أكل البصل والكراث والشوم مطبوعاً كان أو غیر مطبوخ جائز وعلیه ان یقعدفی بیتہ ولا یحضر المسجد والجماعة حتی یذهب ریحہ وکذا من به یخرج متعفن یخرج منه رائحة وصاحب البحر والذفر والذی استعمل دواء کربهة الرائحة یؤذی الناس بریحہ لا یحوزلهم الخروج الی المسجد والشهود الی الجماعة۔“ (بذل المجہود ص ۳۶۳ ج ۵، کتاب الاطعمہ)

چونکہ اس نبیؐ کی علت ایذا رسانی ہے خواہ فرشتوں کی تکلیف کا باعث ہو یا انسانوں کی، اس لئے ان اوقات میں پیاز وغیرہ بدبودار اشیاء کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے، جن میں ایک یا دونوں فریقین کی مذاقات متوقع ہو، لہذا درس قرآن وحدیث یا ان کتب کے درس کے وقت جن میں فرشتوں کی آمد ہوتی ہیں۔ اسی طرح شادی شدہ شخص کے لئے رات کے کھانے کے وقت یا کوئی میٹنگ واجلاس وغیرہ متوقع ہو ان چیزوں کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ کرانا کاتبین اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ممکن ہے کہ اللہ نے ان کے لئے کوئی ایسا انتظام فرمایا ہو جو اس بدبو سے تکلیف نہ اٹھاتے ہوں، یہی حکم حفظ کا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ فرشتے اگرچہ کھاتے پیتے نہیں تاہم قوت شامہ ان کی انسانوں کی طرح ہے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ فرشتے

ع سنن ابی داؤد ص: ۴۹ و ۱۸۰ ج: ۲ ”باب فی النوم“ کتاب الاطعمہ، صحیح بخاری ص: ۱۸ ج: ۱ ”باب مساجد فی النوم والنی والبصل الخ“ کتاب الصلوٰۃ، ایضاً ص: ۸۲۰ ج: ۲ کتاب الاطعمہ، صحیح مسلم ص: ۲۰۹ ج: ۱ ”کتاب الصلوٰۃ“، ایضاً ص: ۱۸۳ ج: ۲ ”کتاب الاشریۃ“، صحیح کذا فی روایۃ ابن ماجہ ص: ۲۲۱ ابواب الاطعمہ، ایضاً مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۱ ج: ۵ کتاب الاطعمہ، ایضاً سنن ابی داؤد ص: ۴۹ ج: ۲ کتاب الاطعمہ

بسیط مخلوق نہیں بلکہ مرکب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے فرشتے یکساں نہیں۔ اگر کسی کو مزید تفصیل درکار ہو تو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حجت اللہ البانیؒ کی طرف مراجعت فرمائیں۔

باب ماجاء فی الرخصة فی أكل الثوم مطبوخاً

عن سماعك بن حوب سمع جابر بن سمرة يقول نزل رسول الله صلى الله عليه وسلم على ابي ايوب وكان اذا اكل طعاماً بعث اليه بفضله فبعث اليه يوماً بطعام ولم يأكل منه النبي صلى الله عليه وسلم فلما أتى ابا ايوب النبي صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له فقال النبي صلى الله عليه وسلم فيه الثوم فقال يا رسول الله أحرام هو؟ قال "لا" ولكني أكرهه من أجل ريحه۔

سماک بن حرب نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سنا ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (زمانہ ہجرت میں) ابویوبؓ کے یہاں تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانا تناول فرماتے تو اپنا بچا ہوا نبی (ابویوب) کے پاس بھیج دیتے چنانچہ ایک دن انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا پیش کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول نہیں فرمایا پھر جب حضرت ابویوبؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر نہ کھانے کے متعلق دریافت کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں لہسن تھا، اس پر ابویوبؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا لہسن حرام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں مگر میں اسے بو کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔

تشریح:۔ اس حدیث سے لہسن اور پیاز وغیرہ کی کراہیت کی وجہ معلوم ہوئی جو یہ ہے اس کی قدرے تفصیل سابقہ باب میں گذر چکی۔ دوسرا حکم یہ معلوم ہوا کہ ایسے آدمی کے لئے جس سے صاحب خانہ وغیرہ عقیدت رکھتے ہوں تبرک کی غرض سے کچھ کھانا پینا بچانا چاہئے۔ امام نوویؒ نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ اسی طرح اگر گھر والے مہمان کے سامنے ضرورت سے زیادہ کھانا پیش کرتے ہوں یا وہ لوگ خود ضرورت مند ہوں تو بھی بچانا چاہئے اگرچہ بچا ہوا تھوڑا ہی کیوں نہ ہو اور اس لئے بھی تاکہ گھروالوں کو اطمینان ہو جائے کہ مہمان نے پیٹ بھر کے کھالیا ہے۔

حدیث باب کا واقعہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی مقام قبا سے مختلف قبائل کے محلوں سے ہوتی ہوئی موجودہ مسجد نبوی کے دروازے پر آ کر بیٹھ گئی تھی اور حضرت ابویوب انصاریؓ نے پالان

اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ دیا تھا اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مہمان بن گئے تھے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ حضرت ابو ایوب خالد بن زیدؓ فرماتے ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچا ہوا کھانا واپس فرماتے تو جس مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پڑتا میں اور ام ایوب (الہیہ) اس مقام کو تلاش کرتے اور برکت حاصل کرنے کے لئے اسی مقام سے کھاتے۔ چنانچہ ایک رات ہم نے کھانے میں پیاز یا ہسن ڈالا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس فرمایا جس کا ذکر حدیث باب میں ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت امام ترمذیؒ نے حضرت ام ایوبؓ سے نقل فرمائی ہے بتاتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لائے تو انہوں نے یعنی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پُر تکلف کھانا تیار کیا جس میں بعض سبز سبز چیزیں یعنی بڑی بڑی تھیں (جیسے پیاز، لہسن یا گندنا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تناول فرمانا پسند نہیں کیا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا تم اسے کھا لو کیونکہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اپنے ساتھی (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کو تکلیف نہ پہنچاؤں۔^۱

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مذکورہ اشیاء حلال ہیں اور یہ کہ یہ حکم سب فرشتوں کی بابت نہیں ہے جیسا کہ سابقہ باب میں بیان ہوا۔ اس باب میں بھی ابو العالیہ کی روایت میں اسے حلال رزق کہا ہے۔ البتہ اگر ان چیزوں کو پکا لیا جائے جس سے ان کی بدبو زائل ہو جاتی ہے تو پھر ان کے کھانے میں کسی طرح کراہیت باقی نہیں رہتی جیسا کہ اسی باب میں حضرت علیؓ کی روایت میں اس کی تصریح ہے اور امام ترمذیؒ نے اسی مقدمہ کے لئے یہ باب باندھا ہے۔

باب ماجاء فی تخمیر الاناء و اطفاء السراج

و النار عند المنام

”عن جابر قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أَغْلِقُوا الْبَابَ وَ أَوْكُوا السَّقَاءَ وَ أَكْفِتُوا الْإِنَاءَ وَ اؤْخَرُوا الْإِنَاءَ وَ أَطْفِئُوا الْمَصْبَاحَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَفْتَحُ غُلْقًا وَلَا يَجْلُ وَ كَاءَ وَلَا يَكْشِفُ نَبِيَّةً فَإِنْ

باب ماجاء فی الرخصة فی أكل الثوم مطبوعاً

۱۔ کذا فی مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۰ ج: ۵ ”من یکوه أكل الثوم“ کتاب الاطعمہ، عن ام ایوب قالت نزل علینا النبی ﷺ فصنعنا له طعاماً فیه من بعض البقول فکروه فقال، انی لست مثکم انی اؤذی صاحبی، الحنفی عفی عنه

الفویسقة تُضرم علی الناس بیتهم۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دروازہ بند کیا کریں اور مشکیزہ کے منہ کو باندھ لیا کریں اور برتن کو الٹا رکھ دیا کریں یا برتن کو ڈھانپ دیا کریں اور چراغ بجھا دیا کریں (یعنی سوتے وقت) اس لئے کہ شیطان بند دروازے کو نہیں کھول سکتا اور نہ ہی مشکیزے کا منہ کھول سکتا ہے اور نہ ہی کسی برتن کو کھول (سیدھا کر) سکتا ہے اور اس لئے کہ چوہا لوگوں کے گھر جلا دیتا ہے۔

لغات :- فوله "اغلقوا" إغلاق سے امر کا صیغہ ہے غلق بندش کو کہتے ہیں۔ فوله "أو كؤا" الفتح الہمزہ وضم الكاف ایکاء سے ہے جو کوا یعنی ڈوری سے باندھنے کو کہتے ہیں۔ فوله "السقاء بکسر السین" مشکیزہ کو کہتے ہیں۔ فوله "كفئو" كفأ کے معنی الٹا کرنے کے ہیں پس یہ اکفأ سے امر کا صیغہ ہے یعنی اگر برتن خالی ہو تو اسے الٹا کر رکھ دو ورنہ اسے ڈھانپ لیا جائے جیسا کہ اگلے جملے میں ہے۔ فوله "أو ختروا" تخیر کے معنی ڈھانپنے کے ہیں چنانچہ شراب کو خمر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قتل کو نشے کے خلاف میں چھپا دیتی ہے۔ اسی طرح دوپٹے کو خمار یعنی ساتر کہتے ہیں۔

فوله "اطفئوا العصباح" مصباح بمعنی سراج اس چراغ کو کہتے ہیں جب وہ روشن ہو یعنی جل رہا ہو "اطفئوا" الفتح الہمزہ وکسر الفاء وضم الہمزہ الثانیۃ بعد الفاء اطفاء سے امر کا صیغہ ہے آگ یا چراغ اور بتی وغیرہ بجھانے کو کہا جاتا ہے۔ فوله "غلغفا" بضم التین مغلغل یعنی بند شدہ کے معنی میں ہے۔ فوله "لا یحل" بضم الحاء حل العقدہ گرہ کھولنے کو کہتے ہیں۔ کوب میں ہے کہ یہ حلول سے بھی ہو سکتا ہے۔ اول خلاف العقدہ بھی یعنی کھولنے کے معنی میں۔ بہتر یہ ہے کہ اسے حلول سے مانا جائے۔ فوله "و کاء بکسر الواو" ڈوری کو کہتے ہیں۔

فوله "الفویسقة" بضم الفاء فاسقة کی تصغیر ہے فسق سے ہے جو خروج من شئی الی شئی کو کہتے ہیں خصوصاً شے مذمومہ کی جانب نکلنے کو کہا جاتا ہے۔ چوہا کو فویسقہ اس لئے کہا کہ یہ اپنے بل سے نکلتا ہے اور عموماً نقصان ہی کرتا ہے۔ فوله "تضرم" بضم التاء وسكون الضاد وکسر الراء "ضرم" کے معنی آگ بھڑکنے کے ہیں یعنی چوہا لوگوں کے گھروں کو خوب جلا دیتا ہے۔

تشریح :- امام ترمذیؒ نے ترجمۃ الباب میں "عند المنام" قید کا اضافہ کر دیا ہے جس سے وہ ایک طرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ احتیاطی تدابیر رات کو سونے سے قبل اختیار کر لینی چاہئے کہ یہ مصلحتیں رات کو ملحوظ رہتی ہیں۔ دوسری جانب یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ احکام اگرچہ ترمذی کی پہلی روایت میں مطلق ہیں لیکن مسلم

وغیرہ^۱ کی اور ترمذی کی دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے۔ اور امام نووی نے بھی اپنی تبویب میں ”عند النوم“ کی قید کا اضافہ کیا ہے، اس لئے سرشام کے وقت بچوں کو باہر جانے سے روکنا چاہئے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دن کو ان آداب کی پابندی میں حرج ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بقول ابن العربی شیطان اگر چہ ناری ہے مگر اس کا دل سیاہ ہے جبکہ انسان اصلاً خاکی ہے لیکن اس کا دل نور ایمان سے منور رہتا ہے اس لئے شیاطین اندھیرے کو پسند کرتے ہیں اور انسان روشنی کو ”و کمل جنس بمیل الی حسنہ وما یستریح بہ“۔ اس لئے وہ اندھیرے کی آڑ میں چیزیں بگاڑتا ہے۔ نیز دن کو انسانی آنکھ کھلی رہتی ہے وہ اسباب کی حد تک اپنی اشیاء کی حفاظت کرتی ہے جبکہ رات کو وہ بند ہو جاتی ہے تو شیاطین کھل جاتے ہیں۔ مسلم^۲ کی روایات میں تسبیح کا بھی ذکر ہے لہذا ان امور کی انجام دہی کے وقت بسم اللہ بھی پڑھ لے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ صرف بسم اللہ ہی اس مقصد کے لئے نثا کافی تھی مگر عالم اسباب کے ضابطے کے مطابق تسبیح کے ساتھ یہ تدابیر بھی ملتا دیں، اور یہ کہ ان اشیاء میں تاثیر اللہ کے نام سے ہے۔ مسلم^۳ کی ایک روایت میں ہے کہ سال میں ایک رات ایسی ہے جس میں وہاں نازل ہوتی ہے وہ جس کھلے برتن یا مشکیزے سے گذرتی ہے تو اسی میں پڑ جاتی ہے۔ امام لیث بن سعد^۴ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں اجماع یہ ہے کہ یہ رات کا نون اول میں آتی ہے ”کانون رومی سال کا تیسرا مہینہ ہے“۔ ہمارے حساب سے یہ دسمبر کی چھ تاریخ یا تیرہ تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔

پھر برتن ڈھانکنے کے لئے کوئی دوسرا برتن نہ ہو جو اس پر رکھ دیا جائے تو دوسری روایت کے مطابق کم از کم ایک لکڑی ہی اس کی چوڑائی میں اوپر رکھ دیں۔ چراغ اور آگ بجھانے کی حکمت یہ ہے کہ کبھی رات کو چوہا کوئی بٹی، کپڑا یا گھاس وغیرہ لاتا ہو وہاں سے گذرتا ہے یا شیاطین کے اُکسانے پر لاتا ہے جس سے آگ لگ جاتی ہے۔ ہم بچپن میں بھینسوں کے بازوے میں سردی سے بچنے کے لئے رات آنے سے پہلے آگ جلاتے اور پھر بجھانے کے لئے اس پر پانی پھیرتے۔ کیونکہ ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ کوئی چنگاری

باب ما جاء فی تخمیر الاناء و اطفاء المسراج و النار عند المنام

۱۔ صحیح مسلم ص: ۱۷۰ ج: ۲ ”باب استحباب تخمیر الاناء الخ“ کتاب الاشریۃ، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۶۷ ”باب

اطفاء النار عند المیت“ کتاب الآداب، ایضاً ابی داؤد ص: ۳۶۵ ج: ۲ کتاب الآداب۔

۲۔ صحیح مسلم ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب الاشریۃ۔ ۳۔ حوالہ بالا۔

جو بے احتیاطی میں رہ جاتی ہے پورے بارے کو جلا دیتی ہے۔

بعض لوگ مجھروں سے بچنے کے لئے مجھرتی جلاتے ہیں ان کو بھی اس بارے میں احتیاط کر لینا چاہئے کہ وہ کپڑوں کے آس پاس نہ رکھیں۔

غرض پورا اطمینان کر کے سو جانا چاہئے۔ بعض لوگ تفریح وغیرہ پر جاتے ہوئے گھر کا دروازہ تو بند کر لیتے ہیں لیکن مین سوچ بجلی کا بند نہیں کرتے جس سے کئی واقعات آگ لگنے کے رونما ہوتے ہیں۔ عام بلب میں یہ اندیشہ چونکہ نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ دیوار یا چھت پر لگا رہتا ہے اس لئے اگر زیر وراث کا بلب وغیرہ رات کو جلتا رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں دیہاتوں میں لوگ لائٹیں جلاتے ہیں اس کی آگ شیشے میں بند ہونے کی وجہ سے محفوظ ہوتی ہے اُسے جلانے رکھنے میں بھی حرج نہیں۔ تاہم جولا لائٹیں خراب ہو اور وقتاً فوقتاً اس کی آگ بھڑکتی رہتی ہو تو اس میں احتیاط ضروری ہے۔

قولہ "فان الشیطان الخ" یہ تعلیمات ہیں بطور لفظی شرم رب کے۔ اور "فان القویسقة" سے مزید تاکید کے لئے اسلوب کلام تبدیل فرمایا کیونکہ آگ کا انجام بہت ہی خطرناک ہے۔

بہشتی زیور کے دسویں حصے میں لکھا ہے کہ "جب برتن خالی ہو جائے تو اس کو ہمیشہ دھو کر الٹا رکھو اور جب دوبارہ اس کو برتنا چاہو تو پھر اس کو دھو لو"۔ بہشتی زیور میں آداب کا کافی ذخیرہ موجود ہے اس لئے ہر شخص کو اس کا پڑھنا نہایت لازمی ہے۔ آج کل شوکیس کے استعمال کا رواج عام ہو گیا ہے چونکہ برتن شیشے کے اندر محفوظ ہوتے ہیں اس لئے اگر سیدھے بھی رکھ لئے جائیں تو کافی ہے گوکہ اس میں بھی ادب کا ظاہری تقاضا الٹا رکھنا ہی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی کراہیۃ القرآن بین التمرین

"عن ابن عمر قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقرن بین التمرین حتی

یسناذن صاحبه۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بھجوروں کو ملا کر کھانے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ اپنے ساتھی سے اس کی اجازت لے لے۔

لغات: بقولہ "ان یقرن" قرآن بکسر القاف سے مشتق ہے جس کے معنی ملانے کے ہیں چنانچہ

قرآن وہ نمک ہے جس میں عمرہ اور حج کو ایک ہی سفر اور احرام میں ملا کر ادا کر لیا جائے۔

تشریح:۔ مسلمؑ اور ابوداؤدؑ وغیرہما میں بالترتیب "حتی یستأذن اصحابہ" اور "الا ان تستأذن اصحابک" کے الفاظ ہیں۔ پھر بذیل المجموع ج ۵ ص ۳۶۵ پر بحوالہ مجمع نقل کیا ہے کہ "الا ان تستأذن" النخ بن عمرؓ پر موقوف ہے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث صرف ابن عمرؓ ہی سے مروی ہے کہ جب وہ قحط والے سال کچھ لوگوں کے پاس سے گذر رہے تھے اور ابن الزبیرؓ ان کو کھلا رہے تھے تو ابن عمرؓ نے فرمایا:

"لانتقارنوا فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الاقتران، ثم یقول: الا ان تستأذن الرجل اخاه۔"

اس ارشاد پاک سے معلوم ہوا کہ کھجور اور اس طرح اور اشیاء جیسے انگور وغیرہ کو جب مشترک طور پر کھایا جا رہا ہو تو دو۔ دو دانے اٹھا کر نہیں کھانا چاہئے کیونکہ اس میں یا تو دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے یا کم از کم آداب مجلس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

پھر اس نمی کی حیثیت کیا ہے؟ تو قاضی عیاضؒ نے اہل الظاہر سے تحریم نقل کی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے جیسا کہ امام نوویؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ یہ حالات پر منحصر ہے اگر کھجور وغیرہ مشترک ہے اور اس کے ساتھ قلیل بھی ہے تو پھر قرآن حرام ہے کیونکہ اس طرح جو بے حیا اور بے شرم ہو گا وہ جلدی جلدی کھا کر پیٹ بھر لے گا اور با حیا شرم کے مارے بھوکے رہ جائیں گے۔ اور کبھی سفر وغیرہ میں متبادل انتظام بھی نہیں ہو سکتا خصوصاً غربت کے شکار لوگ تو اس چیز کو بہت محسوس کرتے ہیں البتہ اگر ملکیت کسی ایک کی ہے، اور وہ خود شریک بن کر نہیں کھاتا بلکہ مہمانوں یا فقراء کو کھلا رہا ہے اور ان کو اجازت دیدی کہ جیسا کھانا چاہو اور جتنا کھا سکو کھالو۔ یا خود بھی شریک ہے مگر ان کو اجازت دیدی۔ یا سب شرکاء نے صراحتاً یا دلائل طے کر لیا کہ جو جیسا کھانا چاہے یا ان کو جلدی فارغ ہونا مطلوب تھا۔ یا کھانا صرف تلمذ کے لئے تھا تو ان صورتوں میں قرآن جائز ہے۔ اسی طرح اگر مالک

باب ماجاء فی کراهیة الاقتران بین التمرین

۱۔ صحیح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۲ کتاب الاشریة، ج: سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ "باب الاقتران فی التمر عند الاکل" کتاب الاطعمہ ولفظہ: نہی رسول اللہ ﷺ عن الاقتران الا ان تستأذن اصحابک، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۹ کتاب الادب، ایضاً مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۲ ج: ۵ کتاب الاطعمہ، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۳۶ ج: ۵ "باب الاقتران فی التمر" کتاب الاطعمہ

طعام خود قرآن کرنا چاہے تو بھی جائز ہے تاہم آداب مجلس کے خلاف ہے۔ بہتر یہ ہے کہ دو یا خود ایک ایک اٹھالے یا سب کو اختیار دیدے۔

بہر حال کوئی بھی کھانا جو دو یا دو سے زیادہ آدمی مل کر مشترکہ طور پر کھائیں تو یہ اگرچہ اس بات کی اجازت ہے کہ جس نے جتنا کھایا وہ اس کے لئے مباح ہے، تو یقیناً کوئی کم کھائے گا اور کوئی زیادہ کوئی بھی نوالے نہیں گنتا۔ تاہم ان تمام صورتوں میں عرف و عادت کا لحاظ رکھنا لازمی ہے، اور عرف کے مطابق مہذب لوگ اپنے ساتھیوں کا خیال رکھنا ضروری سمجھتے ہیں وہ ایثار پر تو خوش ہوتے ہیں مگر دوسروں کا حق ضائع کرنا گوارا نہیں کرتے۔

جدید تحقیق کے مطابق دنیا میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو دوسروں کو کھلانے سے اتنی خوشی محسوس کرتے ہیں جو خود کھانے سے زیادہ ہوتی ہے اور تجربہ بھی اس پر شاہد ہے۔ گوکہ آج کل بخل کا دور دورہ ہے جو علامات قیامت میں سے ایک ہے۔

باب ماجاء فی استحباب التمر

”عن عائشة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: بیت لا تعرفہ جیاع اہلہ۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس گھر میں کھجور نہیں

وہ اہل خانہ بھوکے ہیں۔

تشریح:- جیاع جالع کی جمع ہے۔ یہ ارشاد اہل مدینہ کے لئے ہے کیونکہ ان کی اکثر غذا کھجور ہی تھی لہذا جہاں لوگوں کی غذا کچھ اور چیزیں ہوں ان کو وہی اشیاء گھروں میں رکھنا چاہئے۔ تاہم کھجور کی شان جداگانہ ہے کہ اسے ہر وقت کھایا جاسکتا ہے، نہ پکانے کی زحمت اس میں ہے اور نہ ہی سڑ جانے کا اندیشہ پایا جاتا ہے اور سفر پر جاتے وقت بھی اپنے ہمراہ لے جائی جاسکتی ہے۔ بہر حال اس حدیث سے دو باتیں نمایاں طور پر ثابت ہوئیں ایک یہ کہ سال بھر کے لئے کھانے کا انتظام زہد اور توکل کے خلاف نہیں، کیونکہ کھجور کی فصل تو سال میں ایک دفعہ آتی ہے، جس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آئندہ فصل کی آمد تک اس کی ذخیرہ اندوزی جائز ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ گھر میں معمولی غذا بھی کافی ہے، زیادہ ٹم ٹم کے پیچھے بھاگنے اور اسے گھر میں ہر وقت رکھنے کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ جس کے گھر میں کھجوریں ہیں وہ لوگ بھوکے شام نہیں ہوتے۔ لہذا اس حدیث

سے زہد کی ترغیب بھی معلوم ہوتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں مواسات کی ترغیب ہو کہ مدینہ منورہ چونکہ دارالہجرت تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ لوگ نو آمدہ مہاجرین کی مدد جاری رکھیں اس کے لئے ضروری تھا کہ گھروں میں اس کا انتظام موجود ہو، کیونکہ جب گھر کھجور سے خالی ہوں گے تو وہ لوگ مسافروں اور مہاجرین کی کیا خبر گیری کریں گے۔ علی ہذا ہر علاقے والے کے لئے اس نیت سے گھر میں ہر وقت دستور کے مطابق انتظام کر لینا چاہئے کہ اگر اچانک مہمان آجائیں تو ان کا اکرام و تواضع ہو سکے۔

باب ماجاء فی الحمد علی الطعام اذا فرغ منه

”عن انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اللہ لیرضی عن العبدان یا کل الاکلة او یشرب الشرية فیحمدہ علیہا“۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ اس بندے سے راضی ہوتے ہیں جو کوئی لقمہ کھائے یا کوئی گھونٹ پانی کا پیے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔

لغات:۔ قولہ ”الاکلة“ یہ اور ”الشرية“ فاء کلمہ کے فتح کے ساتھ یعنی اول میں ہمزہ مفتوح اور دوم میں شین مفتوح ہے مرۃ کے معنی میں آتے ہیں کیونکہ فعلہ بالفتح مرۃ کے لئے آتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”اکلة“ میں ہمزہ مضموم ہو پھر نوالہ اور لقمہ کے معنی میں ہو جائے گا۔ قولہ ”علیہا“ یعنی اکلة و شرية کے ہر ایک پر۔

تشریح:۔ اس پر اتفاق ہے کہ کھانے پینے کے بعد حمد مستحب ہے۔ تاہم اس کے الفاظ مختلف ہیں جن میں سے بعض امام ترمذی نے شامل ترمذی ”باب ماجاء فی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل الطعام وبعدهما یفرغ منه“ میں نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے الفاظ مروی ہیں۔ لے حمد کی اقل مقدار ”الحمد للہ“ ہے۔ شاید یہ اختلاف الفاظ مختلف احوال کی وجہ سے ہو کہ کھانا پھنا اچھا ہوا اللہ کی حمد اتنی زیادہ ہونی چاہئے۔ فقیہ ابواللیث سمرقندی نے ”حنبیہ الفالین“ میں ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جس کھانے میں چار

باب ماجاء فی الحمد علی الطعام اذا فرغ منه

۱۔ راجع مجمع الزوائد ص: ۲۰ ج: ”باب ما یقول بعد الطعام“ کتاب الاطعمہ، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۱۰۶ ج: ۳ ”الترغیب فی حمد اللہ تعالیٰ بعد الاکل“۔

باتیں ہوں وہ بہت عمدہ کھانا ہے (۱) حلال ہو (۲) شروع میں اللہ کا نام لیا گیا ہو (۳) کھانے والے زیادہ ہوں (۴) فارغ ہونے پر اللہ کی تعریف کی گئی ہو۔

تفسیر خازن میں سورہ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام سے گفتگو کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان فرشتوں سے پوچھا آپ کیوں نہیں کھاتے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ہم بغیر قیمت اور انہیں کئے کھاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی قیمت تو ہے انہوں نے کہا کہ کیا قیمت ہے فرمایا: ”تذکرون اسم اللہ علی اولہ ونحمدونہ علی آخرہ“ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا: ”حق لہذا ان یتخذہ ربہ خلیلاً“۔

ابن السنی المتوفی ۳۶۳ھ حج نے عمل الیوم والملیلہ (ص ۴۱۵) میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث ذکر فرمائی ہے۔

”قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اکل طعاماً قال: الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین“۔

یہ روایت ابوداؤدؒ و ترمذیؒ میں بھی ہے۔

ملا علی قاریؒ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ کھانے کے بعد حمد کرنا بطور شکر بھی ہے اور طلبِ یادۃ بھی کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: ”لئن شکرتم لازیدنکم“ ^۱ لآیۃ ^۲ اور چونکہ کھانا کھانے سے خجید نعمت ہوتی ہے اس لئے تجددِ حمد بھی ہونی چاہئے، اور ساتھ اس کے بڑے اثرات سے استعاذہ و پناہ بھی ہے۔ پھر اس دعاء میں اہتمامِ شان اور مقتضائے حال کی وجہ سے حمد کو مقدم کیا۔ اور پانی کی ضرورت تو کھانے کی وجہ سے پیش آتی ہے اس لئے اس کے بعد ”وسقانا“ ذکر فرمایا۔ اور پھر نعمتِ ظاہری سے نعمتِ باطنی کی جانب انتقال فرما کر ”وجعلنا مسلمین“ فرمایا۔ (کذا فی المرقاۃ) بہر حال یہ دعا کھانے کے بعد ہے۔ اور جب دسترخوان اٹھالیا جائے تو یہ پڑھے ”الحمد للہ کثیراً طیباً مبارکاً فیہ غیر مکفیۃ و لا مودع ولا مستغنیٰ عنہ ربنا“ (کذا فی ابی داؤد، ^۳ باب ما یقول اذا اطعم من حدیث ابی امامۃ قال کان رسول اللہ

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۳ ج: ۲ ”باب ما یقول اذا اطعم“ کتاب الاطعمۃ، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۶ ”باب ما یقول اذا فرغ من الطعام“ ابواب الاطعمۃ۔ ۲۔ سورۃ قہریم آیت: ۴۔ ج: ۱ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۲ ج: ۲ مکتبہ حقانیہ مضاف۔

صلی اللہ علیہ وسلم اذا رفعت المائدة الخ)۔

باب ماجاء فی الأكل مع المجذوم

”عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخذ بيد مجزوم فادخله معه فی القصعة ثم قال کُل بسم اللہ ثقة باللہ ونوکلہ علیہ۔“

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کوڑھی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ پیالہ میں داخل کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ اللہ کا نام لیکر، اللہ پر بھروسہ اور اسی پر اعتماد کرتے ہوئے۔

لغات:- قولہ ”مجزوم“ ای صاحب جذام، جذام ایک مشہور بیماری ہے اردو میں اسے کوڑھ کہا جاتا ہے علی ہذا مجذوم کو کوڑھی کہیں گے۔ قولہ ”القصعة“ اس کے بارے میں پہلے گزرا ہے یعنی وہ طباق جس میں دس آدمیوں کا کھانا آ سکتا ہے۔ قولہ ”ثقة“ مصدر ہے بمعنی الوثوق پھر یہ مفعول مطلق ہے فعل مذکور کا یعنی ”کُل ثقة باللہ“۔ اسی طرح تو کُل بھی کُل ہے مفعول مطلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ عموماً کوڑھی اس عار سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی بیماری دوسروں کو لگ جائے تو لوگ ملامت کریں گے، اور کبھی وہ ان لوگوں کی اذیت سے بھی ڈرتا ہے جن کو وہ چاہتا ہے، جیسے بیوی بچے تو ان کے ساتھ بھی نہیں کھاتا یہاں تو حضور محبوب علیہ السلام تھے اس لئے وہ آدمی جھجک محسوس کر رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرما کر اس کو تسلی دیدی کہ نہ تو آپ کو عار لاحق ہوگا اور نہ ہی ندامت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا عامل مقدر ہو اور وہ واحد متکلم کا صیغہ ہو ای کسل معی ائیک ثقة باللہ واتوکلہ علیہ۔“

تشریح:- جذام کیا ہے؟ قرون وسطیٰ میں یعنی پانچویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی تک جذام سے پوری دنیا میں ڈرموجود تھا لوگ کوڑھی کو مردہ قرار دے کر اسے علامتی جنازے اور تدفین کے بعد شہر بدر کرتے۔ بعض علاقوں کے لوگ تو ملک بدری کے وقت اس کے گلے میں تھنی باندھ دیا کرتے، تاکہ اس کے آنے پر دوسروں کو پتہ چل کر بھاگنے کا موقع مل سکے۔ اگر وہ کسی غار میں رہائش پذیر ہو جاتا تو بعض خدا ترس لوگ اس کے کھانے کا انتظام یوں کرتے کہ کھانا لے جا کر اس سے دور رکھ کر اس کو آواز دیتے کہ آؤ کھانا لے جاؤ اور خود اس جگہ سے ہٹ جاتے۔ یہ بیماری آج کی طرح پوری دنیا میں پائی جاتی تھی، تاہم بنیادی طور پر یہ گرم اور مرطوب علاقوں کا مرض ہے پچانوے (۹۵) فیصد کوڑھی دنیا کے صرف گیارہ ممالک میں پائے جاتے ہیں

جیسے ہندوستان اور برازیل وغیرہ۔ اس بیماری کے ازالہ کے لئے علاج کے پروگراموں کی بدولت اس کی شرح میں کافی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۵ء میں جذام کے رجسٹر مریضوں کی تعداد دنیا بھر میں ۵۴ لاکھ تھی اور تخمیناً یہ تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

یہ بیماری ایک بیکٹیریا کی وجہ سے ہوتی ہے بیکٹیریاں عام جراثیم سے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ یہ بجائے گرم حصہ کے نسبتاً ٹھنڈے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں مثلاً جلد، ناک اور منہ وغیرہ، جذام کی ایک قسم تو معمولی نوعیت کی ہے مگر دوسری قسم بہت خطرناک ہے، جذام کے جراثیم بدن میں داخل ہونے کے بعد دس سے سال تک جذام ہو سکتا ہے، اس سے جسم کے ٹھنڈے حصوں پر زخم آنا شروع ہو جاتے ہیں اور گہرے ہوتے ہوتے متاثرہ جگہ کو تقریباً ختم کر دیتے ہیں خصوصاً ناک تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور آدی شیر جیسی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مریض کی ناک کی رطوبت میں موجود بیکٹیریا، پھیپھنک یا کھانسی میں خارج ہو جاتے ہیں، اور قریبی فضا میں تحلیل ہو کر دوسرے آدمی کے سانس کے ساتھ بدن میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے جذام کا حملہ ہو سکتا ہے، خصوصاً زخم یا خراش کے راستہ سے داخل ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔ تاہم سائنسدان اس کے پھیلاؤ کے اسباب جاننے میں ابھی تک سرگرداں ہیں کیونکہ جو لوگ جذامیوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں، ان میں کم ہی شاذ و نادر اگر کوئی کیس ایسا ہوا ہو کہ ڈاکٹر یا کوئی ملازم اس بیماری کا شکار ہوا ہو لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے سائنسدان کہتے ہیں کہ اس کے متعدی ہونے کا امکان صرف پانچ فیصد ہے، اور اسباب کی لاعلمی ہی کی وجہ سے اس بیماری کے مکمل خاتمے کی تدبیر ابھی تک کامیابی سے ہمسکار نہ ہو سکیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ ۹۵ فیصد سے زیادہ لوگوں میں خود کار مدافعتی نظام حملہ آور بیکٹیریا کو ہلاک کر دیتا ہے۔ (مائیکروسوفٹ انسائیکلو پیڈیا)

اس تحقیق و تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جذام عام وبائی امراض کی طرح متعدی بیماری نہیں ہے۔ اور حدیث باب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک اور حدیث میں کوڑھی سے بچنے کا صاف حکم آیا ہے ”فر من المجلوم فرارک من الاسد“^۱ اور مسلم شریف کی روایت میں

باب ماجاء فی الاکل مع المجلوم

۱۔ رواہ البخاری ص: ۸۵۰ ج: ۲ "باب الجلام" کتاب الطب واللفظ: فر من المجلوم کما تفر من الاسد۔ ایضاً أخرجه بلغظه ابن ابی شیبہ فی مصنفہ ص: ۵۲۸ ج: ۵ کتاب الاطعمہ، ایضاً أخرجه احمد فی مسنده کذا فی معجم المفہرس ص: ۳۳۰ ج: ۱، ایضاً أخرجه عبدالرزاق فی مصنفہ ص: ۲۳ ج: ۱۰ حدیث: ۲۳۳۵۔

ہے کہ بنو ثقیف کے وفد میں ایک جذامی شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیج کر راستہ سے واپسی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: "ان قد بايعناك فارجع"۔^۱ اور یہ تو بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کو حل کرنے کے لئے غناء نے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ جن میں سے سب سے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعدی بیماری سے اسباب کی حد تک بچنا چاہئے لیکن اگر بیماری لگ جائے تو اس اختلاط اور مرض کی تعدی کو مؤثر حقیقی اور واجب قرار دینا عقیدہ توحید کے منافی ہے۔ چونکہ لوگوں میں عام تاثر یہی پایا جاتا تھا کہ ایسے مریض سے اختلاط کی بناء پر لامحالہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاثر کو غلط ثابت کرنے کے لئے صاحب جذام کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تاکہ اس عقیدہ کو باطل قرار دیدیں، جہاں تک اسباب کی حد تک متعدی ہونے کا تعلق ہے تو اپنی جگہ صحیح ہے، یعنی جیسے عام اسباب اپنے درجے میں کچھ تاثر رکھتے ہیں۔ اسی طرح وبائی امراض کا حال بھی ہے۔ لہذا باب کی حدیث اسی طرح "لا طيرة ولا عدوی" الحدیث نفی عقیدہ باطلہ کے لئے ہے اور "فر من المحدث من فرار من الاسد" وغیرہ احادیث درجہ اسباب میں احتیاط کے طور پر تعلیم پڑتی ہے۔

قوله "هذا حديث غريب" اس حدیث کی تخریج ابو داؤد رحمہ اللہ، ابن ماجہ رحمہ اللہ، ابن حبان اور حاکم نے بھی کی ہے۔ قوله "والمفضل بن فضالة شيخ آخر مصري" امام ترمذی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "مفضل بن فضالة" نام کے دو راوی ہیں ایک سے باب کی حدیث مروی ہے یہ بھری ہیں جو ضعیف من السابغ ہیں۔ جبکہ دوسرے مصری ہیں وہ ثقہ ہیں گو کہ ابن سعد نے ان کو بھی ضعیف کہا ہے مگر یہ ان کا سہو ہے وہ ثامہ میں سے ہیں۔ قوله "وروى شعبة هذا الحديث" الخ یعنی شعبہ کی روایت میں یہ واقعہ حضرت عمرؓ کا ذکر کیا ہے تاہم یہ منقطع ہے مگر امام ترمذی فرماتے ہیں: "وحدیث شعبة اثبت عندی واصح" اس واقعہ میں مجزوم کا نام حضرت معقیب ہے۔

۱ صحیح مسلم ص: ۲۳۳ ج: ۲ "باب اجتناب المجلوم" کتاب السلام، ابناً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۵۳ ابواب الطب.
 ۲ سنن ابی داؤد ص: ۱۹۱ ج: ۲ "باب فی الطيرة والخيط" آخر کتاب الطب. مع سنن لسانی ص: ۱۸۳ ج: ۲ "بعض من به عاهة" کتاب البهجة. ۳ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۳ "باب الجذام" ابواب الطب. ۴ ابناً رواہ ابن ابی شیبہ فی مصنفه ص: ۵۶۸ ج: ۵ "الأكل مع المجلوم" کتاب الاطعمة

باب ماجاء أن المؤمن يأكل في معي واحد

”عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الكافر يأكل في سبعة أمعاء والمؤمن يأكل في معي واحد“۔ (حسن صحيح) ^۱

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کافر سات کھانوں میں کھاتا ہے اور مؤمن ایک کھانوں میں کھاتا ہے۔

لغات:۔ قولہ ”أمعاء“ فتح البزہ معنی کی جمع ہے معی بکسر المیم بروزن الی یعنی الف مقصورہ کے ساتھ بھی ہے اور یاء تنوین بھی جائز ہے۔ جبکہ دوسری قرأت اس میں میم مفتوحہ والف مدودہ کی ہے۔ اسے آنت بھی کہتے ہیں اور انتوی بھی۔

تشریح:۔ اس حدیث پاک کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں علماء و شارحین کے اقوال دس سے متجاوز ہیں، جن میں سے سات تو ترمذی کے حاشیہ پر بھی مذکور ہیں جو باسانی دیکھے جاسکتے ہیں اس لئے ان کو یہاں نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، امام ترمذی کا اشارہ خاص واقعہ کی طرف ہے۔ ان تمام توجیہات میں ہمارے نزدیک سب سے عمدہ توجیہ یہ ہے کہ اس میں تمثیل اور مجازی معنی مراد ہے اور سات کا عدد حقیقی معنی پر محمول نہیں بلکہ مبالغہ پر حمل ہے جیسے اس آیت میں ہے ”والبحر معده من بعده سبعة ابحر“ ^۲ کے پس مطلب یہ ہوا کہ کافر اتنا زیادہ کھاتا ہے گویا وہ سات یعنی بہت ساری کھانوں کو بھرتا ہے، یہ حکم اگرچہ بظاہر عام نہیں ہے کیونکہ بعض مؤمن کافر سے زیادہ کھاتا ہے، تاہم مؤمن اور کافر کے مقاصد میں فرق ہے کافر کا مقصد خواہش کی پیروی ہے جبکہ مؤمن کا مطلوب رضائے ربانی اور اس کے لئے عبادت پر تقویت حاصل کرنا ہے، اس لئے کافر کی کوشش پیٹ بھر کر کھانا ہوتا ہے جبکہ مؤمن کی کوشش کمر سیدھی رکھنا، تاہم اس کو ایک اور تنقید کی ضرورت ہوگی یعنی کامل مؤمن کی شان یہ ہوتی ہے کیونکہ عام مؤمن بھی اپنا اصلی مقصد سو فیصد ملحوظ نہیں رکھتا۔ البتہ اس مطلب میں

باب ماجاء أن المؤمن يأكل في معي واحد

۱۔ الحدیث أخرجه عبد الرزاق في مصنفه ص: ۳۳ ج: ۱۰ حدیث: ۴۳۷۶، ابضا سنن ابن ماجه ص: ۲۳۳ ابواب

الاطعمه۔ ابضا مصنفه ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۹ ج: ۵ کتاب الاطعمه، ابضا مسند احمد بن حنبل ص: ۶۱۱ ج: ۲

حدیث ۵۳-۸۰ دار احیاء التراث العربی بیروت۔ ۲۔ سورة لقمن آیت: ۲۷۔

عوارض کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ کبھی کا فر ریاضت اور بیماری کی وجہ سے کم کھاتا ہے اور مؤمن معدے کی قوت یا مرض کی بنا پر زیادہ کھاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب "عرف الشذی میں فرماتے ہیں کہ یہ خبر بمعنی انشاء کے ہے، یعنی مؤمن کو مناسب یہ ہے کہ وہ کم کھائے، یہ ترغیب اگرچہ عام ہی ہے تاہم وقت اور حالات کے پیش نظر اس کا تقاضا متفاوت سمجھنا چاہئے۔ ہجرت کے زمانہ میں مہاجرین کو جس بھوک اور افلاس کا سامنا تھا اس کے بموجب مقامی لوگوں کو کم کھانے کی بارہا ترغیب دی جاتی جیسا کہ اگلے باب میں بھی ہے۔ اس کا نقد فائدہ یہ ہوتا تھا کہ نو وارد مہمانان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انتظام آسان ہو جاتا۔ اسی علت کے پیش نظر حضرت عمر کا قول بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ابن العربی نے عارضہ میں نقل کیا ہے "وقد هم عمر فی سنة المجاعة ان یجعل مع اهل کل بیت مثلهم" یعنی افلاس اور قحط والے سال حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ جس گھر میں جتنے افراد ہیں ان کے ساتھ اتنے ہی محتاجین شامل طعام کر لیں۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور زیادہ کھانے سے دینی فائدہ ہو تو پھر بجائے کم کھانے کے زیادہ کھانا افضل ہوگا کیونکہ مؤمن کی غرض اصلی تو دینی فائدہ ملحوظ ہونا چاہئے۔

چنانچہ ابن الجوزیؒ اپنی کتاب "صید الخاطر" میں لکھتے ہیں:

"وقد قال احمد بن حنبل: اكره التغلل من الطعام فان افوا ما فعلوه فمعجزوا عن الفرائض وهذا صحيح فان المتغلل لا يزال يتغلل الى ان يعجز عن النوافل ثم الفرائض ثم يعجز عن مباشرة اهله واعفائهم وعن بذل القوى في الكسب لهم وعن فعل خير قد كان يفعله ولا يهولنك ما سمعته من الاحاديث التي تحت على الجوع فان المراد بهما الاحت على الصوم واما انهي عن مقاومة الشبع فاما تنقيص المطعم على اللوام فمؤثر في القوى فلا يجوز"۔ (صید الخاطر ص: ۲۲۰ دار الفکر)

مطلب یہ ہے کہ دینی فائدہ کے درپے رہنا چاہئے خواہ وہ کم کھانے میں ہو یا زیادہ میں ایسے کھانوں اور طاقت کی ادویات کا بھی یہی حکم ہے، کہ اگر ان کے استعمال سے نیکی کمانے کا ارادہ ہو تو وہ عبادت میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر غلط ارادہ اس کا باعث ہو تو وہ گناہ کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں، گویا نیت اور غرض ہی وہ چیزیں ہیں جو مباحات کو عبادات میں بھی تبدیل کر سکتی ہیں اور معصیت میں بھی۔ ہاں فوق الشیخ بقصد شہوت حرام ہے۔ یعنی اتنا کھانا کہ اس سے نقصان ہو (کمائی الدر المختار، کتاب الطہر والاباحۃ)

الاشباہ میں ہے "الاكل فوق الشبع حرام بقصد الشهوة وان قصد به التقوى على الصوم او مواكلة الضيف فمستحب"۔ (الاشباہ والنظائر ص: ۳۳ قدیمی کتب خانہ)

لہذا نہ کم کھانا مطلقاً محمود ہے اور نہ ہی زیادہ کھانا علی الاطلاق مذموم ہے، تاہم عام حالات میں کم کھانا نسبتاً اچھا ہے مگر اتنا کم بھی نہیں کہ اس سے نفس کا حق مارا جائے کیونکہ نفس کو قافلاً اگر چہ لازمی ہے مگر اس کی حق تلفی ہرگز ردائیں۔

دوسری حدیث:۔ امام ترمذی نے ایک اور حدیث بھی نقل فرمائی ہے جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک کافر مہمان ہوا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے واسطے (دودھ دوھنے کا) حکم دیا ایک بکری کے بارے میں چنانچہ وہ دودھ لی گئی تو اس نے سارا دودھ پی لیا پھر دوسری دودھ لی گئی، اس نے وہ بھی پی لیا پھر ایک اور تو وہ اس کو بھی پی گیا یہاں تک کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا پھر صبح کو بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک بکری کا دودھ نکالنے کا حکم دیا جب وہ دودھ دوبا گیا تو اس نے وہ دودھ پی لیا پھر جب دوسری کا حکم دیا تو وہ پورا نہ پی سکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں پیتا ہے۔

تشریح:۔ گویا امام ترمذی کے نزدیک سابقہ حدیث کا پس منظر یہی ہے لہذا یہ ایک مخصوص واقعہ کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام لانے سے اس آدمی میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے جتہ اللہ البالغہ میں تفصیلاً اس پر بحث فرمائی ہے کہ ہر انسان میں دو نفس یا دو روحیں ہوتی ہیں ایک بیکہ دوسری ناطقہ اور ملکی کبھی ایک غالب رہتی ہے اور کبھی دوسری۔ لہذا جب وہ کافر تھا تو بہیمیت غالب تھی اور جب مسلمان ہوا تو ملکیت غالب آئی۔ بہیمیت کا تقاضا زیادہ کھانا ہے اور ملکیت کا تقاضا کم کھانا۔

باب ماجاء فی طعام الواحد یکفی الاثنین

"عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: طعام الاثنین کافی الثلاثة وطعام

الثلاثة کافی الاربعة۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو آدمیوں

کا کھانا تین کو کافی ہے اور تین کا کھانا چار کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں مل کر کھانے اور کفایت شعاری کی ترغیب ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس کھانے سے دو آدمیوں کے پیٹ بھر سکتے ہیں وہ تین آدمیوں کی قناعت کے لئے کافی ہو جاتا ہے، مثلاً اگر دو آدمیوں کے لئے چار روٹیاں سیر ہونے کے لئے درکار ہوں تو اگر وہ ایک آدمی اپنے ساتھ اور شریک کر کے ہر واحد ڈیڑھ روٹی سے کچھ کم کھالیں تو یہ بھی کافی ہے کیونکہ اس صورت میں بھوک مارنے کی ضرورت یقیناً ختم ہو جائے گی اور ساتھ ساتھ ایک بھوکے آدمی کا کام بھی ہو جائے گا، علیٰ هذا القیاس جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اس حدیث کو بھی اسی طرح سمجھا جائے جو سابقہ باب میں بیان ہوا یعنی اس میں کم کھانے کی ترغیب اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور مواسات کو اجاگر کرنا ملحوظ ہے، اور یہ کہ کم کھانے کے فوائد بہت ہیں جبکہ زیادہ کھانا نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔

آج کل کتنے لوگ ہیں جو زیادہ کھانے کی وجہ سے بیمار ہیں شوگر تو وبائی شکل اختیار کر چکی ہے، کم کھانے سے کوئی نہیں مرتا جبکہ کثرت سے کھانا جان لیوا ثابت ہوا ہے۔ آج اگر اس حدیث پر عمل ہو جائے اور سترہ کروڑ پاکستانی عوام اگر دن کے تین اوقات کے کھانے میں سے صرف ایک روٹی کم کر لیں تو یومیہ سترہ کروڑ روٹیوں کی بچت ہوگی جن سے بہت سارے غریب گھرانوں کی کفالت ہو سکتی ہے، اور یہ ممکن ہے کہ آنے کے موجودہ بحران پر قابو بھی پایا جاسکے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی اکل الجراد

”عن عبد اللہ بن ابی اوفیٰ أنه سئل عن الجراد فقال غزوت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بست غزوات فاکل الجراد۔“

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ (نزیل کوذا التوتوی ص ۸۷) رضی اللہ عنہ سے مندی کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ غزوات میں شریک رہا ہوں، ہم مندی یاں کھاتے تھے۔

لغات:۔ ”الجراد“ بفتح الجیم وتخفيف الراء جمع کا صیغہ ہے مفرد جرادة ہے اس میں تذکیر و تانیث لفظ حمامہ کی طرح برابر ہیں۔ بعض حضرات نے اس کو ”جرو“ سے مشتق مانا ہے چونکہ جرو کے معنی بنگا کرنے کے ہیں

مذیوں کا لشکر اور غول جس کھیتی سے گذر جائے تو اس کے پتے کٹ کر ساری فصل کو پتوں اور پتالوں سے فارغ کر دیتا ہے۔

تشریح:- امام نووی^۱ نے مڈی کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے گو بعض شافعیہ سے اس کی کراہیت منقول ہے تاہم اس میں اتنا سا اختلاف ضرور ہے، کہ آیا یہ بغیر ذبح کے محض مارنے سے حلال ہو جاتی ہیں یا ذبح شرط حلت ہے؟ تو امام شافعی اور امام ابو حنیفہ اور جمہور کے نزدیک مڈی جیسے بھی مر جائے اس کا کھانا جائز ہے چاہے ذبح سے مرے یا شکار کرنے سے خواہ شکار کرنے والا نجوسی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح خود مر جانے والی یا کوئی سبب رونما ہونے سے دم توڑنے والی سب برابر ہیں۔ جبکہ امام مالکؒ ماہوا المشہور کے مطابق اور ایک روایت میں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ تب حلال ہے جب اس کا سر کاٹ لیا جائے یا کوئی عضو کاٹ کر مارا جائے یا اسے زندہ آگ میں ڈال کر پکا یا جائے۔ اگر وہ خود بخود مر جائے تو اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔ ابن العربی نے عارضۃ الاحوذی میں فرمایا ہے کہ یہ حکم تمام مڈیوں کو شامل نہیں بلکہ بعض مڈیاں کھائی نہیں جاسکتیں۔

”والجراد اشکال: منه ما کول ومنه ما لا یوکل لضرره وقلة فائدته فی التغذیة ...“

وجراد الحجاز کله ما کول وجراد الاندلس غیر ما کول انما هو ضرر محض۔“

(عارضۃ الاحوذی)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ ماہرین نے مڈیوں کی خاصیات میں یہ جو کہا ہے کہ اس میں دس جانوروں کے نمونے موجود ہیں کہ اس کی ران اونٹ کی مانند اور ٹانگیں شتر مرغ کی طرح اور دم سانپ جیسی اور گردن تیل جیسی وغیرہ وغیرہ تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ حکم تمام مڈیوں کو شامل نہیں کیونکہ ہم نے جو چھوٹی اقسام مڈیوں کی دیکھی ہیں ان میں یہ خواص نہیں پائے جاتے اس لئے بظاہر یہ وہ مڈیاں ہیں جو پرندوں کی طرح بڑی ہیں۔ پہلے زمانے میں ان کو قحط کی مڈیوں سے تعبیر کیا جاتا تھا، کیونکہ یہ غول درغول علاقے میں داخل ہو کر کھیتوں کا صفایا کر دیتی تھیں اور ریت میں جگہ بنا کر انڈے دیتی تھیں جبکہ بہت معمولی اور عام مڈیوں میں یہ چیز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کھانا ثابت ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں دونوں قول ہیں

باب ما جاء فی اکل الجراد

۱۔ کذا فی النووی علی مسلم ص: ۱۵۴ ج: ۲ ”باب اباحۃ الجراد“ کتاب الصيد والذبائح

عام یہی ہے کہ ثابت ہے کیونکہ بخاریؒ اور ابوداؤدؒ وغیرہ کی روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کی تصریح ہے۔ بخاری شریف اور ابوداؤد میں ”فکنا نأکل معہ“ کے الفاظ ہیں جس میں صرف موجودگی کا بیان بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھائی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تناول فرمانے کا ذکر بھی ہو سکتا ہے۔

باب ماجاء فی أکل لحوم الجلالة وألبانها

”عن ابن عمر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أكل الجلالة وألبانها“۔

(حسن غریب)ؒ

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جلالہ کے گوشت اور دودھ کے کھانے پینے سے منع فرمایا ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن المحشمة وعن

لبن الحلالة وعن الشرب من في السقاء“۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجثمہ کے کھانے و جلالہ کے دودھ پینے اور مشکیزہ کے دھانے سے منہ لگا کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

لغات:- قولہ ”المجثمہ“ اس کی قدرے تفصیل ابواب الصيد میں گذری ہے وہاں امام ترمذیؒ نے

اس پر باب باندھا ہے ”باب ماجاء فی کراہیة أكل المصبورة“ اس حدیث میں مجثمہ کی تفسیر بھی کی گئی ہے ”وہی النبی نصیر بالنیل“ یعنی وہ جانور جو شانہ بازی کے لئے باندھا اور تیروں سے نشانہ بنایا جاتا ہے، جس کا عربوں میں رواج تھا، ج، م، مادہ میں زمین کے ساتھ چبٹنے کے معنی پائے جاتے ہیں، جس جانور کو باندھ لیا جاتا ہے وہ مجثمہ اس لئے کہلاتا ہے، کہ وہ اڑنے اور بھاگنے سے قاصر ہو کر پوست زمین رہتا ہے

ج: صحیح بخاری ص: ۸۲۶ ج: ۲ ج: ۲ ”باب أكل الجراد“ کتاب المباح والصيد الخ. ج: سنن ابی داؤد ص: ۱۷۸ ج: ۲ ”باب فی أكل الجراد“ کتاب الاطعمہ، ایضاً رواہ مسلم ص: ۱۵۲ ج: ۲ کتاب الصيد والمباح، ایضاً سنن نسائی ص: ۲۰۱ ج: ۲ کتاب الصيد والمباح، ایضاً سنن کبری للبیہقی ص: ۱۶۱ و ۱۶۲ ج: ۱۳ کتاب الصيد والمباح.

باب ماجاء فی أكل لحوم الجلالة وألبانها

ل: الحدیث أخرجه ابوداؤد فی سننه ص: ۱۷۵ ج: ۲ کتاب الاطعمہ، ایضاً سنن کبری للبیہقی ص: ۲۲۳ ج: ۱۳ حدیث: ۲۰۰۰۱۵ کتاب الضحایا. ج: الحدیث أخرجه البيهقي فی سننه الكبرى ص: ۲۲۳ حدیث: ۲۰۰۰۱۹ ج: ۱۳ کتاب الضحایا.

اگر ایسے جانور کو ذبح نہ کیا جائے تو وہ حلال نہیں، کیونکہ یہ ذبح اضطراری کے حکم میں نہیں۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ اس نمی کی دو جوہات ہیں ایک یہ کہ اس سے حیوان کو تکلیف اور اذیت ملتی ہے جو حرام ہے، دوسرے یہ بغیر ذبح کے مر جاتا ہے۔ علیٰ ہذا اگر کوئی جانور از خود زمین سے چٹا ہوا بیٹھا ہو تو اسے شکار کرنے میں کوئی کراہیت نہیں۔

قولہ ”الحلالۃ“ فتح المجہد و تشدید اللام الاول وہ جانور جو یکنیاں وغیرہ گندگی کھاتا ہو۔ بعض لوگوں نے جلالہ کے لفظ کی تشدید کو اور مبالغہ کے صیغے کو دیکھ کر کہا ہے کہ وہ جانور جو کثرت سے فضلہ کھائے خواہ وہ انسانی فضلہ ہو یا کسی اور جاندار کا۔ یہ لفظ دراصل ”جلتہ“ بالکسر سے بنا ہوا ہے جلتہ کے معنی یکنیوں اور لید وغیرہ کے ہیں۔

تشریح:- گندگی کھانے والے جانور کے گوشت کھانے، دودھ پینے، اور اس پر سواری کرنے کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں:

تحفۃ الاحوذی میں امام خطابی سے مذاہب کی تفصیل کچھ یوں نقل کی گئی ہے، کہ حسن بصریؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ جبکہ اسحاق بن راہویہؒ اچھی طرح دھونے کی شرط پر کھانے کے جواز کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس کا کھانا مکروہ ہے یعنی تحریم یا اگرچہ عام شافعیہ تنزیہی کے قائل ہیں۔ اور تقریباً یہی اختلاف جلالہ کے اثر سے اور قربانی میں بھی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ایسے جانور کی قربانی نہیں کرنی چاہئے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جیسے انسان شراب پینے اور خمر کھانے سے ناپاک نہیں ہوتا ایسا ہی جلالہ نجس نہیں ہوتا۔ ہم نے کتاب کے شروع میں بتلایا تھا کہ قلب الحقائق سے حکم تبدیل ہو جاتا ہے لہذا جو چیزیں نجاست سے متولد ہوں مگر ان پر نجاست کا اثر نہ ہو جیسے گوبر میں بزی اگائی اور حقیقت تبدیل ہو جائے تو اعتبار مال کو ہوگا، ہاں البتہ صرف صورت کی تبدیلی سے حکم تبدیل نہ ہوگا۔ لہذا اگر جلالہ کے گوشت وغیرہ پر گندگی کا کچھ اثر ظاہر نہ ہوا ہو تو اس کا کھانا اور دودھ استعمال کرنا جائز ہے، جیسا کہ بذل المجہود میں جلالہ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا ظلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:

”والحلالۃ التي تعاد اكل العذرة وهذا اذا ظهر اثر النجاسة في لحمها ولبنها، واما

سادام لم يظهر اثرها بحوز اكلها وبعد ظهور الامر ينبغي ان تحبس حتى زال

اثر النجاسة منها“۔ (بذل مجہد ص ۳۵۲ ج ۵)

یعنی جلالت وہ ہے جو کثرت سے گندگی کھانے کا عادی ہو پھر اگر اس پر اثرات رونما ہو جائیں گے تو جب تک باندھ کر اور قبائل غذا کھلا کر ان اثرات کا ازالہ نہ کر دیا جائے اس وقت تک اس کے کھانے سے اجتناب کر لینا چاہئے، گوکہ احتیاط اسی میں ہے کہ بغیر ظہور اثر کے بھی اسے کچھ دنوں تک باندھ کر پاک غذا کھلائی جائے چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو تین یوم تک باندھنے کے بعد ہی ذبح فرماتے۔

حدیث باب میں تیسرا مسئلہ مشکیزے کے منہ سے منہ لگا کر پانی پینے کی ممانعت ہے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس نبی کی تین وجوہات ہیں: ایک یہ کہ اس طرح پینے سے منہ کے مستعمل پانی کا کچھ حصہ مشکیزے کے اندر واپس جاسکتا ہے۔ دوم یہ کہ منہ کی بو کا اثر مشکیزے کے دھانے پر باقی رہ سکتا ہے جسے دوسرے لوگ پسند نہیں کریں گے۔ سوم یہ کہ اس طرح اندر کا پانی نظر بھی نہیں آتا اس لئے یہ امکان پایا جاتا ہے کہ کوئی ناگوار چیز منہ کے اندر چلی جائے چنانچہ ایک آدمی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ منہ لگا کر پانی پی رہا تھا تو اس کے منہ میں مشکیزے سے سانپ چلا آیا نیز ایسا کرنے سے منہ میں یک دم زیادہ پانی جاسکتا ہے جو تکلیف کا سبب ہے اور کپڑوں پر گر سکتا ہے۔ اور جس روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اسی طریقے سے پانی نوش فرمایا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ علل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں پائے جاتے تھے "کبرکته وعطرته وطهارته وأمنه من الغوائل والحوادث"۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نبی اس واقعہ سے متاثر ہو۔ یا پھر وہ حاجت پر محمول ہے۔ (اتھی مانی العارضہ)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ رات کو اندھیرے میں پانی پینا ہو تو اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے کہ پانی بالکل صاف ہے۔ آج کل شہروں میں فریجوں کا استعمال عام ہے لوگ بوتلوں میں پانی رکھتے ہیں چونکہ پانی رکھتے وقت اس کا اطمینان کر لیا جاتا ہے اس لئے بند بوتل میں کسی چیز کے داخل ہونے کا امکان نہیں رہتا اس لئے بوتل کے ساتھ منہ لگا کر پانی پینا اس اعتبار سے تو جائز ہونا چاہئے لیکن اگر بوتل میں پانی رہ جاتا ہے اور دوسرے کی ناگواری طبع کا سبب بن رہا ہے تو پھر کراہت باقی رہے گی۔ اسی طرح اگر رات کو گلاس وغیرہ میں پانی ڈال کر پینا ہو تو بھی اطمینان کر لینا چاہئے کہ گلاس صاف اور خالی ہے۔

آج کل ڈبوں میں جوس ملتا ہے، چونکہ وہ پیک ہوتا ہے اور ایک ہی آدمی کے لئے ہوتا ہے پھر اسے

گلاس میں نکالنا بھی کافی دشوار ہوتا ہے اس لئے نگلی کے ذریعے پینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس نگلی اور ڈبے کو پھینکا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی اکل الدجاج

”عن زہدہم الحرمی قال دخلت علی ابی موسیٰ وهو یا کل دجاجة فقال أدن فکل فانی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کله۔“^۱

حضرت زہدہم جری فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوموسیٰ کے یہاں گیا اور وہ مرغی کا گوشت کھا رہے تھے، انہوں نے فرمایا: قریب ہو جاؤ اور کھاؤ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغی کا گوشت تناول فرماتے ہوئے دیکھا ہے۔

لغات :- دجاج جمع ہے اور دجاجہ مفرد ہے دونوں میں دال پر تینوں حرکات جائز ہیں تاہم فتح سب سے اچھا ہے پھر کسرہ اور ضمہ کی صرف گنجائش ہے۔ بعض حضرات نے فتح مرغی کے لئے اور کسرہ مرغ کے لئے مختص مانا ہے، کاش وہ یہ فرق اس کے برعکس کرتے، تدریس بہر حال دجاج اسم جنس ہے سب پر اطلاق ہوتا ہے مگر مفرد میں مرغ کے لئے دیک آتا ہے نہ کہ دجاجہ۔ دج یدج کے معنی اسراع اور جلدی کرنے کے ہیں چونکہ مرغیاں بھی اکثر متحرک رہتی ہیں بار بار گھر سے باہر آتی جاتی ہیں اس لئے ان کو دجاج کہتے ہیں۔

فولہ زہدہم الحرمی ^۲ شیخ الزاء وسکون الہاء بر وزن جعفر جری شتہ جم وسکون الراء بصری اور ثقہ راوی ہیں۔
تشریح :- اس حدیث سے مرغی کے کھانے کا جواز ثابت ہوا جو بالا جماع حلال ہے۔ باب کی اگلی حدیث حسن و صحیح ہے علاوہ ازیں بھی متعدد صحیح احادیث سے مرغی کی حلت معلوم ہوئی ہے۔ گوکہ بعض نے جلالہ کو مستثنیٰ کیا ہے جس کا ذکر سابقہ باب میں گذر گیا۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں۔

”قال ذی اکل النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللحم الابل والبقر والغنم والدجاج والارنب والحمار الوحشی والعجائی۔“

باب ماجاء فی اکل الدجاج

^۱ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۲۹ ج: ۲ ”باب لحم الدجاج“ کتاب الذبائح، ایضاً صحیح مسلم ص: ۷۷ ج: ۲

کتاب الايمان، ایضاً سنن کبریٰ للبیہقی ص: ۳۲۶ ج: ۱۴ حدیث: ۲۰۰۰۲۵

جبارئی کا ذکر اگلے باب میں آ رہا ہے۔

قاری مرغیوں کا حکم:۔ آج کل قارم میں مرغیوں کو جو دانہ کھلایا جاتا ہے اس میں مچھلی اور خون کو ملا یا جاتا ہے چونکہ دم مسلوخ نجس اور حرام ہے ان لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان مرغیوں کا کھانا جائز ہے یا حرام و مکروہ اور یہ مسئلہ بھی بظاہر جلالہ کی طرف لوٹتا ہے تاہم جلالہ جو گندگی کھاتا ہے وہ عین نجاست ہوتی ہے جبکہ مرغیوں کا دانہ مکچر ہوتا ہے نیز دوسری اجناس کے غلبہ کے علاوہ اس خون میں تہہ پٹی بھی لائی جاتی ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اس غذا میں قلب الحقیقت کی بنا پر خون کا عنصر اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتا چنانچہ جلالہ کا حکم بھی یہی گذرا ہے کہ اگر اس کے جسم پر نجاست کا اثر ہو تو وہ حلال ہے، جیسا کہ در مختار میں جلالہ کے بارے میں لکھا ہے:

”ولو اكلت النجاسة وغيرها بحيث لم يتن لحمها طحت كما حل اكل جدي غُذِيَ بِلَبَنٍ خَنْزِيرٍ لَانَ لَحْمَهُ لَا يَتَغَيَّرُ وَمَا غُذِيَ بِهِ يَصِيرُ مَسْتَهْلَكًا لَا يَضَعُ لَهُ اثْرٌ“۔
اس پر علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

”وعن هذا قالوا لا بأس بأكل الدجاج لانه يعلط ولا يتغير لحمه وروى انه عليه الصلوة والسلام يأكل الدجاج وروى ان الدجاج نجس ثلاثة ايام ثم يباح فطبخ على سبيل التنزه“۔ ملاحظہ فرمائیے (الدر المنثور ج ۲ ص ۶۳۲ کتاب الطہر والاباح) امام سیّد کراچی اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف گندگی کے کھانے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا اثر بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔ اگر اثر دہرا ہو کر باقی ہو تو از لہ اثر تک کھانا حرام ہے اور اگر اثر نہ پڑا ہو یا ختم ہو چکا ہو تو بلا کر اہیت جائز ہے۔
قولہ ”وفي الحديث كلام اكثر من هذا“ یعنی یہاں پر امام ترمذیؒ نے اس حدیث کا صرف متعلقہ حصہ نقل کیا ہے ورنہ یہ کافی طویل حدیث ہے، پھر اس حدیث سے نہ زیادہ حصہ مصنفؒ نے شامل ترمذی میں ”باب ما جاء في صفة اكل رسول الله صلى الله عليه وسلم“ میں ذکر کیا ہے۔

”عن زهدم الحمرى قال كان لابي موسى قال تقدم طعمه وقدم في طعمه لحم دجاج وفي القوم رجل من بني تميم احمركانه مولى (روى) قال فلم يذن فقال له ابو موسى يذن فتى فلما رآه رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل منه قال انى رآته يا اكل شيئا (گندگی) فقلوا له فطخت ان لا اطعمه ابدا“۔ (شمائل ص ۱۱۱) امام سیّد کراچی

یہ حدیث زیادہ تفصیلی دیکھنی ہو تو عارضۃ الاحوذی وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ شاکل کے حاشیہ پر اس حدیث سے چند مسائل مستنبط کر کے لکھے گئے ہیں: (۱) جو آدمی نین کھانے کے وقت آجائے اس کو بھی دعوت دینا چاہئے (۲) اگر وہ انکار کرے تو اس کی وجہ پوچھی جاسکتی ہے بلکہ پوچھنا چاہئے (۳) اگر وہ وجہ ممکن الزوال ہو تو اس کا ازالہ کر لینا چاہئے (۴) اگر آدمی کسی چیز سے قسم کھائے مگر اس کی دوسری جانب مقابل شرع کے مطابق ہو تو قسم توڑ لینا چاہئے (اور پھر کفارہ دے) (۵) اگر کوئی کام شرعاً منع نہ ہو گو نفس کو ناگوار گذرتا ہو تو اس پر چلنا چاہئے یعنی نفس کی پیروی کے بجائے شرع کا اتباع کر لینا چاہئے۔

ملاحظہ:۔ بعض لوگ کھانے پینے کی چیزوں میں مہمان کو زبردستی کھلاتے پلاتے ہیں یعنی اتنا اصرار کرتے ہیں کہ مہمان اخلاقاً مجبور ہو جاتا ہے اگر مہمان ازراہ تکلف انکار نہ کرتا ہو تو اتنا اصرار ضرار کے زمرے میں آتا ہے، چنانچہ راقم کی زیادہ چائے پینے سے نیند بھی اڑ جاتی ہے اور بھوک بھی مرجاتی ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں سے جب یہ عذر پیش کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ایک کپ سے کچھ نہیں ہوتا اس طرح کبھی متعدد جگہوں سے کئی کپ پینے کی وجہ سے خواب آور گولی کھانے سے بھی نیند نہیں آتی اور بھوک نہ لگنے کی وجہ سے کمزوری بڑھ جاتی ہے آیا اس طرح کرنا مہمان نوازی کا اعلیٰ نمونہ ہے؟؟؟

باب ماجاء فی اکل الحباری

”عن ابراہیم بن عمر بن سفینۃ عن ابيه عن جده قال: اُکلت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحم حباری“۔^۱

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرخاب پرندے کا گوشت کھایا ہے۔

لغات:۔ قولہ ”حباری“، ضم الہاء اخیر میں الف مقصورہ ہے اسم جنس ہے تذکیر و تانیث اس میں برابر ہیں۔ سرخاب یہ ایک لمبی گردن والا تیز رفتار پرندہ ہے جس کی چونچ طویل اور رنگ خاکی ہوتا ہے۔ حماقت میں ضرب المثل ہے مگر اس کے باوجود اپنے بچے سے شدید محبت کرتا اور اسے اڑنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ کہتے

باب ماجاء فی اکل الحباری

۱۔ الحدیث أخرجه ابوداؤد ص: ۷۶ ج: ۲ ”باب فی اکل لحم حباری“ کتاب الاطعمہ۔

ہیں کہ اس کے پیٹ میں ایک پتھر ہوتا ہے جو احتلام اور اسہال کے روکنے کے لئے مفید ہے۔

تشریح:- اس روایت سے شراب کا حلال و ماکول ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔ روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے تاہم اس مسئلہ میں کسی کو اختلاف نہ ہونے کی وجہ سے سند میں دونوں ابراہیم کی وجہ سے اشد نہیں پڑتا۔ چنانچہ سخاوی نے فتح المغنیث میں لکھا ہے:

”وَكَذَاذَا تَلَقَّتْ الْأَمَّةُ الضَّعِيفَ بِالْقَبُولِ بِعَمَلٍ بِهِ عَلَى الصَّحِيحِ حَتَّى أَنَّهُ يَنْزِلُ مَنْزِلَةَ الْمُتَوَاتِرِ فِي أَنَّهُ يَنْسَخُ الْمَقْطُوعَ بِهِ وَلِهَذَا قَالَ الشَّافِعِيُّ فِي حَدِيثٍ ”لَا وَصِيَّةَ لَوَارِثٍ“ أَنَّهُ لَا يَثْبُتُ أَهْلُ الْحَدِيثِ وَلَكِنَّ الْعَامَّةَ تَلَقَّتْهُ بِالْقَبُولِ وَعَمَلُوا بِهِ حَتَّى جَعَلُوهُ نَاسِخًا لِلْأَمَّةِ الْوَصِيَّةِ“۔ (نسخ الیہ الخلیفہ ردا لل ابن ماجہ ص ۲۴ طبع قدیمی کتب خانہ)

فولہ ”وہ بقول بڑے بن عمر“ یعنی ابن ابی لہدیک (مصر) اپنی روایت میں ابراہیم کے بجائے بڑے بصیرہ تغیر کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے بڑے کو لقب کہا ہے۔ امام بخاری اور امام عقیلی اس حدیث کو مجہول السند قرار دیتے ہیں مگر اس کا مضمون بلا شک صحیح ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کبھی حدیث سنداً ضعیف اور عملاً قوی صحیح ہو سکتی ہے۔

باب ماجاء فی اَکْلِ الشَّوَاءِ

”قال ابن جریر أخبرني محمد بن يوسف ان عطاء بن يسار أخبره أن أم سلمة أخبرته انها قربت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم جنباً مشوياً فأكل منه ثم قام الى الصلوة وماتوضاً“۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عطاء بن یسار کو خبر دی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہنا ہوا پہلو پیش کیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول فرمایا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور وضو نہیں کیا۔

لغات:- قولہ ”الشَّوَاءُ“ بکسر الشین والفاء ممدودہ کے ساتھ تاہم شین پر ضمہ بھی جائز ہے نہنا ہوا گوشت کہلاتا ہے۔ قولہ ”جنباً“ اس کے کئی معنی آتے ہیں، پہلو، سمت، گوشہ، کنارہ اور بدل و مقابلہ وغیرہ یہاں مراد معنی اول یعنی پہلو ہے جس کو بازو سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ قولہ ”مشوياً“ مفعول کا صیغہ ہے شوئاً سے یعنی نہنا ہوا، حلیہ و مسوطہ اس کے مراد فہن ہیں یہ گوشت انگاروں میں دبا کر پکایا جاتا تھا۔ (لسان العرب)

تشریح :- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قسم کا پکا یا ہوا گوشت کھانا ثابت ہے۔ کھنا ہوا بھی جیسا کہ باب کی حدیث میں ہے۔ اور قدید بھی یعنی گوشت کی بوئیاں دھوپ میں شکھا کر اس کا سالن بنایا جائے اور قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت حلیہ کا جو ذکر آیا ہے، اس سے بھی مشوی یعنی کھنا ہوا مراد ہے۔ ان میں زیادہ لذیذ اگرچہ کھنا ہوا ہوتا ہے۔ تاہم ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ قدید زیادہ مفید ہے کیونکہ اس کی مدح اور ترغیب مروی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گوشت میں زیادہ شور بانانے پر زور فرماتے۔ دوسرے اس میں ٹرید بھی بن سکتی ہے جو عمدہ کھانا شمار ہوتا ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ستر اونٹ فخر کرنے کے بعد ان سے ایک ایک بوٹی ہانڈی میں ڈالنے کا حکم فرمایا اور پکنے کے بعد اس کا شور بانوش فرمایا۔ نیز ترمذی ہی میں ہے ”ان العرق احد اللحیمین“۔ (انہی مافی العارضۃ) یہ حدیث عنقریب آ رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ لذیذ اور عمدہ کھانے جائز ہیں، البتہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ایسے کھانوں کی نوبت زندگی بھر میں شاید انتہائی کم مرتبہ پیش آئی ہوگی وہ بھی اس وقت جب کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کوئی مہمان آئے ہوں، اس کی شاید ایک بھی مثال نہ مل سکے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر یا خواہش کے اظہار پر ایسا کیا گیا ہو۔ لہذا ہونا یہ چاہئے کہ چاہت اور خواہش کے باوجود لذیذ کھانوں کے درپے نہیں ہونا چاہئے اور اس میں اسلام کا ایک بڑا فلسفہ مضمر ہے کیونکہ جو قوم لذیذ کھانوں کے درپے ہو جاتی ہے، وہ کام سے دور چلی جاتی ہے وہ عباد الرحمن کے بجائے عباد الزمان بن جاتی ہے جو وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے خصوصاً قوم کے لیڈر اگر ایسا کریں تو اس کی تباہی ان کے سر پر منڈلانے لگتی ہے۔

ہمیں سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فاقے، تکلیفات اور امت کے لئے آہ و بکا ہی نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فخر اختیاری تھا وہ چاہتے تو قیصر و کسری کی طرح سونے کی میز پر سوتی کی طشتری میں کھا سکتے تھے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا نام شاید آج تک منبروں اور گنبدوں کی پرکیف فضاؤں میں باقی نہ رہتا۔ والعیاذ باللہ

باب کی حدیث میں جس گوشت کا ذکر ہے وہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نوادرات میں سے

ہے۔ جہاں تک عام زندگی کا تعلق ہے تو اس کا ذکر اور نقشہ حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے "ما أكل النبي صلى الله عليه وسلم عجزاً مرفقاً ولا شاة مسمومة حتى لقي الله عز وجل"۔ (رواہ البخاری ^۱) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چپاتی اور بھنی ہوئی بکری (کا گوشت) تناول نہیں فرمایا۔ تا آنکہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے جا ملے۔ گویا باب کا واقعہ اتنا نایاب اور شاذ ہے جو کالمعدوم ہے۔ یا پھر حضرت انسؓ کو نادر ہونے کی بنا پر اس کا علم نہ ہوسکا اور سب کچھ کے طور پر بھنے ہوئے گوشت کے تناول فرمانے کی نفی کر دی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مامت النار کے کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا اس کا مائل بیان ترمذی جلد اول ہے جس سے بحمد اللہ ہم فارغ ہو چکے ہیں۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الأکل متکناً

"عن ابی صحیفۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أما أنا فلا أکل متکناً"۔ ^۱

حضرت ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں تک میرے مزاج کا تعلق ہے تو میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا ہوں۔

لغات: بقولہ "متکناً" انکاء سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ متکئی کون ہوتا ہے، اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ کسی چیز کے ساتھ ٹیک لگانے کو بھی کہتے ہیں، جیسا کہ ترجمہ میں یہی مطلب لیا گیا ہے چونکہ یہ اس لفظ کا ظاہری و متبادر مطلب ہے اس لئے اسے اختیار کیا گیا، ورنہ حدیث کے سیاق کو دیکھتے ہوئے یہ مطلب متعین نہ سمجھا جائے جیسا کہ تشریح سے معلوم ہوگا۔ ایک جانب مائل ہو کر (باکس) ہاتھ کے سہارے بیٹھنے کو بھی انکاء کہتے ہیں اور چار زانو یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کو بھی انکاء کہا جاتا ہے۔ بہت سے علماء کرام نے صرف پہلے دو معنی بیان کئے ہیں، جبکہ تیسرا مطلب اس حدیث کے اہم مطالب میں سے ہے چنانچہ ابن قیمؒ زاد المعاد میں متکئی کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وفسر بالتربع وبالانکاء علی الشئ وفسر بالانکاء علی الحنب والثلاثة من

۱ صحیح بخاری ص ۸۱ ج ۲: "باب العجز المرفق الخ" کتاب الاطعمہ.

باب ماجاء فی کراہیۃ الأکل متکناً

۱ الحدیث أخرجه ابو داود ص ۱۷۳ ج ۲: "باب فی الأکل متکناً" کتاب الاطعمہ، سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۵ "باب

الأکل متکناً" ابواب الاطعمہ، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۶۲ ج ۵: کتاب الاطعمہ.

الانكساء۔“ (دیکھئے مختصر زاد العادۃ ص ۲۳، طبع دار السلام ریاض)

اور ابن کثیر سورۃ کیف آیت نمبر ۳۱ ”متكئين فيها على الأرائك“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
 ”الانكساء قبل الاضطجاع وقبل التربع في الجلوس وهو أشبه بالمرادھہنا ومنه
 الحديث الصحيح اما ان افلا آكل متكئا فيه القولان۔“

(تفسیر ابن کثیر ص ۸۴ ج ۳، قدیمی کتب خانہ)

تشریح:- مندرجہ بالا تینوں معانی و مطالب کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جائے گا، کہ کھانا کھاتے وقت ٹیک لگانا، آلتی پالتی مار کر بیٹھنا اور بائیں جانب جھک کر لٹے ہاتھ پر تکیہ لگانا خلاف اولیٰ ہے۔

کھانے کے آداب میں سے بیٹھنے کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ یا تو آدمی دو زانو بچوں کے بل بیٹھے جیسا کہ حضرت انسؓ کی روایت میں ہے: ”رأيت النبي صلى الله عليه وسلم مقبعا يأكل نحرأ“ (مسلم ج ۲ ص ۱۸۰، طبع قدیمی کتب خانہ) اور یا پھر بائیں پاؤں کو بچھا کر دائینی پنڈلی کو کھڑا کر کے بیٹھ جائے۔ پہلی صورت میں آدمی جلدی فارغ ہو جاتا ہے اور یہی مطلوب شرعی بھی ہے چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

”عن انس قال أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بتمر فجعل النبي صلى الله عليه وسلم يقسمه وهو محتفزيا كل منه اكلاذر يعاؤفي رواية زهير ”اكلاذر حشينا“۔“

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ”ذریعاً اور حشیناً“ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی جلدی کھانا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی اپنے کام کے لئے فارغ ہو جائیں۔ (مسلم ص ۱۸۰ ج ۲) اور علامہ عبدالفتاح ابو غدۃؒ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ محدث کے لئے ضروری ہے، کہ وہ سریع الحشی، سریع الکتاہیہ اور سریع القرأت ہو پھر فرماتے ہیں:

”قال عبدالفتاح: وانما الضيف الى تلك الصفات الثلاث في المحدث وفي طالب العلم ايضا صفة رابعة وهي ان يكون سريع الاكل لكسب الوقت والاستفادة من الزمن الغالي وان قل۔“

(دیکھئے ”صفات من صبر العلماء علی شدة العلم“ تحصیل ص ۳۳ حاشیہ منہ نمبر ۵، المكتبة المغنویہ کراچی)

اسی بنا پر بہت سے علماء ٹرید کو اس لئے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ اس سے وقت کی بچت ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ ایک ایک پیسہ بچانے کی فکر تو کرتے ہیں مگر ایک ایک لمحہ کی بچت سے بے نیاز رہتے ہیں حالانکہ ایک ایک لمحہ ایک روپیہ سے کئی گنا زیادہ قیمت رکھتا ہے اس سے زیادہ افسوس ان علماء و طلبہ پر ہے،

جو وقت خرچ کرنے میں بڑا اسراف کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے بے دریغ خرچ سے عوام الناس نے بھی کہنا شروع کیا کہ مولوی لوگ تو فارغ ہی ہوتے ہیں، ان کا کام سوائے کھانے پینے اور سونے کے اور کیا ہے۔ اسی تاثر کی بنا پر جب کوئی آدمی ہم سے ملتا ہے تو ایک آسان مسئلہ پوچھنے کے لئے لمبی تقریر شروع کرتا ہے جیسے وہ ہمیں گپ شپ میں مصروف کر کے بڑا احسان کر رہا ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ بات جلدی کرو ہمارے پاس کام نہیں ہے تو اسے تعجب ہوتا ہے، خدا را اس تاثر کو توڑنے کی کوشش کیجئے۔

کھانے کے آداب کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ دونوں قدموں اور سرین پر بیٹھ کر پنڈلیوں یعنی گھٹنوں کو کھڑا کر دیا جائے، مسلم کی جو حدیث اوپر اولاً ذکر ہوئی امام نوویؒ نے اس کا مطلب یہی لیا ہے، وہ لکھتے ہیں: قوله "مقعیای جالساً علی البیہ ناصباً سابقہ"۔ (شرح نووی بر مسلم ص ۸۰ ج ۲، قدیمی کتب خانہ)

اگر کہا جائے کہ صرف قدموں پر بیٹھ جائے اور پہلی صورت میں توڑک کر کے بیٹھ جائے تو یہ بھی اس علت اور منشا کے عین مطابق ہوگا جس کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھنے کا مندرجہ بالا طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ یعنی تواضع کرنا، کم کھانا اور کھانے کی قدر و اہتمام کرنا۔ تاہم اقعاء کی پہلی صورت شاید کھجور ہی میں اختیار کی گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں پر اقعاء کے وہی معنی متعین ہو جو امام نوویؒ نے ذکر کئے ہیں معنی اول مراد نہ ہو علیٰ ہذا کہا جائے گا کہ بین السجدتین اقعاء سے مراد معنی اول اور کھانے میں ثانی ہیں۔ واللہ اعلم

بہر حال مذکورہ بیانات کے علاوہ جو بھی طریقہ ہوگا وہ آداب کے منافی ہوگا۔ تاہم امام غزالیؒ نے پیاز کھانے کو کروٹ لگا کر کھانے کی کراہیت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ (کافی التختہ) لہذا کہا جائے گا کہ پان، ٹافیاں اور چھالیا وغیرہ بھی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ رد المحتار شامی میں ہے: "ولا یباس بالاکل متکفلاً او مکشوف الرأس فی المختار"۔ (کتاب البظر والا باحہ، حاشیہ رد المحتار ص ۳۲۰ ج ۶، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

اس میں "لا یباس" کے لفظ سے جہاں ایک طرف منکئی کھانے کے خلاف اولیٰ ہونے کی طرف اشارہ ہے وہیں دوسری جانب منکئی سر کھانے کو بھی خلاف اولیٰ قرار دیا جا رہا ہے۔

چونکہ منکئی کی مذکورہ صورتوں میں زیادہ قبیح شکل چار زانو یعنی آلتی پالتی مارنے کی ہے، کہ یہ منکبرین کا شیوہ ہے، اس طرح کھانا بھی زیادہ کھایا جاتا ہے۔ اور انہم نقصان یہ ہے کہ اس سے پیٹ بڑھ جاتا ہے اس لئے یہ نیک لگا کر کھانے کی نسبت زیادہ قابل احترام ہے۔ اوپر ابن کثیر کا حوالہ بھی گذر گیا۔ جس میں انہوں نے حدیث کا مصداق اسی صورت کو بنایا ہے۔ تختۃ الاحوذی میں ہے۔

”واختلف فی الکراهۃ واقری ماورد فی ذالک ماخرجہ ابن ابی شیبہ^۱ من طریق ابراہیم النخعی قال: کانوا یکرہون ان یأکلوا التکاء^۲ مخافة ان تعظم بطونهم والی ذالک یشیر بقیۃ ماورد فیہ من الاخبار فهو المعتمد۔“

عرف الشذی میں ہے ”واما التربع فجلوس قبیح۔“

امام ترمذی نے ابواب الفتن میں صحیح حدیث نقل کی ہے:

”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: حیرامتی القرن الذی یبشّ فیہم ثم اللین یلونہم ولا اعلم اذکر الثابت ام لائم ینشوء تقوام یشہون ولا یستشہون ویخونون ولا یؤمنون ویفشو فیہم السمن۔“ (باب ماجاء فی القرن الثالث ص ۳۶ ج ۱۲ صحیح الامم سعید کرچی)

اس لئے موٹاپے کے شوق اور اس کے اسباب سے بچنا چاہئے تاہم بیٹھنے کی ہینات سنن زوائد میں سے ہیں اس لئے مریع بیٹھنے سے گناہ نہ ہوگا۔

باب ماجاء فی حُبِّ النبی ﷺ الحلواء والعسل

”عن عائشۃ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب الحلواء والعسل۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم میٹھی چیز اور شہد کو پسند فرماتے تھے۔ لغات:- ”الحلواء“ مد اور قصر دونوں کے ساتھ پڑھنا لفظ جائز ہے۔ عام علماء و شارحین ہر میٹھی چیز کو حلوا قرار دیتے ہیں۔ جبکہ امام خطابی وغیرہ فرماتے ہیں کہ حلوا کا اطلاق صرف ان میٹھی اشیاء پر ہوتا ہے جو مصنوع ہوں یعنی ان کو بنایا، یا پکایا جائے۔

تشریح:- اگر حلواء سے مراد مطلق میٹھی چیز ہو تو پھر اس کے بعد عسل کا ذکر، ذکر خاص بعد العام ہوگا جس سے شہد کی شرافت اور اقا دیت کو اُجاگر کرنا مراد ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث شریف میں ہے ”الایمان بضع وسبعون شعبۃ... وفیہ... والحیاء شعبۃ من الایمان۔“ (مشق علیہ، مشکوٰۃ ص ۱۲ ج ۱)

۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۵۲۵ ج ۵ کتاب الاطعمہ.

باب ماجاء فی حُبِّ النبی ﷺ الحلواء والعسل

۱۔ صحیح بخاری ص ۲ ج ۱ ”باب امور الایمان الخ“ کتاب الایمان، صحیح مسلم ص ۴۷ ج ۱ ”باب بیان عدد شعب الایمان الخ“ کتاب الایمان.

اور اگر حلواء سے مراد خاص اشیاء ہو۔ جیسا کہ امام خطابی کی رائے کے حوالے سے گذر گیا یعنی جس میں صنعت کو دخل ہو تو پھر اس سے مراد وہ حلواء نہیں ہے، جو آج کل حلواء کے نام سے مشہور ہے جو آنے سے بنایا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد کھجور ہے جو دودھ سے گوندھی جاتی تھی چنانچہ الکوکب الدری کے حاشیہ پر امام شعبی کی کتاب المغلفہ سے نقل کیا ہے:

”ان حلوی النبی صلی اللہ علیہ وسلم النبی کان یحبھا ہی المعجیع بالحجم وزن عظیم وهو تسریع من بلین وقد روی انه کان یحب الزبد والتمر وفیه رد علی من زعم ان المراد بالحلوی انه صلی اللہ علیہ وسلم کان یشرّب کل یوم قدح غسل بمزج بالماء واما الحلوی المصنوعہ فما کان یعرفھا وقیل المراد بالحلوی الفالودج (فالودہ) لا المعقودۃ علی النار۔

یعنی آگ پر پکایا ہوا آٹے کا بنا ہوا حلواء مراد نہیں ہے، تاہم اس حلواء کے کھانے اور پسند کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اس کو محض اس لئے اہمیت دینا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے غلط تشریح ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کا یہ مطلب نہیں، کہ وہ اس کے متلاشی اور طالب رہتے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب کھانے میں میٹھی چیز ہوتی تو اسے زیادہ شوق سے تناول فرماتے۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے۔ (کذا فی التلخیص نقلًا عن الخطابی وابن السہین)

علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرکہ کو پسند کرنا بھی ثابت ہے، حالانکہ وہ کھٹا ہوتا ہے اور بازو کا گوشت پسند کرنا بھی ثابت ہے تو یہ انسانی طبائع ہیں، جو مختلف ہوتے ہیں اور ایک ہی آدمی کی طبیعت میں مختلف رنگ دیکھے جاسکتے ہیں، آدمی ایک وقت میں ایک چیز کو پسند کرتا ہے اور دوسرے وقت بالکل مختلف شے کو چاہتا ہے۔ کما حوالہ شاہد

اصل بات یہ ہے کہ جسم میں جس چیز کی بخشی ضرورت ہوتی ہے، طبیعت خود بخود اس کی طرف بقدر ضرورت مائل ہو جاتی ہے، مثلاً جب بھوک لگتی ہے تو آدمی سیر ہونے تک کھا سکتا ہے زیادہ نہیں، پیاس کی صورت میں پانی کی طلب ہوتی ہے۔ خون کی کمی میں گوشت وغیرہ کا تقاضا بڑھ جاتا ہے، اور مرج وغیرہ کھانے کے بعد میٹھے کی طلب شروع ہو جاتی ہے۔ بالعکس۔ لہذا محض اس حدیث کی بناء پر میٹھے کو مسنون سمجھ کر ثواب کی نیت سے کھانا مطلوب شرعی نہیں ہے۔ گو کہ کالمین کا حال یہ ہے کہ جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہوتی وہ

ان کو بھی طبعاً پسند ہو جاتی ہے، جیسے حضرت انسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی کے ٹکڑے رکابی میں ٹٹولتے ہوئے دیکھا تو ان کو بھی کدو طبعاً پسند ہو گیا۔ ”ذالك فضل الله يوتيہ من يشاء“۔

باب ماجاء في اكثار المرقۃ

”عن علقمة بن عبد اللہ المزنی عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا اشتري احدكم لحماً فليكثر مرقته فان لم يجد لحماً أصاب مرقه وهو احد اللحمين“۔

حضرت عبد اللہ مزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص گوشت خریدے تو اس کو چاہئے کہ اس میں زیادہ شوربہ بنائے کہ اگر اسے گوشت (کی بوٹی کھانے کو) نہ ملے تو شوربہ تول جائے گا اور وہ بھی گوشت کی (گویا) ایک قسم ہے۔

لغات:- قولہ ”مرقہ“ مرقق بفتح میم دراء شوربہ اور مرققہ بالتاء شوربے کی قسم یا تھوڑے شوربے کو کہتے ہیں۔

تشریح:- مذکورہ بالا حکم گوشت کی خریداری کے ساتھ مختص نہ سمجھا جائے بلکہ عام ہے، خواہ پکانے کے لئے خرید اہوا گوشت ہو یا اپنے جانور کا یا کسی کی طرف سے ہدیہ کا گوشت ہو۔ بہر صورت ہونا یہ چاہئے کہ اس کو خشک تلنے اور بھوننے کے بجائے سالن کی شکل میں پکائے اور پانی نسبت زیادہ ڈالے۔ اس طرح اس کا نفع زیادہ ہو جائے گا۔ کہ اب وہ پانی حکماً گوشت کے مانند طاقت ور بن گیا کہ اس میں گوشت کی طاقت اور چکناہٹ منتقل ہو گئی اور لذت بھی گوشت جیسی ہے اس کا مشاہدہ گوشت کی یخنی اور سوپ میں کیا جاسکتا ہے۔ نیز اس سے دوسروں کی خبر گیری بھی ہو سکتی ہے، کہ انھیں پڑوس میں بھی دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ باب کی اگلی حدیث میں ہے۔ باب کی پہلی حدیث اگرچہ محمد بن فضال کی وجہ سے ضعیف ہے مگر اگلی حدیث سے اس مضمون کی تاکید ہوتی ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن ابی ذر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحقير احدكم شيئاً من المعروف وان لم يجد فليطبخ احاه بوجه طليق واذا اشترى لحماً او طبخت قدرافاً فليكثر مرقته

ع کذا فی صحیح البخاری ص ۸۱۰ ج ۲ ”باب من تصح حوالی القصعة الخ“ کتاب الاطعمہ، ایضاً ص ۸۱۵ ج ۲

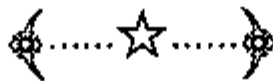
کتاب الاطعمہ، ج سورة الجمعة آیت ۴ پارہ ۲۸

واغرف لِحَاوِكَ مِنْهُ۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، تم میں سے کوئی شخص نیکی کا کوئی بھی کام معمولی نہ سمجھے اور اگر (ہدیہ، برتاؤ کے لئے) کوئی چیز اسے نہ ملے تو اپنے (اسلامی) بھائی سے خندہ پیشانی سے قول لے اور جب تم گوشت خریدو یا ہانڈی پکاؤ تو اس میں شور بہ زیادہ بناؤ اور اس میں سے چلو بھرا اپنے ہمسایہ کو دیدو۔

لغات و تشریح:۔ معروف کے معنی جانی پہچانی اور مانوس چیز کے ہیں چونکہ نیکی کے کام جیسے انصاف، امداد، خدمت، اکرام اور مالی تعاون وغیرہ لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں، اس لئے ہر نیکی کو معروف کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نیکی کے کام شریعت میں اور مسلمانوں میں جانے پہچانے اور متعارف ہوئے ہیں، بخلاف منکر کے کہ وہ نا آشنا نامانوس ہوتے ہیں جب لوگ اسے دیکھتے ہیں تو اس پر نکیر کرتے ہیں، یعنی مہذب اسلامی معاشرہ میں۔ قولہ ”مطلق“ بشارت اور خوشی کو کہتے ہیں۔ بوجہ طلیق کے معنی ہیں، خندہ پیشانی، خندہ روئی، خوش مزاجی اور شگفتگی و کثافتہ روئی و ہنس کھد وغیرہ۔

یعنی آدمی کو دوسروں کا خیر خواہ ہونا چاہئے، اس کا سینہ جذبہ خیر رسانی سے لبریز ہونا چاہئے، اس سے جو کچھ ہو سکے دوسروں کو خیر اور فائدہ پہنچائے چاہئے مالی ہو یا جانی۔ اگر کچھ نہ کر سکے تو کم از کم یہ تو کرے کہ جب دوسروں سے ملے تو اس انداز سے ملے کہ دوسرا دیکھ کر خوش ہو جائے، اور کسی مسلمان کے دل میں سرور و خوشی داخل کرنا بھی نیکی ہے۔ لہذا ملاقات کے وقت چاہئے کہ آدمی سلام میں پہل کرنے کی کوشش کرے اور اس کے ساتھ مسکراہٹ بھی اختیار کرے۔ تاہم بے ہودہ بکواس اور تنزیہ و تہقہہ دلانے والا مزاح اس حدیث کا مصداق یا سرا نہیں ہے، جیسے بعض لوگ مذاق ہی مذاق کرتے رہتے ہیں، اور اس کے لئے لطیفوں اور جھوٹ یا فضول گوئی کو بنیاد بناتے ہیں۔



باب ماجاء فی فضل الثريد

”عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: کمل من الرجال کثیرو لم یکمل من النساء إلا مریم بنت عمران واسیة امرأة فرعون وفضل عائشة علی النساء کفضل الثريد علی سائر الطعام“۔^۱

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں میں بہت سے لوگ کامل ہوئے۔ جبکہ عورتوں میں سے کامل نہ ہوئیں مگر مریم بنت عمران اور آسیہ فرعون کی بیوی اور عائشہ کی فضیلت و برتری عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے ثرید کی برتری باقی کھانوں پر۔

لغات:- قولہ ”کمل“ تینوں بابوں سے آتا ہے نصر، کرم اور علم سے لہذا ہم پر تینوں حرکات پڑھنا جائز ہیں، کمال سے ماضی کا صیغہ ہے۔ کمال کی دو قسمیں ہیں (۱) کمال اول (۲) کمال ثانی۔ اول تمام اشیٰ فی مرتبہ الذات کو کہتے ہیں اور ثانی تمام اشیٰ فی مرتبہ الصفات کو کہا جاتا ہے۔ یہاں کمال ثانی کا بیان ہے کیونکہ بات صفات اور خوبیوں کی ہو رہی ہے، نہ کہ ذات کی۔ قولہ ”الثريد“ مفتحة ثاء و کسرة راء بروزن عظیم و شریف، وہ کھانا جو شوربہ میں روٹی کے کڑے ڈال کر بنایا جائے خواہ شوربا گوشت والا ہو، اس میں گوشت بھی ہو یا کسی اور چیز کا جیسے نماز کا شوربہ ہو یا گوشت کا ہو مگر اس میں بوٹی نہ ہو۔

تشریح:- بعض روایات میں حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہؑ کا بھی بطور حصر ذکر ہے۔^۲ چونکہ مردوں میں کاملین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے ان کے بیان میں کلام کو حصر سے خالی رکھا۔ جبکہ عورتوں کے کمال کے لئے ادوات حصر جو لم اور الا کے الفاظ ہیں ذکر فرمادیئے۔ بعض حضرات نے کمال سے مراد صفات نبوت پر فائز ہونا لیا ہے علیٰ ہذا پھر یہ دونوں خواتین انبیاء کی جماعت میں شامل ہوں گی، یہ رائے امام اشعریؒ کی طرف

باب ماجاء فی فضل الثريد

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب المناقب ”باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا“ ومسلم فی کتاب فضائل الصحابة والنسابة فی عشرة النساء، وابن ماجه ”باب فضل الثريد علی الطعام“ ابواب الاطعمة، بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۳۳ ج: ۲ قدیمی کتب خانہ۔ ۲۔ راجع لفضائل فاطمة رضی اللہ عنہا مسند رک حاکم من ص: ۳۶۱ ج: ۳ تا ص: ۳۷۱ ج: ۳ ”کتاب معرفة الصحابة“ وفيه ان النبی ﷺ قال حسبک من نساء العالمین اربع، مریم بنت عمران واسیة امرأة فرعون و خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد، هذا حديث صحيح علی شرط الشيخين ولم یخرجاه ص: ۳۶۸ ج: ۳۔

منسوب ہے کہ وہ چھ عورتوں کو نبیہ قرار دیتے تھے، خواء، سارہ، ہاجرہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، آسیہ اور مریم۔ ان آخری دونوں کا ذکر حدیث باب میں بھی ہے۔ تاہم جمہور علماء نبوت کے لئے ذکر و ثبوت شرط قرار دیتے ہیں لہذا کوئی عورت نبیہ نہیں بن سکتی۔ اس بارے میں فریقین کے دلائل چونکہ ظنی ہیں اس لئے کہا جائے گا کہ یہ مسئلہ عقائد سے تعلق نہیں رکھتا بس یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ جس کی نبوت بعینہ ثابت ہے اس پر بعینہ ایمان لانا لازم ہے اور جس کی نبوت اجمالاً ثابت ہو اس پر اجمالی ایمان کافی ہے، لہذا جن انبیاء کے نام معلوم ہیں ان پر ہاشم ایمان لازمی ہے، اور باقی جتنے بھی انبیاء ہیں ان پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے خواہ ان میں عورت کیوں نہ ہو۔ چنانچہ علامہ کمال بن ابی شریف التوفیٰ ۹۰۵ھ ہجری شیخ ابن ہمام کی (کتاب المسامیرہ کی شرح المسامیرہ کے ص: ۱۲۰ و ص: ۱۳۰) پر ایک نفیس بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں: ”والادلة من الحنابین ظنیة... وفيه لك ان تمنع وجوب اعتقاد اشراط الذکورة فی النبی“ الخ۔

بہر حال جمہور کے نزدیک اس حدیث میں کمال سے مراد صفات نبوت تک ارتقاء مراد نہیں بلکہ انسانی اختیاری کمالات اور درجہ ولایت تک رسائی مراد ہے، اس طرح جمہور کے نزدیک یہ حصر تمام عالمین کی عورتوں کی منہب نہ ہوگا بلکہ اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے ہوگا کیونکہ ولایت کے درجہ پر تو بہت سی عورتیں فائز ہو چکی ہیں مگر جن عورتوں کی بعینہ صراح سرائی قرآن میں آئی ہے، وہ یہی تین خواتین ہیں باقی بہت سی عورتوں کا ذکر یا تو کسی واقعہ کے ضمن میں آیا ہے یا پھر اجمالاً ہوا ہے لہذا کہا جائے گا کہ ولایت کا مقام پانے والی خواتین بہت زیادہ ہیں مگر قرآنی سند تعریف و عفت اور مقبولیت بعینہ صرف ان تینوں کو حاصل ہے، اور جب ولایت کمال ہے تو نبوت بطریق اولیٰ کمال ہے۔

افضل کون؟ :- یہاں یہ بحث بھی چھیڑی گئی ہے کہ دنیا کی خواتین میں افضل ترین کون ہے؟ حضرت مریم؟ حضرت خدیجہ؟ حضرت فاطمہ؟ یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن چونکہ اس حدیث میں فضیلت کا بیان ہے اور اس فضیلت میں شریہ کی مثال ذکر کی گئی ہے تو شریہ میں بلاشبہ بہت سے فوائد ہوتے ہیں لیکن مع ہذا اس کا تمام کھانوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لئے علماء نے اس پر بحث کی ہے کہ افضل خاتون کون ہے، یہ مسئلہ مناقب کا ہے جو ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں اجمالاً و اختصاراً اتنی سی بات عرض ہے کہ عام علماء کی رائے یہ ہے کہ بعض وجوہ سے ایک افضل ہے اور بعض سے دوسری، چونکہ دلائل محتمل ظنی ہیں اس لئے یہ مسئلہ بھی عقائد کا نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البائتہ میں اس پر بحث فرمائی

ہے، کہ کن کن مسائل سے آدمی اہل سنت والجماعت سے خارج نہیں ہوتا اس کے ضمن میں ایک مثال یہی دی ہے، یعنی یہ ان مسائل میں سے ہے جو نہ تو قرآن کریم میں صراحتاً مذکور ہیں نہ احادیث مشہورہ سے ثابت ہیں اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے اس بارے میں لب کشائی کی ہے، تا آنکہ کچھ اہل علم آئے جنہوں نے ان مسائل کو چھیڑا اور اختلاف رونما ہوا "کفضل الانبیاء علی الملائکۃ وفضل عائشۃ علی فاطمۃ رضی اللہ عنہما"۔ قالہ فی مقدمۃ الکتاب

باب ماجاء انہشوا اللحم نہشاً

"عن عبد اللہ بن الحارث قال رَوَّحَنی ابی فدعانُ أَنَسَ فہم صفوان بن اُمیۃ فقال: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: انہسوا اللحم نہساً فانہ اُھنأُ وأمرءٌ"۔^۱

حضرت عبد اللہ بن حارث سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے میری شادی کر دی، تو کچھ لوگوں کو مدعو کیا جن میں حضرت صفوان بن امیہؓ بھی تھے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے گوشت دانتوں سے نوج نوج کر کھالیا کرو کہ اس طرح کھانا مزیدار اور خوشگوار تر ہوتا ہے۔

لغات:۔ قولہ "انامسا" اس اصل ہے لانا اس کی پھر کثرت استعمال سے ہمزہ ساقط ہو اور لام کو نون میں مدغم کر دیا تو الناس ہو گیا۔ (لسان العرب) "والناس اسم جمع" تفسیر روح المعانی۔

قولہ "انہسوا" نہسا سے امر کا صیغہ ہے بعض نسخوں اور روایتوں میں شین کے ساتھ آیا ہے، بعض اہل لغت نے دونوں میں فرق نہیں کیا ہے مگر بعض اہل لغت یہ فرق بتاتے ہیں کہ اگر اگلے دانتوں سے نوج لیا جائے تو اس کے لئے نہس کا لفظ یعنی سین ہمد کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے جبکہ ڈاڑھوں سے نوچنے کو نہش بالشین المعجم کہا جاتا ہے۔^۲ قولہ "اُھنأُ" جو کھانا مرغوب اور غرض کے مطابق ہوا سے خضی کہتے ہیں۔ اور قولہ "أمرءٌ" مرئی سے ہے جو کھانا ہضم ہو کر بخوبی جز و بدن اور موجب صحت دقت بنے وہ مرئی ہے۔

باب ماجاء انہشوا اللحم نہشاً

۱ الحدیث اخرجہ الدارمی ص ۱۳۵ ج ۲ حدیث ۲۰۷۰ کتاب الاطعمۃ، ایضاً رواہ احمد فی مسندہ ۳/۳۰۰۔
۲ نہس و نہش میں فرق: نہس هو اخذ اللحم بانہبہم من اعلی العظم او اخذ اللحم باطراف اللسان والنہش الاخذ بحمیمہا، حاشیہ ۲۰ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۲ ج: ۲ کتاب الاطعمۃ

تشریح:- چونکہ عربوں میں نیم پختہ گوشت کھانے اور پسند کرنے کی عادت تھی، اور بڑی بڑی بوٹیاں بناتے تھے جن میں ہڈی پر گوشت لگا رہتا تھا اس لئے ہمارے زمانے کی طرح انگلیوں سے گوشت علیحدہ کرنا مشکل ہوتا تھا، کیونکہ ہم تو گوشت کو کھلا کر کھاتے ہیں بلکہ کبھی تو وہ گوشت دیگ کے اندر ہی ہڈی سے خود بخود علیحدہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسے نوچنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی نیز ہمارے ہاں بوٹیاں چھوٹی چھوٹی بنانے کا دستور ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوچ کر کھانے کا مشورہ دیا جو لذیذ تر بھی ہوتا، خاص کر وہ گوشت جو ہڈی کے ساتھ چپکا ہوا ہو چونکہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر معدے میں جاتا ہے اس لئے زود ہضم بھی ثابت ہو جاتا ہے، پھر ابن العربی نے عارضہ میں لکھا ہے کہ خالی ہڈی کو واپس برتن میں نہ رکھے، بلکہ اپنے سامنے دسترخوان پر رکھ دے یا پھر اپنے ہاتھ ہی میں تھامے رکھے۔ آج کل تو وسعت کا زمانہ ہے کھانے کے لئے دسترخوان بچھانے کا رواج عام ہو گیا ہے بلکہ سلیقہ مند لوگ زائد بوٹیوں کے لئے الگ خالی پلیٹ بھی دسترخوان پر رکھتے ہیں، اور بعض ہوٹلوں میں میز کے نیچے برتن یا ڈبہ وغیرہ ہوتا ہے لہذا اسی کا استعمال کیا جائے۔

اس حدیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ گوشت کا یہی طریقہ کھانے کے لئے متعین ہے، بلکہ اگلے باب میں ٹھہری سے کاٹ کر کھانا بھی ثابت ہے، اور ابوداؤدؒ و بیہقی کی جس روایت میں ٹھہری کے استعمال سے منع آیا ہے وہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چونکہ اس روایت میں کھانے کے مذکورہ طریقے کی علت لذیذ تر اور خوشگوار ہونا بتلائی ہے اس لئے اگر یہ علت کسی اور طریقے میں پائی جائے تو وہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

قوله "وقد تکلم بعض اهل العلم فی عبد الکرم المعلم" مگر اس تکلم کے باوجود عبد الکرم ضعیف نہیں ہے بلکہ مختلف فیہ ہے۔

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۷۴ ج: ۲ "باب فی الاکل من اعلی الصفحة" کتاب الاطعمہ، سنن کرمی للبیہقی ص: ۱۰۴ ج: ۱۱ حدیث: ۱۴۹۹۱ ابواب الولیمة قال رسول اللہ ﷺ لا تقطعوا اللحم بالسکین فان ذالک من صنع الاعاجم ولكن انهموه فانه اهنأ و اعمراً. حفیظ الرحمن الحنفی لدولة العلم کراچی۔

باب ماجاء عن النبی ﷺ فی الرخصة

فی قطع اللحم بالسکین

”عن جعفر بن عمرو بن أمية الضمري عن ابيه انه رأى النبي صلى الله عليه وسلم احتزمن كسف شاة فأكل منها ثم مضى الى الصلوة ولم يتوضأ“۔^۱

حضرت جعفر بن عمرو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، جو ٹھہری سے بکری کے شانے سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر تناول فرمایا۔

لغات:- قولہ ”احتزمن“ کا معنی ہے، حز کے معنی کاٹنے کے ہیں۔
قولہ ”کسف“ بفتح اول و کسر ثانی مونث ہے اور کندھے کو کہتے ہیں جبکہ ”سکین“ ٹھہری کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس روایت سے گوشت کو ٹھہری کے ذریعے کاٹ کر کھانا ثابت ہوا جیسا کہ گذشتہ باب میں اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اسی پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ پھلوں کے کھانے میں بھی اختیار ہے چاہے تو آدمی سیب اور کھیر اور غیرہ و انتوں سے کاٹ کر کھائے یا ٹھہری سے کاٹ لے۔ اسی طرح اگر روٹیوں کو ٹھہری سے کاٹنے کی ضرورت پیش آجائے جیسے بعض مدارس اور بعض بڑے بڑے نگر خانوں میں ہوتا ہے تو وہ بھی جائز ہے، اور اس سلسلہ میں نبی کی روایت صحیح نہیں۔ کم از کم اس میں ابو معشر ہیں جو ضعیف ہیں۔^۲

باب ماجاء أي اللحم كان أحب الي رسول الله ﷺ؟

”عن ابی هريرة قال أتى النبي صلى الله عليه وسلم بلحم فذبح اليه الذراع وكان يعجبه ففهم منها“۔

باب ماجاء عن النبی ﷺ فی رخصة فی قطع اللحم بالسکین

۱۔ الحديث أخرجه البخاري من: ۸۱۴ ج: ۲ كتاب الاطعمة ومسلم من: ۱۵۷ ج: ۱ كتاب الحيض، سنن كبرى للبيهقي من: ۱۰۳ ج: ۱ ابواب الموليمة. ۲۔ قال البيهقي بمختلف حديث البخاري، وفي هذا دلالة على جواز قطعه بالسکین وان الخبر الذي قلناه ان صح فانما اراد به والله اعلم انه اذا نهى كان اطيب كالخبر الاول من: ۱۰۳ ج: ۱۱ الحنفی علی عنه

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت کا ہدیہ پیش کیا گیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازو پیش کیا گیا چونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا تو (اس لئے قبول فرما کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دانتوں سے نوچ نوچ کرتا دل فرمایا۔

لغات: - قولہ "السراع" یکسر الذال بروزن کتاب اصل میں کھائی کو کہتے ہیں، یعنی کہنی سے ہتھیلی تک کا حصہ جسے ساعد بھی کہتے ہیں۔

تشریح: - اس کو پسند کرنے کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ جلدی تیار اور پک جاتا ہے، جس سے دقت کی بچت اور تکلفات سے اجتناب مقصود تھا۔ دوم یہ لذت بھی ہوتا ہے۔ سوم یہ نجاست کے مواضع سے دور بھی ہوتا ہے۔ مع ہذا اس میں اور دانتوں سے نوچنے میں تواضع بھی ہوتی ہے۔ ایک وجہ اگلی روایت میں بیان کی گئی ہے۔

دوسری حدیث: - یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازو کا گوشت صرف اس لئے زیادہ پسند تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کبھار گوشت میسر ہوتا پس بازو کا گوشت جلدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا کیونکہ یہ جلدی پک جاتا۔

لغات: - اس حدیث میں "بعجل" مجہول کا صیغہ ہے اور "الیہ" کی ضمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے جبکہ "لأنہ" کی ضمیر لحم ذراع کی جانب لوٹتی ہے۔ قولہ "نضجھا" پکنے اور تیار ہونے کو کہتے ہیں اس لئے یہ لفظ مجبور کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے نفع اتمر بھی کہتے ہیں اور نفع اللحم نضجا بھی۔

تشریح: - اس حدیث میں اور باب کی سابقہ روایت میں کوئی تعارض نہ سمجھا جائے، کیونکہ اس میں پسندیدگی کی مطلق نفی مراد نہیں ہے بلکہ پسند کرنے کی ایک وجہ بتلائی ہے جبکہ سابقہ روایت مطلق عن التقید ہے لہذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

حضرت عائشہ اپنی اس روایت میں اس توہم کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کو کیسے پسند فرمایا حالانکہ یہ تولد اند میں سے ہے تو انہوں نے دفع کی غرض سے فرمایا کہ یہ پسندیدگی بھی زہد کی بنا پر تھی کہ اس سے فراغت جلدی ملتی ہے۔

باب ماجاء فی الخل

عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: نعم الإدام الخل۔^۱

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سرکہ کیانی اچھا سالن ہے۔

لغات:- ”حسل الخاء وتشدید اللام سرکہ کو کہتے ہیں جبکہ بکسر الخاء جگری دوست کو کہا جاتا ہے، سرکہ گھٹنے یا پھلوں کے رس کو دھوپ میں رکھ کر بنایا جاتا ہے، جو ترش اور کھٹا ہوتا ہے شراب سے بھی بنایا جاسکتا ہے اگرچہ شراب سے بنانے کے جواز میں اختلاف ہے جو فقہ میں بیان ہوا ہے۔ قولہ ”الإدام معفود ہے اور جمع اذم آتی ہے جیسے کتاب اور کتب، ادام ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو روٹی کے ساتھ کھائی جائے یعنی سالن۔“

تشریح:- سرکہ کو سالن قرار دینے کا مطلب امام خطابی نے یہ بتلایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کی چیزوں میں تکلفات سے بچنے کی ایک ترغیب دی ہے، کہ جو چیز بآسانی میسر ہو اور عام ہوا سی پراکتفا کر لینا چاہئے لذیذ کھانوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہئے کہ ہوس پرستی سے دین تباہ ہو جاتا ہے اور آدمی اپنی انتشار میں مبتلا رہتا ہے، جیسا کہ آج کل عام مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے کہ زیادہ اور اچھے کھانوں کے چکر میں سارا وقت دنیا کمانے پر خرچ کرتے ہیں، اور پھر بھی خواہشات پوری نہیں ہوتیں نتیجہ یہ نکلا کہ نہ کسی کے پاس خشوع والی نماز پڑھنے کی فرصت ہے اور نہ ہی تلاوت کی۔ بلکہ بہت سے بے چارے تو نماز ہی نہیں پڑھتے ہیں۔

حدیث آخر:- ”عن ام ہانئ بنت ابی طالب قالت دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: هل عندکم شئ؟ فقلت: ”لا“ إلا کسر ہامسة وحل فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ”قریبہ فما انقرب بیت من ادم فیہ حل“۔“

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میرے یہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی الخل

۱۔ الحدیث أخرجه ابو داؤد ص: ۱۷۹ ج: ۲ ”باب فی الخل“ کتاب الاطعمه، أيضاً من ابن ماجه ص: ۲۳۸ ابواب الاطعمه.

تشریف لائے، تو فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی چیز (کھانے کی) ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں البتہ خشک (روٹی کے) ٹکڑے اور سرکہ ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ پیش کر دو کیونکہ جس گھر میں سرکہ ہو وہ سالن سے خالی نہیں ہوتا۔

لغات :- ”مسسر“ بکسر الکاف وفتح السین روٹی کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں اس کا مفرد کسرة آتا ہے۔
 قولہ ”اقفر“ قمر خالی کو کہتے ہیں اور قفار وہ زمین جو پانی سے خالی ہو قبر حرب بکمان فغر“ اسی طرح قفار بغیر سالن والے کھانے کو بھی کہتے ہیں۔ قولہ ”من آدم“ بسکون الدال مفرد کا صیغہ ہے ”فیه نخل“ جملہ ”یت“ کی صفت ہے اور ”من آدم“ درمیان میں فصل ہے۔

تشریح :- حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس گھر میں سرکہ موجود ہو وہ سالن سے خالی نہیں کہلاتا، اس میں بھی زہد کی ترغیب ہے، کہ چونکہ کھانے کا اصل مقصد پیٹ پالنا ہے اور طاعات کے لئے کمر کو سیدھا رکھنا ہے اللہ اور نفس کو خوش کرنا نہیں ہے، لہذا جس چیز سے اصلی مقصد پورا ہو سکتا ہے اس کی نفی نہیں کرنی چاہئے، جیسے نفس لباس سے زینت نہ بھی ہو ستر تو ہوتا ہے۔

قولہ ”وام هانئى ماتت بعد على بن ابى طالب بزمان“۔

امام ترمذی دراصل ایک اعتراض کا جواب دینا چاہتے ہیں، کہ ام ہانی کی یہ روایت تو منقطع ہے کیونکہ امام شعبی کا سماع ام ہانی سے ثابت نہیں جیسا کہ امام بخاری کی رائے ہے، اور امام ترمذی نے بھی علل کبیر میں نقل فرمایا ہے، تو امام ترمذی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ امام شعبی کا سماع حضرت علیؓ سے ثابت ہے کہ انہوں نے عورت کو رجم کرنے کے بعد فرمایا ”وحتھا بمنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کما عند البخاریؒ اور ام ہانی اپنے بھائی حضرت علیؓ کے بعد وفات پائی ہیں لہذا سماع ممکن ہے، اس لئے انقطاع کا اعتراض صحیح نہیں غرض روایت جمہور کی شرط پر پوری ہے۔

باب ماجاء فی اکل البطیخ بالرطب

”عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان يأکل البطیخ بالرطب“۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غریزہ تازہ کھجور کے ساتھ

تناول فرماتے۔

لغات :- ”البطیخ“ یکسرہ باء وتشدید الطاء المسکورة بروزن مزین عام اعلیٰ لغت و شارحین کے نزدیک خر بوزے کو کہتے ہیں۔ الکوکب الدری کے حاشیہ پر ہے کہ ملا علی قاریؒ نے شرح شامل میں اس کو تر بوز کے معنی میں لیا ہے جو بظاہر غلط فہمی ہے۔ حضرت گنگوہی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس غلط فہمی کا منشاء یہ ہے کہ ابوداؤدؒ کی روایت میں ہے ”نکسر خرّ هذا بیرد هذا“ یعنی ہم اس کی گرمی کو اس دوسرے کی ٹھنڈک سے توڑتے ہیں، اور کھجور تو گرم ہے اور خر بوزہ بھی گرم ہے تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد تر بوز ہی ہے، مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اس برووت سے مراد حسی ٹھنڈک ہے نہ کہ مزاج کی برووت، اور جن لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں پر کچا خر بوزہ مراد ہے، کیونکہ پکا ہوا گرم ہوتا ہے تو وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ کچا تو کھایا نہیں جاتا کذا فی الکوکب الدری۔ قولہ ”الربط“ بضم راء اور فتح طاء کی ہوئی تازہ کھجور کو کہتے ہیں۔

تشریح :- مجسم اوسطؒ میں طبرانی نے اور ابو نعیم نے طب میں ایک ضعیف حدیث میں دونوں کو ایک ساتھ کھانے کا طریقہ یہ نقل کیا ہے، کہ کھجور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیدھے ہاتھ میں ہوتیں اور خر بوز ہاتھ میں۔ اس کی حکمت ابوداؤدؒ کی مندرجہ بالا روایت میں خود بیان ہوئی ہے، کہ ملا کر کھانے سے ان کے مزاج میں اعتدال پیدا ہوتا ہے، کیونکہ ہر ایک دوسرے کی حدت اور تیزی کو توڑ دیتا ہے، جیسا کہ عناصر و مغروات کا ضابطہ ہے، نیز اس سے خر بوزہ کی میٹھاس میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور کھجور کی خشکی مضاعف ہو جاتی ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے علاج کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ کسی مضر چیز کا مقابلہ اس کی ضد سے کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ بیک وقت ایک سے زائد اشیاء کھانے میں شامل کرنا جائز ہیں خصوصاً جب وہ متضاد ہوں۔ تاہم بعض متضاد اشیاء کو ملانے سے ایسا مزاج جنم لیتا ہے جو صحت کے لئے مضر ہوتا ہے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم وعلیہ السلام

باب ماجاء فی اکل البطیخ بالربط

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ ”باب الجمع بین اللونین عند الاکل“ کتاب الاطعمہ.

۲۔ کذا فی مجمع الزوائد ص: ۳۲ ج: ۵ حدیث: ۷۹۹۷ کتاب الاطعمہ عن انس بن مالک ان رسول اللہ ﷺ کان

یاخذ الربط بيمينه والبطیخ بيساره فیاکل الربط بالبطیخ وكان احد الفاكهة اليه ۱۲ المحنفی عفی عنه

۳۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۰ ج: ۲ کتاب الاطعمہ.

باب ماجاء فی اكل القثاء بالرطب

عن عبد الله بن جعفر قال كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یأکل القثاء بالرطب
حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ککڑی کھجور کے ساتھ
کھاتے تھے۔

لغات :- قولہ ”القثاء“ بکسرۃ قاف وتشدید الثاء ککڑی کو کہتے ہیں کھیرے پر بھی اطلاق ہوتا ہے تاہم
یہاں ککڑی مراد ہے۔

تشریح :- اس کی حکمت بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی علاوہ ازیں یہ دونوں ایک ساتھ کھانے سے
صحت مندی اور وزن میں اضافہ بھی ہوتا ہے، اس لئے حضرت عائشہ ”فرماتی ہیں کہ میری والدہ نے مجھے رخصتی
سے قبل یہ دونوں چیزیں کھلائیں جس سے میرے جسم میں فربہ ہو گئی۔

باب ماجاء فی شرب ابوال ابل

عن انس بن مالک ان انساً من غریفہ قدموا المدینۃ فاجتروا ما فیہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فی ابل الصدقة وقال: اشربوا من البانہا وابلہا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ عربینہ کے کچھ لوگ مدینہ آئے تو آپ دہرا موافق نہ
آنے سے ان کے پیٹ پھول گئے اور رنگ زدہ ہو گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اونٹوں
کی طرف بھیجا اور فرمایا تم ان کے دودھ پیا کرو اور پیشاب کو۔

اہم حدیث کی تشریح جلد اول میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد اول ”باب ماجاء فی
بول ماہو کل لحمہ“ ص: ۲۳۵)

باب الوضوء قبل الطعام وبعده

”عن سلمان قال قرأت فی التوراة ان برکۃ الطعام الوضوء بعده فذکرت ذالک للنبی
صلی اللہ علیہ وسلم وَاخبرته بما قرأت فی التوراة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: برکۃ

الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده"۔^۱

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا، کہ کھانے کی برکت وضوء کرنا (منہ ہاتھ دھونا) ہے، کھانے کے بعد یس میں نے اس کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور جو میں نے تورات میں پڑھا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دیدی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانے کی برکت تو اس سے پہلے ہاتھ دھونا اور اس کے بعد ہاتھ منہ دھونا ہے۔

تشریح: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے سے پہلے تورات میں یہ مضمون پڑھا تھا، تو جب اسلام لائے اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور ان سے اس کی تصدیق کرا تا چاہی کہ کہیں یہود نے اس میں تحریف نہ کی ہو یا پھر مقصد یہ تھا کہ برکت کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے ساتھ مختص ہے یا اس سے پہلے بھی دھونے سے برکت ہو جاتی ہے؟ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے اور آخر دونوں میں برکت ہے۔ اگر سوال تصدیق کے بارے میں تھا تو جواب کا مقصد یہ ہے کہ اس میں تحریف ہوئی ہے، کیونکہ اصل حکم کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد دونوں پر مشتمل تھا مگر یہود نے پہلے والے حکم کو غائب کر دیا۔ اور دوسری صورت میں جواب کا مطلب یہ ہے کہ ہماری شریعت میں کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھونے سے برکت حاصل کی جاسکتی ہے۔

وضوء کا اطلاق اگرچہ شریعت میں ہاتھ پاؤں سمیت منہ وغیرہ دھونے اور سر کے مسح پر ہوتا ہے، تاہم لغت اور عرف میں اس کے معنی صرف ہاتھ دھونے یا ہاتھ اور منہ دھونے کے ہیں اور یہاں یہی مراد ہیں، گو کہ بعض حضرات نے جیسے صوفیہ کرام وغیرہ اس کو شرعی وضوء پر بھی حمل کرتے ہیں۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں "والناس یرون الوضوء قبل الطعام ینفی الغفرو بعده ینفی اللہم" اور ابن ماجہ کی ایک ضعیف ثلاثی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔^۲

حدیث باب کے بارے میں امام منذریؒ فرماتے ہیں کہ یہ درجہ حسن سے کم نہیں۔ لہذا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے بارے میں اگرچہ کوئی صحیح روایت نہیں ہے تاہم ایسی روایات ہیں جو اشارۃً اس پر دلالت

باب الوضوء قبل الطعام وبعده

۱ الحدیث أخرجه الحاكم في المستدرک ص: ۳۵ ج: ۵ کتاب الاطعمة. ۲ سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۵ "باب الوضوء عند الطعام" ابواب الاطعمة قال رسول اللہ ﷺ من أحب ان یكثر اللہ عبوداً ینفی الغفرو بعده ینفی اللہم اذا حضر هذا فاعرفه واذا رفع ۱۲

کرتی ہیں، مثلاً صفائی ستھرائی کے متعلق احادیث جن سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھاتے وقت ہاتھ دھونا کھانے کے آداب اور مستحبات میں سے ہے، اور باب کی روایت بھی حسن ہے۔

آج جبکہ راقم یہ باب لکھ رہا ہے اخبارات میں لاکھوں روپیہ کے اشتہارات اقوام متحدہ اور صابن بنانے والی کمپنیوں کی جانب سے چھپے ہیں یہ اشتہارات ہاتھ دھونے کے عالمی دن منانے کے موقع پر شائع کئے گئے ہیں جن میں ایک بہت بڑے ہاتھ کی تصویر کے ساتھ لکھا ہے کہ زندگی بچانے کی طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے، عالمی سطح پر آج پروگرام کئے جا رہے ہیں اور اس بات کی تشہیر کی جا رہی ہے کہ صابن سے ہاتھ دھونے سے ڈائیریا (اسہال) اور نمونیا کی اموات میں کمی واقع ہو جاتی ہے ہاتھ دھونے سے ہیپائٹس سے بھی بچا جاسکتا ہے۔ تاہم کھانے کے بعد ہاتھ کی انگلیاں چاٹ کر دھوئے یا کسی کپڑے اور نشو و پیر وغیرہ سے خشک کر دے چنانچہ ابو داؤد کی روایت میں ہے۔

”عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اكل احدکم فلا یمسح یدہ بالمندیل حتی یمسحوا بالیمن یمسحوا“۔^۱

یہاں برکت سے مراد نفع اور فوائد ہیں کہ ہاتھ دھونے سے آدمی صحت مند رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی گھسن نہیں آتی اور کھانے کے بعد ہاتھوں کی صفائی سے آدمی بہت سی ناگوار چیزوں سے بچا رہتا ہے۔ نہ ہاتھ پر کھیاں بیٹھیں گی نہ رات کو کیڑے مکوڑے اور چوہے کاٹیں گے اور نہ ہی کپڑے میلے ہوں گے وغیرہ وغیرہ کچھ مزید باتیں اگلے باب میں آئیں گی۔

باب ماجاء فی ترک الوضوء قبل الطعام

”عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج من الخلاء فقرب الیہ طعام فقالوا: ألاتأتیک بوضوء؟ قال انما أمرت بالوضوء اذا قمتم الی الصلوۃ“۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے نکلے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا لایا گیا، تو حاضرین نے کہا کہ کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضوء کا پانی نہ لائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے وضوء کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب میں نماز پڑھنے کے لئے اٹھوں۔

لغات :- ”خلاء“ سماء کے وزن پر خالی جگہ کو کہتے ہیں۔ تاہم منقول عرفی کے طور پر اس کا استعمال بیت الخلاء کے لئے ہوتا ہے کہ وہ بھی ضرورت کے سوا اوقات میں خالی رہتا ہے۔ قولہ ”فقالوا“ یعنی حاضر مجلس میں سے بعض صحابہ کرامؓ نے فرمایا۔ قولہ ”بوضوء“ بفتح الواو، وضو کا پانی جبکہ بضم الواو معنی مصدری یعنی وضو کرنے کے لئے آتا ہے یہاں بفتح الواو ہی ہے۔

تشریح :- صحابہ کرامؓ کا یہ کہنا از قبیل عرض ہے جیسے ”الآن تنزل عندنا“ یعنی کیا آپ وضو نہیں کرتے ہیں؟ چونکہ صحابہ کرامؓ یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد المحدث وضو واجب ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیت الخلاء سے نکلے ہیں تو دیگر مصروفیات کھانے وغیرہ سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو یاد دلایا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ظن رد کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے وضو کا حکم ہے، جب میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوں، یہ مطلب حدیث کے ظاہر کے موافق ہے اس میں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ہر نماز کے لئے وضو کرنا کسی پر بھی واجب نہیں اس لئے کہا جائے گا کہ یہاں جواب عام احوال پر مبنی ہے، ورنہ با وضوء ہونے کی صورت میں تجدید وضوء لازمی نہیں۔ یہ مسئلہ تفصیلاً تشریحات ترمذی جلد اول ص ۲۱۰ تا ۲۱۳ پر گزرا ہے دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فن شاء الاطلاع فلیراجع (باب الوضوء لكل صلوة باب ما جاء انه یصلی الصلوات بوضوء واحد)

تاہم امام ترمذیؒ نے جس مقصد کے لئے یہ باب باءدھا ہے وہ اس طرح اُجاگر ہو سکتا ہے کہ یا تو اس حدیث میں وضوء سے نظافت یعنی لغوی وضو لیا جائے اور صحابہ کرامؓ کا مقصود یہ تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ نہیں دھوتے؟ چونکہ صحابہ کرامؓ اس کو لازمی تصور کرتے تھے، تو جواب کا مطلب یہ ہوگا کہ جب ہاتھوں یا جسم پر نجاست حسی نہ ہو تو اس کو دھونا طہارت حکمی کے ضمن میں آتا ہے۔ اور طہارت حکمی کا حکم تو نماز کے وقت ہے لہذا جن اعمال کے لئے طہارت حکمی لازمی نہیں وہاں پانی کا استعمال واجب نہیں، غرض آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض نفی وجوب وضوء شرعی و لغوی ہے، نفس وضوء کی نفی مراد نہیں ہے، علیٰ ہذا اس سے ہاتھ دھونے یا وضوء کرنے کی کراہیت پر استدلال کرنا درست نہیں جیسا کہ امام سفیان ثوریؒ نے کیا ہے، اور امام ترمذیؒ نے ان کا قول اسی باب میں نقل کیا ہے ہاں اگر کوئی شخص بہر حال ہاتھ دھونے یا وضوء کرنے کو ضروری اور سنت تصور کرتا ہو اور پابندی سے اس پر عمل پیرا ہو تو پھر سب کے نزدیک مکروہ ہونا چاہئے۔ علیٰ ہذا امام احمدؒ اور امام مالکؒ کی طرف جو عدم انتخاب یا کراہیت کے قول کی نسبت کی جاتی ہے اس کو اسی لزوم والی صورت پر حمل کیا جائے گا، پھر جنبی آدمی ہاتھ کے ساتھ منہ بھی دھوئے عام حالات میں کلی کرنا سنت نہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اگر ہاتھ گندے یا میلے ہوں تو کھانے سے پہلے انہیں دھونا لازمی یا کم از کم مستحب ہے۔ یعنی نجاست اور میل کے تناسب سے حکم میں زیادتی و کمی آتی رہے گی لیکن اگر ہاتھ صاف ہوں آدمی پہلے با وضوء ہو یا کچھ دیر پہلے ہاتھ صاف کر چکا ہو تو کھانے سے پہلے غسل کی تجدید کو لازمی قرار دینا مکروہ ہوگا جیسا کہ باقی احکام مندوب کا حکم و ضابطہ ہے۔ واللہ اعلم

قولہ ”وكان يكره ان يوضع الرغيف تحت القصعة“ یعنی امام سفیان ثوری روٹی پر برتن وغیرہ رکھنے کو مکروہ اور ناپسند فرماتے، کیونکہ اس سے روٹی کی بے قدری اور بے ادبی ہوتی ہے۔ استاد محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوکی نور اللہ مرقدہ نے اس موقع پر درس میں فرمایا کہ حضرت بخاری صاحب رحمہ اللہ جب طالب علم کو روٹی پر پلیٹ رکھتا ہوا دیکھتے تو اسے منع فرماتے۔

باب ماجاء في أكل الذبء

”عن ابي طالبوت قال: دخلت على انس بن مالك وهو يأكل القرع وهو يقول: يا لئك شعرة ما أحببك إلى لحب رسول الله صلى الله عليه وسلم إناك“۔

حضرت ابو طالبوت فرماتے ہیں کہ میں حضرت انسؓ کے یہاں چلا گیا اور اس حالیکہ وہ کدو کا سالن تناول فرما رہے تھے، اور فرماتے اے پیڑ تو کس قدر مجھے پسند ہے؟ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے محبت تھی۔

”عن انس بن مالك قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يتبع في الصحفة يعني الذبء فلا زال أجه“۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ پیالے میں کدو (کے کٹوے) تلاش کر رہے تھے پس میں اس سے ہمیشہ کے لئے (مستقل) محبت کرنے لگا۔

لغات:- ”الذبء“ بضم الدال وتشديد الباء والهمزة، قصر بھی جائز ہے کدو کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ”قرع“ بلخ القاف وسكون الراء بھی کدو کو کہتے ہیں۔ بقولہ ”يا لئك“ اور ما أحببک ”تجرب کے صیغے ہیں۔ ”شعرة“ تمیز ہے۔

تشریح:- اس باب کی دونوں حدیثوں سے لوکی اور کدو کی فضیلت معلوم ہوئی اور اطباء نے بھی اس

کے بہت سے فضائل بیان کئے ہیں، گویا کہ یہ غذا بھی ہے اور دوا بھی آج کل اگر چہ مصنوعی کھاد کی وجہ سے ترکاریوں کی لذت معدوم ہوتی چلی جا رہی ہے، لیکن جب اس کا رواج عام نہیں ہوا تھا تو ہم اپنے باغ میں لوکی کاشت کرتے بلاشبہ تمام ہزیوں سے لوکی زیادہ لذیذ معلوم ہوتی۔

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا ہے، اس لئے اس نیت سے اس کا اہتمام کرنا ایک مستحسن اقدام ہے امام نووی وغیرہ نے اسے افضل قرار دیا ہے، اور حضرت انسؓ کا اسے پسند کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں گو کہ قابل رشک ضرور ہے۔ جس طرح باپ کی صورت و سیرت اولاد میں دیکھی جاسکتی ہے کہ ”الولد سیئہ“ اسی طرح استاذ اور مرشد کی طبیعت بھی شاگرد اور مسترشد کے جسم میں سرایت کرتی ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ قوی تعلق والے اساتذہ و مشائخ کی بیماریاں بھی خوبیوں کی مانند عقیدت مندوں میں منتقل ہو جاتی ہیں، تو جس طرح خوبیاں و بیماریاں موروثی ہوتی ہیں اسی طرح روحانی وراثت میں بھی خوبیاں مل جاتی ہیں۔ اس کا عام مشاہدہ بچوں میں باسانی کیا جاسکتا ہے جب ماں باپ کسی چیز اور پیشے کو پسند کرتے ہیں تو بچے بھی اس کو پسند کرنے لگ جاتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال باعث تعلق نہیں بننا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے میں ادھر ادھر کیوں ہاتھ گھمایا جبکہ وہ دوسروں کو اپنے ہی آگے سے کھانے کا حکم دیتے؟ کیونکہ یا تو مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سائیڈ اور جانب میں ہاتھ دائیں بائیں پھراتے تھے یا پھر منع کرنے کی وجہ شرکاء کا گھن کرنا ہے جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک سے صحابہ کرامؓ کو کسی طرح کوئی گھن نہیں ہوتی بلکہ وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب مبارک حتیٰ کہ پیشاب کو باعث برکت سمجھتے وضوء کا پانی پینے اور سر کے بال بے بدل تو ان کے نزدیک حصول برکت کے قوی اسباب تصور کئے جاتے اور سارے صحابہ کرامؓ ان مبارک اشیاء کی تحصیل کے لئے کوشاں رہتے۔ علیٰ ہذا اگر کوئی شخصیت شرکاء کی نظر میں بہت ہی محترم و دار کسی کے آگے سے کھانے یا چیز اٹھانے سے عقیدت پر مبنی اثر نہ پڑتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں تاہم درمیان سے نہیں کھانا چاہئے اسی طرح ظاہر احادیث کی وجہ سے اپنے آگے سے ہی کھانا چاہئے۔

باب ماجاء فی اکل الزيت

عن زید بن اسلم عن ابيه ان عمر بن الخطاب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
كلوا الزيت وادهنوا به فانه من شجرة مباركة۔^۱

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، کہ زیتون کھالیا کرو اور اس کا تیل بدن پر ملنا کرو کہ یہ مبارک درخت سے نکلتا ہے۔
لغات :- قولہ 'الزيت' زیتون درخت کے تیل کو کہتے ہیں۔ قولہ 'ادهنوا به' ادھان پتھد یا الدال سے امر کا صیغہ ہے یعنی زیتون کا تیل روٹی کے ساتھ کھاؤ اور بدن کو اس سے مالش کرو۔ قولہ 'مباركة' برکت کے معنی زیادتی کے ہیں مگر پہلے گزرا ہے کہ فائدہ اور نفع کو بھی برکت کہتے ہیں یہاں یہی مراد ہے، کیونکہ عربستان خشک علاقہ ہے اس لئے بدن کی مالش خشکی سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

تشریح :- اس حدیث سے زیتون کی فضیلت معلوم ہوئی جو ہر زیتون کو شامل ہے تاہم مشرق وسطیٰ شام وغیرہ کے زیتون بالخصوص مبارک ہیں کہ ایک تو اس کی فضیلت سورہ نور کی آیت سے معلوم ہوتی ہے^۲ دوسرے وہ سرزمین حضرات انبیاء علیہم السلام کی مولد و مرقد ہے اس لئے وہ باقی اراضی سے ممتاز ہے۔ جب اصل مبارک ہوگی تو فرع بھی برکت سے لبریز ہوگی۔ علیٰ ہذا باب کی حدیث میں برکت کو اصلی معنی یعنی خیر پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ گویا جس طرح کھجور حجاز مقدس کا خاص پھل ہونے کی بدولت برکت کا حامل ہے، اسی طرح زیتون ارض انبیاء کی بناء پر مبارک ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے تاہم امام منذری فرماتے ہیں کہ امام حاکم نے اسے صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے لہذا یہ باوجود غرابت کے صحیح ہوئی۔

باب ماجاء فی اکل الزيت

۱۔ الحدیث أخرجه الدارمی ص: ۱۳۹ ج: ۲ حدیث: ۲۰۵۲۔ کتاب الاطعمة۔ ۲۔ كما قال الله تعالى: يوفى من شجرة مباركة زيتونة لا شرقية ولا غربية الخ سورة النور آیت: ۳۵۔ ۳۔ كذا فی مستدرک للحاکم ص: ۳۹ ج: ۵۔ کتاب الاطعمة، قال رسول الله ﷺ ابتدعوا بالزيت وادهنوا به فانه من شجرة مباركة هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجه ۲۔ الحنفی

باب ماجاء فی الأكل مع المملوک

عن ابی ہریرۃ بن ہریرہم ذالک عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا کفی احدکم خادمہ طعامہ حرّہ ودّعانہ فلیأخذ بیدہ فلیقعہ معہ فان ابی فلیأخذ لقمۃ فلیطعمہ ایامہ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ابو خالد کو اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا غلام (یا خادم) اس کے کھانے یعنی پکانے کی گرمی اور دھوکے کی مشقت اپنے ذمہ لے لے تو اسے چاہئے کہ اس خادم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھانے کے لئے بٹھائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو ایک نوالہ لیکر اسے کھلا دے۔

لغات :- قولہ ”کفا“ الف مقصورہ کے ساتھ فعل ماضی کا صیغہ ہے۔ اور ”احدکم“ مفعول بہ ہے جبکہ ”خادمہ“ فاعل ہے خادم سے مراد یہاں صرف غلام نہیں بلکہ ہر قسم کے ملازم کو شامل ہے خواہ وہ آزاد کیوں نہ ہو۔ ہاں گھر کی آزاد ملازمہ کا ہاتھ پکڑنا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کے لئے بٹھانا جائز نہیں لہذا وہ دیگر نصوص کی وجہ سے مستثنیٰ ہے۔ کئی کے معنی کسی کی طرف سے کسی کام کی کفایت کرنے یعنی قائم مقام ہونے کے ہیں۔ ”طعامہ“ مفعول ثانی اور ”حرّہ ودّعانہ“ طعام سے بدل ہیں۔

قولہ ”فلیقعہ“ اور ”فلیطعمہ“ دونوں بضم الیاء اور کسر العین ہیں کہ دونوں متعدی افعال ہیں۔ قولہ ”ایامہ“ مفعول بہ ہے۔

تشریح :- اس حدیث پاک میں مکارم اخلاق کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہے، کہ اگر کسی کا خادم اور ملازم اس کی خدمت میں کھانا تیار کر کے پیش کرے یا تیار کھانا لا کر رکھ دے تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانے میں شریک کیا جائے تاکہ اس کی دلجوئی بھی ہو جائے اور بھوک کی ضرورت بھی پوری ہو جائے، تاہم جو شخص ایسا نہیں کرتا اور اپنے ملازم کے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا ہے جیسے اکثر لوگ اپنے خاندان اور باروچی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تو کم از کم اتنا تو کر دے کہ اسے محروم نہ چھوڑے بلکہ کچھ نہ کچھ اسے پکڑا دے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں ہے ”فلیسنا ولہ اکلۃ او اسکتین“۔ بضم الهمزة، کیونکہ بڑی بے مروتی کی بات ہوگی کہ خادم

باب ماجاء فی الأكل مع المملوک

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۴۰ ج: ۲ ”باب الأكل مع الخادم“ کتاب الاطعمہ، ایضاً سنن دارمی ص: ۱۳۶ ج: ۲

حدیث: ۲۰۷۴ کتاب الاطعمہ

کے سامنے کھایا جا رہا ہے اور اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس لئے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ اسے اپنے ساتھ شریک کیا جائے لیکن بعض طبائع نفیس ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگ طبعاً متکبر ہوتے ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے بطور تنزل فرمایا کہ چلو اسے ہاتھ میں دو مگر بالکل محروم تو نہ کر دو یہ صورت اگرچہ اس کے لئے اچھی نہیں لیکن سب سے بڑی صورت یعنی کچھ بھی نہ دینے سے تو پھر بھی بہتر ہے کیونکہ اس سے احساس پیدا ہوگا۔

باب ماجاء فی فضل إطعام الطعام

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: أفشوا السلام وأطعموا الطعام واضربوا الھام تورثوا الجنان۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلام پھیلادو! کھانا کھلاؤ اور کھوپڑیوں کو مار دو! تم جنت کے وارث بنادینے جاؤ گے۔

لغات:- قولہ ”افشوا“ الفتح: البزۃ افشاء اور فشو کے معنی ظاہر کرنے اور منکشف ہونے کے ہیں عام کرنے اور پھیلانے کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو سلام کر دو کسی خاص آدمی تک مخصوص نہ کرو۔ قولہ ”الھام“ الھامۃ کی جمع ہے کھوپڑی کو کہتے ہیں یہاں مراد کافروں کی کھوپڑیاں ہیں ان کی کھوپڑیاں اڑانا اور مارتا جہاد سے کنایہ ہے۔ قولہ ”الجنان“ بکسر الحیم جنت کی جمع ہے ”جن“ مادہ میں اخفاء کے معنی پائے جاتے ہیں، چنانچہ جنات نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے جن کہلاتے ہیں، جنت بھی نظروں سے غائب یا درختوں میں مستور ہوتی ہے۔ قولہ ”تورثوا“ صیغہ مجہول ہے۔

تشریح:- یہ ارشاد پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقعہ پر مدینہ پہنچنے پر فرمایا تھا، چونکہ حدیث شریف میں ہے ”المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“،^۱ اس لئے اول ملاقات میں سلام کے الفاظ مسنون قرار دیئے گئے تاکہ دوسرا شخص مطمئن ہو جائے۔ اور اس میں دعا بھی ہے، پھر سلام میں

باب ماجاء فی فضل اطعام الطعام

۱۔ رواہ البخاری ص: ۶ ج: ۱ ”باب المسلم من سلم المسلمون الخ“ کتاب الایمان، ایضاً صحیح مسلم ص: ۴۸ ج: ۱ کتاب الایمان۔

ضابطہ کا وارو مدار دو چیزوں پر ہے اول یہ کہ اس کی بنا تواضع پر ہونی چاہئے، گویا کہ یہ حصول تواضع کا قوی سبب ہے۔ دوم یہ کہ اس میں دوسرے کے احترام کو اُجاگر کرنا ملحوظ ہے، اس لئے بادی بالاسلام یعنی پہل کرنے والے کو تکبر سے خالی قرار دیا گیا اور فرمایا کہ راکب غیر راکب پر سلام کرے، جیسا کہ مسلم شریف میں ہے ”یسلم الراكب على العاشي والعاشي على القاعد والقليل على الكثير“۔^۱

آداب سلام :- امام نوویؒ شرح مسلمؒ کے میں اس مرفوع حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہ آداب سلام میں سے ایک ہے، پھر آگے لکھتے ہیں کہ سلام میں پہل کرنا سنت اور جواب واجب ہے۔ اگر سلام کرنے والے زیادہ ہوں تو گو کہ سب کو سلام کرنا چاہئے تاہم ایک شخص کے کرنے سے باقی کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے، یعنی سنت کفایہ ہے۔ اسی طرح اگر مخاطب ایک ہو تو اس پر جواب دینا واجب ہو جاتا ہے۔^۲ ہاں جماعت کی صورت میں جواب فرض کفایہ ہے یعنی واجب کفایہ بن جاتا ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ سب جواب دیں مگر ایک کا جواب بھی کافی ہو جاتا ہے، امام ابو یوسفؒ سب کے لئے جواب لازمی قرار دیتے ہیں، سلام کی اقل مقدار السلام علیکم ہے اور مخاطب واحد ہونے کی صورت میں بھی جمع کا صیغہ یعنی علیکم افضل ہے، اگرچہ علیک بھی جائز ہے اس پر ورحمة اللہ وبرکاتہ کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے، جس کی دلیل ایک تو وہ آیت ہے جس میں سلام کے بعد ”ورحمة اللہ وبرکاتہ علیکم اهل البيت“^۳ مذکور ہے۔ دوم نماز میں سب مسلمان تشہد میں ”السلام علیک ایہا النبی ورحمة اللہ وبرکاتہ“ پڑھتے ہیں، سلام کرتے وقت ”علیکم السلام“ کہنا مکروہ ہے، کہ حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”لا تنقل علیک السلام فان علیک السلام تحیة المومن“^۴ تاہم اگر کسی نے ایسا کیا تو عند بعض جواب کا مستحق نہ ہوگا مگر ماہواجح والمشہور کے مطابق جواب کا مستحق ہوگا۔

سلام کے جواب میں بھی ”ورحمة اللہ وبرکاتہ“ کا اضافہ افضل ہے سلام اور جواب سلام کم از کم اتنا ضرور سے کہنا چاہئے کہ مخاطب سن سکے، جواب فوری دینا لازمی ہے۔ اگر خط میں یا زبانی غائب کی طرف سے سلام پہنچے تو پڑھتے ہی اور سنتے ہی جواب دینا لازمی ہے۔ (شرح مسلم للنووی ص ۲۱۲ ج ۲)

۱ صحیح مسلم ص ۲۱۲ ج ۲ کتاب السلام، ایضاً سنن دارمی ص ۳۵۷ ج ۲۔

۲ النووی علی مسلم حوالہ بالا۔ ۳ راجع لاحادیث السلام سنن دارمی ص ۳۵۷ تا ۳۶۰ ج ۲ کتاب الامیذان۔

۴ سورة ہود آیت ۷۳۔ ۵ الحدیث اخرجه ابو داؤد ص ۳۶۱ ج ۲ ”باب کراهية ان يقول علیک السلام“ کتاب

الادب، ایضاً مسند احمد ص ۵۳۲ ج ۲ حدیث ۱۵۵۲۵ دار احیاء التراث العربی بیروت۔

فائدہ:- اگر ایک آدمی دور ہے تو سلام کرتے وقت ہاتھ سے اشارہ کرنا جائز ہے تاکہ اسے سلام یا جواب کا علم ہو جائے مگر قریب ہی سے ہاتھ کا اشارہ مکروہ ہے کہ غیر مسلموں کا شعار ہے۔

جنت کے وارث ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کا جہنم والاٹھکانا ختم کر دیا جاتا ہے اور جنت ہی میں اسے بسایا جاتا ہے گویا کہ ہر آدمی کے دو مقامین ہیں، وہ جہنم میں ہمیشہ کی زندگی گزارنے سے جنت کے مقام سے محروم کر دیا جاتا ہے والعیاذ باللہ والعکس۔

یا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے وہاں سے دنیا میں بھیجے گئے اب جس کو جنت ملے گی گویا وہ اپنے جدا مجد کی قیام گاہ میں جاتا ہے۔ یا پھر مطلب یہ ہے کہ جس طرح میراث ایک قوی سبب ہے ملک کا اسی طرح یہ اعمال جنت ملنے کے قوی اسباب ہیں۔

حدیث ثانی:- میں ”اعبدوا الرحمن“ کا مطلب یہ ہے کہ ”وَتَجِدُوا اللَّهَ“ تنہا اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی اور کو شریک مت کرو ہاں عام عبادت کے معنی میں لینا بھی صحیح ہے۔

باب ماجاء فی فضل العشاء

عن انس بن مالک قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تَعَشُّوا وَلَوْ بِكَفٍّ مِنْ خَشَفٍ فَإِنْ تَرَكَ الْعَشَاءَ مَهْرَمَةً۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کا کھانا کھایا کرو، اگرچہ مٹھی بھر دی کھجور ہی ہو کیونکہ رات کا کھانا چھوڑنا بڑھاپے کا سبب ہے۔

لغات:- قولہ ”تَعَشُّوا“ مفتح العین بروزن سماء شام کے کھانے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”تَعَشُّوا“ عشی اور عشیہ سے ماخوذ ہے شام اور آخر النہار کو کہتے ہیں، چونکہ اہل عرب رات کا کھانا عموماً غروب آفتاب کے وقت کھاتے اس لئے اس کو عشاء کہا جاتا ہے، اگرچہ اس حدیث میں غروب سے پہلے کھانے کی ترغیب نہیں ہے بلکہ سونے سے پہلے کھانے کی بات کی گئی ہے اس لئے ترجمہ میں اسے رات کے کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ قولہ ”وَلَوْ بِكَفٍّ“ ای بملء الکف۔ قولہ ”خَشَفٍ“ مفتحین ناقص اور ردی کھجور کو کہتے ہیں۔ قولہ ”مہرمہ“ مفتح الحیم والراء ای مظہرہ للضعف والهرم، ہر بڑھاپے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رات کو کچھ کھائے بغیر سونے سے کمزوری لاحق ہوتی ہے جو بڑھاپے کا سبب ہے۔

تشریح:- یہ حدیث اصحاب کتب ستہ میں سے صرف امام ترمذی نے ذکر کی ہے، سند کے اعتبار سے بہت کمزور ہے جیسا کہ خود امام ترمذی فرماتے ہیں "ہذا حدیث منکر" کیونکہ عنہ راوی ضعیف اور عبد الملک بن علاق مجہول ہیں، لہذا متین میں تعشوا اگرچہ امر کے صیغے کے ساتھ آیا ہے، مگر اس سے وجوب ثابت نہیں ہو سکتا تاہم طبی نقطہ نظر سے رات کا کھانا اگرچہ کم مقدار کا ہو صحت اور توانائی برقرار رکھنے کے لئے مفید ہے کیونکہ جب آدی خالی پیٹ سوتا ہے تو خالی معدے کی حرارت، اس کی رطوبت کو خشک اور کم کر دیتی ہے، جو نشو و نما میں بہت اہم ہے یہ قدیم اطباء کی بیاں کردہ وجہ ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق اس کی دو وجہ ہیں (۱) اگر کوئی معدے کا مریض ہو تو خالی پیٹ سو جانے سے معدے کی تیزابیت بڑھے گی۔ (۲) خالی پیٹ سونے سے شوگر کا لیول کم ہو جاتا ہے اور چونکہ دماغ تو گلوکوز اور چکنائٹ استعمال کرتا ہے اس لئے دماغ کی غذا میں کمی آئے گی جس سے سستی اور آکٹا ہٹ جنم لے گی چونکہ عربوں میں صبح دس بجے اور مغرب کے وقت کھانا ہوتا تھا اس لئے یہ دورانیہ تقریباً چوبیس گھنٹے بن جائے گا بخلاف روزے کے۔

باب ماجاء فی التسمیہ علی الطعام

"عن عمر بن ابی سلمة انه دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعنده طعام قال: اُذن یا بنی فسمہ اللہ وکل یمینک وکل ممالیک"۔^۱

حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں داخل ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانا رکھا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیچے قریب ہو اور بسم اللہ پڑھ کر سیدھے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے پاس سے کھاؤ!

تشریح:- حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب ہیں، جب ان کے والد ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو والدہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی التسمیة علی الطعام

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب الاطعمة "باب التسمیة علی الطعام" ومسلم فی کتاب الاشارة "باب آداب الطعام والشراب" وابوداؤد فی کتاب الاطعمة "باب الأكل باليمين" ومالك فی الموطأ كتاب صفة النبي ﷺ "جامع ماجاء فی الطعام والشراب" بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۲۹ ج: ۲ کتاب الاطعمة.

سے ہوا، دستور جاہلیت کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت اور شفقت فرماتے اور پیار کرتے ”یا بُنّی“ فرما کر ان کو اپنی صلیبی اولاد کی طرح پکارتے، اور اپنے پاس کھانے میں شریک فرماتے۔

قوله ”بسم اللہ“ یعنی بسم اللہ پڑھو جیسا کہ اگلی روایت میں ہے ”اذا اکل احدکم طعاماً فليقل بسم اللہ“ حضرت شاہ صاحب ”عرف الشذی“ میں فرماتے ہیں کہ روایات سے فقط ”بسم اللہ“ کے الفاظ ثابت ہیں اس سے زیادہ نہیں لہذا امام نوویؒ اور امام غزالیؒ نے اس پر جو اضافہ مستحسن قرار دیا ہے وہ بلا دلیل ہے۔ تاہم مستدرک حاکم نے ایک روایت کی تخریج کی ہے ”قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبز ولحم وتمر وبسر ورطب اذا اصبتم مثل هذا فصرتم بايديکم فکلوا بسم اللہ وبرکة اللہ“ اور کہا ہے ”هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه (مستدرک ص: ۳۶ ج: ۵)۔ واللہ اعلم

اگر کوئی شخص بسم اللہ پڑھنا شروع میں بھول جائے تو کھانے کے دوران پڑھ لے جیسا کہ اگلی روایت میں تصریح ہے۔ جتنے لوگ کھانے میں شریک ہوں ان سب کو بسم اللہ پڑھنا چاہئے جیسا کہ باب کی اگلی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ گوکہ حاضرین کی جانب سے ایک کاسمہ کافی ہے بعد میں آنے والے سے نہیں۔ پھر امام نوویؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنی چاہئے تاکہ دوسرے شرکاء کے لئے یاد دہانی ہو۔ ہاں البتہ کھانے کے اختتام پر الحمد للہ آہستہ پڑھنا چاہئے تاکہ دوسروں کے کھانے کے اختتام کا سبب نہ بنے۔ ہاں اگر سب لوگ فارغ ہوئے ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح بسم اللہ حلال کھانے پر پڑھنی چاہئے۔ شامیؒ میں تا تاریخانیہ اور قدیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

”واذا قلت بسم اللہ فارفع صوتک حتی تلقن من معک، ولا یرفع بالحمد الا ان

یکونوا فرغوا من الأکل وانما یسمی اذا کان الطعام حلالاً ویحمد فی آخره

کیف ما کان۔ (شامی ص: ۳۴۰ ج: ۶، ایچ ایم سعید کراچی، کتاب الحظر والاباحہ)

پھر بسم اللہ جس طرح کھانے کی چیزوں پر پڑھنا مسنون یا مستحب ہے اسی طرح مشروبات پر بھی مستحب ہے حافظہ، جب وغیرہ سب کے لئے یہ حکم یکساں ہے۔

بذل الحیوۃ میں ہے کہ خنابلہ کے نزدیک تسمیہ واجب ہے جبکہ جمہور کے نزدیک سنت ہے ”واختلفوا

فی التسمیۃ علی الطعام فقال اصحاب احمد بالوجوب والجمہور علی انه سنة (بذل ص: ۳۵۱)

ج: ۵) در مختار کی کتاب الطہر والاباحہ میں ہے ”وسنة الأكل البسملة أوله والحمد لله آخره، وغسل
اليدین قبله وبعده وید بالشیب قبله وبالشیوخ بعده“ اس پر علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے
ہاتھ دھوتے وقت کلی کرنا مسنون نہیں الا یہ کہ وہ حب ہو۔ (ص: ۳۳۰ ج: ۶)

حدیث آخر:- اس باب میں دوسری حدیث حضرت عکراش بن ذویبؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ
نومزہ نے مجھے اپنی زکوٰۃ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، پس جب میں مدینہ پہنچا تو آپ صلی
اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے پایا، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ
پکڑ کر مجھے ام سلمہؓ کے گھر میں لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ چنانچہ ایک پیالہ بہت ترید اور گوشت
والا لایا گیا، تو ہم اس کی طرف متوجہ ہو کر کھانے لگے میں اس کے اطراف میں اپنا ہاتھ ادھر ادھر گھمانے
لگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آگے سے تناول فرما رہے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بائیں ہاتھ
سے میرا داہنا ہاتھ پکڑا اور پھر فرمایا، عکراش! ایک ہی جگہ سے کھاؤ کیونکہ سارا ہی کھانا ایک جیسا ہے۔ پھر بعد
از اس ایک طباق لایا گیا جس میں کئی قسم کی کھجوریں تھیں، ثمرة طرب عبید اللہ (راوی) کو شک ہے (کہ تم کہا
یا رب) پس میں اپنے آگے سے کھانے لگا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ طباق میں گھوم رہا تھا، آپ صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عکراش! جہاں سے چاہو کھاؤ کیونکہ یہ ایک قسم کی چیز نہیں ہے، پھر پانی لایا گیا تو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ دھولے اور اپنے ہاتھوں کی تری سے اپنے چہرے، بازوؤں اور سر کو مسح کیا
اور فرمایا: اے عکراش! یہ اس چیز سے وضوء ہے جو آگ سے پکی ہو۔

لغات:- قولہ ”حفنة“ بواپالہ اور ڈونگا اس کی جمع جفان اور جفن آتی ہے قرآن مجید میں ہے
”وجفان کالجواب“۔ قولہ ”الثريد“ شوربے میں روٹی کو چر کر بھگونا عرب اس کے ساتھ گوشت کی بوٹیاں
شامل کرتے تھے، جیسا کہ حدیث باب میں ہے۔ قولہ ”الوزر“ الفتح الواو گوشت کی ایسی بوٹیاں جو ہڈی سے خالی
ہوں۔ قولہ ”فجعت“ یعنی میرا ہاتھ اس ڈونگے میں بے ترتیب سا گھوم رہا تھا۔ قولہ ”الوان“ طون کی جمع ہے
اس کے ایک معنی رنگ کے ہیں اور دوسرے نوع اور قسم کے ہیں یہاں یہی مراد ہے۔

تیسری حدیث:- باب کی تیسری حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو ”بسم اللہ“ پڑھ لے اگر وہ شروع میں پڑھنا بھول
جائے تو یوں کہے ”بسم اللہ فی اولہ وآخرہ“ اور اسی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھ صحابہ کے ساتھ کھانا تناول فرما رہے تھے، کہ ایک پادریہ نشین آیا اور وہ کھانا دینی لقموں میں کھا کر ختم کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھئے اگر یہ بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا تم سب کے لئے کافی ہو جاتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ سب کے لئے پڑھنی چاہئے، اور یہ کہ تسمیہ سے کھانے میں برکت ہو جاتی ہے اور یہ کہ تسمیہ بہر حال پڑھنا چاہئے۔ شروع میں بھول جائے تو کھانے کے دوران کسی بھی وقت یاد آنے پر پڑھ لے۔ کھانے کے دوران پڑھنے سے بظاہر سابقہ کوتاہی کازالہ اور برکت کا تذکرہ ہو جاتا ہے، بخلاف وضوء کے کہ اگر آدمی وضوء کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں تسمیہ مسنون نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کھانے میں تسمیہ آغاز کے بعد مذکورہ باب کی حدیث سے ثابت ہے، جبکہ وضوء کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وضوء امر بسیط ہے جبکہ کھانا مرکب یعنی کئی حصوں پر مشتمل ہے چنانچہ دو لقمے بھی کھانا ہے اور نہیں بھی۔ جبکہ وضوء میں تھوڑی سی جگہ خشک رہنے سے وضوء محقق نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیخ ابراہیم حلبی شرح منیہ المصلى میں لکھتے ہیں:

”ولو نسي التسمية فذکرهافي خلال الوضوء فسمي لا تحصل السنة بخلاف الأكل كذا في العناية معللأبان الوضوء عمل واحد بخلاف الأكل وهو يستلزم في الأكل تحصيل السنة في الباقي لا استدراك ما فات قاله ابن همام والأول ان استدراك لما فات بالحديث وهو قوله عليه السلام اذا أكل احدكم فمسي ان يذكر اسم الله على طعامه فليقل بسم الله اوله وآخره۔ رواه ابو داؤد^۲ والترمذی ولا حدیث فی الوضوء۔ (کبیری ص ۲۲، کنز الایضی لاہور)

باب ماجاء فی کراہیۃ البیتوتہ وفی بدہ ریح غمر

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الشیطان خمس اس لحاس

۲۔ کذا فی الاحادیث الثی فی مجمع الزوائد ص: ۱۰۱ ج: ۲ کتاب الاطعمۃ۔ مع سنن ابی داؤد ص: ۱۷۳ ج: ۲
 ”باب التسمیۃ علی الطعام“ کتاب الاطعمۃ، قال اذا أكل احدکم فلیذكر اسم اللہ فان نسی ان یذكر اسم اللہ فی اوله فلیقل بسم اللہ اوله وآخره، ایضاً رواه الطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص: ۱۲ ج: ۵ کتاب الاطعمۃ۔

فاحذروه علی انفسکم من بات وفي يده ربيع عمر فاصابه شئ فلابلو من الانفسه۔^۱

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ شیطان تیز حس و ادراک اور بہت چاٹنے والا ہے تم اس سے اپنے آپ کو بچائے رکھو، جو شخص رات گزارے دریاں حالیکہ اس کے ہاتھ میں سے گوشت کی بو آ رہی ہو اور اسے کوئی تکلیف و اذیت پہنچے تو وہ سوائے خود کے کسی کو ملامت نہ کرے۔

لغات:- قولہ ”حساس“ جس سے مشتق ہے بمعنی ادراک کے۔ قولہ ”الحاس“ الحس کے معنی زبان سے ہاتھ وغیرہ آلودہ و چکنی چیز کو چاٹنے کے ہیں، دونوں الفاظ تشدید کے ساتھ ہیں جو مبالغے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ قولہ ”عمر“ بختیں چکناہٹ و دوسوت وغیرہ آلودگی کو کہتے ہیں۔

تشریح:- باب کی دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رات کے کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا بطور خاص اہتمام کرنا چاہئے، کیونکہ سوتے میں کوئی چیز جیسے کپڑے مکڑے اور چوہے وغیرہ کھانے کے اثرات اور خوشبو سونگھتے سونگھتے ہاتھ تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر اسے کاٹنا شروع کر دیتے ہیں، ایسے واقعات کئی دفعہ پیش آئے ہیں کہ سوتے میں چوہے نے لوگوں کو کانا ہے یہ بے احتیاطی کے نتائج ہوتے ہیں

چونکہ اصل مقصد ان موزی جانوروں سے بچنا ہے اس لئے اگر صابن کا استعمال کیا جائے تو وہ زیادہ مفید ہے، ہاں بغیر صابن کے دھو کر کسی کپڑے وغیرہ سے اس طرح خشک کرنا کہ کھانے کے اثرات بالکل ختم ہو جائیں تو یہ بھی کافی ہے، علاوہ ازیں نظافت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی کے ہاتھ ہر حالت میں صاف ستھرے ہوں اور یہی شریعت مطہرہ کی تعلیم ہے۔

مسئلہ:- بعض لوگ کھانے کے دوران روٹی کے ٹکڑے سے ہاتھ پونچھتے ہیں۔ بعض چھری اس سے صاف کرتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ روٹی کے اوپر پیاز اور سلاڈ وغیرہ یا پلیٹ رکھتے ہیں، یہ سب خلاف ادب و مکروہ ہیں۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:- ”یکره وضع الملحہ والقصعة علی الخبز و مسح البدن بالمسکین یہ“۔

(ص ۳۴۰ ج ۲، کتاب النحر والاباحۃ)

آخر ابواب الاطعمة

باب ماجاء فی کراهیة البیتونة ولی یده ربيع عمر

۱۔ الحدیث أخرجه ابو داؤد کتاب الاطعمة ”باب غسل اليد من الطعام“ و احمد فی مسنده وابن ماجه وابن حبان فی صحیحہ بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۳۳ ج: ۲ حدیث: ۲۰۶۳ کتاب الاطعمة.

أَبْوَابُ الْأَشْرِبَةِ

چونکہ کھانا اصل ہے اور پیاس عموماً کھانے کی وجہ سے لگتی ہے، اس لئے اطعمہ کو پہلے ذکر کیا اور اشراب اس کے بعد، نیز قرآن مجید کی ترتیب ذکر کی کو بھی ملحوظ رکھا گیا، واللہ عز وجل نے فرمایا: "كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا" گو ہمارے نزدیک دائر ترتیب پر دال نہیں۔ اشراب، شراب کی جمع ہے جس کا اطلاق پانی اور باقی مانع تمام مشروبات پر ہوتا ہے چنانچہ اس بحث میں نمید کی جملہ اقسام اور پانی پینے کے آداب وغیرہ احکام کا ذکر ہو گا جو مختلف ابواب کے ذیل میں مذکور ہو گئے جبکہ پہلا باب شراب کی وعید پر مشتمل ہے۔

باب ماجاء فی شارب الخمر

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كل مسكر خمر وكل مسكر حرام، ومن شرب الخمر في الدنيا فمات وهو يذم منها لم يشربها في الآخرة۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نشہ آور چیز خمر (شراب) ہے اور ہر نشہ آور شے حرام ہے، اور جس نے دنیا میں شراب پی اور مر گیا اور اس حالیکہ وہ بھیٹگی سے پیتا رہا (اور پھر بغیر توبہ کے مر گیا) تو وہ آخرت (جنت) میں اسے نہیں پیے گا۔

لغات:- قولہ "مسکر" مسکر سے ہے جس سے نشہ پیدا ہو۔ قولہ "خمر" اس کے لغوی معنی بھپانے کے ہیں چنانچہ چادر اور دوپٹے کو خمار اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اوڑھنے سے جسم اور سر چھپ جاتا ہے، اس کے دوسرے معنی شدت اور قوت کے ہیں۔ کما صرح بہ صاحب الہدایہ اور شراب میں یہی معنی ہمارے نزدیک ملحوظ ہے۔ قولہ "یدمنہا" ادمن یدمن بمعنی مداومت کے ہیں ادمن الشیء ای ادامہ کسی چیز پر مداومت اور بھیٹگی سے عمل کرنا۔

تشریح:۔ اس حدیث مبارک میں تین باتیں قابل ذکر ہیں:۔ (۱) یہ کہ ہرنشہ آور مشروب خمر ہے یا ایہ نام بعض مخصوص قسم کا ہے؟ (۲) یہ کہ مسکرات کی قلیل و کثیر سب کا حکم ایک ہے یا مختلف؟ (۳) شراب پینے کا عادی آدمی جنت میں جانے کی صورت میں شراب پینے کا یا نہیں؟ ان میں سے پہلے دونوں مسائل اختلافی ہیں یہاں ان دونوں پر قدرے تفصیل سے بحث کرنا مناسب ہے۔

(۱) پہلے مسئلے میں ائمہ ثلاثہ اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کے نزدیک ہرنشہ آور مشروب خمر ہے خواہ وہ کسی بھی چیز سے بنایا گیا ہو انگور، کھجور، جو، گندم اور شہد وغیرہ اس میں برابر ہیں۔ جبکہ امام اعظمؒ کے نزدیک خمر صرف انگور سے بنائی گئی شراب کو کہا جاتا ہے، جس کی تعریف یہ ہے ”ہی عصیر العنب اذا غلی واشتد وقذف بالزبد“ بعض حضرات نے ”ہی النبی من ماء العنب اذا صار مسکراً“ سے تعریف کی ہے مصداق دونوں کا ایک ہے، یعنی انگور کا وہ کچا اور خام برس اور شیرہ جب اسے کچھ دنوں کے لئے بغیر پکائے یوں ہی خام چموز رکھ دیا جائے یہاں تک کہ وہ جوش مارے اور تیز ہو کر جھاگ اٹھے اس وقت وہ مسکر بھی بن جاتا ہے، اور بالاجماع خمر بھی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ مسکرات کی جو باقی اقسام ہیں وہ اگرچہ مسکر اور نشہ کی وجہ سے ناجائز ہوں گی۔ مگر خمر اور ان کے احکام میں فرق ہے۔ تاہم صاحبین کے نزدیک خمر کی تعریف میں آخری قید یعنی ”قذف بالزبد“ خمر بننے کے لئے لازمی نہیں ہے بلکہ صرف جوش مارنا کافی ہے۔ اس لئے ہدایہ^۱ میں ہے ”وقیل یوحذفی حرمة الشرب بمحرد الاشتداد احتیاطاً“ گویا پینا تو قذف زبد کے بغیر بھی حرام ہے مگر ”حد“ نافذ کرنے کے لئے قذف الزبد کا لحاظ رکھا جائے گا اسی میں احتیاط ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے دلائل:۔ (۱) ان کا پہلا استدلال باب کی حدیث سے ہے کہ ”کل مسکر خمر“۔ (۲) دوسرا استدلال ترمذی وغیرہ کی مرفوع حدیث سے ہے جو ترمذی میں ”باب ما جاء فی الحبوب النبی“

باب ما جاء فی شارب الخمر

۱۔ ہدایہ ج: ۳ ابواب الاشربة۔ ۲۔ الحدیث الخرجہ البخاری ص: ۱۶۳ ج ۲ کتاب المغازی، ایضاً الخرجہ فی کتاب الادب و کتاب الاحکام، و مسلم ص: ۱۶۷ ج: ۲ ”باب بیان ان کل مسکر خمر وان کل خمر حرام“ کتاب الاشربة، اسوداد ص: ۱۶۲ ج: ۲ ”باب ما جاء فی المسکر“ کتاب الاشربة، سنن ابن ماجہ ص: ۲۴۲ ”باب کل مسکر حرام“ ابواب الاشربة، سنن مسانی ص: ۳۲۴ ج: ۲ کتاب الاشربة مؤطا لعلک ضحاہا، مسند احمد ص: ۳۵۲ ج: ۱۔

یتخذ منها الخمر“ میں آ رہی ہے ”ان من الحنطة خمر او من الشعير خمر او من التمر خمر او من الزبيب خمر او من العسل خمر“۔ اسی باب میں ایک اور مرفوع حدیث ہے ”الخمر من هاتین الشحرتین النخلة والعنب“۔ یہ حدیث مسلم کے میں بھی ہے۔ جبکہ پہلی حدیث نسائی کے ملاوہ خمسہ نے روایت کی ہے۔ (۳) خمر، خمارة القتل سے مشتق ہے یعنی ستر و اختلاط کے اور یہ خصوصیت تو برنشہ آور چیز میں پائی جاتی ہے۔
خفییہ کی دلیل :- احناف کہتے ہیں کہ خمر کی حرمت قطعی ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

”انسا الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه“

لعلمکم تفلحون“ (سورہ مائدہ آیت نمبر ۹۰ پر نمبر ۶)

دوسری طرف انگور سے بنائی گئی شراب بغیر کسی اختلاف کے خمر ہے، جبکہ باقی اجناس اور خمر کی مذکورہ تعریف کے علاوہ باقی صورتوں میں مسکرات کی اقسام کے خمر ہونے میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ بعض اہل لغت اگر چہ انہیں بھی خمر کہتے ہیں، مگر جمہور اہل لغت ان کو خمر نہیں مانتے ہیں۔ لہذا انگور کا مذکورہ قیود سے موصوف مشروب قطعی اور بالا جماع خمر ہوا۔ جبکہ باقی میں اختلاف کی وجہ سے ظن پیدا ہوا پس انگور سے بنی ہوئی شراب خمر کا قطعی مصداق ہے جبکہ باقی مسکرات منظون معانی ہیں۔ اور لفظ قطعی مصداق پر حمل کرنا اولیٰ واضح ہوتا ہے بمقابلہ ظنی کے یہ ایسا ہے جیسے ائمہ ثلاثہ بنید التمر کو پانی نہیں مانتے اور اس سے وضوء کو جائز نہیں سمجھتے جیسا کہ ”باب الوضوء بالنبیذ“ میں تفصیلاً گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۲۸۲ ج: ۱ پر)

جوابات :- جمہور کے دلائل کا جواب یہ ہے، کہ جن روایات میں عام مسکرات کو خمر کہا ہے تو یہ اطلاق باعتبار لغت کے نہیں ہے، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ عربوں کو ان کی زبان سکھادیں، بلکہ بیان احکام کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ لہذا ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ تمام منشیات بعلت سکر و نشہ کے حرام ہیں لہذا جس چیز میں یہ علت ہوگی تو وہ حرمت کے زمرے میں آئے گی اور کسی کو نشہ چڑھ جائے تو اس پر حد بھی لگے گی، جبکہ خمر یعنی انگور کی شراب من حیث الذات حرام، نجس، بر جس اور موجب حد ہے۔ اور جن احادیث مبارکہ میں سکر کی علت بیان نہیں کی گئی ہے جیسے ان کے دوسرے استدلال کی روایات، تو ان اشیاء پر خمر کا اطلاق مجاز ہے، کیونکہ جو کام خمر یعنی انگور کے خام پانی سے ہوتا ہے، یعنی نشہ تو وہ باقی اجناس کی شراب میں بھی

پایا جاتا ہے۔ اور قرآن و سنت میں مجاز کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ابن المنک اور ابن سید وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے صاحب تہذیب الاحوی نے ”باب ماجاء فی الحبوب التي يتخذ منها الخمر“ میں ”ان من الحنطة خمرًا“ کی شرح میں لکھا ہے۔ ”قال ابن المنک تسعینہ خمرًا مجاز لا زالتہ العقل“ گو کہ اپنے طور سے پھر اس کی تردید کی ہے اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

”نعم حزم ابن سیدہ“ فی المحکم“ بان الخمر حقیقۃ النماھی للعنب
وغیرہا من المسکرات یسمی خمرًا مجازاً“۔

اعتراض:- اگر باقی اقسام حقیقتاً خمر نہیں تو پھر جب خمر کی حرمت نازل ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس فی عنب (یعنی شیرہ) کے سوا اجناس کی شراب تھی تو اسے کیوں ہنا کر ضائع کر دیا؟ حالانکہ وہ اہل لسان تھے۔
جواب:- اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شیرہ انگور کے سوا تمام اقسام کو خمر سمجھتے تھے، بلکہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مسکرتھا اور مسکرات تو حرام ہیں لہذا جب خمر کی حرمت نازل ہوئی اور علت تو اس حرمت کی سکری تھی اس لئے انہوں نے سب کو ضائع کر دیا۔

جہاں تک جمہور کے تیسرے استدلال کا تعلق ہے کہ عصیر العنب اور باقی اقسام میں علت یکساں ہے یعنی عقل کو مغلوب کرنا اور ٹھپانا لہذا سب برابر ہیں کیونکہ اس لحاظ سے سب خمر ہیں۔

اس کا جواب صاحب ہدایہ نے دیا ہے: ”وانما سمي خمرًا لئلا یخمرہ لالمخامرہ العقل“ یعنی شیرہ انگور کو خمر عقل کو چمپانے کی بناء پر نہیں کہتے، بلکہ خمر یعنی تغیر، اشد اور قوت کی وجہ سے کہتے ہیں، اور یہ علت فی العنب میں جس بیانیہ پر پائی جاتی ہے باقی اقسام میں اس طرح نہیں پائی جاتی۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ہدایہ کے بعض شارحین نے اس عبارت کا دوسرا مطلب بیان کیا ہے جس کو شیخ ابن تائم نے رد کیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے تزیلی جواب بھی دیا ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ شراب کو خمر ستر عقل کی وجہ سے کہا جاتا ہے، تو پھر جواب یہ ہے کہ اس عموم کے باوجود خمر کی تخصیص فی العنب کے ساتھ ہوئی ہے یعنی لفظ میں جیسے غم ظہور کے معنی میں ہے، مگر پھر بھی یہ مخصوص ستاروں کے لئے بولا جاتا ہے انقی پر ہر سودا ہونے والے ستارے کو نہیں کہتے ہیں، بلکہ صرف ثریا پر اس کا اطلاق ہوتا ہے فلذا ہذا۔

دوسری بحث:- اس بحث کا موضوع یہ ہے کہ آیا تمام مسکرات حرام ہیں اور ان کا حکم بھی شرعی کا ہے یا ان میں اور عصیر العنب کے احکام میں فرق ہے؟ تو پہلے یہ جاننا چاہئے کہ انگور کے خام شیرہ کے علاوہ جو مسکرات

ہیں ان کی اقسام میں فرق ہے۔ آسان لفظوں میں ہم ان کی مجموعی اعتبار سے دو قسمیں بنا سکتے ہیں پہلی قسم میں تین قسم کے مشروبات آتے ہیں (۱) انگور کا شیرہ پکا کر شراب بنانا جب ثلاثین یا نصف بیج جائے۔ (۲) کھجور سے بنائی ہوئی شراب۔ (۳) اور قیسری کشمش کی خام شراب یہ تین اقسام عصیر العنب جس کی تعریف ابھی گزری یعنی ہسی عصیر العنب اذا علی الخ کے ساتھ شمار کر کے اشربہ اربعہ کے نام سے مشہور ہیں۔ جبکہ دوسری قسم کے مشروبات ان کے علاوہ گندم اور جو یا شہد وغیرہ کسی بھی چیز سے بنائی ہوئی شراب کی ہے۔

ائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہ اللہ ان اقسام میں اور شراب کی اس قسم میں جو انگور سے بنائی گئی ہو فرق نہیں کرتے ہیں بلکہ سب کو غیر کہتے ہیں۔ اور سب کا حکم ایک ہی بتاتے ہیں یعنی جس طرح ان مسکرات کی مقدار کثیر حرام ہے اسی طرح مقدار قلیل بھی حرام اور موجب حد ہے اگرچہ اس سے نشہ نہ چڑھتا ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ عرف الشدی میں فرماتے ہیں کہ حنفیہ میں سے ارباب فتویٰ نے امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے، اور حضرت تھانوی صاحبؒ نے بھی المسک الذی میں فرمایا ہے کہ امام صاحب کو جمہور کی مستدل حدیث پہنچی نہ ہوگی ورنہ وہ اس پر ضرور عمل فرماتے، کیونکہ اصولی طور پر جب حدیث ثابت ہو جائے تو اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے۔ بہر حال شیخینؒ کے نزدیک قسم ثانی کے مسکرات میں ضابطہ یہ ہے کہ ان کی تھوڑی سی مقدار جس سے نشہ پیدا نہ ہوتا ہو عبادت کی قوت کے حصول کی نیت سے پینا جائز ہے، جبکہ زیادہ پینا یا مستی و شادمانی کی نیت سے پینا حرام ہے۔ جبکہ اشربہ اربعہ مطلقاً حرام ہیں تاہم عصیر العنب اور باقی تینوں میں اتنا سا فرق ہے کہ عصیر العنب کی حرمت باقی تینوں سے اشد ہے، اور متعدد احکام میں ان کے مابین فرق ہے چنانچہ صاحب ہدایہ نے وہ احکام کچھ یوں بیان کئے ہیں۔ خمر کی عین ذات حرام ہے لہذا ایک قطرہ پینا بھی حرام ہوگا اگرچہ سکر نہ ہو۔ یہ پیشاب کی طرح نجس ہے، اس کو حلال سمجھنے والا کافر ہے۔ مسلمان کے لئے اس کی خرید و فروخت وغیرہ جائز نہیں۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ اس کی تھوڑی سی مقدار پینے سے بھی حد لگے گی اور اس کو سرکہ بنانا ہمارے نزدیک جائز ہے۔

باقی تینوں اشربہ کے بارے میں صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

الآن حرمۃ هذه الاشربة (الثلاثة) دون حرمۃ الخمر حتی لا یکفر مستحلها

ویکفر مستحل الخمر لان حرمتها اجتہادیة وحرمة الخمر قطعیة ولا یجب

الحديث بشر بها حتى يسكر الخ یعنی سا بقدا كرام كے بر خلاف ۔

(راجع للتفصیل بدیہ کتاب الاشریہ جلد چہارم)

حضرت شاہ صاحب العرف الشذی میں فرماتے ہیں: "ان هذه المسئلة لم احدفها ما يشفي

الصدور"۔

یہ بحث مانع مسکرات سے متعلق تھی جہاں تک جامد غشیات کا تعلق ہے جیسے افیون تو المسک الذکی میں ہے کہ اجماعاً ایسی چیزوں کا اس قدر کھانا جائز ہے جو مسکرنہ ہو، اور اگر زیادہ کھانا چاہے جس میں نشہ پیدا ہونے کا احتمال ہو تو ان چیزوں میں کوئی ایسی چیز ملا دے جو مانع سکر ہو پھر کھالے کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اتنی علی ہذا جو لوگ نسوا رکھانے اور سگریٹ پینے کو حرام قرار دیتے ہیں ان کا دعویٰ بالادلیل ہے کیونکہ ان کے عادی لوگ نشے کی زد میں نہیں آتے ہاں البتہ ان چیزوں کی دوسری قباحتیں اپنی بد مسلم ہیں جیسے بد بو، بیماری کا اندیشہ، بلا وجہ پیسوں کا ضیاع اور دوسروں کو تکلیف اور گھن وغیرہ کا موجب بننا وغیرہ وغیرہ۔ البتہ جس اور ہیر و مین دولوں تہا کن ہیں اور اس کے پینے سے ایک تو آدی نشے میں ڈھت رہتا ہے۔ دوسرے جسمانی اور مردانہ لحاظ سے ان کا پینے والا طاقت و توانائی سے محروم ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں اس سے عقل میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ادویات اور پرفیوم میں شامل کیا جانے والا "الکحول" نہ عام طور سے ادویات یا سپرے والی خوشبو میں بغرض حفاظت الکول یا الکحول نامی مانع مادہ ملایا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ بھی شراب کی طرح نجس ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ الکحول دو طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے (۱) خام تیل یعنی پیٹرول سے۔ (۲) گلوکوز سے۔ پہلی صورت میں پچانوے (۹۵) فیصد سے زیادہ حصہ پیٹرول کا ہوتا ہے اور باقی کچھ نباتات اور زہر وغیرہ ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری صورت میں گتے اور چھندرو غیرہ کے رس کے جھاگ سے کیسائی عمل سے اور بذریعہ تخمیر بنایا جاتا ہے دونوں صورتوں میں انگور کی کوئی آمیزش اس میں نہیں ہوتی ہے لہذا ادویات وغیرہ میں اس کے ہونے سے کوئی مضائقہ لازم نہیں آتا۔

تیسری بات :- اس باب میں تیسری بحث حدیث کے جز ثانی سے متعلق ہے کہ عادی شرابی جنت میں شراب پی سکے گا یا نہیں؟ اس حدیث کے مطابق جو آدمی بکثرت شراب پیتا ہے اور جسے عرف میں شرابی کہا جاتا ہے وہ جنت میں شراب نہیں پئے گا۔ اس حکم کے بارے میں شارحین کافی پریشان ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ جبہ اشکال یہ ہے کہ نہ تو مرکب کبیرہ کافر ہو جاتا ہے اور نہ ہی جنت میں کسی چیز پر پابندی ہوتی

ہے بلکہ وہاں تو بروہ چیز ملتی ہوگی جس کی دل میں خواہش پیدا ہوگی۔

عام ضابطے کے مطابق جو مؤمن گناہ سے توبہ کر لے تو وہ ایسا ہی شمار ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ "التائب من الذنب کمن لا ذنب له" اور جو شخص بغیر توبہ کے انتقال کر جائے تو اس کا معاملہ اللہ عزوجل کے دست اختیار میں ہوتا ہے چاہے تو معاف فرما دے اور چاہے تو اسے سزا دیدے۔ تاہم اہلسنت والجماعت کے نزدیک وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، بلکہ سزا کاٹنے کے بعد اپنے ایمان کی وجہ سے جنت میں داخل ہوگا۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ جو آدمی شراب حلال سمجھ کر پیتا رہے یا خاتمہ بالخیر سے محروم ہو جائے۔ والعیاذ باللہ تو پھر تو مطلب آسان اور واضح ہے کہ حلال سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے اور خاتمہ بالخیر سے محروم جنت میں داخل نہیں ہوگا تو شراب نہیں پی سکے گا۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے باوجود نہیں پیئے گا تو یہ مشکل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تو ابن العربی نے عارضہ میں یہ توجیہ کی ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز کے حصول میں غلبت اور جلدی سے کام لیا جس کی تاخیر اور انتظار کا حکم تھا تو جس طرح اپنے مورث کو قتل کرنے سے قاتل وارث کو محروم از میراث کر دیا جاتا ہے اسی طرح یہ بھی محروم کر دیا جائے گا۔

مگر اس سے وہ اشکال حل نہیں ہوا کہ جنت میں ہر خواہش پوری کر دی جائے گی۔ بعض نے کہا کہ اس شرابی کی چاہت ختم کر دی جائے گی جیسے دنیا میں بعض لوگ مٹھے کو پسند نہیں کرتے اسی طرح باوجود دستیابی کے شرابی، شراب کی خواہش نہیں کرے گا، تو سزا بھی مل جائے گی اور اسے محسوس بھی نہ ہوگا، اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کم درجے کے جنتی اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھتے ہوں گے اور کسی طرح احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں گے،

فَلَا تَحْزَنُوا وَاللَّهُ عَلِيمٌ عَلِيمٌ

دوسری حدیث:۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے شراب پی لی تو اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہ ہوں گی، پس اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ (توبہ) قبول فرمائیں گے، اگر وہ دوبارہ لوٹے گا (یعنی ثانیاً پیئے گا) تو اللہ اس کی چالیس ایام کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے۔ پھر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ قبول فرمائیں گے، اور اگر وہ پھر لوٹا ہے تو اللہ اس کی چالیس روز کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے پس اگر اس نے توبہ کر لی تو اللہ قبول کریں گے، پس اگر وہ چوتھی بار لوٹ آئے تو اللہ

اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں فرمائیں گے، پس اگر وہ (آب کی بار) توبہ کرے گا تو اللہ قبول نہیں فرمائے گا اور اسے نہر خبال سے پلائیں گے، کہا گیا: اے ابو عبد الرحمن نہر خبال کیا چیز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ دو زخیوں کے پیپ کی نہر ہے۔

تشریح:- ابو عبد الرحمن، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ یعنی اہل جہنم کے زخیوں سے کثیر مقدار میں جو پیپ خارج ہوتا ہے وہ نہر کی شکل اختیار کرے گا اور اسی میں سے شرابیوں کو پلایا جائے گا۔ اس حدیث میں ”صبح“ کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف صبح کی نماز مراد ہو اور وجہ تخصیص اشرفیت ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ اس سے پورے دن کی نمازیں مراد ہیں، اور ذکر الجزء والمرامۃ الکمل عام استعمال ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گندی غذا کا اثر چالیس دنوں تک باقی رہتا ہے، تاہم بعض صوفیہ نے اس میں غلو سے کام لیا ہے کہ اگر کسی بکری کا بچہ مادہ خنزیر کا دودھ پئے تو اسے چالیس دن تک صاف ستھری غذا کھلائی جائے گی اس کے بعد ذبح کر کے کھانا جائز ہوگا۔ مسئلہ کی وضاحت جلالہ کے ضمن میں گذری ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تین بار اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں اس کے بعد نہیں، تو ابن العربی تو فرماتے ہیں کہ موت تک توبہ قبول ہونے پر اجماع ہے لہذا اس حدیث کو وہ صحیح نہیں مانتے لیکن پہلے گذرا ہے کہ قاضی شوکانی نے فرمایا کہ جمہور کے نزدیک حدیث حسن بھی حجت ہے۔ جبکہ امام بخاری اور ابن العربی حسن کو صحیح نہیں مانتے، اس لئے جمہور کے نزدیک اس کی توبہ لازمی ہے۔

لہذا جمہور کے نزدیک یا توبہ تشدید اور تغلیط پر محمول ہے اور نفی توبہ سے رحمت کا۔ کی نفی ہے یعنی اس کی توبہ قبول تو ہو جاتی ہے مگر دل میں جو کہ درت گناہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے وہ مکمل صاف نہ ہوگی اور باری تعالیٰ کی رحمت کا ملہ اسے اپنی آغوش میں نہیں لے گی۔

یا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے پھر آدمی یا تو توبہ کرتا ہی نہیں ہے یا پھر ہلکا سا ارادہ کرتا ہے مگر اس میں عزم نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق نہیں دیتا اور یہی وجہ ہے کہ گناہ پر اصرار سے خاتمہ بالسوء کا خطرہ رہتا ہے، پھر نماز کے علاوہ باقی اعمال قبول ہوں گے یا وہ بھی قبول نہیں ہوتے تو اس میں دونوں احتمال ہیں ظاہر یہ ہے کہ کوئی عمل قبول نہیں ہوگا کیونکہ نماز عماد الدین ہے جب یہ قبول نہ ہوگی تو باقی تو بطریق اولیٰ قبول نہیں ہوں گے۔

ملا علی قارئی مرقات میں لکھتے ہیں کہ عدم قبول سے مراد ثواب نہ ملنا ہے باقی اگر اس نے شرائط کے

ساتھ نمازیں پڑھی ہوگی تو اس کا ذمہ فارغ ہو جائے گا اور قضاء واجب نہ ہوگی۔

باب ماجاء کل مسکر حرام

”عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن البتغ فقال: کل شراب اسکر فهو حرام۔“^۱

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے شہد کی نبیذ کے بارے میں پوچھا گیا (یعنی حل و حرمت کے متعلق) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی شراب جو نشہ پیدا کرے تو وہ حرام ہے۔

لغات :- قولہ ”البتغ“ مفسر الباء وسكون التاء جبکہ تاوی کی حرکت بھی جائز ہے شہد کی نبیذ اور شراب کو کہتے ہیں۔ بعض اہل لغت نے انگوڑی شراب پر بھی اطلاق کیا ہے۔

تشریح :- حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ الکوکب الدری میں فرماتے ہیں کہ سوال اگرچہ مخصوص نبیذ کے بارے میں تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون کلی کے عنوان میں جواب دیا تا کہ اس پر جزئیات کی تعریفات ہو سکیں۔ اس ضابطے کا مطلب یہ ہے کہ جو شراب نشے کے درجے میں داخل ہو جائے یعنی اس کے پینے سے نشہ پیدا ہوتا ہو تو وہ حرام ہے اور اس پر اجماع ہے کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے، البتہ اختلاف اس میں ہے کہ شہد وغیرہ کی شراب مطلقاً حرام ہے خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر یا پھر نشے کی مقدار کثیر ممنوع اور قلیل جائز ہے؟ بشرطیکہ تقویٰ علی العبادۃ کی نیت سے ہو توائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہم اللہ نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے، جبکہ شیخین رحمہما اللہ دوسری صورت کو پسند کرتے ہیں کیونکہ حدیث سے علت سکر کی طرف اشارہ ملتا ہے، تاہم ارباب فتویٰ نے امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی ہے تفصیل گذشتہ باب کی دوسری بحث میں گذری ہے فلا تعید۔

باب ماجاء کل مسکر حرام

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ومسلم وأبو داؤد والنسائی وابن ماجہ ومالك فی الموطأ وأحمد فی مسنده بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۵۳ ج: ۲ حدیث: ۴۰۹ کتاب الاشریہ۔

باب ما سکر کثیرہ فقلیلہ حرام

”عن جابر بن عبد اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما سکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔“^۱

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس چیز (مشروب) کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے تو اس کا قلیل بھی حرام ہے۔

تشریح:۔ جیسا کہ پیچھے گذرا ہے کہ قلیل کی حرمت خمر میں تو متفقہ ہے اور باقی اشربہ ثلاثہ میں بھی قلیل ممنوع ہے گو خمر اور اشربہ ثلاثہ کی حرمت میں قدرے فرق پایا جاتا ہے، تاہم حنفیہ کے نزدیک خمر کے علاوہ باقی اشربہ جیسے گندم، جو اور شہد وغیرہ کی شراب میں اصل علت سکر ہے لہذا جس چیز میں سکر ہو گا وہ حرام ہوگی اور جس میں نشہ نہ ہو گا وہ حرام نہ ہوگی، البتہ یہاں دوسری علت بھی حرمت کی پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر نبیذ وغیرہ مشروبات بطور تہنی و مستی اور بیجان پیدا کرنے کی غرض سے ہو، یا وہ قلیل، زیادہ پینے کا سبب بنتا ہو تو پھر قلیل مسکرات کا بھی حرام ہوگا اگرچہ قلیل میں نشہ پیدا کرنے کی بالفعل طاقت نہ ہو، اور یہی حنفیہ کے نزدیک مفتی بہ ہے حضرت شاہ صاحب اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے بعد المعروف الشذی میں فرماتے ہیں:

”واقعه) فی شرح الہدایۃ ان اباحفص الکبیر افنی بحرمۃ النبیذ فقلیل لہ مخالفت

اباحنیفۃ افعالہ ما مخالفتہ فانہ یحرم اذا کان لتلہی و اناس الزمان یشرہونہ علی

التلہی۔۔۔“

وہ مزید فرماتے ہیں: ”و بحسب العمل بما قال الجمهور و محمد بن حسن“، یعنی مفتی بہ قول جمهور کا ہے۔ ہدایہ کے شارحین نے امام صاحب سے نقل کیا ہے، کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر مجھے ساری دنیا کی چیزیں اور ان جیسی مزید دی جائیں تو بھی میں نبیذ ایک قطرہ نہیں پیوں گا، کیونکہ اس میں اختلاف ہے اور اگر مجھے دنیا کی ساری اشیاء دی جائیں تاکہ میں نبیذ کو حرام قرار دوں تو میں ایسا بھی نہیں کروں گا کیونکہ اس میں اختلاف

باب ما سکر کثیرہ فقلیلہ حرام

۱۔ أخرجه النسائي من: ۳۲۶ ج: ۲ کتاب الاشربة، أخرجه الطبرانی في الكبير حديث: ۳۸۸۰ وفي الاوسط أيضاً

حديث: ۶۳۳۶، كذا في مجمع الزوائد من: ۵۸ ج: ۵ حديث: ۸۱۰۹ کتاب الاشربة.

ہے۔ (راجع لفصل الحرف الشدی علی الترمذی)

دوسری حدیث:- ”عن عائشة قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کل مسکر حرام ما سکر الفرق منه فملاً الکف منه حرام قال احدهما فی حدیثه الحسوة منه حرام۔“
حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ہر نشہ آور چیز (مشروب) حرام ہے جس کا ایک فرق (بڑا پیاناہ ہے) نشہ پیدا کرے تو اس کا ایک چلو بھی حرام ہے (اور میرے دونوں شیخین محمد بن بشار یا عبد اللہ معاویہ) ایک ان دو میں سے اپنی حدیث میں کہتے ہیں کہ اس کا ایک گھونٹ بھی حرام ہے یعنی ایک نے چلو کا لفظ استعمال کیا اور دوسرے نے گھونٹ کا۔

لغات:- قولہ ”الفرق“ مرا کا سکون اور فتح دونوں جائز ہیں وہ پیاناہ جس میں سولہ رطل آجائیں یہاں یہ کنایہ ہے کثرت سے۔ فرق کی مقدار میں اور بھی اقوال ہیں۔ قولہ ”حسوة“ بضم الحاء و سکون ال سین ایک مٹھی اور چلو کو کہتے ہیں یہاں پر چلو اور گھونٹ دونوں تحدید کے لئے نہیں ہیں بلکہ قلت سے کنایات ہیں۔

باب ماجاء فی نبیذ الجر

”عن طاؤس ان رجلاً أتى ابن عمر فقال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نبیذ الجر؟ فقال: نعم فقال طاؤس: والله انی سمعته منه۔“

حضرت طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑے میں نبیذ بنانے سے ممانعت فرمائی ہے؟ تو ابن عمرؓ نے فرمایا: ”ہاں“ طاؤس فرماتے ہیں: بخدا میں نے ابن عمرؓ سے یہ کہتے سنا ہے۔

لغات:- قولہ ”نبیذ“ فعلیل وزن ہے گویا مفعول سے بنا ہے یعنی منبوذ سے، انگور یا کھجور وغیرہ پانی میں ڈال کر رکھ کر چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ پانی مٹھا ہو جائے خواہ اس میں نشہ آئے یا نہ آئے دونوں صورتوں

باب ماجاء فی نبیذ الجر

۱۔ اسی مضمون کی روایت عن سوبد بن مقرن قال اتيت رسول الله ﷺ بنیذ الجر لسانه عنه فنهاني عنه فاحذت الجر فکسر لھا، رواه احمد فی مسنده ص: ۴۷۷ ج: ۴، حدیث: ۱۵۲۷۷، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۵۹ ج: ۵، ایضاً مصنفہ عبدالرزاق ص: ۱۲۳ ج: ۹، کتاب الاشرہ والظروف۔

میں اسے نبذ کہتے ہیں۔ قولہ ”جر“ فتح المعجم وتشدید الراء جرۃ کی جمع ہے جیسے ترمذی اور ترمذی اس کی جمع جر اور بھی آتی ہے اس لئے اور جر سے کو کہتے ہیں جو منی سے ناپا جائے۔

تشریح:- طاؤس ابن کیسان المتوفی ۱۰۶ تا ۱۱۱ء میں بعض نے نام ذکوان اور طاؤس لقب بتلایا ہے طاؤس مور کو کہتے ہیں جو ایک خوبصورت پرندہ ہے۔ یہاں ساکس کے سوال میں حمزہ استفہامیہ مقدر مانا جائے گا جیسا کہ نسائی کی روایت میں مذکور ہے انہی۔^۱

عربوں میں یہ دستور تھا کہ منکوں اور گھڑوں کے مسامات تارکول وغیرہ سے بند کر کے ان میں نبذ بناتے تھے، اور اس چیز سے نبذ میں جلدی سکر آ جاتا تھا اس لئے شراب کی حرمت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام ادائی و ظروف پر پابندی لگادی جن سے نبذ میں سکر پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تاہم یہ پابندی جمہور کے نزدیک پھراٹھالی گئی تھی۔ جبکہ امام مالک، امام احمد اور ایک روایت کے مطابق امام اشعری کے نزدیک یہ بدستور باقی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا مذہب بھی یہی بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

”ثم ان هذا النهی كان في اول الامر ثم نسيخ بحديث يزيد بن رضى الله عنه.... الى ان قال.... هذا الذي ذكرناه من كونه منسوخا هو مذهبا ومذهب جماهير العلماء قال الخطابي: القول بالنسخ هو اصح الاقوال وقال قوم: التحريم باق وكرهوا الانتباذ في هذه الاوعية ذهب اليه مالك واحمد واسحق وهو مروي عن ابن عمرو بن عباس رضى الله عنهم۔ (مسلم مع النووي ص ۳۳ ج ۱) فتح کی دلیل اگلے سے پیوستہ باب میں آ رہی ہے۔

ابن العربی نے بھی عارضہ میں لکھا ہے:

”اختلف العلماء في هذا اختلافا كثيرا روى عن مالك منع ذلك وبه قال احمد واسحق وروى عنه (اي عن اسحق) اجازته الخ۔

علیٰ ہذا حضرت ابن عمرؓ کے جواب ”نعم“ کی کسی توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ انہوں نے یہ جواب اپنے ذوق کے مطابق دیا ہے تاہم وہ فتح کے قائل کیوں نہیں تھے، تو ممکن ہے کہ وہ بطور سد ذرائع اس کی ممانعت فرماتے ہوں، کیونکہ لوگ عموماً احتیاط نہیں کرتے ہیں اور نبذ کو زیادہ دیر کے لئے چھوڑ لیتے ہیں یہاں تک

کہ وہ مسکربن جاتی ہے یا ادنیٰ درجے کا سکر اس میں آجاتا ہے مگر لوگ پھر بھی اسے پیٹے ہیں تو پابندی کا فائدہ حرام سے دور رکھنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ امام ابوحنیفہؒ نے ہدی کے شعار سے منع فرمایا تھا کیونکہ لوگ اس میں غلو کیا کرتے تھے گویا مفتی کو حالات کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ أن ینبذ فی الدباء والنقیور والجنتم

”عن عمرو بن مَرْثَةَ قَالَ سَمِعْتُ زَاذَانَ يَقُولُ سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ عَمَّا نَهَى عَنْهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْأَوْعِيَةِ وَأَخْبَرَنَاهُ بِلَفْتِكُمْ وَفَتِيرَهُ لَنَا بِلَفْتِنَا قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْحَتْمَةِ وَهِيَ الْحَرَّةُ وَنَهَى عَنِ الدَّبَاءِ وَهِيَ الْقِرْعَةُ وَنَهَى عَنِ النَّقِيرِ وَهِيَ أَصْلُ النَّحْلِ يُنْقَرُ نَقْرًا أَوْ يُنْسَجُ نَسْجًا وَنَهَى عَنِ الْمَرْفَتِ وَهُوَ الْمَقْبُورُ وَأَمْرَانِ يُتَبَذَّ فِيهِ الْأَسْقَبَةُ“

عمرو بن مَرثہ فرماتے ہیں میں نے زاذان سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابن عمرؓ سے ان برتنوں کے بارے میں دریافت کیا جن کے استعمال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اس کا بیان اپنی زبان میں کیجئے اور وضاحت ہماری زبان میں کیجئے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حتم سے منع فرمایا ہے اور وہ ہرے رنگ کا گھڑا ہوتا ہے، اور منع فرمایا ہے دبّاء سے اور وہ خشک کدو ہے۔ اور منع فرمایا ہے تمیر سے اور وہ کھجور کی جز کا تراشا ہوا گھڑا ہوتا ہے یا چھلا ہوا دمکا، اور منع فرمایا ہے مرفّت سے اور وہ تارکول کا لپ دیا ہوا دمکا ہوتا ہے۔ اور مشکیزوں میں غیذ بنانے کا حکم دیا ہے۔

لغات: بقولہ ”الاولیۃ“ وعاء بکسر الواو کی جمع ہے برتن کو کہتے ہیں۔ قولہ ”الحتمة“ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کے چھ معانی نقل کئے ہیں اور ان میں سے ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ ہرے رنگ کے مشکے کو کہتے ہیں ”واما الحتم فاختلف فیہا فاصح الاقوال واقواہا انہا جرار خضر“^۱ بہر حال یہ لفظ فتح الحما، وسکون النون اور فتح تاء پڑھا جائے گا بقولہ ”الحرّة مفتحة الجیم“ وفتح الراء المشددة مثنی کا دمکا۔ قولہ ”الدباء“ مضمم الدال وتشدید الباء کدہ کو کہتے ہیں۔ اس میں سے بیج اور گودا نکال کر بوتل کی طرح بناتے ہیں، ہمارے ہاں پہلے لوگ جب کھیت میں کام کرتے تو اس میں پانی اپنے پاس رکھتے خصوصاً تنسی اس میں کافی ٹھنڈی رہتی ہے۔

قولہ ”القرعة“ بروزن نملۃ یہ وہی مذکورہ کدو ہے۔ قولہ ”النقیر“ یہ قیل کی طرح بمعنی منقور کے ہے فقر کے لغوی معنی کریدنے، تراشنے اور کھودنے کے ہیں اصطلاح میں اس کی تفسیر وہی ہے جو حدیث باب میں کی گئی ہے، یعنی کھجور کے تنے کا جزو الا حصہ اندر سے خالی کر کے مکا نما بنانا۔ قولہ ”اوینسج“ اس لفظ کو جیم اور حاء دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے اگر جیم کے ساتھ ہے تو اس کا مطلب وہی ہے جو فقیر کی تفسیر میں بیان ہوا تاہم بعض حضرات نے جیم کے ساتھ پڑھنے کو وہم قرار دیا ہے اور حاء کی روایت کو صحیح کہا ہے جس کے معنی بیرونی حصہ کو کھیل کر ملائم کرنے اور اندرونی کو خالی کر کے مکا بنانے کے ہیں۔

قولہ ”العزفت“ بتشدید الفاء المفتوحہ اس کے معنی وہی ہیں جو حدیث میں اس کے بعد بیان کئے گئے ہیں یعنی ”مقیر“ چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں: ”واما المقیر فهو العزفت“۔ مقیر بضم المیم وفتح القاف وتشدید الیاء المفتوحہ پڑھا جائے گا۔ زفت اور قیر دونوں کے معنی تار کول کے ہیں۔ تار کول لگانے سے مسامات بند ہو جاتے ہیں پھر اس میں بھی نیذ مسکر بن جاتی ہے جس طرح سابقہ برتنوں کی اقسام میں نیذ جلدی مسکر بن جاتی ہے۔

تشریح:- جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ان برتنوں کا استعمال ابتداء زمانہ حرمہ فرم میں ممنوع قرار پایا تھا بعد میں اس کی اجازت دی گئی تھی، اور اب جمہور کے نزدیک ان کا استعمال جائز ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس کے لئے مستقل باب اس باب کے بعد قائم کیا ہے، بہر حال یہ ممانعت مطلق استعمال سے نہ تھی بلکہ نیذ بنانا اور رکھنا ان میں ممنوع تھا، کیونکہ ایک تو مسامات بند ہونے کی وجہ سے سکر کا قوی اندیشہ تھا۔ دوم یہ برتن عموماً شراب کے لئے استعمال ہوتے تھے تو ان کے نخس ہونے کے ساتھ ان کے استعمال سے شریبوں سے مشابہت آتی یا شراب یاد آ جاتی۔ علاوہ ازیں شریعت مطہرہ کا یہ بھی اصول ہے کہ جب کسی چیز پر سخت پابندی لگاتی ہے تو اس کے مقدمات پر بھی پہرہ بٹھا دیتی ہے جیسے فرمایا: ”ولا تقربوا الزنا“ لآ یہ سگے تاہم ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ جس چیز کو لعینہ حرام و ممنوع قرار دے دیا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے حرام و ناجائز ہوتی ہے جبکہ کسی چیز کو علت کی وجہ سے حرام دینے کی صورت میں اس علت کی نفی سے عند الحماچہ حرمت مرتفع ہو جاتی ہے۔

”واذا نهى عن الشيء بعينه لم تؤثر فيه الحاجة واذا كان لمعنى في غيره اثر فيه

الحاجة لارتفاع الشبهة معها“۔ (عارضۃ الاحوی)

علیٰ ہذا جب صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں شراب کی نفرت شدت اختیار کر گئی تو ان برتنوں کے استعمال میں تشدید کی ضرورت ختم ہو گئی اور عند الحاجة صحابہ کرامؓ کی درخواست پر حرمت ختم کر دی گئی۔

باب ماجاء فی الرخصة أن ینتبد فی الظروف

”عن سلیمان بن بُریدة عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انی كنت

نهیتکم عن الظروف وان ظرفاً لا یجل شیئاً ولا یحرمه وکل مسکر حرام“۔

حضرت بُریدہ بن الحصیبؓ فرماتے ہیں: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے تمہیں (چار) برتنوں (میں نبیذ بنانے کے لئے ان) کے استعمال سے روکا تھا تاہم کوئی برتن کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کرتا اور ہر نشہ آور (چیز) حرام ہے۔

دوسری حدیث:- اس باب میں دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا تو (کچھ عرصہ بعد) انصار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس دوسرے برتن نہیں ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تو ان کے استعمال میں حرج نہیں۔

تشریح:- یہ حدیث نسخ پر صریح ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی جمہور کا مذہب ہے۔ عارضہ میں ہے کہ امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ نے نسخ کی علت دفع حرج اور تخفیف کو بتایا ہے۔

چونکہ ممانعت کی علت گویا ان وجوہات میں سے ایک تھی جن کا ذکر سابقہ بابوں میں کیا گیا مثلاً سد ذرائع وغیرہ مگر دوسری جانب ضرورت جب ان سے مراحم بن گئی اور حرمت کی علت اتنی طاقتور بھی نہ تھی، اس لئے حاجت کی علت اباحت کو ترجیح دے کر ان کے استعمال کو جائز فرمایا، اور اگر ہم یہ کہیں کہ حرمت موقت تھی یا جب صحابہ کرامؓ نے درخواست فرمائی تو من جانب اللہ اسی وقت وحی جواز کی نازل ہوئی تو پھر کسی توجہ کی ضرورت نہیں۔

تاہم یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ آج کل ہوس پرستی کا دور ہے لوگ معمولی ضرورت کی بناء پر حرام اشیاء کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں یا درکھنا چاہئے کہ اصحاب ترجیح صاحب ہدایہ اور قاضی خان جیسے لوگ

ہوتے ہیں یہ کام ہر کس و نا کس کا نہیں ہے، کہ جو ضرورت سمجھ میں آجائے تو اسے صبح قرار دیدے گا و حاشا۔
اگر کسی کی جوان لڑکی کالج میں پڑھتی ہے تو اسے اس لئے یاری کی اجازت دینا تاکہ وہ اپنی تعلیم تسلی سے مکمل
کرے ایک خیالی ضرورت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

باب ماجاء فی الانتباز فی السقاء

”عن عائشة قالت کُنَّا نَنْبِذُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَقَاءٍ يَوْكَاُ اَعْلَاهُ لَهُ
عِزْلَاءٌ، تُنْبِذُهُ غُلُوَّةٌ وَيُشْرِبُهُ عِشَاءٌ وَتُنْبِذُهُ عِشَاءٌ وَيُشْرِبُهُ غُلُوَّةٌ“۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نبیذ بناتے تھے
ایسے مشکیزہ جس کے اوپر کا منہ باندھا جاتا تھا اور اس کے نیچے میں ایک چھوٹا سوراخ ہوتا تھا ہم صبح
کھجوریں ڈالتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے شام کو پیتے اور شام کو بناتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو نوش
فرماتے۔

لغات :- قولہ ”نبیذ“ بکسرۃ باء باب ضرب سے بھی آتا ہے اور باب افعال و تفعیل سے بھی آتا ہے
علیٰ ہذا یحیرنوں اول مضموم ہوگا۔

قولہ ”سقاء“ بکسرۃ سین والفاء ممدودہ پانی کے مشک اور دودھ کے مشکیزے کو کہتے ہیں۔

قولہ ”یوکا“ بھینٹہ مجھول مہوز اللام ہے ”ای یوکا بالو کاء“ یعنی جس چیز کا منہ دوری سے باندھا
جاتا ہے۔ تاہم امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ مہوز نہیں ہے بلکہ صحیح ”بسو کسی“ یاء کے ساتھ ہے۔ مطلب دونوں
کا ایک ہی ہے چاہے مہوز ہو یا متعل۔

قولہ ”عِزْلَاءٌ“ بفتح اعرین و سکون الزاء وبالمدودہ چھوٹا سوراخ جو مشکیزے کے نیچے حصہ اور جانب میں
ہوتا ہے اور اسی سے پانی پیا جاتا ہے گویا اس سے ٹوٹی کا کام لیا جاتا ہے جیسے کولر میں اوپر سے پانی ڈال
کر بند کر دیا جاتا ہے اور نیچے ٹوٹی سے پانی نکالا جاتا ہے۔

قولہ ”غُلُوَّةٌ“ بضم الغین عموماً بدن کے پہلے حصے کو اور ”عِشَاءٌ“ بکسرۃ اعرین مابعد الزوال کو کہتے ہیں۔

تشریح :- اس روایت سے مشکیزے میں نبیذ بنانے کا جواز معلوم ہوا۔ ترمذی کی روایت اگرچہ درجہ
حسن میں ہے کیونکہ حضرت ابن بصریؒ کی والدہ ”خیرہ“ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مولاۃ مقبولہ

ہیں تاہم یہ حدیث مسلمؒ و ابوداؤدؒ وغیرہ میں بھی ہے۔

البتہ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ مسلمؒ وغیرہ کی حدیث میں تین دنوں کا ذکر ہے جبکہ باب کی حدیث میں ایک دن کا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

”كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينذله الزبيب في السقاء فيشربه يومه والغدو بعد الغد فاذا كان مساء الثالثة شربه وسقاء فان فضل شئى اهرقه“۔

اور یہ تو بظاہر تعارض ہے۔

اس تعارض کے حل کے لئے ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ اختلاف موسموں کے تفاوت پر مبنی ہے چونکہ گرمیوں میں تغیر جلدی آتا ہے اس لئے حضرت عائشہؓ کی حدیث موسم گرما پر محمول ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سردی کے موسم سے متعلق ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں مقدار قلیل کا ذکر ہے یعنی تھوڑی سی مقدار میں خنجر تیار کی جاتی تھی جو ایک وقت میں ختم ہو جاتی اگر زیادہ ہوتی تو تین دن تک بھی استعمال فرماتے جیسا کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مشکوں کا فرق ہو حضرت عائشہؓ کے گھر میں جو مشک تھی وہ چھوٹی یا پرانی ہوگی اور حضرت میمونہؓ کے گھر میں جو مشک تھی وہ بڑی یا نئی ہوگی، چھوٹی میں قلیل غنیمت بن سکتی ہے اور پرانی میں مسامت کی بندش کی وجہ سے سکر جلد آنے کا اندیشہ ہوتا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت میمونہؓ کے گھر کا حال بیان کیا ہے جہاں مشک میں یہ دونوں غلٹیں نہ تھیں، پھر یہ اختلاف اسی طرح ہو جائے گا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے طریقے میں حضرت عائشہؓ اور حضرت میمونہؓ کی حدیثوں میں اختلاف ہے جسکی ایک توجیہ امام مالکؒ کے قول کے ضمن میں یہی کی گئی ہے کہ یہ دو الگ الگ غسل خانوں پر مبنی ہے۔ کما مر فی باب فلا نعیدہ

باب ما جاء في الانتباز في السقاء

۱۔ ترمذی، ج ۱۶۸: ۲ کتاب الاشریہ، ۲ مسند ابی داؤد ص ۱۶۶: ج ۲ ”باب فی صفة النبید“ کتاب الاشریہ، مسند نسائی ص ۳۲۸: ج ۲ کتاب الاشریہ، العنقی عقی عنہ

باب ماجاء فی الحبوب التي يتخذ منها الخمر

”عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان من الحنطة خمر أو من الشعير خمر أو من التمر خمر أو من الزبيب خمر أو من العسل خمر“۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گندم کی بھی شراب ہوتی ہے، جو کی بھی شراب بنتی ہے چھوڑوں کی بھی خمر ہوتی ہے اور کشمش سے بھی خمر بنتی ہے اور شہد کی بھی شراب ہوتی ہے۔

لغات:- قولہ فی ترجمۃ الباب ”الحبوب“ حب کی جمع ہے اور حنطہ کی جمع ”حبات“ آتی ہے دانے کو کہتے ہیں تاہم مطلق غلوں اور پھلوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔
قولہ ”الحنطة“ بکسر الہاء گیہوں اور گندم کو کہتے ہیں۔ قولہ ”الشعیر“ جو۔ قولہ ”التمر“ کشمش کھجور اور چھوڑے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”الزبيب“ کشمش۔

تشریح:- ابن الملک فرماتے ہیں کہ ان اشیاء کی بنی ہوئی شراب کو خمر بطور مجاز کہا ہے۔ ابن سید نے بھی محکم میں جزم کیا ہے اس پر کہ اصل خمر تو انگور کی ہوتی ہے باقی مسکرات کو مجازاً خمر کہا جاتا ہے (کذا فی تحفۃ الاحوذی)۔ حدیث سے متعلقہ بحث تفصیل سے ”باب ماجاء فی شراب الخمر“ میں گذری ہے۔ فیراجع۔

باب کے اخیر میں حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث ہے ”الخمير من هاتين الشحرتين النخلة والعبه“ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں کہ یہ حکم اہل مدینہ کے لئے تھا کیونکہ ان کی شراب انہی دونوں یعنی کھجور اور انگور سے بنتی تھی۔

ابن جریر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ جو لوگ انگور کے علاوہ اشرہ پر خمر کا اطلاق حقیقی مانتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد حقیقہ شرعی ہو اور جو لوگ اس کی نفی کرتے ہیں وہ لغوی اعتبار سے نفی کرتے ہیں۔ (کذا فی الحقۃ عن فتح الباری) اس میں حنفیہ کے موقف کو تسلیم کیا گیا ہے۔

باب ماجاء فی خلیط البسر والتمر

”عن جابر بن عبد اللہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان یتخذ البسر والرطب جميعاً۔“^۱

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچی پکی کھجوروں کو ملا کر بنیذ بنانے سے منع فرمایا ہے۔

دوسری حدیث:۔ اس باب کی دوسری حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں انگور اور چھواروں کے ملانے اور مشکوں میں بنیذ بنانے کی ممانعت کا اضافہ ہے۔

لغات:۔ قولہ فی ترجمۃ الباب ”خلیط مختلف النوع چیزوں کے مجموعے کو خلیط کہا جاتا ہے گویا کہ فعلیل بمعنی مفعول ہے خلط الشئ بالشئ کے معنی ملانے اور خلط ملط کرنے کے ہیں۔ قولہ ”البسر“ نیم پختہ کھجور، گد رکھجور۔ ویسے ہر تازہ شے کو بھی کہتے ہیں مگر یہاں کچی و نیم پختہ کھجور مراد ہے۔ قولہ ”الرطب“ ضم المراء وفتح الطاء پکی ہوئی تازہ کھجور۔

تشریح:۔ اس باب کی حدیث سے مرکب بنیذ بنانے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے مگر اس ممانعت کا درجہ کیا ہے تو اس میں متعدد اقوال ہیں۔ امام احمد اور امام الطحاوی اور عام شافعیہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں، اگرچہ اس میں سکر نہ آیا ہو۔ جبکہ مالکیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں ایک تحریم کا دوسرا کراہت کا۔ یہ اختلاف ابن العربی نے عارضہ میں نقل کیا ہے۔ جبکہ امام نووی شرح مسلم جلد دوم صفحہ ۱۶۴ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

”ومذهبنا ومذهب الجمهور ان هذا النهی لکراهية التنزیه ولا یحرم ذالک مالم یصر مسکراً وبهذا قال جماهير العلماء وقال بعض المالکيه هو حرام وقال ابو حنیفة وابو یوسف فی رواية عنه لا کراهية فیہ ولا بأس به“ الخ۔^۲

جبکہ ترمذی کے حاشیہ پر اختلاف اس طرح نقل کیا ہے:

باب ماجاء فی خلیط البسر والتمر

۱۔ الصحیحین أخرجه ابن ابی شیبہ فی مصنفه ص: ۵۰۴ ج: ۵ کتاب الاشریہ والطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص: ۵۶ ج: ۵ مع النووی علی مسلم ”باب کراهية اتصاف التمر والزبيب مخلوطین“ کتاب الاشریہ.

”قال مالكٌ واحمدٌ يحرم شرب نبيذ خلط فيه شيان وان لم يسكر عملاً بظاهر الحديث وهو احد قولى الشافعى وقال ابو حنيفة لم يحرم ان لم يكن مسكراً وهو القول الثانى للشافعى۔“

گویا کہ ائمہ کے اقوال اس بارے میں کافی سارے ہیں۔ بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ خلط میں نشہ داخل ہونے کے بعد اس کی حرمت پر اتفاق ہے لیکن سکر سے پہلے حنفیہ کے نزدیک یہ بلا کراہت جائز ہے۔ جبکہ جمہور کے نزدیک یہ بھی منع ہے۔ ایک ایک قول کے مطابق حرام ہے اور ایک ایک قول میں مکروہ ہے وہ اس حدیث کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے اسے اطلاق پر رکھتے ہیں۔ مگر بعض حضرات اتنے سے فرق کے قائل ہیں کہ نبی کی علت سکر ہے لہذا قبل المسکر کراہت تنزیہی ہوگی اور بعد از سکر تحریم ہوگی۔ جبکہ بعض حضرات یہ فرق بھی نہیں مانتے جیسے امام احمد۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ چونکہ بعض روایات سے خلط کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ ابوداؤدؒ و کتاب الآثارؒ میں ہے لہذا اباب کی حدیث کا جواب صاحب ہدایہ نے یہ دیا ہے، کہ یہ شروع زمانہ ہجرت پر محمول ہے کیونکہ اس میں غربت زیادہ تھی اور کھانے کی اشیاء کی کمی تھی، تو خلط پر پابندی کا مقصد یہ تھا کہ لوگ کنایت شعاری کو اپنائے اور دوسروں کے ساتھ مواسات اور ہمدردی رکھیں۔ پھر یہ نئی صرف منصوص علیہ اشیاء تک محدود ہے یا باقی اشیاء بھی ان پر قیاس کی جاسکتی ہیں؟ تو اس بارے میں دونوں اقوال ہیں۔ جبکہ ضابطہ یہ ہے ”کل مسکر حرام“ؒ کما مر۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الشرب فی آنیۃ الذهب والفضۃ

”عن الحكم قال سمعت ابن ابي ليلى يحدث ان حذيفة استسقى فأتاه انسان باناء من فضة فرماه به وقال انى كنت قلنهيته فابى ان ينتهى ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الشرب فى آنية الذهب والفضة ولبس الحرير والديباغ وقال: هى لهم فى الدنيا ولكم فى الآخرة۔“

۳ سنن ابی داؤد ص: ۱۶۵ ج: ۲ ”باب فی التخلیطین“ کتاب الاشربة۔

۴ کتاب الآثار ص: ۹۰ مکیہ امدادیہ ملتان، ایضاً حاشیہ: ۳ الموطا لمحمد ص: ۳۱۴ کتاب الحدود۔

۵ قد مر تخریجہ ”باب ماجاء فی شارب الخمر“۔

حضرت حکم سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے (عبدالرحمن) ابن ابی لیلیٰ کو بیان کرتے سنا ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے پانی طلب کیا تو ایک آدمی نے چاندی کے برتن میں پانی پیش کیا حضرت حذیفہؓ نے اس پیالے کو پینک دیا اور فرمایا: میں نے اسے منع کیا مگر یہ نہ مانا ہے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور چاندی کے برتنوں میں پینے سے منع فرمایا ہے اور ریشم و دیباچ کے پینے سے (بھی) منع فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اشیاء کفار کے لئے ہیں دنیا میں اور آپ کے لئے ہیں آخرت میں۔

لغات :- قولہ "استسقی" سقیایہ الحسین پانی کو اور ضم الحسین بارش کو کہتے ہیں باب ضرب سے آتا ہے سین تا طلب کے لئے ہیں یعنی پانی طلب کیا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ از روئے انت استقاء پانی مانگنے کو کہتے ہیں، اور از روئے شرع بارش مانگنے کو یہاں معنی لغوی مراد ہے۔ قولہ "الحریر" ریشم اور ریشمی کپڑے دونوں کو کہتے ہیں یہاں مراد ثانی ہے کیونکہ ممانعت پہننے کی ہے یعنی یا خریدنے کی نہیں۔ قولہ "الدیباج" وہ کپڑا جو اعلیٰ قسم کے ریشم یعنی ابریشم سے بنا ہوا ہو لہذا یہ ذکر خاص بعد العام ہے۔

تشریح :- بخاری شریفؒ کی ایک روایت میں ہے کہ پانی لانے والا شخص دہقان تھا جو ایک پیالے میں پانی لایا تھا۔ حافظہ فرماتے ہیں کہ دہقان فارسی میں بستی کے بڑے شخص کو کہتے ہیں۔ جبکہ بخاریؒ ہی کی ایک دوسری روایت میں بجوی کی تصریح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص ذی تھا۔ حافظہ فرماتے ہیں کہ اس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔^۱

پھر ترمذی کی روایت سے اس برتن کا فقط پھینکنا ثابت ہے مگر حافظہؒ نے اسامی کی روایت نقل کی ہے جس سے نوٹنا ثابت ہوتا ہے، گویا کہ مقصود پھینکنے سے توڑنا نہ تھا بلکہ صرف تنبیہ اور تادیب ملحوظ تھی۔

سونے چاندی کا استعمال :- اس پر اتفاق ہے کہ عورتیں سونے چاندی کے زیورات بنوا سکتی ہیں اور استعمال بھی کر سکتی ہیں، کیونکہ زیورات میں زینت ہے جو عورتوں کے لئے اپنے محل وقوع پر مطلوب و محمود ہے، لیکن باقی استعمال سونے اور چاندی کا جائز نہیں، خواہ کھانے پینے کے لئے ہو یا دوسرے کاموں کے لئے ہو۔

باب ماجاء فی کراهیۃ الشرب فی آیۃ الذهب والفضۃ

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۳۱ "باب الشرب فی آیۃ الذهب" کتاب الاشریہ، اہلاً معصفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۷ ج: ۵
کتاب الاشریہ وفيه: فلزاد ان يضرب به وجهه الخ. ج: صحیح بخاری ص: ۸۱۶ ج: ۲ "باب الاكل فی اناء معصف" کتاب الاطعمه. ج: کذا فی فتح الباری ص: ۱۱۷ ج: ۱۰ قدیمی کتب خانہ.

جیسے سردانی، سلائی وغیرہ استعمال کرنا اس میں مرد، عورتیں اور بچے سب برابر ہیں۔ تاہم چاندی کی انگوٹھی اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ مرد بھی ساڑھے چار ماشے کم استعمال کر سکتا ہے۔ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں اس پر زور لگا کر کہا ہے کہ یہ ممانعت صرف کھانے پینے کی اشیاء کے استعمال تک محدود ہے باقی استعمال کی چیزیں ان دونوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں، ان سے پہلے داؤد ظاہری نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا، جبکہ بعض شافعیہ عراقیین نے کہا ہے کہ امام شافعی کا قول قدیم عدم تحریم کا ہے گوکہ کراہیت کے وہ بھی قائل ہیں تاہم شافعیہ کا مغلیٰ بقول وہی ہے جو باقی ائمہ اور جمہور کا ہے یعنی مطلقاً تحریم خواہ کسی بھی استعمال کے لئے ہو۔

چنانچہ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

”واجمع المسلمون على تحريم الأكل والشرب في اناء الذهب واناء الفضة على الرجل وعلى المرأة لم يخالف في ذلك أحد من العلماء إلا ماحكاه أصحابنا العراقيون ان للشافعي قولاً قديماً انه يكره ولا يحرم وحكوا عن داود الظاهري تحريم الشرب وجواز الأكل وسائر وجوه الاستعمال وهذان النقلان باطلان... الى ان قال... وانما فرق بين الرجل والمرأة في التحلي لما يقصد منهما من التزين للزوج والسيد... قال: هذا مذهبنابو قال مالك وابو حنيفة والعلماء كافة“۔ (نووی شرح مسلم ص: ۱۸۷، ۱۸۸ ج: ۲)

جمہور کی دلیل کے طور پر ان تمام روایات کو پیش کیا جاسکتا ہے جن میں سونے چاندی کے استعمال پر وعیدیں آئی ہیں۔ کئی حدیث باب کے علاوہ اس قسم کی احادیث کافی زیادہ ہیں۔ علاوہ ازیں صاحب ہدایہ نے کتاب الکراہیۃ میں ممانعت کی ایک اور وجہ بھی بیان فرمائی ہے، کہ اس سے مشرکین کے طور و طریقہ اور وضع قطع میں مشابہت لازم آتی ہے اور اس کے استعمال سے دنیا دارانہ و تکبرانہ تاثر ابھرتا ہے جو ممنوع و مذموم ہے، چنانچہ معروف حدیث ہے ”من تشبه بقوم فهو منهم“۔^۱ ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب

۱۔ راجع للتفصیل مجمع الزوائد ص: ۸۵ ج: ۵ کتاب الاشریہ، ایضاً مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۷ و ۵۱۸ ج: ۵ کتاب الاشریہ۔ فی الحدیث أخرجه عبد الرزاق فی مصنفه ص: ۳۷۱ ج: ۱۰ حدیث: ۲۱۱۵۲، ایضاً معجم اوسط للطبرانی حدیث: ۸۳۲۵ مجمع الزوائد ص: ۲۶۱ ج: ۱۰، ایضاً سنن ابی داؤد ص: ۲۰۳ ج: ۲ کتاب اللباس، ایضاً جمع الفوائد ص: ۶۰۲ ج: ۱ کتاب اللباس۔

”نامُ افقتضاء الصراط المستقیم مخالفة اصحاب الحجیم“ لکھی ہے اس میں جہاں کفار کی مشابہت کی ممانعت پر احادیث مبارکہ نقل کی ہیں، وہیں اعاجم کی مشابہت کی ممانعت پر بھی روایات نقل کی ہیں ”وفسد روی عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه نہی عن التشبه بالاعاجم“۔ پھر اس پر تفریع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ سے سندھی نعال کے استعمال کی بابت پوچھا گیا کہ آدمی یہاں کرگھر سے باہر جاسکتا ہے؟ تو انہوں نے مرد اور عورت دونوں کے لئے ناپسند کیا البتہ بیت الخلاء کے لئے اور ان میں وضوء کرنے کی اجازت دی۔

”قال محمد بن حبر شیل احمد عن نعل سندھی یخرج فیہ؟ فکرمه للرجل والحرأه وقال ان کان للکئیف والوضوء فلا بأس وقال اکره الصرار وقال هو من زبی الاعاجم“۔ (ص: ۸۳)

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اپنی ہی ثقافت اور شناخت ہونی چاہئے، وہ غیر مسلموں کی کسی بھی تہذیب و ثقافت کے مجاز نہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں سندھ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ان کی ثقافت غالب تھی اس لئے سندھی نعال کو مکروہ قرار دیا ورنہ آج محمد اللہ سندھ کی اکثریت مسلمان ہے۔

مطلق تشبہ مذموم نہیں:- یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح کفار کی مشابہت مکروہ یا حرام ہے تو اسی طرح اعاجم کی بھی منوع ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے مگر یہ تشبہ علی الاطلاق مکروہ نہیں بلکہ جو امر مذموم میں ہوا و تشبہ کی نیت ہو۔ بلا قصد اگر کسی ضرورت کی چیز میں مشابہت آجائے تو اس میں کراہیت نہ ہوگی۔ چنانچہ در مختار میں ہے:

”فان التشبه بهم لا یکره فی کل شئی بل فی المذموم وفيما یقصد به التشبه کما فی البحر“۔

اس پر علامہ شامیؒ رد المحتار میں لکھتے ہیں:

”فاننا کل ونشرب کما یفعلون بحر... قال هشام رأیت علی ابی یوسف تعلین معوضین بمسامیر فقلت: أتری بهذا الحدید بأما؟ قال: ”لا“ قلت: سفیان وثور

۱۔ اسی طرح طبرانی کبیر میں ہے ان النبی ﷺ قال لا تقطعوا الخبز بالکین کما تقطعه الاعاجم الخ مجمع الزوائد ص: ۳۰

بن یزید کسر هذا ذلک لان فیہ تشبہا بالرهبان فقال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلبس النعال التي لها شعروا نهامن لباس الرهبان فقد اشار الى ان صورة المشابهة فیما تعلق به صلاح العباد لا یضر الخ۔ (شامی ص ۶۲۳ ج ۱)

”لہذا آج کل گاڑیوں اور چدیر آلات کا استعمال جائز ہوا۔ تاہم حضرت گنگوہی صاحب امر حسن میں بھی مشہد بہت ذمہ منون قرار دیتے ہیں۔ (الظہر تشریحات ص ۳۱۴ ج ۳)

قولہ ”ولیس الحریر والدیاج“ حدیث کے اس کڑے سے ریشم کے استعمال کی بھی ممانعت معلوم ہوئی۔ تاہم اس میں بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً عورتیں اس کو استعمال کر سکتی ہیں، جنگ میں اگر مجاہد کو ضرورت ہو۔ تاہم آج کل اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ پہلے اس پر سے تلواریں بھلی تھیں جو آج استعمال نہیں ہوتی۔ اس سے دشمن پر رعب طاری ہوتا تھا مگر آج کل دشمن دور سے حملہ کرتا ہے۔ اگر کسی ریشمی کپڑے کا شمار ریشم کا نہ ہو بابت اگرچہ ریشم کا وہ اس کا استعمال درجہ حرمت سے کم ہے۔ اسی طرح تین چار انگلیوں کی مقدار میں کوئی زینائن وغیرہ بنانا جو تو بھی جائز ہے۔ اسی طرح ریشمی کپڑے پر نیک لگانے کی بھی منجائش ہے، کسی کو خدائش کی بیماری ہو تو وہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ مثنیٰ ہر ایہ میں ہے:

”لا یحل للرجال لبس الحریر ویحل للنساء..... الا ان القلیل عفو و هو مقدار ثلثة اصابع أو اربع کما لا اعلام والمکفوف بالحریر..... قال... (ای القنوری) ... ولا یأس بتوسده والنوم علیہ عندابی حنیفة وقال ابکرہ..... قال.... ولا یأس بلبس الحریر والدیاج فی الحرب عدھما.... ویکرہ عندابی حنیفة... قال ولا یأس بلبس ماسدہ حریر ولحمہ غیر حریر کالقطن والخزفی الحرب وغیرہ الخ۔ (کتاب الترمذی ج ۴)

واضح رہے کہ فقہاء جہاں بھی ”لا یأس“ کا لفظ استعمال کریں تو اس میں خلاف اولیٰ کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

قولہ ”وقال ہی لھم فی الدنیلو لکم فی الآخرۃ“ یعنی کفار چونکہ اپنے آپ کو شریعت کے احکام کا پابند نہیں سمجھتے اس لئے سونا چاندی اور ریشم مردوں کے اوپر حرام ہونے کے باوجود یہ لوگ انیس استعمال کرتے ہیں، چونکہ آپ پر یہ مسخ ہیں لہذا کفار آخرت میں ان سے محروم ہوں گے اور آپ کو یہ سب چیزیں ملیں گی۔

پھر خاہر یہ ہے کہ ریشم کی ممانعت تحم سے اجتناب کی تلقین ہے لہذا ریشم کے علاوہ ایسی چیزوں سے بھی پرہیز کرنا چاہئے جو اہل تحم کے رغائب و مشاغل میں بطور خاص شامل ہوں۔

باب ماجاء فی النہی عن الشرب قائماً

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان یشرب الرجل قائماً، فقيل: "ألا کل" قال:

ذاك اشد (حسن صحیح)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کو کھڑے کھڑے پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ (ان سے) کھانے کے بارے میں پوچھا گیا (کہ کھڑے ہو کر کھانا کیسا ہے؟) فرمایا کہ وہ تو اور بھی بُرا ہے۔

دوسری حدیث :- اس باب میں دوسری حدیث حضرت جارد بن الحلاء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہ بھی نبی پر صریح ہے۔ تاہم باب کی تیسری حدیث ترجمۃ الباب سے مطابق نہیں اس کو امام ترمذی نے صرف اس مقصد کے لئے ذکر کیا ہے، کہ قتادہ کبھی ابو مسلم سے بلا واسطہ بھی روایت کرتے ہیں۔ جیسا کہ جارد کی پہلی حدیث نبی عن الشرب قائماً میں ہے اور کبھی بواسطہ یزید بن عبد اللہ عن ابی مسلم بھی روایت کرتے ہیں جیسا کہ جارد کی دوسری حدیث "ضالة المسلم حرق النار" میں ہے۔ لہذا بلا واسطہ حدیث کو منقطع نہ سمجھا جائے۔

قولہ "ضالة" گمشدہ اونٹ یا گائے ایسے جانور مراد ہیں جن کو گمشدگی کے باوجود کوئی خطرہ نہ ہو لہذا اس کو لینا "حرق النار" قرار دیا حرق بفتح الحاء، الراء جبکہ راء کا سکون بھی جائز ہے، اسی سبب حرق السنار یعنی اگر کسی نے بیت تملک لے لیا تو یہ اس کے مذاب کا سبب بنے گا۔ کیونکہ اگر اس کو چھوڑ دیا جاتا تو مالک کو مل جاتا کہ زمانہ دیانت کا تھا۔ یعنی ایسی چیز جس کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو تو اسے بیت تملک نہیں اٹھانا چاہئے۔ گمشدہ چیزوں سے متعلق بحث ابواب الاحکام "باب ماجاء فی اللطیفة وضالة الابل والغنم" میں گزری ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً

”عن ابن عمر قال كنا ناكل على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن نمشي ونشرب ونحن قيام“۔ (حسن صحيح غريب) ۱

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چلتے پھرتے کھایا کرتے تھے اور کھڑے کھڑے پیا کرتے تھے۔

دوسری حدیث :- اس باب میں دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوئے زمزم کا پانی پیا ہے۔

تیسری حدیث :- اور باب کی تیسری حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے دونوں حالتوں میں پیتے دیکھا ہے۔

تشریح :- چونکہ کھڑے ہوئے شخص کے لئے پانی پینے کے بارے میں دونوں طرح کی روایات ثابت ہیں، ایک قسم نبی کی اور دوسری قسم جواز کی۔ اس لئے امام ترمذی نے بالترتیب دو الگ الگ باب قائم کر لئے پہلے نبی کے لئے اور دوسرا جواز کے لئے۔

یہ مسئلہ اگرچہ (تشریحات ترمذی ص ۱۹۶ جلد اول) باب فی وضوء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کیف کان“ میں گزر رہا ہے مگر وہاں ضمناً ذکر ہوا تھا اس لئے یہاں دوبارہ معاد کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اس بارے میں روایات دونوں جانب ثابت ہیں، نبی کے بارے میں ترمذی نے پہلے باب میں حدیث ذکر کی ہے۔ امام مسلمؒ نے بھی (مسلم شریف جلد ثانی ص ۷۳ پر) اس کے لئے متعدد احادیث ذکر فرمائی ہیں ”وفیه... لا یشرین احد منکم قائماً فمن نسی فلیستقیء“۔

باب ماجاء فی الرخصة فی الشرب قائماً

۱ الحدیث أخرجه ابن ماجه واحمد، بحواله سنن دارمی ص: ۱۶۲ ج: ۲ حدیث: ۲۱۴۵ کتاب الاشریہ، ایضاً شرب قائماً کی روایات کیلئے یکجہ مجمع الزوائد ص: ۹۰ ج: ۵ کتاب الاشریہ.

۲ صحیح مسلم ص: ۱۷۳ ج: ۲ ”باب الشرب قائماً“ کتاب الاشریہ.

جبکہ اثبات کی روایات بھی صحیح ہیں جیسا کہ اسی باب میں ہیں۔ مسلمؒ میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آب زمزم کھڑے ہو کر پینا مروی ہے۔ بخاریؒ میں ”باب الشرب قائماً“ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر پانی پیا پھر فرمایا کہ بعض لوگ اسے مکروہ سمجھتے ہیں، حالانکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے جیسا میں نے کیا۔ (بخاری شریف ص ۸۴۰ ج ۲)

اس بناء پر علماء نے مختلف موقف اختیار فرمائے ہیں، جن میں قابل ذکر پانچ اقوال ہیں۔

(۱) صاحب مدنی المصنفی نے فرمایا کہ زمزم اور وضوء کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے باقی

مکروہ ہے ”وذكره الشرب قائماً لا هذا (ای فضل الوضوء) ہو شرب ماء زمزم“۔

(۲) بعض اہل ظاہر کہتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی روایات نبی کی احادیث سے منسوخ ہیں

اور زمزم کا پانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عذر کی بناء پر کھڑے ہو کر پیا تھا۔

(۳) بذل میں ہے امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کی روایات منسوخ ہیں۔

(۴) امام نوویؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نبی کی روایات کرہیت تنزیہی پر محمول ہیں، یہی امام خطابیؒ،

ابن بطلؒ وغیرہ جمہور کا قول معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ”وهذا أحسن المسالك واسلمها

وابعدھا من الاعتراض“۔ ابن العربیؒ نے بھی عارضہ میں بحث کے اخیر میں لکھا ہے: ”فالشرب قاعدة تأديباً

واعلم جوازہ قائماً“۔

ہمارے شیخ محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹوٹکی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر بیٹھنے کی مناسب جگہ

نہ ہو تو کھڑے ہو کر پینا چاہئے جیسے راستوں کا پانی اور گئے کا شربت وغیرہ۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی حجۃ اللہ الباقیہ میں لکھا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا شائستگی کے

خلاف ہے، جبکہ بیٹھ کر پینا عمدہ ہیئت ہے ”فان الشرب قاعدة أمن الهيئات الفاضلة واقرب لجموع النفس

والرقي“ الخ۔

(۵) ابن قیمؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کی روایات طبعی نقطہ نظر پر محمول ہیں کہ کھڑے کھڑے پانی

ح صحیح مسلم ص: ۴۳ و ۴۴ ج: ۲ کتاب الاشربة، ايضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۳ ج: ۵ کتاب الاشربة.

ح صحیح بخاری ص: ۸۴۰ ج: ۲ ”باب الشرب قائماً“ کتاب الاشربة، ايضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۱۳ ج: ۵.

کتاب الاشربة، مجمع الزوائد ص: ۸۹ ج: ۵ حدیث: ۸۴۴۴.

پینے سے معدہ متاثر ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح پانی معدے کی تہ تک جا پہنچتا ہے۔ واللہ اعلم

پھر آخری حدیث میں ”یشرب قائماً وقاعداً“ کا یہ مطلب نہیں کہ قائماً وقاعداً دونوں یکساں معمول تھے بلکہ یہاں نفس فعل کا اثبات مقصود ہے ورنہ عام معمول بیٹھ کر ہی پینے کا تھا، لہذا اگر ایک دودفعہ کھڑے ہو کر پانی پینا ثابت ہو جائے تو اس کو سنت نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ عام ضابطہ ہے کہ خلاف عادت کام صرف بیان جواز یا کسی عذر پر محمول ہوتا ہے جیسے را کہنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طواف ثابت ہے مع ہذا اسے سنت نہیں کہہ سکتے اس طرح کی اور بھی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

حضرت تھانوی صاحب المسک الذی میں فرماتے ہیں کہ ہمیشہ بیٹھ کر کھانے پینے میں تکبر پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے کہ بے حد وقار کبھی تکبر کا باعث ہو جاتا ہے، اور پادری لوگ کھڑے ہو کر کھانے کو بڑا معیوب سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بُری بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ بیٹھ کر کھائے پئے۔ اور اگر کبھی اظہار تواضع کے لئے یا ویسے ہی کھڑے ہو کر بھی کھانی لے تو جائز ہے بلکہ اظہار تواضع کے لئے کبھی ایسا کرنا یہ بھی مستحب ہے۔ اتنی المسترشد عرض کرتا ہے: کہ کبھی آدمی میں آداب پر مسلسل عمل کرنے سے ایک گونہ عجب پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے کبھی کبھار اس کے خلاف کرنے سے اپنی تقصیر کا بوجھ سر پر آ پڑتا ہے جو ایک مطلوبہ چیز ہے پس کہا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بیان تعلیم کے لئے کیا۔ (تذکر)

رہا کھڑے ہو کر کھانے کا مسئلہ تو اس میں دو اعتبار ہیں ایک یہ ہے کہ کوئی سوکھی اور خشک قسم کی اشیاء یا کھجور جیسی چیزیں ہوں۔ دوم یہ کہ اس چیز کا کھڑے کھڑے اور چلتے پھرتے کھانا خلاف مروت اور معیوب نہ سمجھا جاتا ہو اور نہ ہی وہ لاپرواہی کی وجہ سے ہو تو ایسی چیز اگر چلتے پھرتے کھالی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں گو کہ اس کا معمول بنانا اچھا نہیں جبکہ اس کے برعکس اشیاء چلتے پھرتے یا بازاروں میں کھانے سے عدالت بخروج ہو جاتی ہے۔

پہلے باب کی حدیث میں کھانے کو حالت قیام میں پینے کی نسبت جو اشد یعنی زیادہ برا قرار دیا ہے یہ اس لئے کہ کھانے کا ادب و احترام پانی سے زیادہ ہونا چاہئے۔

باب ماجاء فی التنفس فی الاناء

”عن انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتنفس فی الاناء ثلاثاً ویقول
هو امرؤ وأروى“^۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم برتن سے پانی پینے کے دوران
تین مرتبہ سانس لیتے اور فرماتے کہ اس طرح پینا زیادہ خوشگوار اور پیاس زیادہ بجھانے والا ہوتا ہے۔

”عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تشربوا واحداً کمشرب
البعیر ولكن اشربوا مثنی وثلاث وسقوا اذا انتم شربتم واحمدوا اذا انتم رفعتم“

یعنی اونٹ کی طرح ایک بارگی مت پیو بلکہ دو، تین سانسوں میں بیا کرو اور جب پینے لگو تو بسم اللہ
پڑھو اور جب برتن ہٹاؤ تو الحمد للہ پڑھو۔

لغات:- ”یتنفس“ تنفس کے معنی سانس لینے کے ہیں۔ قولہ ”امرؤ“ جو موافق آئے خواہ کھانا ہو
یا پانی وغیرہ، فارسی میں اسے گوارتر کہتے ہیں جیسا کہ بین السطور لکھا ہے اردو میں خوشگوار کہہ سکتے ہیں۔
قولہ ”اروی“ ”ری“ بکسر الراء سے اسم تفضیل ہے یعنی پیاس زیادہ بجھانے والا، فارسی میں بین
السطور ترجمہ سیراب کنندہ تر کیا ہے۔

تشریح:- ترمذی کی پہلی روایت میں ”یتنفس فی الاناء“ کا لفظ ہے۔ مگر مسلم^۲ کی ایک حدیث
میں ”یتنفس فی الشراب“ کے الفاظ ہیں اس لئے ترجمہ میں ”پینے کے دوران“ الفاظ میں مسلم شریف کی
روایت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاکہ یہ اعتراض وارد نہ ہو کہ برتن کے اندر تو سانس لینا منع ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔
لہذا ترمذی کی روایت میں فی الاناء سے مراد ”فی اثناء الشراب“ ہے۔^۳

اس حدیث مبارکہ میں اس عمل کی حکمت بھی مذکور ہے کہ اس طرح پینے سے کوئی نقصان بھی نہیں

باب ماجاء فی التنفس فی الاناء

۱ الحدیث اخرجه مسلم وابوداؤد وابن ماجہ ومالك في الموطأ واحمد بن حنبل وصحاح دارمی ص: ۱۶۱ حدیث ۲۱۲۰،
ایضاً مجمع الزوائد ص: ۹۱ ج: ۵ حدیث ۸۲۵۵ ج: ۴، صحیح مسلم ص: ۱۷۳ ج: ۲ ”باب کراهية التنفس فی
نفس الاناء الخ“ کتاب الاشربة۔ صحیح والا فضل ان یتنفس خارج الاناء قبل الشرب او عند الاستراحة من جرعة شرب
جرعة اخرى، مصنفه ابن ابی شیبہ ص: ۵۲۱ ج: ۵ کتاب الاشربة

ہوتا ہے اور پیاس بھی اچھی طرح سمجھ جاتی ہے۔ ایک اور حکمت اگلی حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی دفعہ میں پینے سے اونٹ سے مشابہت آتی ہے جو کہ مذموم ہے۔ لگے ہم نے بڑے جانوروں کو دیکھا ہے کہ پانی پیتے وقت منہ پانی میں رکھ کر ناک کے ذریعے سانس لیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے قطرے پانی میں ناک سے آکر گرتے رہتے ہیں، انسان کو ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ہم نے اس کا بھی تجربہ کیا ہے کہ جب آدمی شدید گرمی اور پیاس کا شکار ہوتا ہے مثلاً کوئی وزنی چیز اٹھا کر چڑھائی چڑھنے کے بعد متصل پانی پیئے اور یکبارگی پیئے تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور گلہ و سیزہ تو یک دم خراب ہو جاتے ہیں جس کا تجربہ راقم نے خود بھی کیا ہے اس لئے ہمارے ہاں دیہاتوں میں یہ عام سی بات ہے کہ جب لوگ مذکورہ پوزیشن میں ہوتے ہیں تو ان کو جلدی پانی نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح "ایکسڈنٹ" اور آپریشن کے بعد بھی۔ جانوروں کے بچے کی ولادت کے بعد جب لوگ پانی دیتے ہیں تو پانی کے اوپر گھاس ڈالتے ہیں تاکہ بھیئس وغیرہ اسے جلدی جلدی نہ پی سکیں۔

اس کی مثال محسوسات میں یوں دی جاتی ہے جیسے آگ بجھانے کے لئے اگر یک دم سے پانی ڈالا جائے تو راکھ اڑ جاتی ہے اور جب پہلے آہستہ آہستہ پانی چھڑک دیا جائے اور پھر پانی ڈالا جائے تو راکھ بھی نہیں اڑتی اور آگ بھی باسانی بجھ جاتی ہے۔ اس لئے پہلے تھوڑا سا پانی بیا جائے پھر نسبتاً زیادہ اور بالآخر بھٹا پینا چاہئے، یکبارگی پینے سے معدے کی حرارت دماغ میں چلی جاتی ہے۔

تاہم یہ طبی اعتبار سے شفقہ ہے یا تشبہ بالحوادث کی وجہ سے ہے اس لئے اگر کسی نے ایک ہی سانس میں پیا تو گناہ گار نہ ہوگا مگر خلاف ادب ضرور ہوگا۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو صرف اپنے آپ کو ہی ملامت کرتا رہے۔

باب ما ذکر فی الشرب بنفسین

”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا شرب بتنفس مرتین۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پانی پیتے

تو دو سانسوں میں نوش فرماتے۔

تشریح:۔ اس کے نگاہری مطلب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دو سانسوں میں بھی پینا ثابت ہے، یہ اس وقت ہوگا جب آدمی کو پیاس زیادہ نہ لگی ہو۔ سابقہ باب کی آخری حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ”ولکن اشربوا منی وثلاث“۔ مگر اس کو حافظ نے تین بار پینے کی طرف راجع کیا ہے کہ جب دو مرتبہ سانس لیا جائے گا تو بھی تین مرتبہ پینا متحقق ہوگا گویا تیسری بار سانس جو اختتام کے لئے ہوتا ہے اسے نہیں گنا گیا۔ (تذکر) ابن قیم فرماتے ہیں:

”وَبُذِّكَرَ عَنْهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) أَنَّهُ كَانَ إِذَا شَرِبَ تَنَفَّسَ فِي الْإِنَاءِ ثَلَاثَةَ أَنْفَاسٍ

بِحَمْدِ اللَّهِ فِي كُلِّ نَفَسٍ وَيَشْكُرُهُ فِي آخِرِهَا“۔^۱ (مختصر زاد المعاد ص ۱۰۴)

بعض دیگر روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ تینوں بار برتن منہ کے قریب کرتے وقت بسم اللہ پڑھتے اور ہٹاتے وقت الحمد للہ۔^۲ علی ہذا ہر مرتبہ برتن منہ سے الگ کر کے سانس لیا جائے۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی کراہیۃ النفخ فی الشراب

”عن ابی سعید الخدری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن النفخ فی الشراب فقال رجل: القَدْ اَکْرَاهَنِ الْإِنَاءَ فَقَالَ: اَعْرِفْهَا فَقَالَ فَاَنی لَا اُرِوِیْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدٍ قَالَ: فَاَبَیْنِ الْقَدَحَ عَنْ فِیْهِ۔“

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا تو اس پر ایک شخص نے پوچھا کہ اگر میں برتن میں کوئی چیز کا دیکھ لوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے بہادو، اس نے پھر پوچھا کہ میں ایک سانس میں سیراب نہیں ہوتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو برتن کو منہ سے دور کرو (یعنی سانس لینے کے بعد دو بارہ دوسرے بارہ پو)۔

باب ماجاء فی الشرب بنفسین

۱۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر ۱۰۳۷۵ مجمع الزوائد ص: ۹۲ ج: ۵.

۲۔ کذا فی معجم اوسط للطبرانی، عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ کان یشرب فی ثلثة انفاس اذا ادنی الإناء الی فیه سعى اللہ فاذا اخره حمد اللہ بفعل ثلاث مرات، مجمع الزوائد ص: ۹۲ ج: ۵ حدیث: ۸۲۵۹ کتاب الاشراب.

لغات :- قولہ ”النفخ“، ”فتح النون وسكون الفاء، منہ سے پھونک مارنا۔ قولہ ”الغذاء“، ”آکھ میں گر جانے والے شے کو بھی کہا جاتا ہے اور مطلق شے کو بھی کہتے ہیں یہاں مطلق تک مراد ہے۔ یہ لفظ ”النفخ“ القاف پڑھا جائے گا اعراب کے لحاظ سے یہاں منصوب علی شریطۃ التفسیر ہے۔ قولہ ”فابن“ مرکا صیغہ ہے ابانت سے۔

قولہ ”القدح“ پیالے اور گلاس وغیرہ کو کہتے ہیں۔ (یعنی برتن کو منہ سے الگ کرو)

تشریح :- اس باب میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت بھی آئی ہے ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ جس طرح برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے اسی طرح اس میں پھونک بھی نہیں مارنی چاہیے، جس کی متعدد وجوہات ہیں مثلاً جو ہوا سانس یا پھونک کے ذریعے خارج ہوتی ہے تو اس میں لعاب کے ذرات کس ہو جاتے ہیں جن سے گھن محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ لعاب برتن میں کرے گا۔ اسی طرح اس ہوا میں بدبو کا بھی امکان ہے اور یہ گھن کا سبب ہے۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سانس کے ذریعے جو تازہ ہوا ہم اندر داخل کرتے ہیں اس میں موجود آکسیجن ہمارے پیپھڑوں کے ذریعے رگوں اور خلیوں تک پہنچ کر مخلول غذا اور خون کے ذرات کو جلا دیتی ہے، تاکہ انرجی پیدا ہو جائے جس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہو جاتی ہے یہ ایک کمی اور زہریلی کثیف گیس ہوتی ہے جو ناک اور منہ کے ذریعے عمل تنفس سے خارج ہو جاتی ہے، چونکہ وہ نسبتاً ثقیل اور کثیف ہوتی ہے اس لئے برتن میں سانس لینے سے وہ کھانے پینے کی چیز سے مل جاتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ صحت کے لئے کوئی مفید چیز نہیں اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم صرف پانی تک محدود نہیں بلکہ ہر مائع کھانے پینے کی چیز کو شامل ہے خاص کر جب آدمی کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شریک ہوں، لہذا اگر برتن میں کوئی ناگوار چیز نظر آجائے تو اسے یا تو برتن کو میز ہا کر کے گرا دیا جائے یا پھر کسی چیز جیسے چمچ وغیرہ سے نکال دیا جائے۔ اسی طرح اگر چائے، دودھ یا دوسرا کھانا وغیرہ گرم ہو تو اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی نہ پھونکے بلکہ انتظار ہی کیا جائے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التنفس فی الاناء

”عن عبد اللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا شرب

احدکم فلا یتنفس فی الاناء۔“

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک پیئے تو برتن میں سانس نہ لے۔

باب ماجاء فی النهی عن اختناث الاسقیة

”عن ابی سعید رواہ انه نهی عن اختناث الاسقیة“۔^۱

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشیزوں کے مناسن کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

لغات: فقوله ”اختناث“ غثت باب ضرب سے مشک کا منہ الناکر کے اس طرح موڑنے کو کہتے ہیں جس سے اس کی اندرون طرف باہر آ جائے۔ فقوله ”الاسقیة“ سقاء کی جمع ہے چترے کا مشکیزہ۔

تشریح: ادنیٰ تا مل سے یہ بات آسانی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ العظیم والعظیم نے منہ کے اوپر ناک اور ناک کے اوپر آنکھیں پیدا فرمائی ہیں جس کا مطلب یہ ہے، کہ جب ہم کوئی چیز کھاتے اور پیتے ہیں تو دوسری سے دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ چیز کھانے پینے کے قابل ہے یا نہیں اور جب اسے منہ کے قریب لاتے ہیں تو اس کی بو سے مزید علم حاصل ہو جاتا ہے، پھر مزید علم قوت ذائقہ سے ہو جاتا ہے جبکہ معدہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے۔

علیٰ ہذا کھانے پینے کی کوئی بھی چیز پہلے ہمیں اچھی طرح دیکھ لینی چاہئے اور پھر سونگھ لینی اور پھر چکھ لینی چاہئے تب ہم فیصلہ کر لیں کہ وہ نکلنے کے قابل ہے یا نہیں۔

اگر کوئی چیز ہماری نظر سے اوجھل ہو تو اس میں یہ حکمت ملحوظ نہیں رہ جاتی۔ علیٰ ہذا اندھیرے میں یا آنکھوں سے پوشیدہ چیز کو منہ میں نہیں ڈالنا چاہئے بلکہ دیکھ بھال کر ہی کھانا چاہئے۔

اسی بناء پر مشکیزے کے منہ کو منہ میں ڈال کر پانی پینے سے ممانعت آئی کہ اندر کا پانی خراب بھی ہو سکتا ہے، اس میں موذی چیز تنکے یا جاندار بھی ہو سکتے ہیں جو سیدھے معدے میں داخل ہوں گے، علاوہ ازیں اس

باب ماجاء فی النهی عن اختناث الاسقیة

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری، وابو داؤد والنسائی وابن ماجہ ومالك فی الموطأ واحمد بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۶۰

ج: ۲، حدیث: ۲۱۱۹ کتاب الاشریة.

سے ایک دم سے پانی منہ میں جا بھی سکتا ہے جو سانس کی نالی میں جا سکتا ہے، مع ہذا مشکیزے کا منہ، پینے والے کے منہ کی بدبو سے بدبودار بھی ہو سکتا ہے جو دوسروں کے لئے گھن کا سبب اور پانی کے ضیاع کا موجب بنے گا، اس آخری وجہ کی بناء پر ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ کھانا کھاتے وقت جب پانی پئے تو پہلے منہ کو صاف کر دے پھر گلاس وغیرہ برتن کے کنارے کو منہ کے اندر زیادہ داخل نہ کرے بلکہ ہونٹ پر رکھ کر پانی چوس لے یا برتن کو جھکائے تو پانی خود بخود اندر چلا جائے گا۔

بعض لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے جب وہ بوتل پیتے ہیں تو بوتل کا منہ پورا کا پورا اپنے منہ میں داخل کرتے ہیں۔ اگر بڑی بوتل ہو اور اس کے پینے میں اور لوگ بھی اس کے ساتھ شریک ہوں اور کوئی گلاس نہ ہو تو وہ اس میں خاص خیال رکھیں کہ بوتل کا کنارہ ہونٹ پر رکھ کر بوتل کو جھکائیں چونکہ بوتل کا اندرون حصہ باہر سے نظر آتا ہے اس لئے اس میں پہلی وجہ متحقق نہیں ہوتی۔ پس اگر چھوٹی بوتل ہو جو انفرادی پینے کے لئے ہو اور پینے میں اس طرح احتیاط ہو سکتی ہو کہ پانی ایک دم سے منہ میں داخل سے روک سکتا ہو تو اس طرح پینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگرچہ شائستگی اس میں ہے کہ گلاس میں ڈال کر پی لے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

”عن عيسى بن عبد الله بن أنيس عن أبيه قال: رأيت النبي صلى الله عليه وسلم قام إلى قربة معلقة فآخضها ثم شرب من فيها“۔

حضرت عبداللہ بن انیس (بالنقصیر) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جو لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہو کر اس کا منہ موڑا اور پھر اس کے منہ سے پانی پیا۔ دوسری حدیث:۔ اس باب میں دوسری روایت حضرت کبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے تو ایک لٹکے ہوئے مشکیزے سے کھڑے کھڑے پانی پیا تو میں نے جا کر اس مشکیزے کا منہ کاٹ لیا (تاکہ بطور تبرک ہمارے پاس رہے)۔^۱

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

۱۔ اسی مضمون کی روایت عن ام سلمہ ان النبی ﷺ دخل علیہا وفي بیتها قربة معلقة قال فشرب من القربة قال قال فحمدت الی فلم القربة وقطعتها، وعن عائشة ان النبی ﷺ دخل علی امرأة من الانصار وفي البیت قربة معلقة فآخضها فشرب وهو قائم، بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۸۹ ج: ۵ کتاب الاشراب۔ حلیۃ الرحمن المصححی ص: ۵۰

لغات:۔ قولہ ”قربة“ بکسرۃ قاف مشکیزہ۔ قولہ ”معلقہ“ تعلق سے ہے یعنی لٹکا ہوا۔ قولہ ”فخضہا“ اس کا منہ پلٹا جیسا کہ سابقہ باب میں گزرا ہے۔

تشریح:۔ اس باب کی روایات سے معلوم ہوا کہ سابقہ باب کی احادیث میں وارد نہیں تحریم کے لئے نہیں اگرچہ بعض اہل ظواہر اس کو تحریم پر حمل کرتے ہیں، مگر جمہور کے نزدیک وہ ارشاد اور بیان آداب شائستگی کے لئے ہے۔ لہذا اس کا درجہ مکروہ تنزیہی سے زیادہ نہیں۔ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشکیزے کے منہ سے پینا یا تو ضرورت پر محمول ہے، ہو سکتا ہے کہ کوئی برتن نہ ہو یا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ مبارک خوشبو کا منبع تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کی روایات بڑے مشکیزے پر محمول ہوں جبکہ باب کی روایات اباحت چھوٹے پر محمول ہیں۔ تدبر

اس سے معلوم ہوا کہ تل اور ٹوٹی پر منہ لگا کر پانی نہیں پینا چاہئے مگر عند الضرورت بلا کر اہت جائز ہوگا۔ حضرت کبشہ کا مشکیزے کا منہ کا شاترک کے حصول کے لئے تھا جس کی کچھ تفصیل (تشریحات ترمذی جلد چہارم ص ۱۲۶) پر گزری ہے ”باب ماجاء باقی جانب الرأس۔ ہدائی الخلق“ (حج) کے ضمن میں۔ فلیراجع

باب ماجاء أن الأيمنین أحقُّ بالشرب

”عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أتى بلبین قد شیب بعاء وعن يمينه

اعرابی وعن يساره ابو بكر فشرب ثم اعطى الاعرابی وقال: الايمن فالایمن“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسا دودھ پیش کیا گیا جس میں پانی ملا یا گیا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ایک اعرابی اور بائیں ابوبکر بیٹھے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے بنفس نفیس نوش فرمایا پھر باقی اعرابی کو دیا اور فرمایا کہ زیادہ حق دار وایاں ہے پھر اس کے دائیں۔

لغات:۔ قولہ ”شیب“ شوب اور شیب خواہ داوی ہو یا یائی دونوں کے معنی ملانے کے ہیں قال اللہ

تعالیٰ: ثم ان لهم علیہا الشوباً من حمیم“ (سورہ صفت آیت ۶۷) پھر ان کو کھول کر پانی (پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا۔ یہاں حدیث میں اس کو کچی لسی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

تشریح:۔ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ سے امام مالکؒ کی مذکورہ روایت

مختصر ہے جبکہ زہری سے سفیان بن عیینہ کی روایت پوری ہے جس میں ہے حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے جبکہ میں بس برس کا تھا اور وصال ہوا تو میں بیس سال کا تھا میری ماں مجھے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ترغیب اور حکم دیا کرتی تھیں چنانچہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے تو ہم نے ان کے لئے اپنی ایک بکری کا دو دودھ دیا اور اس میں پانی ملا دیا۔

”فشرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر عن يساره واعرابي عن يمينه وعمر ناحية فقال عمر: يا رسول الله ناول ابا بکر، فناول رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الاعرابي وقال: الايمن فالايمن“۔

اعراب کے لحاظ سے اس کو منصوب و مرفوع دونوں پڑھنا جائز ہیں۔ بنا بر نصب یہ مفعول بہ ہے فعل ناصبہ مقدر کا جو ”اعطی“ یا ”اقدم“ بصیغہ متکلم یا ”قدموا“ بصیغہ خطاب ہے۔ جبکہ رفع کی صورت میں اس کو خبر اور مبتدا ہر دو بنانا جائز ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں ”الايمنون“ حالت نفی میں آیا ہے جس سے رفع کی تائید ہوتی ہے ”ای الايمن احق بالامقدم“ مثلاً یا ”الاحق بالتقديم الايمن ثم الايمن“۔^۱

یہاں دو باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ یمن والے کا یہ استحقاق کس درجے کا ہے۔

اور دوسری یہ کہ یہ حکم عام ہے اور ہر شے کو شامل ہے یا صرف کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ خاص ہے؟؟؟

(۱)..... پہلی بات کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ حجتہ اللہ الباقیہ میں لکھتے ہیں کہ یہ حکم جھگڑا ختم کرنے اور حکم کے لئے ہے، کیونکہ اگر افضل کو مد ار حکم بنایا جاتا تو بسا اوقات افضل کی معرفت اور تمیز مشکل بلکہ متنازعہ بن جاتی ہے اور تنگ دلی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ تيامن اس شخص کی فضیلت کی وجہ سے نہیں بلکہ جبت یمنین کی وجہ سے ہے کیونکہ یمنین شمال سے افضل ہے۔ علی ہذا یمنین پر کوئی بھی ہو مگر وہ مقدم ہوگا۔ پھر جمہور کے نزدیک یمنین کی ترجیح صرف مستحب ہے واجب نہیں ہے البتہ ابن حزمؒ اس کو واجب مانتے ہیں۔

(۲)..... دوسری بات کے متعلق امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضابطہ صرف پانی میں ہے کیونکہ وہ مباح الاصل ہے۔ مگر ابن العربیؒ نے اس کو مسترد کیا ہے کہ پانی اگر چہ اصلاً تو مباح ہے مگر وہ جس کے قبضے میں

ہوتا ہے اسی کی ملک ہوتا ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

”فی هذه الأحادیث بیان هذه السنة الواضحة وهو موافق لما تظاهرت عليه دلائل الشرع من استحباب التيامن في كل ما كان من انواع الاكرام... الى ان قال... واما تقديم الافاضل والكبار فهو عندنا تساوى في باقى الاوصاف ولهذا يقدم الأعلام والاقراء على الأمن الشيب في الامامة في الصلوة“۔

(نووی شرح مسلم ص ۳۱۷ ج ۲)

یعنی جہاں یمنیں اور شمال کا فرق ہوگا تو اگر مالکین و امین کو مقدم کیا جائے گا اور جہاں یہ تمایز نہ ہو تو پھر الا فضل فالافضل کا ضابطہ ہوگا۔

ابن العربیؒ نے عارضہ میں کچھ مسائل اس حدیث سے مستنبط کئے ہیں:

(۱) اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بہت قدر فرماتے اس لئے فرمایا: ”یا رسول اللہ ناول ابابکر!“۔

(۲) دودھ میں پانی ملائے سے اس کا حکم خلیطین (ممنوع) کی طرح نہیں۔ (تحتی) البتہ جو دودھ پیچنے کے لئے ہو اس میں پانی وغیرہ کی ملاوٹ حرام ہے کہ یہ خش محرم میں داخل ہے۔

(۳) دیہاتیوں کے ساتھ مجالست میں اگر کوئی فائدہ ہو تو یہ جائز ہے۔

المستتر شد: چونکہ دیہاتی لوگ عموماً فضول باتیں اور لافنی مباحث میں الجھتے رہتے ہیں تو شاید ان کو یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہوگی، جس کا مطلب یہ ہے کہ عموماً چونکہ گنواروں کی مجلسوں میں فضولیات کی بھرمار ہوتی ہے اس لئے ان سے بچنا چاہئے خصوصاً جب وہ علماء کی قدر بھی نہ جانتے ہوں اور ان کے سامنے بکواس کرتے رہتے ہوں۔ ہاں اگر کوئی ہوشیار مسافر دیہاتی ہو تو اس کے ساتھ مجالست میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(۴) اگر ایک آدمی کسی عالم کے پاس (یا مسجد وغیرہ میں) پہلے آکر بیٹھ جائے تو وہ اس نشست کا نسبت افضل کے زیادہ مستحق ہے چنانچہ یہاں اعرابی پہلے بیٹھے ہوں گے اس لئے ان کو حضرت ابو بکرؓ کے لئے نشست سے اٹھایا نہیں البتہ افضل کو جگہ دینا چاہئے۔

البتہ یہ ضابطہ عام مجالس کا ہے جہاں تک خصوصی محفایں کا تعلق ہے تو وہاں افضل بہر حال مقدم ہوں

گے۔ چنانچہ نماز کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا تھا کہ میرے قریب بڑے اور دانا لوگ کھڑے ہوں، علیٰ ہذا اگر کوئی مشورہ ہو یا جلسہ ہو تو ہر آدمی کو اس میں شرکت اور اسٹیج پر بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح امور انتظامیہ میں بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں (مع الزیادۃ)۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء أن ساقی القوم آخرهم شرباً

”عن ابی قتادۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ساقی القوم آخرهم شرباً۔“^۱
حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قوم کو پلانے والا خود آخر میں پیئے گا۔

تشریح:- حضرت گنگوہی رحمہ اللہ الکوکب میں فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت ہے کہ جب تقسیم کنندہ اس چیز کا مالک نہ ہو بلکہ صرف تقسیم پر مامور ہو پس مالک کو اختیار ہے کہ وہ کریمانہ اخلاق ایثار ہے۔
ابن العربی عارضہ میں اس حکم کی حکمت یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر تقسیم کرنے والا خادم اور مفصول ہو تو اس کو چاہئے کہ پہلے مخدوم اور افضل کو دیدے اور اگر تقسیم کرنے والا افضل شخص ہو تو کمال فضیلت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیدے۔

نیز خود پہلے لینے میں حرص کا اظہار ہوتا ہے جو کہ مذموم ہے علاوہ ازیں شریعت کا یہ ذرین اصول ہے کہ حقوق اور خصوصاً مشترک حقوق میں احتیاط کی تلقین کرتی ہے کہ آدمی حتی الامکان خود کو دوسروں کی حق تلفی سے بچانے کی کوشش کرے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ پہلے دوسرے مستحقین کو مطمئن کرے تاکہ کسی کو اپنے حق کا دعویٰ نہ رہے پھر اخیر میں اپنا حق وصول کر لے۔

ح عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ لیطیئ منکم اولوا الاحلام والنہی الخ صحیح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۱ کتاب الصلاۃ.

باب ماجاء أن ساقی القوم آخرهم شرباً

۱۔ رواہ مسلم بنحوہ وابوداؤد، ابن ماجہ واحمد، بحوالہ سنن دارمی ص: ۱۶۴ ج: ۲ حدیث: ۲۱۳۵، ایضاً اخرجه الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد ص: ۹۵ ج: ۵، ایضاً مصنفہ ابن ابی شیبہ ص: ۵۲۸ ج: ۵ کتاب الاشریہ.

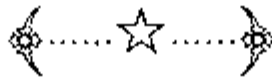
باب ماجاء ائی الشراب کان أحبّ الی رسول اللہ ﷺ؟

عن عائشة قالت کان أحب الشراب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحلو البارد۔^۱
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پینے کی چیزوں میں
سب سے زیادہ پسند میٹھا ٹھنڈا مشروب تھا۔

لغات:- ”الحلو“ بضم الحاء وسكون اللام میٹھا۔

تشریح:- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار پانی میں شہد ملا کر نوش فرماتے۔ اور کبھی کھجور وغیرہ جن سے
پانی میٹھا ہو جاتا، اور چونکہ مشروبات کی خواہش گرمیوں میں عموماً پیدا ہوتی ہے اس لئے ٹھنڈا پانی میٹھا کر کے
پینے کو پسند فرماتے۔ یہ پسندیدگی اس پانی کی افضلیت کی وجہ سے تھی ورنہ افضل تو زمزم ہے، بلکہ لذت کی وجہ
سے تھی۔ پہلے گذرا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ میں ملایا ہوا پانی بھی پیا ہے لہذا یہ تمام صورتیں مختلف
مواقع پر رونما ہوئیں ان میں کسی طرح کا تعارض نہ سمجھا جائے۔ لہذا کبھی ایک مشروب کو پسند فرماتے اور کبھی
دوسرے کو۔

”باب ماجاء ما یستحب علیہ الافطار“ میں ٹیل الاوطار کے حوالے سے گذرا ہے کہ حلاوت کو ایمان سے
ایک گونہ مناسبت ہے شاید اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلو بار کو پسند فرماتے۔ اگرچہ یہ طبعی طور پر بھی ممکن ہے
جیسا کہ آج کل بازاروں میں میٹھے مشروبات کی دوکانوں پر رش دیکھا جاسکتا ہے۔



باب ماجاء ائی الشراب کان أحب الی رسول اللہ ﷺ

۱۔ الحدیث أخرجه مصنف ابن ابی شیبہ عن: ۵۲۴ ج: ۵ کتاب الاشریہ، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۸۸ ج: ۵
حدیث: ۸۲۴۰، ایضاً مسندک حاکم عن: ۶۵ ج: ۵ حدیث: ۷۳۵۷ کتاب الاشریہ، مسند احمد ص: ۵۵۵ ج: ۱
حدیث: ۳۱۱۹.

ابواب البر والصلة

عن رسول الله ﷺ

قولہ "البر" بکسر الہاء وتشدید الراء نیکی اور حسن سلوک کے معنی میں آتا ہے۔ تاہم جب اس کا اطلاق ماں باپ اور رشتہ داروں کے حوالے سے ہوتا ہے تو اس وقت یہ حقوق کے مقابل آتا ہے۔ چونکہ حقوق کے معنی نافرمانی، بدسلوکی اور حقوق تلفی کے ہیں اس لئے ہر معنی فرمانبرداری، نیک سلوک یعنی اچھے برتاؤ اور حقوق کی ادائیگی کے ہے۔ تاہم یہاں برت نام معنی یعنی مطلق نیک برتاؤ مراد ہے تاکہ تمام ابواب کو شامل ہو۔

قولہ "الصلة" متماثل قطع ہے وصل کے معنی ماننے کے ہیں مگر یہاں مراد صلہ رحمی ہے تو چونکہ قطع رحم، رشتہ داروں اور عزیزوں سے لا تعلقی کو کہتے ہیں اس لئے صلہ رحمی اچھے تعلقات کا نام ہے، اور اچھے تعلقات کا مفہوم ہر ایک جانتا ہے۔ جس کا خلاصہ، ایک دوسرے کی مدد برحق، میل جول اور ہر قسم کا جائز تعاون ہے۔ علیٰ ہذا صنادید ذکر بعد البر ذکر خاص بعد العام ہے۔

باب ماجاء فی برّ الوالدین

حدثنا بہز بن حکیم حدثنی ابی عن جدی قال قلت یا رسول اللہ منکم لہم؟ قال: امک، قال: قلت ثم من؟ قال: امک قال قلت ثم من؟ قال: امک قال قلت ثم من؟ قال: ثم ابائک ثم الاقرب فالاقرب۔

بہز بن حکیم بیان کرتے ہیں کہ میرے والد یعنی حکیم نے مجھے یہ حدیث میرے دادا یعنی معاویہ بن حبیہ سے بیان کی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اللہ کے رسول! میں کس کے ساتھ اچھا برتاؤ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ، میں نے پھر پوچھا کہ پھر کس سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں سے، میں نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کس سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ اپنی ماں سے، میں نے پھر پوچھا کہ پھر کس سے؟ فرمایا اپنے باپ کے ساتھ اور پھر جو رشتہ میں جتنا قریب ہو تو اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

لغات: بقولہ "ایر ما فتح الہزمہ والباء وتشدید الراء واحد متکلم کا صیغہ ہے اور بر سے مشتق ہے جس کے معنی حسن سلوک کے ہیں کما مر۔ قولہ "امک منسوب ہے ای پر اُمک۔"

تشریح:۔ اس حدیث سے ماں باپ اور عزیزوں و دیگر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین و تاکید ثابت ہوئی۔ تاہم برادر نیک سلوک میں ماں باپ باقی اقربہ پر اور ماں سب پر مقدم ہے۔ یہ رائے بہت سے علمائے کرام کی ہے جیسا کہ حاشیہ پر علامہ سیوطیؒ سے نقل کیا ہے۔ اور امام نوویؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ نیز اس حدیث میں ماں کے ساتھ برکوتین مرتبہ ذکر کرنے میں اس کی تثلیث کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ماں بچے کی پانی کی حالت سے جوانی کے وقت تک کئی مشکل مراحل سے گزرتی ہے جن کو چار مراتب پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مرحلہ حمل کا ہے۔ دوسرا جنم دینے کا۔ تیسرا دودھ پلانے اور نہلانے دھلانے کا ہے۔ جبکہ چوتھا تربیت کا ہے۔ پہلے تین میں ماں تنہا سب معویتیں جھیلی ہے اس لئے اس کو امتیازی طور پر تین باریک سلوکی کا حکم دیا۔ جبکہ چوتھے میں وہ باپ کے ساتھ شریک ہے اس آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے "وَحَمَلَتْهُ اُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفِطْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا"۔ (سورۃ احقاف آیت: ۱۵)

اس بارے میں اہل علم کی دوسری رائے یہ ہے کہ حدیث شریف میں یہ تکرار تکثیر حق کے لئے نہیں بلکہ تاکید کے لئے ہے کیونکہ اکثر لوگ باپ کا خیال زیادہ رکھتے ہیں اور ماں کی پرواہ کم کرتے ہیں تو حقوق اگرچہ دونوں کے برابر ہیں اور اولاد کو دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنا لازمی ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا ذکر کر فرما کر لوگوں کی کوتاہی اور تعصیب کو دور کرنے کی تاکید فرمائی۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ تعظیم و اکرام تو باپ کا زیادہ ہونا چاہئے اور خدمت ماں کی زیادہ، یہ توجیہ کوئی تیسری رائے نہیں ہے بلکہ یہ بھی وہی مساوات والی صورت ہے اور مطلب یہ ہے کہ ماں باپ دونوں اولاد پر حقوق میں برابر کے شریک ہیں، البتہ بعض اعتبارات سے ایک کا حق زیادہ ہے اور بعض دیگر اعتبارات سے دوسرے کا حق زیادہ ہے "تکلیک بتکلیک"۔ چونکہ باپ کا درجہ فی نفسہ ماں کے درجے سے زیادہ بلند ہے اور یہ تفاوت جنسی، طبعی اور شرعی ہے اس لئے ادب باپ کا زیادہ کرے تاکہ تدبیر المنزل پر اثر نہ پڑے اور ویسے بھی عورتوں میں تواضع ہوتی ہے وہ اولاد سے زیادہ ادب کا تقاضا و مطالبہ بھی نہیں کرتیں، بلکہ اولاد سے بے تکلفی پسند کرتی ہیں اس کے برعکس ماں کا تعلق صنف نازک سے ہے اس لئے اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑے جبکہ باپ کو زیادہ خدمت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی دوکان سے سودا سلف خریدنے اور منگوانے کی ضرورت عام

طور پر عورتوں کو پڑتی ہیں۔ مگر

ہاں جب دونوں بوڑھے ہو جائیں تو پھر دونوں خدمت کے یکساں محتاج ہو جاتے ہیں اس لئے ماں کی خدمت کے ساتھ ساتھ باپ کی خدمت بھی بڑھائے اور باپ کے اکرام کے ساتھ ماں کے اکرام کا درجہ بھی بڑھائے۔

ماں باپ کے مختلف حقوق:۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا“ (الآیہ)۔ ۱ امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب و احترام کو اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے ”أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ“ ۲ یعنی میرا شکر ادا کرو اور والدین کا بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم ہے اور اللہ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گزار ہونا واجب ہے۔

امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ اگر والدین ظلم کریں تب بھی ان کی فرمانبرداری کی جائے گی اور ان کو راضی رکھا جائے۔ انہوں نے فرمایا اگر وہ ظلم کریں تب بھی۔ ماں باپ کا صرف یہی حق نہیں کہ ان کی خدمت کی تو بس حق پورا ادا کیا، بلکہ جن لوگوں سے ان کی قربت یا دوستی ہو ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے اور والدین کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان کے متعلقین کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ ایک اعرابی (بدوی عرب) سفر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ملا اس اعرابی کا باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوست تھا، اعرابی نے ابن عمرؓ سے کہا: تم عمرؓ کے بیٹے نہیں ہو؟ ابن عمرؓ نے کہا کہ کیوں نہیں، اس کے بعد آپؓ نے اعرابی کو ایک گدھا دیدیا جسے وہ ساتھ لائے تھے اور اپنے سر سے عمامہ اتار کر دیدیا، اس پر بعض ساتھیوں نے کہا کہ اس اعرابی کے لئے تو دو درہم بھی بہت تھے، تو ابن عمرؓ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنے باپ کی دوستی کو نبھاؤ، اسے ختم نہ کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارا نور بجھا دے گا۔

ابواب البر والصلة

باب ما جاء في بر الوالدین

۱۔ سورۃ الاسراء آیت ۲۳۔ ۲۔ سورۃ لقمان آیت: ۱۴۔

(الادب المفرد باب نمبر ۲ حدیث نمبر ۳۰ و کذا رواہ مسلم بمعناہ ص ۳۱۲ ج ۲، باب فضل صلۃ اصدقا، الادب والام و نحوہما ^{کے})
اس کی مزید تفصیل دیکھنی ہو تو راقم نے نقش قدم حصہ دوم یا نقش اخلاق میں تیسرے باب کے شروع
میں قدرے زیادہ وضاحت سے بیان کی ہے ظہیر راجع۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

”الْبِرُّ شَعْيٌ هَبْنِ بَوَّاحٍ طَلَقَ وَكَلَامَ لَتَيْنِ“ وَقُلُّ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى ”وَلَا تَقْلُ لِهَمَافٍ وَلَا تَنْهَرُهَا“
وَقُلْ لِهَمَاقٍ لَا كَرِيمًا وَالْحَفْضُ لِهَمَاجٍ نَحَ الذَّلْ مِنْ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رِيَانِي صَغِيرًا“۔
(سورہ اسراء آیت نمبر: ۲۳، ۲۴)

باب منہ

”عن ابن مسعود قال سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: يا رسول الله أي
الاعمال افضل؟ قال: الصلوة لميقاتها قلت: ثم ماذا يا رسول الله؟ قال: برّ الوالدین قال قلت: ثم ماذا
يا رسول الله؟ قال: الجهاد في سبيل الله ثم سكّت عني رسول الله صلى الله عليه وسلم ولو استزدته
لزدني“۔ حسن صحیح

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! اعمال میں سب سے اچھا کونسا عمل ہے؟ فرمایا اپنے وقت پر نماز پڑھنا
فرماتے ہیں میں نے پھر کہا کہ یا رسول اللہ اس کے بعد کون سا ہے؟ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا،
فرمایا میں نے کہا کہ یا رسول اللہ اس کے بعد کون سا افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد
کرنا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی تاہم اگر میں مزید پوچھتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزید
جوابات دیتے۔

لغات :- قولہ ”ای“ یہ لفظ چار معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (۱) شرطیہ کے لئے جیسے
”اَيُّمَا الْاَجْلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ“۔ الآية ۱۔ (۲) استفہامیہ جیسے ”اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ“

یہ وہی مضمون کی روایات کے لئے معنف ابن ابی شیبہ ص: ۹۹ ج: ۶، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۷۵ ج: ۸، کتاب البر والصلة۔

ایماناً“۔ (۳) موصولہ جیسے ”ثُمَّ لَنَسْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَنتَهُم أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَنِ عِتِيًّا“۔ (۴) برائے بیان کمال جیسے ”مُحَمَّدٌ رَجُلٌ أَمَى رَجُلٌ“۔ اس حدیث میں بمعنی ثانی برائے استفہام ہے۔
 قولہ ”ثم ماذا“ ثم یہاں تراخی زمان کے لئے نہیں ہے بلکہ تراخی رتبہ کے لئے ہے یعنی نماز کے بعد کس عمل کا درجہ بلند و بالا ہے؟ قولہ ”ولو استزدته“ عبداللہ بن مسعودؓ کا مقولہ ہے اور سین طلب کے لئے ہے یعنی اگر میں مزید جوابات طلب کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے۔

تشریح:۔ یہ سوال ارکان اسلام کے بارے میں نہیں تھا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں ”الایمان باللہ“ فرماتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشائے سوال سمجھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ لہذا کہا جائے گا کہ یہ سوال تصدیق کے علاوہ اور اعمال قلب کے علاوہ جوارج کے اعمال کے متعلق تھا، اور اگر اس سوال کو عام مانا جائے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سائل پر اعتماد کی وجہ سے ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن مسعودؓ کے علم پر اعتماد تھا کہ وہ ایمان کو تو بہتر اور بنیاد سمجھتے ہی ہیں اس لئے اس کو جواب میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

اس حدیث کے اس جزئی کی شرح (تشریحات ترمذی جلد ۱ ص ۴۱) پر گزری ہے ”باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل“ میں تاہم وہاں یہ روایت حضرت ام فروةؓ سے بھی مروی ہے اور یہی سائلہ ہیں اور وہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور بھی ہے اور وہاں جواب ”الصلوة لاول وقتها“ سے دیا گیا ہے جبکہ یہاں ”الصلوة لمریقاتھا“ کے الفاظ ہیں۔

بہر حال اس قسم کے سوالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحابہ کرامؓ نے پوچھے ہیں۔ مگر سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نماز کو مقدم فرمایا ہے جیسا کہ حدیث الباب میں ہے اور کبھی ایمان کو اور کبھی جہاد کو بظاہر یہ تضاد معلوم ہوتا ہے۔

اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں مگر دو جواب افضل ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکیم تھے اور ماہر حکیم مریض کے مزاج کے مطابق اور موسم کے موافق علاج کرتا ہے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی میں ایک پہلو سے نماز کو وقت پر ادا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تو اس کو وہی جواب دیتے۔ اور جب دوسرے میں جہاد کرنے کی ضرورت محسوس فرماتے تو اس کے لئے وہی

علاج تجویز فرماتے۔ یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم موسم اور حالات کو دیکھتے جب جہاد کا موقع ہوتا تو اس پر زور دیتے۔ اور جب غزوہ سے واپسی ہوتی تو دیگر اعمال پر زور دیتے۔ اور یہی چیز بلاغت کہلاتی ہے ”مطابقت الکلام لمقتضی الحال“۔

(۲) افضلیت کلی مشکلک ہے اس کے افراد جہاد وغیرہ ہیں لہذا ایک کے افضل ہونے سے دوسرے کا مفضل ہونا لازم نہیں آتا۔

اس حدیث مبارکہ میں پہلے نماز کا ذکر ہوا اور پھر بر الوالدین کا۔ یہ گویا اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے ”ان اشکری ولوالدینک“۔ اس لئے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ پانچوں نمازوں کے بعد ان کے لئے دعا مانگی جائے۔

باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین

عن ابی حذافہ قال ان رجلاً اتاه فقال ان لی امرأۃ وان امی تأمرنی بطلاقہا فقال ابوہا لرداء: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: الوالدان وسط ابواب الجنة فان شئت فاضع ذلک الباب او احفظہ وربما قال سفیان ”ان امی وربما قال“: ”ابی“۔ (حدیث صحیح)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ایک شخص نے آکر کہا کہ میری ایک بیوی ہے اور میری ماں اس کو طلاق دینے کا حکم دیتی ہے، تو ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کے دروازوں میں سے بہتر دروازہ ہے پس اگر تو اسے ضائع کرنا چاہتا ہے تو ضائع کر دیا اس کی حفاظت کر۔ سفیان بن عیینہ کبھی والدہ اور کبھی والد نقل کرتے۔

لغات:۔ قولہ ”اوسط“ درمیان، معتدل اور ممتاز کو کہتے ہیں۔ قولہ ”اضیع“ امر کا مینہ ہے اضاع سے۔ تقول کے قانون کے مطابق بنا ہے یعنی اصل میں اضیع تھا یا کی حرکت جو کسرہ ہے ماقبل کو دیا پھر یاء التثانیہ ساکنین کی وجہ سے حذف کی گئی تو اضیع بن گیا۔

تشریح:۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ جنت کے دروازوں میں اوسط یعنی اعلیٰ اور بہترین دروازے ہیں، ان کی رضا مندی اور خدمت ہی سے اس دروازے سے داخل ہونا ممکن ہو سکتا ہے۔ جس

روایت میں لفظ ”امی“ اور ”ابی“ کا ذکر ہے تو وہ صراحۃً معلوم ہوا اور دوسرا اس پر قیاس ہوگا۔

اس حدیث سے ماں باپ کی حد درجہ اطاعت و فرمانبرداری کی تلقین و ترغیب معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ اپنی مرضی و خواہش کو بھی ماں باپ کی خواہش پر قربان کرنے کا حکم ہے خصوصاً جب ماں باپ سنجیدہ ہوں، چنانچہ اگر وہ مرضی کی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیں تو بھی ان کی اطاعت کرنی چاہئے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے پیغام طلاق چھوڑا تھا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس پر عمل بھی کیا جس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اسی طرح ترمذی ابواب الطلاق میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی گزری ہے:

”قال كانت تحسنی امرأة أجبها و كان ابی یکرهها فامرني ان اطلقها فاییت فذکرت ذالك للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا عبد اللہ بن عمر! طلق امرأتک۔“

کیونکہ سنجیدہ ماں باپ کبھی بھی اولاد کو غلط مشورہ نہیں دیتے ہیں، لہذا ان کی اطاعت میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی البتہ یہ ضابطہ بھی ملحوظ ہونا چاہئے کہ ”لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق“۔^۱

اگر ماں باپ ایسے اٹلے سیدھے مطالبے کریں جن کو پورا کرنے سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو یعنی شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو ایسے میں اطاعت والدین جائز نہیں مثلاً بیوی پردہ کرتی ہے اور نیک صالح ہے اور ماں باپ پردہ کی وجہ سے اس کو نہیں چاہتے ہیں تو بیٹے کو دیکھنا چاہئے کہ اگر طلاق دینے سے بیوی کو تکلیف ہوتی ہو، اس کے دوسرے نکاح کا انتظام آسانی سے نہیں ہو سکتا ہو اور اس شخص کو خود بھی ایسی ہی مشکل درپیش ہو تو اسے طلاق سے بچنا چاہئے اور کوئی صورت بچ کی اختیار کر لینی چاہئے، مثلاً ماں باپ سے کہے کہ میں سمجھا دوں گا یہ ٹھیک ہو جائے گی وغیرہ۔ بہر حال ایسے میں اطاعت لازمی نہیں خصوصاً جب بیوی پر ظلم کا خطرہ ہو۔ لیکن اگر دونوں کا متبادل انتظام ہو سکتا ہو یا آدمی کا انتظام دوسرے نکاح کا تو نہیں ہو سکتا، لیکن وہ بیوی کے بغیر بھی رہ سکتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر اطاعت مستحب ہے۔ غرض ماں باپ کو ایذا رسانی سے بچنا واجب ہے۔ لہذا بیوی اگر ان کو ناجائز طریقہ سے ایذا پہنچاتی ہو تو طلاق واجب ورنہ نہیں۔ لہذا ماں باپ کے کہنے پر بیوی

باب ماجاء فی الفضل فی رضا الوالدین

۱۔ رواہ احمد فی مسنده ص: ۴۷۶ ج: ۱ حدیث: ۳۸۷۹ ولفظہ: لا طاعة لمخلوق فی معصية الله عز وجل، ایضاً مصنفہ عبدالرزاق ص: ۲۵۵ ج: حدیث: ۳۷۹۸ کتاب الصلوات، ایضاً رواہ ابن ماجہ بمعوالہ مصنفہ عبدالرزاق۔

پر ظلم اور ناجائز دباؤ ڈالنا ایسی طلاق دینا جس سے عورت بُری حالت کا شکار اور ظلم میں گرفتار ہوتی ہو جائز نہیں۔ مسئلہ:۔ معارف القرآن میں ہے کہ جب کوئی چیز فرض عین یا واجب علی العین نہ ہو کفایہ کے درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں، اس میں مکمل علم دین حاصل کرنا اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جس کو حاصل ہو وہ عالم (تبحر) بننے کے لئے سفر کرے یا تبلیغ و دعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔ (معارف ص ۳۵۳ ج ۵)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں والدین رشتہ کرنے پر راضی نہ ہوں تو اس رشتہ پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب والدین بنا بنا یا رشتہ توڑوا سکتے ہیں تو ابتداءً رشتہ طے کرنے سے بطریقِ اولیٰ روک سکتے ہیں۔

دوسری حدیث:۔ "عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال رضا الرب فی رضا الوالد مسقط الرب فی مسقط الوالد۔"

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کی رضامندی والد کی خوشنودی میں ہے اور رب تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔

لغات:۔ "رضا" بکسر الراء والفتح معصومہ جبکہ ممدودہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے خوشی، رضامندی اور مرضی کے معنی میں آتا ہے۔ قولہ "مسقط" یختصمین بروزن ثمر جبکہ یضم السین و سکون الهماء بھی استعمال ہوتا ہے اس کے معنی رضا کے برعکس ہیں یعنی ناگواری، غصہ اور ناراضگی کے۔

تشریح:۔ والد سے مراد "من لہ الولد" بھی لے سکتے ہیں پھر والدہ بھی اس فضیلت میں شامل ہوگئی یا پھر والدہ اس پر قیاس ہے کیونکہ دونوں کی رضا کی علت مشترک ہے، چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے والدین کو راضی رکھنے اور ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اس لئے جو شخص والدین کو راضی رکھے گا اور ان کی اطاعت کرے گا وہ درحقیقت اللہ کے حکم کی تعمیل کرے گا، گوکہ والدین کو راضی رکھنا ایک طبیعی سائمر بھی ہے تاہم یہ جذبہ ایک وقت تک رہتا ہے پھر کمزور یا ختم ہو جاتا ہے، مثلاً اپنے بچے پیدا ہو گئے تو اب محبت کا رخ والدین سے ان کی طرف مڑ جاتا ہے خصوصاً جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں اور ان کے سیدھے مطالبے کرنے لگیں ایسے میں ان کو خوش رکھنا

ع فیضانِ ولہ الزوار مجمع فتاویٰ ص ۱۷۵ ج ۸: حلیہ: ۱۲۳۸۹ وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ طاعة اللہ طاعة الوالد ومعصية اللہ معصية الوالد، حوالہ بالا، المحض عنی عنہ

امر شرعی کی تکمیل ہی ہے ورنہ تو اہل مغرب ان کو گھروں سے نہ نکالتے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا اچھا خاصا فرمانبردار ہوتا ہے مگر والدین اپنی غیر سنجیدہ فرمائشوں سے اس کو نافرمانی پر گویا مجبور کرتے ہیں اس لئے والدین کو چاہئے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل اختیار نہ کریں جس سے اولاد میں نافرمانی کا بیج بویا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی عقوق الوالدین

”عن عبد الرحمن بن ابی بکرۃ عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا احذركم باكبر الكبائر؟ قالوا: بلى يا رسول الله قال: الا شرارك بالثأل وعقوق الوالدین قال وحلست وكان متكفأ قال وشهادة الزور او قول الزور فما زال رسول الله صلى الله عليه وسلم يقولها حتى قلنا ليته سكت“۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرہ اپنے والد (ابوبکرہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ کرام نے فرمایا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (سیدھے) بیٹھ گئے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ فرمایا اور جھوٹی گواہی یا فرمایا جھوٹی بات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل یہ بات دہرا رہے تھے یہاں تک کہ ہم (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جائیں۔ (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھک رہے ہیں)۔

لغات:- ”اکبر الكبائر“ بڑے سے بڑے گناہ، قولہ ”عقوق“ بغض العین اصل میں ”صق“ سے مشتق ہے جو قطع اور شق یعنی پھٹنے کو کہتے ہیں چونکہ نافرمانی سے دلوں الگ الگ ہو جاتے ہیں، بیٹا ایک طرف اور ماں باپ دوسری جانب ہو جاتے ہیں اس لئے اس کے معنی نافرمانی کرنے اور تکلیف دینے کے بتاتے ہیں۔ پہلے گزرا ہے کہ برادر صلہ، دلوں عقوق کے مقابل ہیں قولہ ”شهادة الزور او قول الزور“ اس میں لفظ ”او“ ٹھیک من الراوی کے لئے ہے، شہادت خاص ہے قول سے۔

تشریح:- کبار، کبیرۃ کی جمع ہے کبیرہ گناہوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ اس حدیث میں ان کا احاطہ

نہیں کہا گیا ہے۔ کبیرہ گناہ کون سے اور کتنے ہیں اس کی تفصیل (تشریحات ترمذی ص ۴۸۸ ج ۱) ”باب فی فضل الصلوٰۃ الخس“ میں گزری ہے ابواب الصلوٰۃ بعد بحث الاذان ملاحظہ ہو۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اہل علم نے کبار کو معدود و محصور مانا ہے اور درجن بھر گناہوں کو کبیرہ کہا ہے جو مختلف احادیث میں مروی ہے مثلاً تین باب کی حدیث میں چوتھا اگلی حدیث میں، زنا، ربوا، قتل نفس ناحق طریقے سے، پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگانا، سحر اور جادو، یتیم کا مال کھانا، فرار عن الزحف، الحادی المحرم، شراب پینا اور چوری کرنا وغیرہ۔

مگر بعض علماء ان کے منضبط و منحصر فی العدد کے قائل نہیں پھر ان کے مختلف اقوال ہیں۔ کسی نے کہا کہ جس پر وعید آئی ہے وہ کبیرہ گناہ ہے۔ کسی نے کہا کہ جس گناہ پر اصرار کیا جائے وہ کبیرہ ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ کبیرہ و صغیرہ امور اضافیہ میں سے ہیں ہر گناہ اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے اور مافوق گناہ کی نسبت صغیرہ ہے۔ علی ہذا سب سے زیادہ اور سب سے بڑا گناہ شرک ہے، کہ اس کے اوپر کوئی بڑا گناہ نہیں اور باقی گناہ حسب تفاوت کبار ہیں پھر وہی کبار اپنے مافوق کے نسبت صغیر بھی ہیں۔

باب کی حدیث میں حقوق والدین کو شرک کے بعد دوسرے نمبر پر ذکر کرنے میں اس کی شاعت کی طرف اشارہ ہے، گویا کہ ماں باپ کے حقوق، حقوق اللہ کے بعد سب حقوق العباد پر مقدم ہیں چنانچہ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں:

”جعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم بر الوالدین ثانی التوحید لقوله ”اکبر الکبار الاشرک باللہ ثم حقوق الوالدین“^۱ وقوله فی افضل الاعمال ”الصلوٰۃ لمیقعاتہم بر الوالدین“^۲ جعلہ فی ضمن حق اللہ فی حدیث آخر فقال رضا الرب فی رضا الوالدین مستط الرب فی مستط الوالدین“^۳

چونکہ حدیث کی اس ترتیب نزولی سے شہادۃ الزور کی اہمیت بظاہر کم ہونے کا اندیشہ تھا، کہ اس کو تیسرا درجہ دیا گیا اس لئے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے بیٹھ گئے اور اسے

باب ماجاء فی حقوق الوالدین

۱۔ رواہ مسلم ص: ۶۴ ج: ۱ ”باب الکبار و اکبرھا“ کتاب الایمان۔

۲۔ رواہ البخاری ص: ۷۶ ج: ۱ کتاب مواعیت الصلاۃ، مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۹۹ ج: ۶ کتاب الادب۔

۳۔ رواہ الترمذی و البزار کلا فی مجمع الزوائد ص: ۷۵ ج: ۸۔

بار بار کر کرتے رہے جیسے تاکید میں ہوتا ہے۔ اور محبوب کی بات جیت تو اگرچہ طوالت سے احسن بن جاتی ہے اور لذت میں اضافہ ہوتا ہے مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اطناب و تکرار سے مشقت و تکلیف اٹھانا پڑ رہی تھی اس لئے صحابہ کرامؓ نے خاموشی کی تمنا کی۔

حدیث آخر:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبار میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول کیا اپنے والدین کو بھی کوئی شخص گالی دیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں“ ایک آدمی دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور یہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔

لغات:۔ سب اور شتم میں بعض حضرات کے نزدیک تراوف ہے، دونوں کے معنی گالی گلوچ کرنے کے ہیں۔ مگر بعض اہل لغت نے یہ فرق کیا ہے کہ سب عام ہے ہر طرح نہ بے پھلے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا حصہ مسجد میں سے مت روکو اگر وہ اجازت چاہیں، تو ان کے صاحبزادے بلالؓ نے فرمایا ”واللہ لاتمنعنہن وفہ... فاقبل علیہ عبداللہ فسیبہ سباً ما سمعت سبہ مثله قط“۔ (رواہ مسلم) جبکہ ”شتم“ خالص گالیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

تشریح:۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ذہن میں یہ بات تھی کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماں باپ کو براہ راست اور دروگالی کی بات فرما رہے ہیں، اس لئے ان کو تعجب ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے کہ جو اپنے ماں باپ کو براہ راست گالیوں کا نشانہ بنائے۔ آج کل تو یہ چیز اور یہ صورت بھی واقع ہے مگر اس وقت یہ بہت مستبعد تھا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ آدمی جب دوسرے کے ماں باپ کی توہین کرتا ہے تو یہ اس کے اپنے ماں باپ کی تذلیل کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی چیز دراصل گالی دینے کے برابر ہے۔ (تشریحات ترمذی جلد سوم ص: ۲۶۷) پر ابن العربیؒ کے استاذ ابو بکر الشاشی کا یہ قول گزرا ہے کہ ”کل من رضی فی الشریعة بالسب حکم علیہ انہ رضی بالمسب بالامن نام فی رمضان فاحتلم“ یعنی جو سب پر راضی ہوا اسے مسوب پر راضی سمجھا جائے گا سوائے اختلاف کے۔ انظر (باب

ما جاء فی من استقاء عمداً تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب میں براہ راست سب و شتم کی نفی نہیں فرمائی جس میں یہ اشارہ مقصود ہے کہ خیر القرون میں اگرچہ یہ صورت مستبعد ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوگا۔

مسئلہ:- اس حدیث مبارکہ سے سد ذرائع کا اصول بھی معلوم ہوا جو اسلام کے زریں اصولوں میں سے ایک ہے ہمارے حنفیہ کے یہاں اگرچہ اس کی اتنی زیادہ رعایت نہیں کی جاتی۔ مگر مالکیہ کے نزدیک اس کی بہت اہمیت ہے اور ہونی بھی چاہئے کیونکہ بقول ابن العربی کے اہل کتاب اس اصول سے لاپرواہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئے۔ آج کل چونکہ ہوس پرستی کا لیل کاٹی او نچا ہے اس لئے علماء کو اس اصول پر سختی سے عمل بھی کرنا چاہئے اور اپنے فتاویٰ مرتب کرنے میں اس کو ملحوظ بھی رکھنا چاہئے۔

باب ماجاء فی اکرام صلیق الوالد

”عن ابن عمر قال: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان ابر البر ان یصل الرجل اهل و ذابہ“۔ (صحیح)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نیکوں میں سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہے۔

لغات:- قولہ ”ابر البر“ پہلا صیغہ اسم تفضیل کا ہے اور دوسرا مصدر ہے۔ نیز پہلا لفظ بفتح تین اور دوسرا بکسر تین پڑھا جائے گا۔ قولہ ”و ذابہ“ بضم الواو و تشدید الدال محبت و مودۃ کو کہتے ہیں، یعنی باپ سے محبت کرنے والے جو بخاور میں دوست کہلاتے ہیں اور ترجمہ میں یہی مختصر ترجمہ کیا گیا ہے۔

تشریح:- شریعت مطہرہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے اچھا سلوک کرتے رہے لیکن یہ طرز سلوک چونکہ بڑے پیمانے پر تو مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگ اجنبی ہوتے ہیں۔ پھر مزاجوں میں بھی فرق بلکہ کبھی کبھی منافرت پائی جاتی ہے، جیسے دار حرب اور دار اسلام کے لوگ باہم محبت نہیں کرتے۔ اس لئے کم از کم اس حد تک ان تعلقات کو خوشگوار بنانے اور ان میں بہتری لانے کا حکم ہوا جو یا کسی خونریں رشتے کی بناء پر ہیں یا کسی اور قدر مشترک کی بناء پر۔ پھر یہ بھی ضابطہ ہے کہ جب تعلق بن جائے تو حتی الامکان اسے توڑنا نہیں چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ طلاق بصورت شدید ضرورت مباح تو کر دی گئی ہے مگر تمام مباحات میں اسے مبغوض ترین قرار دیا گیا ہے کہ اس سے بنا بنایا تعلق ختم اور رشتے کی عمارت مسمار ہو جاتی،

ہے۔ چونکہ دوستانہ تعلق بھی ایک گونہ رشتے کی مانند ہے کہ جس طرح رشتے سے لوگ بلکہ اجانب ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں اسی طرح دوستانہ تعلقات سے دوست آپس میں شیر و شکر بن جاتے ہیں۔ اور اچھا تعلق بھی ایک نیکی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ”أحب الأعمال إلى الله أدومها وإن قل“ (رواہ البخاری و مسلم ^۱)

اس لئے دوستانہ تعلقات کو بھی جاری و باقی رکھنا مطلوب ہے اور یہ شرافت کا بھی تقاضا ہے کہ اشراف اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ہمیشہ رکھتے ہیں، تو جس طرح قطع رحم جائز نہیں اور ماں باپ کے عزیز و اقارب کا رشتہ محفوظ رکھنا لازمی ہے اسی طرح ان کے دوستوں کے ساتھ قطع تعلق بھی جائز نہیں اور یہ حکم حسب مراتب سب کو شامل ہے، علی ہذا اپنے ماں باپ کے تعلقات والوں کے ساتھ، اپنے تمام رشتہ داروں، اساتذہ و مشائخ اور اپنی بیوی وغیرہ سب کے متعلقین کا خیال رکھنا چاہئے۔ ابن العربیؒ نے عارضہ میں ایک حسن حدیث کی تخریج کی ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا:

”هل بقيَ عليّ من برِّ والدي شي أبترهما بعدو فأتتهما؟ قال: نعم الصلوة عليهما،
والاستغفار لهما وإنفاذ عهدهما واکرام صدقهما وصلة الرحم التي لا توصل
إلا بهما“۔ ^۲

لہذا بعد الموت بھی والدین کا حق باقی رہتا ہے۔

باب ماجاء فی بر الخالة

”عن البراء بن عازب عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الخالة بمنزلة الام“۔

باب ماجاء فی اکرام صديق الوالد

۱۔ صحیح بخاری ص: ۹۵۷ ج: ۲ ”باب القصد والملازمة على العمل“ کتاب الرفاق، صحیح مسلم ص: ۲۶۶ ج: ۱
”باب فضيلة العمل الدائم الخ“ کتاب الصلوة، سنن نسائی ص: ۱۲۳ ج: ۱ کتاب القبلة، ابن ماجہ ص: ۳۱۲ کتاب
الزهد، ایضاً رواہ ابو داؤد فی صلاة التطوع واحمد فی مسنده، المعجم المفهرس ص: ۱۶۱ ج: ۲ دار الدعوة، استنبول
ع رواہ ابو داؤد ص: ۲۵۳ ج: ۲ ”باب فی بر الوالدین“ کتاب الادب، ایضاً سنن ابن ماجہ ص: ۲۶۰ و ۲۶۱ ”باب صل
من كان يصل ابوك“ کتاب الادب، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۲۴ ج: ۳ ”الترغیب فی بر الوالدین“ دار الکتب
العلمیہ بیروت، الحنفی غفرلہ ولوالدیہ

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خالہ ماں کی مانند ہے۔

تشریح:۔ خالہ کو ماں کی مانند قرار دینے کا مطلب تقریباً وہی ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے ”العم صنوایہ“۔^۱ اور عقلی و طبعی اعتبار سے بھی یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جب اصل ایک ہی ہو تو فرد میں کوئی خاص تفاوت نہیں ہوتا ہے۔ تو جس طرح ایک درخت کی دو شاخیں صنوان کہلاتی ہیں اور ان کی جڑ اور اصل ایک ہی ہوتی ہے اس لئے بہت سے احکام میں وہ دونوں شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ماں اور خالہ بھی ہیں لہذا یہ بھی کافی سارے احکام میں شریک ہیں۔ اور جس طرح چچا عصبہ ہے اسی طرح خالہ کو حضانت کا حق حاصل ہے۔ علیٰ ہذا جب بچے کی ماں فوت ہو جائے تو پرورش کے ایام میں وہ خالہ کے پاس رہے گا تا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ کیونکہ باقی عورتوں میں ماں جیسی شفقت نہیں پائی جاتی ہے۔ جبکہ بچے کو مادری شفقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو صرف خالہ میں ہوتی ہے۔

قولہ ”وفی الحدیث قصة طویلة“ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ طویل حدیث جس کی طرف امام ترمذی نے اشارہ کیا ہے (بخاری شریف ص ۶۱۰ جلد دوم) میں مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد عمرۃ القضاء سے فارغ ہو کر واپس جانے لگے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے ”ماعم ماعم“ کہتی ہوئی چل پڑی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا ”دونک ابنة عموک“ یعنی اپنی چچا زاد کو پکڑو اور سنبھال کر رکھو چنانچہ انہوں نے اٹھالیا، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت جعفر اور حضرت زید (بن حارثہ) رضی اللہ عنہما نے بھی حق حیانت کا دعویٰ کیا کہ اس کی پرورش کا حق ہمیں ہی حاصل ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دلیل پیش کی کہ میں نے اسے پہلے لیا ہے اور وہ میری چچا زاد بھی ہے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چچا زاد تو میری بھی ہے مگر اس کے ساتھ میری بیوی اس کی خالہ بھی ہے، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مابین مواخاۃ فرمائی تھی) ”فقضنی بہا النبی“۔^۲

باب حاجاء فی بر الخالۃ

۱۔ رواہ مسلم ص ۳۱۶ ج ۱ کتاب الزکوۃ، سنن ابی داؤد ص ۲۳۶ ج ۱ ”باب فی تمجیل الزکوۃ“ کتاب الزکوۃ،

مسند احمد ص ۱۵۱ ج ۱ حدیث ۷۲۷۔

صلی اللہ علیہ وسلم لِحَالَتِهَا وَقَالَ الْحَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْإِمَامِ“ (چنانچہ وہ حضرت جعفرؓ کی بیوی کی پرورش میں آئی) حدیث کا مزید حصہ دیکھنا ہو تو (بخاری شریف جلد ۲ باب عمرة القضاء الخ میں ملاحظہ فرمائیں۔

حدیث آخر:- ”عن ابن عمر رضي الله عنهما ان رجلا اتى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله انى اصبت ذنباً عظيماً الخ۔

یعنی ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا اے اللہ کے رسول! میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے تو کیا میری توبہ ہو سکتی ہے؟ یعنی قبول ہو سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیری کوئی خالہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس اس کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

تشریح:- اس گناہ کو عظیم کہنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:- ایک یہ کہ وہ گناہ صغیرہ تھا مگر نفوس قدسیہ پر صغائر کا بھی انتہائی بوجھ اور ثقل محسوس ہوتا ہے اس لئے اسے عظیم سے تعبیر کیا۔ دوسرا یہ کہ ممکن ہے کہ وہ بذات خود بڑا گناہ ہو جو بظاہر قطع رحمی کی صورت میں تھا، اس لئے اس کے تدارک کے لئے صلہ رحمی سے علاج کا طریقہ بتلایا۔ اور اگر کوئی دوسرا گناہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کے ازالے کا یہ طریقہ اس صحابی کی خصوصیت ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عام ہو کیونکہ بڑی نیکی سے کبیرہ گناہ کم یا ختم ہو جاتا ہے جس کی کچھ تفصیل ”باب ما جاء في ثواب الحج والعمرة“ میں (تشریحات ترمذی جلد سوم ص ۴۱۲) پر گزری ہے اور کچھ تذکرہ ”باب ما جاء في فضل الطهور (تشریحات ترمذی جلد اول ص ۱۷) پر بھی گزرا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام نیکیوں سے صغائر تو معاف ہو جاتے ہیں لیکن کیا کبائر بھی معاف ہو جاتے ہیں؟ تو متقدمین سے اس بارے میں کوئی تفصیل مروی نہیں۔ عام متاخرین کہتے ہیں کہ کبائر کے لئے توبہ شرط ہے۔ تاہم بعض حضرات کے نزدیک بڑی نیکی سے بھی کبیرہ معاف ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ حقوق سے اور خاص کر حقوق العباد سے متعلق نہ ہو کیونکہ اس کے لئے معافی یا تلافی بھی شرط ہے۔

اشکال:- حدیث باب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس صحابی کو شدید ندامت لاحق ہو گئی تھی اور اصل توبہ تو ندامت سے عبارت ہے تو پھر خالہ سے حسن سلوک پر غور کیوں مشروط کیا گیا؟ حالانکہ توبہ سے توباً بالاتفاق ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے۔

حل:- اولاً تو توبہ بھی کبھی مشروط بشرط ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب تو ہے نہیں لہذا وہ

قبولِ توبہ کے پابند نہیں وہ رو بھی کر سکتا ہے اور مؤخر بھی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوا ہو کہ ان کی قبولیتِ توبہ کی شرط یہ ہے کہ وہ والدین یا خالہ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

ٹانیا ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا گناہ معاف ہوا تھا مگر پھر بھی خالہ کے ساتھ برائی کی کا حکم دیا تاکہ تصفیہ قلب مکمل طور پر ہو جائے جیسے بعض صحابہ گناہ کے بعد توبہ کے ساتھ صدقہ بھی دیا کرتے تھے تاکہ گناہ سے جو میل دل پر آتا ہے اس کا مکمل ازالہ ہو اور روحانی کیفیت جلد بحال ہو جائے۔

قولہ ”هل لك من ام“ اس میں لفظ ”من“، تعین کے لئے بھی ہو سکتا ہے لہذا پھر لفظ ام نانی کو بھی شامل ہوگا۔ جبکہ بعض روایات میں ”والدین“ بصفحہ تثنیہ آیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ ”من“ زائد ہو پھر مطلب یہ ہوگا ”آلک ام“ بہر حال اس حدیث سے خالہ کا مقام معلوم ہوا کہ وہ والدہ کی قائم مقام ہے۔

باب ماجاء فی دعاء الوالدین

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ثلاث دعوات مستجابات لاشک فیہن دعوی المظلوم ودعوی المسافر ودعوی الوالد علی ولده“۔^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین دعائیں ایسی ہیں جن کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں (یعنی ضرور قبول ہوتی ہیں) مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور والد کی بددعا اولاد کے حق میں۔

لغات:- ”دعاء“ اگر چہ لغت میں مطلق پکارنے کے معنی میں آتا ہے مگر اصطلاح میں اس پکار کو کہا جاتا ہے جس میں اللہ عزوجل کی مدد مانگی جاتی ہے۔ اس کے صلہ میں اگر لام آجائے تو بمعنی نیک دعاء کے آتا ہے جیسے دعاء، اور اگر صلہ میں علی آجائے جیسے دعا علیہ تو بمعنی بددعا کے آتا ہے۔ امام ترمذی نے ترجمہ میں مطلق چھوڑا کیونکہ دعویٰ الوالد اگر چہ علی کے ساتھ آیا ہے لیکن باقی دونوں میں صلے مذکور نہیں اگرچہ مظلوم کی دعا سے بھی

۱۔ کذا فی المستدرک للحاکم ص: ۸۱ ج: ۵ ”کتاب البر والصلة“ حدیث: ۷۳۱۹، ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۲۲ ج: ۳۔

باب ماجاء فی دعاء الوالدین

۲۔ الحدیث أخرجه ابن ماجہ ص: ۲۷۵ ”باب دعوی الوالد ودعوی المظلوم“ کتاب الدعاء، ایضاً مستدرک احمد ص: ۲۴ ج: ۳ حدیث: ۸۳۷۵ ایضاً ص: ۱۷۲ ج: ۳۔

بظاہر بددعا ہی مراد ہے، دعا کی جمع اور عید آتی ہے۔

تشریح:۔ اس روایت میں ان تینوں دعاؤں کی قبولیت کی تصریح ہے۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اگرچہ مجہول ہے لیکن اصول اس کی تائید کرتے ہیں ”والحدیث مجہول وریعاً شہدت له الاصول ابو جعفر المودن راویہ عن ابی ہریرۃ لا یعرف“ امام ترمذی نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ تاہم امام سیوطی نے الجامع الصغیر میں اس کے کثرت طرق کا دعویٰ کیا ہے۔ ترمذی ”باب ما جاء فی کرہیۃ اخذ خیار المال فی الصدقۃ“ ابواب الزکوٰۃ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صحیح حدیث گزری ہے کہ نبی علیہ السلام نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا تو ان کو جو ہدایات دی تھیں ان کے اخیر میں ہے ”واتق دعوة المظلوم فانہا لیس بینہا و بین اللہ حجاب“ اس پر مسند احمد کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے ”وان کان کافراً“؎ یعنی مظلوم کی بددعا بہر حال قبول ہوتی ہے گو کہ وہ ایسے اعمال کا ارتکاب کر چکا ہو جو دعا کی قبولیت سے مانع ہوں۔ تاہم اگر مظلوم فاسق یا کافر ہو تو دعا کی قبولیت سے مراد حصول مطلوب ہوگی نہ کہ مقصود اصلی جو کہ اکرام اور اللہ کی رضا ہے۔ (انظر تشریحات جلد ۳ ص ۳۶۰)

بہر حال یہ طے ہے کہ جو دعا دل کی جتنی گہرائی اور بے بسی کے عالم میں ہوگی اتنی ہی زیادہ قابل قبول ہوگی، چونکہ مظلوم بے بس ہوتا ہے اور اللہ کے سوا اپنا کوئی سہارا نہیں دیکھتا وہ تمام اسباب سے کٹا ہوا ہوتا ہے اس کی آخری امید اللہ کی ذات سے وابستہ ہوتی ہے اور یقیناً ایسے میں اللہ عز و جل ضرور مدد کرتا ہے۔ اسی طرح مسافر بھی اجنبیت کے عالم میں اللہ کو پکارتا ہے جو بے بسی کا اظہار ہے۔ رہا والد تو ہر ایک جانتا ہے کہ جب تک ماں باپ کو اولاد سے خیر و بھلائی کی توقع ہوتی ہے اس وقت تک وہ اولاد کے حق میں ترقی کی دعائیں مانگتے ہیں مگر جب اولاد نافرمانی کی حد کر اس کرتی ہے تو ناامید ہو کر ماں باپ اس سے جان چھڑانے کے لئے اللہ سے دعا مانگنے لگتے ہیں جو قبول ہوتی ہے۔ اور چونکہ ماں باپ کی نیک دعا بھی اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہے مگر نیک دعا اور بددعا میں واضح فرق ہے کہ اول الذکر حالت اختیار میں ہوتی ہے جبکہ ثانی الذکر حالت اضطرار میں ہوتی ہے اس لئے حدیث میں اسی کی تخصیص کی گئی کیونکہ یہاں ان دعاؤں کا ذکر مقصود ہے جو بہر حال قبول ہوتی ہیں نفس قبولیت کا تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ (تذکر)

باب ماجاء فی حق الوالدین

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یجزی وَلَدُو الدَّاءُ اِلَّا ان یجده

مملوکاً فیشترہ فیعتقہ“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نوئی اولاد اپنے باپ کا بدلہ نہیں دے سکتی الا یہ کہ اسے غلام پائے اور اس کو خرید کر آزاد کر دے۔

تشریح:- اس حدیث میں اور اس سے سابقہ باب کی حدیث میں والد کے لفظ سے حکم کو باپ تک محدود نہ سمجھا جائے کیونکہ والد بمعنی ”من له الولد“ بھی آتا ہے جو ماں کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح ولد کے لفظ سے صرف بیٹا ہی مراد نہ لیا جائے کیونکہ ولد بمعنی مولود بھی آتا ہے جس کا اردو ترجمہ اولاد کے ہے۔

اولاد پر ماں باپ کے حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں:- ایک زندگی اور حیات کا سبب بننا۔ دوم تربیت و پرورش۔ جہاں تک تربیت و پرورش کا تعلق ہے تو اگرچہ اس احسان کا بدلہ ہو یہ وہی شکل میں چکانا تو ممکن نہیں تاہم ان کی خدمت کر کے بطور جزا بالمثل کے ممکن ہے لیکن پہلے احسان کا بدلہ خدمت سے کہاں ممکن ہے؟ یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ وہ غلام ہوں اور ان کو خریداجائے تاکہ وہ غلامی سے آزاد ہوں، چونکہ غلامی بھی ایک قسم کی موت ہے اس لئے گویا یہ بھی جزا بالمثل کی طرح بدلہ شمار کیا گیا۔

قولہ ”فیعتقہ“ اس میں عتاق کی نسبت بیٹے کی طرف کی گئی ہے جس سے بعض اہل ظواہر نے یہی سمجھا کہ خریدنے کے بعد بطور استیفاف کے عتاق کی ضرورت ہوگی نفس ملک میں آنے سے وہ آزاد نہ ہوگا۔ مگر ائمہ اربعہ فرماتے ہیں کہ باپ ہو یا کوئی بھی ذی رحم محرم وہ ملک میں آتے ہی خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ یہاں نسبت سبب کی وجہ سے کی گئی کہ بیٹا اس کی آزادی کا سبب بن گیا ہے۔ جمہور کا مسئلہ اس حدیث سے ہے ”من مملک ذارحم محرم فهو حر“ (رواہ ابوداؤد ص ۵۵۰ ج ۲، باب فیمن ملک ذارحم محرم، ابن ماجہ ص ۱۸۱، ولفظہ للترمذی وغیرہ)

باب ماجاء فی قطعیۃ الرحم

”عن ابی سلمۃ قال اشتکی ابوالدرداء فعاده عبدالرحمن بن عوف فقال: خیرہم واصلہم ما علمت ابو محمد، فقال عبدالرحمن سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: قال اللہ تبارک وتعالیٰ: انا اللہ وانا الرحمن مخلقت الرحم وشفقت لہامن اسمی فمن وصلہا وصلته ومن قطعہا قطعہا“۔^۱

ابوسلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداءؓ بیمار ہوئے تو حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ عیادت کرنے ان کے پاس گئے، ابودرداءؓ نے فرمایا کہ میرے علم کے مطابق ابو محمدؓ سب سے بہتر اور سب سے زیادہ تعلق گزار ہیں تو عبدالرحمنؓ نے فرمایا: کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: کہ میں اللہ ہوں، اور میں رحمن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اس کا نام اپنے نام پر رکھا ہے (یعنی اپنے نام رحمن کے مطابق وہنام) پس جو شخص اس کو جوڑے گا میں بھی اسے (اپنی رحمت سے) جوڑوں گا اور جو اس کو کاٹے گا میں بھی اس کو (اپنی رحمت سے) کاٹوں گا۔

ترکیب:- ”فقال“ کی ضمیر ابودرداءؓ کی طرف لٹوتی ہے۔ ”خیرہم واصلہم“ معطوف علیہ و معطوف مل کر مبتدأ ہے اور ”ابو محمد“ خبر ہے جو عبدالرحمن بن عوفؓ کی کنیت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ابو محمد“ کو مبتدأ مؤخر بنا کر ”خیرہم واصلہم“ کو خبر مقدم مانا جائے۔ بنا ہر دو تقدیر ”ما علمت“ جملہ مقررہ ہے جس کی وجہ آگے تشریح میں آرہی ہے۔

لغات:- قولہ ”اشتکی“ شکایت کرنے اور بیمار ہونے کے معنی میں آتا ہے اور یہاں یہی بیمار ہونے کے معنی مراد ہیں۔ شکاء، شکو، نصر، نصر سے بمعنی بیماری کی تکلیف محسوس کرنے کے آتا ہے۔ قولہ ”الرحم“ رحم، مادہ میں شفقت کے معنی پائے جاتے ہیں اصطلاح میں بچہ دانی کو کہتے ہیں مگر یہاں مراد قرابت کا رشتہ ہے یعنی خوئی رشتہ خواہ محارم ہوں جیسا کہ بعض کی رائے ہے یا مطلق رشتہ دار ہوں جیسا کہ بعض دیگر کا خیال

باب ماجاء فی قطعیۃ الرحم

۱۔ اخرجه ابو داؤد ص: ۲۳۵ ج: ۱ ”باب فی صلة الرحم“ کتاب الزکوۃ، ایضاً الترمذی والتعظیم ص: ۲۲۹ ج: ۳ دار الکتب العلمیۃ بیروت.

ہے۔ قولہ ”ہتہ“ ہتہ الہی جو تا بمعنی منقطع ہونے کے ہیں جبکہ جُت متعدی استعمال ہوتا ہے یعنی بمعنی نکلے نکلے کرنے کے۔

تشریح :- حضرت ابوورداء رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے موقع پر جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ عیادت کی غرض سے ان کے پاس تشریف لائے یہ تحمیدی کلمات ارشاد فرمائے کیونکہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے یا تو کسی دور کی قربت کا خیال رکھتے ہوئے عیادت فرمائی۔ یا پھر محض مواخاۃ اسلامی اور دوستانہ تعلقات کی بناء پر عیادت کی چونکہ ایسا شخص جو عام سے رشتے کی اتنی قدر کرتا ہوا قرآن کا یقیناً قدر رواں ہوتا ہے اس لئے حضرت ابوورداءؓ نے اس پر ان کی تعریف فرمائی۔ تاہم بیچ میں ”ما علمت“ کا اضافہ کر کے تعلیمات نبوی پر عمل کر کے دائرہ مدح و تعریف کے اندر اندر رہے کیونکہ کسی کی ایسی تعریف نہیں کرنی چاہئے جو آدمی کے علم میں نہ ہو۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے منہ پر تو بہت زیادہ تعریفیں کرتے ہیں لیکن دل میں اور غائبانہ طور پر اس کی تصدیق کرنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں، دوسری طرف عجب اور خود نمائی کے شوق کے شکار کو ایسے کلمات سے نوازنا جو اس کے مرتبے سے زیادہ ہوں زہرا کو دشہد کی مانند ہے، بخاری شریف میں حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص نے دوسرے کی تعریف کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ارے تم نے تو اس کی گردن کاٹ ڈالی کئی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کو دہرایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے اگر کوئی کسی کی تعریف کرنا چاہے تو ”احسب فلاناً“ کہہ دے یعنی تعریف میں یہ کہے کہ میرے علم کے مطابق یہ شخص ایسا ہے ”باب اذکر فی رجل رجلاً کفاه“ اور ”باب ما یکبرہ من الاطباء فی المدح ویقل ما یعلم“۔ (ص ۳۶۶ ج ۱)

ان تعریفی کلمات کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے مذکورہ حدیث قدسی بیان فرمائی۔ قولہ ”خلقت الرحم“ اگر رحم سے مراد بچہ دانی ہو تو پھر خلق بمعنی ایجاد کے ہے یعنی میں نے رحم کو جو بخش کر اس کو جسم بنایا اور اگر بمعنی قربت کے ہو تو پھر خلق بمعنی تقدیر کے ہے یعنی میں نے قرأتیں مقرر و مقدر کی ہیں۔

قولہ ”و شققت لہامن انس“ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ بعض محدثین نے اس سے اللہ اور رحم کے درمیان نسب ثابت کیا ہے جو سراسر غلط ہے کیونکہ یہاں مراد تشبیہ دینا مقصود ہے جیسے اللہ کو بھی عالم کہا جاتا ہے اور بندے کو بھی حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی نسب اور مماثلت نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ نے رحم کے اندر شفقت اور باہمی محبت ڈالی ہے، جو رحمن ذات کی رحمت سے کوئی مماثلت نہیں رکھتی علی ہذا یہ شخص اسی مشارکت

ہے نہ کہ معنوی۔ ہاں اسم کا اثر ہوتا ہے اور اپنے معنی سے مناسبت بھی ہوتی ہے جو یہاں موجود ہے۔ (تدبر)
 قولہ ”فمن وصلہا وصلته“ یعنی جو شخص قرابت کی رعایت کرے گا، تو میں اس کو پورا ثواب دوں گا اور جو اس میں کوتاہی کرے گا تو میں اس کو ثواب سے محروم کر دوں گا۔

اس حدیث مبارکہ سے صلہ رحمی کی تاکید اور اسے نظر انداز کرنے پر وعید معلوم ہوتی ہے۔ بخاری شریف میں ہے ”لا یمدحہل الجنة قاطع“ ^۱ گے قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا یہ روایت اگلے باب میں بھی آ رہی ہے۔ جبکہ صلہ رحمی سے آخرت اور دنیا دونوں اعتبار سے برکات کا نزول ہوتا ہے۔ دنیا میں خوشی اور عزت اور دولت اور موت کے بعد دیر تک شہرت و ذکر خیر نصیب ہوتا ہے اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور جنت ملتی ہے۔ مزید تفصیل اگلے باب میں۔

اخیر میں امام ترمذی نے عمر کے طریق کو نقل فرما دیا ہے جس میں ابو سلمہ اور ان کے والد عبد الرحمن بن عوف کے درمیان رد اکا واسطہ بڑھایا ہے ”وفیه مافیہ“۔

باب ماجاء فی صلة الرحم

”عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لیس الواصل بالمکافی ولكن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلہا“۔ ^۱ (حسن صحیح)

حضرت عبد اللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو صلہ رحمی کے بدلے میں صلہ رحمی کرے بلکہ (درحقیقت) صلہ رحمی کرنا والا وہ شخص ہے کہ اس کا رحم کاٹا جائے تو وہ اسے جوڑ دے، یعنی جب اس سے تعلق منقطع کیا جائے تو یہ اسے بحال کرے۔

لغات: ”صلة“ اصل میں وصلہ تھا لہذا اس میں باء واو محذوفہ کے عوض میں آیا ہے جیسے عذۃ۔ قولہ ”الواصل“ باب کی اگلی روایت میں قاطع کا لفظ آ رہا ہے جس کے مطلب میں امام سفیان نے فرمایا یعنی قاطع الرحم

ع صحیح بخاری ص: ۸۸۵ ج: ۲ ”باب الم المفاطع“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۳۱۵ ج: ۲ ”باب صلة الرحم و تحريم قطعہا“ کتاب البر والصلة، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۳۳ ج: ۳، ابوداؤد ص: ۲۳۵ ج: ۱ کتاب الزکوۃ۔

باب ماجاء فی صلة الرحم

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۸۶ ج: ۲ ”باب لیس الواصل بالمکافی“ کتاب الادب و ابوداؤد ص: ۲۳۵ ج: ۱ ”کتاب الزکوۃ“ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۱ ج: ۳۔

لہذا یہاں واصل الرحم مراد ہے یعنی صلہ رحمی کرنے والا۔ قولہ ”الزکافی“ بروزن مجازی لفظاً ومعناً کثافاً یکتافئ مکے لافہ کے معنی بدلہ دینے کے ہیں۔

تشریح: اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ احسان کے بدلے میں احسان کرنا اور اچھے تعلقات کے رد عمل میں اچھے تعلقات اور نیک سلوک سے پیش آنا تو ہر آدمی کا کام ہے یہ تو ادنیٰ شخص بھی کر سکتا بلکہ کرتا ہے یہ کوئی اتنی باکمال شخصیت کا کارنامہ نہیں۔ اصل اور کامل واصل وہ شخص ہے جس سے ناطہ توڑا جائے اور یہ اسے دوبارہ وسیہ بار و پھر بحال کرتا ہے۔

دوسری حدیث: ”لا یدخل الجنة قاطع“ ای قاطع رحم ^۱ اس کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ قطع رحمی کرنے والا شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ شارحین نے اس کے متعدد مطالب بیان کئے ہیں۔ (۱) جو شخص قطع رحمی کو حلال سمجھتا ہے تو چونکہ حرام کو حلال سمجھنے والا دائرہ ایمان سے خارج ہوتا ہے اس لئے وہ جنت میں نہیں جائے گا لہذا یہ عدم دخول مؤبد و دائمی ہے۔

(۲) یہ سابقین کے ساتھ نہیں جائے گا یعنی بقدر گناہ عذاب پہنچنے کے بعد جائے گا۔ حضرت شاہ صاحب کی عرف شذی والی توجیہ بھی اس کے قریب ہے یعنی جب تک وہ اس وصف سے موصوف نہ ہوگا تو جنت میں داخل نہ ہو سکے گا مگر جب عذاب سے پاک ہوگا تو پھر یہ گناہ اس کے ذمہ نہیں رہے گا۔ (۳) یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خاصیت مفرد کا بیان ہو یعنی قطع رحمی کی اپنی خاصیت و تاثیر جنت سے روکنا ہے مگر قیامت کے دن فیصلہ مجموعہ اعمال پر ہوگا۔ پہلے دو جواب حاشیہ پر ہے۔ جبکہ تیسرا جواب امام راغب کے مفردات قرآن کے ضابطے پر مبنی ہے۔

باب کی دونوں ارشادات سے صلہ رحمی کی تاکید معلوم ہوئی۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی کی وجہ سے نسب یاد رکھنا واجب ہے۔

صلہ رحمی کرنے کا طریقہ: فقیر ابو الیث سرقدی فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں سے قریب رہتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ حسب استطاعت کبھی بھسار ان کو تحفہ دہے یہ بھیجا کرے، ان سے ملنے کے لئے جائے۔ اگر ہدیہ کی طاقت نہ ہو تو نفیس زیارت کے لئے ضرور جائے، اگر اس کے لائق کوئی خدمت ہو تو اسے بخوشی قبول کرے۔ اگر وہ اقارب سے دور رہتا ہو تو خط و کتابت کا رابطہ رکھنے سے بھی یہ حق ادا ہو جائے گا۔ آج

کل فنون کی سہولت نے اس مقصد کے حصول کو اور بھی آسان بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی نہ ان سے ملتا ہے نہ ہدیہ بھیجتا ہے اور نہ ہی کوئی رابطہ رکھتا ہے تو وہ صلہ رحمی کو توڑتا ہے۔ (حبیبہ الغافلین ص: ۵۰)

غرض اپنے رشتہ داروں سے ملنا، ان کی ایذا رسانی پر صبر کرنا، ان کی خدمت کرنا، ان کی خیر خواہی کا جذبہ رکھنا اور ان سے بہتر تعلقات سنوارنا صلہ رحمی ہے حتیٰ کہ اگر اقارب میں کوئی غیر مسلم ہو تو بھی ان سے اچھے مراسم رکھنے چاہئے۔ امام بخاریؒ نے اس کے لئے مستقل دو باب قائم کئے ہیں۔ ایک میں ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی والدہ جو مشرکہ تھی صلح کے زمانے میں مدینہ آئی حضرت اسماءؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ”ان امی قدمت وہی راغبۃ أفأصلیہا؟ قال نعم صلی امک“ یعنی میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ کچھ راغب ہے تو کیا میں اس کی خدمت اور خاطر تواضع کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیکر فرمایا ہاں ان سے نیک سلوک اور اچھا برتاؤ کرو۔ (باب صلۃ الوالد المشرک ص: ۸۸۳ ج: ۲)

فقہ ابو الالیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی میں دس حکمتیں ہیں: (۱) اس سے اللہ عز و جل خوش ہوتے ہیں (۲) یہ فرشتوں کی خوشی کا بھی ذریعہ ہے (۳) اس سے اہل قرابت بھی خوش ہو جاتے ہیں (۴) لوگ بھی ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں (۵) یہ ابلیس کی مایوسی و پریشانی کا بہترین ذریعہ ہے (۶) اس سے عمر میں برکت حاصل ہوتی ہے (۷) اس سے رزق و مال میں زیادتی ہوتی ہے (۸) اس کے فوت ہونے والے بزرگ باپ دادا بھی اس سے خوش ہوتے ہیں (۹) اس سے لوگوں میں اس کی محبوبیت بڑھ جاتی ہے (۱۰) یہ موت کے بعد اجر کا ذریعہ ہے یعنی دعائیں لینے کا بہترین سامان ہے۔ (حبیبہ الغافلین ص: ۵۰، نقض قدم کامل ص: ۳۷۹)

باب ماجاء فی حُبِّ الولد

عن ابرہیم بن مسرۃ قال سمعت ابن ابی سؤید یقول سمعت عمر بن عبد العزیز یقول نزعمت المرأة الصالحة حولة بنت حکیم قالت عرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم وهو محتضن أحد ابیہ ابنته وهو یقول: انکم لتبغیون وتُحِبُّون وتُحِبُّون وانکم لئمن ریحان

اللہ۔ (منقطع و آخره احمدی مسندہ)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک نیک خاتون خولہ بنت حکیم کہتی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے، دریاں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کے دو صاحبزادوں میں سے ایک کو گود میں لئے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے تم لوگ (اولاد) بخل پر مجبور کرتے ہو اور بزدل بناتے ہو اور جہل پر اُکساتے ہو، تم لوگ اللہ کی طرف سے تسکین بخش رزق ہو۔ (یا بہت خوشبودار ہو)

لغات:- قولہ "زعمت" زعم و دعویٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے (۱) اعتقادِ فاسد (۲) قول، یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔ قولہ "عولہ بنت حکیم" یہ المرأة الصالحة سے بدل ہے۔ قولہ "محتضن" ۳ خضان سے ہے گود میں لینے کو کہتے ہیں، حضن سینے سے بغل اور پہلو تک کے حصے کو کہتے ہیں۔ حضائے پرورش کو کہتے ہیں کہ اس میں بھی گود میں لینا پڑتا ہے۔ قولہ "لتبعلون" تینوں صیغے باب تفعیل سے ہیں۔ قولہ "ریحان" رحمت، راحت اور رزق کو کہتے ہیں بمعنی خوشبو کے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ بچوں کو پیار کرتے وقت منہ سے لگایا جاتا ہے ان کا بوسہ لیا جاتا ہے اور سونگھے جاتے ہیں۔ علامہ بخاری نے سونگھنے کے معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس کی تائید بعض روایات سے ہوتی ہے۔

تشریح:- یہ واقعہ حضرات خنہیں میں سے کس کا ہے؟ تو اس میں دونوں احتمال ہیں حضرت حسن رضی اللہ بھی ہو سکتے ہیں اور حضرت حسین رضی اللہ بھی۔ بنا برہر تقدیر حدیث میں "ابنت" سے مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ حدیث میں جن تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کسی طرح کا تردد نہیں، کیونکہ اولاد کی محبت ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی بخل اختیار کرتا ہے کہ اسے ہر وقت اپنے بچوں کی خوشی اور روشن مستقبل کی فکر لاحق رہتی ہے اور پھر وہ پیسوں سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ اس سے بھی بچوں کے لئے خوشی خریدی جاسکتی ہے۔ اسی طرح آدمی موت سے بھی ڈرتا ہے کہ اس پر ہر وقت یہ سوچ سوار رہتی ہے کہ اگر میں مر جاؤں گا تو میرے بچے یتیم بن جائیں گے اس طرح وہ شفقت پوری سے محروم ہو جائیں گے ان کی صحیح پرورش نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ نتیجتاً وہ بزدل بن جاتا ہے۔

پھر بعض لوگ اپنی اولاد کی وجہ سے بسا اوقات نامناسب روش بھی اختیار کر لیتے ہیں جو ایک گونہ جہل

ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جبل سے مراد مقابل علم ہو کیونکہ بعض لوگ اولاد کی وجہ سے ضروری علم یا تجربہ علمی سے محروم رہتے ہیں۔

چونکہ ان باتوں سے اولاد کے مقام کا انحطاط معلوم ہوتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ تم اللہ کی طرف سے سونگھنے کا عطیہ ہو جس سے تسکین و راحت نصیب ہوتی ہے، یعنی ایک طرف اولاد کی وجہ سے آدمی نقصان اٹھا سکتا ہے جبکہ دوسری جانب اولاد دھیم اور سکون کا سامان ہے لہذا کوئی آدمی فرط محبت کی وجہ سے اولاد کی طرف سے نقصان نہ اٹھانے پائے۔ بلکہ اپنے دین کا بھی خیال رکھے اور ان کی تربیت بھی کرتا رہے گواں کے لئے بچوں کو مارنا پڑے ہاں زیادہ مارنا ممنوع ہے تین تہیز تک مارنے کی اجازت ہے بشرطیکہ منہ پر نہ ہوں، غرض ان سے محبت بھی کرو اور ادب بھی سکھاؤ۔

باب ماجاء فی رحمة الولد

”عن ابی ہریرۃ قال ابصر الاقرع بن حابس النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو یقبل الحسن وقال ابن ابی عمر: ”الحسن او الحسنین“ فقال: ان لی من الولد عشرة ما قبلت احدا منهم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انه من لا یرحم لا یرحم“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ اقرع بن حابس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن کو چوم رہے تھے ابن ابی عمر (راوی) کہتے ہیں کہ وہ حسن تھے یا حسین؟ (یعنی دونوں میں سے ایک تھے) تو حابس نے کہا کہ میرے تو دس بچے ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چوما ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی پر رحم نہیں کرتا (یعنی شفقت نہیں کرتا) تو اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا ہے۔

تشریح:۔ حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ میں نے اپنے دس بچوں میں سے کسی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا ہے اس رسم پر مبنی تھا جو جاہلیت میں عام تھی کہ بچوں کو پیار کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے پٹھانوں میں بھی یہ رسم جڑیں پکڑ چکی ہے اگر کوئی شخص اپنے ماں باپ کے سامنے اپنی بیوی سے بات کرے یا بچہ گود میں اٹھائے تو لوگ اسے بے شرم سمجھتے ہیں، گویا کہ یہ جاہلی عرفی حیا ہے چونکہ یہ قساوت قلبی کی علامت ہے اس لئے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی فرما کر واضح کر دیا کہ اس کے نتائج ایسے شخص کے بارے میں اچھے نہیں نکلتے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر آدمی کے ساتھ اس کے حال کے مطابق معاملہ و سلوک فرماتے ہیں، نرم دلوں کے ساتھ نرمی کا اور سخت مزاجوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے ہیں چنانچہ ایک حدیث قدسی میں ہے "انسان عند ظن عبادی بسی" ^۱ گو یہ اعتقاد کے بارے میں ہے تاہم اس سے برتاؤ کا اصول لیا جاسکتا ہے کہ جو معاملہ آدمی کا اللہ کے ساتھ ہو اور اس پر جو سزا جزا ملتی ہیں اسی طرح جو سلوک آدمی کا اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہوگا اس کی بھی اچھی بُری سزا ملے گی، چونکہ اہلاد کے ساتھ شفقت اپنے اوپر اللہ کے رحم کا سبب ہے جبکہ اس کے برعکس بچوں کے ساتھ سختی کرنا اپنے اوپر سختی کا موجب ہے اور بوسہ لینا اس سلوک کی علامات میں سے ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حکم لگایا، اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو چومنا بہیمانہ شہوت کا نتیجہ نہیں بلکہ رحمانہ اخلاق اور مشفقانہ طرز حیات کی نشانی ہے۔

باب ماجاء فی النفقة علی البنات

”عن ابی سعید الحدادی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من كانت له ثلاث بنات او ثلاث اخوات او ابنان او اُختان فاحسن صحبتهن واتقى الله فيهن فله الجنة“۔ (حَسَنٌ)

حضرت ابو سعید الحدادی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں یا تین بہنیں ہوں یا دو لڑکیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہے اور ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے تو اس کو جنت ملے گی۔

تشریح:۔ اس روایت میں لفظ ”او“ راوی کے شک کے لئے نہیں بلکہ تنویع کے لئے ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے اتنی قوی تو نہیں تاہم اس مضمون کی متعدد احادیث مروی

باب ماجاء فی رحمة الولد

۱۔ رواہ البخاری ص: ۱۱۰۱ ج: ۲ ”باب قول اللہ و یحذروکم اللہ لنفسہ الخ“ کتاب الرد علی الجہمۃ وغیرہم التوحید، مسلم ص: ۳۵۴ ج: ۲ کتاب النبیۃ، سنن ابن ماجہ فی الادب، سنن دارمی ص: ۳۹۵ ج: ۲ حدیث: ۲۷۳۱ کتاب المرقاۃ، مسند احمد ص: ۵۳۶ ج: ۳ حدیث: ۵۵۸۶ ایضاً رواہ الحاکم فی المستدرک والطبرانی وابن المبارک وابن حبان والذہبی، بحوالہ حاشیہ سنن دارمی ص: ۳۹۵ ج: ۲۔ حلیف الرحمن الحنفی غفرلہ ولوالدیہ ولاسالتہ

ہونے کی وجہ سے کم از کم درجہ حسن کی ہے۔ اس ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیٹیوں یا بہنوں کی صحیح پرورش کرے تو وہ اس عمل کی وجہ سے جنت کا مستحق ہو جاتا ہے گو کہ اللہ پر کوئی چیز واجب تو نہیں لیکن اس کی عادت شریفہ یہ ہے کہ نیک مخلصانہ اعمال پر جنت دیتے ہیں چونکہ لڑکوں کی پرورش، ان کی تعلیم پر خرچ کرنا تو ہر ایک برداشت کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کل یہ لوگ مجھے کھلائیں گے۔ جبکہ لڑکیوں کی بہترین تربیت دنیوی لالچ سے خالی ہوتی ہے یہ صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہوتی ہے اس لئے عند اللہ لڑکیوں کی تربیت پر اتنا بڑا انعام مقرر کیا گیا کیونکہ یہ عمل تکلیف سے خالی نہیں کہ ایک ایسی جگہ پیسے لگانا، تکلیف اٹھانا اور صبر کرنا جہاں سے دنیاوی مفادات ملنے کا خاطر خواہ امکان نہ ہو۔ یقیناً کسی نیک جذبے سے ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ابتلى بشيء

من البنات فصبر عليهن كن له حجاباً من النار“۔ (حسن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس شخص کو کچھ لڑکیوں میں مبتلا کیا گیا اور اس نے ان پر صبر کیا تو وہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم سے آڑ ہوں گے۔

لغات:- قولہ ”ابتلى“ بضمغہ مجہول لاء کے معنی آزمانے اور مصیبت میں گرفتار کرنے کے آتے

ہیں۔ یہاں بمعنی امتحان و آزمائش کے ہے۔

قولہ ”من شئ“ اگر من بیان یہ ہو تو شئ سے مراد عدد ہے۔ اور اگر ابتدائی ہو تو شئ سے مراد ناگواری

ہے۔

تشریح:- چونکہ لوگ لڑکوں کی پیدائش پر خوش ہوتے ہیں اور لڑکیوں پر خوش نہیں ہوتے کہ ان کے ذم

میں یہ ان پر بوجھ ہوتی ہیں، یا ان کی وجہ سے وہ عار سے دوچار بھی ہو سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس لئے اس حدیث

میں ان کی پیدائش اور ان کی تادیب و تعلیم وغیرہ کو ابتلاء سے تعبیر کیا کہ لوگ ان کو بادل نا خواستہ قبول کرتے ہیں۔

تو اس حدیث مبارکہ میں ان کو مبتلا یا گیا کہ جو شخص ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت اور شادی وغیرہ مراحل سے یوں

گذرے کہ ان تمام مراحل میں پیش آنے والی تکلیفات پر صبر کرے اور ان پر اجر و ثواب کی نیت کرے تو یہ لڑکیاں

قیامت کے دن عذاب سے آڑ بن کر والدین کی نجات کا ذریعہ بنیں گی گویا جس طرح بعض اعمال کے فوائد نقد

اور جلد دنیا میں ملتے ہیں اور بعض کے آخرت میں تو بچوں کا معاملہ بھی کچھ اس طرح ہے کہ لڑکوں کی کمائی اور محنت و مزدوری و دیگر فوائد دنیا ہی میں سامنے آتے ہیں مگر لڑکیوں کے ساتھ جو اجر و ثواب وابستہ کیا گیا ہے وہ آخرت میں ملے گا۔ غفلت شخص وہ ہوتا ہے جو اشیاء کے لوازمات اور تاثیرات کو جانتا ہو۔ اگر کھجور کا درخت جلد پھل نہ دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درخت ہی فضول ہے۔ چونکہ آخرت کا ثواب کمائے کے لئے نیت بھی شرط ہوتی ہے اس لئے ان لڑکیوں کی پرورش کے دوران ثواب کی نیت بھی کر لینی چاہئے۔ اور یہ کہ ان کی تربیت اور تعلیم بھی ایسی ہونی چاہئے جو آخرت کے کاموں میں سے ہو۔ ویسے تو لوگ آج کل روشن خیال بنانے کو بھی تعلیم و تربیت کہتے ہیں۔

تیسری حدیث :- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت ان کے یہاں آئی جس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں، اس نے بھیک مانگی لیکن وہ میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ پا سکی جو میں نے اسے دیدی پس اس نے اس کے دو کٹڑے کر کے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دیئے اور خود اس میں سے نہیں کھایا پھر اٹھ کر چلی گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قصے کی خبر دیدی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص ان لڑکیوں کی طرف سے کچھ آزمائشوں میں مبتلا ہو جائے تو وہ (بشرط ماصر) اس کے لئے جہنم سے حجاب ہوں گی۔

تشریح :- حضرت گنگوہی رحمہ اللہ "الکوکب" میں فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس واقعہ پر تعجب ہوا حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر ام المؤمنین چونکہ اولاد کی حلاوت سے واقف نہ تھیں اس لئے یہ منظر ان کو عجیب لگا کہ ایک بھوکى عورت نے کس طرح اپنے آپ پر بچیوں کو ترجیح دی۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسائل کو محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر زیادہ چیز دینے کے لئے نہیں مل رہی یا اس کے دینے کی استطاعت نہیں تو کم از کم کچھ نہ کچھ دینا چاہئے گو کہ وہ بہت معمولی کیوں نہ ہو، سوال کے متعلق تفصیلی بحث باب من تحمل لہ الزکوٰۃ میں گزری ہے فلانحیدہ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد سوم ص ۱۰۱ تا ۱۰۸ بحث اول و ثانی)

یہاں علامہ عینی نے ایک اعتراض کیا ہے کہ بعض روایات کہیں تین کھجوروں کا ذکر ہے کہ اس عورت نے ایک ایک کھجور لڑکیوں کو دی اور تیسری کو خود کھانے کا ارادہ کیا مگر جب اسے منہ کے قریب کیا تو لڑکیوں نے وہ

بھی مانگ لی تو ماں نے اس کے دو ٹکڑے کر کے ان کو ایک ایک ٹکڑا دیے یا اس طرح دونوں روایتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

مگر اس کا جواب یہ ہے کہ راوی کی نظر مغزو معنی پر ہوتی ہے لہذا ممکن ہے کہ اصل میں تین سمجھیں ہوں مگر اختصاراً تیسری کا ذکر کیا گیا کیونکہ اصل غرض اسی سے متعلق ہے کہ خود بھوکے رہی اور بچوں کو کھلایا۔

حدیث آخری: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ دَخَلَ الْإِنَّاوُھُ الْجَنَّةَ كَهَاتَيْنِ وَاشَارَ بِاصْبَعِيهِ“ جس نے دو لڑکیوں کو کھلا پلا کر پالا تو میں اور وہ جنت میں ان دو (انگیوں) کی طرح ساتھ داخل ہوں گے اور اشارہ کیا دو انگلیوں سے۔

عول کے معنی روزی اور مدد وغیرہ کے آتے ہیں لیکن یہاں وہ سب چیزیں مراد ہیں جو عیال داری کے لئے درکار ہوتی ہے مثلاً کپڑے، تعلیم و تربیت کے اخراجات اور علاج کی سہولت وغیرہ، پھر یہ ذمہ داری کم از کم شادی کے وقت تک لازمی ہے صرف چند دن کے حسن سلوک سے یہ فضیلت حاصل نہ ہوگی بلکہ پیدائش سے لیکر مسلسل بلوغت اور شادی تک مراد ہے شادی کے بعد چونکہ یہ ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے اس لئے باپ فارغ ہو جاتا ہے ہاں لازمی سلوک کے علاوہ درجہ استعجاب میں کچھ نہ کچھ خیال پھر بھی رکھنا چاہئے کہ گاہے بگاہے کچھ کپڑے یا پیسے وغیرہ بھیج دے یا جب وہ اپنے میکے آجائے تو ان کا حسب استطاعت خیال رکھے تاکہ ان کا دل نہ ٹوٹے۔ بعض لوگ بچیوں کا مہر لیکر خود ہڑپ کر جاتے ہیں اور بچیوں کو فروخت کئے ہوئے مال کی طرح بھول جاتے ہیں یہ ظلم ہے اور سراسر نا انصافی قطع رحمی ہے اس سے بچنا لازمی ہے۔

پھر جنت میں داخل ہونے میں معیت کا مطلب اتصال ہے یعنی جنت کا دروازہ تو اگرچہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھولا جائے گا تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دوسرے لوگ حائل و رکاوٹ نہیں بنیں گے جیسے صدیقین اور علماء ہیں تو یہ شخص بھی صدیقین اور علماء کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ داخل ہوگا تو جس طرح خاص خادم اپنے مخدوم کے ساتھ قریب قریب رہتا ہے اسی طرح یہ شخص بھی ہوگا گو خادم اور مخدوم میں اتصال کے باوجود بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ فضیلت خاصیات المفردات میں سے ہے۔ (تذکرہ تدبر)

باب ماجاء فی رحمة الیتیم و کفالتہ

”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من قبض یتیمًا من بین المسلمین الی طعامہ و شرابہ ادخلہ اللہ الجنة الا ان یعمل ذنبًا لا یغفر“۔ (تفرد الترمذی بتحریرہ) ^۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمانوں میں سے کسی یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شامل کرے تو اللہ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائیں گے الا یہ کہ وہ ایسا گناہ کرے جس کی بخشش نہ ہوتی ہو۔ یعنی کفر و شرک

لغات:- ”من قبض“ قبض کے معنی ہاتھ میں لینے اور قبضے میں لینے کے آتے ہیں یہاں مراد ٹھکانہ دینا ہے۔ قولہ ”یتیم“ یتیم جمع، یتیم، باب ضرب سے تیار ہ جانے کے آتا ہے اصطلاح میں وہ نابالغ بچہ جس کا باپ مر جائے گو یا وہ بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے تنہا ہوتا ہے۔ قولہ ”من بین المسلمین“ قبض کے ساتھ متعلق ہے۔ قولہ ”الی طعامہ و شرابہ“ یتیم کو اپنا کھانا کھانا مراد ہے خواہ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھائیں یا الگ الگ گو پہلی صورت افضل ہے۔ قولہ ”الجنة“ بتانہ بمعنی قطعاً و یقیناً کے آتا ہے ہمزہ قطعی ہے لہذا درج کلام میں سابقہ نہیں ہوتا۔

تشریح:- سابقہ باب اور اس باب کی احادیث کا مضمون تقریباً ایک ہے کہ بچیوں اور یتیموں کی کفالت پر جنت ملتی ہے وجہ اشتراک یہ ہے کہ یہ دونوں کمزور مخلوق ہیں، لڑکیاں عموماً احساس کتری میں مبتلا ہوتی ہیں جبکہ یتیم بچے احساس محرومی کا شکار ہوتے ہیں پس جو شخص ان کو سہارا دے گا اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کو عجز و محرومی کی آگ سے نکال باہر کر دے کیونکہ محروم آدمی اپنی محرومی کی وجہ سے ہر وقت تڑپا رہتا ہے۔ دوسری جانب یہ اصول ہے کہ اخروی مکافات آدمی کے عمل کے مطابق ہوتی ہے تو جس طرح لڑکیوں اور یتیم کے کفیل نے ان کو محرومی کی ہٹھی سے نکال دیا یا اسی طرح اللہ عز و جل اس کو قیامت کے دن جنت کی محرومی سے محفوظ اور جہنم کی آگ سے مامون بنا کر جنت میں داخل فرمائے گا۔

باب ماجاء فی رحمة الیتیم و کفالتہ

۱۔ ایضاً رواہ الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۱۱۵۴۴۔ ۲۔ عن مسلم قبض یتیمًا من مسلمین الی طعامہ و شرابہ الا ادخل الجنة الا ان یعمل ذنبًا لا یغفر الخ مجمع الزوائد ص: ۲۰۹ ج: ۸۔ حدیث: ۱۳۵۳۵۔

تاہم اس قسم کے فضائل میں یہ ضابطہ ذہن میں رہے کہ یہ خاصیات مفرد ہوتے ہیں جن کے بارے میں پہلے بار باعرض کیا جا چکا ہے کہ یہ فضیلت اس فعل کی ہوتی ہے لیکن اگر اس کے ساتھ مخالف عمل مخلوط ہوگا تو اس کی قوت کے مطابق اس عمل کی تاثیر کم یا ختم ہوگی اس لئے حدیث باب کے اخیر میں فرمایا "الا ان يعمل ذنباً لا یفسر" لہذا اگر اس سے مراد شرک ہو تو پھر تو سارے نیک اعمال راہیگاں چلے گئے۔ اور ذنب سے مراد اگر مادون الشریک گناہ ہوں جیسے حقوق العباد تو پھر کفالت یتیم پر یہ فضیلت زیادہ مؤثر نہ ہوگی بلکہ حقوق کا حساب پہلے دینا پڑے گا الا یہ کہ صاحب حق معاف کر دے۔

دوسری حدیث :- حضرت اہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دونوں کی طرح ہوں گے اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں سے اشارہ فرمایا یعنی سبابہ (اشارہ کی انگلی) اور درمیانی سے۔ "قوله" "کافلی" کفالت کرنے والا یعنی مربی اور پرورش کرنے والا۔

تشریح :- یتیم کی کفالت سے مراد اس کی پرورش ہے جس میں ہر زمانے کے عرف کے مطابق معروف اشیاء داخل ہیں مع ہذا چونکہ وہ شفقت پدری سے محروم ہوتا ہے تو اس پر شفقت کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ علی ہذا اگر کوئی شخص یتیم کو گھر میں جگہ تو دیتا ہے اور اسے کھلا پلاتا بھی ہے مگر اس سے غیر معمولی خدمت لیتا ہے یا اس سے کواکراسی کی کمائی میں سے اس کو دیتا ہے تو یہ للہیت نہ ہوئی بلکہ ذاتی مفادات ہیں، ہاں اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ یتیم سے بالکل خدمت نہ لے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنے بچوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے اسی طرح یا اس کے قریب قریب سلوک اس سے کرے گو قلبی محبت میں فرق ناگزیر ہے، غرض کفیل، یتیم کے لئے بمنزلہ باپ بن جائے تو وہ اس فضیلت کو حاصل کر لے گا۔

پھر جنت میں معیت ظاہری سے من کل الوجود مساوات لازم نہیں آتی بلکہ باوجود اس معیت کے معنوی و باطنی تفاوت رہے گا جیسے ایک ہی دفتر میں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں مگر ان کے گریڈز اور مناصب و عہدوں میں فرق ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ آخرت کے مراتب چونکہ ایمان و عرفان و عمل کے تفاوت پر مبنی ہوتے ہیں، تو جس طرح ایک بڑے اور چھوٹے عالم میں ظاہری کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لیکن باطن میں

بڑا فرق ہوتا ہے اسی طرح جنتیوں کے باطنی کیفیات و احوال و مقامات بھی مختلف ہوں گے (تدبر و تشکر) بلاشبہ اعمال میں یہ بڑی خوشخبری ہے کہ یتیم کا مربی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں بھی معیت کی نعمت حاصل کرے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں وہ شخص ہوں جس کے لئے جنت کا دروازہ سب سے پہلے کھولا جائے گا، میں ایک عورت کو دیکھوں گا جو مجھ سے آگے جانے کی کوشش کرے گی میں اس سے پوچھوں گا تو کون ہے؟ وہ کہے گی میں نے اپنے یتیموں کی پرورش کی تھی۔ (اخرجہ ابو یعلیٰ وقال ردائہ لابائس ہم۔ کذا فی التحدی الاخوانی)

باب ماجاء فی رحمة الصبيان

”عن زبیری قال سمعت انس بن مالك يقول جاء شيخ يريد النبي صلى الله عليه وسلم فأعطاه الغنوم عنه ان يوسعوا له فقال النبي صلى الله عليه وسلم ليس منامن لم يرحم صغيرنا ولم يُوقر كبيرنا“۔

حضرت زبیری فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا ہے کہ ایک بزرگ شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو حاضرین نے ان کو جگہ دینے میں دیر کی پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے۔

تشریح: بقولہ ”لیس منامن“ الخ جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ہمارے طور و طریقے پر نہیں۔ یا ہمارے کامل دین پر نہیں کیونکہ جب کوئی آدمی آداب زندگی کا خیال نہیں رکھتا تو وہ کامل مؤمن کیسے ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ امام ترمذی نے اس باب کے اخیر میں نقل کیا ہے۔ تاہم امام سفیان اس تفسیر کو پسند نہیں فرماتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اسے ظاہر پر چھوڑنا چاہئے تاکہ زیادہ مؤثر ثابت ہو یعنی عوام کے سامنے ایسی روایات میں تاویل کرنے سے ان کی نظر میں اہمیت ختم یا کم ہو جاتی ہے کہ وہ یہ سوچیں گے کہ ہم تو ویسے بھی کامل نہیں لہذا اس پر عمل نہ کرنے سے کیا نقصان ہوگا۔

ع رواہ ابو یعلیٰ واسنادہ حسن ان شاء اللہ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۶ ج: ۳ وقال العلامة الهیثمی: رواہ ابو یعلیٰ ولیہ عبدالسلام بن عجلان وثقہ ابو حاتم وابن حبان وقال یحییٰ وہ مخالف بقیہ رجال ثقات۔ مجمع الزوائد ص: ۲۰۸ ج: حدیث: ۱۳۵۱۹ کتاب البر والصلة۔

پھر سفیان سے مراد ثوری ہے یا ابن عیینہ تو دونوں قول ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے اس لئے کامل مؤمن وہی ہوتا ہے جو اپنی پوری زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے مطابق بنائے۔ دوسری طرف اسلام میں اخلاق و آداب کا بھرپور خیال رکھنا اور باری تعالیٰ کے اخلاق سے متعلق ہونا انسانی زندگی کا نقطہ عروج ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ بلکہ ہر مخلوق کے ساتھ اس کی شان اور حیثیت کے مطابق سلوک کیا جائے لہذا معاشرے میں جو لوگ کمزور ہوں تو وہ قابل رحم ہیں ان پر شفقت کی جائے۔ اور جو لوگ قابل قدر ہیں تو ان کی عزت افزائی کی جائے۔ پس جو شخص ایسا نہیں کرے گا وہ اس اصول کو پامال کرنے کی وجہ سے کامل مؤمن نہیں بن سکتا۔

لہذا کامل مؤمن بننے کے لئے ضروری ہے کہ بچوں پر رحم کیا جائے کہ وہ کمزور اور محتاج ہوتے ہیں جبکہ اپنے سے عمر میں یا فضل و علم میں بڑے کی قدر کی جائے۔

تیسری حدیث :- باب کی تیسری حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی ضابطہ پایا جاتا ہے۔ پس جو شخص نیکی و بھلائی کا حکم نہیں دیتا اور بُرائی سے نہیں روکتا وہ بھی اس وعید میں شامل ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس کی ذمہ داری ہے؟ تو صاحب ہدایہ نے جلد سوم کے آخری صفحہ پر ایک مسئلہ کے ضمن میں امام صاحب سے نقل کیا ہے کہ ہاتھ سے روکنا حکومت کا کام ہے کہ اسے قدرت حاصل ہے۔ عام لوگ گو یا فقط زبانی تنقید کے مجاز ہیں ہاتھ سے تنفیذ ان کی ذمہ داری نہیں ”والامر بالمعروف بالبدالی الامراء لقد رتہم، وباللسان الی غیرہم“ مگر جس مسئلے کے ضمن میں یہ قول ذکر کیا گیا ہے یعنی ”ومن کسر المسلم بربطاً“ الخ۔ اس میں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں ”وفیل الفتوی فی الضمان علی قولہما“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف جس طرح زبانی طور سے لازمی اور ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح ہاتھ سے روکنا بھی سب کے لئے ہے اور یہی رائج ہے۔ حضرت شاہ صاحب بھی العرف الشذی میں فرماتے ہیں ”ولا یستخص الامر والنہی بالامام بل لیکل واحد من المسلمین“ الخ۔ البتہ حضرت شاہ صاحب نے فرق کیا ہے کہ اگر ایک آدمی گناہ کرتا ہوا ملے تو اسے روکنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اسے ڈانٹے اور مار بگائے مگر گناہ سے فراغت کے بعد تعزیر دینے کا حق صرف حکومت کی ذمہ داری ہے۔

باب ماجاء فی رحمة الناس

”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لم يرحم الناس لا يرحمه الله“۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا۔

تشریح:۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ انسان کے اعلیٰ مقاصد میں سے سب سے اعلیٰ، اخلاق ربانی سے متعلق ہوتا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات میں سے ایک رحم بھی ہے اس لئے جو شخص اس وصف سے محروم ہو گا وہ مکافات عمل کی بنیاد پر اللہ کی رحمت سے محروم کر دیا جائے گا، جبکہ ترس کھانے والا شخص اللہ کے رحم و کرم کے زیر سایہ رہتا ہے۔ پھر طبرانی کی روایت میں ہے ”من لا یرحم من فی الارض لا یرحمہ من فی السماء“۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حکم اور معاملہ صرف انسانوں کے لئے مختص نہیں بلکہ ہر ترس جگر والے کے ساتھ ہونا چاہئے، گویا ان اشیاء کو سرکاری مال سمجھ کر ان کی حفاظت کو اپنا فرض بنانا چاہئے۔ چنانچہ ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے دوزخ میں چلی گئی جس نے اسے باندھ لیا تھا نہ تو اسے کھلاتی پلاتی تھی اور نہ ہی اسے کھول کر آزاد چھوڑتی تاکہ وہ خود کھائے۔ جبکہ ایک بدکردار عورت پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے جنتی بن گئی۔ یہ دونوں روایتیں بخاری شریف میں ہیں۔

پھر ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ رحم میں سے یہ بھی ہے کہ اگر آپ پر کسی کا حق ہے تو اسے ادا کریں اور آپ کا حق دوسروں پر ہو تو اسے معاف (یا کم) کو دیں۔ پھر محشی نے رحمت کی نفی کامل کے ساتھ متعید کی ہے جو خاص قسم ہے۔

ہمارے یہاں پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں آج صورت حال یہ ہے کہ لوگ اپنے حقوق کی وصولی کے لئے تو لڑنا جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں مگر دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھا جاتا یہ تاثر نہ صرف

باب ماجاء فی رحمة الناس

۱۔ طبرانی کبیر حدیث: ۲۵۰۴ مجمع الزوائد ص: ۲۴۲ ج: ۱ کتاب البر والصلۃ ولفظہ ارحم من فی الارض یرحمک

من فی السماء، ایضاً رواہ الطبرانی بلفظہ ہامدا جید بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۱۳۰ ج: ۳.

۲۔ رواہ البخاری ص: ۳۱۸ ج: ۱ ”باب فی فضل مقلی الماء“ کتاب المساقاۃ.

۳۔ صحیح بخاری ص: ۳۹۵ ج: ۱ کتاب الاکیاء، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۱۳۷ ج: ۳.

یہ کہ غلط ہے بلکہ حدیث باب کے بموجب خدائے تعالیٰ کی رحمت سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر آپ اس کے اثرات دیکھنا چاہتے ہیں تو حالات و واقعات کے تسلسل میں غور کریں۔

دوسری حدیث :- شعبہ کہہ رہے ہیں کہ منصور نے یہ حدیث مجھے خط کی صورت میں بھیج دی تھی پھر جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے زبانی بھی پڑھا دی ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رحمت بد بخت انسان ہی سے سلب کی جاتی ہے۔

لغات :- قولہ ”لانزع“ بصیغہ مجہول نزع کے معنی اُتارنے، سلب کرنے اور نکالنے کے ہیں۔ چونکہ قلب کی نرمی عند اللہ مطلوب ہے بلکہ قلب کی تخلیق اور جبلت ہی نرمی کے ساتھ ہوئی ہے مگر جو شخص اسے بروئے کار نہیں لاتا تو وہ قلب قاسی اور سخت ہو جاتا ہے اور قسوت قلب بد بختی کی علامت ہے، قساوت قلبی کے اسباب میں سے اہم سبب معاصی میں انہماک ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز بد بختی کی بنا پر ہوتی ہے، قساوت قلبی، اس کے اسباب اور علاج کی تفصیل مطلوب ہو تو راقم کی کتاب (نقش قدم، فصل نمبر: ۱۴) میں ملاحظہ ہو۔

تیسری حدیث :- رحم کرنے والوں پر رحمن رحم فرماتے ہیں تم زمین والوں پر رحم کرو سو آسمان والے تم پر رحم کریں گے۔

لغات :- رحم، رحمن کی طرف سے ابھی ہوئی شاخ (کی مانند) ہے جو شخص اسے جوڑے گا اللہ بھی اسے جوڑے گا اور جو شخص اسے توڑے گا اللہ بھی اسے توڑے گا۔ قولہ ”ارحموا من فی الارض“ مراد اگرچہ عالم سفلی اور زمینی سب جاہدار ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تاہم ذوی العقول کو تغلیب دے کر لفظ ”من“ لایا گیا۔ قولہ ”من فی السماء“ مراد اللہ تعالیٰ ہے اور آسمان کی طرف نسبت تعظیماً ہے نہ کہ بطور طرف و مکان۔ یا مرد فرشتے ہیں کیونکہ جب اللہ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو اعلان ہوتا ہے کہ فلاں شخص سے میں محبت کرتا ہوں فرشتوں تم بھی اس سے محبت کرو پھر حضرت جبریل علیہ السلام یہ اعلان فرماتے ہیں حتیٰ کہ سب سے نچلے آسمان والے فرشتے دنیا والوں میں یہ اعلان کرتے ہیں اس کی مزید تفصیل اور بہترین تحقیق کے لئے حجۃ اللہ البالغہ لشاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا مطالعہ مفید ہے۔ قولہ ”شحنہ“ شین کی تینوں حرکات یعنی زیر، زیر اور پیش جائز ہیں مگر کسرہ

ح. ایضاً أخرجه ابو داؤد کتاب الادب باب: ۵۸ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۱۳۲ ج: ۳ قال، رواہ ابو داؤد واللفظ لہ الترمدی وابن حبان فی صحیحہ وقال الترمذی حدیث حسن وفي بعض النسخ حسن صحيح.
ح. أخرجه ابو داؤد فی الادب باب: ۵۸ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۱۳۰ ج: ۳.

اوٹی ہے جیم ساکن ہے گھنی ٹہنی، ابھی ہوئی شاخ اور گھنے درخت کو کہتے ہیں۔ بعض نے ابھی ہوئی جڑوں پر بھی اطلاق کیا ہے اس میں اقارب کے میل ملاپ کی طرف اشارہ ہے۔ قولہ ”من الرحمن“ یعنی اللہ کی طرف سے اس میں شفقت و دیانت کی گئی ہے جس کی بناء پر ذی الارحام ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ دیکھئے ماں کس طرح اپنے بچے سے پیار کرتی ہے یہ اسی محبت مودعہ کا اثر تو ہے، اس کی کچھ تفصیل پہلے مذکور جگی ہے فائدہ د۔

باب ماجاء فی النصیحة

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الدین النصیحة ثلاث مبرار قالوا: یا رسول اللہ لیمن؟ قال: یلہ ولکتابہ ولائمة المسلمین وعامتہم“۔^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا کہ خیر خواہی کرنا دین کا خلاصہ ہے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول کس کی؟ فرمایا اللہ کی، اس کی کتاب کی، ائمہ مسلمین کی اور سب مسلمانوں کی، یہ روایت مسلم شریف میں تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں دو کتابہ کے بعد در رسولہ کا بھی ذکر ہے۔^۲

لغات:- قولہ ”الدین“ سید شریف التعلیقات میں لکھتے ہیں کہ دین اور ملت دونوں متحد بالذات اور مختلف بالاعتبار ہیں کہ شریعت کو جب اس حیثیت سے ملحوظ کیا جائے کہ اس کی اطاعت ہوتی ہے تو وہ دین ہے اور اس حیثیت سے کہ اسے لکھا اور جمع کیا جاتا ہے ملت کہلاتی ہے۔ خیالی نے بھی یہی بات کی ہے گویا کہ ملت الملاء سے ہے، جبکہ اس حیثیت سے کہ اس سے رجوع ہوتا ہے مذہب کہلاتا ہے وقیل ”الفرق بین الدین والملة والمذہب ان الدین منسوب الی اللہ تعالیٰ والملة منسوبة الی الرسول والمذہب منسوب الی

باب ماجاء فی النصیحة

۱۔ رواہ مسلم ص: ۵۳ ج: ۱ ”باب بیان ان الدین نصیحة“ کتاب الایمان و ابو داؤد ص: ۳۲۸ ج: ۲ ”باب فی النصیحة“ کتاب الادب، ایضاً رواہ النسائی فی البیعة باب النصیحة للامام، و رواہ البزار عن ابن عمر و رجالہ رجال الصحیح، بحوالہ سنن داؤمی ص: ۳۰۲ ج: ۲ حدیث: ۲۷۵۳۔

۲۔ صحیح مسلم ص: ۵۳ ج: ۱ کتاب الایمان، حفیظ الرحمن عفی عنہ نلوۃ العلم کراچی

قولہ "النصيحة" نصيح الشيء نصحاً کسی چیز کا خالص ہونا جو غیر کی ملاوٹ و آمیزش سے خالی ہے گویا یہ غش اور کھوٹ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کا اردو ترجمہ خیر خواہی سے کرنا گویا لازم المعنی ہے کیونکہ جب دل ہر قسم کے حسد اور دیگر امراض سے خالی ہوگا اور کسی کے ساتھ برتاؤ اور سلوک جھلسازی و خود غرضی سے خالی ہوگا تو وہ دل اور سلوک خالص ہوگا جس کو اردو میں خیر خواہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جامع کلمہ و جملہ میں دین کا مفہوم سمجھا دیا کہ بندہ اپنے اور خدا کے مابین کوئی کھوٹے کا معاملہ نہ رکھے۔ اسی طرح اس کی کتاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ائمہ اور سب اہل ایمان کے ساتھ اپنا معاملہ باطن و ظاہر میں صاف رکھنا ہی دین کا لب لباب ہے۔

پس اللہ کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات و صفات کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھے، اس کی عبادت میں نیت خالص رکھے اور اس کے احکام پر عمل اور نواہی سے اجتناب کرے۔ کتاب اللہ کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تصدیق کرے، اس پر عمل کرے، اس کی تلاوت اور نشر و اشاعت میں پوری مستعدی کا اظہار کرے، اس کے متعلق غلط تاویلات، تحریفات اور اقوال مبتدعہ کی مدلل نفی کرے۔ اللہ کے رسول کی نصیحت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نبوت پر ایمان لائے، ان کی تعظیم و توقیر کرے، ان کے لائے ہوئے دین کو من و عن مانا جائے، اس کے آگے سر تسلیم خم کرے، ان کے لائے ہوئے دین کی مدد کرے اور دشمنان دین کا مقدور بھر مقابلہ کرے اور مع ہذا سے پھیلانے کی کوشش کرے۔ ائمہ المسلمین کی نصیحت یہ ہے کہ بلا وجہ ان کی مخالفت نہ کی جائے اگر ان کو جائز طریقے سے نصرت کی ضرورت ہو تو خود کو پیش کرے اور اگر وہ ظلم کریں تو اس پر صبر کر کے لوگوں کو ان کی مخالفت پر نہ اکسائے، افسوس ہے آج کل مسلمانوں کی حالت زار کو الفاظ میں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر ایک طرف حکمرانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ راتوں رات اپنے ہم وطنوں کے ایمان کا سودا کر لیں گے جبکہ دوسری طرف جو لوگ ان کے خلاف سرکوں پر مظاہرے کرتے رہتے ہیں ان کا ساتھ دینا ایک طرف اس حدیث کے ظاہر کے خلاف ہے اور دوسری جانب ایسے مظاہروں کے قائدین اکثر یہ کام کسی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کم ہی کرتے ہیں، اس لئے صحیح و سقیم کے درمیان فرق ناممکن ہو گیا ہے یہ صورت حال دینی اندھا دھند ہے جس کے بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اور فیصلہ مشکل ہے۔

عام مسلمانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی صحیح راہ نمائی کی جائے ان کو اپنے اور حتی الامکان دوسروں

کے شر سے بچانے کی کوشش کی جائے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے، مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش قدم کامل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (نقش قدم فصل نمبر: ۱۰ ص: ۱۹۱)

دوسری حدیث:- حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اس پر کہ نماز قائم کروں گا، زکوٰۃ دوں گا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا۔ چونکہ نماز عبادات بدنی کی اصل و بنیاد ہے اور زکوٰۃ مالی عبادات کی، اس لئے ان دو کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ اس بیعت پر قائم رہے جس کی آسان دلیل یہ ہے کہ صاحب تحفہ نے امام طبرانی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے غلام سے گھوڑا خریدنے کے لئے کہا تو اس نے تین سو کا خرید کر ان کی خدمت میں مالک یعنی بائع سمیت پیش کیا تا کہ پیسے وصول کر لے حضرت جریرؓ نے گھوڑا دیکھ کر فرمایا یہ تین سو سے زیادہ کا ہے بائع نے کہا چار سو میں لیں گے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ کا ہے اس نے کہا پانچ سو؟ حضرت جریرؓ نے فرمایا نہیں اس سے بھی زیادہ کا ہے غرض اس کو آٹھ سو کا خرید اور فرمایا ”انسی بایعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) علی النصح لكل مسلم“۔

باب ماجاء فی شفقة المسلم علی المسلم

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:- المسلم اخو المسلم لا یخونہ ولا ینکذبہ ولا یخذلہ، کل المسلم علی المسلم حرام عرضه وماله ودمه التقویٰ ہنأ بحسب امرء من الشرائح یحتقر آخاہ المسلم“۔ (حسن غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے نہ تو وہ اس کے ساتھ خیانت کرتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اس کو دسوا کرتا ہے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی عزت لینا اور اس کا مال و خون حرام ہے تقویٰ یہاں (دل میں) ہوتا ہے آدمی کے بُرا ہونے کے لئے اتنی بات بھی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی توہین کرے۔

لغات:- فقولہ ”لا یخونہ“ خیانت سے ہے فقولہ ”ولا یخذلہ“ خذلان سے ہے خدا ہونے اور بے یار و مددگار چھوڑنے کو کہتے ہیں چونکہ مدد نہ کرنے سے وہ عموماً دسوا ہوا جاتا ہے اس لئے ترجمہ لازم بالمعنی سے

کیا گیا۔ قولہ ”بِعَرْضہ“ بکسر العین وسکون الراء اس کے کئی معانی ہیں یہاں بمعنی عزت کے ہے۔ قولہ ”التقویٰ ہہنا“ مسلم شریف^۱ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے مبارک کی طرف اشارہ کیا یعنی تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ قولہ ”بحسب امری“ بازائدہ ہے یہ مبتدا ہے اور ”ان یحقر“ الخ اس کی خبر ہے۔

تشریح: اس حدیث پاک میں مسلمانوں کی باہمی معاشرت کا اصول بتلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں بھائیوں کی طرح رہنا چاہئے۔ لہذا ”لا یسخونہ“ الخ خبر بمعنی انشاء ہے یعنی نفی بمعنی نفی کہ ان کو ایک دوسرے سے خیانت نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی دوسرے سے جھوٹ بولنا چاہئے اور اگر کسی مسلمان بھائی کو اس کی مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مدد کرنی چاہئے اسے بغیر مدد کے بے آسرا نہیں چھوڑنا چاہئے، اس کی عزت اور مال و جان کو قابل حرمت بلکہ واجب الاحترام سمجھیں اس لئے کہ اس کی آبروریزی حرام ہے اور جان و مال کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اور چونکہ تقویٰ تو دل میں ہوتا ہے لہذا کسی کو ظاہری عمل کی وجہ سے حقیر و معمولی نہ سمجھا جائے کیا معلوم شاید اس کا باطن اس کے باطن سے اچھا ہو یا اس کا خاتمہ اس سے اچھا ہو۔ یا مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں تقویٰ ہو وہ ان اصولوں پر چلے گا وہ اپنے مسلمان بھائی سے خیانت والا معاملہ نہیں کرے گا خواہ اس کی ذات سے متعلق ہو یا اس کے مال اور اہل و عیال وغیرہ سے، خاص کر رشتہ دار اور پڑوسی سے، پھر خیانت عام ہے باتوں کی خیانت بھی مال میں ملاوٹ کی طرح اور حق تلفی کی مانند ہے، اسی طرح متقی آدمی مسلمان بھائی کی ہر طرح ممکن جائز مدد کے لئے ہمد وقت تیار رہتا ہے وہ اپنے اسلامی بھائی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا ہے اور نہ ہی اس کی حقیر و توہین کرتا ہے اور جو شخص ایسا کرے گا تو یہ اس کی بُرائی کے لئے کافی ہے یعنی اگر وہ اس کے علاوہ دوسری بُرائیاں نہ بھی کرے تو مذکورہ بُرائی اس کی ہلاکت کے لئے کافی ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ بظاہر بہت نیک ہو اور اعمال صالحہ پر کار بند ہو مگر مذکورہ بالا خامیوں کی وجہ سے وہ آدمی بُرا ہی ہے وہ شریعت کی نظر میں اچھا نہیں ہے۔

اس حدیث شریف کا مضمون انتہائی اہم و دل پر مشتمل ہے اس کے اپنانے سے آدمی کامرانی سے ہمکنار ہو سکتا ہے جبکہ اس کو نظر انداز کرنے سے آدمی خسران کی وادی میں ہلاکت سے دو چار ہو سکتا ہے۔ آج ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں کہ نقلی عبادات کے تو سخت پابند ہوتے ہیں اور اپنے طور سے تقویٰ کا ایک معیار

مقرر کر کے اس پر سختی سے عمل کرتے رہتے ہیں لیکن وہ امام ائمہتین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اصول ضروری نہیں سمجھتے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کے معیار کے طور پر بیان فرمایا ہے ایسے خود ساختہ تقویٰ پر چلنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے وضع کردہ تقویٰ پر چلنے سے کچھ بھی اخروی کامیابی حاصل نہ ہوگی اگر آخرت کی کامیابی چاہئے تو امام ائمہتین صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ تقویٰ کو ہی اپنانا پڑے گا۔

دیکھئے امام ترمذی نے اس حدیث سے کس طرح بہترین عنوان اخذ کیا ہے ”شفقة المسلم علی المسلم“ آپ مسلمانوں پر شفقت کیجئے اللہ آپ پر شفقت فرمائیں گے۔

دوسری حدیث:- ”عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

المؤمن للمؤمن کالبیان بشد بعضہ ببعضاً“۔ (صحیح)

یعنی جس طرح عمارت کی چٹائی کے لئے ایک دوسرے کا بہار لازمی ہے کہ جب ایک بلاک کا کچھ حصہ ایک بلاک پر آ جائے اور کچھ دوسرے پر اس طرح کی دیوار مضبوط ہوتی ہے بمقابلہ اس دیوار کے جس کے بلاک الگ الگ کھڑے کر دیئے گئے ہوں کیونکہ ایسی دیوار کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح ایک دیوار کو جب دوسری سے ملایا جاتا ہے تو دونوں مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہیں، ہو بہو اسی طرح حال مسلمانوں کا ہے اگر وہ ایک دوسرے کی پشت پناہی کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ دشمن کا فریب ان کو کمزور بنا دے کیونکہ ان کی طاقت اتنی مستحکم ہوگی جو معمولی دار سے بلکہ طاقت ور دار سے بھی کمزور نہیں ہو سکے گی۔

تیسری حدیث:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے بے شک تم میں سے ایک اپنے بھائی کے لئے آئینہ (کی مانند) ہے پس اگر اس میں کوئی عیب نظر آئے تو اسے ہٹا دے۔ یہ حدیث ضعیف ہے مگر مضمون اس کا صحیح ہے۔

لغات:- قولہ ”میراۃ“ بکسر المیم و مد الہمزہ آئینے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”آذی“ آذیہ سے بمعنی گند کے آتا ہے اور آذیاء سے بمعنی تکلیف کے۔ اگر یہاں پہلا معنی لیا جائے تو پھر مطلب عیب ہے۔ قولہ ”فلیمطہ“ ماطت بمعنی ازالہ کے ہے یعنی اسے زائل کر دے۔

مختصر تشریح:- اس حدیث کا ایک مطلب یہ ہے کہ چونکہ آدمی کو عموماً اپنے عیوب نظر نہیں آتے ہیں اس لئے آدمی اپنا علاج خود نہیں کر سکتا کیونکہ علاج تو تشخیص کے بعد ہی ہوتا ہے لہذا جس طرح آدمی کو اپنے چہرے کے داغ دھبے وغیرہ کسی آئینہ میں ہی نظر آتے ہیں اس لئے ہر مسلمان دوسرے کے لئے آئینے کا کام

دے، لہذا دوسرا شخص اس کو آگاہ کرے کہ تیرے اندر یہ عیب ہے اور چونکہ آئینہ ہیرے کا عیب پکار کر نہیں بتلاتا بلکہ صرف دکھاتا ہے لہذا کسی کو عیب بتلانا ہو تو آئینے کی طرح چپکے سے بتا دے، پھر معیوب انسان اپنا عیب آئینے میں دیکھ کر آئینہ نہیں توڑتا بلکہ اپنی اصلاح کرتا ہے تو اسی طرح اس کو عیب بتانے والے کے پیچھے نہیں لگنا چاہئے بلکہ اپنی صفائی ستھرائی میں لگنا چاہئے۔

آج کل مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کو اس کا عیب بتایا جائے تو وہ دشمنی پر اتر آتا ہے اس لئے بتلانے میں کمال ہوشیاری سے کام لینا چاہئے خاص کر جبکہ یہ حدیث ضعیف بھی ہے، اس لئے بتلانے کو درود و ضروری نہ سمجھا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف یہ تھا کہ اگر کسی میں عیب دیکھتے تو عام ارشاد فرماتے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں مثلاً جس سے وہ آدمی خود بخود سمجھ جاتا۔ پھر علماء نے نصیحت کے آداب میں سے یہ بھی لکھا ہے کہ واعظ جمیع شکم کا صیغہ استعمال کرے مثلاً آج کل ہم لوگ بہت کمزور ہو گئے ہیں ہمارے اندر تقویٰ کا عالم یہ ہے کہ ایک آدمی راستہ میں بیٹھ کر پیشاب کرتا ہے اور ہم اس کو معیوب بھی نہیں سمجھتے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا مطلب اس حدیث کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی کو دوسرے کے اندر عیب نظر آجائے تو اس سے اپنی حالت کو ملاحظہ کرے کہ کہیں میرے اندر تو یہ خامی نہیں تو اگر اس کے اندر ہوگی اور دوسرے کے اندر اسے وہ خامی بُری محسوس ہوئی تھی تو وہ اپنے سے اس کا ازالہ کرے گا جیسے آئینہ میں اپنے عکس پر داغ دھبہ نظر آجائیں تو آدمی آئینہ نہیں دھوتا بلکہ اپنا منہ دھوتا ہے۔ یہ دونوں تو جیہات محشی نے بیان کئے ہیں اور اول کو ظاہر قرار دیا ہے۔

باب ما جاء فی الستر علی المسلمین

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من نفس عن مسلم کربةً من کربةٍ الدنیا نفس اللہ عنه کربة من کربة یوم القیمة ومن ستر علی معسر فی الدنیا یستر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ ومن ستر علی مسلم فی الدنیا ستر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دنیا کے مصائب میں سے کوئی معمولی سی مصیبت بھی کسی مسلمان سے دور کر دے تو اللہ قیامت کے دن مصائب میں سے

بڑی مصیبت اس سے دور فرمائیں گے، اور جو شخص کسی تنگ دست کو دنیا میں سہولت دے تو اللہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کے لئے آسانی فرمائیں گے، اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے، اور اللہ بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

لغات:۔ قولہ ”تَفْسٌ“ تنفیس سے بمعنی دور کرنے اور زائل کرنے کے ہیں۔ قولہ ”مَكْرَبٌ“ مضمر الکاف واسکان الراء جبکہ ”کرب“ بضم الکاف وفتح الراء ہے پہلا لفظ مفرد ہے اور دوسرا جمع کربۃ یہاں دوسرے استعمال ہوا ہے۔ اول میں تنوین تنکیر و تحقیر کے لئے ہے جبکہ دوم میں تعظیم کے لئے۔ علیٰ ہذا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی کوئی بھی مصیبت و پریشانی دور کرے یا چھوٹی سی مصیبت دور کرے تو اللہ قیامت کے دن اس کی بڑی مصیبت دور فرمائیں گے۔ کربۃ ہر پریشانی و رنج کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ستر“ پردہ ڈالنا یہاں مراد عیب چھپانے کے معنی میں ہے۔ بعض نے کبڑے دینے کا مطلب بھی لیا ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث ابواب الحدود میں بھی گزری ہے وہاں امام ترمذیؒ نے اس طرح باب قائم فرمایا ہے ”باب ما جاء فی الستر علی المسلم“ یہاں اگرچہ ایک نسخہ کے مطابق جمع کا صیغہ ہے مگر ایک نسخہ ”مسلم“ بصیغہ مفرد بھی مروی ہے جمع کا نسخہ زیادہ رائج ہے تاکہ تکرار نہ آئے۔

چونکہ جزا مثل عمل ہوتی ہے اس لئے آسانی کے بدلے آسانی اور پردہ پوشی کے بدلے پردہ پوشی کی جزا ملے گی، تاہم انسان جو بھی عمل کرتا ہے اس کی جزا اس عمل کے عوض سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جس کی اقل مقدار دس گنا ہے اور اللہ جس کے انعام میں مزید جتنا اضافہ کرنا چاہے تو یہ اس شخص اور اللہ کے درمیان خصوصی معاملہ ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو شخص عادی مجرم نہ ہو بلکہ کسی عارض کی بنا پر اس سے قصور ہو جائے تو اس کی ایسی حرکت جس پر سزا مقرر ہو خواہ حد ہو یا تعزیر کو نظر انداز کرنا یعنی گواہی سے گریز کرنا مستحب ہے بشرطیکہ اس سے کسی بندے کا حق متعلق نہ ہو حقوق العباد کی صورت میں ایسی گواہی دینی چاہئے کہ حد بھی نہ لگے اور صاحب حق کو اس کا حق بھی مل جائے مثلاً چوری کئے ہوئے مال کے بارے میں ”سرق“ کا لفظ استعمال نہ کرے بلکہ ”أَخَذَ“ کا لفظ بولے، جبکہ پیشہ ور چور اور عادی مجرم کا حکم پردہ پوشی نہیں ہے، کیونکہ اس سے معاشرہ بگڑ جاتا ہے اس لئے ایسے پیشہ ور مجرم کے بارے میں ہیئت اصلاح معاشرہ و اطلاع دینا ہی افضل ہے۔

یہ تو حقوق کے بارے میں ہے جہاں تک ذاتی عمل کا تعلق ہے تو اگر کسی میں عیب نظر آجائے خواہ اس کا تعلق فعل سے ہو یا اخلاق سے تو اس کا حکم سابقہ باب میں بیان ہوا ہے۔

قولہ "واللہ فی عون العبد" الخ اس سے معلوم ہوا کہ رفائی کاموں پر جزا صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی ملتی ہے چنانچہ اس کا فائدہ نفع بھی ملتا ہے خصوصاً اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک کا فائدہ تو بہت ہی نمایاں ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی الذب عن المسلم

"عن ابی الدرداء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رد عن عرض احیہ رد اللہ عن وجهہ الناریوم القیمة"۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا دفاع کرے اللہ قیامت کے روز اس کے چہرے سے جہنم کی آگ دور فرمائیں گے۔

لغات :- "الذب" زور سے بٹانے اور دور کرنے کو کہتے ہیں یہ لفظ گویا ذباب سے ہے جس کے معنی مکھی کے ہے گویا مکھی بٹانے کو کہتے ہیں گو کہ یہاں مطلق دفاع مراد ہے اور عموماً اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

قولہ "عرض" بکسرہ عین عزت و آبرو کو کہتے ہیں۔

تشریح :- چونکہ غیبت کرنے اور عیب جوئی کرنے والے شخص کی مثال مکھی کی طرح ہوتی ہے کہ جس طرح مکھی جسم کی اس جگہ پر ٹنٹختی ہے جہاں زخم اور گندگی موجود ہو، صاف جگہ پر نہیں ٹنٹختی اسی طرح غیبت کرنے والا شخص بھی دوسروں کے عیوب تلاش کر کے ان کو کریدتا رہتا ہے اور اس کی پیپ کو پوتا رہتا ہے اس لئے جو شخص اس کا دفاع کرتا ہے وہ گویا اپنے بھائی کے زخموں سے کھیاں اڑاتا ہے اور اس کے زخموں کو پھیلنے اور بدبودار ہونے نہیں دیتا۔

چونکہ عیب جوئی سے آدمی کی آبرو متاثر ہو جاتی ہے اور انسان کے جسم میں سب سے زیادہ آبرو والی جگہ اس کا چہرہ ہوتا ہے، اس لئے اس دفاع کے بدلے میں اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن اس کے چہرے یعنی ذات کی، آگ سے حفاظت فرمائیں گے کہ اس نے اپنے بھائی کے چہرے کو محفوظ رکھا تھا، پھر یہ دفاع غائبانہ زیادہ افضل ہے نسبت موجودگی کے پھر یہ حکم بہتان اور غیبت سب کو شامل ہے۔ اگر غیبت کرنے والا کوئی

اینا شخص ہے جو خود بھی بظاہر صاحب وجاہت ہے اور اس پر تکبر کرنا زور و مشکل ہو تو آدمی کو چاہئے کہ فوراً موضوعِ سخن کو دوسری طرف موڑ دے یا وہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الہجر للمسلم

"عن ابی ایوب الانصاری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یحل للمسلم ان یہجر احیاء فوق ثلاث یلتقیان فیصدھذا ویصدھذا وخیر ہما الذی یدأ بالسلام"۔^۱

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی مسلمان کے لئے روانہ نہیں کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے ترکِ تعلق و کلام کرے تین دن سے زیادہ (بائیں طور) کہ جب دونوں کی ملاقات (یعنی آنا سامنا) ہو تو یہ بھی اعراض کرے اور وہ بھی (ملنے سے) گریز کرے ان میں سے بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

لغات:- قولہ "الہجر" بکسر الہاء و سکون الحیم آپس میں بات چیت بند کرنے اور تعلق منقطع کرنے کو کہتے ہیں گویا بمعنی ترک کے تو ہے لیکن وطن چھوڑنا یہاں مراد نہیں بلکہ اپنے بھائی سے تعلقات چھوڑنا مراد ہے۔ قولہ "فیصد" صد بصد صد أو صدوداً باب نصر سے منہ پھیرنے اور روکنے دونوں معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں معنی اول یعنی منہ موڑنا مراد ہے جو بمعنی پہلو تہی کے ہے جبکہ صد بضم الصاد پہلو کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اگرچہ ہمارے یہاں نصوص میں مفہوم مخالف معتبر نہیں لہذا اصولی طور پر اس حدیث سے تین دن یا اس سے کم کے لئے قطعِ کلامی پر استدلال درست نہیں ہونا چاہئے۔ تاہم یہاں ایک دوسرا اصول بھی قابلِ ذکر و قابلِ اعتبار ہے وہ یہ ہے کہ انسان جو گناہ کرتا ہے مجموعی لحاظ سے ان کی دو قسمیں بنتی ہیں ایک حیوانی اور دوم شیطانی۔ حیوانی سے مراد وہ گناہ ہیں جو انسانی طبیعت کا تقاضا ہوتے ہیں جبکہ شیطانی گناہ وہ ہیں جو شیطان کے اکسانے پر معرضِ وجود میں لائے جاتے ہیں شیطانی گناہوں کا درجہ بمقابلہ حیوانی کے زیادہ شنیع و بدتر ہے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الہجر للمسلم

۱۔ أخرجه البخاری فی الادب باب: ۵۷ و ۶۲ والاستطان باب: ۹ ومسلم فی البر حدیث: ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲،

چونکہ انسان کے مزاج میں عام جانداروں کی طرح غضب و غصہ ودیعت کیا گیا ہے اس لئے طبعی طور پر ہر انسان کو ناگوار شے پر غصہ آتا ہے اور پھر کچھ دیر تک باقی رہتا ہے لیکن آدمی کو چاہئے کہ غصہ جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرے والا یہ کہ کسی جگہ غصہ مطلوب و ممدوح ہو جیسے جہاد میں دشمنوں کے خلاف لڑنا مطلوب شرعی ہے لیکن جہاں غصہ مذموم ہو وہاں غصے کو طول دینا حیوانی گناہ کے دائرے سے تجاوز کر کے شیطان کی گناہ کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

علیٰ ہذا اگر کسی کو اپنے بھائی پر غصہ آجائے تو شریعت نے اس کی رعایت کے طور پر زیادہ سے زیادہ تین دن تک اس کو قطع کلامی کی اجازت دی ہے اس سے زیادہ کی ہرگز اجازت نہیں، بلکہ زیادہ کی صورت میں ایسے لوگوں کے اعمال بھی قبول نہیں ہوتے جب تک کہ وہ تعلقات کو بحال نہ کریں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مذکورہ حکم ذاتی منادات اور دنیوی تعلقات کے بارے میں ہے اگر کوئی شخص دین کی خاطر یا کسی دینی مصلحت کے پیش نظر کسی سے قطع کلامی کرتا ہے تو وہ صورتیں مذکورہ وعیدات سے مستثنیٰ ہوں گی، مثلاً شوہر اپنی بیوی یا باپ اپنے بیٹے سے تادیبات چیت بند کرتے ہیں تو وہ ممنوع نہیں۔ اس طرح روایات میں کسی قسم کا تعارض نہیں رہتا کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کا اپنے صاحبزادے سے کلام بند کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہینے تک ازواج مطہرات سے قطع کلامی کرنا، غزوہ تبوک سے پیچھے رو جانے والے تین صحابہ کرامؓ سے پچاس دنوں تک متارکت اور حضرت عائشہؓ کی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے قطع کلامی یہ تمام صورتیں تادیب اور غیرت ایمانی پر محمول ہیں۔ علیٰ ہذا آج اگر ایک آدمی ایسا ہو جو علماء کے متعلق یا دین کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہو اور اسے روکنا مشکل ہو تو اس سے قطع کلامی جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو اس کے ساتھ مل بیٹھنے میں ایمان بھی خطرے سے دو چار ہو جاتا ہے، ہاں ہمدردی اور شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش جاری رکھی جائے اور کسی طرح اسے راہ راست لے آئے۔

پھر ان دو آدمیوں میں سے جو بھی اس جمود کو توڑ کر بات چیت میں پہل کرے گا اور عفو و درگزر کرے گا وہ بلاشبہ اچھا ہے جس کی اقل مقدار ابتداء بالسلام ہے۔ حدیث باب کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سلام کرے گا، وہ اس وعید سے محفوظ رہے گا، اور جب دوسرا سلام کا جواب دے گا تو وہ بھی گناہ و جہان سے بچ جائے گا گو کہ اس کا درجہ پہلے والے شخص سے کمتر ہوگا یعنی اسی بات چیت کے بارے میں۔ اسی طرح جو شخص ان میں سے منہ موڑے گا اور سلام بھی نہیں کرنا یا جواب بھی نہیں دینا تو وہ گویا شیطان کی منہی میں ہے اس کا باطن قابل

رم ہے اس کو اپنی اصلاح کی ضرورت معلوم ہوتی چاہئے۔

باب ماجاء فی مواساة الاخ

”عن انس قال لما قدم عبدالرحمن بن عوف المدينة اخى رسول الله صلى الله عليه وسلم بينه وبين سعد بن الربيع فقال له: عَلِّمْ اَنَا سَمَكَ مَالِي نصفين ولى امرأتان فاطلق إحداهما فاذا انقضت عدتها فتزوجها فقال: بارك الله لك فى اهلك ومالك ذلوني على السوق فدلوه على السوق فصار جمع يومئذ الاومعه شعى من اقط وسمن قد استفضله بفراه رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد ذلك وعليه وَضْرُ صُفْرَةٍ فقال: مَهَيْم؟ فقال تزوجت امرأة من الانصار قال: فما اصنفتها؟ قال ”نواة“ قال حميد: لو قال وزن نواة من ذهب فقال: لو لم ولو بشاة“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ جب عبدالرحمن بن عوف ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور سعد بن ربیع کے درمیان بھائی بندی فرمائی تو سعدؓ نے فرمایا: آؤ میں اپنے مال کو آپ کے ساتھ آدھا آدھا تقسیم کر لیتا ہوں، اور یہ کہ میری دو بیویاں ہیں ان میں سے (آپ کی پسندیدہ) ایک کو طلاق دیدوں گا پس جب اس کی عدت گزر جائے گی آپ اس سے شادی کر لیں گے، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے فرمایا کہ اللہ آپ کے بال بچوں اور مال میں برکت دے مجھے بازار کا پتہ بتلا دیں چنانچہ انہوں نے بازار کا راستہ بتلا دیا پس نہیں لوئے وہ اس دن گردراں حالیکہ ان کے پاس کچھ پیڑ اور گھی تھا جو کما کر لائے تھے، چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا کہ ان پر زردی کا اثر تھا (یعنی پیوی کے کپڑوں سے لگے ہوئے رنگ کا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جوابا کہا کہ میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کر لی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مہر میں کیا دیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ایک تھیلی کے برابر سونا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعوت دے کہ آؤ گویا ایک ہی بکری سے ہو۔

لغات: بقولہ ”مواساة“ آئی ہوا سی مواساة بھر دوی اور غم خواری کو کہتے ہیں چاہے مال سے ہو یا بغیر مال کے بقولہ ”احسن“ یہ بھی مواساة کی طرح ہے یعنی مواخاة سے بمعنی بھائی چارہ اور بھائی بندی و دوستی کو کہتے ہیں بقولہ ”ہلم“ اس میں ہاء تنبیہ کے لئے ہے اور اصل لفظ اَلَمْ ہے اَلَمْ اشیٰ نزدیک ہوئے کو کہتے ہیں پھر ہمزہ کو ساقد کر کے ہائے تنبیہ کو شامل کر کے ہلم بنا بمعنی تعال ”آؤ“ بقولہ ”وَضْرُ صُفْرَةٍ“ الخ الواد والاضاد

بمعنی اثر کے ہے۔ جبکہ صفرۃ بضم الصاد و سکون الفاء وہ زردی جو کس خوشبو کی ہو۔ ایک روایت میں "اثر صفرۃ" کے الفاظ ہیں۔

قولہ "مہیم؟" ایک روایت میں ہے "ما هذا" جیسا کہ ترمذی باب ماجاء فی الولیۃ کی روایت میں گزرا ہے۔ لہذا مہیم بمعنی استفہام کے ہے اس میں مہم ثانی کو مجزوم پڑھا جائے گا۔ اگر رنگ کا اثر زیادہ تھا تو پھر یہ استفہام انکاری ہے کیونکہ مردوں کے لئے رنگین خوشبو لگانا ممنوع ہے، پھر جواب کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ میں نے نہیں لگائی ہے بلکہ نبوی کے کپڑوں پر سے لگی ہے۔ اور اگر رنگ قلیل تھا تو پھر مہیم نفس استفہام کے لئے ہے جو بمعنی استعلام ہوگا۔ حاشیہ میں ہے کہ یہ یمانی کلمہ ہے بمعنی ما امرک وما شاکک؟۔

تشریح:۔ اس حدیث کی پوری تشریح (تشریحات ترمذی ج ۴ ص ۴۳۹) پر گزری ہے ذیکئے باب ماجاء فی الولیۃ، ابواب الزکاح۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر سے فراغت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار صحابہؓ کے درمیان مواخاۃ فرمائی جن کی تعداد نوے تھی۔ آدھے مہاجر اور آدھے انصار تھے۔ یہ صحابہ ایک دوسرے سے میراث لینے کے بھی مستحق ہوتے تھے لیہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی "وَأُولَٰئِکَ الْأَرْحَامُ بَعْضُهُمْ أَوْلٰی بِبَعْضٍ" پھر یہ حکم منسوخ ہوا گویا جب بدر تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس مواخاۃ کے مطابق حضرت سعد بن الربیع جو غزوہ احد میں شہید ہوئے ہیں نے اپنے اسلامی بھائی حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو مذکورہ پیش کش کی کہ مدینہ میں میرا مال سب سے زیادہ ہے آؤ میرا مال آدھا تم لے لو اور میری بیویوں میں جو تمہیں پسند آئے میں اسے آزاد کر لوں تم اسے اپنے نکاح میں رکھ لو، مگر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ چونکہ تجارت کا ذوق رکھنے والے صحابی تھے دوسری طرف حضرت سعدؓ کی یہ پیشکش کوئی معمولی آفر بھی نہ تھی بلکہ بہت بڑی قربانی تھی جسے انہوں نے شکر یہ کے ساتھ واپس کرتے ہوئے تجارت کی لائن گزر بسر کے لئے اختیار فرمائی، جس میں اللہ نے بہت برکت دی یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ امیر صحابہؓ میں شمار ہونے لگے گویا خلوص نیت کے ساتھ دوسروں کے حق میں دعامنکس ہو کر داعی کے حق میں بھی قبول ہو جاتی ہے۔

باب ماجاء فی مواصاة الاخ

۱۔ راجع لتلیف فیصل البدایة والنهاية لابن کثیر الدمشقی ص: ۴۳۰-۴۳۱ ج: ۳، ۴ فصل فی مواخاة النبی ﷺ بین

المہاجرین والانصار دار الکتب العلمیۃ بیروت۔ ج: ۱ سورة الاحزاب آیت: ۶

مع کذا فی صحیح البخاری ص: ۵۴۳ ج: ۱ کتاب المناقب۔ حفظ الرحمن الخلیفی

باب کی حدیث سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان گہرے مراسم خوش گوار تعلقات اور انتہائی ایثار و ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے جو اسلامی معاشرہ کا مثالی نمونہ ہے۔ یہ حدیث ان کے باہمی مضبوط تعلقات اور مستحکم معاشرتی موداعہ کی ایک جھلک ہے۔ ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات پر مرسوم و مرقوم ہیں جن کی مثالیں تاریخ میں اور کہیں بھی نہیں ملتیں۔ یہ اسلامی رشتے کا اثر تھا۔

آج کل مسلمان عموماً ایک دوسرے سے نالاں رہتے ہیں شاید کسی کے ذہن میں یہ آئے کہ یہ اسلام کی وجہ سے ہے کلاً و حاشا ایسا ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اولین مسلمان بھی ایک دوسرے سے متفرق ہوتے۔ مگر جب آج کے مسلمانوں نے صدق دل سے اسلام کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی بلکہ صرف ظاہری لیبل مسلمان ہونے کا اپنے اوپر لگا لیا تو یہ تاثر ابھرنے اور جنم لینے لگا کہ گویا مسلمان نفرتیں پھیلاتے ہیں، بالفاظ دیگر جس طرح بادلوں سے بارش برتی ہے اور کسی کڑوے درخت میں اس کا پانی جمع ہو جاتا ہے تو وہ پانی جب ٹپکنے لگتا ہے تو کڑوا معلوم ہوتا ہے یہ آسمان سے کڑوا نہیں آیا تھا بلکہ درخت کی تنگی نے اسے تلخ اور کڑوا بنایا۔ اسی طرح غیبت انفس آدمی میں جب اسلام یا علم سرایت کرتا ہے تو اس کے اثرات بُرے محسوس ہوتے ہیں۔ حدیث کی باقی شرح خصوصاً دعوتِ ولیمہ اور باقی دعوتوں کی اقسام و احکام (تشریحات ترمذی ج ۴ ص ۴۴۰ تا ۴۴۶) پر ملاحظہ ہو۔

باب ماجاء فی الغیبة

”عن ابی ہریرۃ قال: قیل یا رسول اللہ ما الغیبة؟ قال: ذکرک احواک بما یکرہ، قال: رأیت ان کان فیہ ما نقول؟ قال: ان کان فیہ ما نقول فقد اعتبته وان لم یکن فیہ ما نقول فقد بھتہ۔“^۱ ہذا حدیث حسن صحیح۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اے اللہ کے رسول غیبت کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرا اپنے کسی بھائی کا ایسا تذکرہ جو اسے

باب ماجاء فی الغیبة

۱۔ الحلیت الخرجہ مسلم و ابوداؤد و النسائی، و قد روی ہذا الحدیث من طرق کثیرۃ و عن جماعۃ من الصحابۃ۔

ناپسند ہو اس شخص نے کہا بتائیں اگر وہ بات جو میں کہہ رہا ہوں اس میں موجود ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ بات اس میں پائی جاتی ہو جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں جو تم کہہ رہے ہو تو پھر تو تم نے اس پر تہمت لگائی۔

نکات:- قولہ "غیبت" امام قرطبیؒ نے غیبت کی تعریف یوں کی ہے "ہی ذکر العیب بظہر الغیب" یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے عیب بیان کرنا غیبت ہے۔ اور اگر کسی کا عیب اس کے روبرو بیان کرے تو اسے "لمن" کہتے ہیں چونکہ دوسرے پر طعن زنی درحقیقت اپنا ہی عیب بیان کرنا ہے اس لئے اللہ نے فرمایا "ولا تلمزوا انفسکم" یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو۔ قولہ "ارایت" ای انجبرنی مجھے بتائیں۔ قولہ "بہتہ" واحد مذکر مخاطب کا صیغہ بہتان سے ہے ایک ایسی بات کسی طرف منسوب کرنا جس سے وہ بڑی اور پاک ہو بہتان کہلاتا ہے۔ بہتا کے معنی چوک پڑنے کے ہیں کیونکہ مبہوت جب یہ خبر سنتا ہے تو ہکا بکارا جاتا ہے۔

تشریح:- امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "لا خلاف ان الغيبة من الكبائر" یعنی غیبت کے کبیرہ گناہ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور قرآن میں اس کی صریح ممانعت آئی ہے "ولا یغتصب بعضکم بعضاً" کسی کو کسی کی غیبت نہ کرے۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ غیبت کرنے والے کی مثال کھٹی کی مانند ہوتی ہے جس طرح کھٹی جسم کی گندی جگہ پر بیٹھتی ہے اسی طرح غیبت کرنے والا مختاب کے عیوب اُجاگر کرتا ہے جس سے معاشرت بگڑ جاتی ہے، کیونکہ ظنون و شکوک بلکہ غلط فہمیاں اور نفرتیں جنم لیتی ہیں اس لئے شریعت نے اس پر سخت پابندی لگادی اور چونکہ یہ ایک شیطانی گناہ ہے اس لئے دوسری حدیث میں اسے زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ قرار دیا ہے اور اس لئے بھی کہ زنا سے تو آدمی توبہ تائب ہو کر بری الذمہ ہو سکتا ہے لیکن غیبت کرنے والا کہاں معتاب کے پاس جانا گوارا کرتا ہے کہ میں نے تیری غیبت کی ہے مجھے معاف کر دو۔

تاہم اگر غیبت سرزد ہو جائے اور مختاب کو معلوم نہ ہوا ہو تو اس کا ممکنہ کفارہ یہ ہے کہ مختاب کے لئے مغفرت کی دعا کی جائے چنانچہ یہی ہے "ان من کفارة الغيبة ان یستغفر لمن اغتابہ تقول اللهم اغفر لنا ولہ" پھر یہ دعا جہر اُپڑھنی چاہئے تاکہ سامعین کے سامنے اپنی ضمنی تکذیب بھی ہو جائے اور ان کو بھی احساس ہو جائے۔ البتہ اگر غیبت کسی دینی مصلحت پر مبنی ہو تو پھر جائز ہوگی جیسے رادیوں پر جرح۔ اور آج کل کے

روشن خیال قسم کے لوگوں سے عوام کو آگاہ رکھنے کے لئے ان کے ناموں کی تصریح کرنا یا کسی رشتہ و مشورہ میں کسی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کسی کو موضوع بحث بنانا وغیرہ بشرطیکہ حد ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔ پھر غیبت ہر ایک کی حرام ہے خواہ کوئی بچہ یا غلام کیوں نہ ہو۔ اسی طرح غیبت کسی بھی ایسے طریقے سے حرام ہے جس سے کسی کا عیب ظاہر ہو جاتا ہو خواہ قول و عمل سے ہو یا نقل اتارنے اور اشارہ کرنے سے ہو۔ (مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش قدم کامل میں دیکھی جاسکتی ہے)

باب ماجاء فی الحسد

”عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقاطعوا ولا تدابروا ولا تباعدوا ولا تحاسدوا وكونوا عباد الله اخوانا ولا يحل للمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث“۔ (حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ مت موڑو، آپس میں بغض نہ رکھو، اور باہمی حسد نہ کرو بلکہ اللہ کے بندے اور باہم بھائی بن کر رہو اور جائز نہیں کسی مسلمان کے لئے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑ دے (یعنی بات چیت بند کر دے)۔

لغات:- قولہ ”لا تقاطعوا الخ“ چاروں الفاظ باب مفاصلہ سے نہی کے صیغے ہیں جو جانہن سے فعل میں شراکت کو مقتضی ہے پس تقاطع قطع سے ہے وصل کے مقابل آتا ہے ”تدابر“ دُبر سے ہے بمعنی پیٹھ پھرنے کے کتایہ ہے اعراض سے۔ ”تباعد“ بغض سے ہے نفرت و دشمنی کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ”تحاسد“ حسد سے ہے کسی کی نعمت کے زوال اور اپنے لئے حصول کی تمنا کو کہتے ہیں۔

تشریح:- الحمد للہ راقم نے نقش قدم فصل نمبر ۱ میں ”حسد“ پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، حسد کا بنیادی سبب تو کینہ اور بغض ہے تاہم علاوہ ازیں کچھ اسباب اور بھی حسد کے بیان ہوئے ہیں جن کی تعداد سات ہیں (۱) عداوت کہ جب دشمن سے انتقام لینا مشکل ہو جائے تو حسد جنم لیتا ہے (۲) تعوز یعنی اپنے ہم پلہ آدمی کی عزت کا ناگوار ہونا (۳) تکبر کہ جب حاسد کی نظر ایسے شخص کی نعمت پر پڑ جائے جو اس کی نظر میں کمتر ہو تو وہ برابری یا محسود کی ترقی و برتری کے خوف سے حسد کرنے لگتا ہے (۴) تعجب یعنی جب اپنی نظر

میں اپنے سے کمتر پر نعمت دیکھے تو تعجب کرتا ہے اور اسے ہٹانے کی تمنا کرنے لگتا ہے (۵) جب اپنے مقصد کے حصول میں کسی کو شریک یا رکاوٹ دیکھے تو راستہ صاف کرنے کی غرض سے حسد کرتا ہے (۶) کُتُب جاہ در یاست جس میں مزاحم بننے والے پر حسد ہوتا ہے (۷) خیانت نفس و باطن۔

علیٰ ہذا سب سے زیادہ حسدان لوگوں میں ہوگا جہاں یہ سارے اسباب بیک وقت پائے جاتے ہوں اور جہاں یہ اسباب جتنے کم ہوں گے اسی تناسب سے حسد میں کمی ہوگی اور جہاں بالکل کوئی سبب نہ پایا جائے وہاں کوئی حسد نہ ہوگا۔

بہر حال حسد ایک گندی بیماری ہے جو ذاکل اخلاق میں غیر معمولی طور پر مہلک سمجھے جانے والی شیطانی خصلت ہے۔ اہلبیس حسد نہ کرتا تو ملعون نہ بنتا۔ قاتل قاتل نہ بنتا۔ یہود و گمراہ نہ ہوتے۔ اور ابو جہل عدو اللہ نہ بنتا۔ حسد نیکیوں کو ایسا کھاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو۔ رواہ ابو داؤد و ابن ماجہ۔^۱

بہر حال اگر کسی کو حسد کا عارضہ لاحق ہو تو اس سے نکلنے کی کوشش لازمی ہے جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے کہ کیوں تجھے مسلمان کی نعمت پر تنگ دلی محسوس اور زوال کی تمنا ہو رہی ہے پھر حسد کے مقتضائے خلاف چلتے ہوئے محسود کے لئے دعا کرتا رہے اور کسی سے حسد کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی حسد کے مطابق کوئی عمل کرے۔ ممکن ہے کہ اللہ اس کا دل صاف کر کے اس پر رحم فرما دے۔ یہ حکم حسد کی اس نوع کا ہے جس میں دوسرے کی نعمت کے زوال اور اپنے لئے حصول کی تمنا ہو لیکن اگر اس کے زوال کی تمنا نہ ہو بلکہ آدمی چاہے کہ میں اس جیسا بن جاؤں تو یہ چیز قسم اول کی طرح حرام و ناجائز نہیں بلکہ اگر ایسی تمنا اور کوشش کسی دینی کام میں ہو تو یہ محمود ہے اور مطلوب بھی ہے جیسا کہ اگلی حدیث میں ہے حسد کی اس قسم کو غبطہ کہا جاتا ہے اور اگر کسی بھر مباح میں یہ کیفیت آجائے مثلاً کسی کے پاس بہت سارا مال ہے یا اور طرح کی کوئی دنیوی نعمت ہے اور دوسرا اس کی تمنا کرتا ہے تو یہ اگرچہ حرام تو نہیں مگر اس سے بچنا افضل اور درجہ کمال ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کو کسی نعمت میں دیکھا کہ وہ اس نعمت کی وجہ سے مجزتا جا رہا ہے جیسے مالدار آدمی تو اس نیت سے اس کے زوال کی تمنا کرنا کہ وہ فاسق نہ بن جائے بھی جائز ہے۔ عارضہ میں ہے:

باب ما جاء في الحسد

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۳۲۳ ج: ۲ "باب الحسد" کتاب الادب، سنن ابن ماجہ ص: ۳۱۰ "باب فی الحسد" ابواب

الزهد، ایضاً رواہ البیہقی وغیرہما بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۴۷ ج: ۳.

”قال علماءنا: الا ان تكون تلك النعمة يستعين بها على المعصية فاذا احب
زوالها لذلك عنه كان جائزا“۔

حدیث کے باقی تین الفاظ کی تشریح مقابل الفاظ کے تناظر میں سمجھنا آسان تر ہے جیسا کہ لغات کے بیان میں گذرا ہے۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ مقاطعہ باہمی حقوق واجبہ کے ترک کو کہتے ہیں۔ جبکہ تداہر یعنی اعراض محسوس اور معقول دونوں کو شامل ہے۔ محسوس کی صورت جیسے ایک دوسرے سے منہ موڑنا اور راستہ تبدیل کرنا اور معقول جیسے عقائد و آراء اور اقوال میں اختلاف کرنا۔ جبکہ بغض محبت کے مقابلے میں آتا ہے یعنی ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے کی کوشش نہ کرو۔ محشی نے لغات سے نقل کیا ہے کہ دین میں اختلاف مت کرو کیونکہ بدعات کے ارتکاب سے نفرتیں اور عداوتیں جنم لیتی ہیں۔

دوسری حدیث:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی حسد اچھا نہیں مگر دو خوبیوں میں۔ ایک خصلت اور خوبی اس شخص کی جس کو اللہ نے مال دیا ہو پس وہ اس میں سے رات اور دن کی ساعات میں خرچ کرتا رہتا ہے۔ دوسری خوبی اس شخص کی جس کو اللہ نے قرآن (کا علم) دیا ہو پس وہ رات اور دن کی گھڑیوں میں اس کے مطابق رہتا ہے۔

لغات:۔ ”انتین“ اس روایت میں انتین سے مراد خصلتیں ہیں۔ قولہ ”رجل“ اور رجل مرفوع ہے جو قائم مقام مضاف ہے تقدیر اس طرح ہے ”خصلۃ رجل“۔ اور اگر ”انتین“ کا لفظ بول یعنی بغیر تائے تانیث کے تو پھر رجل مجرور ہے بنا بر بدلیت اور حذف کی ضرورت نہیں۔ قولہ ”آناء“ جمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد ”انی“ ہے جیسے ”امعاء و معاء“ ہے مراد ساعات ہیں۔ قولہ ”يقوم“ سے مراد عمل ہے جو تلاوت اور دیگر تمام متعلقہ امور جیسے تعلیم، قضا، فتویٰ اور اس کے احکام کے مطابق خود عمل کرنے وغیرہ سب کو شامل ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث مبارکہ کے مطلب میں شارحین کی آراء مختلف ہیں۔ باب کی سابقہ روایت میں آپ نے پڑھ لیا کہ حسد کی وہ قسم جو کسی دینی امر سے متعلق ہو اور اس میں دوسرے کی دینی نعمت کے زوال کی تمنا نہ ہو بلکہ اپنے لئے حصول کی خواہش اور کوشش ہو تو یہ جائز ہے اس کو غبطہ کہا جاتا ہے۔ ابن العربی نے عارضہ میں یہی مطلب متعین کیا ہے۔ جبکہ بعض حضرات اس کو مبالغہ فی التحریص پر محمول کرتے ہیں یعنی اگر حسد جائز ہوتا تو پھر انہی دو خصلتوں میں جائز ہوتا جیسا کہ حاشیہ پر ہے یعنی اس سے حسد کا جواز بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان دو خصلتوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے، یہ ایسا ہے جیسے ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ اگر میں کسی کو یہ اجازت دیتا کہ وہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو اپنے شوہر کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا، توجس طرح اس حدیث میں سجدے کا جواز بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ عورت پر شوہر کی اطاعت لازم کرنا مراد ہے۔ اس مبالغے کے لئے مذکورہ تعبیر اختیار فرمائی اسی طرح باب کی حدیث میں بھی ہے۔

باب ماجاء فی التباض

”عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان الشیطان قد ایس ان یعبده المصلون ولكن فی التحریش بینہم۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے شک شیطان اس بات سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ مسلمان اس کی عبادت کریں، لیکن ان کی باہم لڑانے کے بارے میں مایوس نہیں ہوا۔

لغات:- تباض کا مطلب سابقہ باب میں گذرا ہے۔ قولہ ”ایس“ مفتح الہمزہ و کسر الیاء ماضی کا صیغہ ہے ایسا مصدر ہے مایوسی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”التحریش“ حرش بین القوم ایک دوسرے کے خلاف لڑانے اور بھڑکانے کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں ”شیطان“ سے مراد ابلیس علیہ السلام ہے اور ”مصلون“ سے مسلمان مراد ہیں۔ جبکہ مسلم شریف^۱ کی روایت میں اس پر ”فی جزیرۃ العرب“ کا اضافہ ہے۔ مگر عبادت شیطان سے مراد کیا ہے تو اس میں متعدد اقوال ہیں۔

پہلا قول:- یہ ہے کہ اس سے بتوں کی عبادت مراد ہے پس مطلب یہ ہوا کہ شیطان کو یقین ہوا چلا ہے کہ جزیرۃ العرب میں لوگ پھر کبھی بھی شرک اور بتوں کی پوجا پاٹ کی جانب نہیں لوٹیں گے جیسا کہ سائزھے چودہ سو سال سے مشاہدہ اور تاریخی حقیقت ہے اس لئے امام نووی نے اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے اور جہاں تک مسئلہ کذاب کے فتنے کا تعلق ہے تو اگرچہ اس میں بعض لوگوں نے الحديث اخرجه الترمذی کتاب النکاح باب: ۱۰، ایضاً ابن ماجہ کتاب النکاح باب: ۳، ایضاً ابوداؤد کتاب النکاح باب: ۳۰، ایضاً رواہ الحاكم فی المستدرک والبیہار وأحمد والنسائی، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۵ ج: ۳۔

باب ماجاء فی التباض

۱۔ صحیح مسلم ص: ۳۷۶ ج: ۲ ”باب تحریش الشیطان وبعث الخ“ کتاب صفۃ المنافقین

کا مرتد ہونا ثابت ہے لیکن انہوں بتوں کی عبادت نہیں کی تھی۔ البتہ شیطان اپنا کام ان کی باہمی نفرتوں سے نکالتا ہے جن کی بنا پر لوگ آپس میں اختلافات اور جھگڑوں بلکہ قتال کا شکار ہو جاتے ہیں جیسا کہ آج کل مشاہدہ عام ہے۔

دوسرا قول:- یہ ہے کہ عبادت سے مراد ارتداد ہے اور مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی امت کے گمراہ ہونے اور مرتد ہونے سے شیطان مایوس ہو چکا ہے، گو اکاذکاذ واقعات ارتداد کے ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ پوری امت والہایا ذبالہ صراط مستقیم سے ہٹ جائے۔ یہ قول علامہ توریشی کا ہے۔

تیسرا قول:- ملا علی قاریؒ کا ہے کہ شیطان اس سے مایوس ہو گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح یہ لوگ بھی توحید کے ساتھ شرک کو ملا دیں گے۔ اس توجیہ کے مطابق پہلی توجیہ کی طرح جزیرۃ العرب کی قید لازمی ہوگی۔ جبکہ دوسری توجیہ میں حکم عام مسلمانوں کو شامل ہے خواہ وہ جزیرۃ العرب سے باہر رہنے والے کیوں نہ ہوں۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس قسم کی احادیث کا حکم ابد الابد کے لئے نہیں ہوتا ہے بلکہ قیامت کے قریب تک کے لئے ہوتا ہے۔ لہذا اس حدیث میں اور اس حدیث میں کوئی تعارض نہ سمجھا جائے کہ جب تک روئے زمین پر اللہ، اللہ کہنے والا ہوگا اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی، اور یہ کہ قیامت شرار الناس پر قائم ہوگی وغیر ذلک من الاحادیث۔^۱

سوال:- اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ امت کے آپس میں جھگڑے اور اختلافات ہوں گے تو پھر ایسے یقینیات سے دامن پھانا کیونکر ممکن ہے؟ اور انسان ایسے میں کیونکر مکلف بن سکتا ہے؟

جواب:- اس قسم کی احادیث یا جیسے ”لتبعن سنن من قبلکم“ الخ^۲ سے بلاشبہ یہ سب کچھ ہونا ہوتا معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی یہود وغیرہ کی مشابہت اور باہمی جھگڑے ممنوع ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرامین کا مقصد یہ ہے کہ امت کی غالب اکثریت ان چیزوں میں مبتلا ہوگی مگر ایک طاقتہ منصورہ ایسا بھی ہونا چاہئے جو قیامت تک اپنا دامن پھائے رکھے۔ تذبذب و تشکر

۱۔ راجع للاحادیث مشکوٰۃ المصابیح ص: ۳۸۱ مکتبۃ الحسن لاہور۔

۲۔ رواہ البخاری ص: ۱۰۸۸ ج: ۲ ”کتاب الاعتصام“ ایضاً أخرجه فی الانبیاء مسلم ص: ۳۳۹ ج: ۲ کتاب العلم

ابن ماجہ ص: ۲۸۷ ابواب الفتن

باب ماجاء فی اصلاح ذات البین

”عن اسماء بنت یزید قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یحل الکذب الا فی ثلاث: یُسَخِّطُ الرجل امرأته لیرضیها، والکذب فی الحرب، والکذب لیصلح بین الناس وقال محمود فی حدیثه: لا یصلح الکذب الا فی ثلاث۔“

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جھوٹ بولنا جائز نہیں مگر تین مواقع پر (جائز ہے) کوئی شخص اپنی بیوی سے جھوٹی بات کرے تاکہ اسے راضی کر دے، اور جنگ (جہاد) میں جھوٹ بولنا اور اس لئے جھوٹ بولنا تاکہ لوگوں کے درمیان صلح کر دے۔ یہ الفاظ امام ترمذی کے ایک شیخ محمد بن بشار کے ہیں جبکہ ان کے دوسرے شیخ محمود بن غیلان نے ”لا یحل“ کے بجائے ”لا یصلح الکذب“ نقل کیا ہے مطلب دونوں کا ایک ہے۔

باب کی پہلی حدیث شہر بن حوشب راوی کی وجہ سے اور ارسال کے شبہ کی بناء پر درجہ صحت سے کم ہے مگر باب کی دوسری حدیث صحیح ہے جو حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ وہ شخص جھوٹا (غلط جھوٹا) نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے (اور اس کے لئے) اس نے بھلی بات کہی یا اچھی بات پہنچائی۔

لغات:- قولہ ”ذات البین“ ذات کا لفظ کسی شے کی حقیقت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم کبھی اس سے مراد صفات بھی ہوتی ہیں یہاں یہی مراد ہے جبکہ ”بین“ کا لفظ اصالتہً ظروف کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کا اطلاق دو چیزوں کے درمیان حالت پر بھی ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ علیٰ ہذا لفظ ذات یا تو زائد ماننا پڑے گا یا پھر ”بین“ معنی ظرفی پر محمول کرنا ہوگا پس معنی یہ ہوگا یہ باب لوگوں کے درمیان باہمی تعلقات کی اصلاح کے بارے میں ہے۔

قولہ ”لیس بالکاذب“ اسی بالکاذب المذموم۔ قولہ ”اونساخیراً“ لفظ ”او“ شک من الراوی کے لئے ہے۔ ”نما“ جب میم کی تخفیف کے ساتھ ہو تو اچھی بات پہنچانے کو کہتے ہیں اور جب میم کی تشدید کے ساتھ ہو تو بمعنی غفلت کے آتا ہے جبکہ ”أما“ میں دونوں قول ہیں۔

تشریح:- اس حدیث مبارکہ کی آسان تشریح ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس میں تینوں کذبات کو حقیقی

جھوٹ پر محمول کیا جائے اور ان کو کذب مذموم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے مستحکم حدیث باب جیسا کہ علماء کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ جبکہ دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ ان کذبات کو اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جو نسبت کذبات ثلاثہ کی گئی ان کو معاریض اور توہین پر محمول کیا جائے جس کا مطلب ہے لفظ کے معنی متبادر کو چھوڑ کر غیر متبادر لیا جائے تو نسبت الی الخطاب اگرچہ یہ جھوٹ سا ہوگا لیکن عند المستحکم یہ سچ ہی ہوگا۔ چنانچہ ابن العربی نے اس مسئلے پر ”باب ما جاء فی النصیحہ“ میں بحث فرمائی ہے پھر اس کی مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”منالہ ان یقول لاهلہ: ابعث لی هذا الثوب بخمسة دنانیر و هو یرید دراهم۔“

چونکہ دنانیر کا اطلاق دراهم پر ہوتا ہے مگر علی التقلیل اس لئے غیر متبادر ہو تو عورت اس سے مراد دنانیر سمجھے گی جبکہ وہ دراهم ہیں۔

”و کفولہ للرجل سمعت من تکرہ یدعوك ویلک کرك بخیر، یرید بذالك عند دعائه

للمسلمین فانه داخل فیہم۔“

یعنی ایک شخص سے کہا جائے کہ تم جس آدمی کو اپنا دشمن و مخالف سمجھتے ہو وہ تو میرے حق میں دعائیں مانگتا ہے تو یہ جھوٹ بھی نہ ہوگا کہ اس کی مراد عام مسلمانوں کے لئے دعا ہے جس میں مخاطب بھی آگیا ہے جبکہ وہ مخاطب اس کو خصوصی طور پر اپنے حق میں سمجھے گا۔

”وفی الحرب مثل ان یقول للعدو: قد جاءک ما لا طاقة لک بہ یعنی بالبدین

والاسلام ونحو ذالک۔“

یعنی یہ کہنے سے کہ تمہارے پاس ایسی چیز آئی ہے جس کا مقابلہ تم نہیں کر سکتے ہو، دشمن اس کو فوج پر محمول کرے گا مگر آپ کی مراد اس سے دین اسلام ہوگی تو یہ سب صورتیں معاریض کی ہوں گی۔ لہذا حدیث کو احتیاطاً اسی صورت پر محمول کرنا چاہئے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اقوال کو بھی معاریض کہیں گے۔

تحقیقی تشریح:- مذکورہ اختلاف درحقیقت ایک فرعی اختلاف ہے بنیادی اختلاف یہ ہے کہ آیا صدق اور کذب کا حسن اور قبح عقلی و ذاتی ہیں یا شرعی؟ تو مسلم الثبوت میں القلۃ الثانیۃ کے تحت اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اتنی سی بات تو اجتماعی ہے کہ افعال کا حسن و قبح اس اعتبار سے کہ کوئی چیز کمال ہے

اور کوئی نقصان ہے اور کوئی چیز دنیوی غرض سے موافق ہے اور کوئی نقصان وہ ہے عقل سے معلوم کی جاسکتی ہے کیونکہ ساری دنیا والے اشیاء میں ایسی اچھائی اور برائی کی تمیز بغیر شریعت کے جانتے ہیں مثلاً علم کا حسن ہونا اور جہل کا قبیح ہونا، البتہ حسن اور قبح بمعنی عند اللہ مدح اور ذم کا استحقاق بھی عقلی ہے یا محض شرعی ہے؟؟؟

تو اشاعرہ کہتے ہیں کہ شرعی ہیں لہذا شریعت جس چیز کا حکم دے تو وہ حسن اور جس سے روکے تو وہ قبیح ہوگی حتیٰ کہ اگر شریعت اس حکم کو منسوخ کر کے مامور بہ اور منہی عنہ کو مامور بہ قرار دیدے تو حکم بھی بدل جائے گا حسن قبیح بن جائے گا اور قبیح حسن۔

جبکہ اکثر حنفیہ (ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک حسن اور قبح مطلقاً عقلی ہیں یعنی ذاتی ہیں یا ایسی صفت کی بناء پر ہیں جو لازم الذات ہوتا ہم ہمارے حنفیہ کے نزدیک اس کے عقلی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حکم شرع کے بغیر بھی وہ مشروع ہو بلکہ یہ نزول شرع پر موقوف ہے حتیٰ کہ اگر اس فعل کے بارے میں شرع وارد نہ ہو تو وہاں کوئی حکم شرعی نہ ہوگا۔

تاہم محققین حنفیہ جیسے امام ابو منصور الماتریدی وغیرہ کے نزدیک بعض اشیاء کا حسن و قبح تو عقلی ہیں لیکن سب کا نہیں۔

”ثم من الحنفیۃ من قال ان العقل قد يستقل فی ادراك بعض احکامہ تعالیٰ فتاوجب الایمان وحرم الکفر وکل ما لایلیق بحناہ تعالیٰ حتیٰ علی الصبی العاقل وروی عن ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ: لا عذر لاجد فی الجہل بحالہ لغیری من الدلائل“ الخ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان کا حسن اور کفر کا قبح عقلی ہیں حتیٰ کہ اگر ایک بچہ کسی جنگل میں ترن تہا بالغ ہو جائے تو اس پر ازروئے عقل لازم اور واجب ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک پر ایمان لائے اور جو صفات اللہ کے شایان ہیں ان پر بھی ایمان لائے جبکہ صفات نقصان سے اللہ کی تنزیہ بھی اس پر واجب ہے تاہم نماز روزہ وغیرہ اس پر بغیر اخبار شائع کے واجب نہ ہوں گے کہ ایمانیات عقلی ہیں اور فریعات نقلی ہیں۔

علیٰ ہذا حدیث باب کا مطلب اشاعرہ کے نزدیک تو بالکل آسان ہے کہ جب شارع نے کذب کی مندرجہ بالا صورتیں جائز قرار دیں تو یہ حسن بن گئیں لہذا اب ان میں کسی طرح کا کوئی قبح باقی نہ رہا لہذا ان کے نزدیک حدیث کو ظاہر معنی اور کذب حقیقی پر محمول کرنے میں کوئی اصولی پیچیدگی نہیں۔

لیکن ہمارے خفیہ اور معتزلہ کے نزدیک اس کو کذب حقیقی پر محمول کرنے سے یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ اگر صدق و کذب کا حسن و قبح عقلی ہیں تو پھر ایک قبیح چیز کیسے جائز ہو سکتی ہے جبکہ شارع اور حکیم قبیح کا حکم نہیں دیتا؟

بلاشبہ یہ ایک وزنی اعتراض ہے مگر اس کا حل یہ ہے کہ اولاً تو ہمارے نزدیک ان کذبات سے مراد معاریض ہیں علیٰ ہذا یہاں کسی قبیح کو جائز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثانیاً علامہ بہاری رحمہ اللہ نے مسلم الثبوت میں فرمایا ہے: ”والحق عندنا الاطلاق الا اعم فلا بد للنسخ علينا“ یعنی ہمارے نزدیک حق بات اور صحیح موقف یہ ہے کہ حسن اور قبح عام ہیں کبھی فعل کی ذات میں ہوتے ہیں، کبھی صفات لازمہ و حقیقیہ کی وجہ سے اور کبھی کسی عارض کی وجہ سے۔ لہذا جس طرح ایک حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے تو ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ قبل النسخ اس کا حسن عارض کی وجہ سے تھا جواب ختم ہوا تو اسی طرح کذب میں بھی قبیح عارضی ہو سکتا ہے۔ ابن العربیؒ نے عارضۃ الاحوذی باب ما جاء فی النصیہ میں بھی یہی بات کہی ہے:

”حقیقۃ: الکذب حرام لا لئلاہ کما تقولہ المبتدعۃ (المعتزلہ) وانما هو لمافیہ من المضرۃ ولذلك یحب الرفع المضرۃ کستر المسلم المظلوم علی الظالم۔“

(عارضہ ص: ۸۷ ج: ۷)

چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ صدق اور کذب کا حسن و قبح عقلی ہیں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امور عارضہ کبھی کبھار اتنے زیادہ اور طاقت ور ہوتے ہیں جن کی بنا پر ذاتی تقاضا مغلوب ہو جاتا ہے، اس کو علم بلاغت والے مقتضائے حال سے بھی تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ علامہ تفتازانیؒ نے مطول میں ”الحمد للہ“ کی شرح میں کہا ہے کہ لفظ الحمد کو اسم ذات پر کیوں مقدم کیا حالانکہ اسم ذات مقدم ہونا چاہئے تھا۔ غرض کبھی شرع کا ایک حکم کسی شرعیہ کے وجود پر موقوف ہوتا ہے مگر حکیم خیر کثیر کا حکم شرعیہ کی وجہ سے ترک نہیں کرتا پس جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ ان کذبات میں جو فوائد ہیں وہ ان کے قبائح ذاتیہ سے کہیں زیادہ ہیں لہذا قبیح ذاتی حسن عارضی کے ساتھ منافی نہیں۔

یہاں مسلم الثبوت کی عبارت قارئین کی افادہ کی غرض سے نقل کی جاتی ہے:

”وقالوا (ای الاشاعره) اولالو كان ذاتیالم یختلف وقد یختلف فان الکذب

مثلاً یحب لعصمة نبی و انقاذ بری عن سفاک و الجواب ان هناك ارتکاب اقل
القیححتین لان الکذب صار حسناً قیل یرد علیه ان هذا الکذب ههنا واجب
فیدخل فی الحسن اقول الحسن لغیره لا ینافی القیح لذاته و هذا معنی قولهم
الضرورات تبیح المحذورات... الی ان قال... قال الشیخ فی الاشارات: الشر
داخل فی القدر بالعرض۔

اس پر محشی لکھتے ہیں:

”فان التقدير الإلهي انما يتعلق أولاً بالذات بالخبر لكنه قد يكون متوقفاً على
وجود الشر القليل وليس من شأن الحكيم ان يترك الخير الكثير لاجل
الشر القليل“ الخ۔

یہ بحث انتہائی دلچسپ ہے مگر خوفِ تطویل سے بچنے کے لئے اسی قدر پر اکتفاء کرتا ہوں کیونکہ آج کل
اساتذہ و طلبہ کا مزاج بن گیا ہے کہ مشکل اور طویل اباحت سے اپنا دامن اس طرح بچائے رکھنے کی کوشش کرتے
ہیں جیسے قیام و صیام کا پابند شخص گندگی سے اپنے دامن کی حفاظت کرتا ہے۔ بہر حال انخطاطِ علم پر رونے سے زیادہ
تو اتعات و ابستہ کرنا خیالِ محال ہے، یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ کوئی شخص ہمارے آنسوؤں کو خشک کرنے
اور رونے کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کے لئے آگے بڑھے گا اور محققِ عالم بنے گا ہمارا خوابِ شرمندہ تعبیر کرے
گا۔ الا ماشاء اللہ و ما ذا لك على الله عز و ج

بہر حال اگر کسی کو یہ نفیس بحث دیکھنی ہو تو مسلم الثبوت کا مقالہ ثانیہ مع الحواشی اور ابنِ قیم کی مفتاح
دار السعادة وغیرہ کتب سے مراجعت فرمائے۔

باب ماجاء فی الخيانة والغش

”عن ابی صرمة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ضارّ ضارّ الله به ومن شاقّ

شاق الله عليه“ (حسن غریب)۔

حضرت ابو صرّہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کو نقصان
پہنچائے اللہ اس کو نقصان پہنچائے گا اور جو شخص کسی کو مشقت میں ڈالے (یا کسی سے پہلو تہی کرے) تو اللہ تعالیٰ

اس کو مشقت میں ڈالے گا (یا اللہ اس سے اعراض کرے گا)۔

دوسری حدیث :- باب کی دوسری حدیث حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص ملعون (رحمت سے دور) ہے جس نے کسی مسلمان کو نقصان پہنچایا، یا اس کے ساتھ دھوکہ اور دغا کیا۔ (حدیث غریب)

لغات :- قولہ "العیانۃ" یہ لفظ امانت کے مقابل آتا ہے۔ خیانت کی تفصیل "باب ماجاء فی شفقۃ المسلم علی المسلم" میں "لا یخونہ" کے تحت گزری ہے۔ قولہ "الغش" بکسر القین یہ دونوں الفاظ گویا نصیحت و خیر خواہی کے مد مقابل آتے ہیں اس لئے غش کا اطلاق دھوکے، ملاوٹ اور کینہ وغیرہ سب پر ہوتا ہے۔ قولہ "من ضار" راء کی تشدید کے ساتھ ضرر اور محضرت سے ہے۔ قولہ "ضار اللہ بہ" یعنی اللہ اس کو ضرر میں مبتلا فرمائیں گے۔ قولہ "ومن شاق" تشدید القاف، مشقت سے بھی ہو سکتا ہے اور شق بمعنی پہلو جی سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ جس آدمی سے اختلاف ہوتا ہے تو وہ ایک شق یعنی کنارے پر ہوتا ہے اور یہ دوسرے پر ہوتا ہے اور پر ترجمہ میں بین القوسین اس معنی کو بیان کیا گیا ہے۔

تشریح :- حضرت ابو صرمدؓ بکسر الصاد کی یہ روایت مستند احمد، سنن ابی داؤد و نسائی اور ابن ماجہؒ میں بھی ہے۔ خیانت اور دھوکہ دونوں شیطانی صفات ہیں جس طرح شیطان آدمی کو جھوٹی تسلیاں دیتا ہے اور فریب دے کر اسے صحیح راستے سے ہٹاتا ہے اور جھوٹ کو مزین کر کے اس کی نظر میں حسین بناتا ہے، اسی طرح گناہ کے جملہ امور سے اس کا دل بہلاتا ہے جبکہ وہ درحقیقت دھوکہ ہے، اسی طرح جو شخص یہ کام اپنے کسی بھائی کے ساتھ کرے گا گویا وہ شیطان کا بھائی ہے، اس لئے دوسری حدیث میں اسے ملعون یعنی اللہ عزوجل کی رحمت سے بعید قرار دیا، اعازنا اللہ من غصہ وعذاب۔

باب ماجاء فی الخیانة والغش

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۵۶ ج: ۲ "باب فی القضاء" کتاب القضاء، سنن ابن ماجہ ص: ۱۶۹ "باب من بنی علی حقد" ساینٹر بیجارہ "ابواب الاحکام، مستند احمد ص: ۳۸۷ ج: ۳ حدیث: ۱۵۳۲۸، عن ابی صرمة عن رسول اللہ ﷺ من ضار اخرہ اللہ ومن شاق شقہ اللہ علیہ. الحنفی عفی عنہ

باب ماجاء فی حق الجوار

”عن محامد بن عبد اللہ بن عمرو دُبَحْتُ لَهُ شاةٌ فِي اَهْلِهِ فَلَمَّا جَاءَ قَالَ اَهْدَيْتُمْ لِحَارِنا الْيَهُودِي؟ اَهْدَيْتُمْ لِحَارِنا الْيَهُودِي؟ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَا زَالَ جِبْرِيلُ يُوَصِّنِي بِالْحَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُورِّثُهُ“۔^۱

حضرت مجاہد سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو کے لئے ان کے گھر میں بکری ذبح کی گئی تھی جب وہ تشریف لائے تو (گھروالوں سے) پوچھا کہ کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کو بھی (گوشت کا) ہدیہ دیا ہے، (دوسرے فرمایا پھر حدیث بیان کرنے لگے) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل مجھے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اس قدر تاکید فرماتے کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید اسے وارث قرار دیں گے۔

تشریح: بقولہ ”الحوار“ ص ۱۳ واضح بکسر الجیم ہے جبکہ ضمہ بھی جائز ہے۔ بقولہ ”اھدیتم“ یہاں ایک ہمزہ مقدر ہے جو برائے استفہام ہے یعنی اُھدیتم، اھداء سے ہے بمعنی ہدیہ دینا۔ بقولہ ”سیورثہ“ وراثت باب تفعلیل سے میراث دینے کو کہتے ہیں۔ جبکہ مجرد سے میراث لینے کے معنی میں آتا ہے، پھر سیورث کی ضمیر اللہ کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور جبرئیل کی طرف بھی، اس صورت میں نسبت مجازی ہوگی۔

تشریح: اس حدیث سے ہمسایہ کے حق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنا مؤکد ہے ایک طرف حضرت عبد اللہ بن عمرو کا کلام ذوالہرام اور دوسری جانب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بارہا تاکید اور وصیت، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو وارث بنا دیا جائے گا۔

پھر اس تواریث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ تاکید صرف نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مختص تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کوئی مادی و مالی میراث نہیں ہوتی ہے گو کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گمان اپنے پڑوسی کے بارے میں اپنی میراث کے بارے میں بھی ہو اور یہ اس وقت کی بات ہو جب آپ صلی

باب ماجاء فی حق الجوار

۱۔ أخرجه أيضاً أبو داود ص: ۳۵۴ ج: ۲ ”باب فی حق الجوار“ کتاب الادب، وقال الحافظ وقد روی هذا المتن من طرق

كثيرة وعن جماعة من الصحابة رضي الله عنهم الترهيب والترهيب ص: ۲۳۶ ج: ۳۔

اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں دیا گیا تھا کہ انبیاء علیہم السلام نہ میراث لیتے ہیں اور نہ ہی دیتے ہیں۔ لیکن بے غبار بات یہ ہے کہ یہ حکم امت کے بارے میں ہے لہذا عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ ”یوصینی جبرئیل بان آمر الامة برعاية حقوق الجار حتی ظننت ان يحکم بتوریت احد الجارین الآخر“۔ کما فی الخاتمة

بہر حال ہر ایک جانتا ہے کہ اس کلام میں بہت تاکید اور مبالغے سے ہمسایہ کے حقوق اُجاگر کئے گئے ہیں، علاوہ ازیں قرآن سمیت بہت سی احادیث مبارکہ میں پڑوسی کا حق بیان مؤکد کے ساتھ مروی ہے مثلاً باب کی دونوں حدیث اور بخاری شریف کی حدیث ”من کسان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم جاره“ اور (ص: ۸۸۹ ج: ۲) کی ایک روایت میں ہے ”فلا یؤذی جاره“ اور بخاری کے اسی صفحہ پر ہے ”واللہ لایومن، واللہ لایومن یواللہ لایومن یقبل ومن یرسل اللہ؟ قال: الذی لایامن جاره بوائقه“ (شرارتوں سے) اس کے علاوہ بھی بہت احادیث ہیں مگر اختصار کے پیش انہیں ذکر نہیں کیا جاسکا۔

قصہ مختصر پڑوسی کے حقوق تو ہیں مگر کیا ہیں تو اس پر اتفاق ہے کہ حسن سلوک کے تمام شعبے مراد ہیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس سلوک میں سارے جیران و ہمسایہ داخل ہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو اس میں کافر و مسلمان نیک و فاسق اور امیر و فقیر سب شامل ہیں البتہ جس پڑوسی سے حقوق کے اسباب جتنے زیادہ ہوں گے، وہ اس حسن سلوک مثلاً ہدیہ وغیرہ کا نسبت زیادہ مستحق ہوگا مثلاً ایک پڑوسی رشتہ دار بھی ہے اور مسلمان بھی اور استاذ بھی تو اس کا حق غیر استاذ سے زیادہ ہے پھر مسلمان اور رشتہ دار کا علی ہذا القیاس اسی طرح جو پڑوسی جتنا قریب ہوگا وہ زیادہ مستحق ہوگا نسبت دور والے کے اگرچہ دور والے کا بھی حق ہے اور چاہئے یہ کہ آدمی تمام اہل محلہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے مگر قریب والے پڑوسیوں کے حقوق بطور خاص قابل لحاظ بلکہ واجب الرعاۃ ہیں۔

اس پر بھی اتفاق ہے کہ نفس پڑوسی کی بنیاد پر کوئی آدمی پڑوسی کا وارث نہیں بنتا جیسا کہ حدیث باب سے ظاہر ہے البتہ حق شفعہ میں اختلاف ہے: ہمارے نزدیک حق جو اہل حق جو اہل حق شفعہ بھی داخل ہے جبکہ شوافع وغیرہ کے نزدیک یہ حقوق الجوار میں شامل نہیں۔ کما بین فی محلہ

ع کما ورد فی الحدیث ان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ودرہماً الخ رواہ ابو داؤد کتاب العلم باب الحدیث علی طلب العلم، وابن ماجہ والترمذی واحمد وابن حبان وغیرہم وسندہ حسن، سنن دارمی ص: ۱۱۰ ج: ۱، وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما معشر الانبیاء، رواہ البخاری ومسلم وابوداؤد والترمذی والنسائی ومالک فی الموطا واحمد، المعجم المفہر ص: ۱۸۲ ج: ۷۔

ہمسائیگی کے چند اہم حقوق:- (معارف الحدیث ج ۶ ص ۳۰۹) پر بیجم کبیر للطبرانی کے حوالے سے مندرجہ ذیل حدیث رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی گئی ہے فرماتے ہیں:

”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: حق الجاران مرض عُدته وإن مات شيعته وإن استقرضك أقرضته وإن أعور سترته وإن أصابه خیر هَنَأْتَهُ وإن أصابه مصيبة عزيتَه ولا ترفع بناءك فوق بناءه فتسُدَّ عليه الریح ولا تؤذيه بریح قدرك إلا أن تعرف له منها“۔^۳

یعنی پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو اور اگر انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ (یعنی تدفین میں تعاون کرو) اور اگر وہ قرض مانگے تو اس کو قرض دو اور اگر وہ کوئی بُرا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو اور اگر کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو اور اپنی عزت اس کی عزت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی دیوار بند ہو جائے اور اپنی بانڈی کی مہک سے اس کو ایذا مت پہنچاؤ الا یہ کہ اس میں سے تھوڑا سا اس کے گھر بھی بھیج دو۔

اور ارشاد ہوا:

”وإن اشتریت فاكهة فاهذله فإن لم تفعل فادخلها بئرًا ولا يخرج بها ولدك ليغبط بها ولده“۔

اور اگر تم کوئی پھل خرید کر لاؤ تو اس میں سے پڑوسی کے ہاں بھی ہدیہ بھیجو اور اگر ایسا نہ کر سکو تو اس کو چھپا کے لاؤ اور پھر تمہارا کوئی بچہ وہ پھل لے کر باہر نہ نکلے کہ پڑوسی کے بچے کے دل میں اسے دیکھ کر جلن پیدا ہو۔ (ایضاً حوالہ: ابس: ۱۰/۲، بحوالہ کنز العمال)

غرض پڑوسی کے ساتھ انتہائی اچھا برتاؤ کرنا اسلامی تعلیمات کے اخلاقی اور معاشرتی اصول کا زین اصول ہے اس سے دونوں کی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے، جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا قوی سبب ہے۔ مزید تفصیل راقم کی کتاب نقش اخلاق (نقش قدم کامل) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۳۔ أخرجه الطبرانی في الكبير ۴/۱۹۱ بحواله مجمع الزوائد ۲/۱۴ ج ۲: ۸۰ حدیث: ۱۳۵۴۵ کتاب البر والصلة، أيضاً رواه ابن حبان عن معاذ بن جبل التريخ والترتيب ص: ۲۳۳ ج ۳.

آخری حدیث :- باب کی آخری حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتھیوں میں سب سے اچھا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے ساتھی سے اچھا برتاؤ کرتا ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے اچھا پڑوسی وہ ہے جو اپنے ہمسایہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہو۔ اللہ عزوجل کا فرمان ہے ”وَالْحَارِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْحَارِثُ الْجَنبِ وَالصَّاحِبُ بِالْجَنبِ“ نیکی کرو ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ ”وَالصَّاحِبُ بِالْجَنبِ“ کی تفسیر میں ابو سعود لکھتے ہیں :

”ای الرفیق فی امر حسن کتعلم وتصرف وصناعة وسفر فانه صحبك وحصل بحانك ومنهم ممن قعد بحبك فی مسجد او مجلس او غیر ذالک من ادنی صحبة التأممت بینک و بینہ وقیل ہی المرأة“۔

باب ماجاء فی الاحسان الی الخادم

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اخوانکم جعلہم اللہ فیتۃ تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یدہ فلیطعمہ من طعامہ ولیلبسہ من لباسہ ولا یمکلفہ ما یغلبہ فان کلفہ ما یغلبہ فلیعنتہ“۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (یہ غلام) تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے زیر دست غلام بنایا ہے، بس جس شخص کا بھائی اس کے ماتحت ہو تو اس کو اپنے کھانے میں سے کھلائے اور اپنے لباس سے اس کو پہنائے اور اسے کسی ایسے کام کا پابند نہ بنائے جو اس کے بس کا نہ ہوتا ہم اگر اسے کسی بھاری کام پر لگائے تو خود اس کی مدد کرے۔

لغات :- قولہ ”احسان“ اس کے صلے میں جب الی آجائے تو بمعنی نیک سلوک کے آتا ہے جیسا یہاں آیا ہے جبکہ بغیر ”الی“ کے اخلاص کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ حدیث جبرئیل میں ہے ”ما الاحسان؟“ ہے۔ قولہ ”اخوانکم“ ایک روایت میں ہے ”ہم اخوانکم“ جبکہ بخاری شریف کتاب الایمان کی روایت

میں ”اخوانکم عولکم“ کے الفاظ آئے خول الخاء والواو خادم۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ ”و اصل (خ و ع) الاصلاح“ چونکہ خادم بھی آدمی کے امور کی اصلاح کرتا ہے اس لئے اسے خول کہتے ہیں۔

قولہ ”فتیہ“ بکسر الفاء فتی کی جمع ہے غلام کو کہتے ہیں چنانچہ بعض حضرات نے اسی معنی لغوی کو دیکھتے ہوئے موقف اپنایا ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے کہ اللہ نے فرمایا:

”واذ قال لفتاہ“^۱ وقال فی آية اخری ”وقال لفتیانہ اجعلو بضاعتم فی

رحالهم“۔ (سورۃ یوسف آیت: ۶۲)

قولہ ”تحت یدہ“ یعنی تحت قدرتہ۔ (العارضہ)

تشریح: غلام اگرچہ اصلہ آزاد پیدا ہوتا ہے مگر جب وہ کفر اختیار کرتا ہے تو اللہ نے اس کو غلامی کی ذلت آموز سزا میں مبتلا فرمایا لیکن مع ہذا اقرار کو اس کے ساتھ نرمی کرنے کا حکم دیا کہ وہ اللہ کا مجرم ہے لوگوں کا نہیں۔ پس اگر وہ توبہ تاب ہو جائے تو اس کی نسل آزاد ہوگی ورنہ وہ بھی ماں باپ کی سزا کے طور پر غلامی کے مستحق ہوگی کیونکہ آباء کے اعمال کا اچھا اثر اولاد پر ہونا لازمی ہے۔

چونکہ یہ اسلام کی آمد سے پہلے کی ایک عام رسم تھی جو جنگی قیدیوں کے بجائے قتل یا قیدی بنانے کے متبادل کے طور پر دنیا میں رائج تھی تو شریعت نے اس کو ختم تو نہ کیا مگر غلاموں کو آزاد کرنے اور ان کے ساتھ نرمی کرنے کو نیکی کا بہت بڑا باب قرار دیا، تاکہ لوگ غلاموں کو آزاد کرتے رہیں یا پھر ان کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کریں چنانچہ حدیث کا پہلا لفظ ”اخوانکم“ اس پر مطلق ہے، لہذا آدمی کو آقا کا تاثر دینے کے بجائے بھائی بنی کا تاثر قائم کرنا چاہئے اس حدیث شریف کا یہ حکم انتخاب پر محمول ہے لہذا افضل یہ ہے کہ آدمی خود جیسا کھاتا ہے اور جو لباس زیب تن کرتا ہے غلام کو بھی اسی طرح دے مگر یہ واجب نہیں، لہذا اسے کم درجے کی چیز دینا بھی جائز ہے البتہ راوی حدیث حضرت ابو زر رضی اللہ عنہ اس انتخابی حکم کا اس طرح اہتمام فرماتے جیسے امر و جوبی کا ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اسے ظاہر پر حمل کرتے تھے۔

دوسری حدیث: ”لا یدخل الجنة منیء المملکة“^۲ یعنی اپنے غلاموں کے ساتھ ناروا سلوک

باب ما جاء فی الاحسان الی الخادم

۱۔ صحیح بخاری ص: ۹۰ ج: ۱ ”باب المعاصی من امر الجاهلیۃ الخ“ کتاب الایمان۔ ۲۔ سورۃ الکہف آیت: ۶۱۔

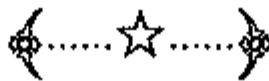
۳۔ الحدیث أخرجه احمد و ابو یعلیٰ باسناد حسن و بعضه عند الترمذی و غیره۔ الترغیب والترہیب ص: ۷۰ ج: ۳۔

کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

لغات :- ”سبیہ“ ”سہیلہ“ ”سہیلہ“ (س، و، و) مادہ میں عیب اور برائی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ”ملکہ“ ملک سے ہے یعنی جو ملک کے ساتھ برابرتاؤ کرے اور وہ ملکہ بھی محتمل ہے جو مقابل حال آتا ہے یعنی جو حالت اور وصف پختہ عادت بن جائے۔

تشریح :- علی ہذا مطلب یہ ہوگا کہ جس آدمی کی یہ بُری عادت ہو جو ہمیشہ اپنے غلاموں اور خادموں سے سختی سے پیش آتا ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا، کیونکہ جنت رحمت باری کا اثر ہے لہذا اس میں وہ لوگ جائیں گے جو اللہ کی مخلوق پر شفقت کرتے ہیں، بخلاف ان لوگوں کے جو سخت مزاج ہوں ان کے لئے تو دوزخ ہے کہ لوہا آگ سے نرم ہوتا ہے اور پتھر گرم ہونے سے پھلتا ہے۔ پہلے بارہا گذرا ہے کہ اس قسم کی احادیث کو خاصیت المفرد پر حمل کرنا چاہئے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دخول اولیٰ کی نفی مراد ہو یعنی ایسے لوگ جو حرام نہیں وہ اپنی غیبتوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائیں گے۔

آج کل تو غلام نہیں ہیں لیکن لو کہتے ہوتے ہیں لہذا ان کے ساتھ نیک برتاؤ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا غلاموں کے ساتھ ہے کہ اگرچہ بُرا سلوک کرنے کی صورت میں وہ نوکری چھوڑ سکتے ہیں اور خود کو ذلت سے آزاد کر سکتے ہیں، مگر ان میں سے اکثریت کی بعض ایسی مجبوریاں ہوتی ہیں جو نوکری چھوڑنے سے مانع ہوتی ہیں لہذا ان کی مجبوری سے غلط استفادہ اتنا ہی گناہ ہے جتنا غلام کے ساتھ ناروا سلوک کا ہے۔ ہاں اگر کوئی نوکر اور ملازم صحیح ذیوقی نہیں کر رہا یا خائن ہے یا کوئی اور عیب اس میں ہو تو اسے نوکری سے فارغ کیا جاسکتا ہے لیکن احسن طریقے سے کہ اسے بروقت بتلایا جائے جو اس کا حق بنتا ہے وہ پورا دے اور اچھے الفاظ میں معذرت کر لی جائے۔



باب النهی عن ضرب الخدّام وشتّمهم

”عن ابی ہریرۃ قال قال ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نبی التوبۃ من قذف مملوکہ بریقاً متافال لہ، اقام اللہ علیہ الحدیوم القیۃ الا ان یکون کما قال۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی توبہ ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مملوک کو تہمت لگائے دراصل حالیکہ وہ اس الزام سے پاک ہو تو اللہ اس کو قیامت کے دن حد لگائیں گے الا یہ کہ وہ ایسا ہی ہو جیسا اس نے کہا ہے۔

لغات :- ”شتّم“ گالی دینے اور برا بھلا کہنے کو کہا جاتا ہے۔ قولہ ”نبی التوبۃ“ ابو القاسم سے بدل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت استغفار فرماتے۔ قولہ ”قذف“ لغت میں پھینکنے کو کہتے ہیں مگر اصطلاح میں پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگانے کو کہا جاتا ہے یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

تشریح :- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظلم کا بدلہ اگر دنیا میں نہ ملے تو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ سزا ختم ہوگئی کیونکہ مظلوم کے لئے اللہ قیامت کے دن ظالم سے انتقام لیں گے اے اے اللہ منہ۔ چونکہ باندی اور غلام اپنے آقا سے گالیوں اور بہتان کا بدلہ تو لے نہیں سکتے، اور شبہ کی وجہ سے حد قذف بھی جاری نہ ہوتی اس لئے یہ سزا آخرت میں بھگتنا ہوگی۔

”قولہ ”الا ان یکون“ الخ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ استثنا مشکل ہے کیونکہ ”بریقاً“ اس استثنا کی نفی کرتا ہے اور پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے کہ ”بریقاً“ کا تعلق نفس الامر سے نہیں بلکہ آقا کے خیال سے ہے یعنی وہ باندی یا غلام نفس الامر میں تو زانی ہے لیکن قاذف کے ظن و اعتقاد میں پاک ہے۔ علیٰ ہذا مطلب یہ ہوگا ”من قذف مملوکہ وهو بریء فی ظنہ واعتقاده“ الخ یعنی اگر وہ ایک بری اور پاک غلام یا باندی پر جسے وہ خود بھی پاک سمجھتا ہے الزام و تہمت لگائے تو اسے قیامت کے دن حد لگے گی الا یہ کہ وہ واقعی زانی ہو تو پھر حد نہیں ہوگی۔

دوسری حدیث :- حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا کہ اتنے میں اپنے پیچھے کسی کہنے والے کو سنا جو کہہ رہا تھا غور سے سنو اے ابو مسعود! غور سے سنو اے ابو مسعود!

جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تجھ پر زیادہ قادر ہے نسبت حیرت کے اس غلام پر چنانچہ ابوسعود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد اپنے کسی غلام کو نہیں مارا ہے۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک سے معلوم ہوا کہ کمزور اور ضعیف کو مارتے وقت یہ تصور کرنا چاہئے کہ اللہ کی لٹاٹھی بے آواز ہوتی ہے اور جب چلتی ہے تو پھر اس کے آگے کوئی طاقت مزاحمت کی تاب نہیں لاسکتی لہذا غلام و خادم ہوں یا بیوی بچے اور شاگرد وغیرہ سب کا حکم یہی ہے۔ بعض بڑے بڑے سردار اور زمیندار اپنے مزدوروں کو بے دردی سے مارتے ہیں ان کو بھی اللہ کا خوف کرنا چاہئے، تاہم جن لوگوں کی سرپرستی کسی کو حاصل ہو تو تادیب شرعی کی نیت سے ان کا مارتا جائز ہے جس کے لئے امام ترمذی نے اگلا باب قائم کیا ہے۔

باب ماجاء فی ادب الخادم

”عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا ضرب احدکم خادمه فذكر الله فارفعوا اليه يكم“۔ الحديث اخرجه البيهقي في شعب الایمان لكن ابوهارون خارجي وشيعی منهم بالكذب۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو مار رہا ہو اور وہ اللہ کا نام لے لے تو اپنے ہاتھ (اس سے) اٹھا لو (یعنی مزید مارتا بند کرو)۔

تشریح:۔ سابقہ باب سے خادم کے مارنے کی نفی معلوم ہوتی تھی تو اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ خادم کو کسی بھی صورت میں مارتا جائز نہ ہوگا، تو امام ترمذی نے اس باب میں اس توہم کا ازالہ کیا اور ترجمۃ الباب کے ساتھ حدیث کی مناسبت اس طرح ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ باب کا مسئلہ اس حدیث سے اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ اس ارشاد میں مارنے کی نفی نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ مارنے کے دوران اگر غلام وغیرہ تمہیں اللہ کا واسطہ دے کہ مجھے معاف کر دو تو آپ اسے معاف ہی کر دیں جس سے ضرب کا جواز معلوم ہوا۔

پھر یہ روایت اگرچہ ابوہارون کی وجہ سے ضعیف ہے لیکن اس کا مضمون صحیح ہے، چنانچہ ادب سکھانے کی

خاطریوی کا مارتا تو قرآن سے ثابت ہے^۱ اور تادیب شرعاً امر مطلوب ہے جس میں کبھی کبھار بیٹے اور شاگرد کو مارنے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اور یہی مطلب ہے اس فرمان^۲ کا ”وَلَا تَرْفَعِ عَنْهُمْ عَصَاكَ أَدَبًا“ (مشکوٰۃ ص: ۱۸) تاہم مارنے کی اپنی حد ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے خلاصہ یہ ہے کہ مارنے میں سراور چہرے کو بچا کر تین ڈنڈے یا تھپڑ مارنا جائز ہے، بشرطیکہ زخمی کرنے والے نہ ہوں۔ ابن العربیؒ لکھتے ہیں کہ اگر پڑوسی غلام کی شکایت کرے تو اس کی شکایت پر بھی مارا جائے اور مارتے وقت اس غلطی کا تذکرہ بھی کرے تاکہ ڈانٹ ڈپٹ اور مارنے کا فائدہ بھی حاصل ہو علیٰ ہذا یہ حکم بچے کا بھی ہوگا۔ واللہ اعلم وعلیہ السلام

باب ماجاء فی العفو عن الخادم

”عن عبد اللہ بن عمر قال جاء رجل الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا رسول اللہ کم أعفو عن الخادم؟ فصمت عنه النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال یا رسول اللہ کم أعفو عن الخادم؟ قال: کل یوم سبعین مرة۔“ (حسن غریب)^۱

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! اپنے خادم کو کتنی بار معاف کر لیا کروں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، اس نے پھر پوچھا اے اللہ کے رسول! میں کتنی مرتبہ اپنے غلام کو معاف کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ۔

تشریح:- حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سائل کے سوال پر خاموشی اختیار کرنا وحی کے انتظار کی بنا پر بھی ممکن ہے اور سوال کو ناپسند کرنے کی وجہ سے بھی ممکن ہے کیونکہ معافی ایسی نیکی ہے جس کو محدود کرنے سے وہ محدود ہو جاتی ہے جبکہ نیکی اور خصوصاً ادائیگی کو کسی عدد کے ساتھ منحصر نہیں کرنا چاہئے بلکہ زندگی بھر اس پر عمل

باب ماجاء فی ادب الخادم

۱۔ کما قال اللہ عزوجل للمعجزون فی المضاجع واضربوهن الخ سورة النساء آیت: ۳۴۔

۲۔ رواہ احمد ص: ۳۱۶ ج: ۶ حدیث: ۲۱۵۷۰۔ حقیق الرحمن الحنفی

باب ماجاء فی العفو عن الخادم

۱۔ الحدیث أخرجه ابو داؤد ص: ۳۵۵ ج: ۲ باب فی حل المملوک کتاب الادب، ایضاً سنن کبریٰ للبیہقی ص: ۵۱۷ ج: ۱۱ حدیث: ۱۶۲۲۶۔

کرنا چاہئے۔

اعتراض:- اگر معافی کو عدد سے منسلک کرنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو پھر خود ستر کا عدد کیوں متعین فرمایا؟

جواب:- اگر یہ خاموشی وحی کے انتظار میں مانی جائے پھر تو کوئی اشکال نہیں لیکن اگر دوسری توجیہ کی بناء پر ہو تو پھر جواب یہ ہے کہ سہین کا عدد انحصار کے لئے نہیں ہے بلکہ کثرت سے کنایہ ہے جیسے اس آیت میں ہے ”ان تستغفرلہم سبعین مرۃ“ الایہؑ یا پھر مطلب یہ ہے کہ ستر مرتبہ معافی کے بعد جرم کرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

اس روایت میں امام ترمذی نے ”حسن غریب“ کہا ہے مگر ملا علی قاریؒ مرقات میں نقل کرتے ہیں کہ ترمذی کے بعض نسخوں میں اسے ”حسن صحیح“ کہا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس روایت پر ابوداؤد سکوت کریں اور منذری صحیح کریں تو وہ صحیح ہوتی ہے اس روایت کو منذری نے جید الاسناد کہا ہے۔

باب ماجاء فی آداب الولد

”عن جابر بن سمرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لَان یؤدّب الرجل ولده غیر من ان یتصلدی بصاع“۔ (حلیث غریب) لان ناصح بن علاء الکوفی لبس بالقوی فهو حلیث ضعیف۔

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ آدمی کا اپنے بیٹے کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ دینے سے افضل ہے۔

لغات: مقولہ ”لَان یؤدّب“ لام برائے تاکید بمعنی القسم آتا ہے جبکہ ان مصدر یہ فعل مضارع کو بمعنی مصدر بناتا ہے۔ حاصل کلام اس طرح ہے ”واللہ نادیب الرجل ولده“ ”ادب“ ادب لغت میں اصالت و دعوت دینے کو کہتے ہیں مگر خصال حمیدہ اور شانگی کو بھی ادب اس لئے کہتے ہیں کہ یہ خیر و بھلائی کی طرف بلاتے ہیں۔ یہاں مراد تہذیب، سلیقہ اور اچھے طور و طریقہ کی تعلیم ہے۔

تشریح:- چونکہ انسانی زندگی بغیر آداب کے خوشگوار نہیں بن سکتی اس لئے شریعت نے آداب زندگی

کی اہمیت کو بار بار اُجاگر کیا ہے اور آداب کا دامن بہت وسیع ہے اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ بیٹے کو مکمل مہذب بنانا ایک صاع کے صدقہ سے افضل ہے بلکہ وہ تو کئی نیکیاں ہیں لہذا یہاں ایک ہی ادب مراد ہے مثلاً بیت الخلاء میں داخل ہونے کے وقت پہلے بایاں پاؤں داخل کرنا ایک ادب ہے اور نکلتے وقت دایاں پہلے نکالنا دوسرا ادب ہے علیٰ ہذا القیاس پھر اس کی افہامیت ایک صاع کے صدقہ سے اس بنا پر ہے کہ ادب سکھانے کے بعد جب اس پر عمل درآمد ہو گا تو یہ ایک جاری و ساری صدقہ ہو گا جبکہ صاع تو جلد ہی ختم ہو جاتا ہے گو کہ وہ بھی بڑھتا رہتا ہے لیکن وہ اضافہ اخروی ہے جبکہ ادب تو دنیا میں بھی بڑھتا چلا جاتا ہے تو آخرت میں بطریق اولیٰ بڑھے گا۔ (تدبر)

نیز ادب سکھانا ایک علمی افادہ ہے جبکہ صدقہ مالی تعاون ہے۔ مثال اس لئے کہ والد کی تادیب یقیناً اپنے محل میں واقع ہوتی ہے جبکہ صدقہ میں بے محل وقوع کا بھی احتمال ہے۔ رابعاً تادیب درجہ لزوم میں ہے جبکہ صدقہ درجہ نفل ہے اور واجب کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ خامساً بیانا جب متکادب بنے گا تو دوسروں کو بھی وہ آداب سکھائے گا۔ لہذا یہ ایک متعدی نیکی ہے جبکہ صاع تو کھانے سے ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث:- باب کی دوسری حدیث "ایوب بن موسیٰ عن ابیہ عن جدہ" ہے اس سند میں ابیہ کی ضمیر تو ایوب کی طرف لوثی ہے جس کا مصداق موسیٰ بن عمرو ہیں لیکن "عن جدہ" کی ضمیر میں دو احتمال ہیں (۱) اگر یہ ایوب کی طرف راجع ہو تو ایوب کے دادا عمرو بن سعید ہیں جو تابعی ہیں زمانہ پیدائش دور خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہے لہذا روایت مرسل ہوگی۔ (۲) اور اگر ضمیر موسیٰ کی طرف لوثی ہو تو پھر مصداق سعید بن العاص ہیں یہ اگرچہ عہد پاک میں حین حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے لیکن صاع میں شک ہے اس لئے امام ترمذی نے اس حدیث کو بنا بر ہر صورت مرسل قرار دیا ہے۔

بہر حال اس سند کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی باپ بیٹے کو حسن ادب سے زیادہ بہتر تحفہ نہ دے سکا۔ نحلاً بضم النون اور بحلاً بکسرہ نون عطیہ، ہبہ اور تحفے کو کہتے ہیں۔ اس تفصیل کی وجہ یہ یہی ہے کیونکہ انسان کی سعادت و کمالات کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے ایک حکمت نظر یہ اور دوم حکمت عملیہ علم پر موقوف ہے اور علم تادیب و تعلم پر، جب باپ اپنے بیٹے کو مہذب بناتا ہے تو وہ علم و عمل دونوں اعتباروں سے کامل بن جاتا ہے اور مملوک کے درجہ سے ملوک کے مقام تک پہنچ جاتا ہے، پھر حسن ادب کا مطلب وہی ہے جو عند الشرع معتبر ہے جیسے حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو بطور نصیحت آداب کے چند کلمات ارشاد فرمائے تھے

جن کو قرآن نے بھی نقل کیا ہے اس سے اچھی تہذیب و تربیت کا عالی مقام بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے ورنہ تو قرآن اس کو بطور مدح نقل نہ کرتا۔

باب ماجاء فی قبول الهدیۃ والمکافاة علیہا

”عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل الہدیۃ ویثیب علیہا“۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے اور اس کا بدلہ عطا فرماتے۔

لغات:- قولہ ”الہدیۃ“ عقیدت و محبت کی بنا پر کسی کو ایسا تحفہ دینا جس کا کوئی عوض پہلے نہ ملا ہو گو کہ بعد میں عوض مل جائے۔ قولہ ”مکافاة“ مجازات اور بدلہ کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ویثیب علیہا“ اٹالہ سے بمعنی بدلہ دینے کے اس لئے نیکی کو ثواب کا کام کہتے ہیں کہ ثواب بمعنی جزا اور بدلہ کے ہے۔

تشریح:- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے مگر صدقہ قبول نہ فرماتے اس کی وجہ ابواب الزکوۃ ”باب ماجاء فی کرہیۃ الصدقۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم“ الخ میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۱۱۹ جلد سوم) پھر اخلاق کریمانہ کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ میں قدر و قیمت کی رعایت نہیں فرماتے بلکہ ہدیہ پیش کرنے والے کی دلدادگی کے پیش نظر معمولی قسم کا تحفہ بھی قبول فرماتے چنانچہ ارشاد ہے ”لو اھدی لی سکواع لقبلت ولو ذعبت علیہ لآجبت“ اگر مجھے بکری کا ایک بیز بھی ہدیہ کر لیا جائے تو میں ضرور قبول کروں گا اور اگر اس کی دعوت دی جائے تو میں ضرور جاؤں گا۔ (شامل ترمذی)۔

چونکہ اکرام مسلم واجب ہے اور ہدیہ اکرام کا بہترین طریقہ ہے لہذا ہدایا کا تبادلہ اس مقصد کے حصول میں بڑا معاون ثابت ہو جاتا ہے لہذا اگر ہدیہ قبول کرنے سے کوئی شرعی مانع نہ ہو تو اسے رد نہیں کرنا چاہئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری عادت شریفہ یہ تھی کہ ہدیہ قبول کرنے کے بعد اس کا بدلہ بطور نعم البدل عنایت فرماتے کیونکہ جب ہدایا کا تبادلہ طرفین سے ہو تو محبت اور تعلق میں کمال اور پختگی آتی ہے بلکہ اس کو ترقی نصیب ہوتی ہے اور اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم بھی دی ہے فرمایا ”من أعطی عطاءً فهو جلیل حذرہ

ومن لم يجد فليش فأن من أننى فقد شكرو من كتم فقد كفر“۔ (ابوداؤد وترمذی) ۱

علیٰ ہذا اگر آدمی مالی بدلہ نہ دے سکے تو کم از کم اس آدمی کے لئے خیر کے چند کلمات کہے یا دعا دے تو بھی بدلہ ادا ہو جائے گا چنانچہ ترمذی کی ایک روایت میں ہے ”من ضیع الیہ معروف فقال لفاعله جزاء اللہ خیر أفقد البلیغ فی الشاء“ ۲ کیونکہ جب اس کا بدلہ اللہ پر چھوڑے گا تو اس سے بہتر کیا بدلہ ہو سکتا ہے۔ احادیث ۳ کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خطیر ساقط ہے تو اس کا بدلہ کسی چیز سے دینا چاہئے اور اگر حقیر سی چیز ہے تو اگرچہ اسے حقیر نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس کا تاثر دینا چاہئے تاہم زبانی دعا اور شکر و ثناء سے بھی بدلہ ہو جائے گا، اس کی کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

حدیث الباب سے استدلال کر کے مالکیہ کہتے ہیں کہ ہدیہ کا بدلہ واجب ہے کیونکہ ”کان“ کا لفظ مواظبت پر دلالت کرتا ہے جو موجب وجوب ہے اور یہی امام شافعی کا بھی قدیم قول ہے مگر حنفیہ کے نزدیک مکافاة یعنی ہدیہ کا عوض اور بدلہ دینا مستحب یا زیادہ سے زیادہ مسنون ہے واجب نہیں بلکہ بدلے کی نیت سے ہدیہ دینا تو بیع ضمنی الجمول ہے جو صحیح نہیں، گو کہ جب بدلہ ملے گا تو انتہاء وہ بیع کہلائے گی اور اس لئے عوض ملنے کے بعد ہدیہ سے رجوع نہیں ہو سکتا لیکن ابتداء میں تو ہدیہ حرام ہی ہے۔ رہا مالکیہ کا استدلال تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ”کان“ احادیث میں استمرار کے لئے نہیں آتا کم از کم غیر مرۃ۔ ثانیاً مواظبت سے اس وقت تک وجوب ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ ترک پر وعید نہ آئی ہو جیسے نماز میں تکبیرات انتقالات اور وضوء میں مضمضہ و استنشاق وغیرہا۔

(ہدیہ سے رجوع کے متعلق مسئلہ ”باب ما جاء فی کراهیۃ الرجوع من الهبة“ میں گزری ہے، دیکھئے

تشریحات ص ۲۲۱ ج ۵)

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۳۱۵ ”باب فی شکر المعروف“ کتاب الادب.

۲۔ ایضاً رواہ الطبرانی فی الکبیر مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸.

۳۔ راجع للاحادیث مجمع الزوائد ص: ۲۳۲ ۲۳۶ ج: ۸.

باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ۔“ (حدیث صحیح)۔^۱

باب کی اگلی روایت حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں لفظ ”لا“ کے بجائے ”لم“ آیا ہے۔ یعنی جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔

تشریح:- عارضہ الاحوذی میں ہے کہ اس حدیث میں اس اور لفظ اللہ کے اعراب کے اعتبار سے چار روایات ہیں (۱) دونوں منصوب (۲) دونوں مرفوع (۳) پہلا مرفوع دوسرا منصوب اور نمبر (۴) اس کے برعکس۔

اوپر ترجمہ میں پہلے اعراب کو ملحوظ رکھا گیا اور مطلب یہ ہے کہ جو آدمی لوگوں کے احسان کا شکر یہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا کیونکہ اس کی طبیعت میں ناشکری سرایت کر چکی ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے کہ لوگوں کے احسانات کا شکر یہ ادا کرو مگر وہ اس حکم کی تعمیل نہیں کر رہا جس سے اللہ کے حکم عدولی کا ارتکاب لازم آتا ہے جو ناشکری ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے احسانات ظاہری اسباب پر مبنی ہیں تو جب وہ اسباب ظاہری کو نہیں سمجھتا اور ان کی قدر نہیں کرتا تو اللہ کی نعمتیں تو غفلت اسباب پر مبنی ہوتی ہیں یہ شخص اس درجے تک کیسے پہنچ پائے گا؟

اگر دونوں مرفوع ہیں تو پھر صریحاً ”من“ کے لئے ضمیر کو مستتر ماننا پڑے گا اور تقدیر یہ ہوگی ”من لا یشکرہ الناس لا یشکرہ اللہ“ یعنی جس شخص کا شکر یہ لوگ ادا نہ کریں اللہ بھی اس کے عمل کی قدر نہیں کرتا کیونکہ لوگ تو زمین پر اللہ کے گواہ ہیں اور ظاہر ہے کہ لوگ تو اس کا شکر یہ نیک سلوک اور احسان پر ادا کریں گے، تو لوگوں کا شکر یہ ادا نہ کرنا اس آدمی کے نیک سلوک کی نفی سے کہنا یہ ہے یعنی اعتقائے لازم سے اعتقائے طرہم مراد ہے پس ایسا شخص جو لوگوں کو شکر یہ کا موقعہ نہیں دیتا یعنی کسی کے ساتھ کچھ بھی مواسات و مہمردی نہیں کرتا تو اس کا عمل عند اللہ مشکور نہیں ہوگا کیونکہ ”وکان معہ مشکوراً“^۲ لایۃ۔^۳ تو نیک سلوک کرنے والوں

باب ماجاء فی الشکر من احسن الیک

۱۔ رواہ ابو داؤد ص: ۳۱۴ ج: ۲ کتاب الادب، مستدرک احمد ص: ۵۰۸ ج: ۲ حلیہ: ۵۴، ع: ۵۴، سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۱۹۔

کے لئے ہے۔

جبکہ تیسرے احوال یعنی ناس کے رفع اور لفظ اللہ کے نصب کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اللہ کا شکر گزار نہ ہو لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے، کیونکہ اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو صحیح مصرف میں لگائے اور جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ بدکار ہوتا ہے لوگ اس کی تعریف کیسے کریں گے؟ چوتھی صورت میں تقدیر اس طرح ہوگی ”مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللَّهَ“ یعنی جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس آدمی کا شکر ادا نہیں کرتا یعنی وہ اس کو دی ہوئی نعمتوں کا فائدہ نہیں دیتا مثلاً قلب ہو گا مگر اس میں ملکوتی فکر نہ ہوگی، آنکھیں ہوں گی مگر ان میں عبرت کی نگاہ نہ ہوگی علیٰ ہذا القیاس۔

باب ماجاء فی صنائع المعروف

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : تَبَسُّمُكَ فِی وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ وَامْرُكُ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَإِشْرَاكَكَ الرَّجُلَ فِی أَرْضِ الْمَضَلِّ لَكَ صَدَقَةٌ وَبَصْرُكَ لِلرَّجُلِ الرَّدَى الْبَصْرُ لَكَ صَدَقَةٌ وَأَمَّا طَعْنُكَ الْحَجَرَ وَالشُّوكَ وَالْعِظْمَ عَنِ الطَّرِيقِ لَكَ صَدَقَةٌ وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلُوكَ فِی دَلْوِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ۔ (حسن غریب)^۱

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی کے زور و تیری مسکراہٹ تیرے لئے صدقہ ہے اور تیرا حکم کرنا اچھی بات کا اور زور و کنابری بات سے صدقہ ہے، اور تیرا رہنمائی کرنا (پریشان حال) آدمی کی نا آشنا جگہ میں تیرے لئے صدقہ ہے اور تیرا آدی کی دنگیری و رہنمائی کرنا تیرے لئے صدقہ ہے اور راستے سے تیرا پتھر ہٹانا اور کاٹنا اور ہڈی ہٹانا تیرے لئے صدقہ ہے، اور تیرا اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا تیرے لئے صدقہ ہے۔

لغات :- ”الصنائع“ صنیع و صدیقہ کی جمع ہے بمعنی احسان کرنے کے۔ قولہ ”تَبَسُّمُكَ“ تبسم کے معنی مسکراہٹ کے ہیں۔ قولہ ”ارض المضلل“ ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں راستہ معلوم کرنے کی علامات نہ ہوں۔ قولہ ”الردی البصر“ ناہیا بصر یعنی بر وزن شمر و کیھنے کی قوت اور نگاہ کو کہتے ہیں ردی البصر وہ شخص کہلاتا ہے

باب ماجاء فی صنائع المعروف

۱۔ ایضاً رواہ بمثلہ ابن حبان فی صحیحہ و البیہقی مختصراً عن ابی ذر، الترغیب والترہیب ص: ۳۷۷ ج: ۳۔

جو توبہ باصرہ سے محروم ہو یعنی اندھا ہوا البتہ یہاں پہلا بصر بمعنی تبصیر ہے۔ قولہ ”اماطة“ ازالہ اور ہٹانے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”انراغلك“ بہانے اور ڈالنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”دلو“ ڈول کو کہتے ہیں۔

تشریح:- عام طور پر جہاں نیک سلوک کے حوالے سے لفظ ”اذیک“ آجائے تو اس سے مراد اسلامی اخوة ہوتی ہے، ان اعمال کو صدقات سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے صدقہ پر ثواب ملتا ہے کہ وہ ایک مسلمان یا کسی انسان کی خوشی کا سبب ہے تو اسی طرح ان اعمال کی وجہ سے جو مسلمان بھائی کی راحت کے اسباب ہیں بھی صدقہ کا ثواب ملتا ہے کہ دونوں کی علت ایک ہی ہے۔

باب ماجاء فی المنحة

”عن البراء بن عازب يقول سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم يقول: من منّ منحةً لمن او رقی او هدی زقاقاً کان له مثل عتق رقبة“۔ (حسن صحیح)^۱

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی کو دودھ والے جانور کا (بقدر ضرورت) عطیہ دیدے یا چاندی کا (بطور قرض) عطیہ دے یا کسی راستہ بھولے ہوئے کی رہنمائی کرے تو اس کو ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔

لغات:- قولہ ”المنحة“ اسی طرح ملتے دونوں کے معنی عطیہ کے بھی آتے ہیں یا اس معنی کہ موہب لہ کو اس کا مالک بنادیا جائے اور عاریہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، کہ کسی کو دودھ والا جانور جیسے بکری، گائے، بھینس یا اونٹنی دے کہ جب تک تمہیں ضرورت ہو اس کا دودھ استعمال کرتے رہو جب میں چاہوں گا یا تیری ضرورت ختم ہو جائے تو واپس لے لوں گا سواری کے لئے گاڑی دینا یا کوئی اور چیز استعمال منافع کے لئے دینا بھی منجہ کہلاتا ہے۔ قولہ ”ورقی“ بکسر الراء و سکونھا چاندی کو کہتے ہیں امام ترمذی نے آگے اس کی تفسیر فرمائی ہے کہ یعنی کسی کو دراہم بطور قرض دیدے۔

قولہ ”او هدی زقاقاً“ بضم الراء اصل میں راستے کو کہتے ہیں یہاں مراد وہ شخص ہے جو راستے کا پتہ

باب ماجاء فی المنحة

^۱ الحدیث أخرجه مسلم في كتاب الزكوة ومسند احمد ص: ۳۴۱ ج: ۵ حدیث: ۹۳۶۱، ایضاً ص: ۳۶۱ ج: ۵

حدیث: ۱۸۰۳۵، ایضاً حدیث: ۱۸۰۶۰

نہیں جانتا کہ یا تو اندھا ہے یا پھر راستہ بھولی گیا ہے پس مطلب ”ہدی زقاقاً“ کا یہ ہوا کہ اسے راستہ بتلائے مگر ایک روایت میں ”ہدی“ دال کی تشدید کے ساتھ آیا ہے تو یہ یا تو مبالغے کا صیغہ ہے یا پھر ہدیہ کے معنی میں ہے پس اس صورت میں زقاق سے مراد کھجوروں کے درختوں کی قطار ہوگی یعنی کسی کو اپنے باغ میں سے چند درخت کھجوروں کے دے، کہ وہ اس کا پھل خود حاصل کر لیں چونکہ باغ کے درخت عموماً قطار میں ہوتے ہیں اس لئے ان کو زقاق یعنی صف اور قطار سے تعبیر کیا، مگر اول رائج ہے مکافرہ المصنف۔

تشریح:- جس طرح غلام اپنی غلامی کی وجہ سے پریشان حال ہوتا ہے مگر اپنی بے بسی کی وجہ سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا تو جو شخص اسے آزاد کرتا ہے وہ غلام کے ہر عضو کے بدلے اپنے اعضاء جہنم کی آگ سے آزاد کر لیتا ہے کہ نیکی اور عمل کی جزائیں نیکی کے مطابق ہوتی ہے، اسی طرح ایک آدمی ضرورت مند ہے اس کے گھر میں دودھ کا انتظام نہیں یا راستے کی وجہ سے اپنی منزل تک نہیں پہنچ پا رہا ایسے میں کوئی آدمی اس کی مدد نہ کورہ صورتوں میں کر لیتا ہے اور اسے پریشانی کی قید سے اور ضرورت کی مشقت سے آزاد کر لیتا ہے تو گویا یہ نیکی، غلامی سے آزادی دلانے کے مترادف ہے اس لئے دونوں کا ثواب مماثل ہوا گو کہ درجات میں تفاوت ممکن ہے۔ (تدبر)

باب ماجاء فی إماطة الأذى عن الطريق

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بینما رجل یمشی فی الطريق اذ وجد عصن شوك فآخزہ فشکر اللہ لہ فغفرلہ۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس دوران کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا تو اس نے ایک کانٹے دار شئی پائی تو اسے ہٹا دیا اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر فرمائی اور اس کی بخشش فرمائی۔ (حدیث حسن صحیح)

لغات:- ”اماطة“ بمعنی ازالہ اور ہٹانے کے۔ قولہ ”الاذی“ تکلیف اور ناگواری کا سبب بننے والی چیز جیسے پتھر، پانی، کانٹے اور دیگر موذی اشیاء جو راستہ میں پڑی ہوں۔ قولہ ”عصن شوك یا شئی“۔ قولہ ”شوك“ کانٹے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فآخزہ“ تاخیر بمعنی ابعاد اور ہٹانے کے ہیں۔

قولہ ”فشکر اللہ لہ“ اسی جزاء یعنی اللہ کو یہ عمل پسند آیا اور اس پر اس شخص کی مغفرت فرمائی۔

تشریح:۔ صحیحین^۱ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے:

”الایمان بضع و سبعون شعبۃ فافصلها قول لا اِلهَ اِلاَّ اللّٰهُ واذناها ما طاعة الاذی عن الطريق والحیاء شعبۃ من الایمان“۔

امام ترمذیؒ نے شاید ترجمۃ الباب کو اسی حدیث سے اخذ کیا ہے، اس میں ”اُذی“ بمعنی موذی کے ہے یعنی تکلیف وہ چیز خواہ وہ کچھ بھی ہو غرض ایمان میں اعلیٰ مقاصد سے لیکر ادنیٰ مفاسد کے ازالے جیسے مقاصد تک اور حقوق اللہ سے لیکر حقوق العباد بلکہ حقوق الثقلت تک تمام امور شامل ہیں، حسب مراتب اعلیٰ پر عالی درجات اور ادنیٰ پر نچلے درجات ملنے کا وعدہ ہے، مگر یہاں یہ اشکال وارد ہو سکتا ہے کا نسا جیسے موذی اشیاء کو ہٹانا جب اعمال صالحہ کا ادنیٰ درجہ ہے تو اس پر مغفرت کیسے مرتب ہوئی؟ اس کا جواب ابن العریفیؒ نے عارضہ میں یہ دیا ہے کہ یا تو اس سے دل میں نرمی اور رحم کا جذبہ پیدا ہوا اور پھر اس کی بدولت توبہ و استغفار کی توفیق نصیب ہوئی یا اس شخص کی نیکیاں اور بُرائیاں دونوں مساوی و برابر تھیں جب یہ ادنیٰ نیکی اس کے نیکیوں والے پلے میں ڈالی گئی تو وہ بھاری ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے کیا معلوم یہی نجات کا ذریعہ بن جائے خواہ پہلی وجہ کے مطابق ہو کہ اس سے ہمارے دلوں میں انشراح پیدا ہو یا پھر اس سے نیکیوں کی شرح بڑھ جائے اور بجائے پچاس فیصد کے اکاون فیصد ہو جائے۔

باب ماجاء ان المجالس بالامانة

”عن جابر بن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا حذث الرجل الحدیث ثم

انْقَضَتْ فَهِيَ امانة“۔ (حدیث حسن)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص کوئی بات کرے اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے تو یہ بات امانت ہے۔

باب ماجاء فی اماطة الاذی عن الطريق

۱۔ المعرجۃ البخاری فی الہیۃ باب: ۳۵ والمظالم باب: ۲۳ والعقیقۃ باب: ۲ والبر باب: ۳۸ ومسلم فی الایمان، وابوداؤد فی الادب باب: ۱۶ وابن ماجہ فی المقدمة باب: ۹، الترغیب والترہیب ص: ۲۷۱ ج: ۳۔

تشریح :- ترجمہ الباب کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی بھی مجلس کی بات بیان کرنا اور غیروں سے ظاہر کرنا جائز نہیں کیونکہ وعظ و نصیحت اور تعلیم وغیرہ عام مجالس کی باتوں کا افشاء بالاتفاق جائز بلکہ مطلوب ہے پس مراد وہ مجالس ہیں، جو دو یا زیادہ آدمیوں کے درمیان ہوں اور ان میں کی جانے والی باتوں کا اخفاء مقصود ہو یعنی راز کی باتوں کا اظہار جائز نہیں علیٰ ہذا ترجمہ الباب میں ”المجالس“ کا الف لام عہد کے لئے ہے اور ”بالامانہ“ میں حرف جر مقدر کے ساتھ متعلق ہے نقد پر اس طرح ہے ”حق المجالس التي يراد إخفاءها بالامانة“۔

کلام کا مقصد جس طرح صریح کلام سے سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے اسی طرح عرف اور دلالت سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے پس جس مجلس کی باتیں راز سے تعلق رکھتی ہوں ان کا اظہار جائز نہیں خواہ کہنے والا اس کی امانت کی تصریح کرے یا نہ کرے لیکن کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہ باتیں عام بتاتا نہیں چاہتا ہے مثلاً وہ کسی کو مجمع سے الگ لے جا کر بات کرے، یا کہے کہ میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کہنا چاہتا ہوں، یا باتوں باتوں میں ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی قریب سے تو نہیں گزر رہا، یا مجلس کے اختتام پر ادھر ادھر دیکھے کہ کسی نے ہماری یہ باتیں تو نہیں سنی ہوں گی، یہ تمام صورتیں اخفاء اور رازداری پر دلالت کرتی ہیں لہذا اس مجلس کی باتیں امانت ہوں گی والا یہ کہ وہ ایسی بات ہو جس کے چھپانے میں کسی دوسرے شخص کا ضرر متوقع ہو خواہ جانی ہو یا مالی ہو یا عفت و عزت سے متعلق ہو ایسے میں متعلقہ شخص کو آگاہ کرنا لازمی ہے تاکہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کرے چنانچہ ابوداؤد میں اس حدیث پر یہ اضافہ موجود ہے ”الانثلاثة مجالس سفك دم حرام أو فرج حرام أو اقتطاع مال بغير حق“۔

باب ماجاء في السخاء

”عن اسماء بنت ابی بکر قالت قلت یا رسول اللہ انہ لیس لی من شئی الا ما أدخل علیّ الزبیر، أفأعطی؟ قال نعم، لا توکی فیوکی علیک، یقول لا تحصی فیحصی علیک“۔
حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میری ذاتی

باب ماجاء ان المجالس بالامانة

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۳۲۰ ج: ۲ ”باب فی نکل الحدیث“ کتاب الادب۔ حفیظ الرحمن الحنفی ندوة العلم کراچی

ملک میں کوئی چیز نہیں ہے سوائے اس کے جو زیر لا کر مجھے دیتے ہیں (یعنی گھر میں لاتے ہیں) تو کیا میں وہ دے سکتی ہوں؟ (یعنی اس میں سے مجھے صدقہ دینے کا اختیار ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہاں“ تم بندھن مت لگانا ورنہ تجھ پر بندھن لگا دیا جائے گا (یعنی ڈوری مت کسو ورنہ تیری رزق دانی کی ڈوری کس کر جک کر دی جائے گی) (راوی کہتا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کن کن کر مت رکھو ورنہ تیرے ساتھ بھی گنتی اور حساب کا معاملہ ہوگا۔

لغات :- سخاوت فضائل اعمال اور اخلاق کریمانہ میں عمدہ وصف ہے چونکہ ہر فضیلت دو روزیوں کے درمیان ہوتی ہے اس لئے سخاوت بخل اور اسراف کے مابین معتدل درجے کا نام ہے، جو ضرورت اور مرقت کے مطابق طیب خاطر سے مالی حقوق کی ادائیگی سے عبارت ہے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔

قولہ ”لا تو کسی“ ایکام سے ہے وکاء وہ ڈوری کہلاتی ہے جس سے مشکیزے یا تھیلے کو باندھا جاتا ہے کنایہ ہے عدم بخل سے کیونکہ پہلے زمانے میں لوگ راشن کی چیزیں آٹا وغیرہ خشک مشکیزے میں رکھتے تھے۔ قولہ ”لا تحصی“ یہ راوی کی تفسیر ہے احصاء دراصل کنکریوں کے ساتھ گننے کو کہتے ہیں جس میں غلطی کا امکان تقریباً معدوم ہوتا ہے۔ احصاء کے دوسرے معنی پورے پورے استعمال کے بھی آتے ہیں مفسرین نے ”وَان تَعْلَمُوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا“ میں دونوں مطلب بیان کئے ہیں علیٰ ہذا مطلب یہ ہوگا کہ کھانے کی چیزیں گن گن کر اس نیت سے نہ رکھنا کہ سب خود ہی گھر میں کھائیں گے اور کسی کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیں گے۔ قولہ ”قبو کسی وفیحصی“ دونوں سینے مجھول کے ہیں یعنی تیرے ساتھ بھی اللہ کی طرف سے پھر ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

تشریح :- حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا جو حضرت زبیر بن العوام کی بیوی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی ہیں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتی ہیں کہ میرا ذاتی ملکیت میں تو کوئی مال نہیں ہے دوسری جانب بنت الصدیق ہونے کے ناطے بغیر صدقہ کے بھی نہیں رہ سکتی تو کیا میں اپنے شوہر کے کمائے ہوئے مال سے صدقہ دینے کی مجاز ہوں؟ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب مرحمت فرما کر خرچ کرنے اور صدقہ دینے کی رغبت دلائی۔

اس حدیث میں دو باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں ایک یہ کہ عورت شوہر کے مال میں کس حد تک خرچ کرنے اور صدقہ دینے کا حق رکھتی ہے، دوسری یہ صدقہ کرنا اور سخاوت مال بڑھانے کا سبب ہے اس کے برعکس بخل مال کی برکت کی قلت یا النعدام کا موجب ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل ”باب ما جاء فی نفقة المرأة من بیت زوجها“ ابواب الزکوٰۃ میں گزری ہے (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد سوم ص ۱۵۷) خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر عورت شوہر کے مال میں سے صدقہ نہیں دے سکتی تاہم اذن عام ہے خواہ صراحۃً ہو یا عرفاً ودلالۃً، اس میں ہر علاقے اور قوم کا عرف ملحوظ رکھنا لازمی ہے بلکہ ہر آدمی کے مزاج کا خیال بھی ملحوظ رکھا جائے گا خصوصاً آج کل چونکہ بخل کا دور دورہ ہے لوگوں کی اکثریت دینوی جمع کو اخروی جمع پر ترجیح دیتی ہے اس لئے آج صدقے کی اہمیت کافی گھٹ گئی ہے بخلاف اسلاف اور متقدمین کے اور خصوصاً عرب اور خاص الخاص زیر بن العوام رضی اللہ عنہ صدقہ سے خوشی محسوس فرماتے لہذا اس قسم کی احادیث کو عربوں اور خصوصاً صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عرف و مزاج کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

دوسری بات تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو محققین کے نزدیک مسلم ہے بلکہ مجرب ہے اور قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت سے اور خصوصاً اقارب کے ساتھ نیک سلوک سے مال بڑھ جاتا ہے، چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے شرح البخاری ”فضل الباری“ میں اس آیت ”وَمَنْ قَلِيلٌ مَّا يَرْزُقُهُ فَلَْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ“ (المطلاق آیت نمبر ۷) اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اسی میں سے خرچ کرے، کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

”ایک نابینا طالب علم نے اپنے وہم و تخیل کی بنا پر مجھے مجبور کیا کہ مجھ کو بھی دست غیب کا نمل سکھا دو، میں نے اس کو اس آیت کے مدلول پر عمل کرنے کو کہہ دیا گو اس آیت کا شان نزول اور کچھ ہے مگر اشارہ عام مضمون کی طرف ہے۔ میں نے کہا کہ یہ وعدہ ایزدی ہے اس کا خلاف ناممکن ہے اور امت میں سے بہت سے لوگوں کا یہی تجربہ ہے۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کی روزی میں وسعت ہوگی۔ (فضل الباری ص ۹۰ ج ۱)“

باب کی حدیث اس مضمون پر صریح ہے اور حدیث صحیح ہے شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔

دوسری حدیث :- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جتنی شخص اللہ سے قریب رہتا ہے، جنت کے قریب ہوتا اور لوگوں سے بھی قریب ہوتا اور دوزخ سے دور رہتا ہے جبکہ بخیل اللہ (کے رحم) سے دور ہوتا ہے جنت سے بھی بعید ہوتا اور لوگوں سے بھی دور رہتا ہے اور جہنم کے نزدیک رہتا ہے، اور جاہل نخی خدا کے نزدیک بخیل عبادت گزار کی بنسبت زیادہ محبوب ہے۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور بلکہ منقطع ہے اور امام ترمذی کے کلام میں مرسل سے منقطع مراد ہے تاہم اس کے طرق متعدد ہیں۔ (آخر جہا البیہقی فی شعب الایمان والطہرانی فی الاوسط) لہذا اس کا صحیح مطلب جاننا اور بعض الفاظ کی توجیہ لازمی ہے۔ پس اللہ کے قریب ہونے سے مراد باعتبار مساوت نہیں ہے کیونکہ اللہ عزوجل مکان و جہت سے منزہ ہے بلکہ یہاں اس کی رحمت کا قریب ہونا اور زیادہ ثواب ملنا مراد ہے، جبکہ جنت سے قرب باعتبار مکان بھی ہو سکتا ہے اور لوگوں کے قریب ہونے سے مراد محبت کرنا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرب مکانی مراد ہو کیونکہ نخی آدمی کے پاس مہمان زیادہ آتے ہیں اور دوست بکثرت ہوتے ہیں جو اکثر و بیشتر اس کے آس پاس بیٹھے رہتے ہیں۔

”والحاحل السعی“ الخ اس عبارت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جاہل سے مراد وہ شخص ہو جس کے پاس فرض کے بقدر علم تو ہوتا ہے لیکن وہ تبصر عالم نہیں ہوتا ہے، ایسے شخص کو عرف میں جاہل کہا جاتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ایک آدمی ضروری علم کے ساتھ سخاوت کرتا ہے اور نوافل کا اہتمام نہیں کرتا تو یہ شخص اس عبادت گزار سے افضل ہے، جو اگرچہ ضروری علم کے ساتھ نوافل کا اہتمام کرتا ہے مگر سخاوت نہیں کرتا، یہ اس فلسفہ پر مبنی ہے کہ پہلا شخص دنیا سے بے زار ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو مال میرے پاس ہے یہ رہ جانے والا ہے لہذا اس کو آگے بھیجا جائے جبکہ دوسرے کا دل دنیا میں لگا ہوا ہے، اس لئے وہ مال جمع کرتا رہتا ہے، دیکھئے یہ ٹٹکوں کے ملازمین کس خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے ہیں مگر حرام کی کمائی بڑی احتیاط

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۲۴۵ ج: ۱ ”باب فی الشح“ کتاب الزکوۃ، سنن نسائی ص: ۳۵۵ ج: ۱ ”الاحصاء فی الصدقات“

کتاب الزکوۃ، ایضاً مسند احمد ص: ۳۸۲ ج: ۷ حدیث: ۲۶۳۷۲۔

۲۔ آخر جہا الطبرانی فی الاوسط حدیث: ۲۳۶۱ والعلی فی الصفۃ الکبیر ۱۱۷/۲ وابن عدی فی الکامل ۱۴۳۸/۲

والبیہقی فی شعب الایمان ۳۲۹، ۳۲۸/۷ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۴۸ ج: ۳ کتاب الزکوۃ، الحنفی

سے جمع کرتے رہتے ہیں البتہ ایسا عالم جو تبخیر ہو اور دوسروں کو بھی علمی فائدہ پہنچاتا ہو تو وہ نخی جاہل سے افضل ہے۔ قالہ فی العارضة۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں سخاوت اور بخل کا تعلق حقوق واجبہ سے جوڑا جائے تو جو آدمی زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ اور لازمی حقوق ادا کرتا ہے وہ اگرچہ نوافل بکثرت نہیں پڑھتا مگر پھر بھی وہ اس عبادت گزار سے افضل ہے، کہ نوافل تو بہت پڑھتا ہے مگر واجبی حقوق کی ادائیگی نہیں کرتا، وجہ ظاہر ہے کہ اول فرائض پر عمل پیرا ہے جبکہ دوسرا فقط نوافل میں لگا ہوا ہے اور فرائض سے تغافل برت رہا ہے بلاشبہ فرائض کا درجہ نوافل سے اعلیٰ ہے۔ (سخاوت کی مزید تفصیل اور فضائل دیکھنے ہوں تو نقش قدم فصل نمبر ۵ ملاحظہ ہو) غرض دنیا کی محبت ہر بُرائی کی جڑ ہے اور زہادت ہر نیکی کی بنیاد ہے۔

باب ماجاء فی البخل

”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: خصلتان لا تجتمعان فی مؤمن البخل وسوء الخلق“۔ حدیث غریب اخرجه ایضاً احمد ابو داؤد والحاکم۔^۱ قال ابن العربی فی العارضة: هذا الحدیث وان كان غریباً فانه تعضده احادیث وتعارضه أخرى۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو عادتیں یعنی بخل اور بد خلقی کسی مؤمن میں (بطور ملکہ کے) جمع نہیں ہو سکتیں۔

ترکیب:- بعض حضرات نے نکارت مبتداء سے بچنے کی غرض سے ”لا تجتمعان“ کو ”خصلتان“ کے لئے صفت مخصوصہ بنایا ہے اور ”البخل وسوء الخلق“ کو ”خبر“ جبکہ بعض نے ”البخل وسوء الخلق“ کو مبتداء اور ”خصلتان“ موصوف صفت کو ”خبر مقدم“ بنایا ہے۔ لیکن ان دونوں ترکیبوں سے حدیث کا مطلب صحیح طور پر ادا نہیں ہو سکتا جیسا کہ ادنیٰ تا مل سے ظاہر ہوتا ہے، اس لئے صحیح ترکیب یہ ہے کہ ”خصلتان“ مبتداء ہے اور ”لا تجتمعان“ خبر ہے اور جہاں تک نکارت مبتداء کا مسئلہ ہے تو یا تو کہا جائے گا کہ ”البخل وسوء الخلق“

باب ماجاء فی البخل

۱۔ رواہ ابو داؤد فی الادب باب: ۱۰۰، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۳۵۸ ج: ۳، رواہ الترمذی وغیرہ، ولی اعلاء السنن اخرجه الترمذی ولی سندہ ضعف ص: ۳۵۶ ج: ۱۸، ادارة القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی۔

المخلوق“ بناء بر بدلیت از مبتدا تخصیص کے لئے کافی ہیں۔

مگر اس سے بھی زیادہ آسان جواب یہ ہے کہ نکارت مبتداء کی ممانعت کوئی منصوص علیہا چیز نہیں ہے جس میں رائے کو دخل نہ ہو بلکہ یہ ایک مفید رائے ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جس کلام میں مبتداء نکرہ ہو تو چونکہ وہ کلام فائدے سے عموماً خالی ہوتا ہے اس لئے ایسا کلام ممنوع ہے، مگر جہاں یہ وجہ نہ ہو تو وہاں یہ پابندی کیوں لاگو ہوگی؟ اس لئے کہا جائے گا کہ کلام کا دارودار فائدے پر ہے پس اگر نکارت مبتداء کے باوجود کلام مفید ہو سکتا ہے تو بلاشبہ وہ ترکیب صحیح ہی ہوگی، چنانچہ اس قسم کی ایک اور حدیث میں جب علامہ طیبیؒ نے ایسا تکلف کیا تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے رضی سے یہی بات نقل کر کے اسے رد کر دیا اور رضی تو شوکا ابام ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے: ”حصلتان معلقتان فی اعناق المؤمنین للمسلمین صیامہم وصلاتہم“۔ (رواہ ابن ماجہ، ۱/۲۷۷، مشکوٰۃ ص: ۶۷) اس میں طیبیؒ نے ”للمسلمین“ کو خبر بنایا ہے ”حصلتان“ کی مگر اس سے مطلب یکسر تبدیل ہو جاتا ہے اس پر شیخؒ کہتے ہیں:

”ولاشك ان المتبادر ان قوله معلقتان خبر ونكارة المبتداء قد تكلمنا فيه مراراً ان

المصادر على الافادة كما ذكره الرضی النخ۔ (مشکوٰۃ ص ۶۷ حاشیہ نمبر ۹)

اس لئے اوپر ترجمہ میں ”حصلتان“ کو مبتداء اور ”لا تلتصمان“ کو خبر بنایا گیا ہے تاکہ حدیث کا مطلب تبدیل یا سخ نہ ہو۔

تشریح:- سابقہ باب میں سقاء کی تعریف سے بخل کی تعریف خود بخود معلوم ہوتی ہے کہ ”انما الاشياء تعرف باضدادها“ لہذا کہا جائے گا کہ شرع جہاں مال خرچ کرنے کا حکم دے یا مروت اس کا تقاضا کرے وہاں خرچ نہ کرنا بخل ہے خواہ حقوق اللہ کی مد میں ہو یا حقوق العباد۔

گوکہ خلاف شرع اور خلاف مروت دونوں اوصاف مذموم اور قبیح ہیں تاہم وہ بخل جو مخالف شریعت کے زمرے میں آتا ہے زیادہ شنیع ہے اس سے جو خلاف مروت کہلاتا ہے۔

اس حدیث کا مطلب شارحین کے لئے کافی مشکل رہا ہے وجہ اشکال یہ ہے کہ اس ارشاد پاک کے مطابق بخل اور بد اخلاقی ایمان کے منافی ہیں حالانکہ مؤمن میں ان دونوں کا مشاہدہ تو کیا جاسکتا ہے جس سے ان کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے۔

پھر اس اشکال سے بچنے کے لئے متعدد توجیہات پیش کی گئی ہیں مثلاً مومن سے مراد کامل ہے لہذا مطلب یہ ہوگا کہ کامل مومن میں یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوتیں اور جن مومنین میں مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ گویا کاملین نہیں ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں خامیاں بطور ملکہ اور عادت راسخہ کے جمع نہیں ہو سکتی ہیں گو کبھی کبھار ہو سکتی ہیں۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہ دونوں خصالتیں بھرپور انداز میں جمع نہیں ہو سکتی ہیں اگرچہ مقدارِ قلیل ممکن ہے۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ اگر اخلاق کی تعریف اور حقیقت سمجھ میں آجائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان تینوں توجیہات کا مطلب اور مال ایک ہی ہے صرف تعبیرات کا فرق ہے۔ الحمد للہ راقم نے اخلاق کے موضوع پر کتاب لکھی ہے اس میں اخلاق کی تعریف تفصیل سے دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اخلاق دراصل ان ملکات اور راسخ کیفیات نفسانیہ کا نام ہے جو اللہ عز و جل پیدائش کے وقت کسی آدمی میں ودیعت فرماتا ہے، یہ وہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو ان کے مطابق افعال کا صدور باسانی ہوتا ہے مثلاً ایک دن کا نومو لو د بچہ ہے مگر اس کے اندر شجاعت، عفت اور حکمت پائی جاتی ہیں تو اگرچہ فی الوقت ان کے آثار نظر نہیں آتے مگر جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اگر کسی عارض سے وہ اس کی مخالفت کرے تو اس سے اخلاق پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں پڑتا مثلاً ایک آدمی کے اندر خرچ کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے تو یہ شخص سخی کہلائے گا لیکن اگر بعارض وہ کسی وقت خرچ کے موقع پر خرچ نہ کرے تو یہ بدستور سخی ہی کہلانے کا مستحق ہے تا آنکہ کبھی اس کا مزاج ثانی نہ بن جائے، پھر اخلاق کے بڑے بڑے ستون تین ہیں، شجاعت، عفت اور حکمت ان کے اجتماع سے عدالت جنم لیتی ہے۔ تفصیل نقش قدم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علیٰ ہذا چونکہ مومن تو وہی ہوتا ہے جس کا باطن صاف ہو یا کم از کم رذائل اخلاق سے بچنے کی کوشش کرتا ہو لہذا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ بحیثیت مومن وہ بکل کر کے مالی حقوق کو پامال کرے اور بد اخلاقی و بد تمیزی کر کے معاشرتی حقوق کو روندے خاص کر تسلسل سے تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا، اگر اس کے باوجود کوئی ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے اپنے خاتمے کے لئے فکر مند رہنا چاہئے کیونکہ ایسی خرابیاں عاقبت کو خراب کر سکتی ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ غرض یہاں از روئے ایمان اور بحیثیت ایمان کی بات ہو رہی ہے۔

”قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ان العبد لیعمل عمل اهل النار وانه من اهل الجنة“

ويعمل عمل اهل الجنة وانه من اهل النار وانما الاعمال بالخواتيم۔ (متفق علیہ)

یعنی بد باطن کی وجہ سے آدمی بالآخر دوزخیوں کی راہ لیتا ہے۔ اعازنا اللہ منہ لہذا ہر مومن کو چاہئے کہ اپنے باطن کو صاف و شفاف بنالے تاکہ اسلام کے احکام کے حوالے سے انشراح قلب میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا رہے، یہاں تک کہ جب موت آجائے تو انشراح نور علی نور بن جائے۔

باب کی دوسری حدیث:- "لا يدخل الجنة نجس ولا بهيم ولا منان"۔

وغاباز، نجس اور احسان جتانے والا جنت میں نہیں جائیں گے۔

لغات:- قولہ "نجس" کبکسر الخاء وتشديد الباء جبکہ فتح بھی جائز ہے مکار، فریب کار اور دھوکہ باز کو کہتے ہیں جو کہتا کچھ ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے عارضہ میں ابن العربی لکھتے ہیں: "النجس هو الماكر الذي يظهري للناس من الخير خلاف مايسره فيما يعود اليهم"۔ قولہ "منان" منق سے ہے فتح الميم وتشديد النون اس کے صلہ میں جب "علی" آجائے تو بمعنی احسان کرنے اور احسان جتانے کے آتا ہے اور بغیر صلہ "علی" کے بمعنی قطع کے آتا ہے جیسے منق لیل ری کاٹ دی۔ اس حدیث میں دونوں احتمال ہیں کہ یا تو معنی یہ ہو کہ احسان جتانے والا جنت میں نہیں جائے گا یا مطلب یہ ہے کہ صلہ رحمی توڑنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

تشریح:- اس حدیث کے مطلب میں بھی حقد و اقوال ہیں ایک یہ کہ نجس سے مراد کافر ہے جیسا کہ اگلی روایت میں مومن کے ساتھ تقابل سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد دخول اولی کی نفی ہے کیونکہ جنت صاف ستھری جگہ ہے وہاں گندے اعمال اور تازیبا اخلاق کے حامل لوگ نہیں جاسکتے یہاں تک کہ صاف ہو جائیں یا اللہ کے معاف کرنے سے یا جہنم کی آگ سے، ہاں جو گندگی ایسی ہے جو ختم نہیں ہو سکتی تو دوزخ میں جلنے کے باوجود بھی وہ پاک نہیں ہوں گے جیسے مشرکین اور دیگر کفار۔

ایک مطلب وہی ہے جو اوپر والی حدیث کی شرح میں گذر گیا کہ ایسے عیوب عموماً خاتمہ بالخیر سے مانع بنتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ اور عام فہم مطلب وہ ہے جو بارہا گذرا ہے کہ یہ خاصیات المفرد ہیں یعنی ان افعال کی تاثیر یہ ہے کہ جنت سے روکتے ہیں تاہم قیامت کے دن فیصلہ مفردات کے بجائے مرکب اعمال پر ہوگا تدر۔ ابن العربی لکھتے ہیں کہ احسان جتانے والا گویا اللہ کی مشابہت اختیار کرتا ہے کیونکہ انعامات دے

کراہیات جتنا اور تکبر تو اللہ کا وصف ہے، بندے کو تو عاجزی اور تواضع اختیار کر لینی چاہئے یعنی اپنا کام کر لینا چاہئے خدا کا کام اور اس کی صفات خاصہ میں شرکت و مداخلت نہیں کرنی چاہئے، خاص کر جب آدمی کو اپنے خاتمے کا علم بھی نہ ہو اور اگر بالفرض علم بھی ہو جائے تو پھر انبیاء علیہم السلام کی سنت، تواضع کو اپنانا چاہئے۔

قال: "وَكذلك لا بدخل الحنة منان وهو الذي يفخر بنعمته على المتعم عليه فان ذلك انما هو لله سبحانه ورسوله اذا الكبرياء لله في السموات والارض والتكبر منموم في حق العبد لرؤيته نفسه فوق غيره وهو لا يعلم خاتمة امره وان علم فمن حقه ان يتواضع كما فعلت الرسل الكرام التي تحققت خواتيمها وتواضعت لامر ربها".

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

باب کی تیسری حدیث:- "المؤمن غير كريم والفاجر خيب لئيم" ⑤

مومن سادہ لوح اور جلد دھوکہ میں آجانے والا اور شریف النفس ہوتا ہے جبکہ فاجر دھوکہ باز اور کینہ ہوتا ہے۔

لغات:- "غير" بکسر الفین وتشدید الراء بمعنی سادہ لوح، سیدھا سادہ اور جلد دھوکہ میں آجانے والا کے بقولہ "کريم" ملیم کی ضد ہے بمعنی شریف الطبع، نجی، عالی ظرف اور صاحب عزت کے۔ قولہ "لئيم" بردزن کریم۔ یہ لفظ لونا سے مشتق ہے بفتح اللام و سکون الهمزة "لئوم فلان" کم ذات ہوتا، نچلے اور گھٹیا درجہ کا ہوتا، خیس، کم ظرف اور بخیل ہوتا وغیرہ اس کے مفہوم میں شامل ہیں، چونکہ کریم میں سخاوت کے معنی پائے جاتے ہیں اس لئے لئیم میں اس کی ضد یعنی بخل کے معنی کو ملحوظ رکھنا بھی مناسب ہے۔

تشریح:- حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن جاہل ہوتا ہے اس لئے دھوکہ کھا جاتا ہے بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ "لعمرا یقین علی نفسه" کے اصول کی بنا پر مومن دوسرے کو بھی سچا سمجھتا ہے خاص کر جب

دوسرا دھوکہ باز ہو تو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور بڑے بڑے دعوے کرتا ہے چونکہ مؤمن کا دل صاف ہوتا ہے اس لئے فاجر کی باتیں اس خالی لوح پر جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، دیکھئے ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام سے جھوٹ بولا اور قسم کھائی کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں چنانچہ اس کی قسم جھوٹی تھی مگر حضرت آدم علیہ السلام کے پاس اللہ کے نام سننے کے بعد کوئی اور چارہ نہیں رہا تھا۔ اور بخاری شریف کتاب الانبیاء میں روایت ہے:

”رَأَى عِيسَى رَجُلًا يَسْرِقُ فَقَالَ لَهُ اسْرِفْتَ قَالَ كَلَّا وَالَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَقَالَ
عِيسَى اْمْنُتُ بِاللَّهِ وَكَذَّبْتَ عَنِّي“۔ (بخاری ص: ۳۹۰، جلد ۱۰، باب قول اللہ عزوجل وَاذْكُرْنِي
الْكَتَابَ مَرَّةً) (الکتاب مریع)

غرض مؤمن حسن ظن اور دنیوی امور میں عدم دلچسپی اور روزِ گذر و تسامح کی بنا پر دھوکہ کھا جاتا ہے جبکہ فاجر بدگمانی کی وجہ سے اچھی اور نچی بات کو شک کے تاثر میں دیکھتا ہے کہ اس کا کام یہی ہوتا ہے، اس کی آسان مثال یہ ہے کہ اکثر سیاسی لوگ ہمارے علماء کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں اور علماء ان کے وعدوں پر بھروسہ کر کے نقصان اٹھاتے ہیں۔

لیکن یہاں شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں ایک اعتراض کر کے پھر اس کا جواب دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحیحین کی روایت کے مطابق ایک آدمی کو بدر میں گرفتار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے بہت زیادہ اعتذار اور حیلے بہانے کر کے رہائی حاصل کر لی مگر جب گھر پہنچا تو کہنے لگا کہ میں نے محمد کو دھوکہ دیا، پھر وہ شخص دوبارہ گرفتار ہوا اور حسب سابق پھر معذرت کرنے لگا ”فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَلْذِغُ الْمُؤْمِنَ مِنْ تُحَمَّرُوا حُلْمَرَيْنِ“ الخ اس لئے نبی علیہ السلام نے اسے نہیں چھوڑا تو بظاہر باب کی حدیث اور صحیحین کی حدیث میں تعارض ہے۔ ان میں تطبیق یہ ہے کہ حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن حیلہ ساز اور غیار نہیں ہوتا جو کسی معاملے کی پہلے سے حیلہ سازی کرتا رہے جبکہ صحیحین کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن جب کسی مرحلے سے گزر جائے اور اس میں ایک بار دھوکہ کھائے تو دوبارہ اس معاملے میں پھر دھوکے میں نہیں آتا بلکہ کوئی تعارض نہ رہا۔

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب الادب باب: ۸۳، ومسلم کتاب الزهد، وابوداؤد کتاب الادب باب: ۲۹،

وابن ماجہ ابواب الفتن باب: ۱۲، واحمد فی مسنده ص: ۲۱۴، ج: ۲، حدیث: ۵۹۲۸۔

اس حدیث کو سراج الدین قزوینی نے موضوعات میں شمار کیا ہے کیونکہ اس کا راوی بشر بن رافع امام احمدؒ کے نزدیک ضعیف ہے مگر صلاح الدین علابی نے ابن معین سے نقل کیا ہے: ”لیس به بأس“ کما فی حاشیة القوت وفيها التفصيل۔ نیز اس کے متابع بھی موجود ہیں، صاحب تحفہ لکھتے ہیں: أخرجه أحمد وأبو داود والحاكم۔ ابن العربی نے عارضہ میں بھی اس پر اعتراض نہیں کیا ہے لہذا یہ کم از کم درجہ حسن تک پہنچ سکتی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم وأکمل۔

باب ماجاء فی النفقة علی الاهل

”عن ابی مسعود الانصاری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: نفقة الرجل علی اہله صدقة“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کا خرچ کرنا اپنے اہل خانہ پر صدقہ ہے۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ صدقہ کی صحت اور ثواب کا دار و مدار صرف اس پر نہیں ہے کہ غیروں اور فقراء کو کچھ دیا جائے بلکہ اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنے سے بھی صدقہ کا ثواب مل جاتا ہے خواہ اہل خانہ سے مراد بیوی لی جائے یا دیگر افراد خانہ لئے جائیں، اسی طرح وہ نان نفقہ واجبی ہو جیسے بیوی اور نابالغ بچوں پر یا غیر واجبی ہو جیسے ان کے علاوہ دوسرے افراد خانہ پر۔ البتہ بظاہر یہ ثواب اس وقت ملے گا جب وہ اس اتفاق میں ثواب کی نیت کرے چنانچہ محققین کی روایت اس طرح ہے: ”إذا انفق المسلم نفقة علی اہله وهو یحتسبها“۔^۱ ہاں البتہ صدقات سارے مساوی اور برابر نہیں ہیں بلکہ نفس ثواب میں شرکت کے باوجود ان میں تفاوت پایا جاتا ہے، بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ہم اپنے معاملات اور مباح اعمال یا وہ اعمال جو ہمارے ذمے کمی کے حق کے طور پر واجب ہیں۔ ان کو بھی بیت ثواب عبادت بنا سکتے ہیں۔

۱۔ سنن ابی داؤد ص: ۳۱۴ ح: ۴ کتاب الادب، ومسند احمد ص: ۱۰۴ ح: ۳

باب ماجاء فی النفقة علی الاهل

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۰۵ ح: ۲ ”باب فضل النفقة علی الاهل“ کتاب النفقات، ایضاً مسند احمد ص: ۳۶۷ ح: ۶ حدیث: ۲۱۸۳۲، وأخرجه مسلم فی الزکوٰۃ ص: ۳۲۴ ح: ۱ حدیث: ۳۸، والنسائی فی الزکوٰۃ باب ۶۰ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۲ ح: ۳۔

دوسری حدیث :- حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہتر دینار وہ دینار ہے جسے آدمی اپنے عیال (گھر والوں) پر خرچ کرے اور (پھر) وہ دینار ہے جس کو آدمی اللہ کی راہ میں اپنی سواری پر خرچ کرے اور (پھر) وہ دینار ہے جس کو آدمی اللہ کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرے۔ (ابو قتلابہ) (راوی) فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیال سے ابتدا فرمائی، پھر فرمایا (ابو قتلابہ نے) کہ کس شخص کا ثواب اس آدمی سے زیادہ ہو سکتا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کو سوال سے محفوظ رکھتا ہے اور اسی اتفاق کی وجہ سے اللہ ان کو مستغنی کر دیتا ہے۔^۱ (ہذا حدیث حسن صحیح)

تشریح :- اگرچہ ”ادب“ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی مگر راوی ابو قتلابہ نے ترتیب ذکر کی کو دیکھتے ہوئے اولاد پر خرچ کرنے کا ثواب باقی دو قسموں سے زیادہ قرار دیا کہ اگرچہ یہ تینوں اخراجات بڑے اجر و ثواب کے باعث ہیں مگر اہل و عیال کا درجہ زیادہ اعلیٰ ہے، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصطلاح میں جہاد کے لئے استعمال ہوتی ہے لہذا اس کا اصل مصداق تو مجاہدین ہیں مگر مع ہذا اطلب علم اور دین کے کسی بھی کام کی غرض سے گھر سے نکلنے پر بھی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اطلاق بعض احادیث سے ثابت ہیں لہذا اس حدیث کو عموم پر رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

باب ماجاء فی الضیافۃ وغایۃ الضیافۃ کم ہو؟

”عن ابی شریح العدوی انہ قال: أبصرت عینای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسجفۃ اذنای حین تکلم بہ قال: من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ جائزۃ قالوا: وما جائزۃ؟ قال یوم ولیلۃ قال: والضيافة ثلاثة ايام وماکان بعد ذلک فهو صدقۃ ومن کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل غیر أولی سکت“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو شریح العدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ ارشاد فرما رہے تھے تو اس وقت میری آنکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں، اور میرے کان سن رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے تو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اس کے امتیازی کھانے کا خیال رکھے، صحابہ کرامؓ نے پوچھا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا ایک شب و روز (خصوصی)

مہمانی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہمان نوازی تین دن تک ہے اس کے بعد جو کھلایا جائے گا وہ (مخلص) صدقہ ہوگا اور جو مخلص اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے تو وہ بھلی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔

لغات:۔ قولہ ”محائزہ“ اس لفظ کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ مہمان جب جانے لگے تو اسے رخصت کرتے وقت اتنا کھانا دے دیں جو اس کے ایک شب و روز کے لئے کفایت کرے۔ یہ مطلب صحرائی اور جنگلوں کے سفر کے ساتھ مناسب ہے۔ دوسرا یہ کہ نفس مہمان نوازی تو تین شب و روز ہے مگر پہلادان بطور خاص اہتمام والا ہونا چاہئے جس میں اپنے معمول سے زیادہ عمدہ کھانا امتیازی طور سے تیار کیا جائے۔ اس کی تائید مسلم کی روایت سے ہوتی ہے جس میں جائزہ کو عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ”الضيافة ثلاثة ايام ومحائزہ يوم وليلة“۔^۱

ترمذی کی روایت کے مطابق ”محائزہ“ منصوب ہے کہ یہ ”فلیکرم“ کا مفعول ثانی ہے کیونکہ ”فلیکرم“ بمعنی اعطاء کے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب بنزع الخافض ہو ”ای فلیکرم ضیفہ بمحائزہ“۔
تشریح:۔ اسلام کی آمد سے پہلے بھی عربوں کی بعض عادات و رسومات ایسی تھیں جو سنت ابراہیمی کی بنیادوں پر قائم تھیں یا پھر انسانیت سے ہم آہنگ تھیں۔ اسلام نے ایسی رسومات کو جوں کا توں اپنی حالت پر برقرار رکھا ہے۔ ازاں جملہ ایک ضیافت کی روایت تھی جو عربوں میں رائج تھی، اس روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی مزید تاکید نقل فرمائی ہے جو اپنی عادت کے مطابق فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کے دوران میری آنکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں، اور کان یہ ارشاد سن رہے تھے۔ ترمذی ہی میں ابواب الحج کی پہلی حدیث بھی انہی سے مروی ہے، اس میں بھی انہوں نے یہی انداز گفتار اپنایا ہے، کسی راوی کے یہ انداز تعمیر اختیار کرنے کا مقصد حدیث کے کمال حفظ سے کنا یہ ہوتا ہے، یا محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے اپنے قلب کو محفوظ و منور کرنا ہوتا ہے کہ تذکرہ حبیب سے جو لطف ملتا ہے اس کا اندازہ محبت ہی کر سکتا ہے۔ اس ارشاد پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مخلص اللہ اور آخرت پر ایمان لایا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ اسلام نے صحیح رسومات و روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان کی تائید اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تاکید بھی فرمائی لہذا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ضیافت کا حکم اب پہلے سے زیادہ

مؤکد ہے۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان عقیدہ کا لازمی جزء ہے۔ راقم نے اپنے کانوں سے بعض پروفیسروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اہل مغرب یعنی یہود و نصاریٰ کو کافر نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ اس سے منافرت پھیلے گی ہے اور دہشت گردی کو تقویت ملتی ہے۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شور با، ان کا زعم یہ ہے کہ ایمان بالرسول لازمی نہیں اور اللہ و آخرت کو تو وہ لوگ مانتے ہیں پھر وہ کیوں کافر ہوئے؟؟؟

یہ لوگ ان نصوص سے استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن پر ایمان کا ذکر نہیں ہے مثلاً سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۳ اور ۱۱۴ میں ہے:

”لَتَسُوْا سِوَاہٖ مِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ اِمَّةٌ قَائِمَةٌ یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اِنَّاۤ اَنۡزَلْنٰہُ وَہُمْ یَسْمَعُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وِیَاۤمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہٰوْنَ عَنِ الْمُنکَرِ ۚ وَہُمْ الصّٰلِحِیْنَ“۔

اسی طرح باب کی حدیث میں بھی ایمان بالرسول والکتاب کا ذکر نہیں ہے۔

جواب:- ویسے تو اہل زندقہ کا اصول یہی ہے کہ وہ ان نصوص سے استدلال کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں جن میں اجمال یا اختصار ہوتا ہے مگر آج کل کے روشن خیال طبقے نے اس طرز استدلال کو اپنا مشن بنالیا ہے چونکہ ان لوگوں کا مقصد دین اسلام سے لوگوں کو ہٹانا ہے اس لئے ان کی تحریروں اور تقریروں میں یہ عنصر نمایاں ہے کہ یہ لوگ اپنا ایک معیار مقرر کر لیتے ہیں جس میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اہل مغرب کے فضاء کے مطابق ہو بلکہ بسا اوقات یہ مشن ان کو سونپا جاتا ہے پھر یہ لوگ مسقطانیہ طرز استدلال سے نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور صریح درجنوں نصوص کو نظر انداز بلکہ ان کا انکار کر لیتے ہیں۔ راقم نے اپنی کتاب ”تجدد پسندوں کے افکار کا جائزہ“ میں اس پر نسبتاً تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ لوگ صرف ایک گھبر پر چلتے ہیں اور باقی علوم کے جتنے اصول ہیں ان سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ صرف نظر کرتے ہیں حالانکہ بلاغت کا سلسلہ اصول ہیں، کہ بعض مخاطب کے سامنے یا بعض اوقات ایک بات محمل بیان کی جاتی ہے جبکہ وہی بات دوسرے موقع پر تفصیلی بیان کی جاتی ہے یا اس لئے اجمال ہوتا ہے کہ وہ بات دوسری جگہ تفصیلاً آچکی ہوتی ہے فقہاء و بلغاء کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں کہ ایک بات ایک جگہ متعید ہوتی ہے مگر دوسری جگہ اس میں وہ قید ذکر نہیں کی جاتی ہے حالانکہ وہ طوطا بلکہ ضروری ہوتی ہے،

جیسا کہ علامہ شامیؒ نے شرح عقود رسم مفتی میں بوضاحت بیان کیا ہے، مفسرین نے اس نکتے کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "القرآن بفسر بعضہ بعضاً"۔

لہذا ہم کہتے ہیں کہ سورۃ آل عمران کی یہ آیت جس حالت میں نازل ہوئی ہے اس کا مقتضایہ یہ تھا کہ اس میں فقط اتنا ہی بیان ہو جبکہ دوسری درجنوں آیات میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول والقرآن کی بارہا تصریح کی گئی ہے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم بطور نمونہ یہاں محدودے چند ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) "قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فان اللہ لا يحب الکفرین"۔ (آل عمران آیت

(۳۲)

(۲) "یا اهل الکتاب لم نکفرون بالیلہ اللہ وانتم تشہدون"۔ (آل عمران آیت نمبر ۷۷

(۷۸۳)

(۳) "و یقولون عنی اللہ الکذب وہم یعلمون"۔

(۴) "ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه و هو فی الآخرة من الخسرین"۔

(۵) "کیف یرید اللہ قومًا کفروا بعد ایمانہم وشہدوا ان الرسول حق وجاءہم البینت"

واللہ لا یرید الظالمین اولئک جزاء ہم ان علیہم لعنة اللہ والملائکة والناس

اجمعین۔ حائدین فیہا لا یخفف عنهم العذاب ولا ہم یظفرون"۔ (آل عمران آیت ۸۸)

(۶) وقولہ تعالیٰ "ولا تکنونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءہم البینت و اولئک

لہم عذاب عظیم"۔ (آل عمران آیت ۱۰۵)

(۷) وقولہ تعالیٰ "وما محمد الا رسول"۔ (آل عمران آیت ۱۴۴)

(۸) وقولہ تعالیٰ "لا نفرق بین احد من رسلہ"۔ (سورۃ بقرہ آیت ۲۸۵)

(۹) وقولہ تعالیٰ "لا تحسبن الذین یمفرحون بما آتواؤا یُحبون ان یُحذروا بما لہم

یفعلوا فلا تحسبنہم بمفازة من العذاب ولہم عذاب الیم"۔ (آل عمران آیت ۱۸۸)

(۱۰) وقولہ تعالیٰ "ان الذین کفروا من اهل الکتاب والمشرکین فی نار جہنم یخلدون

فیہا اولئک ہم شر البریة"۔ (سورۃ البینہ آیت ۶)

(۱۱) وقولہ تعالیٰ "ان الذین یمکفرون باللہ ورسولہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسولہ و

يقولون نؤمن ببعض ونكفر ببعض ويريدون ان يتخذوا بين ذالك سبيلاً اولئك هم الكفرون حقا واعتدنا للكافرين عذاباً مهيناً“۔ (سورۃ النساء آیت ۱۵۱)

اگر طول کا خطر نہ ہوتا تو مزید آیات عیش کی جاتیں مگر طالب حق کے لئے تو اشارہ بھی کافی ہونا چاہئے یہ تو کافی تعداد میں آیات ہیں۔

لہذا اہل تہجد کے اس قسم کے نظریات کے پرچار کا مقصد صرف اور صرف گمراہی کو فروغ دینا ہے۔ رہی باب کی حدیث تو سمجھ لینا چاہئے کہ بعض اصطلاحات اسماء اعلام کے طور پر استعمال ہوتی ہیں جیسے ”من قال لا الہ الا اللہ دعل الجنة“؎ اور ”مفاتيح الجنة شهادة ان لا اله الا الله“؎ (مشکوٰۃ ص ۱۵) لہذا کہا جائے گا کہ باب کی حدیث میں اللہ اور آخرت پر ایمان مبدا اور معاد یعنی پورے اسلام کا اسم علم ہے یعنی بحیثیت مسلمان آدمی کو اپنے مہمان کا اکرام کرنا چاہئے۔

اکرام ضیف:- اکرام ضیف یہ ہے کہ اس سے خندہ پیشانی سے ملے، ملاحظت اور نرمی سے بات کرے اسے مناسب جگہ پر بٹھادیا جائے، اور یہ تاثر دے کہ آپ کی آمد سے بڑی خوشی محسوس ہوئی، اس سے کھانے کے بارے میں پوچھے بغیر کھانا حاضر کیا جائے ہاں اگر کھانے کا وقت گزر گیا ہو تو پھر پوچھنے میں کوئی حرج نہیں، ممکن ہے کہ اس نے کھایا ہو، ایسے میں مہمان کو از خود کہنا چاہئے کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔

کھانے سے پہلے کسی اور چیز سے اس کی تواضع کی جائے تو زیادہ اولیٰ ہے تاکہ فوری طور پر کچھ اکرام ہو جائے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جلد ہی مہمانوں کی خدمت میں محل سمین پیش فرمایا تھا۔ اہل استطاعت کے مطابق عمدہ سے عمدہ کھانا ان کی خدمت میں پیش کیا جائے خصوصاً ابتداء ضیافت میں۔ ان کے کھانے سے سرور ہونا چاہئے، کھانے کے دوران مہمان سے گاہے گاہے کہا جائے کہ آپ کیوں نہیں کھا رہے؟ بچے یا ایسے افراد کو مہمانوں کے ساتھ کھانے پر نہیں بٹھانا چاہئے جن سے تکدر خاطر ہو۔

قولہ ”قالوا ما جازئہ“ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سوال مدت کے بارے میں تھا کہ جازئے کی مدت کتنی ہے کیونکہ نفس جازئہ وہ جانتے تھے۔

ضیافت کا حکم:- بعض صحیح روایات سے بظاہر مہمان نوازی کا وجوب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے

ع روی بمعناہ مسلم ص: ۴۱ ج: ۱ کتاب الايمان من عثمان قال قال رسول الله ﷺ من مات وهو علم ان لا اله الا الله

دخل الجنة۔ ع رواہ احمد فی مسنده ص: ۳۲۱ ج: ۶ حلیث: ۲۱۵۹۷۔

متعلق بعض احادیث کے الفاظ یوں ہیں "لیلة الضیف حق واجب"۔ "کے بعض میں ہے کہ اگر مہمان کو کھانا نہیں کھلایا گیا اور اس نے خالی پیٹ رات گزاری تو اس کا حق میزبان پر ذین ہے۔ (کمادواہ ابو داؤد) اور بعض میں ہے کہ اس کا حق لینا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اگر وہ لوگ تمہیں نہ کھلائیں تو ان سے مہمانی کا حق زبردستی لے لو^۱ وغیر ذالک من الروایات۔ "کے باب کی حدیث سے بھی لزوم معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض اہل ظاہر نے تو وجوب کی تصریح کر دی جبکہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل بادیہ پر واجب ہے جبکہ شہری لوگوں پر واجب نہیں، کیونکہ شہر میں ہوٹل ہوتے ہیں مگر باقی امر مشا^۲ فرماتے ہیں کہ مہمان نوازی زیادہ سے زیادہ سنت ہے جو مکارم اخلاق کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤکد فرمائی ہے۔

مذکورہ احادیث سے جمہور نے متعدد جوابات دیئے ہیں مثلاً شروع میں جب مسلمانوں کی آبادی کم تھی اور وسائل بھی قلیل تھے تو ضیافت واجب تھی مگر بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا، یا پھر وجوب پہلے بھی نہ تھا البتہ احتیاب زیادہ مؤکد تھا جبکہ بعد میں زیادہ تاکید منسوخ کر دی گئی یہ دونوں جوابات اسی طرز پر دیئے گئے جیسے بیعت کے غسل کے بارے میں جمہور نے تاکید کی روایات سے دیئے ہیں۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ضیافت کو واجبی حق قرار دینا عام نہ تھا بلکہ یہ عالمین کے لئے مخصوص تھا کہ اہل ذرع والی ضرع پر عالمین کی ضیافت واجب ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ مضطر کے لئے ہے یا پھر یہ لزوم حکومت کی طرف سے اہل ذمہ پر عائد کیا گیا تھا۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ نسبتاً زیادہ اطمینان بخش جواب یہ ہے کہ یہ وجوب از روئے مکارم اخلاق و حسن معاشرت ہے وجوب تشریحی نہیں لہذا اگرچہ ضیافت واجب تو ہے مگر ضیافت نہ کرنے کی صورت میں آدمی بے مروت کہلائے گا، کہ اس نے وہ حکم پامال کر دیا جو بامروت فحش پر مروت کے طور پر واجب ہوتا ہے اور اس کا ضمیر مہمان کو محروم و مایوس کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے لہذا ایسا شخص بے ضمیر اور بے مروت کہلانے کا مستحق تو ہوگا، مگر شرعاً آخرت میں اس پر ان شاء اللہ سزا مرتب نہ ہوگی چنانچہ امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں ضیافت کے باب میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد ایک اور باب باندھا ہے "باب فی فتح المضیق فی الاکل من مال غیرہ"^۳

مع کلماتی سنن ابن ماجہ ص: ۲۶۱ کتاب الادب والخطبة لیلۃ الضیف واجبة، وابوداؤد ص: ۱۷۰ ج: ۲ "باب من الضیافة الخ" کتاب الاطعمة۔ فی سنن ابی داؤد حوالہ بالا۔

۲ صحیح بخاری ص: ۹۰۶ ج: ۲ "باب اکرام الضیف و خدمتہ" کتاب الادب۔

۳ راجع للتفصیل الترغیب والترہیب ص: ۲۵۰ و ۲۵۱ ج: ۲۔

فی سنن ابی داؤد ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب الاطعمة۔

اور اس میں یہ آیت نقل کی ہے ”لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ“ (الایۃ)۔ لہذا سابقہ روایات مؤول ہیں۔

مہمان کی ذمہ داری:- شریعت مطہرہ کا یہ عام اصول ہے کہ جہاں کوئی معاملہ دو یا دو سے زیادہ فریق کے درمیان مشترک ہو تو وہاں ہر فریق کے لئے مناسب حال حکم ہوتا ہے ہر فریق کو یہ تعلیم دینا شریعت کا زربین ضابطہ ہے، کہ وہ دوسرے فریق کا بطور خاص خیال رکھے ازاں جملہ ایک ضیافت بھی ہے اس میں میزبان کو سختی سے اس کا پابند بنایا کہ وہ اپنے مہمان کو راضی رکھنے اور اس کی راحت کی ہر ممکن کوشش کرے۔

مگر چونکہ مہمان بہر حال ایک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے اس لئے ضرورت تھی کہ مہمان کو بھی بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے دسترخوان سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ باب کی دونوں حدیثوں میں یہ تصریح کر دی گئی کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی، اگر وہ صاحب خانہ کی کرم نوازی سے غلط فائدہ اٹھانا چاہے گا اور تین دن کے بعد بھی جانے کا نام نہیں لے گا تو مزید کھانا صدقہ شمار ہوگا اب ایک غیور اور خوددار شخص خود سوچے کہ آیا وہ صدقہ کھانا پسند کرتا ہے یا اپنی عزت کی حفاظت پسند کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا "ولا یحسل لہ ان یشوی عنده حتی یحرجہ"۔ امام ترمذی نے "یثوی" کا مطلب خود بیان فرمایا ہے "یعنی المضيف لا یقیم عنده حتی یشد علی صاحب المنزل والخرج هو المضيف"۔ یعنی مہمان اتنا نہ ٹھہرے کہ جس سے صاحب خانہ تنگ آجائے، یثوی یثوی بردن رمی بری یعنی الماکمۃ۔^۱

ضیافت سے متعلق مزید تفصیل درکار ہو تو ملاحظہ ہو نقش قدم کامل حصہ دوم، نقش اخلاق فصل ہفتم مہمان کے حقوق اور آداب ضیافت و آداب برائے مہمان۔

۱۰ سورة البقرة آیت: ۸۸.

٢١- وقال الخطابي: معنى لا يرى، لا يحل للضيف ان يقيم عنده بعد ثلاثة ايام من غير استعفاء منه حتى يضيق صدره فيظل اجرة الضيف. وقال الحافظ وللمعلماء في هذا الحديث ثلاثان: احدهما ان يحطيه ما يجوز به ويكفيه في يوم وليلة ١٣١ اجاز به وثلاثة ايام اذا قصده، والثاني يحطيه ما يكفيه يوماً وليلة يستقبلهما بعد ضيافته، الرقيق والغريب من: ٢٥١

باب ماجاء فی السعی علی الارملة والیتیم

”عن صفوان بن سلیم یرفعہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللہ او کالذی یصوم النہار ویقوم اللیل“۔^۱

حضرت صفوان بن سلیم سے روایت ہے جسے وہ مرفوع بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پیوہ اور مسکین (کی مدد) کی کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں مجاہد کی مانند ہے یا اس شخص کی طرح ہے جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو نماز پڑھتا ہے۔

لغات:- قولہ ”الساعی“ معنی سے ہے لیکن یہاں دوڑنے کے معنی میں نہیں بلکہ محنت و مشقت اور کسب کے معنی میں ہے چونکہ محنت کرنے والا عموماً تیز ہوتا ہے اس لئے اسے ساعی کہتے ہیں۔ قولہ ”الارملة“ بفتح الهمزة والمیم وینہما راء ساکنۃ۔ ارمال سے مشتق ہے فقر و مسکنت کو کہتے ہیں جو عورت بغیر شوہر کے ہو وہ عموماً غریب و محتاج ہوتی ہے اس لئے اسے ارملة کہتے ہیں۔ قولہ ”المسکین“ من لاشئ لہ، بعض حضرات نے یہ معنی فقیر کے بیان کئے ہیں اور مسکین اس کو کہا ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ ہو مگر وہ نا کافی ہو۔ بعض نے یہ حکم فقیر کا بتلایا ہے۔ بہر حال مراد اس سے محتاج اور غریب ہے۔

تشریح:- حضرت صفوان تابعی ہیں مگر روایت مرفوعہ نقل کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مرسل ہے تاہم دوسری سند میں موصول مردی ہے اس لئے شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے،^۲ امام ترمذی نے ترجمہ الباب میں لفظ یتیم کا ذکر کیا ہے جبکہ حدیث میں مسکین کا لفظ وارد ہوا ہے یہ تعمیم کی طرف اشارہ ہے۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جتنا ثواب مجاہد یا صیام و قیام کے پابند کو ملتا ہے اتنا ہی ثواب اس عامل کو یا اس شخص کو بھی ملتا ہے جو پیوہ اور محتاج کی فکر میں مشغول اور ان کی مدد کے لئے کوشاں ہوتا ہے چونکہ مجاہد کی محنت سے بیت المال میں غنیمت جمع ہو جاتی ہے، جس سے بیواؤں اور بے کسوں کو فائدہ ہوتا ہے اسی طرح

باب ماجاء فی السعی علی الارملة والیتیم

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً البخاری فی اللغات باب: ۱، ومسلم فی الزهد حدیث: ۳۱ وابن ماجہ فی التجارات باب: ۱، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۸ ج: ۳

۲۔ صحیح بخاری ص: ۸۰۵ ج: ۲ عن ابی ہریرۃ، کتاب اللغات، صحیح مسلم ص: ۳۱۱ ج: ۲، ”باب فضل الاحسان الی الارملة والمسکین والمعم“ کتاب الزهد

اس شخص کی کمائی سے بھی ان کی مدد ہوتی ہے اس لئے دونوں کو یا مسادی ہیں یا جس طرح مجاہد بیت المال میں حصے کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح عامل بھی ہوتا ہے، بہر حال یہاں تشبیہ ثواب میں مراد ہے چونکہ مجاہد اور روزہ دار اور نمازی کے ثواب کا ایک معیار معلوم ہے اس لئے عام طور سے ان کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، جس سے شریعت کے احسان عظیم کا پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے اعمال کو تو سیح دے کر بڑے مشقت والے اعمال کے برابر ثواب دیا جاتا ہے۔

باب ماجاء فی طلاقۃ الوجه و حسن البشر

”عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کل معروف صدقۃ وان من المعروف ان تلقی اخاک بوجه طلق وان تفرغ من دلوک فی اناء احملک“۔^۱

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی کے کاموں میں سے یہ بھی ہے کہ تم اپنے (اسلامی) بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو اور یہ کہ تم اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالو۔

لغات: فقولہ ”طلاقۃ طلیق“ دونوں مصدر ہیں پھر طلق میں لام کا کسرہ بھی جائز ہے اور سکون بھی، بمعنی ہنس کھ، خندہ روا اور کھلا ہوا ہشاش چہرہ۔

فقولہ ”البشر“ بکسر الباء بمعنی خندہ روئی و خوشی کے ہے۔ فقولہ ”المعروف“ وہ کام جس کی اچھائی اور خوبی از روئے نقل و عقل دونوں ثابت ہو جیسے راستے کا صاف کرنا وغیرہ، یہ لفظ ”مکثر“ کے مقابلے میں آتا ہے جو نا آشنا ہوتا ہے۔

تشریح:- حدیث کی تشریح ”باب ماجاء فی منافع المعروف“ میں عنقریب گزری ہے اعادہ کی ضرورت نہیں صرف اتنی بات عرض ہے کہ جب آدمی اپنے بھائی سے خوشی خوشی ملتا ہے اور مسکرا کر ملاقات کرتا ہے تو اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے اور قلب کا سیلان اور صفائی معلوم کر لیتا ہے، کیونکہ ہر آدمی کا چہرہ اس کے دل و دماغ کی

باب ماجاء فی طلاقۃ الوجه و حسن البشر

۱۔ الحدیث المخرجه ایضاً احمد فی مسنده ص: ۳۰۵ ج: ۴ حدیث: ۱۳۲۹۹، ایضاً ص: ۲۳۲ ج: ۴ حدیث: ۱۳۲۹۳،

ایضاً الترمذی و الترمذی ص: ۲۸۲ ج: ۳،

اسکرین کا کام دیتا ہے لہذا جب ملاقات ختمہ پیشانی سے ہوتی ہے تو اس سے ایک اچھا تاثر ابھرتا ہے جس کی اچھائی پر عقل اور نقل دونوں متفق ہیں اور جب اس کے بھائی کو ملنے سے خوشی ہوگی تو اس پر صدقے کا ثواب ملے گا کیونکہ صدقے سے بھی خوشی ملتی ہے تو جس طرح صدقے کی خوشی باعث اجر و ثواب ہے اسی طرح اچھے انداز سے ملاقات بھی خوش افزا ہونے کی وجہ سے باعث ثواب ہے۔ تدریر

باب ماجاء فی الصدق والكذب

”عمر عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: علیکم بالصدق فان الصدق یہدی الی البر وان البر یہدی الی الحنة وما یرال الرجل بصدق ویتحرى الصدق حتی یمکتب عند اللہ صدیقاً وانما کم والكذب فان الکذب یہدی الی الفجور وان الفجور یہدی الی النار وما یرال العبد یمکتب ویتحرى الکذب حتی یمکتب عند اللہ کذاباً“۔ (حسن صحیح)^۱

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سچائی کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ سچ بھلائی کا راستہ بتلاتا ہے اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور آدمی مسلسل سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں انتہائی سچا لکھا جاتا ہے، اور تم اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ کیونکہ جھوٹ آدمی کو صریح خرابی تک پہنچاتا ہے اور خرابی جہنم تک پہنچاتی ہے اور آدمی مسلسل جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ بناتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں وہ انتہائی جھوٹا لکھا جاتا ہے۔ (یعنی قرار پاتا ہے)

لغات :- صدق اور کذب کی تعریفیں تو مشہور ہیں کہ جو حکایت اپنے محکم عنہ کے مطابق ہو وہ صدق ہے اور جو موافق نہ ہو وہ کذب ہے تاہم کذب میں کاف کافحہ اور ذال کا کسرہ زیادہ فصیح ہے نسبت کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے اس لئے قرآن مجید میں ذال کے سکون کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ قولہ ”صدیق“ مبالغہ کا صیغہ ہے اسی طرح کذاب بھی ہے۔

باب ماجاء فی الصدق والكذب

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری فی الادب باب ۶۹ ومسلم فی البر حدیث: ۱۰۳ وابن داؤد فی الادب باب: ۸۰ وابن ماجہ فی المقدمة باب: ۷ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۶۶ ج: ۳۔

تشریح:۔ صدق اور کذب کے حسن اور قبح سے متعلق بحث ”باب ماجاء فی اصلاح ذات البین“ میں تحقیقی تشریح کے عنوان کے ضمن میں گزری ہے۔ فلیراجع، باب کی حدیث میں صدق کے التزام اور جھوٹ سے اجتناب کا تاکید حکم ہے اور اس کے ساتھ دونوں کا نفع و نقصان بھی بیان فرمایا گیا ہے، تاہم اگر صدق سے کسی کو غیر معمولی نقصان کا خطرہ ہو تو وہاں خاموشی اختیار کر لینی چاہئے اسی طرح کبھی جھوٹ کہنے سے ایک بے گناہ کی جان محفوظ ہو سکتی ہے جیسے ظالم بادشاہ کسی نیک آدمی اور حق کو عالم کی گرفتاری کے لئے پولیس بھیجتا ہے تو اس کا پڑوسی اگر اس کو اپنے گھر میں پناہ دے کر پولیس کو تلاشی میں ناکام بنا دے اور جب وہ اس کے متعلق پوچھے تو یہ لاعلمی ظاہر کر دے تو اس کا عظیم فائدہ ان شاء اللہ جھوٹ کے نقصان پر غالب رہے گا، گو کہ اس صورت میں بھی اس کو تو یہ اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے گزرا ہے، لہذا کہا جائے گا کہ ناگزیر وجوہات باب کی حدیث سے مستثنیٰ ہیں۔

اس حدیث میں ایک اہم ضابطہ بیان ہوا ہے کہ نیکی، نیکی کے لئے جالب ہے جبکہ بدی، بدی کے لئے جاذب ہے لہذا ایک نیکی کرنے سے دوسری نیکی کی توفیق ملتی ہے خصوصاً وہ نیکی جو پہلی کی نوع سے ہو مثلاً ایک صدقہ سے دوسرا صدقہ آسان ہو جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس اسی طرح ایک گناہ سے دوسرے کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے خصوصاً جب اسی نوع کا ہو مثلاً ایک بار چوری کرنے سے دوسری آسان تر معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ آدمی چور بن جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس۔ غرض نیکیوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں اور گناہوں کے بھی شجرے ہوتے ہیں نیکی، نیکی سے مانوس ہوتی ہے اور بدی، بدی سے۔

دوسری حدیث:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل اس سے دور چلا جاتا ہے۔^۱
لغات:۔ بقولہ ”نتن“ فتح النون الاول و سکون التاء بدبو کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ما جاء به“ مراد اس سے وہ معمولی بات ہے جو اس نے کہی ہے۔

تشریح:۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں اقوال کی دیگر تاثیرات ہیں اسی طرح ان میں خوشبو اور بدبو بھی ہوا کرتی ہے اچھی بات خوشبودار ہوا کرتی ہے اور غلط بات غلیظ اور متعفن و بدبودار ہوتی ہے، ابن العربی نے عارضہ میں سوال اٹھایا ہے کہ ”بات کیسے بدبودار ہو سکتی ہے جبکہ بتو اجسام کا وصف ہے پھر اس کا جواب دیا ہے کہ

اجسام میں یوکی تخلیق ذاتی و طبعی نہیں ہے بلکہ عادی ہے لہذا اللہ جب چاہے اقوال و اعراض میں بھی ہو وغیرہ اوصاف پیدا کر سکتا ہے۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ یہ مسئلہ بھی ”باب ماجاء فی اصلاح ذات البین“ میں تحقیقی تشریح کے ضمن میں گزرا ہے کہ آیا اشیا کا حسن و قبح ذاتی ہیں یا عادی یہ مسئلہ بھی اسی طرح ہے کہ آیا تاثیرات ذاتی ہیں یا عادی، فلیراجع۔

نیز آج کل کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوال اعراض نہیں بلکہ جواہر کے ضمن میں معرض وجود میں آتے ہیں، یہ بحث و پیچیدہ ہے یہاں اس پر تسلی بخش بحث مشکل ہے اگر تحقیق درکار ہو تو راقم کی کتاب ”شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت“ سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، نیز حجۃ اللہ البالغہ میں عالم مثال کی بحث سے اس میں مدد بلکہ تشفی ملتی ہے۔

چونکہ اس حدیث کی سند میں یحییٰ بن موسیٰ نے اپنے شیخ سے استفادہ کیا تھا ”حدیثکم عبدالعزیز؟ الخ“ یہاں ہمزہ استفہام مقدر ہے ”ای احدنکم؟“ اس لئے انہوں نے جواب میں ”نعم“ سے یعنی اثبات میں جواب دیا۔

باب ماجاء فی الفحش

”عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ماکان الفحش فی شیء الا شانه وماکان المحباء فی شیء الا زانه“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدگوئی شامل نہیں ہوتی کسی معاملے میں مگر اسے معیوب بنادیتی ہے اور حیا کسی چیز میں شامل نہیں ہوتی مگر اسے زینت بخشتی ہے۔

دوسری حدیث:- ”عیارکم احاسنکم اخلاقاً ولم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشاً ولا متفحشاً“۔

تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ غیر ارادی طور پر بدگوئی کرتے اور نہ ہی ارادہ فرماتے۔

لغات: بقولہ ”الفحش“ ضم الفاء سخت اور نازیبا جواب اور قول کو کہتے ہیں۔ قال ابن العربی:

”الفحش هو الکلام بما یکره سماعه مما یعلق بالبدین“ یعنی دینی اعتبار سے غلط بات۔ ”قال وهو من اعظم ذنوب اللسان“۔ (عارضہ) بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کا دامن افعال تک پھیلا ہوا ہے، چنانچہ زنا پر فاحشہ کا اطلاق معروف و مشہور بلکہ ماثور ہے۔ قولہ ”الاشانہ“ ”شین“ یفتح اشین عیب کو کہتے ہیں۔

فقولہ ”الازانہ“ شانہ نے قابل ہے زین یفتح الزاء زینت اور خوب صورتی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فاحشاً“ جس کی طبیعت میں بدگوئی کی خصلت ہو۔ قولہ ”منفحشاً“ جو بدگوئی میں تکلف کرتا ہو اور اہتمام کے ساتھ بالا راہہ قبیح بات منہ سے نکالے ہو۔ پس مطلب یہ ہوا کہ فحش بات کرنا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت تھی اور نہ ہی کسی تھی۔

تشریح: خلق بالفتح ظاہری بناوٹ اور شکل و صورت کو کہتے ہیں جبکہ خلق بالضم باطنی ملکات کو کہتے ہیں خواہ وہ ملکات اصلہ ہوں یا فاضلہ، جن کو ہم اخلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ پہلی قسم میں یعنی خلق بالفتح میں تو انسان عام جانداروں کی طرح ایک جاندار ہے مگر اس کا امتیازی مقام اخلاق کی بنا پر ہے۔ آج کل ہمارے یہاں اخلاق کی حیثیت بالکل مٹا دی گئی ہے حتیٰ کہ جب شخص میں داخلے کے لئے طلبہ آتے ہیں تو ان کو عجب، کبر، حسد اور حقہ وغیرہ کی تعریفیں بھی نہیں آتی ہیں اور ان اشیاء میں فرق بھی نہیں جانتے ہیں حالانکہ یہ تو کبار ہیں ان سے اجتناب فرض میں ہے جو ان کی معرفت کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ الحمد للہ راقم نے اس موضوع پر مستقل کتاب ”انفصاف قدم کامل“ لکھی ہے۔

اس حدیث میں فحش بات کو نہایت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جبکہ بھلی بات اور حیا کی حمین کی گئی ہے جس سے ان دونوں کی شرعی حیثیت اور مقام کا صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے، نیز اس میں اچھے اخلاق کے حامل لوگوں کو بہترین افراد قرار دیا گیا ہے، جس سے اخلاق کا اونچا مقام بھی معلوم ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فحش گوئی سے پاک تھے نہ تو کبھی سہواً ان کی زبان پر بڑی بات آئی ہے اور نہ ہی ارادۃً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی غلط بات کی ہے، یہی حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کا بھی تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر و باطنی قول و عملاً پاکیزگی معلوم ہوتی ہے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے اعلیٰ انسانیت کا نمونہ تھے اور ہمیں اس نمونے کے مطابق چلنے کا حکم ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے افعال، اخلاق اور اقوال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور بنائے ہوئے معیار کے مطابق بنائیں تب ہم کامل اور کامیاب انسان کہلائیں گے۔

باب ماجاء فی اللعنة

”عن سمرة بن جندب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تلعنوا بلعنة الله ولا بغضبه ولا بالنار“۔^۱

حضرت سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم ایک دوسرے کو اللہ کی لعنت سے مخاطب نہ کرو (یعنی یوں نہ کہو کہ: تم پر اللہ کی لعنت ہو) اور نہ اس کے غضب سے اور نہ ہی دوزخ سے۔ (جیسے تم پر اللہ کا غضب ہو تم دوزخ میں جاؤ یا اسے دوزخی وغیرہ مت کہو) دوسری حدیث: ”لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذي“۔ ”مومن نہ طعنہ

دینے والا ہوتا ہے اور نہ لعنت کرنے والا اور نہ بے ہودہ ہوتا ہے اور نہ ہی کجواں کرنے والا ہوتا ہے۔

تیسری حدیث: ”ان رجلاً لعن الريح عند النبي صلى الله عليه وسلم فقال لا تلعن الريح فانها مأمورة وانه من لعن شيئاً ليس له باهل رجعت اللعنة عليه“۔^۲

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا پر لعنت بھیجی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہوا پر لعنت ملامت نہ کرو کیونکہ یہ (اللہ کی طرف سے) پابند ہے اور جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت بھیجے جو اس کی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت پلٹ کر اس پر واپس جاتی ہے۔

لغات:۔ قولہ ”اللعنة“ اللہ کی رحمت سے دوری کی بددعا خواہ رحمت خاصہ سے ہو یا رحمت عامہ سے۔ قولہ ”طعان واللعان“ دونوں مبالغے کے بیچے ہیں پہلا طعن سے ہے اور دوسرا لعن سے، طعن اصل میں نیزہ زنی کو کہتے ہیں مگر کڑوی بات چونکہ نیزہ مارنے کے مترادف ہوتی ہے اس لئے تہمت لگانے اور عیب جوئی کو طعنہ کہتے ہیں۔

جراحات السنان لها انبيام

ولا يلتام ما جرح اللسان

باب ماجاء فی اللعنة

۱۔ الحدیث أخرجه ابو داؤد ص: ۳۲۴ ج-۲ ”باب فی اللعن“ کتاب الادب ۲۔ الحدیث أخرجه ابناً ابو داؤد ص: ۳۲۳

ج-۲ کتاب الادب وابن حبان فی صحیحہ، الترمذی والترغیب ص: ۳۱۵ ج-۳

ابن العربی فرماتے ہیں: ”وانما سماء طعناً لان سهام الكلام معنى كسهام النصال حساً وجرح اللسان كجرح اليد“۔ قولہ ”الفاحش“ اس کا مطلب اگرچہ سابقہ باب میں گزرا ہے تاہم یہاں اس کو عام لیماز یا وہ افضل ہے بایں طور کہ فاحش وہ ہے جو کلام اور افعال دونوں میں حد سے گزرتا ہو جبکہ ”الہذی“ وہ ہے جو باتوں میں بے ہودہ بلکتا ہو، پھر ہذی پشید الیاء بھی پڑھ سکتے ہیں اور تخفیف الیاء و بعدھا ہمزہ بھی جبکہ دونوں حالتوں میں باء مفتوح اور ذال کسور ہے۔

تشریح:۔ امام ترمذی نے اس باب میں تین احادیث ذکر فرمائی ہیں پہلی حدیث خاص ہے مخاطب کے ساتھ جبکہ دوسری عام ہے عائین کو بھی شامل ہے۔ تیسری حدیث اس نبی کی علت ہے کہ لعن طعن اس لئے حرام ہے کہ جب لعنت زبان سے نکلتی ہے تو پھر ضائع نہیں جاتی بلکہ کہیں نہ کہیں واقع ہو جاتی ہے اگر وہ چیز جس پر لعنت بھیجی گئی ہے مستحق ہو تو اسی پر واقع ہو جائے گی در نہ لعنت کرنے والے کی طرف واپس لوٹ کر پڑ جائیگی۔ ابن العربی عارضہ میں اس تیسری حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ”والمعنى فيه ان ذالك يوجب وقوعها بمن قالها ان لم يكن المخاطب (الملعون) اهلاً لها... الى... حديث غريب ومعناه صحيح“۔ اسی طرح دوسری حدیث بھی باوجود غرابت کے صحیح ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اگر کسی شخص سے ناپسندیدہ کام صادر ہو جاتا تو اس کا نام ذکر کرنے کے بجائے عام تعبیر کرتے جیسے مہاجر ام قیس یا اس حدیث میں ”رجلاً“ وغیرہ۔ بعض روایات کے مطابق کمافی ابی داؤد سے اس آدمی سے ہوانے چادر کھینچی تھی جس پر اس کو غصہ آیا اور ہوا پر لعنت بھیجی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس پر تنبیہ فرمائی اور واضح فرمایا کہ لعنت کا ضرر بہت زیادہ ہے اگر ایسی چیزوں پر لعنت بھیجی جائے جو امور نکوینہ کی پابند ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے میں ان کا کوئی قصور نہیں تو لامحالہ اس کا نقصان لعنت کرنے والے کی طرف ہی لوٹے گا۔

بہر حال ان احادیث ثلاثہ سے لعنت اور فحش گوئی کی سخت مذمت و ممانعت معلوم ہوتی ہے، مسلم شریف میں ہے کہ ایک عورت نے جو قافلے میں شامل تھی اونٹنی پر لعنت بھیجی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسی اونٹنی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتی جس پر لعنت بھیجی گئی ہو چنانچہ اس کو آزاد چھوڑنے کا حکم دیا جس کی

تقیل کی گئی۔ مسلم شہ ہی کی ایک اور حدیث ہے "لا ینبغی لصدیق ان یکون لعاناً" چونکہ تھوڑی بہت لعنت اور خامی سے بچتا تو شاید انسانی پس سے باہر ہے "الامن عصبہ اللہ" اس لئے اس حدیث میں اور اسی طرح باب کی دوسری حدیث میں طعان اور لقان، مبالغے کے صیغے لائے گئے۔ امام نوویؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ولم یقل لاعناو اللاعتون لان هذا الدم فی الحدیث انما هو لمن کثر منه اللعن
للمرة ونحوها ولانه ینخرج منه ایضاً اللعن المباح وهو الذی ورد الشرع به وهو
لعنة الله على الظالمین، لعن الله اليهود والنصارى، لعن الله الواصلة والراشمة
وشارب الخمر واکل الربوا و موكله وکاتبه وشاهديه والمصورین... وغيرهم
ممن هو مشهور فی الاحادیث الصحیحة"۔ (مسلم ص ۳۲۲ ج ۲)

یعنی لعنت کی ممانعت سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کو اوصاف مذیلہ سے یاد رکھنے کی لعنت کرے یا جو مخصوص ہیں کیونکہ ان دونوں اقسام پر لعنت بھیجتا جائز ہے اسی طرح جس کا خاتمہ بالکفر نص سے ثابت ہو وہ بھی ملعون ہے۔

یہ بحث رحمت خاصہ نے بارے میں تھی جو جنت سے دوری کی بددعا ہے جہاں تک رحمت عامہ یعنی دنیوی فوائد و منافع کا تعلق ہے تو اس میں نسبتاً گنجائش زیادہ ہے اگرچہ دونوں کام نصیح و ہمدردی کے منافی ہیں اس لئے مطلق لعنت سے بچنا چاہئے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"لان اللعنة فی الدعاء یراد بها الابعاد من رحمة الله تعالى وليس الدعاء بهذامن
اخلاق المؤمنین الذین، وصنهم الله تعالى بالرحمة بينهم والتعاون علی البر
والتقویٰ، جعلهم کالبیان یشد بعضه بعضاً و کالحسد الواحد وان المؤمن
یحب لایحیه ما یحب لنفسه فمن دعا علی ایحیه المسلم باللعنة وهی الابعاد من
رحمة الله فهو من نهابة المقاطعة والتدابیر و هذا غایة ما یؤده المسلم للکافر
و یدعو علیه و لهذا جاء فی الحدیث الصحیح لعن المؤمن کفله لان القاتل
یقطعه عن منافع الدنیا و هذا یقطعہ عن نعيم الآخرة و رحمة الله تعالى۔ وقیل:

فی حوالہ بالا ایضاً رواہ الحاکم وصححه ولفظه قال: لا یجتمع ان تكونوا لعائن مدلفین بحوالہ الترغیب والترہیب
ص: ۳۱۲ ج: ۳۔

معنی لعن المؤمن کفله فی الاثم وهذا الظاهر۔ (نووی شرح مسلم ص ۳۲۳ ج ۲)
 اس کا مطلب یہ ہوا کہ لعنت بھیجنے والا نہ صرف ملعون کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ خود بھی غیر معمولی نقصان اٹھاتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے: "لا یسکون اللعانون شفعا ولا شهداء یوم القیمة"۔ (مسلم ص ۳۲۳ ج ۲) (مزید تفصیل شرح نووی بر مسلم میں دیکھی جاسکتی ہے۔)

باب ماجاء فی تعلّم النسب

”عن اسی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: تعلّموا من انسابکم ما تصلون بہ ارحامکم فان صلة الرحم مَحَبَّةٌ فی الِاهل مَثْرَاةٌ فی المال مَنَسَاةٌ فی الِاثَر“۔ (حدیث غریب تفرد بہ الترمذی من اصحاب الستہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے نسب سے جو بے لوگوں کے کم از کم اتنے نام یاد رکھو جن کے ذریعے آپس کی صلہ رحمی کر سکو کہ صلہ رحمی رشتہ داروں سے محبت کا ذریعہ ہے مال بڑھنے کا سبب ہے اور ذکرِ خیر تادیر کا ذریعہ ہے۔

لغات:- ”انساب“ نسب کی جمع ہے فتح النون والسمین پدری قرابت کو کہتے ہیں۔ ”ما تصلون بہ“ چونکہ تمام نسب حضرت آدم علیہ السلام تک یاد کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی زیادہ مفید ہے اس لئے صرف اس مقدار کو یاد رکھنے کا حکم آیا جن کو یاد رکھنے کا عملی فائدہ حاصل ہو، وجہ اعلیٰ اور اس کی شاخوں پر مشتمل ہے۔ قولہ ”مَثْرَاةٌ“ ثراء سے ہے ثروت دولت مندی و مال داری کو کہتے ہیں یہ لفظ فتح الحمیم و سکون الثاء پڑھا جائے گا۔ قولہ ”مَنَسَاةٌ“ یہ بھی فتح الحمیم و سکون النون ہے نساء سے ہے جو بمعنی تاخیر کے ہے ”فَسال اللہ: ما تنسخ من اية او تنسها“۔

تشریح:- اس حدیث سے نسبی رشتوں کو یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کی تاکید اور اس کی حکمت ثابت ہوتی ہے جہاں تک صلہ رحمی کے حکم کا تعلق ہے تو اس پر تفصیلی بحث گزری ہے، رہی اس کی حکمت تو اس ارشاد پاک میں

۱۔ ابنا رواہ ابو داؤد ص: ۳۴۴ ج: ۲ کتاب الادب۔

باب ماجاء فی تعلّم النسب

۱۔ الحدیث اخرجه الطبرانی فی الکبیر ۹۸/۱۸ بحوالہ مجمع الروائد ص: ۹۵ ج: ۸ حلیہ: ۱۳۶۲ کتاب البر والصلة ج: ۱ سورة البقرة آیت: ۱۰۶۔

اس کے تین فوائد بیان ہوئے ہیں ایک یہ کہ صلہ رحمی آپس میں محبت کا ذریعہ ہے اور یہ بات بالکل واضح اور مشاہدہ کے مطابق ہے۔ دوم یہ کہ اس سے مال میں اضافہ ہوتا ہے اس کی قدرے تفصیل بھی پہلے مذکور ہے کہ مال خرچ کرنے سے اور خصوصاً اہل قربت کے ساتھ سنوک کرنے سے مال بڑھتا رہتا ہے اور یہ بھی مجرب ہے۔ رہی تیسری بات تو اس کے تین مطلب بیان ہوئے ہیں: ایک یہ کہ منساق فی المار سے ماہر میں اضافہ ہے مگر اثر سے مراد اہل ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ صلہ رحمی اہل کی تاخیر کا ذریعہ ہے، یعنی جو لوگ صلہ رحمی کرتے ہیں اللہ ان کی عمر بڑھاتا ہے باری صورت کہ اللہ نے زیادہ عمر والوں کے لئے صلہ رحمی کو آسان بنا دیا ہے اور مقدر فرمایا ہے کہ جو لوگ صلہ رحمی کریں گے ان کی موت کو مؤخر کروں گا اور یہ معنی تقدیر مبرم کے منافی نہیں کیونکہ اللہ نے ان کے لئے تقدیر میں صلہ رحمی کو آسان کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے اور پھر اسی پر عمر کا اضافہ بھی مقدر فرمایا ہے۔ تدبیر

یا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی عمر میں برکت دی جاتی ہے جن کو نسیاع وقت سے محفوظ رکھ کر مسلسل اور زیادہ عمل کی توفیق دیتا رہتا ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ وقت کا ایک طول ہوتا ہے اور دوسرا عرض ہوتا ہے وقت میں برکت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے عرض کو کشادہ کیا جاتا ہے، چنانچہ کبھی آدمی ایک ہی دن میں پوری کتاب لکھ لیتا ہے حالانکہ دن تو وہی بارہ گھنٹے کا ہوتا ہے مگر چوڑائی بڑھادی جاتی ہے۔

دوسرا مطلب اس آخری جملے کا یہ ہے کہ ایسے آدمی کا ذکر قبیل لوگوں میں عرصہ دراز تک باقی رکھا جاتا ہے جس سے اس کو اخروی فائدہ ہوتا ہے اور ترجمہ میں اسی مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ ایسے آدمی کو نیک صالح اولاد دی جاتی ہے جس سے اس کی یادگار بطور ذکر خیر اور عمل صالح کے باقی رہتی ہے خواہ یہ ذریعہ صلیبی ہو یا روحانی ہو، چنانچہ آج ایسے علماء کی روحانی اولاد بکثرت پائی جاتی ہے جو ان کا نام لے کر ”رحمہ اللہ“ اور ”رضی اللہ عنہ“ وغیرہ دعاؤں سے ان کو یاد رکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں یہ حدیث.... صرف امام ترمذیؒ نے ذکر کی ہے علاوہ ازیں امام احمد و حاکم وغیرہ نے بھی تخریج کی ہے۔

نوٹ:- نسب اگرچہ باپ کی جانب سے اقرباء کو کہتے ہیں تاہم اس حدیث میں ذوالارحام یعنی مادری رشتے بھی مراد ہیں کیونکہ جس طرح پھوپھی کے ساتھ حسن سلوک ان تین فوائد کا موجب ہے اسی طرح

خالہ کے ساتھ نیک برتاؤ بھی ان منافع کا سبب ہے۔ اسی طرح اور کے اعزہ و اقارب سے بھی اچھا تعلق ہونا چاہئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب قریش کے ساتھ رشتہ داری کی بنیاد پر نیک سلوک فرماتے۔

باب ماجاء فی دعوة الاخ لاخته بظہر الغیب

”عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مادعوة اسرع اجابة من دعوة عائب لغائب“۔ (غریب والا فریقی یضعف النسخ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غائب کی دعاء عائب کے حق میں قبول ہونے میں کوئی دعا اس سے زیادہ جلد قبول ہونے والی نہیں۔

لغات:۔ ”بظہر الغیب“ پیٹھ پیچھے، ظہر کا لفظ زائد برائے تاکید ہے۔

تشریح:۔ چونکہ مدعو لہ کی موجودگی میں ریاء اور لالچ و طمع کی آمیزش دعاء کی قبولیت کو متاثر یا ختم کر سکتی ہے اس لئے عائبانہ کی تخصیص فرمادی پھر غائب سے مراد دور نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کے حق میں دعا مراد ہے جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں شخص میرے لئے دعائیں مانگ رہا ہے لہذا اگر وہ دونوں ایک ہی سیٹ پر بیٹھے ہوں مگر دل میں ایک دوسرے کے لئے دعائیں مانگیں تو بھی وہ عائبانہ کہلائے گی اس کی قبولیت کی وجہ اخلاص نیت اور نصیحت و خیر خواہی ہے۔

باب ماجاء فی الشتم

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال المُستَبان ماقلا فاعلی البادیئ متھما مالم یعتد المظلوم“۔^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گالم گلوچ کرنے والے دونوں جو کچھ کہتے ہیں وہ پھل کرنے والے پر بول ہے جب تک کہ مظلوم (جس کو گالی پہلے دی گئی ہے) انتقام میں زیادتی نہ کرے۔

لغات:- قولہ ”المستبان“ تسمیہ الہباءِ مُستَبَّ کا تثنیہ ہے جو باب افتعال کا اسم فاعل ہے یعنی استَبَّ کا باب افتعال بھی باب تفاعل کی طرح کبھی جائیں سے مشارکت فعل کے لئے آتا ہے لہذا استَبَّ کے معنی باہم گالی گلوچ کرنے کے ہیں۔ قولہ ”فعلى البادئ الخ“ المستبان کی خبر ہے ”ای انہم قولہما علی البادئ“۔ چونکہ ”ما“ موصولہ معنی شرط کو متضمن ہے اس لئے خبر پر ”فا“ داخل کر دیا پھر ”البادئ“ کے اخیر میں ہمزہ ہے کیونکہ یہ بدء سے اسم فاعل ہے۔

تشریح:- باب کی تیسری روایت میں شتم اور سب کو فسوق کہا ہے اس طرح ایک روایت میں گالیاں بکنے والوں کو شیطان کہا ہے جیسا کہ مسند احمد نے اور ابوالوفاء المروری میں ہے ”المستبان شیطانان“ الخ جس سے گالیوں کی شاعت معلوم ہوتی ہے تاہم اگر کوئی شخص کسی کو گالی دیدے تو دوسرا جواب دینے اور انتقام لینے کا حق شرعاً محفوظ رکھتا ہے اگر وہ چاہے تو خاموش ہو جائے جو عزیمت کا درجہ اور صبر کا مقام ہے لیکن اگر وہ جواب دینا چاہے تو اسے اجازت ہے تاہم امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ خلاف واقعہ جواب دینے کی اجازت برگزیدہ ہوگی لہذا اسے ایسا جواب دینا چاہئے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو اور بات بھی حقیقت پر مبنی ہو مثلاً جواب میں احمق اور بے وقوف کہنا چونکہ کوئی آدمی آج کل حماقت سے معر نہیں ہو سکتا اس لئے جواب درست ہوگا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جواب میں گالی دینے والے کے الفاظ پر اکتفاء کرے ایسے میں اس بُرائی کا سارا گناہ اس آدمی پر آئے گا جس نے پہل کی ہے لیکن اگر دوسرے نے غصے میں یا جواب میں تجاوز کیا تو یہ بھی گناہ میں برابر کا شریک ہوگا۔ ابن العربی لکھتے ہیں: ”المعنی انہ اذا سبہ فرد علیہ کان کفافاً فان زاد بالغضب والتعصب لنفسه کان ظالماً وکان کل واحد منہما فاسقاً“۔

دوسری حدیث:- فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مردوں کو برا بھلا مت کہو کیونکہ اس سے تم زندوں کو تکلیف پہنچاؤ گے۔ ۳

یح مسند احمد ص: ۱۶۶ ج: ۵ حدیث: ۱۷۰۲۹ عن عیاض قال قلت یارسول اللہ رجل من قومی یشتمنی وهو دنی علی باسم ان انصر منه؟ قال: المستبان شیطانان یتھاذبان یتکااذبان، ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۱۱ ج: ۳۔ حلیط الرحمن الحنفی

مع الحدیث المخرجه احمد فی مسندہ ص: ۳۰۸ ج: ۵ حدیث: ۷۷۴۴، ۷۷۴۵، ۷۷۴۶ وابن عدی فی الکامل ۱۵۶۸/۳، والنزیدی فی التحائف المذابة المنقذ ۴/۲۹، والعراقی فی المعنی عن حمل الاسفار ۳/۷۷، ۷۸، مجمع الزوائد ص: ۹۳ ج: ۵ حدیث: ۱۳۰۳۱۔

تشریح:۔ چونکہ مُردوں کو گالی دینے کا رخ ان کے پس ماندگان کی جانب ہوتا ہے اس لئے مُردوں کو گالی گلوچ دینا ممنوع قرار دیا کہ اس سے درحقیقت زندوں کی ایذا رسانی ہوتی ہے پس اگر وہ نیک و صالح لوگ ہوں گے تو ان کے مردے جیسے بھی ہوں ان کو گالیاں نہیں دینی چاہئے گو وہ کافر کیوں نہ ہوں، نیز ان کے گناہوں کی سزا ان کو مل چکی ہے اور اگر وہ قابلِ غصہ ہوں جیسے مسلمان مُردے تو پھر ایسے لوگوں کو جو عبد اللہ مقبولِ غصہ سے ہیں بُرائی نہیں کہنا چاہئے۔

تیسری حدیث:۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ (حسن صحیح ۷)

لغات:۔ فقولہ ”سب ابسکسر السین“ گالی اور بُرا بھلا کہنا۔ فقولہ ”فسق“ کے معنی خروج کے ہیں اصطلاح میں شرع کی اطاعت سے خروج یعنی گناہ کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ خوارج اس حدیث کے ظاہر کے مطابق کہتے ہیں کہ مسلمان کو قتل کرنا کفر ہے اور قاتل کافر ہے۔ ابن العربی فرماتے ہیں کہ پھر قاسق بھی کافر ہونا چاہئے کیونکہ کسی کو بحیثیت مسلمان قتل کرنا جیسے کفر ہے اسی طرح گالی دینا بھی کفر ہے، لہذا حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ گالم گلوچ اور قاتل اگرچہ دونوں کبار ہیں تاہم گالیوں کا درجہ اخف ہے کہ بعض لوگ اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے بخلاف قاتل کے کہ یہ تو صرف اختلافِ دین کی وجہ سے ہونا چاہئے، لہذا جو آدمی کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے وہ گویا اپنا دین الگ سمجھتا ہے۔ غرض گالی گناہ ہے مگر عمل کفر نہیں جبکہ قاتل گناہ کے ساتھ عمل کفر بھی ہے اور عمل کفر سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا یعنی نفسِ فعل سے اور حدیث میں یہی فرق ظاہر کرنا مراد ہے۔ تدبر ولاحظ!

باب ماجاء فی قول المعروف

”عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان فی الحنة عُرْفًا تُرَى ظہورہامن یعلو بہا ویطونہا من ظہورہا مقام اعرابی فقال: لیمن ہی یا رسول اللہ؟ فقال: لمن اَطَابَ الکلام واطعم الطعام وَاَدَامَ الصِّیَامَ وَصَلَى بِاللَّیْلِ وَالنَّاسِ نِیَامًا“۔ (حدیث غریب وَاخْرَجَہُ اَحْمَدُ ابْنُ حَبَانَ

عَنِ الْحَدِیثِ اَخْرَجَہُ الْبُخَارِیُّ فِی الْاِیْمَانِ بَاب: ۳۶ وَالْاَدَبِ بَاب: ۳۳ وَالْفَقْہُ بَاب: ۸، وَمُسْلِمٌ فِی الْاِیْمَانِ حَدِیث: ۱۱۱،

وَالنَّسَائِیُّ فِی التَّحْرِیمِ بَاب: ۲۷ وَابْنُ مَاجَہُ فِی الْمَقْدِمَةِ بَاب: ۹، وَالتِّرْمِذِیُّ وَالتَّحْرِیمِ ص: ۳۱۱ ج: ۳،

فی صحیحہ وغیرہ (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک جنت میں ایسے بالا خانے ہیں جن کا بیرونی منظر اندر سے دکھائی دیتا ہے اور اندر کا باہر سے نظر آتا ہے، ایسے ایک اعرابی نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ کس کے لئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کے لئے ہیں جو میں نے میٹھی گفتگو کرے اور کھانا کھانے اور کثرت سے روزے رکھے اور رات کو نماز پڑھے جب لوگ سو رہے ہوں۔

لغات: بقولہ "عُرْفًا" بضم الاول وفتح الثانی عُرْفٌ کی جمع ہے دو کمرہ اور غمارت جو بلندی پر بنی ہو خواہ زمین پر ہی ہو جیسے ٹیلہ نما جگہ پر جہاں سے چاروں اطراف دور تک نظر آتے ہیں۔

تشریح: جو آدمی صاف گو اور حق گو ہو تو چونکہ اس کا ظاہر باطن کا آئینہ ہوتا ہے اور باطن بھی ظاہر کے مطابق ہوتا ہے اسی طرح دوسری نیکیوں کا حامل جن کا تذکرہ اس حدیث میں ہوا ہے دوسری جانب یہ طے ہے کہ جزاء مثلاً عمل ہوتی ہے لہذا اس کے اس شفاف روئی اور صاف ستھرے طرز کلام اور بے غبار عمل کی وجہ سے اللہ نے ایسے محلات عطا فرمائے جو شیشے کی طرح بالکل صاف اور شفاف ہیں۔ آج کل جیسے بڑے بڑے شیشے لگائے جاتے ہیں جس سے اس حدیث کے سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

چونکہ ایسے گھر ایک عمدہ نعمتیں ہیں اس لئے ایک اعرابی نے یہ سن کر بوجہ اشتیاق پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لحسن اطباء الکلام" طیب کے معنی عمدہ کے آتے ہیں بعض طرق میں اطباء کے بجائے "الان" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی نرم کے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ جس کے اخلاق اچھے ہوں کیونکہ عمدہ اخلاق کا مالک جب بات کرتا ہے تو جی سننے سے نہیں ٹھکتا بلکہ دل و دماغ مسرور ہوتے ہیں۔

قولہ "وإدام الصيام" ابن العربی عارضہ میں نکلتے ہیں کہ اس سے مراد معروف روزے ہیں یعنی

باب ماجاء فی قول المعروف

رواہ احمد فی مسندہ ۳۴۳/۵ واورده المصنف فی روائد المسند حدیث ۵۱۱۲، والخلف البغدادی فی تاریخ

بغداد ۳۰۳/۸، والسرطانی فی الدر المنثور ۱۸۲/۵، مجمع الزوائد ص ۵۶۰ ج ۱۰، أيضاً رواه ابن حبان فی

صحیحہ، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۳۹ ج: ۱۰

رمضان اور باقی فضیلت والے ایام کے جس کی تفصیل ابواب الصوم میں گزری ہے، لہذا اس سے مراد صوم الدہر اور تسلسل سے روزے رکھنا نہیں ہے۔ بعض صوفی فرماتے ہیں کہ یہاں صیام سے مراد ہر مکروہ سے پرہیز و مساک ہے چنانچہ دل خراب اعتقادات اور تصورات سے اور زبان غلط باتوں اور جسم بے ہودہ کاموں سے محفوظ رکھنا مراد ہے۔

قولہ ”وصلی باللیل الخ“ عارضہ میں ہے کہ تہجد کی فضیلت کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ اللہ نے اس کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا وسیلہ بنایا چنانچہ ارشاد ہے ”ومن اللیل فتحہ حدیثہ نافلۃ لک عسی ان یبعثک ربک مقاماً محموداً“ الایۃ۔ دیگر فضائل ابواب الصلوٰۃ میں گزرے ہیں۔

باب ماجاء فی فضل المملوک الصالح

”عس ای ہریرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: نعم ما یلاخدهم ان یطیع ربہ ویؤدی حق سیدہ یعنی المملوک وقال کعب: صدق اللہ ورسولہ“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہت اچھی بات ہے ان میں سے ایک کے لئے کہ وہ اپنے رب کی بھی اطاعت کرے اور اپنے آقا کا حق بھی ادا کرتا رہے (راوی کہتا ہے) ”یعنی غلام“۔ حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے سچ ہی کہا ہے۔

لغات:- ”نعم ما“ لفظ ”ما“ نکرہ ہے بمعنی شیئاً اس کا پہلے میم میں ادغام بھی جائز ہے چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ”نِعْمَ المملوک“ کے الفاظ ہیں ادغام کی صورت میں عین پر کسرہ پڑھا جائے گا جبکہ نون پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں جبکہ بغیر ادغام کے جیسے ترمذی کی روایت میں ہے نون مکسور اور عین کو ساکن پڑھا جائے گا۔

تشریح:- چونکہ غلام کے لئے بیک وقت مالک حقیقی اور مالک مجازی دونوں کو خوش رکھنا یا اس صورت کہ دونوں کی پوری اطاعت کی جائے ایک مشکل کام ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مدح فرمائی

بلکہ بعض روایات میں اس کو ذیلِ ثواب کی خوشخبری دی ہے کہ عمل بھی ذہرا ہے۔

قولہ "وقال کعب صدق اللہ ورسولہ" چونکہ حضرت کعب الاحبار کتبِ سادہ کے ماہر تھے اس لئے انہوں نے سابقہ کتب میں بھی یہی پڑھا ہوگا اس لئے اس کی تصدیق فرمائی کیونکہ کتبِ سادہ سب ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔

حضرت کعب الاحبار سے کافی ساری روایات مروی ہیں اگرچہ بخاری شریف میں ان سے روایت نہیں ہے مگر مسلم شریف میں ان سے روایت ہے۔

حافظ نے تقریب وغیرہ میں لکھا ہے کہ ان کا نام کعب بن ماتع الحمیری تھا، کنیت ابو اسحاق اور المعروف بہ کعب الاحبار تھے، ثقہ راوی ہیں، مختصر میں میں سے ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحنِ حیات موجود تھے مگر ملاقات نہ ہو سکی تھی کیونکہ یہ یمن میں ہوتے تھے بعد میں شام منتقل ہو گئے تھے اور عمر سو برس سے متجاوز تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انتقال فرما گئے۔

حدیث آخر:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین اشخاص مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے (راوی کہتا ہے) میں سمجھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن وہ غلام جس نے اللہ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا بھی۔ اور وہ شخص جس نے کسی قوم کی امامت کی (خواہ صغریٰ ہو یا کبریٰ) اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ اور وہ شخص جو پانچوں نمازوں کے لئے ہر دن رات اذان دیتا رہا ہو۔

لغات:۔ قولہ "کعبان المسک" کعبان، بروزن عثمان بن عفان الکافی کعب کی جمع ہے اونچے ٹیلے کو کہتے ہیں اور مسک بکسر المیم مشک کو کہا جاتا ہے۔ قولہ "أراه" اسی اظہر، اس لفظ میں ضابطہ یہ ہے کہ جب ضم الہزہ آتا ہے تو بمعنی ظن کے آتا ہے جیسے یہاں ہے اور جب بفتح الہزہ آتا ہے تو روایت بصری اور یقین کے معنی میں آتا ہے۔

تشریح:۔ چونکہ مشقت والے اعمال اور پاکیزہ کاموں سے آدمی ترقی کرتا ہے اور اسے نیک شہرت ملتی ہے بشرطیکہ اُن میں ریاء اور دکھاوانہ ہو اس لئے اللہ نے ان تینوں کو قیامت کے دن ان اعمال کے مطابق شہرت کے اونچے مقام تک پہنچایا، بخلاف ریاکار کے کہ وہ اپنے جن اعمال کی وجہ سے کُتبِ جاہ میں مبتلا ہے تو دنیا میں

اگرچہ وہ شہرت حاصل کر لیتا ہے لیکن قیامت میں بدنام و گنہگار بنادیا جاتا ہے یا شہرت تو ہوگی مگر بدنامی والی۔
 رہا یہ مسئلہ کہ اگر امام سے لوگ راضی نہ ہوں اور وہ زبردستی کرسی پر یا مسجد کے منبر و محراب پر قابض رہے
 تو اس کا حکم ابواب الصلوٰۃ میں گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی، باب ماجاء من اثم قوما وھم لہ کارھون ص: ۲۰۲ ج: ۲)
 جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام میں خاں ہو اور لوگ اس کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے ہوں تو امام کو لازم
 ہے کہ یا اس خاں کا ازالہ کرے یا پھر مستعفی ہو جائے بصورت دیگر حوالہ بالا کی حدیث کے مطابق یہ ان تین
 آدمیوں میں سے ہوگا جن پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ والعیاذ باللہ

باب ماجاء فی معاشرۃ الناس

”عن ابی ذر قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اتق اللہ حیث ما کنْتَ و اتبع
 السبیلۃ الحمیۃ تَمَحُّهَا وَ تَحَالِفِ النَّاسَ بِخُلُقِ حَسَنٍ۔“ (ہذا حدیث حسن صحیح)
 حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:
 اللہ سے ڈرتے رہنا خواہ جہاں بھی ہو، اور نیکی کو بُرائی کے درپے کر لیا کر دتا کہ اسے مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ
 خوش اخلاقی سے ملو۔

لغات:- قولہ ”معاشرۃ“ عشرت سے ہے باب مفاعلہ کی خاصیت کے مطابق باہم رہن سہن اور میل
 جُل کر رہنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”اتق اللہ“ تقویٰ کے معنی پرہیز اور بچنے کے ہیں، جس کے متعدد درجے ہیں جیسا
 کہ تفسیر بیضاوی وغیرہ میں ہے ”وہو فی عرف الشرع اسم لمن یقی نفسه عما یضرب فی الآخرة ولہ
 ثلاث مراتب“: (۱) شرک اور عذاب دائم سے بچنا۔ (۲) ہر گناہ سے بچنا حتیٰ کہ صغائر سے بچنا بھی بعض کے
 نزدیک تقویٰ کے اس درجے میں شامل ہے۔ (۳) اپنے دل و دماغ کو ہر اس چیز سے محفوظ رکھنا جو راہ حق میں
 رکاوٹ بنے ”وہو التقوی الحقیقی المطلوب بقولہ تعالیٰ: اتقوا اللہ حق تقاتہ۔“ (بیضاوی)
 قولہ ”حیث ما کنْتَ“ یعنی خلوت اور جلوت دونوں میں۔ قولہ ”تَمَحُّهَا“ اسناد مجازی ہے کیونکہ
 مٹانے والا اللہ ہی ہے یعنی اللہ اس کے ذریعے گناہ کو مٹا دیتا ہے۔

تشریح:- تقویٰ کا حکم تو سب مسلمانوں کے لئے ہے مگر اس حدیث میں چونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو خصوصی طور سے نصیحت کی جا رہی ہے، گویا قی لوگوں کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہئے اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہاں تقویٰ کا آخری تیسرا درجہ لیا جائے علیٰ ہذا گناہ اگرچہ توبہ سے معاف ہوتا ہے مگر یہاں چونکہ بات تقویٰ کی ہو رہی ہے، اور وہ بھی اعلیٰ درجے کے تقویٰ کی جو دل کی روحانی کیفیات کو ہمہ وقت برقرار رکھنے اور برسرِ یعنی قلب کو ماسوا اللہ سے پاک رکھنے کا نام ہے تو جب کبھی گناہ صادر ہو جائے تو وہاں دل میں سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے خواہ وہ گناہ صغیرہ کیوں نہ ہو اس لئے فوراً نیکی کا کام کرنا چاہئے تاکہ دل کی جلا بحال ہو اور دھبہ مٹ جائے یعنی نامہ اعمال کے مٹنے کے ساتھ ساتھ لوحِ قلب سے بھی اس کا موزی اور مخوس اثر ختم ہو جائے۔

چونکہ تقویٰ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ راضی نہ ہو لہذا حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بھی ذکر فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ میل جول میں وہ برتاؤ کرو جس سے اللہ راضی ہو یعنی اخلاقِ حسنہ، حسن ظن اور حسن معاملہ۔

باب ماجاء فی ظن السوء

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: یا اکرم والظن بغان الظن اکذب“

المحدث“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ کیونکہ بدگمانی جھوٹ سے زیادہ غلط ہے۔

لغات:- قولہ ”ظن السوء“ ظن کے معنی گمان کے ہیں یہ وہی معنی ہیں جو مناسطہ کے یہاں معتبر ہے جو تصدیق کا ادنیٰ درجہ ہے یعنی اعتقادِ جازم، جبکہ السوء کے معنی برائی و بدکاری وغیرہ کے آتے ہیں مجموعی ترجمہ بدگمانی ہے۔

تشریح:- سابقہ باب میں آخری جملے سے اخلاقی حسنہ پر عمل کرنے کا حکم تھا جس میں حسن ظن بھی داخل ہے اس لئے اصل یہ ہے کہ مسلمانوں اور خاص کر نیک صالح لوگوں کے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہئے جبکہ بدگمانی اس کی ضد ہے اس لئے اس باب میں بدگمانی کی نفی اور نہی فرمادی، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن مطلوب اور سوء ظن مردود و مذموم ہے ہاں البتہ عقائد میں ظن قطعاً قابل قبول نہیں، مثال

اللہ تعالیٰ: ”وَمَا تَتَّبِعْ أَكْثَرُهُم إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا“^۱ یہ مسئلہ متفق علیہا ہے سوائے ابن ہمام رحمہ اللہ کے جو بعض عقائد کو ظن سے ثابت مانتے ہیں مگر یہ ان کا تفرد ہے جیسا کہ (تشریحات ترمذی جلد چہارم ”باب ماجاء فی عذاب القبر“ ص ۴۰۱) پر گزرا ہے۔ ہاں اعمال و احکام فرعیہ میں خبر واحد قابل قبول ہے جو کثرت و سائل کی وجہ سے مفید للظن ہے اسی طرح دیگر معاملات و معاشرت میں بھی مگر یہ الگ مسئلہ ہے اور باب کا مسئلہ بدگمانی سے متعلق ہے، لہذا یہاں اسی سے متعلق بحث مناسب ہے، پس اس حدیث کا مطلب کیا ہے؟

(۱) تو امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس بارے میں امام سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ وہ بدگمانی اکذب الحدیث کی وعید میں آتی ہے جس کے بارے میں زبان سے اظہار کیا جائے بغیر اظہار کے گناہ میں نہیں آتی، لیکن ابن العربی نے عارضہ میں اس توجیہ کو رد کیا ہے کیونکہ ایک دفعہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کے دنوں میں رات کے وقت مسجد کے دروازے کے پاس حضرت صفیہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کو گھر جانے کے لئے رخصت کر رہے تھے ابھی ان کے ساتھ کھڑے ہی تھے کہ وہاں سے دو آدمی گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”انہا صغیہ“ قال لا ہمارسول اللہ سبحان اللہ قال: ان الشیطان یحری من ابن آدم محرم الدم ہوانی عشتیت ان یقذف فی قلوبکم ما شیئاً فتنہلکم“۔^۲

چنانچہ یہاں بغیر نطق کے ظن کو بھی مہلک قرار دیا ہے اگرچہ غیر نبی کے بارے میں بدگمانی ہلاکت خیز تو نہیں مگر معصیت تو ہے۔

(۲) امام نووی نے شرح مسلم میں امام خطابؓ سے نقل کیا ہے کہ مراد وہ ظن ہے جو فس میں قرار پکڑے یعنی چٹکی پائے۔ رہا وہ ظن جو آئے اور ختم ہو جائے وہ معاف ہے کہ غیر اختیاری و سو سے انسانی بس سے باہر ہے۔

(۳) ابن العربی نے جس کو صحیح کہا ہے وہ یہ ہے ”وقبل: ذالک مختلف بحال المظنون وهو الصحیح عندی“ یعنی اگر ایک آدمی مشتبہ کام کرتا ہے مثلاً جب اس کا پڑوسی گھر میں نہیں ہوتا ہے تو وہ چھپکے

سے اس کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور یہ اس کا معمول ہے اور پڑوسی کی بیوی بھی کوئی نیک سیرت خاتون نہیں ہے تو ایسے میں حسن ظن کہاں سے آئے گا؟ یا ایک راوی متهم بالکذب ہے وغیرہ وغیرہ تو ایسی بدگمانی گناہ میں نہیں آتی بلکہ اس کا ذمہ دار مظنون خود ہے لیکن جو شخص نیک صالح کردار کا حامل ہے تو اس پر بلا وجہ بدگمانی کرنا غلیظ جھوٹ اور تہمت ہے۔

”لان من الناس من تنطرق اليه التهمة، ومنهم من لا تنطرق، فكل من تعرض

التهم فلا يلوم من أساء به الظن والصيانة، ترفع ذالك عن الصائن فان ظن به

احد ذالك اثم“۔ عارضہ

المستعرض عرض کرتا ہے کہ اس آخری اور تیسرے مطلب سے بہت سے اشکالات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور روایات میں کوئی تعارض بھی نہیں رہتا۔ تدریر

قولہ ”فان الظن اكذب الحديث“ یعنی پاک لوگوں کے بارے میں بدگمانی غلیظ قسم کا شیطانی وسوسہ ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ظن السوء جھوٹ بولنے کا سبب بنتا ہے۔ کیا ایسی بدگمانیاں کرنے اور پھیلانے کی یہ بُرائی اور قباحت، خرابی کے لئے کافی نہیں جو آج کل اہل تہجد نے اسلاف کے بارے میں اپنا شیوہ اور مشغلہ بنایا ہے سالہا سالوں سے کئی گروپ منظم سازش کے تحت فقہاء و محدثین جیسے نیک سیرت لوگوں کے بارے میں یہ تاثر دے رہے ہیں اور تحریک چلا رہے ہیں کہ ان فقہاء و محدثین نے قلاں جگہ غلط بیانی کی ہے اور قلاں جگہ غلط استنباط کیا ہے اور مقصد ان پر سے اعتماد اٹھانا اور انکار حدیث و انکار فقہ کی راہ ہموار کرنا ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کیا اس سے بڑی غلیظ بات ہو سکتی ہے؟

باب ماجاء في المزاح

”عن انس قال إن كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليخالفنا حتى إن كان ليقول لآخ

لبي صغير: يا أبا عُمير ما فعل النغير؟“ (هذا حديث حسن صحيح^۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے

میل جول فرماتے حتیٰ کہ بلاشبہ میرے چھوٹے بھائی سے کہتے، اے ابوعمیر تغیر کا کیا ہوتا؟۔

لغات:۔ قولہ "المیزاج" بکسر الحیم اور ضمہ بھی صحیح ہے خوش طبعی کی گفتگو کو کہتے ہیں۔ قولہ "ان کان وحتىٰ ان کان" دونوں جگہوں میں "ان" مخفف من المثلہ ہے، اس کا اسم ضمیر شان ہے یعنی "انہ"۔ قولہ "لیعالطنہ" مطلق غزلت و تنہائی کی ضد ہے کھل مل کر رہنے کو کہتے ہیں جو کنایہ ہے عدم تکلف اور عدم تکبر سے۔ قولہ "تغیر" بصیغہ تغیر یعنی ضمیم الاول و فتح الثانی سرخ چوچ والا چھوٹا سا پرندہ ہے جس کو اہل مدینہ بکمل کہتے تھے۔

تشریح:۔ دنیا داروں اور بالخصوص ملوک و سلاطین کے اخلاق کچھ اس طرح ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اہل جنت اور اہل نفع سے ممتاز و بہتر سمجھتے ہیں وہ ہر وقت اپنے رعب جمانے کی کوشش میں ہوتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی برتری ظاہر کرتے رہتے ہیں جس کے کئی طریقے ہیں: وہ نہ تو اپنے سے کمتر لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں۔ وہ عام لوگوں سے مل کر رہنے کو عیب سمجھتے ہیں کہ عام لوگ ان کی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ایک ہی مجلس میں بیٹھنا، کھانا کھانا، باتیں کرنا اور چھوٹے بچوں کے ساتھ سرگرمیوں اور لڑائیوں میں کھڑے ہو کر خوش مزاجی کی باتیں معیوب سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بغیر ان کا رعب قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے ملوک فارس جب بیٹھتے تو دربار والے ان کے گرد کھڑے رہتے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جن کمالات اور اخلاق سے نوازا تھا ان میں ان تکلفات کی نہ گنجائش تھی اور نہ ہی ان کو ضرورت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب بعد ایک ماہ کی مسافت کے دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل اور عروج پر پہنچانا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے بادشاہوں سے بالکل منفرد و ممتاز عالی شان بادشاہ تھے۔ اس حدیث میں ان کے کریمانہ اخلاق کی ایک جھلک بیان ہوئی ہے چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ مطلق فرماتے، اس مطلق اور بے تکلفی کا عالم یہ تھا کہ میرے چھوٹے بھائی سے یہ کہہ کر مزاح فرماتے کہ تیری بلبل کہاں ہے؟ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ چھوٹا بھائی ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا صاحب زادہ ہے لہذا یہ ان کا ماں شریک بھائی ہے یعنی دونوں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہیں۔ ابوعمیر کے نام میں دو قول ہیں: ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھی میں "حفص" ذکر کیا ہے جبکہ امام حاکم رحمہ اللہ

نے ”عبداللہ“ نام کو ترجیح دی ہے۔ ان کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ہوئی تھی۔

بعض نے اس حدیث کے حوالے سے محدثین عظام پر ایک اعتراض کیا ہے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں میں فضول قسم کی بے فائدہ احادیث بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ابن القاضی الشافعیؒ نے فرمایا کہ ان کو پتہ نہیں حالانکہ اس حدیث میں ساتھ فوائد ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کچھ اور مزید فوائد کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث ”باب ماجاء فی الصلوٰۃ علی البیض“ میں بھی گزری ہے وہاں بھی ہم نے چار فوائد کا ذکر کیا تھا کہ اس سے معلوم ہوا کہ حرم مدنی کا حکم حرم مکی سے مختلف ہے کہ مدینہ میں شکار کھیلنا جائز ہے۔ بچہ اگر پرندے سے کھیلے اور اسے تکلیف نہ دیتا ہو تو یہ بھی جائز ہے، اور یہ کہ بے اولاد شخص کو کنیت سے پکارنا جائز ہے اور یہ کہ بچوں کے ساتھ ایسی بے تکلفی جس میں خلاف واقع بات کا ارتکاب نہ ہوتا ہو جائز ہے۔

لیکن یہاں یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محالی اخلاق کی مناسبت سے ذکر کی گئی ہے، اس کے علاوہ بھی امام ترمذیؒ نے اس باب میں تین ایسی احادیث ذکر فرمائی ہیں جو اس بات پر ناظر ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے خوش طبعی اور بے تکلفی کی باتیں فرماتے، جس کا مقصد ان کو خوش کرنا، اپنے رعب کو کم کرنا تھا تا کہ اگر وہ کوئی مسئلہ پوچھنا چاہیں تو غیر معمولی رعب رکاوٹ نہ بنے اور ان کو باہم رہن بہن کے اطوار و طریقے بتلاتا تھا کہ وہ آپس میں بھی ہشاش بشاش رہیں، گھٹن کا ماحول پیدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ، تاہم اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی شریعت کے اوئی آداب کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور نہ ہی یہ مزاح دین کے بارے میں یا کثرت سے ہوتا کیونکہ یہ دونوں سخت ممنوع ہیں چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: ”اِنَّ اللّٰهَ بِاَمْرِكُمْ اَنْ تَذْبَحُوا بَقْرَةً قَالُوا اَلَمْ نَسْخَرْكَ مِنْ اَعْدَاؤِکَ بِاللّٰهِ اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِیْنَ“ کے معنی میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ دین کے معاملے میں مذاق کروں۔ تفسیر مدارک میں ہے کہ ایسے موقع پر مذاق جہالت میں سے ہے ”لان الهزء فی مثل هذا من باب الجہل والسفہ“۔ اسی طرح کثرت مذاق بھی ممنوع ہے کہ آدمی لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے ہر وقت مذاق کرتا رہے اور خود کو سخرہ بنائے کیونکہ اس کی ممانعت صحیح نصوص سے ثابت ہے اور یہ کہ اس سے کثرت محک اور قساوت قلب بلکہ غفلت عن الآخرة لازم آتی ہے جس کی قباحت و ہلاکت بدیہی ہے، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں:

”ولكن لا ينبغي ان يكون الرجل مزاحاً ولا لعلابة، ولا يستعمل ذلك في احكام

الدين فانه جهل“۔ (عارضہ)

ایسی ہی بات امام نوویؒ نے بھی لکھی ہے لہذا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اس صورت میں ہرگز نہ تھا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں کوئی خلاف واقعہ بات بھی نہیں ہوتی جیسا کہ باب کی اگلی روایت میں اس کی تصریح ہے، نیز کسی کے اوپر طنز یا کسی کی تحقیر یا لوگوں کی تضحیک اور خود زور سے ہنسے کے مزاح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح میں دوسروں کی حوصلہ افزائی قدر و عزت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبسم و مسکراہٹ فرماتے۔

الحمد للہ راقم نے ”نقش قدم“ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور خوش طبعی کے کچھ واقعات ذکر کئے ہیں۔ (دیکھئے نقش قدم فصل ۳ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ“ باب اول) گیارہ صفحوں سے زائد اس مضمون کا آخری حصہ آپ بھی پڑھ لیں، ایک دفعہ ایک عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میرا شوہر بیمار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے پاس) تشریف لانے کی درخواست کرتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تیرا خادم وہی ہے جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے؟ وہ (خاموشی سے) واپس آئی اور اپنے خادم کی آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی، اس نے پوچھا تو کیا کر رہی ہے؟ کہنے لگی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیری آنکھوں میں سفیدی ہے اس نے (ہنس کر) کہا کہ کون سا انسان ہے جس کی آنکھوں میں سفیدی نہیں ہے؟

اسی طرح ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (میرے لئے) اللہ سے دعا فرمائے کہ وہ مجھے جنت میں داخل فرمائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے فلاں کی ماں کوئی بوڑھی جنت میں داخل نہیں ہوگی وہ عورت روتی ہوئی واپس چلی آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے پاس بیٹھنے والوں سے) فرمایا کہ اس کو جا کے بتادو کہ جب یہ جنت میں داخل ہوگی تو بوڑھی نہیں ہوگی (بلکہ بالکل نوجوان ہوگی) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی ”اِنَّ الْاِنْسَانَ اَنْفَسًا“ فجعلنا من ابكارنا ثم بآثرنا“۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی بلند اخلاق اور محاسن افعال کا مجموعہ بنا کر مبعوث فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے پاک ہو کر پیدا ہوئے گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم جیسا چاہے ایسا ہی پیدا ہوئے۔

خُلِفْتُ مُبْرَأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ

كَانَكَ قَدْ خُلِفْتَ كَمَا تَشَاءُ

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھار لوگوں سے مزاح بھی فرما لیتے مگر کبھی بھی سچ کے علاوہ کوئی لفظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا نہیں ہوا۔

دوسری حدیث:- ”عن ابی ہریرۃ قال قالوا یا رسول اللہ انک تداعبنا قال: انی لا أقول الا

حقاً۔ (ومعنی قوله انک تداعبنا انما یعنون انک تمارحنا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں صحیح بات کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہتا ہوں۔

لغات:- ذَعَبَہ، ذَعَبًا وَذَعَابًا دونوں مصدر ہیں تاہم ذَعَبَہ میں دال کا فتح وضمہ دونوں جائز ہیں خوش طبعی کرنے اور کسی مذاق کو کہتے ہیں۔ بقولہ ”تداعبنا“ مداعبہ سے ہے مطلب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے مذاق میں حصہ لیتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وجہ تعجب وہی رسم تھی جس کا تذکرہ شروع باب میں کیا جا چکا ہے کہ عموماً بڑے لوگ اور خصوصاً سلاطین ایسا نہیں کرتے کہ ہر شخص سے بے تکلفی کریں، جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ میرا مذاق کرنا حد اعتدال کے اندر رہتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق تمسخر اور لوگوں کو ہنسنے پر آمادہ کرنا نہیں ہوتا تھا جس کے لئے جھوٹ بولنا یا طنز کرنا پڑتا ہے بلکہ صحابہ کرامؓ کے ذہن سے اپنے غیر معمولی رعب کو کم کرنا وغیرہ محمود مقاصد ہوا کرتے تھے اور یہ کام صحیح باتوں سے بآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے جیسا کہ مثالوں سے واضح ہے اس لئے بعض شارحین نے ”الاحاطہ“ بمعنی مفید اکیا ہے یعنی میرا مزاح آپ کے فائدے کے لئے ہے۔

تیسری حدیث:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (انس) سے فرمایا ”اے دوکانوں والے“ اس کا مقصد بھی راوی کے مطابق مزاح کرنا تھا، گو کہ بعض شارحین نے

اس کو تنبیہ علی الاستماع پر بھی حمل کیا ہے کہ جب کان دو ہیں تو بات کو اچھی طرح سنا اور سمجھ لینا چاہئے مگر ترمذی نے اپنے شیخ سے جو مطلب نقل کیا ہے وہ زیادہ ظاہر ہے۔

اس حدیث میں بھی مزاح کے رنگ میں ایک ہچی اور درست بات کی گئی ہے۔

چوتھی حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا تو اس شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں اونٹنی کے بچے سے کیا کروں گا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونٹ کو تو اونٹنی ہی جلتی ہے۔

لغات: بقولہ ”استحمل“ باب استعمال طلب کے لئے ہے یعنی سواری طلب کر لی خواہ بطور ہدیہ و صدقہ کے ہو یا عاریہ ہو۔ بقولہ ”وہل للذلال الالانوی“ اس میں ”نوق“ فاعل اور ”الابل“ مفعول بہ ہے۔ نوق بضم النون ناقۃ کی جمع ہے اونٹنی کو کہتے ہیں جبکہ ”الابل“ میں الف لام جنس کے لئے ہے یعنی جنس اونٹ خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کو اونٹنی جلتی ہے۔ چونکہ سائل نے ولد الناقۃ سے متبادر معنی لئے اس لئے تعجب کا اظہار کیا کہ بچہ تو سواری کے قابل نہیں ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ اس کلام میں غور کرتے تو مطلب سمجھ میں آ جاتا، دیکھئے یہاں مزاح بھی ہوا اور سائل کے سوال کو قبول کرنے اور اونٹ دینے کی بات بھی ہوئی۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مراتب متفاوت تھے بعض کلام کے رموز کو بہت جلد سمجھ جاتے جبکہ بعض حضرات کو اس میں تاثر اور زیادہ تدریج کی ضرورت پیش آتی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مذاق سب کے ساتھ یکساں نہیں ہوتا بلکہ مخاطب کے فہم کے مطابق ہونا چاہئے، ذکی کے ساتھ بلیغانہ انداز میں اور دوسرے درجوں والوں کے ساتھ حسب صلاحیت۔ واللہ اعلم

باب ماجاء فی المراء

”عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من ترک الکذب وهو باطل بُنیٰ له فی رِیض الجنة ومن ترک المراء وهو مُحِقُّ بُنیٰ له فی وسطها، ومن حَسَنَ خُلُقَهُ بُنیٰ له فی اعلاها“۔ (حسن) ^۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جھوٹ کو چھوڑا اور اس حالیکہ وہ غلط ہو تو اس کے لئے جنت کے نشیبی حصے میں گھر بنایا جائے گا اور جس نے جھگڑا کرنے کو چھوڑا حالانکہ وہ حق بجانب ہو تو اس کے لئے جنت کے درمیانی حصے میں گھر بنادیا جاتا ہے اور جس شخص نے اپنے اخلاق کو عمدہ بنایا تو اس کے لئے جنت کے بلند مقام پر گھر بنایا جائے گا۔

لغات :- ”مراء“ بکسر المیم جنگ و جدال اور بحث و تکرار کو کہتے ہیں۔ قولہ ”وہو باطل“ یہ جملہ معترضہ ہے جو شرط اور جزاء کے درمیان آیا ہے جو یا تو تاکید کے لئے ہے یا پھر اس کذب سے احتراز کے لئے ہے، جس کی گنجائش بصورت شدید ضرورت یا بطور تعریض و توریہ کے ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے اور یہ احترازی کی صحت اس پر مبنی ہے کہ یہ جملہ حال ہے اور حال قید ہوتا ہے پھر حال ہونے میں دو احتمال ہیں یا مفعول یعنی ”کذب“ سے حال ہے اسی کو ترجمہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یا پھر قائل سے حال ہے یعنی وہ شخص جو جھوٹ سے اجتناب کرتا ہے باطل اور غلطی پر ہو تو جب ایسے شخص کو جھوٹ چھوڑنے پر اتنا ثواب ملتا ہے تو جو حق پر ہو اور جھوٹ سے اجتناب کرے اس کے لئے تو بطریق اولیٰ بڑا مرتبہ ہوگا۔ قولہ ”بنیٰ له“ بصیغہ مجہول ہے۔ قولہ ”فی رِیض الجنة“ رِیض بفتح الہاء گھر کے آس پاس کی جگہ اور ماحول کو کہتے ہیں، مگر ہم نے ترجمہ میں نشیب کا ترجمہ اس لئے کیا ہے کہ ایک تو اس حدیث میں تشبیہ دی گئی ہے، دوم رِیض کا تقابل وسط اور اعلیٰ سے کیا گیا ہے جس سے یہی مطلب نکلتا ہے، نیز جنت سے خارج اور باہر کا ترجمہ مناسب بھی نہیں ہے کما هو الظاہر۔ لہذا حاشیہ میں جو خارجاً سمجھا کہا گیا ہے اس سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے، پس یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے ایک ٹیلا نما جگہ پر قلعہ ہوتا ہے اور اس کے دامن میں کچھ چوکیاں اور مکانات ہوتے ہیں چونکہ ایسی جگہ میں سب سے زیادہ خوب

صورتی اور اہمیت کا حامل گھرونی ہوتا ہے جو سب سے اوپر چوٹی پر بنا ہوا ہو پھر وہ جو دامن کوہ اور قلعہ کوہ کے درمیان میں ہوتا ہے اور سب سے ادنیٰ وہ ہوتا ہے جو نیچے دامن یا نقیب میں واقع ہو ایسا ہی حال جنت کے مکانات اور مقامات کا ہے۔

تشریح:- اس حدیث شریف میں حسب تفاوت حسنات متفاوت مقامات میں گھروں کا وعدہ کیا گیا ہے بایں طور کہ پہلی نیکی کا درجہ نسبتاً کم ہے کہ یہ آسان ہے تو اس پر ادنیٰ گھر کا وعدہ کیا گیا جبکہ تیسرے نمبر کی نیکی بڑی مشکل اور عظیم ہے اس لئے اس کی جزاء بلند فضاء اور پُر کشش بناء مقرر کی گئی اور دوم درمیانہ ہونے کی وجہ سے درمیانہ درجے کے گھر کی بنیاد بنادی گئی۔

اس حدیث کے پہلے جملے میں جھوٹ چھوڑنے سے مراد جنگ و لڑائی کے وقت ترک ہے کیونکہ ایسے میں جبکہ جھوٹ بولنا مفید اور حجت میں کامیابی کا ذریعہ ممکنہ طور پر بن سکتا ہے مگر صرف گناہ سے بچنے کی غرض سے چھوڑنا نفس کو قابو میں رکھنے کی واضح دلیل اور بہترین موقع ہے اس لئے اس کے عوض جنت میں گھر دیا جاتا ہے تاہم نفس لڑائی کی نحوست سے نہ بچنے کی وجہ سے وہ گھر زیادہ اعلیٰ مقام پر نہ ہوگا۔ جبکہ دوسرے جملہ میں جس نیکی کا ذکر ہے یہ پہلی سے اعلیٰ ہے کہ اس میں نفس جھگڑے سے اجتناب کیا گیا اور وہ بھی حق بجانب ہوتے ہوئے تو بہتھمائے حدیث ”من تواضع لله رفعه الله“ لے اس کا گھر نشی مقام سے بلندی پر چلا گیا اگرچہ سب سے اعلیٰ گھر اس کا ہوگا جس کے تمام اخلاق تواضع سمیت اعلیٰ ہوں۔

دوسری حدیث:- ”عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كفى بك ايماناً لا تزال مخاضماً“۔ (حدیث غریب) قال المناوی اسنادہ ضعیف۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تیرے گناہ گار ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ تو ہمیشہ جھگڑا کر رہے۔

تشریح:- اس حدیث کا مطلب بالکل واضح ہے (گو کہ حدیث ضعیف ہے) کیونکہ جھگڑا ایک منحوس عمل ہے اس کا آدمی کے دین پر انتہائی بُرا اثر پڑتا ہے، اس سے اخلاق بھی تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ جھگڑا کرتا ہی

۱۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ ص: ۳۳۳ ”باب المصعب والكبر“ ایضاً رواہ احمد ص: ۷۹ ج: ۳ حدیث: ۸۷۸۲ ولفظہ: و ما تواضع احد لله الا رفعه الله عز وجل، ایضاً ص: ۳۹۱ ج: ۳ ولفظہ: من تواضع لله درجة رفعه الله درجة، ایضاً رواہ ابن ماجہ وابن حبان بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۵۱ ج: ۳۔

بد اخلاق کی دلیل ہے پھر جو آدمی بار بار لڑتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باطن درندگی کی صفات سے لبریز ہے تو جس طرح اچھے اخلاق کا مالک مسلسل روزہ رکھنے اور نمازیں پڑھنے والوں کا بھنا ثواب کماتا رہتا ہے ٹھیک اس کے برعکس جھگڑا لڑا آدمی مسلسل گناہوں کا بار بڑھاتا رہتا ہے۔

تیسری حدیث:- "لاتمار احالك ولا تمازحه ولا تعده موعداً فتخلفه" (حدیث غریب)
اپنے بھائی سے جدال و تکرار مت کرو اور نہ اس سے نازیبا مذاق کرو اور نہ ہی ایسا وعدہ کرو جس کی تم خلاف ورزی کرو۔

لغات:- قولہ "لاتمار" مراد سے ہے اور "لاتمازحه" مزاح سے ہے دونوں کے معنی گزرے ہیں۔ قولہ "ولا تعده" وعدہ یعنی وعدہ کرنے کے اور موعداً مصدر مسمیٰ بمعنی وعدہ اُکے ہے۔ قولہ "فتخلفه" اخلاف سے ہے الخلف وعدہ و بوعده، وعدہ خلافی کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں تین باتوں سے منع کیا گیا ہے۔
(۱) مراد جس کا حکم گزر گیا تاہم مراد یعنی بحث و تکرار اگر قرآن میں کسی شک و شبہ ڈالنے کی غرض سے ہو تو یہ کفر ہے اور اگر ازالہ شک کے لئے ہو تو یہ جائز ہے۔

(۲) مزاح کی ایک صورت وہ ہے جو سابقہ باب میں گزر چکی وہ ہرگز مذموم نہیں۔ دوسری صورت وہ ہے جس میں وہ شرانگہ نہ ہوں جو سابقہ باب میں بیان ہوئی ہیں بلکہ کسی کی تحقیر اور طنز کے طور پر ہو تو یہ ناجائز ہے اور یہاں یہی قسم مراد ہے اور امام ترمذی کا مقصد بھی یہی ہے کہ مزاح کی دونوں صورتوں کو ناجائز فرمائے چنانچہ سابقہ باب میں جائز حالت بتلا دی اور اس باب میں ناجائز کو ذکر کیا۔

(۳) وعدہ خلافی: اس بارے میں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے جیسا کہ بحثی نے طبعی سے نقل کیا ہے کہ جس چیز کا وعدہ کیا جائے لہذا وہ خلاف شرع نہ ہو تو اسے پورا کرنا پڑے گا مگر اس کی حیثیت میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک ایفا مستحب ہے اور بعض کے نزدیک جن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی ہیں واجب ہے بعض نے تفصیل بیان کی ہے، لہذا پہلے فریق کے نزدیک وعدہ خلافی مکروہ ہے جبکہ فریق ثانی کے نزدیک موجب گناہ ہے یہ اس وقت ہے جب وعدہ کرتے وقت ارادہ پورا کرنے کا ہو لیکن اگر شروع ہی سے خلاف ورزی کی نیت ہو تو یہ منافقت کی شاخ ہے:

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: آیۃ المنافق ثلاث: إذا حدث کذب وإذا وعد

اخلف واذاؤتمن خان۔^۱

البتہ شروع سے ارادہ ایفاء کا تھا مگر پھر کچھ عذر پیش آیا تو ایفاء لازمی نہیں، اس لئے وعدہ کرتے وقت ان شاء اللہ کہنا چاہئے تاکہ دوسرا فریق مکمل اعتماد کر کے نہ بیٹھے۔

یہ تو نفس مسئلہ ہوا مگر یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اخلاقی طور سے ایفاءئے عہد حتی الامکان لازمی ہے خاص کر جب وعدہ خلافی سے دوسرے کو نقصان ہوتا ہو بلکہ بسا اوقات وہ نقصان ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدرسہ کسی مدرس کے ساتھ رابطہ کر کے اس کو ترغیب دے کر اپنے مدرسہ میں استاذ مقرر کرنے کا وعدہ کر کے اسے لالچ بھی دلاتا ہے چنانچہ وہ بے چارہ اپنے مدرسہ سے استعفاء دیتا ہے اور جب یہاں آتا ہے تو ہمتہم صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری کچھ مجبوریاں ہیں آپ ناراض نہ ہوں، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک صاحب نے سرکاری نوکری سے استعفاء دے دیا اور پھر مدرسہ سے بھی نہیں رکھا، یہ بد اخلاقی کی بدترین مثال ہو سکتی ہے عام علماء یہ سمجھتے ہیں کہ عذر پیش آنے سے وعدہ خلافی جائز ہو جاتی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ عذر کس درجے کا ہو تو میخ ہے اور یہ کہ دوسرے کا جو غیر معمولی نقصان اور علمی قتل ہوا اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟

ایسے لوگوں سے ہماری درخواست ہے کہ ایسے معاملات میں وعدہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے نہ کہ بعد میں، اگر کسی مدرس کے بارے میں تحقیق کرنی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تسلی کر کے پھر اس سے رابطہ کر لیا جائے یہ طریقہ غلط ہے کہ پہلے وعدہ کر لیا اس سے استعفاء دلویا اور اب تحقیقات کرنے لگ گئے۔ آخر اخلاقی فرائض بھی تو اسلام کا حصہ ہیں مدرسہ چلتا تا زیادہ سے زیادہ ایک مستحب امر ہے اگر اس میں ایسے قہارِج اور اخلاقی خامیاں سراپت کر لیں تو انتخاب کہاں رہے گا؟ یہ تو کاروبار بن جائے گا۔

ٹھیک ہے کاروبار بھی ایک مباح امر ہے مگر صدقات و خیرات اور دین کے نام پر نہیں بلکہ اپنے بازوؤں کی طاقت پر، یہ نہیں ہونا چاہئے کہ دین کے نام پر پیسے جمع کریں اور دین کے تقاضوں کو پامال کیا جائے اس سلسلہ میں اخلاق نبوی کی ایک جھلک آپ بھی پڑھ لیں: قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ”الشفاء بتعریف حقوق المصطفى صلى الله عليه وسلم“ میں ابوالحسناء سے نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

مع رواہ البخاری ص: ۱۰ ج: ۱ ”باب علامة المنافق“ کتاب الایمان، ایضاً رواہ فی الاستفراض باب: ۱۰ ومظالم باب: ۱۷ وفی الوصایا باب: ۸، وفی الجزیة باب: ۷ وفی الشهادات باب: ۲۸ وفی الادب باب: ۲۹ وصحیح مسلم ص: ۵۶ ج: ۱ ”باب خصائص المنافق“ کتاب الایمان، ایضاً رواہ ابو داؤد فی کتاب الصلاة باب: ۱۳۹ والنسائی کتاب الایمان باب: ۲۰ ایضاً مسند احمد ص: ۴۰ ج: ۳ حدیث: ۸۴۷۰ و ص: ۳۵۵ ج: ۲ حدیث: ۱۰۵۴۲۔

وعدہ کیا کہ میں آپ کا بقیہ حق لے کر اسی جگہ آتا ہوں پھر میں بھول گیا پھر تین دن کے بعد مجھے یاد آیا تو جب وہاں آیا تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں پر تھے یہ قبل البیث کا واقعہ ہے:

”عن ابی الحسساء قال بايعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیع قبل ان یبعث وبقیت له بقیة فوعدته ان آتیة بهانی مکانه فنیبت ثم ذکرث بعد ثلاث فجئت فاذا هو فی مکانه فقال یافتی لقد شققت علی انا ههنا منذ ثلاث انتظرک۔“

(مس: ۳۰۷ حصہ اول فصل واما خلقہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت ”واذکرن فی الکلب اسلعل انہ کان صادق الوعد“ (سورہ مریم: آیت: ۵۴) کے تحت امام طبرہ کی روایت نقل کی ہے:

”ان اسماعیل النبی علیہ السلام وعد رجلاً مکاناً ان یأتیہ فیہ فجاء ونسی الرجل فظلم بہ اسماعیل ویاث حتی جاء الرجل من الغد فقال: ما برحت من ههنا؟ قال ”لا“ قال انی نسیت قال: لم اکن لا یرح حتی تأتینی فلذلك (کان صادق الوعد) وقال سفیان الثوری بلغنی انه قام فی ذالک المکان ینظرہ حولاً حتی جاءہ وقال ابن الشوزب بلغنی انه اتخذ ذالک الموضع مسکناً وقد رواہ ابو داؤد فی سننہ الخ۔“

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ”ان اللہ لا یخلف المیعاد“ (ال عمران: آیت ۹) اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اخلاق ربانی اور اخلاق نبوی سے متخلق ہونے کی قدر و توقیر عطا فرمائے۔ آمین

باب ماجاء فی المداراة

”عن عائشة قالت استأذن رجل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا عنده فقال یس ابن العشیرة او اخو العشیرة ثم اذن له فالآذ له القول فلما خرج قلت له یا رسول اللہ اقلت له ما قلت ثم آلت له القول؟ قال یا عائشة ان من شر الناس من ترکہ الناس او ودعہ الناس إتقاء فحشہ۔“ (حسن صحیح)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر

آنے کی اجازت چاہی جبکہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص اپنے خاندان کا بُرا آدمی ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دیدی (چنانچہ جب وہ آیا) تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نرم گفتگو فرمائی، جب وہ نکلا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے تو اس کے بارے میں وہ بات کی تھی جو آپ کر چکے ہیں اور پھر بھی آپ نے اس سے نرم انداز میں بات فرمائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ بے شک لوگوں میں بدترین شخص وہ ہے جس کو لوگ بدگوئی سے بچنے کی خاطر چھوڑ دے۔

لغات:- ”مدارات“ بذل الدنیا للدين یعنی دینی غرض کے پیش نظر لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات اور رہن کن میں نرمی کرنا اور بول چال میں ملائمت اختیار کرنا۔ قولہ ”بئس ابن العشیرۃ او احو العشیرۃ“ بئس افعال ذم میں سے ہے اور لفظ ”او“ شک من الراوی کے لئے ہے، ترویج کے لئے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ بخاری شریف کی ایک روایت میں لفظ ”او“ کے بغیر آیا ہے۔ ابن اور اخ کی نسبت جب عشیرہ بمعنی قبیلہ کی طرف ہو جائے تو مراد فرد من القبیلہ ہوتا ہے جیسے فلان ابن العسین یعنی فلان آدمی ساٹھ سال کا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص اس قبیلہ کا بُرا آدمی ہے۔ قولہ ”فالآن له القول“ لیکن سے ہے بمعنی نرم و ملائم کے۔

تشریح:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آدمی کی بابت یہ ارشاد فرمایا اس کا نام ”عشیرہ بن حصین“ تھا جو بظاہر تو ایمان لایا تھا مگر اس میں مخلص نہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلیت پر تنبیہ کی غرض سے فرمایا کہ یہ اس خاندان کا بُرا آدمی ہے یعنی منافق ہے تاکہ اس کے ظاہری اسلام سے کسی کو دھوکہ نہ ہو اور کسی آدمی کے متعلق اس قسم کا انتباہ جائز بلکہ بعض دفعہ لازم ہو جاتا ہے، چنانچہ فقہاء نے اس پر کئی تفریعات کی ہیں مثلاً ایک آدمی کسی سے رشتہ کرنا چاہتا ہے اور آپ سے مشورہ لے لے تو اس میں اگر ایسی خامی ہو جو دین یا دنیا کے اعتبار سے مضر ہو تو آپ کو بتلادینا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب وہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندہ پیشانی اور خندہ روئی سے کلام فرمایا جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکمت پوچھنی پڑی، جس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”ان من شر الناس الخ“ یعنی میں نہیں چاہتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں شمار ہو جاؤں جن کو لوگ ان کی سخت مزاحی اور سخت کلامی کی وجہ سے چھوڑ لیتے ہیں، تو چونکہ ان دنوں ارشادات اور رویوں کے مقتضیات الگ الگ ہیں اس لئے یہاں یہ اعتراض وارد نہ ہوا کہ اس طرح تو گویا ایک گونہ تضاد سا پیدا ہوا، جواب واضح ہے کہ دونوں صورتیں بطور تشریح کے ہیں۔ تدر

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں:

”ولم یکن ذالک من قسم النفاق وحاشاء، ثم حاشاء، ثم حاشاء، ولکن امرہ اللہ تعالیٰ ان یُسَنِّ لَامتہ سنۃ فی التعریف بحال الفاسق لِمَن جہلہ، وَاَلان القول مخافة شرہ من غیر ان یکون فی القول معہ کذب ولا میراء۔“

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ہر صورت میں خوش خلقی سے ملنا چاہئے تاہم اس میں مبالغہ نہیں ہونی چاہئے، مبالغہ، مدارا کے مقابل کا نام ہے یعنی ایسا قول یا عمل جائز نہیں جس سے دین کی توجین یا مسلمان کی اہانت ہو جاتی ہو، اسی نکتے کے پیش نظر تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اپنے سے کم حیثیت والے کافر سے مدد لینا جائز ہے جیسے غلام سے اور کتابیہ کے ساتھ نکاح کر کے۔ جبکہ بڑی حیثیت والے سے مدد نہیں طلب کرنی چاہئے کہ اول میں ذلت نہیں جبکہ دوم میں تذلل ہے۔

کفار سے تعلقات کی نوعیت :- کافروں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات جائز اور کون سے ناجائز ہیں؟ تو باب کی حدیث سے مدارات کا جواز معلوم ہوتا ہے، قرآن کریم کی آیتوں سے اگرچہ بعض تعلقات جیسے دوستی اور راز کی باتیں بتانے کی ممانعت آئی ہے تاہم ان سے ہر قسم کے تعلقات پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے چنانچہ سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

”لَا يَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً۔“ (آل عمران آیت: ۲۸)
اور سورۃ نساء آیت: ۹۰ میں ہے:

”إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ أَوْ جَاءَ وَكُمْ حَصْرَتٌ مِنْهُمْ
أَوْ يَفَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوكُمْ... إلخ... فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا۔“
جبکہ سورۃ مائدہ آیت: ۵ میں ہے:

”الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُتُوا الْكِتَابَ حَلَالٌ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حَلَالٌ لَهُمْ، وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ... إلخ۔“

وغیر ذالک من الآیات والا حادیث، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو سارے کفار سے ہر قسم کے تعلقات

جائز ہیں، اور نہ ہی سب ناجائز ہیں۔ اس لئے علماء نے مجموعی اعتبار سے لیکن دین کے علاوہ تین اقسام کا ذکر کیا ہے: (۱) مولات یعنی دوستانہ تعلقات (۲) مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی (۳) مواسات یعنی احسان اور نفع رسانی۔

اد پر ال عمران کی جو آیت ذکر کی گئی اس میں پہلی دونوں قسموں کا حکم معلوم ہوا کہ دوستانہ تعلقات ناجائز ہیں اور مدارات جائز ہیں یعنی ان کے ضرر سے بچنے کی غرض سے یا ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی غرض سے ظاہری خوش خلقی میں کوئی حرج نہیں، چنانچہ تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

”وفی الآیۃ دلیل علی مشروعیۃ التقیۃ وَغَرُّ فَوْهَا بِمَحَافِظَةِ النَّفْسِ أَوْ الْجِرْضِ أَوْ الْحَالِ مِنْ شَرِّ الْأَعْدَاءِ... وَعَدُّ قَوْمٍ مِنْ بَابِ التَّقِیۃِ مَدَارَاتِ الْكُفَّارِ وَالْفُسْقَةِ وَالظُّلْمَةِ وَالْأَنَیۃِ الْكَلَامِ لَهُمْ وَالتَّبَسُّمِ فِي وَجُوهِهِمْ وَالْإِنْسِاطِ مَعَهُمْ وَإِعْطَائِهِمْ لِسَكِّفٍ إِذَا هُمْ وَقَطَعَ لِسَانَهُمْ (یعنی خفی پروینگنڈے سے بچنے کے لئے) كَوْصِبَانَةِ الْجِرْضِ مِنْهُمْ وَلَا يَحْدُذَلِكَ مِنْ بَابِ الْمَوَالَةِ الْمَنْهَى عَنْهَا بَلْ هِيَ سَنَةٌ وَأَمْرٌ مَشْرُوعٌ“۔

پھر آگے مدارات کے ثبوت کے لئے متعدد احادیث کی تخریج فرمائی ہے تاہم یہ مدارات ال ذمہ کے ساتھ مخصوص ہے، البتہ ان کے لئے مجلس میں اٹھنا جائز ہے یا نہیں تو ابن حجر رحمہ اللہ نے جائز کہا ہے جبکہ علامہ آلوسی اس کو مولات میں شمار کر کے ناجائز قرار دیتے ہیں، اسی بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ عرف میں لوگ جس چیز کو تنظیم اور مولات سمجھتے ہیں وہ ناجائز ہے۔ (کذا فی تفسیر روح المعانی) خلاصہ یہ ہے کہ مدارات تین صورتوں میں جائز ہے (۱) ضرر سے بچنے کے لئے (۲) دینی اصلاح کی غرض سے (۳) اکرام ضیف کے طور پر۔

تیسری قسم مواسات ہے اس کا حکم یہ ہے کہ حربی کے ساتھ ناجائز ہے اور باقی کفار کے ساتھ جائز ہے۔
 قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ”لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُواكُمْ
 مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ“۔

(سورۃ محمد آیت: ۸)

رہا تجارتی معاملہ تو اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ ہر اس چیز کی تجارت جس سے مسلمانوں کو نقصان

ہو سکتا ہو تو وہ جائز نہیں، جیسے جنگ کے دنوں میں ان کو اسلحہ فروخت کرنا یا مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے خرید کر اسلحہ کرنے والے کو فروخت کرنا جائز نہیں۔ باقی معاملات اجارہ یعنی نوکری وغیرہ دنیوی معاملات میں کوئی حرج نہیں ان کو ملازم رکھنا بھی جائز ہے بشرطیکہ کوئی دوسری وجہ نہ ہو اور ان کی نوکری کرنا بھی جائز ہے گو اس سے بچنا چاہئے، خصوصاً ان کے گھروں میں نوکری کرنے سے مسلمان کی تذلیل ہوتی ہے جبکہ کہنی وغیرہ میں یہ علت نہیں۔

محبت صالح ترا صالح کند
محبت طالح ترا طالح کند

باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض

”عن ابی ہریرۃ اُراء رفعہ قال احب حبیبک ہوناماعسی ان یکون بغضک یومامنا،
وَابْغَضْ بِغِضْکَ هُونَامَاعَسَىٰ اَنْ یَّکُونَ حَبِیْبُکَ یَوْمَآمَنَّا“۔ (حدیث غریب والصحیح ہذا عن علیؑ
موقوف)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مرفوع روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے دوست سے محبت کرو سنجیدہ طریقے سے ممکن ہے کہ وہ ایک دن تجھ سے نفرت کرنے والا بن جائے اور نفرت کرو اپنے دشمن سے سنجیدہ طریقے سے ممکن ہے کہ ایک دن وہ تیرا دوست بن جائے۔

لغات:- ”الاقتصاد“ اس کے متعدد معانی ہیں، میانہ روی، اعتدال، کفایت اور بچت کو کہتے ہیں، یہاں اعتدال و میانہ روی مراد ہے۔ ”احب اور ابغض“ دونوں باب افعال سے امر کے صیغے ہیں لہذا ان کو ”اکرم“ کے وزن پر پڑھا جائے گا بمعنی محبت کرو اور بغض کرو۔ قولہ ”ہونا“ عارضہ میں ہے ”الھون السکینۃ والوقار“ دونوں جگہوں میں مراد میانہ روی ہے یعنی محبت ہو تو بھی افراط سے خالی ہونی چاہئے اور بغض بھی۔ حبیب اور بغض دونوں بمعنی مفعول یعنی محبوب و مبغوض کے ہیں جیسے قتل بمعنی مقتول کے۔

باب ماجاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض

۱۔ الحدیث المرحہ ابضا الطبرانی فی الکبیر والایوسط، مجمع الزوائد ص: ۱۱۰ ج: ۸.

تشریح :- ترجمۃ الباب اور حدیث میں محبت اور نفرت ہر دو حالتوں میں اعتدال و میانہ روی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی وجہ بھی آسان لفظوں میں بتلا دی گئی ہے کہ محبت میں اتنا غلو نہیں ہونا چاہئے کہ دوست کے بغیر رہنا مشکل ہو جائے، یا اسے اپنے سارے راز بتلا دئے جائیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اچانک تعلقات خراب ہو جائیں تو کل بچھتاوا ہوگا، اسی طرح دشمنی اور مخالفت میں بھی اس حد تک نہیں جانا چاہئے کہ اگر کل تعلقات خوشگوار ہو جائیں تو آنکھیں ملانا مشکل ہو، جس کا عام مشاہدہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں وہ کل بچھتاتے رہتے ہیں۔

باب ماجاء فی الکبر

”عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من عرطل من کبر ولا یدخل النار من کان فی قلبه مثقال حبة من ایمان“۔ (حسن صحیح) ۱

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں بوزن رائی کے دانے جتنا کبر ہو اور وہ شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں (رائی کے) دانے کے برابر ایمان ہو۔

لغات :- بقولہ ”بمثقال ثقل“ سے ماخوذ ہے مراد یہاں رائی کے دانے کے برابر وزن ہے جو ثقل سے کنایہ ہے بقولہ ”حبة“ دانہ بقولہ ”عرطل“ رائی جو ایک قسم کی سرسوں ہے بعض نے حبة السوداء یعنی کلوئی پر بھی اطلاق کیا ہے بقولہ ”من کبر“ بکسر الکاف و سکون الباء جبکہ باء کافہ بھی جائز ہے بڑھائی کے معنی میں آتا ہے اصطلاح میں دوسروں پر اپنی برتری و بڑھائی جاننے کو کہتے ہیں عارضۃ الاحادی میں ہے:

”بناء کبر للمکثرة والعظم، يقال کبر الرجل بکسر العین اذا تکاثرت سنوہ، و کبر بضم العین اذا تکاثرت خصاله والاسم من الاول الکبر بکسر الفاء وفتح العین، والکبر بکسر الفاء واسکان العین معظم الشئ وهو العظمة“ الخ۔

باب ماجاء فی الکبر

۱ الحدیث أخرجه مسلم ج: ۶۵ ج: ۱ ”باب تحريم الکبر وبيانہ“ کتاب الايمان۔

تشریح:۔ کبر امراض قلب اور رذائل اخلاق میں سب سے بڑی مہلک بیماری ہے کہ اس سے بہت سی بیماریاں حتیٰ کہ کفر و فحشاء جیسے مہلکات جنم لیتے ہیں۔ اس ساتھ فضائل اخلاق کا اجتماع نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کبر میں مبتلاء شخص کو یا تمام خوبیوں سے محروم رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کو سخت ناپسند کیا ہے یہاں تک کہ حدیث الباب کے مطابق اس کو جنت سے محرومی کا سبب قویٰ قرار دیا ہے کیونکہ مشکوٰۃ آدمی اللہ کے ساتھ اس کے وصف خاصہ ”تکبر“ میں منازعہ کرتا ہے حدیث شریف میں ہے ”قال اللہ الکبرياء ردائی والعظمة ازاری من نازعی واحدًا منہما فصمتہ“^۱ یعنی کبر یا میری چادر اور عظمت میرا ازار ہے جو بھی ان میں سے کسی ایک میں مجھ سے جھگڑتا ہے میں اسے نامراد لوٹا دوں گا۔ ابن العربی عارضہ میں فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے مطلب کے بارے میں علماء سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آدمی جو لباس زیب تن کرتا ہے تو اس کا استعمال یا بطور خرچ وابتذال کے ہوتا ہے اور یا بطور جمال کے ہوتا ہے، اول کی مثال جیسے جوتے اور دوم کی مثال جیسے چادر، چونکہ کبر یا اللہ کے لئے مخصوص ہیں اس لئے کسی بھی مخلوق کو اس کا دعویٰ جائز نہیں جو آدمی اس کو اپنانے کی کوشش کرے گا وہ نقصان ہی نقصان اٹھائے گا ہاں علم میں چونکہ فائدہ ہے اس لئے وہ حاصل کرنا ممنوع نہیں کہ تکبر ترقی سے مانع اور شانِ عہدیت کے منافی ہے جبکہ علم سے آدمی اپنا صحیح مقام پہچانتا ہے اس لئے ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔

کبر و تکبر اور اسباب:۔ جانتا چاہئے کہ کبر خلقِ باطنی کا نام ہے یعنی صفتِ قلب ہے اور جب اس کا اثر ظاہری اعضاء پر رونما ہونے لگے تو وہ تکبر کہلاتا ہے، کبر کے معنی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنے کے ہیں محض اپنے مقام جاننے کا نام کبر نہیں ہے مثلاً ایک آدمی یہ جانتا ہے کہ میں فلاں مدرسے کا شیخ الحدیث ہوں تو یہ کبر نہیں ہے مگر اس کے ساتھ اگر وہ دوسرے اساتذہ کو کمتر اور حقیر سمجھنے لگے تو بلاشبہ یہ کبر ہے اور جب وہ خود ان سے آگے چلنے اور امتیازی نشست پر بیٹھنے کو اپنا حق سمجھے تو یہ تکبر ہے۔ ہاں اگر اس کی جگہ متعین ہو یا اس لئے اعلیٰ سیٹ پر بیٹھتا ہے کہ دوسرے اساتذہ اس کو پھر وہاں بیٹھنے پر مجبور کریں گے تو یہ نہ کبر ہے اور نہ ہی تکبر۔

کبر و تکبر کا سبب عجب ہے، عجب کے معنی خود پسندی کے ہیں یعنی اپنی کسی خوبی پر نازاں ہونا اور اسے اللہ کی طرف سے محض نعمت کے بجائے اپنا کمال سمجھنا عجب کہلاتا ہے جس کے کئی اسباب ہیں کہ کبھی اپنے علم و عمل یا حسب و نسب اور کبھی جمال و کمال یا نوال و غیرہ کی وجہ سے آدمی متعجب بنتا ہے لہذا کہا جائے گا کہ کبر کا سبب

قریب عجب ہے جبکہ اسباب بعیدہ زیادہ ہیں۔

عجب اور کبر انتہائی موزی بیماریاں ہیں اس لئے ہر مؤمن کو ان کا علاج کرنا لازمی ہے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں طریقہ علاج اور عجب و تکبر کے موزی اثرات کو نقل نہیں کیا جاسکتا جس کو تفصیل اور اصلاح درکار ہو تو وہ راقم کی کتاب ”نقش قدم کامل“ فصل نمبر ۱۲، عجب خود پسندی اور فصل نمبر ۱۳ اکبر و تکبر ص ۱۲۳ تا ص ۱۳۷ یا اخلاقیات کی دوسری کتب جیسے احیاء العلوم للامام غزالی وغیرہ ضرور مطالعہ کریں۔ اور چونکہ آج کل یہ امراض بہت عام ہو گئے ہیں اس لئے راقم کا مشورہ ہے کہ ان کے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ خلاصہ بہترین علاج خود کو دوسروں کی خدمت میں لگانا اور عجب و تکبر کی بُرائی کو ملحوظ رکھنا ہے۔

حدیث باب کا مطلب:- بظاہر یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حدیث کے پہلے جزء سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر جنت میں نہیں جائے گا جبکہ آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن دوزخ میں نہیں جائے گا پس اگر کسی مؤمن میں تکبر ہو تو اس کا کیا ہوگا؟

اس کا ایک جواب تو پہلے بارہا گذرا ہے کہ یہ خاصیات المفردات ہیں یعنی تکبر کا اپنا تقاضا یہ ہے کہ وہ جنت میں داخلے سے مانع ہے اور ایمان کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوزخ میں داخلے سے مانع ہے۔ تاہم قیامت کے دن فیصلہ مفردات اعمال پر نہیں ہوگا بلکہ مرکب اور مجموعی اعمال پر ہوگا۔

دوسرا جواب:- یہ ہے کہ تکبر جنت میں دخول اولیٰ کا مستحق نہیں وہ سابقین کے ساتھ نہیں جائے گا تا وقتیکہ اسے دوزخ کی آگ سے پاک نہ کر دیا جائے اور مؤمن دوزخ میں غلو و تحقیر کے لئے داخل نہ ہوگا۔

تیسرا جواب:- یہ ہے کہ اس حدیث میں ضابطہ کی بات کی گئی ہے مگر جس پر اللہ کا فضل اور خصوصی رحم ہو وہ بلا عذاب پاک کر دیا جائے گا، اور صاف ستھرا بنا کر پاکیزہ جنت میں داخل کر دیا جائے گا جہاں اس کے ساتھ گناہ کی کسی قسم کی گندگی کا واسطہ نہیں رہے گا اس طرح وہ صاف ستھری جگہ کا اہل بنا دیا جائے گا۔ ”وماذا لك على الله بعزیز“ اے اس طرح وہ ”الطیبات للطیبین“ اے کا مصداق بن جائے گا۔

دوسری حدیث:- باب کی دوسری حدیث پر یہ اضافہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تو حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرے کپڑے اچھے ہوں اور میرے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں آتا ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ بھلائی

کو پسند فرماتا ہے مگر متکبر وہ ہے جس نے حق کو ٹھکرا دیا اور لوگوں کو حقیر سمجھا۔

لغات :- قولہ ”فردہ“ خاک کا ذرہ و ریزہ، ایٹم و جوہر فرد جو ناقابل تقسیم ہو، چھوٹی چیزیں، سورج کی شعاع میں نظر آنے والے ذرات۔

قولہ ”الحمال“ ایک روایت میں ہے ”ان الله جميل يحب الجمال“ جمال کا اطلاق ظاہری خوبصورتی پر بھی ہوتا ہے اور خوش خلقی یعنی باطنی حسن سیرت کو بھی کہتے ہیں، اس لئے اوپر ترجمہ بھلائی سے کیا گیا یعنی اللہ اچھے افعال اور کامل صفات سے خود بھی موصوف ہے اور دوسروں میں بھی اچھائی و خوبی کو پسند فرماتا ہے۔ قولہ ”لکن الکبر“ عبارت بخذف المضاف ہے ”ای لکن ذا الکبر“ اس لئے ترجمہ متکبر سے کیا گیا ہے۔ قولہ ”بطر الحق“ رد اور دفع یعنی بد مستی کی وجہ سے ٹھکرانے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”و غمض الناس“ ایک روایت میں ہے ”الکبر بطر الحق و غمض الناس“ غمض اور غمط کے معنی حقیر اور معمولی سمجھنے کے ہیں۔

تشریح :- امام نوویؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے والے صحابی کا نام مالک بن مرارہ الرہادی ہے، مسئلہ سوال کا مقصد واضح ہے کہ اگر دوسروں پر اپنی برتری کے اظہار کے بغیر عمدہ لباس زیب تن کرنا کسی کو پسند ہو تو کیا یہ بھی ممنوع ہے، اور جواب کا مقصد بھی ظاہر ہے کہ فی نفسہ عمدہ لباس پہننا جس میں دوسروں پر فخر کرنا ملحوظ نہ ہو بزرگمکبر کے زمرے میں شامل نہیں کیونکہ تکبر اس وقت متحقق ہوگا جب دوسروں کو اپنے آپ سے کمتر جانا جائے، اگر یہ ارادہ نہ ہو تو عمدہ لباس یا سواری اسی طرح گھر تعمیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہاں جب آدمی ناز و نعمت اور خرمستیوں میں اس حد تک پہنچ جائے کہ اس کے سامنے نہ دوسرے لوگوں کی کوئی حیثیت باقی رہے یا کم ہو جائے اور نہ حق قابل اتباع سمجھے تو وہ یقیناً متکبر ہے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں نقل کیا ہے: ”وفی صیام فتح القدیر ان الحمال من الاخلاق الحسنة والزينة من اخلاق الشیطان“۔ اس لئے آدمی کو متوسط حالت اختیار کر لینی چاہئے تاکہ ذلت سے بھی بچے اور تکبر سے بچتا رہے۔

۵۔ رواہ مسلم فی الایمان ص: ۶۵ ج: ۱ وابن ماجہ فی ابواب الدعاء بحوالہ المعجم المفہر ص: ۳۷۳ ج: ۱، ایضاً

مسند احمد ص: ۱۲۰ ج: ۵ حدیث: ۱۶۷۵، ص: ۱۳۹ ج: ۵ حدیث: ۱۶۹۱۸، ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط

معجم الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۶۸۶، حلیط الرحمن الحنفی

۶۔ کذا فی روایۃ مسلم ص: ۶۵ ج: ۱ کتاب الایمان، الترغیب والترہیب ص: ۳۵۶ ج: ۳.

۷۔ النووی علی مسلم حوالہ بالا.

غرض لباس ہو یا اپنا کوئی عمل اس میں اپنی صلاحیت کے مطابق چلنا منع نہیں، ممنوع فقط یہ ہے کہ آدمی اپنی خوبی اس طرح اُجاگر کرنے کی کوشش کرے کہ گویا وہ دوسروں سے برتر ہے اور دوسرے لوگ اس کی نظر میں حقیر لگیں اور اس رویے کی وجہ سے حق کی اہمیت بھی اس کی نظر سے گر جائے۔

تیسری حدیث:- ”لا يزال الرجل يذهب بنفسه حتى يركب في الجبارين فيصيبه

ما أصابهم“۔ (حسن غریب)

آدمی اپنے آپ کو بڑھاتا چڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ مغرور اور سرکش لوگوں میں شامل کر دیا جاتا ہے پھر اس کو وہی سزا ملتی ہے جو ان تکبر لوگوں کو پہنچتی ہے۔

نکات و تشریح:- بقولہ ”یذهب بنفسه“ کلمہ باء تعدیت کے لئے ہے یعنی خود کو بلندی کی جانب لے جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے زعم میں اپنا مقام عام لوگوں سے بالاتر سمجھتا ہے اور یہی چیز تکبر ہے، پس وہ اپنے زعم کے مطابق اعلیٰ درجے کا مستحق ہے اس لئے کتر لوگوں کے ساتھ اس کی نشست و برخاست اس کی شانِ عظیم کے منافی ہے۔ بعض حضرات نے باء کو مصاحبت کے لئے لیا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے نفس کا ساتھ دیتا رہتا ہے اور چونکہ نفس تو سرکشی کی جانب میلان رکھتا ہے اس لئے یہ شخص اس راستے پر اس کا ہم سفر بن جاتا ہے اور چلتے چلتے جبار بن جیسے فرعون، قارون اور ہامان وغیرہ کا تکبر میں مصاحب بن جاتا ہے پھر نہ نماز پڑھتا ہے اور نہ روزہ رکھتا ہے، بلکہ انکبار عن الحق اس کا مزاج بن جاتا ہے تو دنیا میں بھی حق سے دور ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی اہل ایمان کے بجائے قارون اور فرعون وغیرہ کے ساتھ اس کا حشر ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ

چوتھی حدیث:- ”عن ابیہ قال یقولون لی: ”فی النبیۃ“ وقد رکبت الحمار ولبست الشملة وقد حلبت الشاة وقل قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من فعل هذا فلیس فیہ من الکبر شی“۔ (ہذا حدیث حسن غریب)

حضرت کبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ لوگ میری بابت کہتے ہیں کہ میرے اندر تکبر ہے حالانکہ میں گدھے پر سواری کرتا ہوں اور معمولی شال اوڑھتا ہوں اور بکری خود وہ لیتا ہوں اور بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جو شخص یہ کام کرے تو اس میں کچھ بھی تکبر نہیں۔

نکات:- بقولہ ”النبیۃ“ بکسر الاء بمعنی تکبر کے ”ای یقولون فی نفسی الکبر“۔ بقولہ ”الشملة“ سوئی چادر کو کہتے ہیں۔ یہ کبھی ریشم کی ہوتی ہے اور کبھی اُون کی۔ یہاں اُونی چادر مراد ہے کیونکہ یہ معمولی نوعیت

کی چادر ہوتی ہے۔

تشریح :- اس تعلیل کا مطلب واضح ہے کہ تکبیرین ان امور سے دور رہتے ہیں کہ وہ ان میں عار محسوس کرتے ہیں اس لئے وہ ان کے قریب بھی نہیں جاتے جبکہ ایسا شخص جو ان امور کو اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتا ہو اور ان میں عار محسوس نہ کرتا ہو وہ تکبیر سے کوسوں دور ہوتا ہے۔

باب ماجاء فی حسن الخلق

”عن ابی السرداء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما شئنی انقل فی میزان المؤمن يوم القيمة من خلق حسن فان الله تعالى یغضض الفاحش البذی“۔ (حسن صحیح)^۱

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن مؤمن کی ترازو میں اخلاق حسنہ سے بڑھ کر کوئی چیز زیادہ وزنی نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ بے ہودہ اور لغو کلام کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے۔

نوٹ :- ”فاحش اور بذی“ کے معنی ”باب ماجاء فی المعصیہ“ میں گذرے ہیں۔

تشریح :- باب کی اگلی حدیث میں اس پر یہ بھی اضافہ ہے کہ اچھے اخلاق والا اپنے اخلاق کی وجہ سے پابند صوم و صلوٰۃ کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ ابن العریثی عارضہ میں اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں ”ہو معنی صحیح جنسا وان لم یصححہ تعضدہ الاحادیث والاصول“ یعنی باب کی دوسری حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے قوی نہیں لیکن مضمون کے لحاظ سے قوی ہے۔ پھر اس حدیث کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص فحش گوئی اور بکواس سے اجتناب کرتا رہتا ہے تو یہ اس شخص کے برابر ہے جو نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہے مگر بے ہودہ باتوں میں مشغول رہتا ہے۔

اخلاق کیا ہے؟ اور اس کا مقام کیا ہے؟ ان دونوں سوالوں کا قدرے اجمالی جواب گذشتہ ابواب میں گذر چکا ہے۔ الحمد للہ راقم نے ”نقش قدم اور نقش اخلاق“ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق حسنہ اللہ کو بہت پسند ہیں اور فحش گوئی اس کو نا پسند ہے

باب ماجاء فی حسن الخلق

۱۔ الحدیث امر جہ ایضاً ابن حبان، والہزار ورواہ ابو داؤد مختصراً بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۷۱ ج: ۳۔

اس لئے ترازوئے اعمال میں صاحبِ اخلاق حسنہ کے اخلاق و دیگر اعمال کا بہت زیادہ وزن ہوگا جبکہ بد اخلاق اس نعمت سے کلیتہً یا جزوی طور پر محروم ہوگا۔ پھر دوسری حدیث کا مطلب یہ معنوم ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق کی وجہ سے آدمی نقلی روزوں اور نمازوں کے پابند نہیں جتنا ثواب حاصل کر لیتا ہے یعنی ایک شخص کے اخلاق اچھے نہیں مگر وہ قیام و صیام کا بطور نفل زیادہ اہتمام بلکہ التزام کرتا ہے جبکہ یہ صاحب جو اچھے اخلاق کا مالک ہے بغیر اہتمام کے اس کے درجے کے برابر ہے۔

دوسری حدیث: "عن ابی ہریرۃ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اکثر ما بُدِجِلُ النَّاسِ النِّحْنَةَ قال تقوی اللہ وحسن الخلق وسئل عن اکثر ما یُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ قال الغم والفرج"۔^۱ (حدیث صحیح غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اسباب کے بارے میں پوچھا گیا جو کثرت سے لوگوں کو جنت میں داخل کر دیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اللہ کا خوف اور حسن اخلاق ہیں پھر ان اسباب کے حوالے سے پوچھا گیا جو بکثرت لوگوں کو جہنم میں داخل کر دیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ منہ اور شرم گاہ ہیں۔

تشریح: تقویٰ کے تین درجوں کا تذکرہ "باب ماجاء فی معاشرۃ الناس" میں گزرا ہے۔ حدیث پاک میں دخول جنت کو دو چیزوں پر مرتب بلکہ موقوف فرمایا ہے ایک تقویٰ اور دوم حسن اخلاق۔ کیونکہ تقویٰ سے آدمی اور اس کے مولیٰ کے مابین تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں، اور اخلاق حسنہ سے لوگوں سے اس کا رویہ کریمانہ و شریفانہ رہتا ہے تو جب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں کوئی کوتاہی نہیں رہے گی تو آدمی باسانی جنت میں داخل ہو جائے گا جبکہ اس کے برعکس اگر ان دونوں پہلوؤں سے آدمی کمزور و ناقص ہوگا اور منہ و شرم گاہ کی وجہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرتا رہے گا تو اس کی نحوست سے جنت سے محروم اور دوزخ کا مستحق ٹھہرے گا۔

"منہ" سے زبان اور حرام خوری دونوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بد گوئی اور حرام خوری دونوں مہلکات میں سے ہیں اسی طرح شرم گاہ کے غلط استعمال سے آدمی عذہ آدمیت سے نکل کر عذہ بھیمیت بلکہ بسا اوقات عذہ شیطانیت میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ بحث کافی لمبی اور موضوع بہت طویل ہے اشارۃً انتہائی کافی ہے اگر مزید تفصیل درکار ہو تو دیکھئے راقم

کی کتاب ”نقش اخلاق یا نقش قدم کامل“ حصہ دوم ”فصل اول زبان کی تباہ کاریوں میں“ اور فصل سوم ”نا جائز اور حرام شہوات رانی“۔

تیسری حدیث:- ”عن عبد اللہ بن المبارک انه وَصَفَ حَسَنَ الْخَلْقِ فَقَالَ: هُوَ بَسِطُ الْوَجْهِ وَبَذْلُ الْمَعْرُوفِ وَكَفُّ الْأَذَى“۔

حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ نے خوش اخلاقی کے بارے میں بتایا یعنی اخلاق حسنہ کیا ہیں؟ تو فرمایا چہرے کا کھل جانا اور نیکی و بھلائی کرنا اور تکلیف سے بچانا ہے۔

تشریح:- اخلاق کے متعلق روایات میں متعدد الفاظ مقول ہیں: کبھی غصہ نہ کرنے کو اخلاق کہا گیا ہے، کبھی سخاوت کو اور کبھی خندہ روئی وغیرہ کو۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اصل اخلاق نفسانی ملکات کا نام ہے جو کبھی ذاتی ہوتے ہیں جیسے شجاعت، عفت اور حکمت، اور کبھی کسی ہوتے ہیں جن کو ملکات فاضلہ بھی کہہ سکتے ہیں، یہ جو اعمال جوارج ہیں جیسے خرچ کرنا اور خندہ پیشانی سے چیخ آنا وغیرہ یہ ان ملکات کے آثار ہیں مگر عوام الناس چونکہ باریکیوں کو نہیں جانتے اس لئے ان کی سہولت کے لئے تعریفات بالرسوم کی گئی ہیں۔

باب ماجاء فی الاحسان والعفو

”عن ابی الاحوص عن ایہ قال قلت: یا رسول اللہ الرجل امر بہ فلا یقرینہ ولا یضربہ فی فیمری آقا جزیہ؟ قال: ”لا، اقرہ“ قال: وراسی رث الثیاب فقال هل لك من مال؟ قال قلت: من کل المال قد اعطانی اللہ من الابل والغنم قال فلیر علیک“۔

ابوالاحوص اپنے والد مالک بن عوف بن نضلہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! میرا گدرا یک آدمی پر ہوتا ہے جو میری مہمان نوازی نہیں کرتا، پھر وہ میرے یہاں سے گذرتا ہے تو کیا میں اس کا بدلہ لے سکتا ہوں (یعنی میزبانی نہ کر کے) فرمایا نہیں تو اس کی مہمانی کر لیا کرو، حضرت مالک بن عوف فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میرے کپڑے بوسیدہ اور ہڑانے ہیں تو فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی مال ہے؟ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اللہ نے مجھے ہر قسم کا مال اونٹ اور بکریاں دی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کا اثر تجھ پر نظر آتا چاہئے۔

لغات:- فقوله ”الاحسان“ لغوی اعتبار سے خوب صورت بنانے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں جب اس

کے صلہ میں ”السی“ آجائے تو بمعنی سلوک کے اور بغیر ”السی“ کے بمعنی نیکی و خلوص کے آتا ہے۔ قولہ ”للعفو“ مٹانے اور درگزر کرنے اور معاف کرنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فلایقربنی ولا یضیی فی“ دوسرا جملہ پہلے کی تفسیر ہے۔ قولہ ”افاجز بہ“ بفتح الهمزة وسكون الیاء جزاء سے ہے بمعنی بدلہ کے۔ قولہ ”اقرہ“ بفتح الهمزة امر بمعنی افسدہ کے یعنی تم اس سے بے مروتی کا بدلہ مت لو بلکہ اس کی مہمان داری کرو۔ قولہ ”زٹ الثیاب“ زٹ بمعنی بوسیدہ اور ہڑانے کے۔ قولہ ”من الابل والغنم“ مال کا بیان ہے۔

تشریح: چونکہ انسانی طبیعت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی بھی کام کا رد عمل دوسرے کے رویے اور سلوک پر مبنی کر دیتی ہے اچھائی کا جواب اچھائی سے اور بُرائی کا بُرائی سے، لیکن اسلام کا اصول یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اصلاح کرے اور بُرائی کا بدلہ بھی بھلائی سے دیدے، گو انتقام جائز ہے مگر عفو و درگزر کی بات ہی اور ہے اللہ نے صبر اور معافی پر جو انعامات مقرر کئے ہیں ان کا حصول بدلے کی صورت میں ممکن نہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک بن عوفؓ سے فرمایا کہ اگر کوئی شخص آپ کی مہمان داری نہیں کرتا لیکن جب وہ آپ کے یہاں سے گذر رہا ہو تو آپ ایسا نہ کریں بلکہ اس کا اکرام کر لیا کریں، غرض اگر کوئی شخص آپ کا حق ادا نہیں کرتا تو آپ اس کے حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں، ”فان المظلوم لا یظلم“۔

اس ارشاد پاک میں ان لوگوں کے لئے بھی بڑا سبق ہے جو عیادت، تعزیت اور ولیمہ وغیرہ تقریبات میں صرف ان لوگوں کا خیال رکھتے ہیں جو ان کو یاد کرتے ہیں اس طرز عمل کی اصلاح ضروری ہے۔

اس حدیث میں دوسری بات یہ قابل ذکر ہے کہ آدمی کو اپنے لباس و پوشاک و خوراک میں میانہ روی اختیار کر لینی چاہئے جیسا کہ اسلام کی تعلیمات میں ہر چیز میں اعتدال کو پسند کیا گیا ہے۔ لباس کے متعلق قدرے تفصیل تو ”ابواب اللباس“ میں گذری ہے مگر یہاں اتنی بات عرض ہے کہ آدمی کو شہرت کے لباس سے اجتناب کرنا چاہئے جس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آدمی بہت معمولی لباس پہنے۔ دوسری یہ کہ بہت اعلیٰ لباس زیب تن کر دے چونکہ دونوں میں آدمی ایک امتیازی رنگ اختیار کر لیتا ہے اس لئے شہرت اور ریا کا اندیشہ ہے اعلیٰ میں تو ظاہر ہے جبکہ ادنیٰ میں دکھاوے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کو زاہد اور پارسا سمجھتے ہیں اس لئے محققین فرماتے ہیں کہ اپنے ہم نشینوں اور دوستوں کے مساوی لباس اختیار کر لینا چاہئے ہاں جمعہ و عیدین اور خوشیوں کے مواقع اور وفود سے ملتے وقت اعلیٰ کی بھی اجازت ہے۔

حدیث باب سے ادنیٰ کی ناپسندیدگی معلوم ہوئی جبکہ اعلیٰ کی کراہیت دوسری روایات سے معلوم ہوتی

ہے۔ مزید تفصیل ان شاء اللہ ”ابواب الزہد“ میں آئے گی اور ”نقش قدم کامل“ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

دوسری حدیث:- ”عن حذیفۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تكونوا إمعة،

تقولون إن أحسن الناس أحسناً وإن ظلموا ظلّمنا، ولكن ووطنوا أنفسکم إن أحسن الناس أن تحسنوا وإن أساؤا فلا تظلموا“۔ (حدیث حسن غریب)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم ضعیف الرائے (برایک کی ہاں میں ہاں ملانے والے) مت بنو یعنی یوں مت بولو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ بُرا سلوک کریں گے تو ہم بھی ایسا کریں گے، بلکہ تم اپنے آپ کو اس بات کا خوگر بناؤ کہ اگر لوگ نیک سلوک کریں تو بھی تم اچھا سلوک کرو گے اور اگر وہ بد سلوک کریں تو بھی تم ان پر ظلم نہ کرو گے۔

لغات:- قولہ ”امعة“ بکسر الهمزة وتشديد الميم المانع اخیر میں تاہم مبالغہ کے لئے ہے نہ کہ تانیہ کے لئے اس لئے اس کا اطلاق مؤنث پر نہیں ہوتا چنانچہ ”رحل امعة“ کہنا صحیح ہے مگر ”امراة امعة“ نہیں کہا جاتا۔ ائم وہ آدمی ہے جو ہر ایک سے کہتا ہو کہ میں تیرے ساتھ ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسا وہ شخص کرتا ہے جو ضعیف الرائے ہو، اس لئے یہ جس کی بات اور دلیل بھی سنتا ہے تو اس سے متاثر ہو جاتا ہے اس لئے وہ کسی رائے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ قولہ ”تقولون“ الخ یہ اس امعة کی تفسیر ہے۔ قولہ ”ووطنوا“ تو طین یعنی باب تطعلل سے امر کا صیغہ ہے بمعنی مانوس کرنے اور آمادہ کرنے کے ہے۔ باب افعال سے بھی یہی معنی آتے ہیں: ”یغال اوطن نفسه علی کذا“ یا ”وطن نفسه علی کذا“ یعنی اپنے آپ کو کسی کام کا عادی و خوگر بنانا۔

تشریح:- اس حدیث کا مطلب تقریباً وہی ہے جو باب کی پہلی حدیث کا ہے کہ نیکی کو کسی آدمی کے عمل سے منسلک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ نیکی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے والے عمل کو کہتے ہیں لہذا اس میں لوگوں سے طمع و امید نہیں رکھنی چاہئے گو اس کے ثمرات دنیا میں بھی مل سکتے ہیں کہ ہر نیکی پر برکات کا ترتب ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اس میں لوگوں سے معاوضہ کی توقع رکھے کہ اگر کچھ ملنے کی امید ہو یا کچھ ملنا ہو تو بطور طمع یا بطور عوض نیکی کرے گا اور جو جگہ دنیوی فائدے سے خالی ہو تو وہاں نیکی و اچھائی نہیں کرے گا خاص کر جبکہ دوسری طرف سے بُرائی کا سلوک ہو جائے۔ غرض آدمی کو نیکی و احسان کا دامن ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے خواہ کوئی کیسا بھی ہو، نیکی ہر جگہ مطلوب ہے چاہے وہ اچھی جگہ ہو یا بُری جگہ۔ تدر

باب ماجاء فی زیارة الاخوان

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من عاد مریضاً أو زار أخاه فی اللہ ناداه مناداً أن طِبْتُ وطاب ممشاطاً وَتَبَّات من الجنة منزلاً“۔^۱ هذا حدیث غریب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی بیمار کی عیادت کی یا اپنے اسلامی بھائی کی زیارت کی تو ایک فرشتہ (منادی) اسے آواز دیتا ہے کہ خوش رہو اور تیرا چلنا بھی بہت خوب ہے اور تو نے (اس عمل سے) جنت میں گھر بنالیا۔

لغات:۔ بقولہ ”الاخوان“ اُخ کی جمع ہے اگر بھائی بندی نسبی و خوئی ہو تو اس کی جمع اخوة آتی ہے اور اگر دوستانہ تعلق کی بناء پر ہو تو اس کی جمع اخوان آتی ہے چنانچہ کہاوت مشہور ہے ”إخوان الوداد اقرب من إخوان الولاد“ دوستی کے بھائی، نسبی بھائیوں سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

قوله ”أخاه فی اللہ“ اگر ”فی اللہ“ کا تعلق اخا کے ساتھ ہو جیسا کہ اوپر ترجمہ اسی پر مبنی ہے تو اس کے ساتھ یہ قید ملحوظ رہے گی کہ یہ عیادت اور زیارت دونوں ثواب کی نیت سے ہوں کہ ”انما الاعمال بالنیات“۔^۲ تاہم اس پر یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے کہ اخا تو فعل یا شبہ فعل نہیں تو اس کے ساتھ جار کا تعلق کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ کیونکہ جار کے تعلق کے لئے فعل کی خوشبو اور شائبہ بھی کافی ہے جیسے ”وهم بعد علی من سواهم“ اس میں یہ بمعنی قوت کے ہے لہذا یہاں بھی ”اُخ“ کے اندر اخوة کے معنی پائے جاتے ہیں جو تعلق کے لئے کافی ہیں اور اگر ”فی اللہ“ کا تعلق ”زار“ فعل کے ساتھ ہو تو پھر کوئی اشکال نہیں ہے۔ بقولہ ”مناد“ اس منادی اور پکارنے والے سے مراد فرشتہ ہے۔ بقولہ ”ممشاطاً“ مصدر میسی کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور ظرف زمان یا مکان کا بھی۔ یعنی تیرے

باب ماجاء فی زیارة الاخوان

۱۔ ابیہذا رواہ ابن ماجہ ص: ۱۰۳ ”باب ماجاء فی ثواب من عاد مریضاً“ ابواب الجنائز، ابیہذا رواہ ابن حبان فی صحیحہ الترغیب والترہیب ص: ۲۴۷ ج: ۳۔ ۲۔ رواہ البخاری ص: ۲ ج: ۱ ”باب کیف کان بدل الوحي الخ“، ابیہذا کتاب الایمان باب: ۳۱، نکاح باب: ۵، طلاق باب: ۱۱، مناقب الانصار باب: ۴۵، عقیق باب: ۶، ایمان باب: ۲۳، حیل باب: ۱، و مسلم ص: ۱۳۰ ج: ۲ باب قوله ﷺ انما الاعمال بالنية الخ کتاب الامارة، و ابو داؤد ص: ۳۰۷ ج: ۲ کتاب الطلاق، ابیہذا رواہ النسائی فی الطہارة، و ابن ماجہ ص: ۳۱۱ ”باب النية“ ابواب الزہد، مستد احمد ص: ۲۳ ج: ۱ حدیث: ۱۶۹۔ حقیظ الرحمن الحنفی غفرلہ ولوالدیہ ولاساتلہ

چلنے کا یہ وقت اور یہ راستہ بہت مبارک ہے کیونکہ یہ جنت کی طرف جاتا ہے۔ قوله "وَتَبَوَّاتُ مِنَ الْحَنَّةِ مَنْزِلًا" تَبَوَّاتُ لکان کے معنی جگہ بنانے اور لینے کے ہیں۔ من الجنۃ ای من منازل الجنۃ جبکہ منزل میں تنوین تعظیم کے لئے ہے یعنی تم نے اپنے اس عمل کی وجہ سے جنت کی منازل میں سے ایک عظیم گھر بنالیا۔

تشریح:- اس حدیث مبارکہ سے ان دونوں عملوں یعنی مریض کی عیادت اور دوستوں کی زیارت کی بڑی فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ ایسے اعمال ہیں کہ ان کی بدولت آدمی فرشتوں کی دعاء کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ اس شخص کی دنیاوی و اخروی فلاح و نجات اور کامیابی کے لئے دعا گورہتا ہے اور اس یقین سے کہتا ہے کہ بجائے انشاء کے اخبار کا صیغہ استعمال کرتا ہے کہ گویا یہ آدمی کامیاب ہو ہی گیا۔

تاہم "فی اللہ" کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت ان دوستانہ تعلقات والوں کو ملتی ہے جن کا تعلق اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسا تعلق نیک لوگوں سے ہی ہو سکتا ہے، چور اور ڈاکوؤں کے ناجائز تعلقات کو یہ فضیلت بظاہر حاصل نہیں ہے کیونکہ اگر چور اپنے چور ساتھی کی عیادت اس لئے کرتا ہے کہ معلوم ہو کہ وہ میرے ساتھ چوری کرنے کی غرض سے جانے کے لئے کب تیار ہو سکے گا تو یہ کوئی ثواب کی نیت یا کام نہیں ہے۔ واللہ اعلم وعلہ اتم۔

باب ماجاء فی الحیاء

"عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الحیاء من الایمان والایمان

فی الحنۃ والبذاء من الحفاء والحفاء فی النار"۔ (حسن صحیح) ^۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: حیا ایمان کا جزء ہے اور ایمان جنت میں لے جانے والا ہے اور بے ہودگی سنگ دلی میں سے ہے اور بے رحمی (سنگ دلی) جہنم میں لے جانے والی (خصلت) ہے۔

لغات:- قوله "الحیاء" بالمدرغۃ میں وقار اور بنحیدگی کو کہتے ہیں جبکہ اصطلاح میں ایک ایسی کیفیت اور ملکہ کا نام ہے جس کی بدولت انسان خیر اور بھلائی کی طرف اقدام کرتا ہے اور مذمت کے خوف سے شر و قبیح سے

اجتناب کرتا ہے یہ وقاحت (لا پرواہی اور غلط کام کی جرأت) اور تجل (ہر کام کرتے ہوئے شرمندہ ہونے) کے درمیان درجہ اوسط سے عبارت ہے۔ قولہ ”الحفاء عتیم اور بے مروتی کو کہتے ہیں جو وفاداری اور رحم کے مقابل آتا ہے۔

تشریح:- اس ارشاد پاک میں حیاء کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے اس طرح بعض دوسری احادیث بھی اس مضمون پر ناظر ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک ایمان مرکب ہے ان کے یہاں تو اس کی کسی تاویل کی ضرورت نہیں، مگر حنفیہ اور جمہور متکلمین کے ہاں چونکہ ایمان بسیط ہے اس کے اجزاء نہیں ہیں اس لئے وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حیاء ایمان کے ایسے مقتضیات میں سے ہے جیسے لازم اپنے مژوم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ دونوں میں نسبت تلازم کی ہے جو ایک دوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے۔

باب کی حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدمی حیاء کی بناء پر چنتی بن جاتا ہے اس کی وجہ بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتی ہے کہ ”الحیاء لایمانی لا یحیر“^۱ یعنی حیاء خیر کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں دیتی تو ظاہر ہے کہ جب یہ خیر ہی خیر ہے تو اس کا انجام بھی جنت تک رسائی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس بذاء یعنی بے حیائی کے کام اور باتیں حیاء کی نقیض ہیں تو ان کا انجام دوزخ میں دھکیلا ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ جو حیاء مشروع و ممدوح ہے اس سے مراد وہ خلق ہے جو ان امور سے روکے جو شرعاً معیوب ہیں جیسے زنا، فحشا اور دیگر اعمال بد۔ جہاں تک امور شرعیہ میں شرم کرنے کا تعلق ہے تو وہ شرعی حیاء نہیں بلکہ شرعاً وہ عیب ہے اگرچہ عارفانہ حیاء ہی کہلاتا ہے۔

باب ماجاء فی التَّائِبِ وَالْعَجَلَةِ

”عن عبد اللہ بن مسرج بن المزنی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: السمٹ الحسن والقدوة والاقتصاد جزء من اربعة وعشرين جزء من النبوة“۔

حضرت عبد اللہ بن مسرج بن مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھی عادت اور وقار اور میانہ روی نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

ح: صحیح بخاری ص: ۹۰۳ ج: ۲ ”باب فی الحیاء“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۴۸ ج: ۱ ”باب بیان عدد شعب الایمان وفضلها الخ“ کتاب الایمان۔

لغات:۔ قولہ "الثَّانِي" بفتح الهمزة وتشديد النون جلدی کرنے کے مد مقابل آتا ہے۔ قولہ "العَجَلَةُ" عین، جیم اور لام تینوں مفتوح ہیں بمعنی جلدی و سرعت کے ہے گویا ترجمۃ الباب کے دونوں الفاظ ایک دوسرے کی تفسیر ہیں۔ قولہ "السَّعْيُ" اس کے معنی فحلت اور عادت کے ہیں لہذا است حسن کا مطلب اچھی عادت و خوبی ہے۔ قولہ "وَالنُّوْذَةُ" بضم الناء وفتح الهمزة وفتح الدال الخفيفة یہ اسی ثانی کے معنی میں ہے یعنی عجلت کے مقابلے میں آتا ہے جس کا مطلب وقار و سکون اور سلیقے سے کام کرنا ہے۔ قولہ "الاقتصاد" بمعنی اعتدال کے یعنی افراط و تفریط کے درمیان درجہ اوسط کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک میں اچھی عادت، آرام و سکون اور میانہ روی کو نبوت کا چوبیسواں حصہ قرار دیا گیا جس سے ان امور کا عمدہ ہونا نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسے نبوت کا چوبیسواں حصہ کس اعتبار سے کہا گیا ہے؟ جبکہ بعض روایات میں پچیسویں جزء ہونے کا بھی ذکر ہے۔^۱

اس کا جواب یہ ہے کہ نبوت ایک وہی نعمت ہے اس کے حصول میں کسی طرح انسانی کسب و اكتساب دخل نہیں، تاہم نبوت ہر شخص کو بھی نہیں ملتی، یہ نعمت عظمیٰ اس انسان ہی کو مل سکتی ہے جو انسانی اعلیٰ کمالات اور خوبیوں کا مالک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی بعثت عموماً ان اقلیم وارضی و بنطوں میں بکثرت ہوئی ہے جہاں کی آب و ہوا معتدل ہے۔ وہ چوتھی اقلیم کا درمیانی حصہ ہے جو شام کے آس پاس ممالک پر مشتمل ہے۔ چونکہ آب و ہوا اور اعتدال موسم کا انسانی اخلاق پر ایک اچھا اثر ہوتا ہے اس لئے وہاں کے لوگوں میں اعتدال پایا جاتا ہے اور اسی کی بدولت وہاں اولیاء و علماء اور اقیاء بکثرت پیدا ہوتے ہیں جیسے وہاں کا زیتون لاثانی ہے ایسا ہی وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی انتہائی معتدل ہے، جب ان پر وحی نازل ہو جاتی ہے تو نور علی نور کا مصداق بن جاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ دین فطرت ان علاقوں میں زیادہ جلد نافذ اور مقبول عام بن جاتا ہے جہاں اعتدال موسم پایا جاتا ہو جس کی تفصیل مقدمہ ابن خلدون میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال انبیاء کمالات اور انسانی خوبیوں اور ملکات کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں ان ملکات میں سے تین وہ بھی ہیں جن کا ذکر حدیث بالا میں آیا ہے۔ اگر کسی میں یہ اوصاف اعلیٰ پیمانے پر ہوں تو اس میں گویا

باب ماجاء فی الثانی والعجلة

۱۔ ایک روایت میں پچیسویں جزء ہونے کا ذکر ہے کما فی ابی داؤد ص ۳۱۱ ج ۲: "باب فی العلم و اخلاق النبی ﷺ" اول کتاب الادب، ایک روایت میں ۴۷ ویں اور ایک روایت میں ۷۰ ویں جزء ہونے کا ذکر ہے، کذا فی مجمع الزوائد ص ۱۱۳ ج ۸: حدیث: ۱۳۱۱۔

چوبیسواں حصہ آگیا اور جس میں تسیہ کم درجے کے ہوں تو اس میں گویا نبوت کا پچیسواں حصہ پایا جاتا ہے، لیکن جزء کے تحقق سے کل کا تحقق لازم نہیں آتا، اس لئے ایسا شخص انبیاء کے راستہ پر گامزن تو ہے مگر وحی کا مستحق نہیں کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ تدبر، اس کی مزید تحقیق ابواب البر یا میں آئے گی۔

دوسری حدیث:- ”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا شیخ عبد القیس ان فیک تحصلتین یحبہما اللہ الحِلْمُ والِانَاءُ“۔^۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے شیخ عبد القیس سے فرمایا کہ بے شک تیرے اندر دو ایسی خوبیاں ہیں جن کو اللہ پسند فرماتا ہے، وہ بردباری اور اطمینان ہیں۔

لغات:- قولہ ”الحلم“ بردباری اور عقلمندی کو کہتے ہیں۔ قولہ ”الاناء“ بکسر الہمزۃ یہ وہی تاقی اور تودہ کے معنی میں ہے یعنی اطمینان و سکون سے کام سرانجام دینا۔ پھر الحکم والاناء کے اعراب میں دو احتمال ہیں۔ دونوں بنا بر بدلیت از خصلتین منصوب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور خبر المبتدأ المحذوف بھی ہو سکتے ہیں۔ ”ای ہما الحِلْمُ والِانَاءُ“۔

تشریح:- شیخ عبد القیس عبارت اضافت کے ساتھ ہے۔ حاشیہ میں ایک احتمال بدلیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس صورت میں مضاف مقدر ہوگا ”ای وافد عبد القیس“۔ ان کا نام منذر بن عائد بن المنذر العصری تھا۔ ان کا بڑا قبیلہ ربیعہ تھا مگر عبد القیس شاید ربیعہ کی شاخ ہے۔ شیخ کے معنی سر کے زخم کے ہیں۔ اور عصری قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

اس وفد کی آمد کا مختصر پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ:- ان کا ایک آدمی منقذ بن حیان تجارت کے لئے مدینہ طیبہ آتا رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد حسب معمول مدینہ طیبہ میں آیا ہوا تھا اور اپنا سامان فروخت کر رہا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف تشریف لائے تو یہ آپ کو ملا۔ آپ نے اس کا حال پوچھا اور اس قبیلے کے بڑے بڑے اشراف کا نام لے کر احوال پوچھا تو اس سے منقذ کو بہت تعجب ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۃ فاتحہ اور سورۃ علق کا سبق لیا۔ اور وطن واپس آگیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرفاء قبیلہ کی طرف ایک خط بھی لکھوا دیا تھا۔ منقذ نے اپنے قبیلے میں آکر ابتداء اپنے اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو بخفی رکھا۔ اور گھر میں نمازیں پڑھتا رہا۔ اس کی بیوی قبیلے کے

سروار منذر بن عائد کی بیٹی تھی۔ بیٹی نے اپنے شوہر کی نماز کا تذکرہ اپنے والد منذر کے سامنے کیا کہ وہ جب سے مدینہ سے واپس آیا ہے۔ اس طرح مُند دھوتا ہے۔ اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی بیٹھ جاتا ہے۔ اور کبھی ماتھا زمین پر ٹیک دیتا ہے۔ غرض یہ کہ بیعت صلوة کو نقل کیا۔ منذر نے اپنے داماد منذر سے پوچھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو؟ اس نے اپنے اسلام لانے کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ منذر کے دل میں اسلام کی محبت آگئی۔ اور خط بھی اس کو دکھلایا گیا۔ اس نے قبیلے کے لوگوں کو حالات سنائے۔ اور خط پڑھ کر سُنا یا۔ سب اسلام لانے کے لئے تیار ہو گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد مدینہ طیبہ بھیجنا چاہئے۔ چنانچہ رئیس قبیلہ منذر (عبد القیس) کی قیادت میں ایک وفد تشکیل دے دیا گیا۔ چنانچہ وہ وفد مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی تعلیمات حاصل کیں۔

ابن ماجہ (باب الحکم ص ۳۰۸) پروردگار تعالیٰ فرمادی رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد سے پہلے ہی اس کی پیشین گوئی فرمادی تھی۔ چنانچہ جب یہ لوگ آگئے تو بے تابانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فوراً حاضر ہوئے۔ جبکہ شیخ عسری (عبد القیس) پہلے اپنی منزل پر گئے۔ سواری بٹھادی۔ اور کپڑے تبدیل کر کے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”يا اشج ان فيك لخصلتين يحبهما الله الحلم والتؤدة، قال يا رسول الله اشئني جُئِلْتُ عليه ام شئني حَدَثَ لِي؟ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بل شئني جُئِلْتُ عليه“۔

ایک روایت میں ’تؤدة‘ کے بجائے ’حياء‘ کا لفظ ہے۔ (ابن ماجہ ص ۳۰۹)

چونکہ حياء، اناء، ة پر آمادہ کرتی ہے اس لئے یہ تعبیر بھی صحیح ہے۔

تیسری حدیث:- ”الا ناءة من الله والعجلة من الشيطان“۔ (حدیث غریب) ۳

تا مل اور سنجیدگی اللہ کی طرف سے ہے اور جلدی کرنا شیطان کی جانب سے ہے۔

تشریح:- جب آدمی کسی کام کو سوچ سمجھ کر تا مل کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اسے اس کے گرد و پیش اور عواقب میں غور کرنے کا موقع ملتا ہے جبکہ بلا تا مل اور بلا سوچے سمجھے کام کرنا بے انجامی کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

اس لئے اول مستحسن ہوا۔ اور دوم مذموم۔ اور ضابطہ ہے کہ اچھے کاموں کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے اور بُرے اور غلط کاموں کی نسبت شیطان کی جانب۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جن کا انجام بہر حال اچھا ہی ہو جیسے نماز اور دیگر امور شرعیہ جن کے کرنے کا حکم ہے لہذا ان میں جلدی کرنا معیوب نہیں کیونکہ اللہ نے خیر و بھلائی کی طرف مسابقت کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور ایسے لوگوں کو پسند بھی فرمایا ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عجلت اور سرعت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں عجلت قبل از وقت کام کرنے کو کہتے ہیں جبکہ سرعت اپنے وقت پر کام جلدی نمٹانے کو کہتے ہیں۔ اللہ نے سرعت کی مدح تو فرمائی ہے مگر عجلت کی نہیں لہذا استثنیٰ کی ضرورت باقی نہ رہی۔

باب ماجاء فی الرفق

”عن ابی النرداء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من أعطی حظه من الرفق فقد أعطی حظه من الخیر ومن حُرِمَ حظه من الرفق فقد حُرِمَ حظه من الخیر“۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو نرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو نرمی میں سے اس کا نصیب ملا تو اسے خیر میں سے اس کا حصہ ملا۔ اور جس شخص کو نرمی میں سے اس کے نصیب سے محروم کر دیا گیا تو خیر میں سے اس کا حصہ ختم کر دیا گیا۔

لغات: بقولہ ”من أعطی اور من حُرِمَ“ مجہول کے صیغے ہیں ان میں ضمیر مستتر ”من موصولہ“ کی طرف عائد نائب فاعل ہیں اور ”حظ“ منصوب مفعول ثانی ہیں۔

تشریح:۔ ارشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ نرمی خیر کا حصہ ہے جس نیک بخت کو جتنی نرمی نصیب ہوگی اسی تناسب سے خیر و بھلائی اس کی متاع ہوگی۔ اور جس قدر نرم خوئی میں کمی ہوگی اسی تناسب سے خیر سے محرومی ہوگی۔ لہذا خیر و بھلائی کا دار و مدار نرم خوئی پر ہوا۔ اب جو شخص جتنا چاہے اپنے لئے خیر بڑھا سکتا ہے۔

اس مضمون کی متعدد احادیث اور بھی وارد ہوئی ہیں جس سے نرم خوئی کی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے کہ عند الشارح اس کا کتاباً بڑا مقام ہے۔^۱

باب ماجاء فی الرفق

۱۔ راجع للاحادیث مجمع الزوائد ص: ۱۲۵ ج: ۸، ایضاً الترغیب والترہیب ص: ۲۷۸ ج: ۲۸۲ ص: ۳۰۱۔

تاہم یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں سختی مطلوب ہو وہاں نرمی کرنا مدوح و محمود نہیں ہے مثلاً جہاں حکومت کو قوت تنفیذ کی ضرورت ہو اور وہاں ایک اہل کار کسی مجرم کے ساتھ نرمی کرتا ہے تو اس سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک طالب علم پڑھتا نہیں تو مدرسے کی انتظامیہ کے لئے اس کے ساتھ سختی کرنا ہی اس کے لئے مفید ہے۔ ایک اچھا باپ وہی ہوتا ہے جو اپنے بچوں کی پرورش میں موقع و محل کا بھرپور خیال رکھے کہ کس جگہ نرمی اچھی ہے اور کس وقت سختی۔ شوہر، واعظ، مفتی اور قاضی کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے۔ البتہ سختی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے ڈھنگی سختی کرے بلکہ جہاں سختی کا اظہار ضروری ہو تو اس میں نرمی و مہربانی کا عنصر ضرور شامل ہونا چاہئے اور وہ کام اس خوبی سے سرانجام دینا لازمی ہے کہ اس سختی کا فائدہ جلدی نمایاں ہو جائے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سختی درحقیقت مہربانی اور نرمی ہی تھی مگر صورتاً یہ سختی لگ رہی تھی۔ تدریجاً

باب ماجاء فی دعوة المظلوم

”عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذاً الی الیمن فقال: یا قتی دعوة المظلوم فانه لیس بینہما وین اللہ حجاب“۔ (حسن صحیح)^۱

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ ستم زدہ کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ (مانع) نہیں ہوتا ہے۔

تشریح:۔ مظلوم کی بددعا سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرنا چاہئے کیونکہ ظلم کر کے آدمی بددعا سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے یہاں لازم کی نفی سے ملزوم کی نفی مراد ہے۔ یہ حدیث ابواب الزکاة کے شروع میں بھی گزری ہے جو ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی، ج ۳ من ص ۴۰ الی ص ۴۷) یہاں حجاب سے مراد مانع ہے، یعنی اس بددعا کے اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں بلکہ وہ

باب ماجاء فی دعوة المظلوم

۱۔ اخرجه البخاری فی الجہاد باب: ۱۸۰، وفی الزکاة باب: ۶۳، وفی مظالم باب: ۹، ومغازی باب: ۶۰، ومسلم فی الایمان حدیث: ۳۹، ابوداؤد زکوة باب: ۵، ابن ماجہ ابواب الزکوة باب: ۱، سنن دارمی زکاة باب: ۱، ومسند احمد ص: ۳، ج: ۱، حدیث: ۱۲۰۷۲۔

ضرور پیش ہوتی ہے۔ حافظ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ مظلوم خواہ ایسا کیوں نہ ہو جس کی دعا قبول نہیں کی جاتی، مثلاً اس کا کھانا حرام ہو لیکن مظلومیت کی صورت میں اس کی بددعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ پھر مسند احمدؒ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اگرچہ یہ مظلوم کافر کیوں نہ ہو۔ تاہم حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر اور فاسق کی دعا قبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وقتی مطلوب حاصل ہوگا، اصلی مقصود کا حصول مراد نہیں جو خالق کی طرف سے داعی کا اکرام اور رضا ہے۔

بہر حال حجاب سے مراد مانع ہے۔ اور یہ کتنا یہ ہے سرعت قبولیت سے۔ اس حجاب سے مراد پوشیدہ ہونا نہیں اور نہ ہی اس کا مفہوم مخالف معتبر ہے، کیونکہ اللہ عزوجل سے کوئی شے محبوب نہیں۔ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کسی شے کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان حجاب ہے تو مطلب منع اور حرمان ہوتا ہے کہ وہ محروم ہے۔

باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ

”عن انس قال خدمت رسول الله صلى الله عليه وسلم عشرين سنين فَمَا قَالَ لِي ”أَفْتُ“ وَمَا قَالَ لَشَيْءٍ صَنَعْتُهُ لِمَ صَنَعْتُهُ؟ وَلَا لَشَيْءٍ تَرَكْتُهُ لِمَ تَرَكْتُهُ؟ وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ خُلُقًا وَمَا مَسَسْتُ خَزَأً قَطُّ وَلَا حَرِيرًا وَلَا شَيْئًا كَانَ الْكَبِيرُ مِنْ كَفِّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَوْلًا شَمَمْتُ مِسْكَاً قَطُّ وَلَا عِطْرًا كَانَ أَطْيَبَ مِنْ عَرَقِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی مجھے ”أَفْتُ“ کا لفظ نہیں بولا ہے، اور نہ کسی کام کے بارے میں جو میں نے کیا ہو (اور وہ کرنا نہیں چاہئے تھا) فرمایا ہے ایسا کیوں کیا؟ اور نہ ہی فرمایا ہے کسی ایسے کام کے متعلق جو میں نے نہیں کیا ہو (اور وہ کرنا چاہئے تھا) ایسا کیوں نہیں کیا؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ میں نے کسی نرم کپڑے کو ہرگز نہیں چھوا اور نہ ریشم کو اور نہ ہی کسی اور چیز کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک سے زیادہ نرم ہو۔ اور میں نے نہیں سونگھا مشک کو کبھی۔ اور نہ ہی عطر کو

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے زیادہ خوشبودار ہو۔

لغات :- قوله "أقْب" بضم الهمزة وكسر الفاء المشددة المنونة، اس میں دیگر لغات بھی ہیں۔ اصل میں ناخن کی میل کو کہتے ہیں، پھر ہر قابل نفرت چیز کے لئے استعمال ہونے لگا، اور اسی میں اب مشہور ہے۔ قوله "نَحْوًا" اُن اور ریشم ملا کر اس سے بنایا جاتا ہے جو بہت نرم کپڑا ہوتا ہے۔

تشریح :- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ تشریف لائے تو کچھ عرصہ کے بعد جس کی مدت زیادہ سے زیادہ چند ماہ ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کو لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور کہنے لگیں اے اللہ کے رسول! انس سنجیدہ بچہ ہے یہ آپ کی خدمت کیا کرے گا گویا ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا، اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مسلسل پوری حیات نبوی یعنی تقریباً دس سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حضور اور سفر میں سرانجام دی۔

باب کی حدیث میں جن امور کا ذکر ہے کہ جو کام کئے جانے کے تھے ان میں سے اگر کوئی کام رہ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں کیا۔ اور جو امور ایسے ہوتے ہیں جن کو نہیں کرنا چاہئے اگر ایسا کوئی کام مجھ سے سرزد ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ کیوں کیا؟ تو ان سے آداب اور معاشرت کے وہ امور مراد ہیں جن کا تعلق ذاتی ضروریات یا گھریلو معاملات سے ہو اور شرمیہ مراد نہیں کیونکہ ان میں کمی بیشی اور کوتاہی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً تنبیہ فرماتے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے کہ حرمت اللہ کی بے حرمتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غضب ناک کر دیتی۔ (چونکہ یہ غصہ بھی خالصتاً لوجه اللہ ہوتا تھا اس لئے) اس غصہ کی کوئی بھی تاب نہ لاسکتا تھا۔

بہر حال حدیث باب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کس قدر درگزر اور عفو کے مالک تھے، ورنہ دس سال کے عرصے میں خادم سے اور خصوصاً کم عمر والے سے کوئی نہ کوئی کوتاہی ضرور ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذاتی سہولیات اور دنیوی امور میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ورنہ دلچسپی کے امور کے مجز جانے کی صورت میں یقیناً غصہ آتا ہے، اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لئے کسی طرح و با کسی پر نہ ڈالتے اور نہ ذاتی معاملات میں کسی سے انتقام

باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ

۱۔ کذا فی صحیح مسلم ص: ۲۵۶ ج: ۲ کتاب الفضائل

لیتے۔ چنانچہ مسلم شریفؒ کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے، اس میں کفار کو مارنا اور قتل کرنا ثابت ہے ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خادم یا کسی عورت (امہات المؤمنین میں سے کسی) کو نہیں مارا۔ ان میں سے کسی سے خطا و غرض بھی ہوتی تو اس کا انتقام نہیں لیا، بجز اس کے کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کی ہو تو اس پر شرعی سزا جاری فرمائی۔

باب کی حدیث سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بھی بڑی منقبت معلوم ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی ان پر تارنگی کا اظہار نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ دوسری روایات سے ان کے لئے مال و اولاد اور عمر کی دعا ثابت ہے جو قبول بھی ہوئی۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک ہر خوشبو سے زیادہ خوشبودار تھا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عطر اور مشک وغیرہ کی خوشبو کیوں استعمال فرماتے؟ اس کے جواب میں حضرت انگوی صاحب رحمہ اللہ نے الکوکب میں متعدد وجہات پیش فرمائی ہیں: مثلاً خوشبو اللہ کی نعمت ہے اسے استعمال کی غرض سے لگانا یا سنن انبیاء ہونے کی وجہ سے ان کی متابعت و موافقت کرنا یا ان اوقات میں لگانا جن میں پسینہ نہیں آتا جیسے سردی کے موسم میں۔ مگر زیادہ مناسب تو یہ ہے کہ آدمی کو جس بڑے مسلسل واسطہ رہے تو وہ آدمی کو محسوس نہیں ہوتی ہے جیسا کہ مشاہدہ و تجربہ ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوشبو استعمال کرنا کوئی تحصیل حاصل یا تحصیل ادنیٰ کے زمرے میں نہیں آتا۔ تدر

دوسری حدیث: "عن ابی اسحق قال سمعت اباعبداللہ الحدادی یقول سالت عائشۃ عن خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: لم یکن فاحشاً و لا متفحشاً و لا صخباً بافی الاسواق و لا یجزی بالسبیۃ السبیۃ و لکن یعفو و یمسح"۔ (حدیث حسن صحیح)

ابو اسحق فرماتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ حدادی سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ غیر ارادی طور پر بد گوئی کرتے اور نہ ہی ارادہ فرماتے، اور نہ بازاروں میں چیخنے والے تھے اور آپ صلی

اللہ علیہ وسلم بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہ دیتے بلکہ معاف فرماتے اور درگزر فرماتے تھے۔

لغات :- ”فاحش اور منکشف“ کے معنی ”باب ماجاء فی النفس“ میں گزرے ہیں۔ جبکہ ”صحاب“ خاء کی تشدید کے ساتھ صیغہ اور چیخنے چلانے والے کو کہتے ہیں۔ بظاہر یہ صیغہ مبالغے کا معلوم ہوتا ہے اس طرح پھر زیادہ چیخنے کی لہجہ ہوگی، نہ کہ نفس چلانے کی۔ لیکن یاد رہے کہ ایسے بہت سے صیغے ہیں جن کا وزن بظاہر مبالغے پر دلالت کرتا ہے مگر وہاں مبالغہ مقصود یا مراد نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ فحّال وزن کبھی نفس نسبت کے لئے بھی آتا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی مرقات میں ایسی ہی بات کہی ہے ”قال و فحّال المقصود من هذا الكلام مبالغة النفس لانفسى المبالغة كما فى قوله تعالى: و ما نانا بظالم للعبيد“۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بازاروں میں شور نہیں فرماتے تھے، حالانکہ وہاں عموماً شور کی ضرورت پیش آتی ہے تو دوسری جگہوں میں بطریق اولیٰ شور نہیں فرماتے تھے۔ قولہ ”يعفو“ اس کا تعلق باطن سے ہے۔ اور ”يصفح“ کا ظاہری درگزر سے ہے۔

تشریح :- ان دونوں حدیثوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ اخلاق جیسے ظاہری عبارت سے معلوم ہوئے اسی طرح بطور التزام بھی معلوم ہوئے، کیونکہ پہلی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک کا نرم ہونا اور پسینے کا خوشبودار ہونا۔ اور دوسری حدیث میں زور سے نہ بولنا، یہ سب علامات بلکہ دلالت ہیں اعلیٰ نفاست پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی نفیس الطبع، پاکیزہ طبیعت اور نرم خوتھے۔ کیونکہ جب مزاج نرم اور نفیس و پاکیزہ ہوتا ہے تو اعضاء بھی نرم اور آثار بھی قابل رشک ہوتے ہیں۔ جبکہ بد مزاج شخص کا پسینہ انتہائی بدبودار، آواز غلیظ و بلند اور ہاتھ پاؤں سخت ہوتے ہیں۔ بال بھی سخت اور کھال بھی موٹی اور سخت ہوتی ہے۔

راقم نے ”نفس قدم“ لکھتے وقت ابوعلی سینا کی ”شفاء“ منکوائی تھی تاکہ وہ قیافے بھی کتاب میں شامل کر دیئے جائیں جن سے اخلاق پر استدلال ہو سکتا ہے، مگر بعد میں مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس طرح بعض لوگ ایک دوسرے کے عیوب پر استدلال کرنا شروع کر دیں گے اس لئے ایسی علامات کو کتاب میں شامل نہیں کیا گیا۔

باب ماجاء فی حسن العهد

”عن عائشة قالت ما عُرِثَ على احد من ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما عُرِثَ على خدیجہ وما بی ان اکون ادر کتھا وما ذاک إلا لیکثرة ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لھا وان کان لیلذبح الشاة فیکتتبُ بها صدائق خدیجہ فیہدیہا لھن“۔ (حسن صحیح غریب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر اتنی غیرت نہیں آئی جتنی خدیجہ پر آئی اور نہ معلوم میرا کیا حال ہوتا اگر میں ان کو پالیتی، اور یہ غیرت صرف اس بناء پر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بکثرت یاد فرماتے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بکری ذبح فرما لیتے تو خدیجہ کی سہیلیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو بکری (کا گوشت) بے دینے فرماتے۔

لغات:۔ قولہ ”حسن العهد“ عہد کے متعدد معانی آتے ہیں نگہداشت اور دور و زمانہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ علی بنہا حسن عہد کا مطلب یہ ہوا کہ اچھے دور کی یاد۔ قولہ ”ما عُرِثَ“ بکسر الفین غائر کا، خائف، مخافت کی طرح ہے تاہم غار یغار یا ئی ہے اور تخاف یخاف داوی ہے، غیرت کسی مرد کی بیوی کے دوسرے مرد کی طرف میلان یا کسی عورت کے شوہر کے دوسری عورت کی طرف جھکاؤ پر جوش، ناگواری اور غصے کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق پر کبھی اتنا رشک نہیں آیا جتنا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آتا، چونکہ ایک عورت میں یہ چیز فطری ہوتی ہے کہ جب شوہر ایک بیوی سے قرب حاصل کرتا ہے تو دوسری سوکن کو اس پر غصہ آتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اتنا خیال رکھنا کہ ان کو بکثرت یاد فرماتے اور جب کوئی بکری ذبح فرماتے تو اس کے گوشت میں سے ان کی سہیلیوں کے لئے بطور خاص حصہ مقرر فرماتے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کتنا پسند فرماتے اس لئے اگرچہ میں نے ان کو دیکھا تو نہیں تھا مگر اس یادداشت پر جب مجھے اتنا رشک آتا تو نہ معلوم کہ اگر وہ بقید حیات ہوتیں اور میری موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر محبت فرماتے تو میرا کیا حال ہوتا؟ یعنی میں ضرور رشک کرتی، مگر اللہ نے مجھے بچایا کہ میں ان کے زمانے میں موجود نہ تھی۔

عام شارحین نے ”مابہی الخ“ میں ”ما“ کو نافیہ بنایا ہے یعنی یہ رشک اس وجہ سے نہ تھا کہ میں نے خدیجہ کا زمانہ پایا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کثرت سے ذکر کرنے کی وجہ سے تھا، مگر ادھر ترجمہ اور مطلب میں راقم نے اپنے شیخ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ کے ترجمہ کو لیا ہے، کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے اسی طرح ترجمہ و مطلب بتایا تھا۔ واللہ اعلم۔ اگر یہ مطلب صحیح ہو تو حضرت شیخ کی فتاہت کا نتیجہ ہے اور اگر غلط ہو تو پھر میری طرف سے ہے، اور میں یہی کہوں گا کہ میں نے سننے اور سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

مگر عبارت پر غور کرنے سے یہی لگتا ہے کہ ہمارا بیان کردہ مطلب زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگر شارحین کا مطلب ہوتا تو پھر عبارت یوں ہونی چاہئے تھی ”و مابہی ان اکون ادرکتھا الا لکثرة ذکر“ الخ یعنی ”و ماذاک“ درمیان میں نہیں ہونا چاہئے تھا، تاکہ تعلیل صحیح ہو جبکہ ہمارے مطلب پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ”و مابہی ان اکون ادرکتھا“ جملہ معترضہ ہے اور ”و ماذاک الا لکثرة ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لہا“ غیرت کی غلط ہے۔ تدبر۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

ربا یہ مسئلہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ کہنا کہ اگر میں حضرت خدیجہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں بیک وقت مجتمع ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا یعنی غیرت سے کیسے بچتی؟ بلکہ اندیشہ اس میں واقع ہونے کا تھا، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو امہات المؤمنین کی شان کے منافی ہو، کیونکہ غیرت طبعی شے ہے اور امور طبعیہ پر گرفت یا پابندی نہیں ہوتی، ہاں البتہ امور طبعیہ جب بے قابو ہو جائیں تب وہ شرعاً مذموم ہوتے ہیں، قوت غصہ، اور قوت شہوانیہ اور قوت عقیدہ تینوں کے لئے یہی ضابطہ ہے کہ وہ حد اعتدال میں فضائل ہیں جبکہ افراط و تفریط کی صورت میں رذائل بن جاتے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ ہر فضیلت دور ذلتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ مزید تفصیل درکار ہو تو راقم کی کتاب ”نقش قدم“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فی معالی الاخلاق

”عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان من احبکم الی و اقربکم منی محلساً یوم القیمة احاسنکم اخلاقاً و ان من ابغضکم الی و ابعدکم منی یوم القیمة الثرثارون و المتشذبون و المتفہقون، قالوا یا رسول اللہ قد علمنا الثرثارین و المتشدقین، فما المتفہقون؟“

قال: "المتكبرون" ^۱ قال الامام ابو عيسى الترمذی رحمه الله هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه، الثنا هو كثير الكلام، والمتشدد هو الذي يتناول على الناس في الكلام ويلذو عليهم۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ میرے قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہوں گے جو اچھے اخلاق والے ہیں۔ اور مجھے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور سب سے زیادہ مجھ سے دور ہوں گے وہ جو زیادہ باتونی، پُر زور انداز سے بولنے اور طنز کرنے والے اور تھن کرنے والے متکبر ہوں گے۔

لغات :- قولہ "معالي" "معلات" کی جمع ہے قدر و منزلت اور بلندی اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ قولہ "ان من احبكم الي" اس جملے کا تعلق اسی طرح "وان من ابغضكم الي" کا تعلق بعض شارحین نے دنیا کے ساتھ جوڑا ہے، جس کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ اچھے اخلاق کے دوسرے ہیں: ایک دنیا میں محبوبیت اور دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب قیامت میں، اسی طرح بُرے اخلاق کے بھی دو نتائج ہیں: ایک دنیا میں مبغوضیت اور دوسرے آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری۔ جبکہ ترجمہ میں ہم نے یوم القیامۃ کا تعلق دونوں سے جوڑا ہے جس کے مطابق یہ دونوں نتائج آخرت میں ملیں گے گو کہ مالا دونوں تو جیہوں میں فرق نہیں ہے۔

قولہ "الثرثارون" ثرثار کی جمع ہے جس کا مطلب امام ترمذیؒ نے بتلایا ہے یعنی بہت زیادہ بولنے والا۔ قولہ "المتشدقون" متشدق کی جمع ہے اس کے معنی بھی مصنفؒ نے بتلائے ہیں یعنی جو باتوں میں لوگوں پر فخر کرے اور ان کے ساتھ بے ہودہ باتیں کرے، ثرثارون اور متشدقون کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ثرثار وہ ہے جو تکلف باتیں بنائے اور دائرہ حق سے نکل کر بہت زیادہ بولے۔ اور متشدق وہ ہے جو تولے بغیر بولتا رہے اور بولنے میں احتیاط نہ کرے۔ بعض نے کہا کہ تشدق شدق سے مشتق ہے، شدقین باجیہوں کو کہتے ہیں لہذا متشدق وہ ہے جو باتیں کرتے وقت باجیہیں ہلائے تاکہ اپنے کلام کو حاضرین پر زیادہ مؤثر بنائے اور باجیہوں کے اشاروں سے لوگوں پر طنز کرے۔ غرض زبان کو منہ میں پر تکلف انداز سے گھما گھما کر بولنے والا۔

قولہ "المتفیهقون" ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ لفظ فہق الوادی سے ماخوذ ہے جب وادی

باب ماجاء فی معالی الاخلاق

۱۔ رواہ ابیہ احمد فی مسندہ ص: ۲۱۵ ج: ۵ حدیث: ۱۷۴۷۸ رواہ الطبرانی فی المعجم ۱۵۸۱۲ مجمع الزوائد

ص: ۱۳ ج: ۸۰ حدیث: ۱۲۲۶۵ رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترمذی و الترمذی ص: ۴۷۷ ج: ۳

بھر جائے تو اس وقت وہ پہنچے لگتی ہے لہذا متفحص وہ شخص ہوا جو اپنی باتوں میں روانی، فصاحت اور لوگوں پر بڑھائی ظاہر کرنے والا ہو، چونکہ یہ کام تو کوئی کبر سے بھرا ہوا متکبر ہی کر سکتا ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "المتکبرون"۔

تشریح:- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کے لئے جس چیز پر بہت زور دے کر اپنانے کی ترغیب دی ہے بلکہ حکم بھی دیا ہے وہ ہے اچھے اخلاق۔ باب کی حدیث کے علاوہ بہت ساری احادیث میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ اخلاق اچھے ہوں تو آدمی کامیاب ہے ورنہ اخلاق کی خرابی کی صورت میں آدمی تباہی کا شکار ہو جاتا ہے، بالفاظ دیگر اچھے اخلاق آدمی کو مسلسل بلندی پر لے جاتے ہیں جبکہ بُرے اخلاق سے آدمی مسلسل پستی کی طرف گرتا رہتا ہے یہاں تک کہ پست ترین نقطے تک پہنچ جائے۔ والعیاذ باللہ

اخلاق اگرچہ ملکات کا نام ہے مگر ان ملکات کے اثرات آدمی کے ظاہر پر نمودار ہوتے ہیں، اس کی بول چال پر بھی اخلاق کا گہرا اثر ہوتا ہے چنانچہ جس آدمی کے اندر تکبر اور تعلی کا شوق ہوتا ہے وہ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے، وہ مجلس میں کوشش کرتا ہے کہ اپنے ہم نشینوں کو زیر کر دے اور بناوٹ سے بولتا ہے، زبان کو منہ میں گھماتا ہے، الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں اور منہ کی حرکات سے دوسروں کو مرعوب بنانے کی کوشش کرتا ہے، چونکہ یہ سب حرکتیں کبر کے آثار اور تکبر کے زمرے میں آتی ہیں، اس لئے ایسا شخص نہ تو دنیا میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب بن سکتا ہے، اور نہ ہی آخرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل کرتا ہے، کیونکہ وہ اللہ سے دور ہے تو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کیسے ہو سکتا ہے۔

اسی بناء پر عاقل کو چاہئے کہ اللہ کی دی ہوئی استطاعت کے مطابق بولے اس سے زیادہ زور نہ لگائے اور نہ ہی لوگوں پر اپنی فوقیت و برتری ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

تاہم جس آدمی کو اللہ نے بولنے کا ملکہ دیا ہے یا زور قلم سے اس کو نوازا ہے اور وہ بلا تکلف مٹھلی و مسجع عبارات بناتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں وہ کبر کی علامت نہیں بلکہ فصاحت کا نتیجہ ہے، اور چونکہ یہ ممانعت تکبر کی بناء پر ہے لہذا اگر ایک خطیب یا مصنف خیر خواہی کی بناء پر کلام کو مؤثر بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ سن کر یا پڑھ کر عمل کریں تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ گو آج کل یہ نیت مشکل ہی لگتی ہے کہ آج کل عام کاموں میں حُب جاہ زیادہ ملحوظ رہتی ہے، ہوا، مال، اعمال، مالیات و انما لامرئی

باب ماجاء فی اللعن والطعن

”عن ابن عمر قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا یكون المؤمن لعناً.... وَرَوَى

بعضهم... قال لا ینبغي للمؤمن ان ینکون لعناً“۔ (حسن غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔ دوسری روایت میں ”لا ینبغي“ کا لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لعنت کرنا کامل ایمان کے منافی ہے نہ کہ نفس ایمان کے۔

تشریح:۔ لعن اور طعن کی تشریح اور حکم تفصیل سے ”باب ماجاء فی اللعن“ میں گذرا ہے وہیں ملاحظہ ہو۔ تاہم ابن العربی نے اس باب کے ضمن میں لکھا ہے کہ جس صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ”لعن المؤمن کقتله“^۱ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل کرنے سے وہ مقتول کو دنیا سے محروم کر دیتا ہے اور لعنت سے ملعون کو جنت سے تولاً دور کر دیتا ہے اس لئے تشبیہ صحیح ہوئی۔ پھر یہ ممانعت اس وقت ہے جب کوئی شخص بلا وجہ کسی پر لعنت کرے۔ اگر کوئی وجہ ہو تو پھر اس کی عادت مکروہ ہوگی جیسے کسی نے راستہ میں گندگی پھیلائی ہے تو اگر چہ وہ لعنت کا مستحق ہو جاتا ہے مگر لعنت کرنے والے کو بار بار لعنت کرنا مکروہ ہوگا۔

باب ماجاء فی کثرة الغضب

”عن ابی ہریرۃ قال جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: عَلِمْنِی شِئاً وَلَا تُکَثِّرْ

عَلَّی لَعَلَّی اَعِیہ، قال: ”لَا تَغْضَبْ“ فَرَدَّ ذَٰلِكَ مَرَّاراً، کُلَّ ذَٰلِكَ یَقُولُ: لَا تَغْضَبْ“۔^۲ (ہذا حدیث

ع قد مر بخریجہ فی ”باب ماجاء فی زیارة الاخوان“۔ حفظ الرحمن عفی عنہ

باب ماجاء فی اللعن والطعن

۱۔ رواہ البخاری ص: ۸۹۳ ج: ۲ ”باب ما ینہی من السباب واللعن“ کتاب الادب، ایضاً ص: ۹۸۳ ج: ۲ ”باب من

حلف بملۃ سوی الاسلام“ کتاب الایمان ورواہ مسلم فی الایمان حدیث: ۱۷۲ الترغیب والترہیب ص: ۳۱۳۔

باب ماجاء فی کثرة الغضب

۲۔ الحدیث اعرجہ البخاری ص: ۹۰۳ ج: ۲ ”باب المنکر من الغضب“ کتاب الادب۔

(حسن صحیح غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ مجھے کوئی مختصر ہدایت دیں اور مجھے ارشاد کی زیادہ باتیں نہ کیجئے شاید کہ (وہ مختصر نصیحت) میں یاد رکھ سکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غصہ نہ کرو، اس شخص نے بار بار (تین بار) اپنا سوال دہرایا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مرتبہ یہی فرماتے کہ غصہ نہ کر۔

لغات: - قولہ ”عَلَّمَنِي شَيْئًا“ شی سے مراد مختصر اور قلیل نصیحت ہے۔ اور کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے لئے بطور خاص کوئی مفید ترین بات ارشاد فرمائیے۔ قولہ ”وَلَا تَكْثُرْ“ اکثر سے ہے یعنی زیادہ اشیاء نہ بتائیں کیونکہ ”لَعَلِّي أَعْبَهُ“ اے احفظہ تاکہ وہ مختصر بات میں یاد رکھ سکوں جبکہ زیادہ باتیں یاد رکھنا مشکل ہوتی ہیں۔ قولہ ”فَرَدَّدَ ذَلِكَ مِرْرًا“ اس آدمی نے اپنا سوال دوبارہ و سہ بارہ دہرایا۔ شاید وہ اتنا مختصر بھی نہیں چاہتا تھا۔ یا مطلب یہ تھا کہ اس کے لئے غصہ سے بچنا مشکل تھا اس لئے متبادل کا مطالبہ کر رہا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ مفید تر کا مطالبہ کر رہا ہو۔

تشریح: - آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حکیم تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے مناسب حال علاج کرتے اور سالکین کو ان کی ضرورت و حالت کے مطابق جواب عنایت فرماتے۔ تو جس طرح ایک طیب مریض کی حالت دیکھ کر مناسب مرض وادیتا ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف سالکین کے ایک ہی سوال کے مختلف جوابات مروی ہیں۔

حدیث بالا میں سالک نے جو سوال پوچھا شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال سے یا بات کرنے کے انداز سے یا دیگر قرآن سے معنوم کیا ہو کہ اس کو غصہ جلد یا زیادہ آتا ہے۔ مثلاً ”وَلَا تَكْثُرْ عَلَيَّ“ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ لگا لیا ہو وغیرہ۔ چونکہ ہر فضیلت کی بنیاد میں ایک قوت و دلیعت کی گئی ہے جن کی تعداد اصول کے اعتبار سے تین ہے: قوت غصیبہ، قوت شہوانیہ اور قوت عاقلہ۔ تاہم ان قوتوں میں افراط و تفریط عیوب ہیں جبکہ درجہ اوسط عین کمال ہے اس لئے کہا جائے گا کہ ہر فضیلت دو رذیلوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس لئے حدیث کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اسے غضب اور غصہ جوڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ یہ نہ تو ممکن ہے کیونکہ یہ امر طبعی و جبلی ہے اور نہ ہی مطلوب شرعی ہے جبکہ شریعت تکلیف بما لا یطاق یا تکلیف لا یعنی نہیں دیتی، اس لئے مطلب یہ ہے کہ غصہ زیادہ مت کرو یعنی غصہ کو قابو کرنے کی کوشش کرو! کیونکہ غصہ جب تک

عقل اور شریعت کے دائرے کے اندر ہوتا ہے تو یہ ممدوح و محمود ہے مگر اس دائرے سے نکلنے کے بعد اس کی بُرائی میں کوئی شک نہیں۔ زیادہ غصہ عموماً آدمی کو دائرہ عقل و نقل سے باہر کر دیتا ہے۔ پھر قباح کار تکاب تقریباً یقینی ہو جاتا ہے۔

غصے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کے نقصانات کیا ہیں؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟ اگر ان سوالات کے جوابات درکار ہوں تو (دیکھئے راقم کی کتاب ”نقش قدم فصل ۸ غضب و غصہ، باب دوم رؤا کے بیان میں) یہاں زیادہ تفصیل مُمل ثابت ہو سکتی ہے۔

باب ماجاء فی کظم الغیظ

ہندی نسخوں میں یہاں باب کا عنوان نہیں ہے بلکہ یہ حدیث گذشتہ باب کے ضمن میں ذکر کی گئی ہے۔
 ”عن سهل بن معاذ بن انس الجهني عن ابيه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كظم غيظاً وهو يستطيع ان ينفذه دعاه الله يوم القيامة على رؤس الخلائق حتى يعيره في آفة الحور شاء“۔ (حسن غریب) ۱

حضرت معاذ بن انس جہنی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے غصہ ضبط کر لیا در اس حالیکہ وہ اس کی تکفید پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے نکال کر (اعزاز سے اتانوازیں گے کہ) اسے اختیار دیں گے کہ وہ جس حور کو چاہے لے لے۔

لغات:۔ قولہ ”کظم الغیظ“ کظم اصل میں بھرے ہوئے مشکیزے کے منہ کے باندھنے کو کہتے ہیں جبکہ غیظ غصہ کو کہتے ہیں۔ تو کظم الغیظ کا مطلب غصے کو ضبط کرنا اور قابو کرنا ہوا۔ چونکہ آدمی غصے سے بھر جاتا ہے پھر جب خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو گویا اس نے بھرے ہوئے مشکیزے کی طرح سب کچھ اندر ہی اندر بند کر دیا۔
 قولہ ”ان ينفذه“ بتقدیر الفاء باب تفعل سے ہے۔ جبکہ باب افعال سے یعنی قاء کی تخفیف کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ”وهو ينفذ على الفاء“ آیا ہے (مکرر واد)

باب ماجاء فی کظم الغیظ

۱۔ رواہ ابوداؤد ابیہاً ص: ۱۱۱ ج: ۲ ”باب من کظم غیظاً“ کتاب الادب و سنن ابن ماجہ ص: ۳۰۸ ”باب العلم“ ابواب الزهد۔

ابن ابی الدنیا، کذا فی التلخیص) یہ جملہ حالیہ ہے یعنی وہ اس حال میں غصے کو ضبط کر لے جبکہ وہ اس کے مطابق عمل کرنے پر قدرت رکھتا ہو مثلاً کسی کمزور نے غصہ دلایا ہو اور وہ اس سے انتقام لے سکتا ہو مگر نہ لے۔ قولہ ”دعاه اللہ“ الخ یہ جواب شرط ہے یعنی جس نے غصہ باوجود قدرت کے پی لیا تو اللہ عزوجل قیامت کے روز اسے سب لوگوں کے سامنے بلائیں گے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں غصے کو ضبط کرنے اور پی جانے کی بہت بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ تاہم چونکہ غصہ آنے کی صورت میں آدمی کی دو حالتیں ہوتی ہے ایک یہ کہ غصہ کسی طاقت ور پر آ جائے ایسے میں تو غصہ نافذ نہیں ہو سکتا اور عموماً لوگ غصہ پی جاتے ہیں یعنی انتقام نہیں لیتے، مگر یہ کوئی شرعی کمال کی بات اور اتنی فضیلت نہیں کیونکہ یہ ایک مجبوری ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جو حدیث بالا میں بیان ہوئی کہ انتقام کی قدرت ہو مگر آدمی صبر کرے اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب غصہ اپنے سے کمزور پر آ جائے۔ چونکہ عموماً لوگ ایسے میں مغضوب علیہ کی خوب خبر لیتے ہیں اور دل کی بھڑاس کو نکالتے ہیں لیکن ان ہی لوگوں میں سے اگر کوئی بندہ خدا اپنے نفس کی خواہش کے برعکس اللہ کے لئے انتقام کا جذبہ ترک کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کا کام اور للہیت کی دلیل ہے، اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب لوگوں جہاں انسانوں، فرشتوں اور جنات کا ناقابل تصور رش ہوگا سامنے لا کر اس کے کردار کو سراہا جائے گا پھر اسے حور عین میں انتخاب کرنے کا اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنی پسند کی حور عین لے کر جنت میں داخل ہو۔

ملا علی قاریؒ مرقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ فضیلت تو صرف غصہ ضبط کرنے پر ہے تو اگر وہ اس کے ساتھ معاف بھی کر دے اور مزید انعام بھی دے دے تو ایسے شخص کا کیا حال ہوگا؟

اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے: ”وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“۔ (آل عمرانؑ)

لیکن یہاں پر بھی یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر فضیلت دو روزیتوں کے درمیان ہوتی ہے لہذا یہاں بھی درجہ اوسط محمود ہے یہ نہیں ہونا چاہئے کہ غصے کے مقتضی پر چلنے کا جہاں حکم ہے اور عقل جس کو مقتضی ہے وہاں بھی غصہ نہ آئے کیونکہ یہ کوئی فضیلت نہیں بلکہ رذیلیت اور بے غیرتی ہے جو شرعاً معیوب اور مذموم ہے۔ مزید تفصیل

کے لئے (دیکھئے نقش قدم فصل: ۹ کظم غیظ، باب سوم فضائل کے بیان میں)

ابن العربیؒ نے بھی عارضۃ الاحوذی میں یہی بات کی ہے وہ لکھتے ہیں:

”فإذا كان الغضب لله فهو من الدين وقوة النفس في الحق في الغضب قبول
الكفار واقامت الحدود وذهبت الرحمة على اهل ذلك في القلوب وهذا
يوجب ان يكون القلب عاقلاً والبدن عاملاً بمقتضى الشرع يسترسلان اذا
ارسلهما ويمسكان اذا أمسكهما“ الخ۔

باب ماجاء في إجلال الكبير

”عن انس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما اكرم شابٌ شيخاً بلبينه
الإقيض الله له من يكرمه عند بيته“۔ (هذا حديث غريب)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
کوئی جوان کسی بوڑھے کی قدر اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کرتا ہے تو اللہ اس کے لئے ایسے شخص کو مقرر کر دیتے
ہیں جو بڑھاپے میں اس کی قدر کرے گا۔

لغات: بقولہ ”إجلال الكبير“ بزرگ و عمر رسیدہ کی قدر کرنا۔ بقولہ ”شاب“ بچہ یا الباء جوان۔
بقولہ ”لبينه“ ”ای لاجل منه“۔ بقولہ ”أقيض“ بچہ یا الباء بمعنی سَلَط مسلط اور مقرر کرنا۔ بقولہ ”عند بيته“ ”ای
عند يكرمه“ یعنی بڑھاپے میں۔

تشریح:۔ اس روایت میں ابوالرجال نامی راوی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ بچہ یا الباء صحیح ہے اگرچہ
بتنقیف الجیم جیسا کہ اس سند میں ایک راوی ہے جو کہ ثقہ ہے مگر یہاں بالباء ہی ہے جو ضعیف ہے۔ واللہ اعلم
محمی نے نقل کیا ہے کہ کسی بوڑھے کا اکرام جو اس فضیلت کا باعث ہے یہ شخص بڑی عمر کی وجہ سے
مراد ہے حتیٰ کہ اگر کافر عمر شخص کی قدر محض اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کی تو بھی یہ فضیلت حاصل ہوگی، ظاہر ہے
کہ جب نفس بڑھاپے کی قدر دانی پر اتنا بڑا انعام ملتا ہے تو جب کسی مسلمان بزرگ کا اکرام کیا جائے تو اس
کا ثواب اور انعام تو بطریق اولیٰ ملے گا بھی اور زیادہ بھی ہوگا۔

اس کا مشاہدہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ بعض اہل علم کو کہ علمی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں مگر ان کو دیکھا گیا

ہے کہ ان کی خدمت پر اپنے شاگرد نمبر مقرر کر دیتے ہیں اور یہ کام بڑی خوشی سے کرتے ہیں کیونکہ اس مخدوم استاذ نے بھی اپنی طالب علمی کی عمر میں اپنے اساتذہ کی خدمت و قدر کی تھی۔

نیز اس حدیث میں یہ بھی خوشخبری ہے کہ بوزھوں کا اکرام کرنے والا جوان بڑی عمر پائے گا کیونکہ بڑھاپے میں مخدوم ہونا بڑی عمر پر موقوف ہے۔

باب ماجاء فی المتہاجرین

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: تُفْتَحُ ابواب الجنۃ یوم الاثنين والخمیس ۱ فبغفر فیہما لمن لا یشرک باللہ إلا المتہاجرین بقول: زُکُوا هَذَینِ حَتَّى یَصْطَلِحَا“۔ (هذا حدیث حسن صحیح) ۲

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھول دیئے جاتے ہیں، پس ان دونوں دنوں میں ہر اس شخص کی مغفرت کی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا ہو مگر قطع تعلق کرنے والے دونوں کی نہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں (کے اعمال) کو لوٹا دو یہاں تک کہ صلح کر لیں۔

لغات:۔ قولہ ”المتہاجرین“ اس کی شرح امام ترمذیؒ نے خود فرمائی ہے، یعنی ”المصارمین“، صرم سے بمعنی قطع کے ہے محشی لکھتے ہیں کہ اس تفسیر کا مطلب شاید یہ بتانا ہے کہ سفر وغیرہ کی وجہ سے جو جدائی ہوتی ہے وہ مذموم نہیں بلکہ تعلق ختم کرنا اور بات چیت اور ملاقات نہ کرنا مذموم ہے جو یہاں مراد ہے۔

تشریح:۔ کسی مسلمان بھائی سے قطع تعلق اور بات چیت بند کرنے کے متعلق ضروری تشریح ”باب ماجاء فی کراہیۃ الکفر للمسلم“ میں گزر چکی ہے وہیں پر ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں صرف اس حدیث باب سے متعلق شرح اور وضاحت پیش ہے۔ پیر اور جمعرات کے دنوں میں جنت کے دروازوں کے کھولے جانے کا مطلب کیا ہے؟ تو اس میں شارحین حدیث کے متعدد اقوال ہیں

باب ماجاء فی المتہاجرین

۱۔ الحدیث أخرجه مسلم فی البر حدیث: ۳۳ و ۳۶ و مالک فی حسن الخلق حدیث: ۸۰۱، ايضاً روی ابو داؤد و ابن ماجہ بسنحوۃ، الترغیب والترہیب ص: ۳۰۶ ج: ۳، ايضاً راجع للتفصیل مجمع الزوائد ص: ۷۹ تا ۸۱ ج: ۸، کتاب الادب۔ حفظہ الرحمن الحنفی ندوة العلم

جن کو مجموعی طور پر دو قولوں کی طرف راجع کیا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ حدیث ظاہر پر محمول ہے اور جنت سے معنی حقیقی مراد ہے، چونکہ آدمی کے اعمال جنت میں جا کر جسم مثالی کے ساتھ متشکل ہو جاتے ہیں کوئی نہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کوئی محل کی، اور کوئی حور عین کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کوئی درخت کی وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اعمال آدمی سے پہلے ہی جنت میں پہنچ جاتے ہیں گو کہ نامہ اعمال میں بھی اس کا ریکارڈ رہتا ہے۔ تدبیر

دوم یہ کہ اسے مجاز پر محمول کیا جائے یعنی مطلب یہ ہے کہ ان دو (۲) ایام میں مسلمانوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کے لئے پیش ہوتے ہیں، چونکہ وہاں قبول ہونے کے بعد ان پر جنت ملتا ہے اس لئے گویا ذکر لازم والمراد منہ الملوذوم کے طور پر جنت کا اطلاق اس پر کیا گیا گو کہ اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں۔ بہر حال یہاں دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ اعمال پیر اور جمعرات کو پیش ہوتے ہیں یعنی ہر تین دنوں کے بعد گو کہ یومیہ اعمال بھی پیش ہوتے رہتے ہیں مگر یہ خصوصی پیش ہوتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یومیہ اعمال عالم بالا کی ایک مخصوص حد تک جاتے ہوں وہاں سے آگے پھر پیر اور جمعرات کو جاتے ہوں، بنا برہر تقدیر حدیث سے پیر اور جمعرات کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ قطع کلامی کی رخصت تین دن تک ہے زیادہ کی نہیں ہے جیسا کہ پہلے گذرا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ بد باطنی یعنی رذائل اخلاق اور خصوصاً حسد کی منحوس تاثیر اتنی قوی ہے کہ اس سے اعمال مسترد کر دیئے جاتے ہیں گویا یہ اعمال کو جلا تا رہتا ہے۔ لہذا اگر کسی سے اختلافات آ بھی جائیں تو نہ ان کو طول دینا جائز ہے اور نہ ہی دل کو ان کے لئے مستقل ٹھکانہ بنانا جائز ہے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اولاً تو دل شیشے کی طرح صاف ہو، تاکہ ایمان کے انوارات منجلی ہوں۔ مگر بصورت مجبوری ان امراض کا جلد علاج کرنا اور کرنا از حد ضروری ہے کہ جب دل بگڑ جاتا ہے تو انسان ہلاک ہی ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی الصبر

”عن ابی سعیدان ناسأمن الانصار سألوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاعطاهم ثم سألوا فاعطاهم ثم قال ما یكون عندی من خیر فلن اذخره عنکم، ومن یستغن یغنه اللہ، ومن یتضعف یغفہ اللہ، ومن یتصبر یصبرہ اللہ، وما أعطی احدا شیئاً هو خیر وأوسع من الصبر“۔^۱

حضرت ابوسعید (خدری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار کے کچھ لوگوں (صحابہ) نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے (مال کا) سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دے دیا انہوں نے پھر مانگا آپ نے مزید عطا کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے پاس کوئی بھلی چیز ہوگی تو وہ میں تم سے نہیں روکتا (مگر بات یہ ہے کہ) جو شخص اپنے آپ کو (لوگوں کے مال سے) بے نیاز بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو بے نیاز بناتا ہے، اور جو شخص خود کو پاک بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو پاک بناتا ہے، اور جو شخص خود کو صبر پر آمادہ کرتا ہے تو اللہ اس کو صبر نصیب کرتا ہے، اور کسی کو صبر سے زیادہ بہتر اور زیادہ وسیع چیز نہیں دی گئی ہے۔

یہاں روایات میں دو قسم کے الفاظ آئے تھے ایک ”فلن اذخرہ“ اور دوسرا ”فلن اذخرہ“ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ان دونوں کا مطلب و معنی ایک ہی ہے۔ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں، کہ کہنے کا مقصد نفی الذخار مطلقاً ہے یعنی جیسے ماضی میں کوئی چیز میں نے ذخیرہ کر کے نہیں رکھی ہے اسی طرح مستقبل میں بھی نہیں کروں گا۔ لہذا ”فلن اور فلن“ دونوں اس مطلب میں برابر ہیں۔ (کذا فی الکوکب الدری)

لغات:- قولہ ”الصبر“ اگر صلہ میں ”علی“ آجائے جیسے ”صبر علی الامر“ تو معنی ”برداشت کرنے، ہمت سے کام لینے کے ہوتے ہیں“۔ اور اگر صلہ میں ”عن“ آجائے تو معنی ”روکنے اور باز رکھنے کے آتا ہے“۔ اور اگر ”بغیر صلہ“ کے آجائے جیسے ”صبر بنفسہ“ تو اس کے معنی ”دل تھامنے اور نفس کو قابو میں رکھنے کے آتے

باب ماجاء فی الصبر

۱۔ الحدیث المخرجه البخاری ص: ۹۵۸ ج: ۲ ”باب الصبر عن محارم اللہ الخ“ کتاب الرقاق، ابصار رواہ فی الزکاة باب ۵۰۰، ورواہ مسلم فی الزکاة ص: ۳۳۷ ج: ۱ کتاب الزکوة، ابو داؤد ص: ۲۳۹ ج: ۱ ”باب فی الاستغفار“ کتاب الزکوة، سنن دارمی ص: ۲۷۳ ج: ۱ کتاب الزکوة باب: ۱۸، وموطا مالک ص: ۳۴۴ صلیہ باب: ۷، مسند احمد ص: ۳۸۵ ج: ۳ حدیث: ۱۰۷۰۷۰، ایضاً ص: ۵۲۰ ج: ۳ حدیث: ۱۱۳۸۰ والنسائی ص: ۳۶۲ ج: ۱ الاستغفار عن المسألة، کتاب الزکوة.

ہیں۔

قولہ ”من صبر“ کو کب میں ہے کہ یہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی خیر کو شامل ہے لہذا علم اور مال دونوں مراد ہوئے۔ قولہ ”ومن يستغن“ الخ ان صیغوں میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جو آدمی خود کو لوگوں سے مستغنی کرنے کی کوشش کرے گا، کہ ضرورت کے باوجود سوال نہ کرے اور خود کو سوال سے پاک بنانے کی کوشش کرے کہ باوجود ضرورت کے سوال کی گندگی سے دور رہے اور خود کو صبر پر مجبور اور آمادہ کرے یعنی باوجود رخصت سوال کے صبر کرے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس میں یہ صفات پیدا کر ہی دے گا بایں طور کہ وہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائیں گی۔

تشریح:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت استاذ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مسلسل تربیت فرماتے، کوئی موقع تعلیم دین اور تہذیب اخلاق سے خالی نہ گذرتا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی جب انہوں نے کوئی چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمادی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توجہ رخصت سے عزیمت کی طرف مبذول کرادی کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو غیر اللہ کی طمع اور لالچ سے بالکل خالی کر دے، اگر اس کے اندر یہ صفت ذاتی نہیں تو بحکف فضائل اپنانے کی کوشش کی جائے، ایک وقت ایسا آجائے گا کہ جب یہ فضائل اس کے اخلاق بن جائیں گے۔ چنانچہ اگر ایک آدمی لوگوں کے مال اور دولت و عزت سے بے نیاز و مستغنی ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس کی مشق کرے، اسی طرح پاک بازی اور صبر کو اپنانے کا طریقہ ہے۔

یاد رہے کہ انسان میں دو طرح کے ملکات ہوتے ہیں: (۱) ذاتیہ۔ (۲) فاضلہ۔ ذاتی ملکات: تو وہ ہیں جو انسان کی جبلت اور فطرت میں ودیعت کئے گئے ہوں۔ جبکہ ملکات فاضلہ کسب اور تحصیل سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ لہذا اگر ایک آدمی میں کوئی فضیلت و اخلاق بطور ودیعت کے نہیں پایا جاتا تو وہ اسے بحکف اپنانے کی کوشش کرتا رہے تو وہ صفت اس کی طبیعت بن جائے گی۔ اخلاق اگرچہ اصلا وہ ہیں جو فطری ہوں مگر مجاہدوں سے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مزید تفصیل راقم کی کتاب ”نقش قدم“ میں دیکھی جاسکتی ہے، (فصل نمبر ۱) اخلاق فطری چیز ہے، اور کیا اخلاق میں ذاتی سعی کا دخل ہے، اور اخلاق حسنہ اپنانے کا عملی طریقہ، عنوانات کے تحت ملاحظہ ہو۔ (باب اول)

امام ترمذی نے یہ باب صبر کی فضیلت کے بیان میں قائم کیا ہے جس کے فضائل قرآن و سنت میں اسنے

زیادہ بیان ہوئے ہیں کہ اگر ان کا احاطہ ممکن بھی ہو تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

اجمالاً اتنی سی بات عرض ہے کہ صبر وہ بہترین خداداد نعمت ہے۔ کہ اس کا شروع نہ صرف آخرت میں ملنے کا قوی امکان ہے بلکہ دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل کئے جاسکتے ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ جس آدمی نے بھی کسی مسئلہ میں صبر سے کام لیا ہے اس کو ناقابل تصور خوش نصیب ہوئی ہے۔ جتنی برداشت زیادہ ہوگی اسی تناسب سے ثمرات بھی زیادہ ہوں گے۔ راقم کو اس کا بار بار تجربہ رہا ہے اور جب بھی صبر کے ثمرات آنا شروع ہوئے تو ایک حسرت سی بھی دل میں رہی کہ کاش برداشت میں تھوڑی بہت جو کوتاہی ہوئی ہے وہ بھی نہ ہو جاتی تو آج بھر پور ثمرات ملتے۔

صبر کے تین درجے ہیں: (۱) ”صبر علی الطاعة“ یعنی نیکیوں کی ادائیگی۔ (۲) ”صبر عن المعصية“ گناہوں سے بچنا اور (۳) ”صبر علی الاذى“ یعنی تکلیف کو برداشت کرنا۔ چونکہ ان تینوں حالتوں میں نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لئے گویا ان میں نفس کو روکنا پڑا اس لئے ان کو صبر کہا جاتا ہے، طاعت میں نفس سست اور کامل ہو جاتا ہے جسے تیز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ گناہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے جسے لوٹانا پڑتا ہے اور تکلیف کے وقت حواس باختہ ہو جاتا ہے جس کی اصلاح کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر آسودہ حالی کے مقابلہ میں بد حالی پر صبر کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ خوش حالی اور مال داری میں بالآخر آدمی مال اور خواہشات کا غلام بن ہی جاتا ہے الا ماشاء اللہ۔

عارضہ الاحوذی میں ہے:

”قال الصحابة في الحديث الصحيح: أبتلينا بالضراء فصبرنا، وأبتلينا بالسراء فلم

نصبر، وقد قال العلماء يصبر على البلاء كل مؤمن ولا يصبر على العافية

إلا بصديق۔“

غرض مال آجائے تو آزمائش سخت ہو جاتی ہے اس لئے عاقل کو چاہئے کہ اس کی طرف زیادہ نہ جھکے۔
انام غزائی فرماتے ہیں: کہ دنیا سانپ کی مانند ہے اس سے وہی کھیل سکتا ہے جو اس کے زہر سے بچ سکتا ہو، آدمی سپیرا نہ ہو اور مال سے کھیلے گا تو ہلاک ہوگا۔

باب ماجاء فی ذی الوجھین

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان من شر الناس عند اللہ یوم

القیمة ذالوجھین“۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے بُرا شخص اللہ کے نزدیک وہ ہوگا جو دُورِ خِ والہ ہو۔ (یعنی دُورِ خال اور منافق) لغات:۔ قولہ ”ذالوجھین“ ملغوی اعتبار سے تو ذالوجھین کے معنی دو چہروں والا شخص ہے مگر عرف میں اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے دو روپ ہوں، جب سامنے آتا ہے تو دوستی کا روپ دھار لیتا ہے اور جب رخصت ہو کر چلا جاتا ہے تو روپ بدلتا ہے، اور یہی طریقہ اس کے مخالف کے ساتھ کرتا ہے گویا وہ دو مخالف آدمیوں کے درمیان مسلسل بھیس بدلتا رہتا ہے سامنے آئے تو دوست لگے جب پیٹھ پھیرے تو دشمن بنے۔ (کما عند البخاری) ”الذی ہانی ہولاًء بوجہ و ہولاًء بوجہ“ (۱)

تشریح:۔ دورِ خِ ایسی بیماری ہے جو کئی امراض کا مجموعہ ہے اس لئے اس پر مندرجہ بالا سخت وعید آئی ہے۔ دورِ خِ میں چونکہ ظاہر اور باطن میں تضاد ہوتا ہے اس لئے اس پہلو سے یہ منافقت ہے، جبکہ ایسا شخص ہر دو فریقین سے وہ بات کرتا ہے جس سے نفرت میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ اس کا چغلی والا پہلو ہے۔ پھر منافرت کے اضافے کی صورت میں نوبت عملی جھگڑوں تک جا پہنچتی ہے تو اس اعتبار سے یہ فساد فی الارض ہے اور خیر خواہی کا تاثر دے کر وہ دوسروں کے اسرار اور راز تک پہنچانا چاہتا ہے تو یہ خیانت بھی ہے، اس لئے ایسا شخص بدترین سلوک کا سزاوار ہوگا۔

چنانچہ ابوداؤد وغیرہ میں ہے: ”من کان لہ وجھان فی الدنیا کان لہ یوم القیمة لسانان من نار“۔ (ابوداؤد ص: ۳۱۴ ج: ۲، الادب المفرد ص: ۶۳۳) (۲)

عارضہ میں ہے کہ دین صرف ایک ہی حالت پر ہوتا ہے یعنی حق، جبکہ یہ شخص دین کے مزاج اور اصول

باب ماجاء فی ذی الوجھین

۱۔ رواہ البخاری ص: ۳۹۶ ج: ۱ ”باب المناقب“ کتاب المناقب، ایضاً أخرجه فی الادب باب: ۵۲، وفی الاحکام باب: ۴۷، وصحیح مسلم ص: ۳۴۵ ج: ۲ ”باب ذم ذی الوجھین الخ“ ابواب البر والصلة وموطا مالک ص: ۳۳۷ ”باب ماجاء فی اضاعة المال وذی الوجھین“ کتاب الجامع۔

۲۔ ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۳۷۱ ج: ۳۔

کے خلاف چلتا ہے، ہاں اگر بطور تقیہ کے سخت مجبوری میں آدمی اپنے دل کا راز چھپا کر دوسری بات ظاہر کر دے جس سے مراد اپنی حفاظت ہو یا کسی دوسرے مسلمان کی حفاظت ملحوظ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح اصلاح ذات البین کا بھی حکم ہے جس کی تفصیل پہلے ”باب ماجاء فی اصلاح ذات البین“ میں گذری ہے۔

دورخی اور اصلاح ذات البین میں فرق واضح ہے کہ دور خا شخص کی کوشش اختلافات کو ہوا دینا ہوتی ہے اس لئے وہ ہر فریق کے موقف کو درست کہہ کر اس کو بھڑکاتا ہے، جبکہ اصلاح ذات البین کرنے والے کی نیت اس کے برعکس اختلافات کو کم کرنے یا ختم کرنے کی ہوتی ہے اس لئے وہ ہر فریق کو اپنی باتوں سے ٹھنڈا کرتا ہے، لہذا دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ ”وانما الاعمال بالنیات“

جہاں تک تقیہ کا تعلق ہے تو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے تفسیر روح المعانی میں (سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸) ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ کی تفسیر میں لکھا ہے: ”وفی الایۃ دلیل علی مشروعیۃ التقیۃ وعرفوہا بمحافظۃ النفس او العرض او المال من شر الاعداء“۔ پھر دشمن کی بھی دو قسمیں بنائی ہیں اور تقیہ کی بھی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اگر آدمی کے دین کو خطرہ ہو تو وہاں سے ہجرت کر کے اپنا دین بچانا لازمی ہے۔ مگر ہجرت پر عدم قدرت کی صورت میں مخالفین کی ظاہری موافقت بقدر ضرورت جائز ہے بشرطیکہ وہ ہجرت کی کوششوں میں مصروف ہو، ہاں اظہار مذہب عزیمت ہے اگر وہ اس پر مارا جاتا ہے تو شہید ہوگا۔ تقیہ کے بارے میں خوارج اور شیعہ افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں، خوارج اس کے جواز کے منکر ہیں جبکہ شیعہ نے اس میں بہت تساہل سے کام لیا ہے جس کی تفصیل روح المعانی میں ہے۔

باب ماجاء فی النمام

”عن ہمام بن الحارث قال مر رجل علی حذیفۃ بن الیمان فقیل لہ: ان هذا یبکغ الامراء الحدیث عن الناس، فقال حذیفۃ: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ”لا یدخل الجنۃ قتات“^۱ قال سفیان: والقتات النمام۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

باب ماجاء فی النمام

۱ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۹۵ ج: ۲ ”باب ما یکرہ من النمیمۃ“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۷۰ ج: ۱ کتاب الایمان، سنن ابی داؤد ص: ۳۲۰ ج: ۲ ”باب فی القتات“ کتاب الادب.

ہام بن الحارثؓ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے ایک شخص گزرا، تو ان (حذیفہؓ) سے کہا گیا کہ یہ شخص لوگوں کی باتیں نکام تک پہنچاتا ہے تو حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قتات جنت میں داخل نہیں ہوگا، راوی حدیث امام سفیانؒ فرماتے ہیں کہ قتات کے معنی نمام یعنی چغلی رکے ہیں۔

لغات:۔ قولہ "النعمان" نسیم سے ہے جس کے معنی "نقل کلام الغیر لئلا ضرار والافساد" کے ہیں، یعنی جو شخص کسی کی بات سن کر اسے دوسروں تک پہنچائے اور مقصد نقصان پہنچانا اور فساد برپا کرتا ہو۔ اور اگر مقصد نیک ہو جیسے اصلاح ذات البین تو وہ جائز ہے کیونکہ ایسی صورت میں وہ بات کو اچھی صورت ہی دے گا جبکہ چغلی میں وہ لگائی بھجائی کرے گا۔ قولہ "قتات" اس کے معنی وہی ہیں جو راوی حدیث نے بیان کئے ہیں۔ تاہم قتات اور نمام میں لغوی اعتبار سے یہ فرق ہے کہ نمام لوگوں میں بیٹہ کر زبوں سن کر بات کو نقل کرتا ہے جبکہ قتات چوری چھپے سنا ہے اور پھر نقل کرتا ہے گویا تجسس کرتا ہے۔ مگر بعض حضرات اس فرق کے قائل نہیں ہیں۔^۱

تشریح:۔ چغلی ری گناہ کبیرہ ہے اور اصلاح ذات البین کے مقابل رد اہل اخلاق میں سے ہے اس کی مذمت قرآن و سنت دونوں میں کی گئی ہے اس سلسلے میں ایک حدیث ترمذی جلد اول، ابواب الطہارت میں گذری ہے۔ اور بخاری شریف وغیرہ میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبروں کے بارے میں فرمایا کہ ان کو عذاب ہو رہا ہے... ان میں سے ایک پیشاب سے نہیں پچتا تھا اور دوسرا چغلی لئے پھرتا تھا۔^۲ (دیکھئے باب التثدیدی فی البول، تشریحات ص: ۲۳۷ ج: ۱)

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ زمین میں فساد کو ہرگز پسند نہیں فرماتا اس لئے جو شخص لوگوں کو باہم لڑاتا ہے وہ سخت ترین عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ چغلی سے دو خاندان بلکہ کبھی دو قبیلے فساد کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اس لئے شریعت نے اس پر سخت پابندی عائد کی ہے۔

حدیث بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ چغلی جنت میں داخل نہیں ہوگا یہ ایسا ہی ہے جیسے تکبر کے بارے میں

ع قال الحافظ: القات والنعمان بمعنى واحد وقيل النعمان الذي يكون مع جماعة يتحدثون حديثاً فبهم عليهم والقتات الذي يصح عليهم وهم لا يعلمون ثم ينم، الترغيب والترہیب ص: ۳۲۳ ج: ۳۔

مع الحديث أخرجه البخاري باب: ۵۵ و ۵۶ كتاب الوضوء، وفي الجنايز باب: ۸۹ وفي الادب باب: ۴۹، ورواه مسلم في الطهارة حديث: ۱۱۱، وابوداؤد في الطهارة باب: ۱۱، والنسائي في الطهارة باب: ۲۶، وابن ماجه في الطهارة

باب: ۲۶، بحوالہ الترغيب والترہیب ص: ۳۲۳ ج: ۳۔

”باب ماجاء فی الکبر“ میں گزرا ہے۔ فلیراجع۔ چغلخوری کی مزید تفصیل ”نقش قدم کامل یا نقش اخلاق“ میں چغلخوری کے عنوان کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔ فصل اول، زبان کی تباہ کاریوں میں۔

مخبری اور جاسوسی :- حدیث باب میں جاسوسی کو چغلخوری کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ شخص حکومت وقت کی طرف سے اس کام پر مقرر نہ ہو بلکہ اپنی ذاتی شرارت کی وجہ سے لوگوں کے عیوب یا حکومت مخالف نظریات سے حکام کو آگاہ کرتا رہتا ہو، اگر یہ صورت تھی تو پھر تو بلاشبہ یہ چغلخوری اور مذموم ہے۔ لیکن اگر حکومت وقت کی طرف سے مقرر ہو تو اس میں دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ حکومت ظالمانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو اور مخالفین کو کچلنے کے لئے جاسوس مقرر کرتی ہو اور پھر یہ چلنے پر لوگوں کو ظلم کا نشانہ بناتی ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا اور ظلم کے مخالفین جو عدل کا مطالبہ کرتے ہوں، ان کی مخبری کرنا ظلم اور عدوان میں تعاون ہے اس لئے یہ صریح حرام ہے چونکہ بنو امیہ کے بعض حکمران اپنے مخالفین کو ادنیٰ شبہ ہو جانے پر قتل کرتے تھے اس لئے یہ وہی صورت بن گئی کہ ان کے لئے جاسوسی کرنا ظلم میں مدد کرنا تھا۔

اگر حکومت اسلامی اصولوں پر کار بند ہو اور عدل و انصاف کی راہ پر گامزن ہو مگر وہاں بعض لوگ حکومت کو گرانے کے لئے غیر اسلامی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے مخالفت کرنے اور اس کے لئے لوگوں کی ذہن سازی کرنے میں مصروف ہوں یا غیر مسلم کے ساتھ ان کے روابط ہوں تو ایسے میں ان کے مذموم عزائم روکنے کے لئے تجسس کرنا اور ان کی سرگرمیوں سے حکومت کو آگاہ کرنا مذموم نہیں بلکہ ایک مستحسن اقدام ہے۔

اسی طرح کافروں کے لشکر میں جا کر یا ان کے ملک میں جا کر اسلامی حکومت کو غیر مسلم سرگرمیوں سے آگاہ رکھنا بھی جائز ہے بلکہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کی فضیلت کے لئے باب قائم کیا ہے:

”باب فضیلة الطلیعة معن جابر قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یاتینی

بعبیر القوم یوم الاحزاب فقال الزہرانا“۔ الحلیث، (بخاری ص ۳۹۹ ج ۱)

البتہ اگر جاسوس کفار کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی کرے اور پکڑا جائے تو اسے قتل بھی کیا جاسکتا

ہے چنانچہ امام بخاری (ص ۳۲۱ ج ۱) پر ایک باب قائم کرتے ہیں: ”باب الحاسوس والتجسس التبعث و قول اللہ تعالیٰ: لا تمسکوا علیہم وعلوکم اولیاء“۔ لے اس پر محشی نے فتح الباری سے نقل کیا ہے کہ

اگر ایسے جاسوس کے بارے میں بعض مسلمانوں کو پتہ چل جائے تو اس پر خاموشی اختیار نہ کریں بلکہ حکومت کو آگاہ کریں تاکہ وہ اس کا فیصلہ کرے۔ تاہم اس کو قتل کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے (بخاری ص ۴۲۲ ج ۱، حاشیہ نمبر ۱) پھر آگے اسی جلد کے ص ۴۲۸ پر امام بخاریؒ نے ایک اور باب قائم کیا ہے: ”باب السحر ہی اذا دخل دار الاسلام بغیر امان“۔ اس میں حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین کا ایک جاسوس آگیا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، وہ شخص صحابہ کرام کے پاس بیٹھا اور بات چیت کرتا رہا، پھر اٹھ کر چلا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے تلاش کر کے قتل کر دو۔

آج کل یہ صورت پیش آتی ہے کہ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ ہیں جو کافروں کے لئے جاسوسی کرتے ہیں، ان کا مقصد صرف پیسے کمانا ہے، ان کی جاسوسی سے مسلمانوں اور مسلم حکومتوں کو غیر معمولی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، ایسے لوگ چونکہ کلمہ گو ہوتے ہیں اس لئے ان کے قتل میں علمائے وقت کی دورائے ہیں: ایک رائے عدم قتل کی ہے، جو ان کے اسلام کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی ہے۔ دوسری ان کو قتل کرنے کی ہے، یہ ان کے کردار کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ بہت مشکل ہے اور کوئی حتمی فیصلہ کرنا آسان نہیں، تاہم بعض لوگ محض شبہ کی بناء پر جاسوسی کا الزام لگا کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں جبکہ وہ کلمہ اسلام پڑھتے رہتے ہیں یہ کام اتنا ہی خطرناک ہے جتنا ان جاسوسوں کا کام تباہ کن ہے۔ یہ وہی صورت بن جاتی ہے جس میں کسی مفتی کے لئے فیصلہ کرنا اور فتویٰ دینا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

راقم کی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ آج کل اس بارے میں دونوں فریقین کی طرف سے بے اعتدالی اور زیادتی دیکھنے میں آتی ہے، اس لئے کرنے والے تو اپنا کام کر ہی لیتے ہیں مگر اس بارے میں قتل کے جواز کے فتویٰ سے بے گناہوں کے قتل کا راستہ بھی کھل جاتا ہے کہ لوگ اپنی ذاتی دشمنی کی بناء پر بھی الزام لگا دیتے ہیں اور ملزم پر غیر معمولی تشدد کر کے اس سے اپنے حق میں اقرار لگوا لیا جاتا ہے، اس لئے میں اس میں توقف ہی اولیٰ سمجھتا ہوں۔ واللہ اعلم وعلہ اتم

باب ماجاء فی العیّ

”عن ابی امامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الحیاء والعیّ شعبتان من الایمان، والبذاء والبیان شعبتان من النفاق“۔ (ہذا حدیث حسن غریب)۔۔۔ قال والعیّ قلة الکلام، والبذاء هو الفحش فی الکلام، والبیان هو کثرة الکلام مثل هؤلاء الخطباء الذین یخطبون فیتوسعون فی الکلام ویتفصّحون فیہ من مدح الناس فیما لا یرضی اللہ“۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: حیاء اور کم گوئی دونوں ایمان کے شعبے ہیں۔ اور بے ہودہ گوئی اور کثرت گوئی دونوں نفاق کے شعبے ہیں۔

لغات:۔ قولہ ”العیّ“ بکسر العین وتشدید الیاء اصل میں عدم قدرت علی الکلام کی وجہ سے عدم کلام کو کہتے ہیں۔ عارضہ میں ہے کہ ”وهو ترك القول او الفعل بالعجز عنهما“۔ تاہم یہاں بی بیان کے مد مقابل ہے یعنی کلام کے وبال سے بچنے کے لئے زیادہ بولنے سے پرہیز کرنا جیسا کہ امام ترمذی نے اس کی طرف اشارہ اور ملا علی قاری نے مرقات میں تصریح فرمائی ہے۔ (کذا فی حواشی الترمذی، توت وجمع) قولہ ”والبیان“ ”هو“ کما قال الترمذی کثرة الکلام، ”یعنی“ بوجہ کہ زیادہ بولنا مراد ہے۔^۱

تشریح:۔ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ کسی بات کو چھوڑنا یعنی نہ بولنا اور فعل کو ترک کرنا کبھی محمود ہوتے ہیں اور کبھی مذموم، وہ اس طرح کہ جس بات یا فعل کو ترک کیا جاتا ہے اگر وہ مذموم ہوں تو یہ ترک یعنی عی محمود ہے اور اگر وہ بات اور کام اچھے ہوں تو ان کا ترک کرنا اچھا نہیں، اسی طرح بیان کی بھی دو قسمیں ہیں اگر وہ اظہار حق میں مفید اور سچائی پر مبنی ہو تو یہ محمود سحر ہے اور اگر وہ ایسا نہ ہو بلکہ غلط ہو تو وہ حرم مذموم ہے۔ غرض خاموشی اور گویائی دونوں کی اچھائی اور بُرائی کا دار و مدار اپنے اپنے متعلقات اور نتائج پر ہے۔

اس تفصیل و تقسیم کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ حدیث بالا میں عی کا محمود پہلو اور بیان کا مذموم پہلو مراد ہے اور یہی تفصیل حیاء میں بھی ہے کہ اگر وہ اچھے کام سے مانع ہو تو وہ حیاء شرعاً محمود نہیں بلکہ

باب ماجاء فی العیّ

۱۔ ولی الترغیب والترہیب: والعی قلة الکلام والبذاء هو الفحش فی الکلام، والبیان هو کثرة الکلام مثل هؤلاء الخطباء الذین یخطبون فیتوسعون فی الکلام ویتفصّحون فیہ من مدح الناس فیما لا یرضی اللہ ص: ۲۶۸ ج: ۳۔

م شروع ہی نہیں ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے جبکہ بذاء یعنی فحش گوئی بہر حال مذموم ہے اس میں کوئی خیر کا پہلو نہیں ہے۔

سچ اور حیا کو ایمان کے شعبے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان مؤمن کے قلب میں ایک ایسے جوہر اور ملکہ کا نام ہے جو بُرائی سے روکتا اور اچھائی پر آمادہ کر دیتا ہے گویا یہ اچھائی و بُرائی کی پہچان کا ایک معیار اور پیمانہ ہے۔ اچھی بات اور ارادے کو قبول کرتا ہے اور بُرے خیال اور عمل کو رد اور ناپسند کرتا ہے پس حیا اور عی اس کے دو شعبے یعنی دونوں ایمان کے اثرات ہیں بالفاظ دیگر ایمان حیا اور عی کا منشاء اور مصدر ہے کہ مؤمن ہر اس کام سے دور رہتا ہے جو مذموم ہے، جسے حیا کہنا چاہئے اور ہر اس بات سے گھبراتا اور خاموش رہتا ہے جو معیوب ہو جسے عی کہتے ہیں۔

اس کے برعکس بذاء یعنی بے ہودہ بکواس اور بیان یعنی باتوں میں تعق اور مصنوعی فصاحت اختیار کرنا جس سے مقصد حاضرین اور سامعین وقارئین پر اپنے اعلیٰ مقام اور برتری کا اظہار ہو تکبر و لا پرواہی کا اثر ہے جبکہ تکبر و لا پرواہی منافقت کی شاخیں ہیں کیونکہ مؤمن پر عبادیت کا غلبہ ہوتا ہے وہ تکبر کہاں کر سکتا ہے، مؤمن اپنی باتوں کے انجام پر نظر رکھتا ہے کہ بات کس انداز سے کہنی چاہئے اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اس لئے وہ بولنے وقت سادگی اختیار کرتا ہے اور جو بات کہتا ہے اس کی بد انجامی سے ڈرتا ہے اس لئے یا تو بھلی بات منہ سے نکالتا ہے یا پھر خاموش رہتا ہے۔ پس جو آدمی ان دونوں باتوں کا خیال نہ رکھے وہ گویا منافق ہے کہ اثر بغیر موثر کے نہیں پایا جاتا، لہذا جب منافقت کی یہ دونوں علامتیں پائی جائیں گی تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ آدمی منافق (فی العمل) ہے یا اس کے اندر منافقت کے دو شعبے آگئے، لہذا اسے ڈرنا چاہئے کہ اگر ان شعبوں کی تعداد بڑھ گئی تو عین ممکن ہے کہ وہ عین منافق بن جائے۔ والعیاذ باللہ

واضح رہے کہ فطری ملکہ فصاحت یا کثرت مواعظ و تدریس و تالیف سے حاصل ہونے والے ملکہ یا نیک نیتی پر مبنی اور خود بینی سے پاک فصیح کلام کرنا شرعاً معیوب نہیں، اس حدیث میں بیان کی مذموم قسم مراد ہے۔ کلمہ

باب ماجاء ان من البیان سحراً

”عن ابن عمر ان رجلیین قدما فی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخطبا فاجاب الناس من کلامهما فالتفت البیاض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: ان من البیان سحراً وان بعض البیان سحر“۔ (حدیث حسن صحیح)^۱

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو آدمی آئے اور دونوں نے خطبے دیئے (یعنی تقریریں کیں) تو لوگ ان کے خطبوں پر حیران رہ گئے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ بعض تقریر جادوسی ہوتی ہے۔

لغات:۔ قولہ ”سحر“ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ یہ لفظ مضاد و شاذہ میں سے ہے اس کا ماضی اور مضارع دونوں مفتوح العین ہیں گویا باب فتح سے ہے۔ سحر وہ کرب اور عمل کہلاتا ہے جس کا سبب انتہائی مخفی اور باریک ہو۔ (انتہی) بعض لوگوں نے سحر کو خوارق میں شمار کیا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں جیسا کہ علامہ خیالی نے تصریح فرمائی ہے کیونکہ امر خارق سبب پر مبنی نہیں ہوتا اس لئے اسے خارق للعادۃ کہتے ہیں جبکہ سحر تو سبب پر مبنی ہوتا ہے اگرچہ وہ سبب باریک اور دقیق ہو۔ یہاں لفظ ”او“ شک راوی کے لئے ہے۔

تشریح:۔ یہ دونوں آدمی کون تھے جنہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اپنے خطبے پیش کئے تھے؟ اس بارے میں کوئی حتمی بات کہنا تو مشکل ہے تاہم جن دو خطیبوں کے نام معلوم ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ یہ دو شخص وہی ہوں تو ان میں سے ایک کا نام حصین بن بدر بن امرء القیس ہے جس کا لقب زبیرؓ کان بکسر الزاء والراء والباء الساکنہ ہے جو چاند کے ناموں میں سے ایک ہے یہ لقب اسے خوب صورتی کی وجہ سے ملا تھا۔

دوسرے کا نام عمرو بن لاہتم تھا، یہ دونوں تمیمی ہیں ان کی آمد ۹ھ میں ہوئی تھی۔ (کذا فی التحدیث عن

باب ماجاء ان من البیان سحراً

۱۔ التحدیث المخرجه البیاضی ص ۸۵۸ ج ۲ ”باب من البیان السحر“ کتاب الطب، صحیح مسلم ص ۲۸۶ ج ۱۔
 ”صلاة الجمعة“ سنن ابی داؤد ص ۳۳۵ ج ۲ ”باب ماجاء فی التشدیق فی الکلام“ کتاب الادب، سنن دارمی ص ۴۴۰ ج ۱ ”باب فی قصر الخطبة“ حدیث ۱۵۵۶، ایضاً مؤطا لمالك فی الکلام باب ۷، مسند احمد ص ۴۹۸ ج ۱ حدیث ۲۷۵۶ و ۲۸۱ و ۲۸۵۶ و ۳۰۱۸۔

حاشیہ میں ہے کہ زبردقان نے اپنی مدح میں کلام پیش کیا جو فصیح کلمات پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے نے اس کی مذمت میں بلیغانہ کلام پیش کیا۔ پہلے نے دوسرے پر حسد کا الزام لگایا۔ دوسرے نے اور زیادہ بلیغ کلام سے جواب دیا۔

احیاء العلوم للفرانی ^۱ میں ہے کہ عمرو نے ایک دن زبردقان کی مدح کی اور دوسرے دن ذمہ، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو عمرو نے کہا کہ میں نے پہلے میں بھی سچ ہی بولا تھا اور دوسرے میں بھی جھوٹ نہیں بولا ہے کل اس نے مجھے خوش کر لیا تھا تو میں نے اس کی ان خوبیوں سے مدح کی جو مجھے معلوم تھیں اور آج اس نے مجھے ناراض کر لیا تھا تو مجھے اس میں جو عیوب معلوم تھے ان کو بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان من البیان لسحراً“۔ اس میں ”من“ تبعیض کے لئے ہے یعنی بعض بیانات سحر اور جادو سا اثر رکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح سحر سے دوسروں پر اثر ہوتا ہے اسی طرح بعض بیانات سے بھی سامعین کے دل متغیر اور اپنی حالت سے تحول ہو جاتے ہیں اگرچہ جادو کی طرح وہ بیان صحیح نہ ہو یا بعض بیانات سے جادو کی طرح گناہ ملتا ہے۔ دونوں تو جیہوں کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان خطبوں کا عیب بیان کرتا ہے اور یہی مطلب حدیث کا ظاہر لگتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مدح ہو کہ بعض بیانات جادو کی طرح اثر رکھتے ہیں یعنی ان سے ناراض دلوں کو راضی اور سخت کو نرم و آسان بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (کذا فی الحاشیہ عن النہایۃ)

باب ماجاء فی التواضع

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ماتقوّضت صدقۃ من مال، ولا زاد اللہ رجلاً بعفو إلا عزاً، أو ماتواضع أحدہم إلا رفعة اللہ۔“ ^۱ (حسن صحیح)

فتح الباری ص: ۲۹۰ ج: ۱۰، قلمی کتب خانہ کراچی۔

مع أخرجه البيهقي في الدلائل والطبرانی في معجمه بحواله فتح الباری ص: ۲۹۱ ج: ۱۰۔

باب ماجاء فی التواضع

۱۔ الحدیث أخرجه مسلم ص: ۳۲۱ ج: ۴ ”باب استحباب العفو والتواضع“ کتاب البر والصلة۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی صدقہ نہیں گھنٹا مال کو، اور کسی کے معاف کرنے سے اللہ نے اس کی عزت ہی بڑھائی ہے اور کسی نے اللہ کے لئے تواضع نہیں کی مگر اللہ نے اسے اونچا فرمایا۔

لغات :- قولہ ”من مال“ اس ”من“ میں تین احتمالات ہیں: (۱) زائد ہونا۔ (۲) تبغیض کا ہونا اور (۳) بیانیہ ہونا اور ترجمہ میں بیانیہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ قولہ ”تواضع“ جو شخص اللہ کی معرفت کی بناء پر اللہ کی رضا کی خاطر یا مخلوق پر رحم کی خاطر اپنے اصل درجہ سے کم پر راضی ہو جائے یا خود کو پست کر دے تو اس فضیلت کا نام تواضع ہے اس سے نیچے درجہ کا نام ذلت ہے جو ذیلت ہے یعنی اپنے حظ انفس اور ذاتی مفادات کے لئے اپنی رسوائی و اہانت پر راضی ہونا ذلت ہے، تواضع فضیلت ہے جبکہ ذلت عیب اور ذیلت ہے۔

تشریح :- صدقہ دینے سے مال کم نہ ہونے کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں مال بڑھ جاتا ہے یا کم از کم بقدر صدقہ کے اس میں واپس آ جاتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگرچہ کمی محسوس ہوگی مگر آخرت میں وہ مال محفوظ بلکہ مضاعف ہو جاتا ہے اور یہ دونوں مطلب بیک وقت صحیح ہیں کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ مال خرچ کرتے ہیں ان کے ذرائع آمدن بڑھ جاتے ہیں اور آخرت میں ایک کھجور احد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے۔

اسی طرح مطلب دوسرے جملے کا یہ ہے کہ معاف کرنے سے، جبکہ انتقام کی قدرت حاصل ہو، آدمی لوگوں میں معالی اخلاق سے مشہور اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات سے معمور ہو جاتا ہے اور اس کے عیوب مستور ہو جاتے ہیں کیونکہ معافی محبت پیدا کرتی ہے اور انتقام نفرت۔

جہاں تک تواضع کا تعلق ہے جس کے لئے امام ترمذی نے باب باندھنا ہے تو اس کی فضیلت تو بہت ہی زیادہ ہے، تواضع کی وجہ سے آدمی بلند و بالا ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث باب میں اس کی تصریح کی گئی ہے، اس کی بناء پر آدمی ان تمام وعیدات و مہلکات سے محفوظ ہو جاتا ہے جو تکبر کی وجہ سے یقینی ہیں، اور یہ کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے اخلاق میں سے ہے، اس کی وجہ سے آدمی اللہ کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے اور یہ کہ یہ انسان کی اصل فطرت منی سے ہم آہنگ ہے جبکہ تکبر شیطان کی فطرت آگ سے ملتا ہے، اور یہ کہ تواضع میں کسی کو حسد نہیں ہوتا، اور یہ کہ تواضع عظمیٰ کا اثر ہے جبکہ تکبر حماقت کا نتیجہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاہم تواضع کا جاننا ایک باریک امر ہے بعض لوگ تواضع کا دعویٰ کرنے اور تواضع کا عمل کرنے کے

باوجود متکبر ہوتے ہیں جبکہ بعض ذلت و رسوائی کو تو اضع سمجھتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو راقم کی کتاب ”نقش قدم“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

باب ماجاء فی الظلم

”عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الظلم ظلمات یوم القیمة“۔^۱ (حسن)

(غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ظلم قیامت کے دن بہت سے اندھیروں پر مشتمل ہوگا۔

لغات:۔ قولہ ”الظلم“ کسی چیز کو اپنے محل و موقع سے ہٹانے کو ظلم کہتے ہیں یعنی مکمل طور پر کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانا ہو یا کسی بیشی کی صورت میں تجاوز عن الحد ہو پھر یہ تجاوز وقت سے ہو یا مکان سے، اسی مناسبت سے اس کا اطلاق نا انصافی، غلط روش اور ستم پر بھی ہوتا ہے۔ حدیث میں اس سے نا انصافی اور حق تلفی مراد ہے جو عدل کے مقابل ہے۔ پھر یہ حق تلفی خواہ حقوق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں۔

تشریح:۔ چونکہ عدل اور دیگر نیک اعمال سے قیامت کے روز انوار پیدا ہوں گے جو آدمی کے ساتھ محشر میں اور پل صراط پر جنت کے داخلے تک رہیں گے، اور ظلم تو عدل کی ضد ہے لہذا اس سے اندھیرا جنم لیتا ہے جو قیامت میں آدمی پر چھایا رہے گا۔ والعیاذ باللہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل اور نیکیاں قلبی ہدایت اور نور ایمانی کے ثمرات ہیں جبکہ ظلم اور گناہ دل کا نور ہدایت سے خالی ہونے کے اثرات ہیں اور عالم آخرت میں اعمال کے اثرات اپنے دنیاوی بنیادوں پر مبنی اور ان کے مشابہ ہوتے ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ دنیا کے ایک ظلم سے آخرت میں کئی ظلمات کیسے بنیں گے تو اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ ظلم سے مراد جنس ہے جو کثرت کے مبنائی نہیں، لہذا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے مظالم آخرت میں اندھیرے ہوں گے۔ دوسرا جواب: یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح نیکی کا صلہ بہت بڑا ہوتا ہے اور ایک کھجور بطور صدقہ خرچ کرنے

باب ماجاء فی الظلم

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ۳۳۱ ج: ۱ ”باب الظلم ظلمات یوم القیامة“ کتاب المظالم، و مسلم ص: ۳۲۰ ج: ۲ ”باب

لحریم الظلم“ کتاب البر والصلۃ۔

سے وہ احد پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے تو اس طرح ایک ظلم بھی اتنا بڑھ گئے گا کہ ہر طرف پھیلنے سے وہ کثیر محسوس ہوگا کیونکہ جب نور ہر طرف ہوگا تو اندھیرا بھی اس پر چاروں طرف سے محیط ہوگا۔

ابن جوزئی فرماتے ہیں ظلم دو گنا ہوں پر مشتعل ہوتا ہے ایک نا انصافی جیسے کسی کمزور کا مال لیا۔ اور دوم قلبی اندھیرا کیونکہ اگر ظالم کے دل میں نور ہدایت ہوتا تو وہ ظلم نہ کرتا، اس لئے ظلم کا متعدد دین چانا کوئی نامعقول بات نہیں اور نہ ہی اصول کے خلاف ہے۔ بعض شارحین نے ظلمات سے تکلیفات اور عقوبات کے معنی لئے ہیں یعنی ظالم جس کو تکلیف پہنچاتا ہے اس کے انتقام میں ظالم پر قیامت کے روز کئی سختیاں مسلط کی جائیں گی۔

باب ماجاء فی ترک العیب للنعمۃ

”عن ابی ہریرۃ قال ماعاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طعاماً قط کان اذا اشتہاه اکلہ والا ترکہ“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کھانے میں عیب نہیں نکالا (یعنی عیب بیان نہیں فرمایا) اگر خواہش ہوتی تو کھا لیتے ورنہ اسے چھوڑ دیتے۔

تشریح:- یہاں طعام سے مراد پکا ہوا کھانا ہے اور عیب سے مراد وہ خامی ہے جو پکانے والے سے وہ جاتی ہے جیسے نمک کا کم یا زیادہ ہونا، کھانا کچا یا جلا ہوا ہونا وغیرہ۔

اگرچہ گھر والوں کو تنبیہ کرنے کی غرض سے اور تادیب کی نیت سے کھانے کے نقصان کے بارے میں بتانا جائز ہے تاکہ اس خامی کا ازالہ آئندہ کے لئے ہو سکے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معالی اخلاق کا اصول یہ تھا کہ کسی کے دل کو ذرہ بھی تکلیف پہنچانا گوارا نہیں فرماتے اور ہر اس راستے سے بچتے جہاں کسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہو، چونکہ عیب جوئی میں پکانے والے کا دل پریشان ہو جاتا ہے خاص کر عورتیں اس بارے میں بہت حساس ہوتی ہیں اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب ظاہر نہیں فرمایا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک کھانا مجلس میں کسی کو پسند ہوتا ہے اور کسی کو نہیں، تو عیب نکالنے سے دوسرے حاضر مجلس والوں پر جو ممکن ہے شوق سے کھاتے ہوں منفی اثر پڑتا ہے۔ نیز کھانے میں لذت تلاش کرنا دنیا کی چیزوں کی طرف جھکاؤ سا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کے بارے میں ناممکن ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھانے کی زیادہ تعریفیں بھی ثابت نہیں، ہم لوگ جب کسی

مہنگے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں تو پھر عرصہ تک اسے یاد رکھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان نہ تھی۔

باب ماجاء فی تعظیم المؤمن

”عن ابن عمر قال سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر فنادى بصوت رفيع قال يا معشر من قد اسلم بلسانه ولم يفيض الايمان الى قبله، لا تؤذوا المسلمين ولا تعيروهم ولا تسمعوا عورتاتهم فانه من تتبع عورة اخيه المسلم تتبع الله عورته ومن يتبع الله عورته يفضحه ولو في جوف رحله، فقال ونظر ابن عمر يوماً الى البيت او الى الكعبة فقال: ما اعظمك واعظم حرمتك والمؤمن اعظم حرمة عند الله منك“^۱ (هذا حديث حسن غريب، وانخرجه ابن حبان في صحيحه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے تو بلند آواز سے پکار کر فرمانے لگے: اے ان لوگوں کے گروہ! جو زبانی اسلام لائیں ہیں اور ان کے دلوں تک ایمان نہیں پہنچا ہے، مسلمانوں کو ایذا مت پہنچاؤ اور نہ ہی ان کو شرمندہ کرو اور ان کے رازوں کے درپے مت ہونا، کیونکہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے خفیہ رازوں کے پیچھے پڑتا ہے (یعنی اس کے عیوب ظاہر کرتا ہے) تو اللہ اس کے خفیہ عیوب کو ظاہر فرماتا ہے اور اللہ جس کی چھپی ہوئی بات کو ظاہر فرمادیتا ہے تو اس کو فضیحت یعنی رسوا کر دیتا ہے گو وہ اپنے گھر کے اندر کیوں نہ ہو۔ راوی کہتا ہے کہ ابن عمرؓ نے ایک دن بیت اللہ کی طرف دیکھا، یا (راوی کو شک ہے) کعبہ کی طرف دیکھا تو فرمایا کہ تو کس قدر عظیم ہے اور کس قدر بڑی حرمت والا ہے، تاہم مؤمن کی حرمت اللہ کے نزدیک تجھ سے بڑھ کر ہے۔

لغات:- قولہ ”صَعِدَ“ بکسر العین صعود کے معنی چڑھنے کے ہیں جبکہ اصعاد کے معنی ہموار زمین میں چلنے کے آتے ہیں۔ قولہ ”ولم يفيض“ افشاء سے بمعنی پہنچنے اور اترنے کے آتے ہیں۔ قولہ ”لا تعيروا“ تعییر سے بمعنی عار دلانے اور شرمندہ کرنے کے ہے۔ قولہ ”ولا تسمعوا“ تتبع باب افعال بمعنی تجسس اور تلاش کے آتا ہے۔ قولہ ”عورتاتهم“ عورت کی جمع ہے خفیہ حالت جس کا اظہار باعث شرم سمجھا جاتا ہے۔ قولہ ”تتبع“

باب ماجاء فی تعظیم المؤمن

۱۔ ولفی مسنن ابن ماجہ: والذی نفس محمد بنہ لحرمة المؤمن اعظم عند الله حرمة منك ماله ودمه الخ ص ۲۸۲ ابواب الفتن، ایضاً رواہ الدارمی فی المنکح۔

اللہ" یہ اطلاق مشاکلتہ ہے یہاں مراد کشف اور اظہار ہے۔ قولہ "بفضحه" نفیست شرمندگی اور بدنامی کو کہتے ہیں۔ قولہ "والی الکعبۃ" راوی کو شک ہے کہ اصل لفظ بیت کا ہے یا کعبہ کا، اس لئے دونوں احتیاطاً لایا تاکہ لفظ رہ نہ جائے جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ قولہ "مما اعظمک واعظم حرمتک" دونوں فعل تعجب کے صیغے ہیں۔ قولہ "حرمۃ" انضمام الیاء اس کے کئی معنی ہیں: مثلاً بیوی جسے حریم بھی کہتے ہیں اور عزت، عظمت، ممانعت وغیرہ پر اطلاق ہوتا ہے مگر یہاں معنی مراد وہ حق ہے جس کی رعایت واجب ہو اور پامال کرنا ممنوع ہو۔

تشریح: آنحضرت کا یہ خطبہ اونچی آواز میں دینا عام عادت شریفہ کے مطابق بھی ہو سکتا ہے کہ خطبے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سرخ اور آواز بلند ہو جاتی جیسے کوئی دشمن کے لشکر کی آمد سے ڈرانے والا ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کے متعلق سنا ہو یا بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی ہو کہ وہ مسلمانوں اور کامل مخلصین کے خلاف زبان درازی کرتے اور ان کے عیوب تلاش کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں یہ عام ارشاد معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب منافقین اور ضعیف الایمان سب لوگ ہوں جبکہ دوسری صورت میں بظاہر زبانی مسلمانوں سے منافقین مراد ہیں کیونکہ وہ کاملین کے خلاف منفی پردہ پکینڈا کرتے رہتے تھے۔

بہر حال اس ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دوسروں کے عیوب کی پردہ کشائی کرتا ہے تو اللہ اس کے عیوب کو لوگوں پر ظاہر فرماتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ غیبت کرنے والا شخص لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر ہوتا ہے۔

ترمذی کے ابواب "صلۃ النبیۃ" میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے "من غیر احبہ بذنب لم یحمت حتی یعمله"۔ اسی صفحہ پر ایک اور روایت ہے "لا تظہر الشماتۃ لایحیک فیرحمہ اللہ ویبتلیک"۔ اس کے اگلے باب میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما أحب انی حکیت احداً وان لی کذا وکذا"۔ (انظر ص ۷۷ ج ۲، ایچ ایم سعید کراچی) اس صفحے پر اور بھی احادیث ہیں۔

ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسروں کے عیوب کے درپے ہونے سے نہ صرف آدمی کے اپنے عیوب کھل جاتے ہیں بلکہ وہ جس کو عار دلاتا ہے وہ عیب بھی اس کے اندر آ جاتا ہے اور جو آدمی دوسروں کی تکلیف پر خوش ہوتا ہے یا خوشی کا اظہار کرتا ہے تو اللہ اس مصیبت زدہ پر رحم فرماتا ہے اور خوشی کرنے والے کو پکڑ لیتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کسی کا عیب نقل کرنا پسند نہیں کرتا اگرچہ مجھے ساری دنیا دی جائے۔

چونکہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ جو عیب دوسرے میں نظر آجائے آدمی اپنے گریبان میں جھانکے اگر وہ اس کے اندر بھی ہے تو خود سے اور اپنے بھائی سے اس کا ازالہ کرے۔ اور اگر اس کے اندر نہیں تو اللہ کا شکر کرے اور بھائی کی فکر کرے اور کیا معلوم کہ جو عیب نظر آ رہا ہے وہ ظاہری ہی ہو اور اس کا باطن طاعن سے اچھا ہو اور کرامت کا دار و مدار تو تقویٰ پر ہے نہ کہ ظاہری شکل و ہیئت پر، پس جو آدمی ایسا نہیں کرتا وہ کامل مؤمن نہیں یا پھر خالص منافق ہے۔

اس سلسلے میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول اس باب میں نقل کرنا بہت ہی معنی خیز استدلال ہے کہ لوگ کعبہ شریف کی توقد و عزت کرتے ہیں لیکن بعض لوگ مؤمن کی قدر نہیں کرتے حالانکہ مؤمن کی حرمت عند اللہ کعبے سے زیادہ ہے۔

اس کی وجہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ”المسک الذی“ میں یہ فرمائی ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کی تجلی کامل ہے، کعبہ مکرمہ میں ایک دو تجلی کا ظہور ہے جبکہ مؤمن تمام تجلیات ربانیہ کا مظہر ہے۔ تدبر۔ عیب اگر گناہ کا ہو تو اس سے توبہ کرنے کے بعد عار دانا مطلقاً ممنوع ہے اگر وہ شخص اس میں مبتلا ہو تو ستر علی المسلم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے بچاؤ کا ایسا راستہ نکالنا جائز ہے جس سے شرمندہ کرنا مراد نہ ہو بلکہ روکنا ہو خواہ تعزیر سے ہو یا تعمیر سے۔

باب ماجاء فی التجارب

”عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاحلیم الاذو عشرة ولا حکیم الاذو تحربة“۔^۱ (حدیث حسن غریب)

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بردبار کوئی نہیں مگر لغزش (پھسلن) کرنے والا اور حکیم کوئی نہیں ہوتا مگر تجربے والا۔

لغات:- قولہ ”عشرة“ بلغ العین پھسلنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد غلطی کرنا ہے کیونکہ غلطی سے بھی آدمی صحیح راستے سے ہٹ جاتا اور پھسل جاتا ہے۔ قولہ ”تحربة“ آزمائش کے معنی میں آتا ہے۔ ازد میں اس کی

جمع تجربات آتی ہے، مگر عربی میں تجارب، جیسے ترجمۃ الباب میں ہے۔

تشریح:- جیسا کہ پہلے گزرا ہے کہ ”لا“ کبھی نفی جنس کے لئے آتا ہے اور کبھی نفی کمال کے لئے۔
بظہر یہاں نفی کمال کے لئے ہے کیونکہ کچھ نہ کچھ عقل و برداشت اور حکمت تو بطور ملکات ذاتیہ اکثر لوگوں میں
ہوتی ہیں۔ لیکن بطور ملکات فاضلہ کے جو درجہ کمال تک پہنچے ہوں وہ بردبار کے لئے لغزش پر مبنی ہے اور
دانا و عقلمند کے لئے تجربہ و آزمائش پر موقوف ہے۔ جب آدمی خود غلطی کرتا ہے تو اس کے انجام سے ڈرنے لگتا
ہے پھر وہ معافی کا طلب گار ہوتا ہے جس سے معافی کی قدر معلوم کر لیتا ہے کہ یہ کتنی عزیز اور محبوب چیز ہے،
اس لئے وہ دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کو پسند کرتا ہے کیونکہ مؤمن دوسروں کے لئے وہی پسند کرتا ہے جو
اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

اسی طرح جو آدمی تجربہ کار ہو تو اس کی دانائی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ تجربہ سے اشیاء کے احوال سے
واقفیت حاصل ہوتی ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جہاں دیدہ آدمی زیادہ ہوشیار ہوتا ہے، عورتیں چونکہ گھروں تک
محدود ہوتی ہیں اس لئے ان کی عقل کم ہوتی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اصلی عقل کی بات ہو رہی ہے،
بلکہ یہ عقل تجربی کا ذکر ہے جہاں تک جنسی عقل ہے تو وہ انسانوں میں متفاوت ہوتی ہے گو تجربہ سے وہ بڑھتی بھی
ہے، ”مہذی“ اور ”المستطرف فی کل فن مستطرف“ میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

حاشیہ قوت میں ہے کہ یہ حدیث ان میں سے ایک ہے جس کی بناء پر سراج الدین القزوينی نے
صاحب مصابح پر تنقید کی ہے۔ اور موقف اختیار کیا ہے کہ یہ موضوعی ہے کیونکہ اس میں دراج عن ابی الہیثم کی
روایت ہے جو صحیح نہیں۔ دوسری طرف بعض حضرات جیسے ابن حبان، امام حاکم کا میلان اس کی صحت کی طرف
ہے، بلکہ مناوی نے تو شرح الجامع الصغیر میں اس کی صحت کی تصریح کی ہے۔ قوت میں ہے:

”فما حصل الامر ان هذا الحديث باول درجات الحسن او هو ضعيف ضعفاً

يحتمل واما الحكم بوضعه فلا“۔

باب ماجاء فی المتشبع بمالم یعطه

عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من أعطی عطاءً فوجد فلیجزہ ومن لم یجد فلیش فان من اتنی فقد شکرو من کتم فقد کفرو من تحلی بمالم یعطه کان کلابس ثوبی زور۔^۱ (حدیث حسن غریب، ومعنی قولہ: ومن کتم فقد کفر یقول کفرتک النعمۃ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو کوئی عطیہ دیا گیا اور اس کی (بدلہ دینے کی) گنجائش ہو تو اسے بدلہ دینا چاہئے، اور اگر گنجائش نہ ہو تو تعریف کرنی چاہئے (جیسے شکریہ یا دعاء وغیرہ) کیونکہ جس نے (دینے والے کی) تعریف کی تو اس نے شکریہ ادا کر لیا، اور جس نے نظر انداز کیا تو اس نے ناشکری کی، اور جس نے ایسی چیز سے خود کو مزین کیا جو اس کو دی نہیں گئی ہو تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی مانند ہے۔

لغات: - قولہ ”المتشبع“ شیخ سے باب تفعّل کا صیغہ ہے ہبجان بھرے ہوئے پیٹ کو کہتے ہیں، چونکہ باب تفعّل کی ایک خاصیت تکلف بھی ہے اس لئے متشبع سے مراد وہ شخص ہے جو شکم سیری کا اظہار کرے دراصل حالیکہ وہ بھوکا ہو۔ پھر یہ لفظ بناوٹی و مصنوعی دکھاوے کے لئے استعمال میں مشہور و مستعار ہوا ہے جو یہاں مراد ہے۔ قولہ ”من أعطی“ مجہول کا صیغہ ہے۔ قولہ ”عطاء“ بمعنی عطیہ کے ہے یا مفعول مطلق ہے، مفعول مطلق بنانے کی صورت میں مفعول بہ مقدار ماننا پڑے گا۔ یعنی من أعطی عطیۃ اور حذف میں تعین کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی چیز دی گئی ہو جبکہ بعض روایات میں عطاء کے بعد شیئاً مذکور ہے پھر تقدیر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ قولہ ”فوجد“ یعنی مالی گنجائش موجود ہو۔

قولہ ”فلیجز“ جزاء سے امر کا صیغہ ہے، اس میں جیم ساکن ہے یعنی بدلہ دیدے۔ قولہ ”فلیش“ بضم الیاء اس کی ثاء یعنی تعریف کرے۔ قولہ ”ومن کتم“ کتمان کے معنی چھپانے کے ہیں یعنی اگر اس نے عطیہ کا بدلہ بھی نہیں دیا اور شکریہ وغیرہ بھی ادا نہیں کیا تو اس نے گویا وہ نعمت چھپالی اور کفران و ناشکری کے پردے میں

باب ماجاء فی المتشبع بمالم یعطه

۱۔ الحدیث أخرجه بمعناه البيهقي في السنن الكبرى ۱۹۹/۳ والحاكم في المستدرک ۶۳/۴ واحمد في مسنده ۹۰/۶، واورده المصنف في زوائد المسند برقم: ۲۸۸۲ والنقی الہندی فی کنز العمال برقم: ۱۶۵۲۶ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حلیہ: ۱۳۶۳۱۔

لیٹ لی۔ قولہ ”کفر“ کفران سے ہے بمعنی ناشکری کے۔ قولہ ”نَحْلَى“ حلی سجاوٹ اور زینت کے سامان کو کہتے ہیں۔ یہ بھی تشبیح کی طرح باب تفعیل کی خصوصیت کی بناء پر بمعنی بناوٹی اظہار زینت کے ہے۔ قولہ ”کمان“ کلابس ٹوبی زور“ لابس اسم قاعل کا صیغہ ہے اور کاف تشبیہ کے لئے ہے۔ ٹوبین کا نون اضافت کی وجہ سے ساقط ہوا ہے اور زور جھوٹ کو کہتے ہیں۔

تشریح:- بعض روایات کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں ایک عورت حاضر ہو کر کہنے لگی اے اللہ کے رسول! میری ایک سوکن ہے تو کیا مجھ پر کوئی گناہ ہوگا کہ میں شکم سیری کا تاثر دوں جبکہ شوہر نے مجھے دیا نہ ہو (یعنی سوکن کو دکھانے کے لئے کہ میرا شوہر مجھ سے زیادہ محبت کرتا ہے اور بہت کھلاتا پلاتا ہے) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ (کذا فی التلخیص)

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی چیز سے محروم ہے اور وہ اس چیز کی موجودگی کا دعویٰ کر رہا ہے اور تاثر دیتا ہے کہ میں اس چیز سے مالا مال ہوں اور یہ تاثر دینے کے لئے وہ غلط راستہ اختیار کرتا ہے، اور مقصد بھی بُرا ہو مثلاً سوکن کو چھینرنا مقصود ہو جس سے شوہر اور سوکن کے درمیان نفرت جنم لے گی یا کوئی شخص زاہدوں اور علماء کا روپ اختیار کرتا ہے تاکہ لوگ اسے پارسا اور علامہ سمجھ جائیں جبکہ وہ اس نعمت سے عاری ہو تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے فریب و مکاری کا روپ دھار لیا ہو، اس معنی کے اظہار کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا حوالہ دیا ہے جو بقول امام خطابی کے عربوں میں گمراہ ہے وہ درحقیقت جھوٹا آدمی تھا مگر اس نے اپنے جھوٹ کو مشکل سچ ظاہر کرنے کی غرض سے با اعتماد لوگوں کا لباس اختیار کر لیا تھا چنانچہ لوگ اس کی ہیئت کو دیکھ کر اسے سچا مانتے تھے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ بعض شارحین نے یہاں پر مشبہ بہ میں تشبیہ کے صیغہ کو مشکل جانا ہے کہ اس عورت کی تشبیہ دو کپڑے پہننے والے کے ساتھ کیوں دی گئی، پھر عورت یعنی مشبہ کی جانب میں دو جھوٹ بنانے کی کوشش کی ہے، ایک یہ کہ شوہر اس سے زیادہ محبت کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کو زیادہ دیتا ہے، لیکن میرے خیال میں اس کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ اصل بات یہ ہیئت کی تشبیہ ہے ہیئت کے ساتھ چونکہ اپنی شکل و صورت با اعتماد لوگوں کی مانند بنانے کے لئے دو کپڑے پہننا پڑتے ہیں جیسے آج کل قمیص شلوار ہیں تو اس زمانے میں ازراہ اور چادر تھی کیونکہ یہ مقصد صرف ایک کپڑے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا اور تمین کی ضرورت نہیں اس لئے کوئی

اشکال نہ رہا۔

غرض جو شخص اپنی اصلیت کو چھپا کر کسی غلط مقصد کے حصول کے لئے جو راستہ اختیار کرتا ہے خواہ وہ لباس کا ہو یا اقوال کا یا اور کوئی حیلہ ہو جیسے کسی کی تحریر اپنی طرف منسوب کرنا اور کسی کا رٹاے کو اپنے نام کرنا وغیرہ یہ سب فراڈ اور دھوکہ میں آتا ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

ہاں اگر مقصد نیک ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں جیسے مسلمانوں کا جاسوس بھیس بدل کر کافروں میں بظاہر شامل ہو جاتا ہے تاہم اس بات کا تعین کرنا بھی ایک مشکل کام ہے کہ کون سا مقصد نیک ہے اور کون سا مذموم ہے، کیونکہ بعض اشیاء میں اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً ایک شخص جو مدرسہ چلانے کا اہل نہیں ہوتا ہے مگر وہ بڑے بڑے گرتے زیب تن کر کے وسیع علم اور تقویٰ کا اظہار کرتا ہے اور اس پر لوگوں سے چندہ وصول کرتا ہے جبکہ وہ بجائے صحیح علماء تیار کرنے کے یا تو سرے سے مدرسہ میں طلبہ رکھتا ہی نہیں یا پھر ان کی تعلیم و تربیت کا ڈھنگ نہیں جانتا، بلکہ اس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی کہ اس کے مدرسہ میں خدام دین تیار ہوں وہ زیادہ توجہ اپنے بار و بچی خانے اور آسائش و زیبائش کے سامان پر دیتا ہے، ان کو اپنی اصلیت چھپانا اس حدیث کی رو سے منع ہے۔

باب ماجاء فی الثناء بالمعروف

”عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”من صُنِعَ اليه معروف فغال ليعمله: جزاك الله غير أفقد ابلغ في الثناء“۔ (حدیث حسن جید غریب) ^۱

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے ساتھ نیک سلوک کیا گیا پس اس نے ایسا کرنے والے سے کہا: جزاک اللہ خیر اتو اس نے شاندار انداز سے تعریف کی۔

تشریح:- معروف عام ہے خواہ کوئی ہدیہ ہو یا خدمت، مدد یا نیک مشورہ، تعلیم و تربیت اور دیگر اچھے

باب ماجاء فی الثناء بالمعروف

^۱ الحدیث رواہ بمعناه الطبرانی فی الكبير ۱۴۹/۲ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۳۵ ج: ۸ حدیث: ۱۳۶۳۳، ایضاً مصنف ابن ابی شیبہ ص: ۲۳۰ ج: ۶ کتاب الادب.

اجتہد کام ہوں۔ سابقہ باب میں گنہگار ہے کہ اگر بدلہ دینے کی گنجائش ہو تو اولاً بدلہ دے مگر گنجائش نہ ہونے کی صورت میں تعریف کرے، اس باب کی حدیث گویا ثنا کی تفسیر ہے کہ اگر وہ جزاک اللہ خیر! کہہ دے تو یہ سب سے اونچی تعریف ہے کیونکہ اس نے اپنی کوتاہی کا اقرار کیا کہ تیرا یہ سلوک اتنا زیادہ ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتا پس تجھے اللہ ہی اس کا بدلہ دے اور ظاہر ہے کہ جب اس نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تو یقیناً اللہ کا بدلہ اس سلوک سے بدرجہا بہتر و افضل ہوگا۔

یہ ایسا ہے جیسے اللہ نے ہم کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے کہ ”یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیماً“۔ لے تو ہم نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی کہ ”اللہم صل علی محمد“ یعنی ہم تو قاصر ہیں، اللہ تو ہی ان پر رستوں کا نزول مزید بڑھا دے چنانچہ اسی بناء پر درود پڑھنے کا ثواب بھی بڑھ جاتا ہے۔ تدبر

آخر ابواب البر والصلة

ابواب الطب

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

طب بکسر الطاء جسمانی و دہنی علاج و معالجے کو کہتے ہیں ویسے ”ط، ب“ مادہ میں مہارت کے معنی پائے جاتے ہیں لہذا کہا جائے گا کہ حسن تدبیر اور مہارت سے علاج کرنے کا نام طب ہے گویا بغیر عمرگی و مہارت کے علاج کرنے والے کو طبیب نہیں کہا جائے گا۔

آج کل لوگ طبیب پر حکیم کا اطلاق کرتے ہیں یہ اطلاق گویا ذکر عام والمراد منہ الخاص کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ حکمت کا مفہوم بہت وسیع ہے جیسا کہ میبذی وغیرہ کتب کے اوائل میں بیان ہوا ہے جبکہ طب حکمت کا ایک چھوٹا سا شعبہ ہے، اور جہاں تک ڈاکٹر کا اطلاق ہے تو یہ بھی اگرچہ عام لفظ ہے ہر P.H.D کرنے والے کو ڈاکٹر کہا جاتا ہے خواہ وہ کسی بھی فن و شعبے میں ہو، تاہم اس سے بھی حکیم کی طرح عوام میں معالج ہی مراد ہوتا ہے۔

علم طب کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس کی تدوین کب ہوئی؟ اس سوال کا جواب کافی مشکل ہے بلکہ کوئی حتمی بات کہنا ناممکن ہے کیونکہ قدیم زمانے کی کوئی مستند تاریخ قرآن و سنت کے علاوہ محفوظ نہیں ہے حتیٰ کی یہود و نصاریٰ نے سادوی کتب کے تاریخی واقعات کو بھی اپنی تلمیسات کا نشانہ بنایا ہے اور قرآن و سنت میں علم طب کی ابتداء و تدوین کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔

طب کا ثبوت :- جرأت یقین سے کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں میں طب کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے بلکہ جانداروں کی بہت سی اقسام بھی اس علم سے وابستہ رہی ہیں اور بنی جنس حیوانی اپنی اپنی استعداد کے مطابق علاج سے مستفید رہے ہیں، اس لئے یہ علم متفقہ طور پر مسلمات میں سے ہے۔ تاہم طب اور علاج کو اسباب کے درجہ میں ماننا چاہئے اس سے زیادہ مؤثر ماننے میں ایمان کا خطرہ ہے بلکہ ضیاع ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علاج روٹی اور پانی کی طرح ظاہری اسباب میں بھی شامل نہیں بلکہ اسباب مخفی میں سے ہے لہذا اس کو ظنی اسباب کا درجہ دینا چاہئے، ہاں جہاں سبب بہت زیادہ نمایاں ہو تو اسی تا سب سے حسن ظن میں

یا یقین میں کوئی حرج نہیں، جیسے گردوں کی پتھری کے لئے جراحی سے مرض کا ازالہ یقینی ہے بشرطیکہ زخم مجزنہ جائے، اسی طرح ٹائیفائیڈ اور لیبریا کی صحیح تشخیص سے بھی ماہر ڈاکٹر کا علاج نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، باقی عام علاج ظنی ہے۔

دوسری جانب جو لوگ طب، علاج اور اسباب کا انکار کرتے ہیں تو ان کی بات محض بے معنی ہے وہ اس قابل نہیں کہ اس کی تردید میں وقت ضائع کیا جائے۔

امام ترمذی نے ابواب میں صحیح احادیث سے ثابت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پرہیز اور علاج کی رخصت عطا فرمائی ہے بلکہ بعض روایات میں امر کے صیغہ بھی آتے ہیں۔

ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث فرمائی ہے جو الگ کتابی شکل میں ”طب نبوی“ کے نام سے چھپ گئی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: ”موجودہ معالجن کا سرمایہ علم طب یا تو قیاس ہے، بعض نے تجربہ، بعض نے الہام ربانی، کسی نے سچا خواب اور کسی نے ایک زیرک و دانادماغ کی پیداوار کہا ہے۔“

بہتوں نے اس فن کو حیوانات و بہائم کا درس بتلایا ہے پھر اس کی کچھ مثالیں دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی کچھ بعید از عقل نہیں کہ وحی الہی کے ذریعہ مضر قوتوں اور منافع کا علم ہم تک پہنچا ہو۔ بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ علاج کے عمدہ ہونے کے تمام باکمال اطباء اور اساطین فن نے اقرار کیا ہے۔

بہر حال ان ابواب میں جسمانی، قلبی اور روحانی علاج کے بہت سارے طریقے مروی ہیں جیسا کہ باقی کتب احادیث میں بھی طب پر مستقل ابواب قائم کئے گئے ہیں۔

باب ماجاء فی الحمیۃ

”عن ام المندر قالت: دخل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومعہ علیؑ وکنا دوال معلقة قالت فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأکل ومعہ علیؑ یأکل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلیؑ: منہ، منہ یا علیؑ فانک نایۃ قال فجلس علیؑ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یأکل قالت فجعلت لہم سلقا وشعیرا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یا علیؑ! من ہذا فأصب فانہ اوفق لک۔“ (ہذا حدیث حسن غریب)

حضرت ام المندر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں

تشریف لائے، حضرت علیؑ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور ہمارے یہاں کچی کھجوروں کے خوشے لٹکے ہوئے تھے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کھانے لگے اور ان کے ساتھ حضرت علیؑ بھی کھانے لگے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا بس کرو، بس کرو اے علیؑ! کیونکہ تم ابھی (بیماری کی وجہ سے) کمزور ہو۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت علیؑ بیٹھ گئے جبکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بدستور کھاتے رہے، ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ان کے لئے چقندر اور جو کا کھانا تیار کیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علیؑ اس میں سے لو کیونکہ یہ حیرے موافق (منفید) ہے۔

لغات:۔ قولہ "الحصبة" بکسر الحاء، بچاؤ اور حفاظت کے معنی میں ہے اور بالخصوص مریض کے نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

قولہ "حوال" والیہ کی جمع ہے ناچختہ کھجوروں کی شاخ۔ قولہ "معلقة" لٹکی ہوئی، ممکن ہے کہ یہ درخت گھر کے صحن میں ہو اور اس کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں مگر ظاہر یہ ہے کہ اس خوشے کو توڑ کر لایا گیا ہو اور گھر میں چھت وغیرہ کے ساتھ لٹکایا گیا ہو جیسا کہ عام معمول ہے کیونکہ یہیں کھجوریں پختہ ہو کر کھائی جاتی ہیں۔ قولہ "مہ" اسم فعل ہے بمعنی اکفف یعنی رک جاؤ اور کھانے سے بس کرو!۔ قولہ "ناقه" بروزن صاحب اس آدمی کو کہتے ہیں جو بیماری سے ٹھیک ہو جائے مگر ابھی تک کمزوری باقی ہو۔ قولہ "یسلق" بکسر السین چقندر کو کہتے ہیں۔ یہ شہبہ کی طرح ایک ترکاری ہے اس سے چینی بھی بنائی جاتی ہے جو غیر معیاری ہوتی ہے۔ قولہ "فاصب" امر کا صیغہ ہے بمعنی ادرک یعنی کھل و خذ۔ قولہ "اوفق لك" بمعنی موافق تر اور مناسب تر کے ہے۔ یہ اسم تفضیل مبالغے کے لئے ہے تفضیلی معنی میں نہیں کیونکہ پھر تو مطلب یہ ہو جائے گا کہ کھجور بھی موافق ہے مگر چقندر زیادہ موافق ہے حالانکہ یہ معنی صحیح نہیں، لہذا یہ کہا جائے کہ چقندر بذات خود تیرے لئے منفید ہے کہ نرم غذا ہے لہذا خطرے کا اندیشہ نہیں ہے۔

تشریح:۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بالکل شروع میں کھانے سے نہیں روکا کیونکہ دو تین کھجور کھانے سے پیٹ کے سخت ہونے یا دوسرے ضرر کا اندیشہ نہیں ہوتا ہے البتہ زیادہ کھانا نازک پیٹ کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے کہ کھجور بھاری غذا ہے اور مرض کی وجہ سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے اس لئے جب تک مکمل صحت یابی نہ ہو تو قتل غذا سے پرہیز کرنا چاہئے۔ (کذا فی البذل و فیہ: وفی الحدیث دلیل

علی فضل علم الطب وان الطیب یقبل قوله ویرجع الیہ)

اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے امام ترمذی نے پرہیز کے ثبوت پر باب باندھا ہے، اور یہی باقی علماء کی بھی رائے ہے چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے بھی اس حدیث پر ایسا ہی باب باندھا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی اس آیت سے بھی پرہیز کا ثبوت ہوتا ہے ”وان کنتم مرضی او علی سفر... الی قوله... فتیمموا صعیداً طیباً“ لآیۃ ۱۔ اس آیت میں مریض کے لئے مرض بڑھنے سے بچنے کے لئے تیمم کی رخصت دی گئی ہے۔

مرض لاحق ہونے سے قبل پرہیز اور دوا کا حکم:۔ باب کی حدیث سے تو یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ مرض کے دوران یا جب تک کہ اس کے اثرات باقی ہوں تو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی صورت ایسی ہو جس کو بطور حفظ یا تقدم کے اختیار کرنے سے بیماری سے بچا جاسکے تو کیا حالت صحت میں اس پر عمل کرنا جائز ہے؟ مثلاً زیادہ ٹھنڈے پانی سے پرہیز یا آج کل جیسے بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو ابن العربیؒ کے کلام سے اس کی گراہیت معلوم ہوتی ہے:

”فنقول ان من الطب استرسال المرء علی شہواته فی صحته، وکفه عما یضره

فی مرضه من الاطعمة والاشربة فاذا احتتم فی صحته مخافة ان یمرض فهو من

باب استعمال الادویة مخافة ان یمرض وهو مکروه“۔ (عارضۃ الاحوی)

یعنی حالت صحت میں جو دل کرے وہ آزاد ہے (یعنی امور مباحہ میں) جبکہ مرض میں نقصان دہ کھانے پینے سے پرہیز کرے، اگر وہ صحت میں پرہیز کرے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے صحت میں مرض سے بچنے کے لئے دوا کا استعمال اور یہ مکروه ہے۔

المستز شد عرض کرتا ہے کہ اس بارے میں جستجو کے باوجود فقہ حنفیہ میں کوئی صریح جزیئہ نہ مل سکا لیکن اصول کی رو سے ایسا لگ رہا ہے کہ جس ضرر کے لاحق ہونے کا اندیشہ قوی ہو تو اس سے بچاؤ کی صورت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں خواہ وہ تحفظ پرہیز کی صورت میں ہو یا دوا کے استعمال سے ہو، ہاں توہمات کے درپے نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی چیز کسی جہت سے مفید ثابت ہوتی ہے تو اس کا استعمال بھی جائز ہے۔

چنانچہ مدیۃ المصلیٰ اور اس کی شرح طحطاویؒ، شرح الکبیر (کبیری) میں ہے:

ابواب الطب عن رسول اللہ ﷺ

باب ما جاء فی الحمیة

”والجنب الصحيح في المصرا اذا خاف بغلبة ظنه عن التجربة الصحيحة ان اغتسل ان يقتله البرد او يمرضه يتيمم عندا ي حنيفة رحمه الله... وان كان عارج المصريتيمم بالاتفاق“۔ (کبیری ص: ۶۶)

اس عبارت میں ظن غالب اور صحیح تجربے کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ کسی مرض کا قوی اندیشہ جبکہ وہ مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہو اور محض خیال اور وہم نہ ہو مرض اور میج ہے اس کے ضرر سے بچنے کی تدبیر کے لئے۔ (تذکر) چونکہ آج کل خسرہ، پولیو اور بعض دیگر امراض کا لاحق ہونا خصوصاً بچوں کے حق میں عام مشاہدہ ہے جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے چیچک سے بچاؤ کے لئے ٹیکوں کی مہم جوئی مفید ثابت ہوئی ہے اور آج کل مذکور الصدر بیماریاں بھی کافی حد تک کنٹرول ہو چکی ہیں اس لئے میرے نزدیک ان سے حفاظت کے پیش نظر ٹیکے لگانا اور لگوانا دونوں جائز ہیں۔ واللہ اعلم

ابوداؤد کے ابواب الطب میں ”باب فی قمر النجوم“ میں مرفوع حدیث ہے ”من تصبّح بسمع تمرات عسوة لم يضره ذلك اليوم سم ولا سحر“۔ اس کے بعد دونوں بابوں میں عود ہندی اور سرے کے فوائد مردی ہیں۔ (ابوداؤد ص: ۵۳۱ ج: ۲، میر محمد کتب خانہ)

اس قسم کی احادیث اور مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں اگر ان کو جمع کیا جائے تو اچھا خاصا ضخیم مجموعہ بن جائے گا جس سے کم از کم جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس بارے میں طاعون زدہ علاقے میں جانے کی ممانعت والی روایت اور یہ آیت ”ولا تلقوا بأيديكم الى التهلكة“ کے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔

حدیث آخر:۔ حضرت قتادہ بن العثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو دنیا سے اس طرح بچاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے مریض کو پانی سے بچاتا ہے۔

تشریح:۔ اس روایت میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں اور ان سے روایت کرنے والے

۱۔ الحديث المخرجه ايضاً بخاري في صحيحه ص: ۸۱۹ ج: ۲ ”باب المعجوة“ كتاب الاطعمة، ايضاً كتاب الطب باب: ۵۶ و ۵۷، صحيح مسلم ص: ۱۸۱ ج: ۲ كتاب الاطعمة ايضاً مسند احمد ص: ۲۹۶ ج: ۱ حديث: ۱۵۴۵، ايضاً سنن كبرى للبيهقي ۳۳۵/۹، وابونعيم في الحلية ۳۶۲/۵ والبيهقي في شرح السنة ۳۲۳/۱۱، واورده المصنف في زوائد المسند برقم: ۳۰۳۶، والمطى الهندي في كنز العمال: ۳۳۸۵۰، ۲۸۲۰۵، بحواله مجمع الزوائد ص: ۳۶ ج: ۵ كتاب الاطعمة. ج: سورة البقرة آيت: ۱۹۵.

حضرت محمود بن لبید بھی صحابی ہیں جیسا کہ امام ترمذی نے تصریح کی ہے تاہم ان کی عمر چھوٹی تھی اس لئے یہ روایت بغیر واسطہ قنادہ کے مرسل ہوگی جیسا کہ امام ترمذی نے فرمایا ہے۔ مگر اس سے روایت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑیگا کہ ”الصحابۃ کلہم عدول“۔ لہذا اسرائیل صحابہ بالاتفاق حجت ہیں۔

اس روایت میں ”حماء الدنيا“ میں لفظ ”من“ مقدر ہے ”ای حماء من الدنيا“۔ اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ دنیا انسان کے لئے رغبت کی چیز ہے مگر وہ سخت نقصان دہ ہے، جب آدمی کے پاس زیادہ مقدار میں جمع ہو جائے تو آدمی حد آدمیت سے عموماً خارج ہو جاتا ہے اور اپنے فرائض سرانجام دینے کے بجائے خواہشات نفسانیہ کی تکمیل میں لگ جاتا ہے، اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو دنیا کے مناصب اور مال و متاع سے دور رکھتے ہیں تاکہ وہ بددماغی کا شکار نہ ہوں۔ اس مضمون کو سمجھانے کی غرض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض کی مثال دی ہے مگر یہاں یہ قید ملحوظ رہے کہ یہاں تمام بیماروں کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ وہ مریض مراد ہے جس کے لئے پانی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے جیسے استقاء، دل کا مریض جب مرض شدت اختیار کر لے اور بھیچھڑے کام کرنا چھوڑ دیں یا گردے فیل ہو جائیں وغیرہ، تو ایسا مریض شدت پیاس کی وجہ سے پانی کو ترستا ہے مگر نقصان کے پیش نظر اس کے ہمدرد پانی نہیں دیتے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دنیاوی مال و متاع یا منصب سب لوگوں کے لئے برا نہیں جیسے پانی تمام مریضوں کے لئے یکساں نہیں، لہذا جن نیک لوگوں کو دنیا ملتی ہے وہ مزید صالح بن جاتے ہیں۔ امام غزالی نے مثال دی ہے کہ پیر اگر سانپ سے کھیلتا ہے تو وہ اس کے لئے مضر نہیں مگر عام آدمی اگر سانپ ہاتھ میں پکڑے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ تدبر

باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ

”عن اسامة بن شريك قال قالت الاعراب: يا رسول الله! ألا نتداوى؟ قال نعم يا عباد الله! تداووا فان الله لم يَضَعْ ذاءً الا وضع له شفاءً“ او قال دواءٌ لا داءٌ واحداً فقالوا يا رسول الله وما هو؟ قال الهرم“۔^۱ (هذا حديث حسن صحيح)

باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ

۱۔ الحديث أخرجه أيضاً الطبرانی في الكبير، مجمع الزوائد ص: ۹۸ ج: ۵ کتاب الطب

یہ باب دوا کی اہمیت اور اس کی ترغیب کے بارے میں ہے۔

حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اعراب نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا ہم علاج کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اے اللہ کے بندوں دوا استعمال کرو کیونکہ اللہ نے کوئی بیماری پیدا نہیں کی مگر اس کے لئے شفاء بھی پیدا فرمائی ہے یا فرمایا (راوی کو شک ہے) کہ دوا (ضرور پیدا کی ہے) سوائے ایک بیماری کے تو انہوں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! وہ کیا (بیماری) ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بڑھاپا۔ (یعنی بڑھاپا ایسا مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں)

لغات:- قوله "ثم يضع" ای لم يعلق۔ قوله "شفاء" او دواء "الليخ" لفظ "او" راوی کے شک کے لئے ہے۔ قوله "الهرم" بروزن ترقی یعنی بڑھاپا۔ پھر الھرم مرفوع بنا بر خبریت ہے "ای هو الھرم"۔

تشریح:- اس حدیث مبارکہ سے علاج کی رخصت معلوم ہوئی جو ان صوفیہ کے خلاف حجت ہے جو ترک علاج اور توکل پر زور دیتے ہیں گویا وہ علاج کو توکل کے منافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ تاثر غلط ہے کیونکہ توکل ترک اسباب کو نہیں کہتے بلکہ اسباب پر یقین نہ کرنے کو کہتے ہیں، دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں فرمائی ہیں، ہتھیار جمع کئے اور استعمال فرمائے ہیں جنگوں میں صحابہ کرام کو مورچوں پر بٹھایا ہے اور ان جیسے اسباب اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے جبکہ حدیث الباب میں "تداؤوا" امر کا صیغہ ہے جس کا ادنیٰ تقاضہ اباحت کا ہے پس اگر اسباب اختیار کرنا منافی توکل ہوتا تو سید التوکلین اس کا حکم کیسے کر سکتے ہیں معلوم ہوا کہ اسباب اختیار کرنا الگ چیز ہے اور ان پر اعتماد کرنا دوسری شے ہے ایک مسلمان اور کافر میں یہی فرق ہوتا ہے کہ کافر اپنے حاصل کردہ اسباب پر بھروسہ اور فخر و ناز کرتا ہے جبکہ مسلمان کا اعتماد اسباب کے بجائے اللہ پر ہونا چاہئے۔

پھر العرف الشدی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے امام غزالیؒ سے نقل کیا ہے کہ اگر مریض کو کسی دوا سے شفاء کا یقین ہو (جیسے گردے کا آپریشن کر کے پتھری نکالنا) اور وہ علاج نہ کرے اور مر جائے تو گناہ گار ہوگا جبکہ گمان کی صورت میں اسے اختیار ہے اور وہ ہم کی صورت میں ترک علاج ادولی ہے۔

۱۔ وعن انس ان رسول الله ﷺ قال ان الله عز وجل حيث خلق الداء خلق الدواء فتداؤوا، رواه مصنفه ابن أبي شيبة ۳۵۹/۷، ابن عبد البر في التمهيد ۲۸۵/۵، ومسند احمد ص: ۶۳۰ ج: ۳، حديث: ۱۲۱۸۲، مجمع الزوائد ص: ۹۶ ج: ۵، كتاب الطب.

گویا جہاں اسباب میں قوت اور مرض میں شدت ہوگی تو علاج کی تاکید زیادہ ہوگی جبکہ مرض کے نسبتاً کم نقصان اور علاج کے پیش نظر حکم میں تخفیف آتی ہے حتیٰ کہ توہم کی صورت میں ترک ہی افضل ہے اور متوکل کے لئے اس آخری درجے پر عمل کرنا یعنی علاج نہ کروانا کافی ہے۔

ادویات وغیرہ کے اسباب کی تاخیرات کا اصولی حکم واختلاف ”باب کرہیۃ البول فی المختسل“ میں گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۱۳۸، ۱۳۹ ج: ۱)

غرض ادویات استعمال کرتے وقت اعتماد و دواء پر نہیں بلکہ اللہ جل جلالہ پر ہی ہونا چاہئے مگر اس نیت سے استعمال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نظام ایسا بنایا ہے کہ ہر چیز دوسرے کے ساتھ بخوبی ہوئی ہے چنانچہ اگلے درجے تک جانے کے لئے سیرھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ مگر

پھر بڑھاپے کو مرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مرض کی وجہ سے بدن کمزور ہو کر ختم ہو سکتا ہے اسی طرح بڑھاپے سے بھی بلا آخر موت آتی ہے یعنی کلام میں بڑھاپے کو مرض سے تشبیہ دی گئی ہے یا پھر ہرم سے مراد موت ہے مگر بڑھاپا چونکہ موت کا قریبی اور قوی سبب ہے اس لئے موت پر بڑھاپے کا اطلاق کیا گیا گویا کہ مجازاً۔

ابن العربی نے عارضہ میں اس کی چار وجوہات بیان کی ہیں مگر اول کو پسند کیا ہے۔ فمن شاء الاطلاع فلیراجع۔

باب ماجاء ما یطعم المریض

”عن عائشة قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا احذاھلۃ الوعک امر بالحساء فصنع ثم امرھم فحسوا منہ وکان یقول: انه لیرتو فواد الحزین ویمسرو عن فواد السفیم کما تمسروا احدا کن الوسخ بالماء عن وجھہما“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب ان کے گھروالوں (میں سے کسی) کو بخار ہو جاتا تو حریرہ پکانے کا حکم دیتے چنانچہ وہ تیار کیا جاتا پھر ان کو حکم فرماتے تو بخلو لے

یعنی اس کی تاکید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ ﷺ قال: ما نزل اللہ من داء الا انزل له دواء علم ذالک من علمہ او جهل ذالک من جهلہ الا السام قالوا یا نبی اللہ وما السام؟ قال: الموت، مجمع الزوائد ص: ۹۷ ج: ۵ حدیث: ۸۷۸۸۔

لے کر وہ تناول فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ یہ غم زدہ شخص کے دل کو قوت (اور تسکین) دیتا ہے اور بیمار کے دل سے بیماری کا اُلم دور کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی پانی سے اپنے چہرے سے میل پکیل کو زائل کرتی ہے۔

لغات:۔ بقولہ "الْوَعَلُ" بروزن عہد بخار کو کہتے ہیں، یہ اخذ کا قائل جبکہ "اهله" مفعول مقدم ہے۔
 قولہ "الحساء" بروزن سحاب ہر نرم غذا کو کہتے ہیں جس کو چبانانہ پڑتا ہو مگر عام طور پر جو آٹا پانی میں پکا کر اور پھر اس پر تیل یا گھی ڈال کر تیار کیا جاتا ہے اُسے کہا جاتا ہے، اہل مکہ اسے حریرہ کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں پہلے اس کا استعمال کافی زیادہ ہوتا تھا اور طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اسے بڑے تھال میں ڈال کر درمیان سے خالی جگہ بنائی جاتی، اس میں دودھ، گھی اور چینی یا گڑ ڈالتے پھر چلو سے نوالہ سا بنا کر اُسے دودھ میں ڈبو کر کھاتے۔ تحفہ میں ہے: "وہو طبیخ يتخذ من دقيق وماء ودهن وقد يحلى ويكون رقيقاً نحساً"۔ تاہم دودھ اور شہد کے ساتھ تیار ہونے والے حریرہ کو تلمینہ کہتے ہیں جیسا کہ نام سے واضح ہے کیونکہ لہن دودھ کو کہتے ہیں چنانچہ صحیحین^۱ میں تلمینہ ہی کے الفاظ آئے ہیں، یہ تلمینہ حریرہ کی ایک قسم ہے، اسی طرح ثابت "نحو" پانی میں اُبال کر بھی حریرہ بناتے ہیں جسے ماء الشعیر کہا جاتا ہے جبکہ تلمینہ میں جو (وغیرہ) کا آٹا ہوتا ہے اور یہ قسم زیادہ مفید ہوتی ہے۔ (صرح بہ ابن القیم فی الطب النبوی)

قولہ "المسرو" اسی ہشید و بقوی یعنی دل کو فرحت و طاقت بخشتا ہے۔ قولہ "مسرو" ای ہکشف ویزیل یعنی دل کی تکلیف اور درد کو زائل کرتا ہے۔

تشریح:۔ چونکہ بیماری سے قوت شہوانیہ اور قوت ہاضمہ دونوں کمزور ہو جاتی ہیں اس لئے معدہ سخت اور فضل غذا ہضم نہیں کر سکتا تاہم یہ حالت مرض اور افاقہ کی صورت میں مریض کو نرم غذا دینا ہی مناسب ہے جیسا کہ آج کل ڈاکٹر زردودھ اور ڈبل روٹی دینے کو کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ڈبل روٹی کا وجود نہ تھا اس لئے نرم غذا کی صورت تلمینہ اور حریرہ ہی کی ہو سکتی تھی، نیز کبھی مریض اتالاغر اور کمزور ہو جاتا ہے کہ سخت غذا کو چبا بھی نہیں سکتا چنانچہ ابن العریقی نے عارضہ کے اسی باب میں اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ دشمن سے ساری رات

باب ما جاء ما يطعم المريض

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۱۵ ج: ۲ "باب التلمینة" کتاب الاطعمہ، ایضاً زواہ فی الاثریۃ، صحیح مسلم ص: ۲۲۷ ج: ۲ کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۹ "باب التلمینة" ابواب الطب، ایضاً مستند احمد ص: ۱۱۸ ج: ۷ حدیث: ۲۳۹۹۱، ایضاً راجع جمع الفوائد ص: ۲۵۲ ج: ۲ کتاب الطب، دار الکتب العلمیۃ بیروت۔

بھاگتا رہا اور سخت کوشش میں مبتلا تھا دوسرے دن ایک قلعہ میں پہنچا انہوں نے میرے سامنے روٹی اور گوشت رکھا باوجودیکہ میں ایک شب دروازے سے بھوکا تھا مگر اس روٹی کے نگلنے پر قادر نہ تھا، کھانے کو حلق سے اتارنے کی غرض سے پانی پیامگر وہ روٹی پانی میں گر گئی اور میں کھانا نہ سکا اگر یہ بجائے روٹی کے حریرہ ہوتا تو میں کھا لیتا۔

غرض حریرہ میں بھر پور غذائیت بھی ہے اور نرم ہونے کی بناء پر اس کا کھانا بھی آسان ہے اس لئے مریض کے لئے مفید ہے خاص کر جب گرم ہو کیونکہ مرض کی وجہ سے حرارت غریزہ کم ہو جاتی ہے اس لئے دل متاثر اور معدہ کمزور ہو جاتا ہے، جب گرم گرم کھا لیا جائے تو اس سے حرارت غریزہ بحال ہونے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے جیسا کہ ابن القیمؒ نے طب النبوی میں اس کی تفصیل میں بیان کیا ہے، اور یہی ایک وجہ دل کے غم دور کرنے کی ہے۔ دوسری وجہ دل کو راحت پہنچانے کی یہ ہے کہ تلمیذ میں فرحت بخش ادویات کی طرح کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے دل کو سرور اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بیماری کی وجہ سے معدہ وغیرہ اعضاء میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور چونکہ خشکی سے بے چینی جنم لیتی ہے اس لئے خشک مزاج آدمی اور بوڑھے شخص کو غصہ زیادہ آتا ہے۔ حریرہ سے نمی اور تری پیدا ہوتی ہے جس سے خشکی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ کذافی

الطب النبوی لابن القیم الجوزیہ (فصل ۲۸)

باب ماجاء لا تکرهوا مرضاکم علی الطعام والشراب

”عن عقبہ بن عامر الجھنی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تکرهوا مرضاکم علی الطعام فان اللہ تبارک وتعالیٰ یطعمهم ویسقیهم“۔ (حسن غریب)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مریضوں کو کھانے پر مجبور مت کرو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو کھلاتا پلاتا ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں بکر بن یونس بن بکر ضعیف راوی ہیں۔ تاہم امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ابن ماجہؒ اور حاکم نے بھی اس کی تخریج کی ہے اس لئے اس مضمون کو قبول کرنا پڑے گا۔

باب ماجاء لا تکرهوا مرضاکم علی الطعام والشراب

۱۔ سنن ابن ماجہ ص: ۲۳۶ ”باب لا تکرهوا المریض علی الطعام“ ابواب الطب، مستدرک حاکم ص: ۳۲۶ ج: ۵۔ حدیث: ۸۳۳۰ کتاب الطب، ایضاً آوردہ المصنف فی کشف الاستار برقم: ۳۰۱۸ مجمع الزوائد ص: ۹۹ ج: ۵، ایضاً جمع الفوائد ص: ۲۳۶ ج: ۲ حدیث: ۷۴۷۳۔

پس اس حدیث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ مریض کو خلاف خواہش کھانے پر مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ دوم یہ کہ اس کو من جانب اللہ کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔

پہلی بات تو بدیہی ہے کیونکہ جب کھانے کا اشتیاق نہ ہو اور اسے زبردستی کھلایا جائے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پیٹ بھر کر کھانے کے بعد دوبارہ کھالے اور ظاہر ہے کہ یہ کھانا کوئی مفید نہیں ہو سکتا بلکہ مضری ثابت ہوتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے تو اسی طرح مریض کی حرارت غریزہ کم ہونے کی صورت میں وہ کھانے کو ہضم نہیں کر سکتا۔ اگر اسے زبردستی کھلایا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بدن مزید بھاری پن اور ثقل محسوس کرے گا اور عین ممکن ہے کہ بگاڑا ہوا نظام ہضم مزید بگاڑ کا شکار بن جائے۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو بعض شارحین نے اسے مجاز پر محمول کیا ہے یعنی جس طرح کھانے پینے سے آدمی روٹی اور پانی سے بے فکر ہو جاتا ہے اسی طرح مریض بھی اس صبر کی وجہ سے جو اسے اللہ تبارک و تعالیٰ عطا فرماتا ہے کھانے پینے سے بے فکر ہو جاتا ہے اور یہی کھانے کا مقصد ہوتا ہے، لہذا تحصیل حاصل کی ضرورت نہیں۔

مگر ابن القیم طب نبوی میں لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ بہت لطیف ہے اطباء کی عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، اس کی وجہ وہی سببے گا جو روح اور قلب کے معاملات سے پوری طرح واقف ہو، پھر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب نفس کسی امر کی طرف متوجہ ہو کر مشغول رہتا ہے تو کھانے پینے کی مانگ اور طلب ختم ہو جاتی ہے پس جب نفس کو غیر معمولی شغل اور خصوصاً نشاط پیش آئے تو وہ غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے اس سے طبیعت آسودہ ہو جاتی ہے اور ساری قوتوں میں جان آ جاتی ہے۔ (مزید تفصیل طب نبوی فصل ۳۴ میں دیکھی جاسکتی ہے)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ یہ وجہ مشاہدے کے عین مطابق ہے کہ اس کا مشاہدہ ہر دور کے آدمیوں میں کیا جاسکتا ہے، بچے سارا دن اگر کھیلتے رہیں تو ان کو اپنی بھوک اور پیاس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور اس کا ہم بچپن میں بارہا تجربہ کر چکے ہیں۔ راقم کو کئی سالوں کا تجربہ ہے کہ جب لکھنے کا کام زیادہ ہوتا ہے تو ان دنوں میں بھوک بالکل مٹ جاتی ہے اس لئے بھوک لگانے کی خاطر کبھی کبھار اس تسلسل کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ بھی تجربہ ہے کہ روزہ رکھنے سے بھوک کی تکلیف تو ہرگز نہیں ہوتی البتہ کبھی کبھی پیاس کا احساس ہوتا ہے، کبھی کم اور کبھی زیادہ، گوکہ میں اس کو بیماری سمجھتا ہوں لیکن اس بھوک نہ لگنے سے بجز اللہ میرا کام کبھی نہیں رکا ہے۔ عرصے سے لکھنے پڑھنے

کا کام بدستور جاری ہے۔

دنیا کے بے شمار واقعات ایسے ہیں کہ بہت سے لوگ کھانے پینے کا کام بہت کم کرتے ہیں مگر وہ اپنا روحانی کام شد و مد کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو جس طرف متوجہ کیا جائے یہ وہی کام کرتا رہتا ہے۔ عورتوں کے تصور سے عورتوں کی طلب بڑھتی ہے۔ کھانے کے تخیل سے بھوک لگتی ہے۔ اور آخرت کے تفکر سے نعمت ہائے جنت اور رضائے باری تعالیٰ کی غیر معمولی تمنا لاحق ہوتی ہے اور مادی کھانے پینے کی طلب مٹ جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے۔

باب ماجاء فی الحبة السوداء

”عن ابی ہریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: علیکم بهذه الحبة السوداء فان فیہا شفاء من کل داء الا السام، والاسام الموت“۔^۱ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کلونجی کا استعمال ضرور کیا کرو کہ اس میں ہر بیماری سے شفاء ہے سوائے سام کے اور سام موت ہے۔

لغات:۔ قولہ ”الحبة السوداء“ کلونجی کو کہتے ہیں جو عموماً اچار میں استعمال ہوتی ہے۔ ابن العربی عارضہ^۲ میں لکھتے ہیں: ”والحبة السوداء الشونیز“۔ شونیز فارسی لفظ ہے حضرت شاہ صاحب^۳ نے ”العرف الشدی“ میں فرمایا ہے کہ فارسی میں اس کو سیاہ دانہ بھی کہتے ہیں مگر ہندی زبان میں سیاہ دانہ ایک زہریلے بیج کو کہتے ہیں۔ قولہ ”علیکم بهذه الحبة السوداء“ ای باستعمال الحبة السوداء۔ قولہ ”السام“ موت کو کہتے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث سے کلونجی کا فائدہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اللہ نے اس میں ہر بیماری سے شفاء کا اثر ودیعت فرمایا ہے البتہ اگر کوئی بیماری ایسی ہو جس سے موت مقدر ہو تو اس میں مفید ثابت نہ ہوگی کیونکہ

باب ماجاء فی الحبة السوداء

۱۔ الحديث أخرجه البخاری ص: ۸۳۸ ج: ۲ ”باب الحبة السوداء“ کتاب الطب، صحيح مسلم ص: ۲۲۷ ج: ۲ کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ص: ۲۲۶ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۴۷۸ ج: ۲ حدیث: ۷۵۰۴، ۷۵۰۳، ۷۵۸۲، ایضاً جمع الفوائد ص: ۲۸۹ ج: ۲ حدیث: ۷۵۱۸، ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۰۱ ج: ۵ حدیث: ۸۲۹۷۔ ۲۔ روى الطبرانی فی الاوسط عن الس بن مالک ان النبی ﷺ کان اذا اشتكى لقمح کفا من شونیز ویشرب علیہ ماء وعلیلاً، مجمع الزوائد ص: ۱۰۰ ج: ۵ حدیث: ۸۲۹۵۔

اسباب تقدیر کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔ تمام اسباب میں اللہ عزوجل کی یہی سبب جاری رہے کہ اس عالم میں اسباب کو موثر بنایا ہے مگر جہاں اسباب میں تضاد و تضاد آجائے تو پھر کبھی ترجیح قوت سبب کی بناء پر ہوتی ہے اور کبھی کسی مصلحت کی بناء پر یہ سبب کفکاش اس وقت ہوتی ہے جب مقررہ وقت نہیں آ جاتا۔ اجل آنے پر اسباب فیل ہو جاتے ہیں۔ (مزید تفصیل حجۃ اللہ الباقیہ میں دیکھی جاسکتی ہے)

اس حدیث کے مضمون میں تو کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کلونجی ایک مفید دوا ہے اور العرف اللہ کی میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ابوعلی سینا نے اس کے چالیس سے زیادہ فائدے ذکر کئے ہیں۔ تاہم قابل غور صرف یہ پہلو ہے کہ یہ حدیث شریف اپنے عموم پر محمول ہے جیسا کہ الفاظ سے عموم معلوم ہوتا ہے یا مراد مشکلم یہاں خاص ہے؟ تو اس بارے میں شارحین حدیث کے دونوں قول ہیں۔ عام شارحین کی رائے یہ ہے کہ کلونجی چونکہ مزاج کے اعتبار سے خشک اور گرم ہے اس لئے یہ فقط ان امراض میں مفید ہے جو رطوبت اور برودت کی وجہ سے لاحق ہو جائیں اور مدینہ منورہ زاد ہا اللہ نوراً و شرفاً کے لوگوں کو اکثر اسی قسم کی بیماریاں لاحق ہوتی تھیں۔

جبکہ شارحین کا دوسرا فریق اسے عموم پر محمول کرتا ہے، لہذا اب مطلب یہ ہوگا کہ کلونجی مفید تو تمام امراض میں ہے تاہم اس کے استعمال کے طریقے مختلف ہیں، کبھی مفرد مفید ہوتی ہے اور کبھی دوسری اشیاء کے ساتھ ملانے سے فائدہ دیتی ہے لہذا اگر اس کا استعمال صحیح طریقے سے کیا جائے جو ماہر طبیب ہی بتا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں شفاء نہ ہو، اس کے فوائد اور طرق استعمال طب نبوی لابن القیمؒ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج کل کلونجی کا تیل ملتا ہے تجربے سے وہ بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

باب ماجاء فی شرب ابوال الابل

”عن انس ان ناساً من عربۃ قد نعو المملیۃ فاجتروا ما فیہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اہل الصلۃ وقالوا شربوا من البانہا و ابو الہا“۔^۱ (حدیث حسن صحیح)

باب ماجاء فی شرب ابوال الابل

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۶۶۳ ج: ۲ کتاب التفسیر، ابناً أخرجه فی الجہاد باب: ۱۵۳، ولی النبیات باب: ۲۲، صحیح مسلم ص: ۵۷ ج: ۲ کتاب القسامۃ، سنن ابن ماجہ ص: ۱۸۵ کتاب العلود، والنسائی ص: ۶۶ او ۱۶۷ ج: ۲ کتاب المحاربة، ابناً مسند احمد ص: ۶۳۷ ج: ۳ جلیت: ۱۲۲۸، ۱۲۲۹ وغیرہ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ غریبہ قبیلے کے مدینہ آئے تو وہ پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے (یعنی آب و ہوا موافق نہ آئی) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اونٹوں کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو اور ان کا پیٹ شاب بھی۔

ملاحظہ:- اس حدیث کی شرح ”باب ماجاء فی بول الماکل لحمہ“ میں تفصیلاً گزری ہے۔ (دیکھیے تشریحات ترمذی ص ۲۳۵-۲۳۶ ج ۱)

باب من قتل نفسه بسم او غیرہ

”عن ابی ہریرۃ رآہ رفعہ قال: من قتل نفسه بحدید جاء یوم القیمة و حدیدتہ فی یدہ یتوجأ بہا بطنہ فی نار جہنم خالداً مُخلداً ابدًا، و من قتل نفسه بسم فسمہ فی یدہ یتحساه فی نار جہنم خالداً مُخلداً ابدًا“۔ اگلی حدیث جو کہ صراحۃً مرفوع ہے اس میں یہ اضافہ ہے ”و من تردی من جبل فقتل نفسه فهو یتردی فی نار جہنم خالداً مُخلداً فیہا ابدًا“۔^۱ (حدیث صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے راوی کہتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ اس کو مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا کہ جو شخص لوہے سے خودکشی کر لے تو وہ قیامت کے دن آئے گا دریاں حلیکہ اس کا لوہا (آگہ قتل) اس کے ہاتھ میں ہوگا وہ دوزخ میں اس کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا ہمیشہ ہمیش کے لئے (یعنی جب تک جہنم میں رہے گا یہی عمل کرتا رہے گا) اور جس نے زہر سے خودکشی کر لی تو اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ بمشکل پیتا ہی رہے گا دریاں حلیکہ وہ جہنم میں ہوگا (اور جب تک دوزخ میں ہوگا) یہ کام ہمیشہ کرتا رہے گا۔ اس کے بعد امام ترمذیؒ نے دوسری سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے وہ مرفوع ہی ہے اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جس نے کسی پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خود کو ہلاک کیا تو وہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے (پہاڑ سے) چھلانگیں مارتا رہے گا۔

لغات:- قولہ ”ارآہ“ بضم الهمزة بمعنی ظن و گمان کے آتا ہے۔ قولہ ”یتوجأ“ مہوز اللام ہو جأ

باب من قتل نفسه بسم او غیرہ

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۸۶۰ ”باب شرب السم والدواء بہ“ کتاب الطب، و مسلم فی الایمان حدیث: ۱۷۵۰، و ابوداؤد فی الطب باب: ۱۱۱، و السالی فی الجنائز باب: ۶۸، الترغیب والترہیب ص: ۲۰۵ ج: ۳.

سے بمعنی مارنے کے جیسے چھرا مارنا نیزہ وغیرہ جیسا کہ حاشیہ قوت میں ہے۔ قولہ ”بہا“ ضمیر حدیدہ کی طرف راجع ہے مگر مراد کہ قتل ہے خواہ چھری یا نیزہ وغیرہ ہو یا بندوق کی گولی۔ قولہ ”غسی نار جہنم“ یہ حال ہے اسی حال کو نہ فی نار جہنم یعنی ایک مصیبت آگ کی ہوگی اور دوسری مسلسل خودکشی کرتے رہنے کی۔ والعیاذ باللہ۔ قولہ ”بسم“ اس میں سین پر تینوں حرکات یعنی فتنہ، ضمہ اور کسرہ جائز ہیں۔ تاہم فتح زیادہ فصیح ہے، اس میں میم مشدد ہے۔

قولہ ”ینحسہ“ حسا بحسو مجرد سے بمعنی تھوڑا تھوڑا اپنے کو کہتے ہیں جبکہ باب کی حدیث میں تاء کے اضافے سے اس میں تکلف کا معنی ادا کرنا مقصود ہے یعنی نہ چاہتے ہوئے بھی اور نکلنے پر قدرت کم ہونے کے باوجود وہ مجبوراً پیتا رہے گا۔ قولہ ”متردی“ زیدی ہلاکت کو کہتے ہیں جبکہ زوایا چنان کو کہا جاتا ہے۔ پس متردی کے معنی چنان یا کسی اونچی جگہ سے خود کو گرانے اور پھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کے ہوئے۔ تاہم چونکہ یہاں جبل کا ذکر بھی آیا ہے اس لئے یہاں ”متردی“ میں تجرید ہوگی۔

تشریح:- اس حدیث کے ظاہر سے معتزلہ استدلال کرتے ہیں جو مرکب کبیرہ کے تھلہ فی النار یعنی جہنم میں ہمیشہ پڑے رہنے کے قائل ہیں گو وہ خوارج کی طرح گناہ کبیرہ کے مرکب کو کافر نہیں کہتے۔

اہل السنۃ والجماعہ چونکہ ہر مؤمن و مومنہ کی نجات کے قائل ہیں، جس کے بے شمار دلائل ہیں، اور اپنے محل میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں: مثلاً شرح عقائد، شرح مواقف وغیرہا میں، اس لئے وہ اس حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کرنے کے بجائے اس کی ایسی تشریح و تاویل کرتے ہیں جس سے باقی فصوص جو نجات مؤمن پر دال و صریح ہیں کا باب کی احادیث سے کسی طرح کا تعارض نہیں آتا، چنانچہ ایک مطلب تو امام ترمذیؒ نے بتلایا ہے کہ ”وروی محمد بن عجلان... ولم يذكر فيه خالداً مخلصاً أبداً“ الخ یعنی اس روایت کے بعض طرق میں اگرچہ ”خالداً مخلصاً“ کا اضافہ ہے مگر محمد بن عجلان اور ابوالزناد وغیرہما کے طریق میں یہ اضافہ نہیں ہے۔ اور اگرچہ یہ اضافہ ماننا چاہئے کہ ثقہ کی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے مگر یہاں یہ اصول نہیں چلتا کیونکہ پھر دوسری نصوص سے روایت باب کا تعارض آتا ہے لہذا جن حضرات نے یہ اضافہ نقل نہیں کیا ہے ان کی روایت زیادہ اصح ہے ”و هذا اصح“ الخ۔

اس کا دوسرا جواب بصورت تسلیم اضافہ وہی ہے جس کی طرف اوپر ترجمہ کے ضمن میں اشارہ کیا گیا ہے

یعنی وہ شخص جب تک جہنم میں ہوگا تو یہ عمل جس کے ذریعہ اس نے خود کو قتل کیا ہے دہراتا رہے گا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا علیٰ ہذا "عالمہ مغلدا کما تعلق فی نار جہنم" کے ساتھ نہیں ہے بلکہ "یتو حابہا اور یتحسہ اور ینردی" کے ساتھ ہے۔ تدریر۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں اور مولانا محمد چراغ علی صاحب نے عرف میں بحوالہ شاہ صاحبؒ کے فرمایا ہے کہ ہر محل کا اپنا خلود ہوتا ہے لہذا دنیا کا خلود موت پر ختم ہو جاتا ہے اور عالم برزخ کا حشر پر تو اسی طرح عصاة مؤمنین کے خلود سے مراد ان کے طبقہ جہنم کے خاتمے تک ہوگا۔ تدریر ثانیاً

راقم کے نزدیک یہ جواب پہلے سے بھی زیادہ صحیح ہے کہ اس سے بہت ساری نصوص کا مطلب سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے اور کسی طرح کا اشکال بھی وارد نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی جوابات دیئے گئے ہیں: مثلاً یہ حکم حلال سمجھنے والے کا ہے یا تہدید پر محمول ہے یا خاصیت المفرد ہے وغیرہ وغیرہ۔

تنبیہ:- صاحب تحفۃ الاحوذی نے امام ترمذیؒ کے جواب کا مطلب یہ لیا ہے کہ گویا امام ترمذیؒ اس زیادتی کو راوی کے وہم پر محمول کرتے ہیں اور پھر امام ترمذیؒ پر "زیادة الشقة مقبولة" سے اعتراض کر کے ان کے جواب کو رد کر دیا ہے۔

لیکن راقم کے نزدیک امام ترمذیؒ کے قول کا صحیح مطلب وہی ہے جو اوپر پہلے نمبر پر بیان ہوا فلذا اشکال۔ خودکشی حرام ہے:- اس حدیث اور اسی طرح کی دیگر نصوص کے بموجب خودکشی کی حرمت پر اتفاق ہے اور یہ کہ خودکشی گناہ اکبیرہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح دوسرے کی جان لینا جائز نہیں، اسی طرح اپنی جان کی حفاظت بھی فرض ہے، کسی کو اپنے نفس کا کلی اختیار حاصل نہیں، نہ کوئی عورت زنا میں آزاد ہے، اور نہ ہی کوئی شخص اپنی جان کا مالک ہے۔ اور اگر مالک بھی ہے تو مجازاً احمد و دینا نے پر، پس جتنی اجازت شریعت کی طرف سے ہے اس سے آگے کوئی اختیار نہیں، لہذا جہاں کسی کو غلام بنانا اور بیچنا جائز ہے تو وہ اس میں آزاد ہے اور جس کو فروخت کرنا ممنوع ہے جیسے خر تو وہ ناجائز ہے، خودکشی کرنے والا اپنے اختیار سے غیر معمولی تجاوز کرتا ہے جو سنگین جرم ہے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ خودکشی کرنے والا گویا تقدیر سے بھاگتا ہے کہ وہ دنیوی تکالیف پر صبر نہیں

سے کسمار دہی ایسی داؤد: من حساساً فی ہذہ بحسہ فی نار جہنم عالماً مغلداً فیہا ابداً ص: ۱۸۵ ج: ۲ "ابواب فی الادویۃ المکروہۃ" کتاب الطب، ایضاً سنن نسائی ص: ۲۷۹ ج: ۱ ابواب الجنائز.

کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خودکشی سے جان چھوٹ جائے گی تو جس طرح دنیاوی تکلیفات سے تنگ آکر دعائے موت جائز نہیں اسی طرح خودکشی بھی جائز نہیں۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں خدا تعالیٰ کے فیصلے پر مطمئن نہیں، اس لئے گویا اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے جبکہ رضا بر قضا واجب ہے تاہم شدید بھڑی دباؤ اور یئش کی وجہ سے اگرچہ وہ اس عمل سے کافر نہ کہلائے گا جب تک کہ طحال نہ سمجھنے لگے مگر قلبی تصدیق کے باوجود یہ عمل انتہائی قبیح ہے۔

چوتھی وجہ: یہ ہے کہ وہ اپنے ہمساندگان کو غم اور صدمے سے دوچار کرتا ہے جبکہ ایسے مؤمن اور خصوصاً والدین و اقارب کی حرام ہے۔ وغیرہ ذالک من الوجوہ

تاہم اگر ایک آدمی کسی نیک غرض سے خودکشی کرے جیسے آج کل کے خودکش حملے تو کیا وہ بھی عین خودکشی محرم کے حکم میں ہے؟ تو اس بارے میں علمائے وقت کی آراء مختلف ہیں۔ راقم کے نزدیک یہ مسئلہ بہت مشکل ہے کہ اگر اس کی اجازت دی جائے تو ایک تو اس کی کوئی واضح دلیل نہیں۔ دوم اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے۔ اور آج کل کوئی ہفتہ خودکش حملے سے خالی نہیں گذرتا ان میں نانوے (۹۹) فیصد بلکہ تمام تر حملوں میں بڑی تعداد میں شہری ضرور ہلاک کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف کفار کے پاس ہر قسم کے وسائل ہیں ان کے آگے نیچے مسلمانوں اور مجاہدین کا جتنا تقریباً ناممکن ہے، مگر اس عمل کی اجازت نہ دی جائے تو ان کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟؟؟

حدیث آخر: ”عن ابی ہریرۃ قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الدواء المعیث یعنی السم“۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیث دواء سے منع فرمایا ہے یعنی زہر سے۔

لغات: فقولہ ”الدواء المعیث“ یہ لفظ عام ہے مطلق گندی اور حرام ادویات پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر راوی نے اس کی تفسیر زہر سے کی ہے، لہذا اس پر حمل کرنا اولیٰ ہے۔ پھر یہ کس راوی کی تفسیر ہے؟ تو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہو یا کسی اور کی ہو۔

تشریح: پھر ادویات کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ نجس، حرام اور مستفہر چیزیں یعنی جن سے

طبیعت گھسن کرتی ہے یا ضرورت استعمال نہیں کی جانی چاہئے خصوصاً کھانے میں تو ہرگز استعمال نہ کی جائیں جبکہ بعض دیگر صورتوں میں مباح اور جائز الاستعمال ہیں جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا۔ زہر میں بھی اگر شفاء اغلب ہو تو جائز ورنہ نہیں۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التداوی بالمسکر

"عن سماک انه سمع علقمة بن وائل عن ابيه انه شهد النبي صلى الله عليه وسلم وسأله سويد بن طارق او طارق بن سويد عن الخمر فنهاه عنه فقال انما التداوی بها، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: انها ليست بدواء ولكن هاداء"۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے تو (اسی اثناء میں) سويد بن طارق نے یا طارق بن سويد نے (راوی کو شک ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خمر (شراب) کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع فرمایا، انہوں (طارق) نے کہا کہ ہم اس کو بطور علاج معالجہ کے استعمال کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دواء نہیں بلکہ داء یعنی بیماری ہے۔

تشریح:- حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کرنے والے صحابی کا نام کیا ہے؟ تو اس بارے میں اختلاف ہے جیسا کہ اس روایت میں راوی کے شک کے اظہار سے معلوم ہوتا ہے۔ ابو داؤد^۲ کی روایت بھی شک کے ساتھ ہے۔ امام بخاری نے بھی تردید کا اظہار کیا ہے^۳ مگر راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح طارق بن سويد ہے۔ اور ابو داؤد میں اسی کو مقدم ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ^۴ نے بھی طارق بن سويد ہی ذکر کیا ہے یعنی بلا شک و تردید کے۔ (کذا فی البذل ص: ۵۰ ج: ۶)

چونکہ عربوں کی اکثریت کے نزدیک شراب کو شفاء کا سبب مانا جاتا تھا اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نظریے کی تردید فرمائی کہ "انها ليست بدواء ولكن هاداء"۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التداوی بالمسکر

۱۔ روی بمعناه ابو داؤد ص: ۱۸۵ ج: ۲ کتاب الطب، ابناً رواه مسلم بحوالہ جمع القوائد ص: ۲۵۲ ج: ۲ حدیث: ۷۵۵۰۔ ۲۔ سنن ابی داؤد ص: ۱۸۵ ج: ۲ کتاب الطب۔ ۳۔ ابناً صحیح مسلم ص: ۱۶۳ ج: ۲ کتاب الاشربة۔ ۴۔ کذا فی سنن دارمی حاشیہ: ۱ ص: ۱۵۳ ج: ۲ حدیث: ۲۰۹۵ کتاب الاشربة۔

شراب ہو یا کوئی اور نجس چیز حالت اضطراب میں اس کا استعمال بغرض جان بچانے کے بالاتفاق جائز ہے مثلاً کسی کا لقمہ گلے میں پھنس جائے اور کوئی پانی وغیرہ مانع چیز اس کو اتارنے اور نکلنے کی نہ ملے تو اور جان کو خطرہ ہو تو اسے اتارنے کے لئے شراب کا گھونٹ بقدر ضرورت پینا جائز ہے۔ اس میں ابن قاسم کے ملاوہ کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے بلکہ جمہور کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے کہ جان بچانا ضروری ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے: "وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرَرْتُمْ عَلَيْهِ"۔ (انعام آیت ۱۱۹) اس میں "و" کا لقمہ عام ہے تمام انجاس و حرمت کو شامل ہے۔ (کذا فضله السنوی فی "المجموع" و شرح مسلم، وابن العربی فی العارضة الاحوذی وغیرہما)

پھر ابن العربی نے اس بارے میں سخت موقف اپناتے ہوئے لکھا ہے: "لا منفعة فیہا" یعنی شراب میں کسی طرح کا فائدہ نہیں ہے، گویا وہ اس حدیث کے الفاظ "انہا لیست بدواء" سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ نکرہ فی سیاق الظمیٰ عموم کے لئے آتا ہے، مگر قرآن کا ظاہر اس موقف کی نفی کرتا ہے "کل فیہما اثم کبیر ومنافع للناس وانہما اکبر من نفعہما"۔ (البقرہ آیت ۲۱۹) اس لئے کہا جائے گا کہ خمر میں کچھ جسمانی اور وقتی فائدے ہو سکتے ہیں مگر اس کے نقصانات اور خصوصاً دینی و روحانی مضرتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے فوائد بچ ہو جاتے ہیں کیونکہ جہاں فوائد و نقصانات جمع ہو جائیں تو اکثر حکم اغلب پر مبنی ہوتا ہے۔ اور جہاں تک حدیث الباب کا تعلق ہے تو اس نفی کی وجہ سے ذرائع اور جسم باب ہے، کیونکہ عرب اس کو شفاء کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس مسئلے کی کچھ وضاحت "باب ماجاء فی بول ما یوکل لحمہ" میں بھی گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی از ص: ۲۴۷ تا ص: ۲۵۱ ج: ۱)

پھر بذل المجہود میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اس قسم کی احادیث سے استدلال کر کے فرمایا ہے کہ حرام اشیاء سے کسی طرح کی تدویٰ جائز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ حکم عدم حاجت کی صورت پر محمول ہے یعنی جب ضرورت نہ ہو حرام و نجس کی، یا ضرورت ہو مگر متبادل کا انتظام ہو سکتا ہو، جب کوئی چارہ نہ رہے تو پھر نشہ آور اشیاء کے علاوہ دیگر نجاستوں کا بطور علاج استعمال جائز ہے، نیز تدویٰ بالمحرم کی نفی اس جہت سے مقید ہے جس جہت سے اس کی حرمت معتبر ہو مثلاً کسی چیز کا کھانا حرام ہو تو اس کو کھانے کے طور پر استعمال کرنا جائز نہ ہوگا (یعنی حالت اختیار میں اور بغیر ضرورت کے جبکہ جسم کے ظاہری حصہ پر لگانا ممنوع نہ ہوگا) اور جن اشیاء سے مطلقاً منع آیا ہو جیسے خمر، خنزیر اور میوہ تو ان کا استعمال بہر صورت ممنوع ہے۔ الخ (بذل المجہود ص: ۴۰ ج: ۶)

در مختار میں ہے:

”وَحُوزُ ابِوَاللَّيْثِ بَيْعُ الْحَبِثَاتِ اِنْ النِّفْعُ بِهَا فِي الْاَدْوِيَةِ وَالْاَلَاوَرْدَةِ فِي الْبَدَنِ اِنْ بَانَ غَيْرُ مَسْدِيْدٍ لِاَنَّ الْمَحْرَمَ شَرْعًا لَا يَحُوزُ الْاِنْتِفَاعَ بِهِ لِتَلْتَدَاوِي كَالْحَمْرِ“ الخ۔
اس پر علامہ شامی رحمہ اللہ نے اپنے حاشیہ رد المحتار میں تداوی بالمحرم کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے:
”قَالَ فِي النِّهَايَةِ وَفِي التَّهْذِيبِ يَحُوزُ لِلْعَلِيلِ شَرْبُ الْيُولِ وَالدَّمِ وَالْمَيْتَةِ لِلْتَدَاوِي اِذَا أَخْبِرَهُ طَبِيبٌ مُسْلِمٌ اَنَّهُ فِيهِ شِفَاءٌ وَلَمْ يَحْلُمْ مِنَ الْمَبَاحِ مَا يَقُومُ مَقَامَهُ اِنْ قَالَ الطَّبِيبُ يَتَحَلَّلُ شِفَاءً لَكَ بِهِ فِيهِ وَجْهَانٌ وَهَلْ يَحُوزُ شَرْبُ الْعَلِيلِ مِنَ الْحَمْرِ لِتَلْتَدَاوِي؟ فِيهِ وَجْهَانٌ، كَذَا ذَكَرَهُ الْاِمَامُ التِّرْمِذِيُّ مُوَكَّدًا فِي الذَّخِيرَةِ وَمَقَابِلِ اِنْ اَلَا سَتَشْفَاءُ بِالْحَرَامِ غَيْرِ مُعْجَرٍ عَلَى اِطْلَاقِهِ اِنْ اَلَا سَتَشْفَاءُ بِالْحَرَامِ اِنْ اَلَا يَحُوزُ اِذَا لَمْ يَعْلَمْ اَنْ فِيهِ شِفَاءٌ اَمَّا اِنْ عِلْمٌ وَلَيْسَ لَهُ دَوَاءٌ غَيْرُهُ يَحُوزُ“ الخ۔
(ص: ۲۲۸ ج: ۵، باب السُّحْرَاتِ مِنَ الْبُهِرَةِ، ابي ايم سعيد کراچی)

خلاصہ یہ ہے کہ اضطراری حالت میں ہر محرم جائز ہے، جبکہ نازل حالت میں کسی محرم کا استعمال جائز نہیں جبکہ ضرورت کی صورت میں خمر، خنزیر یا دیگر مسکرات کے علاوہ باقی محرمات و نجاسات جائز ہیں جبکہ خمر میں دو قول ہیں: رائج عدم جواز ہے، باقی مسکرات میں تخفیف ہے۔

باب ماجاء فی السعوط وغیرہ

”عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنْ خَبِرَ مَا تَدَاوِيْتُمْ بِهِ السَّعُوطُ وَالسَّنُودُ وَالْحِمَامَةُ وَالْمَشْيُ فَلَمَّا اشْتَكَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَدَهُ اَصْحَابُهُ فَلَمَّا فَرَّغُوا قَالَ لَّهُمْ قُلُّوْهُمُ غَيْرَ الْعَبَّاسِ“۔^۱

باب ماجاء فی السعوط وغیرہ

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً بخاری ص: ۸۵۱ ج: ۲ "باب السَّنُودِ" كتاب الطب، أيضاً أخرجه في المغازی ص: ۸۳ وفي التلخیصات باب: ۲۱۰۱۳ وصحیح مسلم ص: ۲۲۷ ج: ۲ كتاب الصلاة، مستدرجاً ص: ۷۹ ج: ۷ حلیہ: ۲۳۷۳۲، ۲۳۷۳۳، ۲۳۷۳۴، ۲۳۷۳۵، ۲۳۷۳۶ ج: ۲۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم جو دوائیں لیتے ہو ان میں سحوط ولد وود حجامت اور مٹی بہت اچھی ہیں، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنس نفیس بیمار ہوئے تو صحابہ کرامؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (بلا اجازت) دوا پلا دی، چنانچہ جب وہ فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سب کو دوا پلا دو، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان تمام شرکاء کو دوا پلا دی گئی سوائے عباسؓ کے۔

لغات:- قولہ "السحوط" بروزن رسول، ناک میں ڈالنے والی دوا جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مریض کو چت لٹا کر اس کے دونوں شانوں کے درمیان کوئی چیز رکھتے ہیں تاکہ سر نیچے رہے پھر اس کی ناک میں دوا آلود پانی یا تیل ڈالتے ہیں تاکہ اسے چھینک آئے، اور اس سے دماغ کھل جائے۔ قولہ "الدود" یہ بھی رسول کے وزن پر ہے، وہ دوا جو منہ میں ایک جانب ڈالی جائے اور اگر گلے میں یا منہ کے درمیان میں نکادے تو اسے دجور کہتے ہیں۔ قولہ "ججامۃ" بکسر الجاء پھینچنے اور سینگلی لگوانے کو کہتے ہیں جسے احتیاج بھی کہا جاتا ہے۔ قولہ "المشی" بفتح المیم و کسر الشین و تشدید الیاء، مٹی سے ماخوذ ہے ہر سہل و دست آور دوا کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بار بار قضائے حاجت کے لئے جانے پر مجبور کرتی ہے۔ قولہ "اشتکی" ای مرض۔

تشریح:- سحوط اور لدود کرنا دونوں قدیم زمانے کے علاج معالجے کے اہم طریقے تھے گو کہ آج بھی ناک اور منہ میں ڈالنے کے قطرے رائج ہیں لیکن ان میں کسی مخصوص جانب سے ڈالنے کو اہمیت نہیں دی جاتی، جبکہ پھینچنے لگوانے اور دست آور دوا کا استعمال آج بھی مروج و معروف ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے لدود کا مندرجہ بالا فائدہ ملحوظ رکھتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض وصال میں دوا پلا دی۔ بعض روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے ان کو منع فرمایا مگر وہ یہ سمجھے کہ یہ نبی تشریحی نہیں بلکہ طبعی ہے کیونکہ تقریباً ہر مریض طبخا دوا کو ناپسند کرتا ہے جبکہ یہ نبی تشریحی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ بمنزلہ نص کے تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نبی یا تو اس بناء پر تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہو چکا تھا کہ اس مرض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہونے والا ہے، ایسے میں علاج کا کوئی فائدہ نہیں رہتا بلکہ بعض علماء نے کراہیت علاج کی تصریح کی ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اسے ذات الحبس کی بیماری سمجھ کر لدود کو تجویز کر رہے تھے حالانکہ یہ وہ بیماری نہ تھی، بناء پر ہر تقدیر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افاقہ ہوا تو فرمایا کہ ان سب کو لدود کیا جائے سوائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے۔ چنانچہ جتنے بھی صحابہ اس وقت گھر میں موجود تھے سب کو لدود کیا گیا

حتیٰ کہ بعض اہمات المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو بھی دوپلا دی گئی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ قیامت کے دن ان کی گرفت نہ ہو جائے اور یہ کہ اللہ کی ناراضگی سے محفوظ ہوں۔ عارضۃ الاحوزیٰ میں ہے: "لَسْلَاسَاتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهِمْ حَقٌّ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُدْرِكُهُمْ حُطْبٌ عَظِيمٌ"۔ اس لئے جب ماں باپ کو اپنے بچوں پر غصہ آ جائے تو ان کو کچھ نہ کچھ علی سزا دینا مناسب ہے تاکہ وہ اللہ کی ناراضگی سے بچیں، اگر کوئی یہ کہے کہ معافی بھی تو ہو سکتی تھی، تو اس کا جواب ابن العربیؒ نے دیا ہے کہ معافی میں ایک فائدہ ہوتا یعنی اللہ کی ناراضگی سے حفاظت جبکہ لدو کرنے میں دو فائدے ہوئے، ایک غلطی کا ازالہ، اور دوم تادیب: "فَإِنْ قِيلَ فَهَلْ أَعْفَاهُمْ؟ قُلْنَا إِنْ أَدَّيْتُمْ لَنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِثْلَهَا فَيَكُونُ لَهُمْ أَذْبًا وَقَصَاصًا فَتَكُونُ فَائِدَتَيْنِ وَذَلِكَ خَيْرٌ مِنْ وَاحِدَةٍ"۔ (عارضۃ الاحوزیٰ)

یہاں یہ اشکال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو اجتہادی غلطی تھی جس پر مواخذہ نہیں ہوتا ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ شارع کی موجودگی میں اجتہاد معتبر نہیں، ہاں البتہ صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین حیات ان کی غیر موجودگی میں اجتہاد کرتے تھے۔ حضرت عباسؓ کو اس تقریر میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ اگرچہ بعض روایات کے مطابق انہوں نے اس عمل کا حکم دیا تھا مگر لدو کرنے کے وقت موجود نہ تھے تو وہ متسبب تھے مگر مباشر نہیں تھے اور جب مباشر موجود ہو تو متسبب کا مواخذہ نہیں ہوتا ہے۔

بعض نے جواب دیا ہے کہ ان کو تا دبا چھوڑا یا وہ روزے سے تھے لیکن حضرت گنگوئیؒ نے الکوکب میں ان دونوں کو رد کیا ہے۔ واللہ اعلم

باب کی دوسری حدیث:۔ "عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن خير ما تداويتم به اللدود السعوط والحمامة والمشى وخير ما تكتحلتم به الاثمد فانه يحلو البصر وينبت الشعر قال وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم له مكحلة يكتحل بها عند النوم ثلاثاً في كل عين"۔^۱ (حسن غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جو دوائیں استعمال کرتے ہو ان میں لدود و سعوط و حمامات اور مشی بہتر ہیں، اور جو سرمے تم استعمال کرتے ہو اس میں سب سے اچھا "اثمد" ہے کیونکہ وہ نگاہ کو تیز کرتا ہے اور ٹیکوں کے بال اُگاتا ہے (ابن عباس) فرماتے

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سرمہ دانی تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت ہر آنکھ میں تین تین بار سرمہ لگاتے۔

لغات: - قولہ "انسد" بکسر الهمز وواو الهمز وفتحها ثاء ساکنہ، کالے سرے کو کہتے ہیں خواہ اصفہان کا ہو یا حجاز مقدس کا، تاہم حجاز میں جو پتھر اس کا ہوتا ہے وہ سرفنی مائل ہوتا ہے مگر اصفہان کا پتھر زیادہ عمدہ ہوتا ہے کہ کالا ہے۔ قولہ "مکحله" بضم الهمز والجاہ وفتحها کاف ساکنہ، اصل میں آلہ کا صیغہ ہے جو سلاخی کو کہتے ہیں مگر خلاف القیاس یہ سرمہ دانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور یہاں یہی مراد ہے۔ قولہ "بکحل بہا" سی منہا، لہذا باب بمعنی من کے ہے جیسا کہ شکل کی روایت میں "منھا" ہی ہے۔

تشریح: - اس مسئلے کی وضاحت ابواب اللباس میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ج: ۵ ص: ۵۶۵ "باب ما جاء فی الاستحصال")

یہاں اس بحث کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔ سرمہ سفید بھی ہوتا ہے اور کالا بھی جبکہ بعض کالا سرفنی مائل بھی ہوتا ہے گوکہ استعمال ان سب کا جائز ہے مگر کالا زیادہ مفید ہے جیسا کہ حدیث الباب میں ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق سرے میں چاندی کی آمیزش ہوتی ہے جو جراثیم کش ہے اس لئے سرے کے استعمال سے آنکھوں کا فاسد مادہ باہر نکل آتا ہے، پھر سیاہ رنگ روشنی کے تمام رنگوں کا انعکاس کرتا ہے جو بصارت میں کلیدی کردار کا حامل ہے کہ دیکھنا روشنی جذب کرنے سے عبارت ہے۔ راقم نے "شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت" نامی کتاب میں اس کی پوری وضاحت پیش کی ہے۔

سرمہ زینت کے لئے استعمال کرنا بھی جائز ہے اور بطور دوا کے بھی، تاہم بطور نفع رات کو استعمال مفید تر ہے کہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سرمہ سرایت کر کے پورا اثر دکھاتا ہے مگر مردوں کو زینت سے پرہیز کرنا چاہئے، جبکہ عورتوں نے آج کل جو رواج بنایا ہے کہ سرمہ لگا کر بازار میں چلتی ہیں باقی چہرہ ڈھانپ لیتی ہیں اور آنکھیں دکھاتی ہیں یہ عمل شیطانی حرکت سے کم نہیں کہ ایسی حالت میں پلکیں دلوں کو ایسے چھتی ہیں جیسے حیر نشانہ کو چیرتے ہیں، اس لئے اس سے پرہیز کرنا لازمی ہے، اگر عورتیں اس سے اجتناب نہ کریں تو مرد اپنی نگاہیں پست رکھیں تاکہ وہ کسی فتنے کا شکار نہ ہوں ورنہ وہ خود اپنے ذمہ دار ہوں گے۔

پھر سرمہ لگانے کی کوئی خاص ترتیب نہیں مگر بہتر و مستحب یہ ہے کہ طاق عدد اور داہنی آنکھ سے شروع کا اہتمام کیا جائے کہ پہلے دائی میں تین پھر بائیں میں تین سلاخی پھیر دے یا پہلے داہنی میں ایک پھر بائیں میں

کے جنت میں داخل ہوں گے، ”ہم السذین لایسترقون ولا یطیرون ولا یکتون وعلی ربہم یتوکلون“۔^۱ جبکہ اگلے باب میں اور بعض دیگر روایات میں اس کی اباحت معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے۔

”عن جابر قال بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی ابی بن کعب طبیباً فقطع منہ عرقاً ثم کواه“۔ (رواہ ابن ماجہ و احمد و مسلم)

ان روایات کو متعدد طریقوں سے جمع کیا گیا ہے: ایک یہ کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عمل ثابت ہے جیسا کہ اگلے باب میں ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ثابت ہے تو وہ رگ کے خون روکنے کی غرض سے تھا جبکہ نبی کی روایات تداوی کی صورت پر محمول ہیں کہ جب عرب اس عمل کو مؤثر سمجھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، گویا نبی تنزیہ کے لئے ہے، یا مطلب یہ ہے کہ اس کو ہر بیماری کے لئے مفید نہ سمجھا جائے بلکہ یہ مخصوص امراض میں مفید ہو سکتا ہے عام نہیں ہے۔ یا بطور حفظ ما تقدم کے اوپر محمول ہے، یہ تینوں توجیہات ابن العربی نے عارضہ میں بیان کی ہیں، حاشیہ ترمذی میں بھی یہی بات کی گئی ہے۔

اس بارے میں دوسری تطبیق یہ ہے کہ جواز کی روایات ضرورت پر محمول ہیں جبکہ نبی کی روایات عدم ضرورت پر، لکن کتب الدرر میں اسی کو لیا ہے۔ علیٰ ہذا حضرت عمران بن حصینؓ کے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ضرورت کے موقع محل کو سمجھ نہ سکے، اس لئے ہم کامیاب نہ ہوئے یعنی ایسے موقع پر داغ لگوا لئے جس کی اباحت نہ تھی جس کا علم پہلے سے نہ تھا بعد میں ہوا۔

بعض روایات کے مطابق اس عمل سے ان کی بیماری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اس لئے انہوں نے کامیابی کی دوسرے نفعی کی یعنی پہلی میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بیماری ٹھیک نہیں ہوئی، اور دوسری میں یہ کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے جبکہ حدیث کا صحیح مطلب اور محل و موقع سمجھنا بڑی کامیابی ہے، ترجمہ میں اسی توجیہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاہم حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت تھانوی صاحبؒ نے ایک اور حدیث کی روشنی میں یہ مطلب لیا ہے کہ حضرت عمرانؓ سے فرشتے ملے اور سلام کرتے تھے جب انہوں نے داغ

۱۔ رواہ احمد فی مستدرک ج: ۶۱۲، حدیث: ۱۹۳۶۲، ایضاً ج: ۴۴۸، حدیث: ۲۳۳۳ و ۲۷۹۶

۲۔ رواہ مسلم ج: ۲۴۵، کتاب السلام، سنن ابن ماجہ ج: ۲۴۹، ابواب الطب، مستدرک احمد ج: ۲۵۵، ج: ۴

حدیث: ۱۳۹۷۰

دو یا تین پھر اخیر ادا ہنی میں ایک تاکہ اس سے ابتداء بھی ہو اور اسی پر انتہاء بھی ہو۔ واللہ اعلم وعلہ اتم۔
 قوله ”وہو حدیث عباد بن منصور“ یعنی باب کی دونوں حدیثیں ایک ہی درجے کی ہیں یعنی حسن
 غریب، کیونکہ دونوں میں مدار سند عباد بن منصور ہیں۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الکئی

”عن عمران بن الحُصین ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الکئی فابتلنا
 فاکتوبنا فما افلحنا ولا انحنا“۔^۱ (حدیث حسن صحیح)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داغ دینے سے
 ممانعت فرمائی ہے مگر جب ہم (بیماری میں) مبتلا ہوئے تو ہم نے داغ لگوا لئے پس نہ تو ہم (علاج میں)
 کامیاب ہوئے اور نہ ہی (اس سے بچنے میں) مقصد کو پہنچے۔

لغات:- قوله ”الکئی“ اکٹوی مطاوع شحوی اور کواہ الکئیہ وکتیا گرم لوہے یا پتھر وغیرہ سے
 جسم کے کسی حصے کو داغ دینے کو کہتے ہیں، تاہم یہ عمل کپڑے یا مخصوص قسم کی گھاس سے بھی کیا جاتا ہے۔
 قوله ”فما افلحنا ولا انحنا“ لغوی اعتبار سے دونوں کے معنی کامیابی کے آتے ہیں، تاہم ”افلح“ کا لفظ قرآن
 کی اصطلاح میں عموماً اخروی نعمتوں کے حصول میں کامیابی کے لئے استعمال ہوا ہے، لیکن یہاں حدیث میں معنی
 لغوی مراد ہے۔ کما سیأتی شرحہ

تشریح:- آگ سے داغ دینے سے نبی کے بارے میں متعدد روایات ثابت ہیں ازاں جملہ ایک
 روایت باب کی بھی ہے، ایک اور روایت میں ہے: ”نہی عن الکئی“۔ ایک حدیث میں ہے: ”من اکٹوی
 او استرقی فقد برئ من التوکل“۔ (رواہ الترمذی^۲) ایک اور روایت میں ہے کہ ستر ہزار آدمی بغیر حساب

سے وعن ابن عمران رسول اللہ ﷺ کان اذا اکتحل جعل فی العین الیمنی ثلاثاً و فی العین السری مروین وجعلوا
 ونراً، رواہ الطبرانی فی الکبیر برقم: ۳۶۳/۲ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۱۳ ج: ۵ حدیث: ۸۴۵۲۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الکئی

۱۔ روی بمعناه صحیح بخاری ص: ۸۴۸ ج: ۲ کتاب الطب، سنن ابی داؤد ص: ۱۸۴ ج: ۲ ”باب فی الکئی“ کتاب
 الطب، سنن ابی ماجہ ص: ۲۴۹ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۵۸۹ ج: ۵ حدیث: ۱۹۳۳۰۔
 ۲۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۴۹ ”باب الکئی“ ابواب الطب، مسند احمد ص: ۳۰۳ ج: ۵ حدیث: ۱۷۷۱۵۔

لگوا دیئے تو وہ سلسلہ رک گیا پھر جب انہوں نے اس سے توبہ کر لی تو بقطۃ تعالیٰ وہ مبارک سلسلہ پھر شروع ہوا جیسا کہ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، علیٰ هذا "ولانا حننا" میں اسی حسرت کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاج میں بہت زیادہ غلو کی ضرورت نہیں ہے جہاں تک ممکن ہو الاسهل فالاسهل پر اکتفاء کر لینا چاہئے، ہاں جہاں ضرورت پڑے گی تو حسب ضرورت مہنگا اور مشکل علاج مباح ہوتا جائے گا حتیٰ کہ بعض صورتوں میں مکروہات پھر محرکات اور حالات اضطراری میں تمام ممنوعات خواہ مسکرات ہی کیوں نہ ہوں حلال ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم وعلیہ التمس

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: تحوی سعد بن زرارۃ من الشوكة۔ (هذا حديث حسن غریب وقد اخرجہ الطحاوی فی معانی الآثار^۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن زرارہ کو سرخ پھنسی کی وجہ سے داغ لگایا... (یا لگوا یا)۔

نکات:- قولہ "من الشوكة" بفتح الشین طاقت اور دبدبے کو بھی کہتے ہیں اور نوکیلی چیز جیسے کانٹے اور تھنیاں وغیرہ کو بھی کہتے ہیں چونکہ ان چیزوں میں تکلیف ہوتی ہے اس لئے جسم پر سرخ پھنسیوں کو بھی کہتے ہیں کہ یہ سخت دہ تکلیف ہوتی ہیں۔

تشریح:- سعد بن زرارہ یہ لفظ ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ بھی مروی ہے یعنی اسعد جبکہ زرارہ میں زاء مضموم ہے، امام ترمذیؒ کا مقصد بیان جواز ہے جس کی وضاحت سابقہ باب میں گذری ہے۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

۱۔ ابناً اخرجہ الطبرانی فی الکبیر برقم: ۵۵۸۳ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۱۶ ج: ۵ کتاب الطب، مستند احمد ص: ۱۳ ج: ۵ حلیث: ۱۶۱۸۲۔

باب ماجاء فی الحجامة

”عن انس قال كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحتحم فی الاخذعین والکاهل وکان یحتحم لسیع عشرة وتسع عشرة واعدی وعشرين“۔^۱ (هذا حدیث حسن غریب)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم گردن کی دونوں جانب کی رگوں میں پھینچنے لگواتے اور کندھے (کی رگ کاہل) پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سینگی لگواتے سترہ تاریخ کو، اور انیس اور اکیس کو۔

لغات:۔ بقولہ ”الحجامة“ بکسر الہاء، سینگی اور پھینچنے لگانا، سینگی دراصل سوراخ کیا ہوا سینگی ہوتا ہے جسے بدن کے کسی حصے پر رکھ کر منہ سے خون چوسا جاتا ہے جس سے جسم کی گرمی اور فاسد خون باہر نکل جاتا ہے، آج کل سرخ کی طرح ایک آلہ دستیاب ہے جس کے ذریعہ یہ عمل آسانی ہوتا ہے۔ بقولہ ”الاخذعین“ گردن کی دونوں جانبوں کی دو رگوں کو کہتے ہیں۔ بقولہ ”الکاهل“ دونوں شانوں کے مابین کمر کے اوپر والے حصہ کی رگ کو کہا جاتا ہے۔

تشریح:۔ اچھی صحت وہ ہوتی ہے جو اعتدال اخلاط کے ساتھ ہو، جب چار اخلاط یعنی سوداء خون، بلغم اور صفراء میں کسی ایک کا اعتدال ختم ہو جائے تو بندہ مریض بن جاتا ہے پس اگر کوئی عنصران میں سے اپنی مقدار سے کم ہو جائے تو اس کا تذکرہ مناسب کھانے پینے یا ادویات سے ہوتا ہے جبکہ زیادتی کی صورت میں اس کے اخراج کی ضرورت پڑتی ہے، جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خون کے اخراج کے لئے پھینچنے لگوائے جائے اور باقی کے اخراج کے لئے اسہال کرانا ہے۔ (طب نبوی فصل: ۴)

پھینچنے لگوانے کے فوائد کافی زیادہ ہیں، تاہم وقت اور مقام کا لحاظ رکھنا اس کے لئے بہت اہم ہے، گرم علاقوں کے لوگوں کے لئے گرمیوں کے موسم میں یہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عام سانس اصول کے مطابق کہ حرارت سے شئی بھیل جاتی ہے جبکہ برودت سے سکڑ جاتی ہے، گرم علاقے میں خون میں شدت آتی ہے خصوصاً گرم موسم میں اس لئے خون کا اخراج مفید رہتا ہے، آج کل بلڈ پریشر وغیرہ جیسے امراض کی

باب ماجاء فی الحجامة

۱۔ راجع للاحادیث حول عنوان الحجامة سنن ابی داؤد ص: ۱۸۴ ج: ۱ کتاب الطب، مجمع الزوائد ص: ۱۰۴

ج: ۱۰۹، مجمع الفوائد ص: ۲۳۸، ۲۳۹ ج: ۲ کتاب الطب، سنن ابی ماجہ ص: ۲۳۸، ۲۳۹ ابواب الطب.

شکایت عام ہے، یہ خون کی بے اعتدالی ہی کی وجہ سے تو ہے۔

تاہم مذکورہ قاعدے کی بناء پر ٹھنڈے علاقوں کے لوگوں کے لئے اور خصوصاً جسم کے اندرونی امراض کے ازالے کے لئے فصد یعنی رگ کا خون نکالنا زیادہ مفید ہے کہ گرمی سے خون جلد کی طرف آ جاتا ہے مگر ٹھنڈی وجہ سے وہ رگوں میں ہوتا ہے اور جلد سخت اور مسامات بند رہتے ہیں۔ (تذکرہ) سر کی بیماریوں کے لئے گردن کی رگ میں مفید ہے جیسا کہ حدیث باب میں گردن کی رگ کا ذکر ہے۔

پھر چونکہ خون کامدہ و جزر سے تعلق ہے روشنی تیز ہونے کی صورت میں اس میں زیادتی آتی ہے اس لئے سب سے اچھا وقت قمری مہینے کا نصف آخر خصوصاً قیسری چوتھائی نہایت مفید ہے۔ بعض حضرات نے بروز ہفتہ، بدھ اور جمعہ کو کچھ لگوانا مضر قرار دیا ہے۔

دوسری حدیث:- ”عباد بن منصور قال سمعت عكرمة يقول كان لابن عباس غلظة ثلاثة حمامون فكان اثنان يغفلان وواحد يحضه ويحضم اهله قال وقال ابن عباس قال نبى الله نعم العبد الحاحام يذهب بالدم ويخفف الصلب ويحلون البصر وقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين عرج به ”مامر على ملا من الملائكة الا قالوا عليك بالحمامة وقالان خير ماتت حمامون فيه يوم سبع عشرة ويوم تسع عشرة ويوم احدى وعشرين، وقال: ان خير ماتت او يتم به السعوط والتدود والحمامة والتمشي وان رسول الله صلى الله عليه وسلم لذه العباس واصحابه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لذننى؟ فكلهم امسكوا فقال لا يبقى احد من فى البيت الا لذننى غير عمه العباس، قال النضر اللدود والوَجُور“۔ (حدیث حسن غریب)

حضرت عبادہ بن منصور فرماتے ہیں کہ میں نے عکرمہ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابن عباس کے تین غلام تھے جو حجامت کا کام جانتے تھے (یا حجامت ان کا پیشہ تھا) پس ان میں سے دو تو کما کر لاتے جبکہ ایک ان کو اور ان کے گھروالوں (یعنی متعلقین) کو سبکی لگاتا تھا، عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ کے نبی نے ارشاد فرمایا ہے: کہ اچھا غلام سبکی لگانے والا ہوتا ہے جو (زائد و فاسد) خون کو نکالتا ہے اور پیچھے (کی گرائی) کو ہلکا کر دیتا ہے اور نگاہ کو تیز کرتا ہے اور فرمایا (ابن عباسؓ نے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شبہ معراج میں اوپر جاتے ہوئے فرشتوں کی کسی جماعت سے نہیں گزرے مگر انہوں نے کہا کہ آپ کچھ کورواج دیں اور یہ کہ تمہارے کچھ لگانے کے ایام میں بہترین تاریخیں سترہ، انیس اور اکیس ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ معالجہ کا بہترین طریقہ ناک سے دوا چڑھانا، منہ سے کھلانا، پچھنے لگانا اور جلاب ہے، اور یہ کہ (جب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ میں دوا پلائی حضرت عباس اور صحابہ کرامؓ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (افتاقہ ہونے کے بعد) فرمایا کہ کس نے میرے منہ میں دوا ڈالی؟ تو سب خاموش ہوئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھر میں جتنے بھی لوگ ہیں ان میں کوئی نہ بچے مگر سب کو دوا پلائی جائے سوائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ کے۔

نضر راوی کہتے ہیں کہ لدود وہی وجور ہے۔ (پہلے گذرا ہے کہ لدود جانب سے دی جاتی ہے اور وجور منہ کے درمیان یا حلق میں پٹکائی جاتی ہے)

لغات:- قوله "غِلْمَة" غلام کی جمع ہے۔ قوله "يُغْتَلَن" نغم الیاء وکسر الغین، "أَغْلٌ يُغْل" کے صلہ میں جب "علی" آجائے تو بمعنی آمدنی لانے کے آتا ہے، پھر غِلْمَة اگرچہ مطلق آمدنی کو کہتے ہیں حتیٰ کہ زمین کی پیداوار کو بھی غِلْمَة کہا جاتا ہے، مگر یہاں پچھنے لگانے کی اجرت مراد ہے۔ قوله "نَمِجَعٌ" اخفاف سے ہے بمعنی ہلکا کرنے کے۔ باقی الفاظ کی شرح پہلے گذری ہے۔

تشریح:- اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ پچھنے لگانا اور لگوانا دونوں جائز ہیں اور یہ کہ اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس کی اجرت حضرت ابوطیبہ رضی اللہ عنہ کو دی ہے جیسا کہ صحیحینؒ کی روایت میں ہے، ہاں یہ بات ہے کہ یہ پیشہ اختیار کر لینا پسندیدہ نہیں ہے، اسی طرح ہر وہ کام شرعاً ناپسند کیا جاتا ہے جس میں کسی طرح گندگی کے لگنے کا قوی احتمال ہو۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ج: ۵ ص: ۲۰۸ و ص: ۲۰۹، باب ماجاء فی کسب الحجام، ابواب المیوٰع)

باقی روایت کی تشریح پہلے گذری ہے، البتہ اس روایت کے اخیر میں یہاں یہ اضافہ ہے کہ گھر کے تمام افراد کو دوا پلائی گئی چنانچہ حافظ ابن حجر اور حافظ عینی رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو بھی پلائی گئی، ممکن ہے کہ وہ بھی اس مشورے میں شریک ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے "من فی البیت" کے عموم کو دیکھ کر ان کو دوا دی ہو۔ واللہ اعلم وعلیہ اتم واکرم

۱ صحیح بخاری ص: ۸۳۹ ج: ۲ "باب الحجامة من الداء" کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۲۵ ج: ۲ عن ابن

عباس ان النبی ﷺ استنجم واعطی للحجام اجرہ واسقط، کتاب السلام.

۲ کما رواہ احمد فی مسنده ص: ۱۷۱ ج: ۱ ح: ۲۳۳۹، ص: ۵۹۱ ج: ۱ ح: ۲۶۹۳۲.

باب ماجاء فی التداوی بالحناء

”عن علی بن عبد اللہ عن جدته وکانت تخدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت: ماکان یسکون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرحة ولا نکبة الا امرتني رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضع علیها الحناء“۔^۱ (هذا حدیث غریب واخرجه ابن ماجه)

علی بن عبد اللہ اپنی دادی (سہلی ام رافع زوجہ ابی رافع) سے نقل کرتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتی تھی، انہوں نے فرمایا کہ کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی زخم تلوار وغیرہ کا یا پتھر اور کانٹے کا نہیں لگتا تھا مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس پر مہندی لگانے کا حکم دیتے۔

لغات:- قوله ”ماکان یسکون“ اس میں یسکون زائد برائے تاکید بھی ہو سکتا ہے اور تاویل کر کے اسے غیر زائد بھی مانا جاسکتا ہے ایسا کہ فرحة ولا نکبة تکون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ”الخ“۔ قوله ”فرحة“ الفتح القاف اور ضمہ بھی جائز ہے، وہ زخم جو تلوار یا چھری وغیرہ کا ہو بقولہ ”نکبة“ الفتح النون پروزن رحمة جیسا کہ قرہ بھی اسی وزن پر ہے، پتھر یا کانٹے کے زخم کو کہتے ہیں، ولا نکبة میں لازماً برائے تاکید ہے۔ قوله ”الحناء“ بکسر الحاء وتشدید النون، مہندی کے پتے اور مہندی۔

تشریح:- یہ روایت ابن ماجہ میں اس طرح ہے: ”قالت کسان لا یصیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فرحة ولا شوكة الا وضع علیہ الحناء“۔^۲ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ترمذی کی روایت میں کان کی ضمیر برائے شان ہے۔ دوم یہ کہ یسکون زائد ہے الا تاویل کماتر۔

چونکہ مہندی میں قوت قابضہ پائی جاتی ہے اسی طرح یہ مزاج کے اعتبار سے ٹھنڈی بھی ہے جبکہ دوسرے درجے میں یہ خشک ہے اس لئے زخم پر لپ کرنے سے خون بھی بند ہو جاتا ہے اور زخم کی گرمی بھی ختم ہو کر درد میں کمی آجاتی ہے، اسی بناء پر یہ اس درد کے لئے بھی مفید ہے جو شدت حرارت کی وجہ سے ہو، اپنی کثیر المنفعت خصوصیات کی وجہ سے یہ ہر قسم کی پھنسیوں، گلے ہوئے اعضاء، مرطوب دانوں اور خارش کے ازالے کے لئے مفید ہے، لوگوں کا تجربہ ہے کہ پاؤں کے تلوؤں کی جلن دور کرنے کی غرض سے اس کا لپ کرنا

باب ماجاء فی التداوی بالحناء

۱۔ سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۰ باب الحناء ابواب الطب، جمع الفوائد ص ۲۵۰ ج: ۲ کتاب الطب۔

۲۔ سنن ابن ماجہ حوالہ بالا۔

بھی مفید ہے، تاہم ابن العربی نے عارضہ میں حنا سے متعلق تمام احادیث کی صحت سے انکار کیا ہے۔ شاید حدیث الباب حسن ہو۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الرقیۃ

”عن عمار بن المغیرہ بن شعبہ عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من اکتوی او استرقی فهو یومی من التوکل“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص داغ لگوائے یا دم کرائے تو وہ توکل سے خالی ہے۔

لغات:۔ قولہ ”الرقیۃ“ ضم الراء وسكون القاف، جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں۔

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

”عن انس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم: رخص فی الرقیۃ من الحمة والعین والنملة“۔^۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچھو کے ڈنگ اور نظر بد اور پہلو کی پھنسیوں کے لئے جھاڑ پھونک کی اجازت فرمائی ہے۔

لغات:۔ قولہ ”الحمة“ ضم الحاء وتخفيف الحيم، بچھو کے ڈنگ مارنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”العین“ نظر لگنا مراد ہے خواہ انسان کی ہو یا جنات کی۔ قولہ ”النملة“ بر وزن رحمة، وہ پھنسیاں جو پہلو پر تلکتی ہیں۔

دونوں بابوں کی تشریح:۔ چونکہ جھاڑ پھونک اور داغ دینے سے علاج میں کامیابی کی صورت میں آدمی کا عقیدہ کچھ نہ کچھ متزلزل ہونے کا قوی اندیشہ رہتا ہے اگرچہ خواص اس سے محفوظ رہتے ہیں مگر عوام بیچارے تو فائدے کو دیکھتے ہیں اور ظاہری فائدہ جس چیز سے حاصل ہوتا ہے عوام اسی کو مفید بلکہ مؤثر سمجھنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہ ظن غلبہ اختیار کرتا رہتا ہے اس لئے پہلے باب کی حدیث میں ان دونوں سے روکا گیا، پس

باب ماجاء فی الرخصة فی ذالک

۱۔ روی بمعناه ابو داؤد ص: ۱۸۷ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً رواه مسلم فی الایمان، جمع الفوائد ص: ۲۵۳ ج: ۲ کتاب

مطلب یہ ہوا کہ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ کامل توکل سے محروم ہو جاتا ہے، یا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بغیر اضطراب اور ضرورت کے ایسا کرے گا تو وہ توکل میں نقصان اٹھائے گا، یا پھر یہ روایت اس وقت سے متعلق ہے جب لوگ نئے نئے مسلمان ہو رہے تھے اور قرآنی تعلیمات ابھی ابتدائی حالت میں تھیں جب لوگوں نے عقائد کی تفصیل معلوم کر لی تو پھر یہ حکم منسوخ ہوا علیٰ ہذا اس ممانعت کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن دوسرے باب میں اس کی رخصت بیان ہوئی ہے پس اس رخصت کو پہلے باب کی وجہ ممانعت کے تناظر میں دیکھنا ہوگا، یعنی پہلے باب کی حدیث میں نبی کی وجہ ہوگی جواز کی حدیث میں اس وجہ کی نفی رخصت کی علت ہوگی۔

بہر حال اس بارے میں دونوں جانب بہت ساری صحیح احادیث مروی ہیں، نبی کے بارے میں بھی اور اباحت کے متعلق بھی، جن میں تطبیق کی صورتیں وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ جھاڑ پھونک کرنے اور کروانے میں فرق ہونا چاہئے کیونکہ حدیث بالا میں لفظ ”استرقی“ کا استعمال ہوا ہے اور یہ معلوم ہے کہ باب استعمال کی ایک خاصیت طلب فعل (یعنی ماخذ الاشتقاق) بھی ہے، لہذا اسی خاصیت کے تناظر میں کہنا جائے گا کہ جھاڑ پھونک کروانے کی غرض سے کسی کے پاس جانا نہیں چاہئے اور نہ ہی اسے طلب کرنا چاہئے البتہ اگر کوئی آدمی از خود چل کر مریض کے پاس جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ رقیہ کے کلمات والفاظ مشروع ہوں کیونکہ اس سے توکل پر اثر نہیں پڑتا، اسی طرح استرقی یعنی طلب رقیہ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جبکہ اسے اسباب کے درجہ میں مان کر اعتقاد صرف اللہ پر ہو مگر یہ قدرت عوام کو شاید حاصل ہوتا مشکل ہو، لہذا جھاڑ پھونک کے وقت ان کو بتانا چاہئے کہ شفا دینے والا صرف اللہ ہے اسی نے اپنے کلام میں شفا رکھی ہے۔ مزید تفصیل درکار ہو تو دیکھئے (تشریحات ترمذی ص: ۲۲۸ تا ص: ۲۳۲ ج: ۴، باب ماجاء فی التعوذ للمریض، ابواب الجنائز)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث ”لارقیۃ الا من عین او حمة“^۳ میں حصر مقصود نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن بیماریوں میں رقیہ زیادہ مفید ہے ان میں سے یہ دو بطور خاص قابل ذکر ہیں گور قیہ باقی امراض میں بھی مفید ہے۔

۳۔ راجع للروایات جمع الفوائد ص: ۲۵۳ تا ۲۵۷ ج: ۴۔

۴۔ رواہ البخاری ص: ۸۵۰ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً رواہ مسلم فی الايمان وابوداؤد فی الطب باب: ۷۱، مستند احمد

ص: ۲۴۷ ج: ۱ حدیث: ۲۳۴۳۔ حقیظ الرحمن الحنفی عفی عنہ

بہر حال جب دوا یا رقیہ سے فائدہ محسوس ہو تو شفاء کی نسبت اللہ کی طرف کرنی چاہئے کہ درحقیقت وہی

شفاء دینے والا ہے۔

باب ماجاء فی الرقية بالمعوذتین

”عن ابی سعید قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتعوذ من الحان وعین

الانسان حتی نزلت المعوذتان فلما نزلتا أخذ بهما وترك ما سواهما“۔^۱ (حدیث حسن غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنات اور انسانی

بد نظری سے پناہ مانگتے تا آنکہ معوذتین نازل ہوئیں، پس جب یہ دونوں (سورتیں) نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے انہی دونوں کو معمول بنایا اور باقی کا پڑھنا ترک کیا۔

لغات :- عوذ اور عیاذ پناہ اور پناہ میں آنے کو کہتے ہیں جبکہ تعوذ پناہ میں آنے اور پناہ لینے کو کہا جاتا

ہے۔ قولہ ”المعوذتان“ اصطلاح میں سورہ فلق اور سورہ الناس دونوں کو کہتے ہیں۔

تشریح :- چونکہ نظر بد ایک حقیقت ہے اور ہر ایک کو لگ سکتی ہے اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

جنات کے شر اور نظر بد کے ضرر سے بچنے کے لئے دعائیں مانگتے مثلاً ”أعوذ باللہ من الحان وعین

الانسان“ پھر جب لبید بن اعصم یہودی اور اس کی بیٹیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تو اس سے

شفاء کے لئے یہ دونوں سورتیں نازل ہو گئیں جس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے تب آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کا پڑھنا معمول بنایا اور باقی معوذات کا پڑھنا کم کر دیا، کیونکہ ان سورتوں میں

جو جامعیت اور برکت ہے وہ دوسری ادعیہ تعوذ میں نہیں ہے لہذا باقی تعوذات ماثورہ کا پڑھنا بدستور جائز ہے

منسوخ نہیں۔

قال ابن العربی فی المعارضۃ: ”اذا کان الافضل الرقية بكتاب اللہ فالفاتحة

اصل... وبالمعوذتین... او بکلمات المرویۃ عنہ فی تعویذ الحسن وفی

تعویذ حبریل وثابت“۔

باب ماجاء فی الرقية بالمعوذتین

۱۔ الحدیث أخرجه النسائی من ۳۱۷ ج: ۲ کتاب الاستعاذۃ، متن ابن ماجہ ص: ۲۵۱ ”باب من استرق من العین“

ابواب الطب ج: ۲ جمع الفوائد ص: ۲۵۵ ج: ۲۔

معوذتین کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ دونوں سورتیں مکی ہیں مگر یاد رہے کہ کسی سورت یا آیت کا مکرر نازل ہونا ممنوع نہیں، یہ مسئلہ اور اسی طرح ان دونوں سورتوں کے بارے میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے مع الاحوال جو یہ راقم کی کتاب ”زاوایہ فی علوم التفسیر“ میں ملاحظہ ہو کہ یہ مسئلہ تفسیر کا ہے۔

باب ماجاء فی الرقية من العین

”عن عبید بن رفاعۃ الزرقی ان اسماء بنت عمیس قالت: یا رسول اللہ! ان ولد جعفر تسرع الیہم العین افسا سرقی لہم؟ قال ”نعم“ فانہ لو کان شئی سابق القدر لسبقہ العین۔“ (حدیث حسن صحیح) ^۱

حضرت عبید بن رفاعہ سے روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! جعفرؓ کی اولاد کو نظر بد لگ جاتی ہے تو کیا میں ان کے لئے جھاڑ پھونک کر سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہاں“ کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت حاصل کر سکتی تو آنکھ سبقت لے جاتی۔ (یعنی بد نظری)

تشریح:- حضرت اسماء بنت عمیسؓ بصیغہ تصغیر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں، یہاں سوال اپنے ہی بچوں کے بارے میں مراد ہے مگر حضرت جعفرؓ کی خوب صورتی کو سوال میں آجا کر کرنا مقصود ہے تاکہ نظر بد لگنے کی وجہ بھی ساتھ ساتھ ذکر کر دیں کیونکہ ”الولد سر لایہ“ یعنی میرے بچوں کو خوب صورتی کی وجہ سے نظر بد لگتی ہے کیونکہ آخر وہ جعفرؓ ہی کے بچے ہیں نظر کیوں نہ لگے گی، پھر ذلک فقہین مفرد اور جمع ایک تادم ذکر اور مؤنث سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس کا بہترین ترجمہ اردو میں ”اولاد“ ہے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت دینا ان کی خصوصیت نہیں بلکہ عام اذن ہے بشرطیکہ وہ کلمات ماثور یا کم از کم معنی صحیح پر مشتمل ہوں اور جہاں تک جواب میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ مبالغے کے لئے ہے تاکہ لوگ نظر بد سے بچنے کی تدبیر کریں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو تدبیر بتلائی تھی اور اگر نظر بد لگ جائے تو اس کے لئے جھاڑ پھونک کریں کیونکہ نظر بد کی مستعار تاثیر اتنی قوی ہے کہ اگر کوئی

باب ماجاء فی الرقية من العین

۱۔ جمع الفوائد ص: ۲۵۴ ج: ۲ کتاب الطب، ایضاً راجع للروایات مجمع الزوائد ص: ۱۳۱ ج: ۵ کتاب الطب۔

چیز تقدیر پر غالب آسکتی تو نظروہ چیز ہے جو غالب آجاتی مگر اللہ کا فضل ہے کہ کوئی چیز تقدیر کو مغلوب نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ سب تقدیر کا حصہ ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نظر بد کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ نقل اور عقل دونوں کے خلاف چلتے ہیں اور یہ کہ یہ تاثیر دراصل روح کی ہوتی ہے اسی بناء پر نابینا شخص کی بھی نظر بد لگتی ہے۔ (راجع للتفصیل زاد المعاد و تشریحات ترمذی ص: ۲۳۰ ج: ۴، باب ما جاء فی التعوذ للبریض) اس کی کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

حدیث آخر: "عن ابن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعوذ الحسن والحسین یقول: أَعِیْذُكُمْ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ النَّامَةِ مِنْ كُلِّ شَیْطَانٍ وَهَامَةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَةٍ ویقول: هَلْکُنَا کَانَ اِبْرَاهِیْمُ یُعَوِّذُ اسْمٰحُ وَاسْمٰعِیْلَ"۔ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے تعوذ فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے میں تمہارے لئے اللہ کے کلام کے ذریعہ پناہ مانگتا ہو جو پورا ہے ہر شیطان سے اور ہر زہریلی چیز سے اور جنوں میں ڈالنی والی آنکھ سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی طرح تعوذ فرماتے حضرت اسحاق اور اسمعیل (علیہما السلام) کے لئے۔

لغات مع التشریح:۔ قولہ "النامة" اس سے کلمات کی توصیف اس لئے کی گئی کہ اللہ کا کلام پورا اور مکمل ہے اس میں کسی طرح کا نقصان نہیں یا اس لئے کہ وہ تعوذ کے لئے کافی ہے، پھر کلمات سے مراد کلام بھی ہو سکتا ہے جو کہ قرآن ہے اور اسماء و صفات بھی ہو سکتی ہیں۔ قولہ "هامة" ہر وہ زہریلا جانور جس کے کاٹنے سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے جبکہ اس سے کم درجے کا جانور سام کہلاتا ہے یعنی اس کا زہر قاتل نہیں۔ هامة مع بمعنی فکر سے بھی ہو سکتا ہے یعنی ہر اس چیز سے پناہ مانگتا ہوں جو پریشان کرنے والی ہو۔

قولہ "لامة" لامہ، جنوں کی ایک قسم یا درجہ ہے، جب آدمی کو نظر بد لگتی ہے تو وہ معیون پاگل اور مجنون جیسا حواس باختہ محسوس ہوتا ہے وہ خود بھی اپنی حالت صحیح طور پر نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہوا ہے؟

باب ماجاء أن العين حق والغسل لها

”عن یحییٰ بن ابی کثیر قال ثنی حیاة بن حابس النمیمی ثنی ابی انه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: لا شئ فی الهام، والعیون حق“۔ (حدیث غریب و اخرجه احمد^۱، و کذا اخرجه البخاری فی الادب المفرد)

حضرت حابس تمیمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہام کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نظر لگنا سچ ہے۔

لغات :- ہام جمع ہے ہامہ کی بروزن ساعۃ یعنی میم کی تخفیف کے ساتھ۔ بعض نے تمذید کو بھی جائز کہا ہے۔ ہام یا ہامہ سر اور کھوپڑی کو بھی کہتے ہیں اور ”یومہ“ یعنی آؤ کو بھی کہا جاتا ہے اور ایک چھوٹے سے پرندے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو رات کو قبرستان میں رہتا ہے۔ قاموس الوحید وغیرہ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا اعتقاد تھا کہ مقتول کی کھوپڑی سے ایک پرندہ نکل کر گھر آتا ہے اور ”امسقونی، امسقونی“ پکارتا ہے یعنی مجھے سیراب کرو، اور مراد بدلہ لینا ہوتا ہے چنانچہ وہ مسلسل انتقام لینے تک یہ پکارتا رہتا ہے، اسلام نے اس عقیدہ کو باطل قرار دیا جیسا کہ حدیث باب میں مصرح ہے۔ (کنز الدانی الحاشیہ)

ابن العربی اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں ”و حدیث ابی عیسیٰ هذا صحیح“۔

تشریح :- ہام کے بارے میں کچھ کہانی زمانہ جاہلیت کے اہل عرب میں مشہور و معروف تھی، اس حدیث میں اس کی صریح نفی کی گئی، اس کے بعد اس قسم کی وہابیات کا زعم کسی طرح جائز نہیں، اسی طرح بعض مسلمانوں میں ارواح کے متعلق جو قصے مشہور ہیں کہ روح کبھی طوطے کی شکل میں کسی پنجرے میں بند ہوتی تھی اور کبھی موتی بن کر سانپ کے منہ میں محفوظ کر دی جاتی وغیرہ وغیرہ یہ ہندوں کے عقائد کا حصہ ہیں جو کہ تناسخ کے قائل ہیں لہذا اپریوں، دیوا اور شبنراؤں کے اس قسم کے مفروضی بلکہ منکھر قصہ نمونیوں سے پرہیز لازمی ہے کہ اس سے عقیدہ خراب ہو جاتا ہے کیونکہ اسلام میں تناسخ کے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

جہاں تک نظر بد کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے مگر اس کے ساتھ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ

اشیاء کی تاثیرات تولیدی نہیں اور نہ ہی تاثیرات کا دار و مدار اعداد پر ہے بلکہ عادی ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اشیاء میں بعض اثرات پیدا فرمائے ہیں، یہ اشیاء بمنزلہ اسباب ہوتے ہیں، ان کے استعمال یا رونما ہونے سے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی سنت جاریہ کے مطابق کچھ اثرات پیدا فرماتے ہیں، اس مسئلہ کی تفصیل ”باب ما جاء فی کرہیۃ البول فی المختل“ میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۱ ص: ۱۳۸)

نظر بد آنکھ کا اثر ہے یا روح کا؟ اس کے بارے میں ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے:

”ولیس العین ہی الفاعلة وانما التأثير للروح ولشدة ارتباطها بالعین نسب

الفعل الیہا وروح الحاسم مودہ للمحسود اذنی بیناً ولهذا امر اللہ رسولہ ان

یستعید بہ من شرہ الخ۔ (مختصر زاد المعاد ص: ۲۳۷ فصل فی جزمہ ابی بکر رضی اللہ عنہ)

یعنی نظر بد آنکھ کی تاثیر نہیں بلکہ دراصل روح کی تاثیر ہوتی ہے مگر آنکھ سے گہرے تعلق کی بناء پر نسبت آنکھ کی طرف کی جاتی ہے چنانچہ حسد کرنے والا شخص محسود کو سخت تکلیف پہنچاتا ہے یعنی نظر بد لگاتا ہے۔

بہر حال نظر ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم اس کی ماہیت کیا ہے تو یہ جاننا خاصا مشکل ہے ممکن ہے کہ جس طرح آج کل لیزر شعاعیں غیر مرئی حقیقت اور موثر قوت ہیں، اسی طرح یہاں بھی کوئی غیر مرئی طاقت خفیہ طریقہ سے وار کرتی ہو اور اس قسم کے حقائق کا کارخانہ قدرت میں وجود کوئی ناممکن نہیں، دیکھئے کبھی ایک بات سے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث:۔ ”عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لو کان شئی

سابق الفدر لسبقته العین واذا استغسلتم فاغسلوا“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

یعنی جب تم (عائن) سے غسل کرنے کو کہا جائے تو غسل کر لیا کرو۔

لغات:۔ بقولہ ”استغسلتم“ بصیغہ مجہول طلب غسل مراد ہے یعنی جب کسی کی نظر لگ جائے اور معین یا اس کے گھر والے عائن سے کہیں کہ تم اپنے اعضاء دھو کر وہ مستعمل پانی ہمیں دے دو تو ایسا کرنا چاہئے۔

محشی نے مجمع البحار کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر عائن غسل سے انکار کر دے تو اسے مجبور کیا جائے گا کیونکہ اس حدیث میں امر کا صیغہ ”فاغسلوا“ لزوم پر دلالت کرتا ہے۔

تشریح:۔ پھر غسل کا طریقہ حاشیہ میں تفصیل سے بتلایا ہے کہ عائن کے پاس جب پانی لایا جائے تو وہ

پہلے چلو میں پانی لے کر مضبوط کر کے کلی کا پانی اسی برتن میں ڈالے، پھر چہرہ دھو لے، پھر بائیں ہاتھ سے پانی لے کر دائیں پر ڈالے، و بالعکس، پھر بائیں ہاتھ سے پانی داہنی کہنی پر ڈالے، و بالعکس، پھر بائیں ہاتھ سے پانی لے کر سیدھے پاؤں پر ڈالے، و بالعکس یعنی پھر سیدھے ہاتھ سے پانی لے کر بائیں پیر پر ڈالے، پھر اسی طرح گھٹنے دھوئے اور پھر داخل الازار یعنی شرم گاہ اور ازار باندھنے کی جگہ کے درمیانی حصے کو دھوئے، یہ سارا مشتمل پانی اس برتن میں جمع ہونا چاہئے، فراغت کے بعد یہ سب پانی ایک بارگی معین کے اوپر پشت کی جانب سے ڈالے وہ اللہ کے حکم سے ٹھیک ہو جائے گا۔ تاہم ابن العربی نے عارضہ میں دھونے کی اس تفصیل سے اتفاق نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

”ومن قال: لا يجعل الاماء في الارض ويغسل كذا بكذا وكذا بكذا، فهو كله

تحكم وزيادة“۔ (العارضة)

یعنی مندرجہ بالا طریقہ کار کی ضرورت نہیں اور نہ ہی برتن کو ہاتھوں میں معلق پکڑنے کی ضرورت ہے بلکہ صرف ہاتھ پاؤں اور داخل الازار دھونا جیسے بھی ہو کافی ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس وضو کے پانی کا نظر کے ازالہ سے کیا تعلق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے بعض اسباب انتہائی مخفی ہوتے ہیں تو بھران کے اثر کے ازالے کا طریقہ بھی باریک ہوتا ہے جس کا عام مشاہدہ کیا جاسکتا ہے دیکھئے جادو وغیرہ اور ریاضی کے اصول وغیرہ کو وہ کتنی باریکی پر مبنی ہوتے ہیں چنانچہ کچھ اجسام کو مخصوص زاویہ پر رکھنے سے ان میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک آدمی باقاعدہ ایک گھنٹے کے بعد آکر گھنٹی بجاتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے حالانکہ وہ کوئی انسان نہیں ہوتا ہے، آپ نظام شمسی پر غور کریں کہ مخصوص زاویہ پر واقع ہونے پر یہ اجرام فلکیہ کس طرح رواں دواں ہیں؟ جب آدمی اللہ عزاسرہ کے کارخانہ قدرت میں معلومات کی روشنی میں غور کرتا ہے تو اس قسم کے عجائبات کا مشاہدہ روزمرہ کا معمول بن جاتا ہے۔

علاج کے اسباب کیا ہیں؟ اس بارے میں کئی آراء ہیں: ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد تجربے پر ہے ممکن ہے کہ یہ تمام اسباب بیک وقت مفید ہوں، علیٰ ہذا النظر بد سے شفاء اس تجربے کے تناظر میں نامعقول نہیں کہ اس قسم کے تجربات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں، مذکورہ تجربہ بھی زمانہ قدیم کا نسخہ تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا، علاوہ ازیں روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب کوئی چیز دیکھنے سے پسند آجائے تو آدمی

برکت کی دعا کرے، یا ”ماشاء اللہ ولا حولہ الا باللہ“ کہے تو نظر کے ضرر سے محفوظ ہو سکتا ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظر کے حوالے سے جو طریقے مختلف اقوام میں معمول بہا ہیں اور وہ مفید بھی ثابت ہوئے ہیں تو اگر ان میں کسی غیر شرعی امر کا ارتکاب نہ آتا ہو یا وہ اصول سے متصادم نہ ہوں تو وہ بھی قابل عمل ہیں مثلاً ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ عائشہ اپنے بدن پر سوتی کپڑا ملتا ہے پھر اس کی بتی بنا کر آگ لگا دی جاتی ہے اور معین اس دھوئیں کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے اور دھواں سونگھتا ہے، اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ شفاء بھی عنایت فرماتے ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم، سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا۔

باب ماجاء فی اخذ الاجر علی التعویذ

”عن ابی سعید قال: بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَرِيَّةٍ فَتَزَلْنَا بِقَوْمٍ فَسَلَّطْنَا هُمُ الْفَرَى فَلَمْ يَمُتُوا فَلَدَغَ سَيْدُهُمْ فَأَتَوْا نَافِقًا لَوَاهِلَ فِيكُمْ مَنْ يَرْفِي مِنَ الْعَرْبِ؟ قُلْتُ نَعَمْ أَتَاوَلَكُنْ لَأَرْقِيَهُ حَتَّى تَعْطُوا نَاغِمًا قَالُوا إِنْ أَمَّا نَاغِمُكُمْ ثَلَاثِينَ شَاةً فَقَبَلْنَا فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ الْحَمْدَ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَبَرَأَ وَقَبَضْنَا الْغَنَمَ بِقَالَ فَعَرَضَ فِي أَنْفُسِنَا مِنْهَا شَيْءٌ فَقُلْنَا لَا تَعْلُو حَتَّى تَأْتُوا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَيْهِ ذَكَرْتُ لَهُ الَّذِي صَنَعْتُ قَالَ: وَمَا عَلِمْتُ أَنْهَارِقِيَّةٌ؟ اقْبِضُوا الْغَنَمَ وَاضْرِبُوا لِي مَعَكُمْ بِسَهْمٍ“۔ (هذا حديث حسن صحيح واخرجه الشيخان وغيرهما)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ کی شکل میں بھیجا تو ہم ایک قبیلہ والوں کے یہاں اتر گئے ہم نے ان سے ضیافت طلب کی مگر انہوں نے ضیافت نہیں کی (یعنی کھانا نہیں کھلایا) اتنے میں ان کا سردار ڈسا گیا (یعنی سانپ یا بچھو نے ڈس لیا) تو وہ ہمارے پاس آ گئے اور کہنے لگے کہ تم میں کوئی بچھو کے ڈسے ہوئے کو دم کر سکتا ہے؟ میں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں لیکن جب تک تم ہمیں بکریاں نہیں دو گے تب تک میں رقیہ نہیں کروں گا تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو تیس (۳۰) بکریاں دیں گے (کیونکہ سریہ والے بھی کل تیس صحابہ تھے) پس ہم نے قبول کر لیا پس میں نے اس پر سات مرتبہ الحمد شریف

ج: کذا فی مجمع الزوائد ص: ۱۴۱ ج: ۵ حدیث: ۸۴۴۲ ج: سورة البقرة آیت: ۳۲

باب ماجاء فی اخذ الاجر علی التعویذ

۱۔ صحیح بخاری ص: ۸۵۳ ج: ۲ ”باب الرقی بالقرآن والمعوذات“ کتاب الطب، صحیح مسلم ص: ۲۲۴ ج: ۲

کتاب السلام، ایضاً روح البوداؤد کذا فی جمع الفوائد ص: ۲۵۵-۲۵۶

پڑھ کر دم کیا چنانچہ وہ ٹھیک ہو گیا اور ہم نے وہ بکریاں لے لیں، فرماتے ہیں کہ اس سے ہمارے دلوں میں کھٹکاسا پیدا ہوا تو ہم نے باہمی مشاورت سے طے کیا کہ جلدی نہ کریں یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا جائے، فرمایا کہ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس عمل کے بارے میں آگاہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ (فاتحہ) رقیہ ہے؟ بکریوں کو اپنے پاس رکھو اور میرا بھی ان میں حصہ کرلو۔

لغات:- ”نعویذ“ باب تفعیل کا مصدر ہے، تحفظ کے پیش نظر یا شفاء کی غرض سے اسماء حسنی وغیرہ کلمات خیر لکھنا یا پڑھنا۔ قولہ ”فی سریرہ“ بکسر الراء وتشدید الیاء، المکتوحہ، لشکر کا وہ دستہ جس کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار سو افراد پر مشتمل ہو، یہاں جس سریرہ کا ذکر ہے روایات کے مطابق یہ تیس نفوس پر مشتمل تھا۔ اصحاب السیر کی اصطلاح میں وہ لشکر جس کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شامل نہ ہوں سریرہ کہلاتا ہے۔ قولہ ”الغری“ بکسر القاف والفاء المقصورة، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ قری اور ضیافت دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں البتہ ”ق، ر، ی“ مادہ میں جمع کے معنی پائے جاتے ہیں جبکہ ”ض، ی، ف“ میں میلان کے معنی ہیں، ”تقول فریث السعاء فی الحوض اذا جمعت فیہ متفرقة“ گویا میزبان اپنے مہمان کی خاطر محبت، خدمت، ٹھکانہ اور کھانا جمع کرتا ہے، اسی طرح وہ مہمان کی جانب مائل بھی ہوتا ہے۔

قولہ ”فلدغ“ بھینچہ، مجہول، لدغ بچھو کے ڈنگ مارنے اور سانپ کے ڈسنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”من یرقی“ رقا، یرقی، رقی، جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں۔ قولہ ”وما علمت انہا رقیہ؟“ اگلی روایت میں ہے ”وما یدریک انہا رقیہ؟“ ابن العربی فرماتے ہیں کہ یہاں ”بہ“ مقدر ہے ”ای ما علمت بہ انہا رقیہ؟“ قولہ وفی الحدیث الثانی۔ قولہ ”جعلنا“ بالضم، اجرت۔ قولہ ”قطعیاً“ گلہ، ریوڑ۔

تشریح:- واضح رہے کہ اس قسم کا ایک واقعہ نسائی^۱ میں بھی مروی ہے جس سے تعارض کا شبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس میں ہے کہ وہ آدمی مجنون اور پاگل تھا جبکہ یہاں لدغ کا ذکر ہے لیکن وہ الگ واقعہ ہے کہ یہاں راتی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور اس میں حضرت علقمہ بن صحرار رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس لدغ کو فاتحہ سے شفاء ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب ابن العربی نے عارضہ میں دیا ہے کہ انہوں نے ”ام الکتاب“ کے نام اور جامعیت مضمون سے معلوم کیا تھا یعنی قرآن

میں شفاء تو ہے اور فاتحہ ام الکتاب ہے، لہذا اس میں بھی شفاء کی خاصیت ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اجتہاد کی تردید نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ ان کا اجتہاد صحیح تھا اور یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں اجتہاد و استنباط فرماتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسافر کے پاس کھانے پینے کا انتظام نہ ہو تو وہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام نے اظہار کید والوں سے کیا تھا، عارضہ میں ہے کہ رقیہ کی اقل مقدار تین بار پڑھنا ہے اور اکثر سات مرتبہ، ابوسعید خدریؓ نے اکثر پر عمل کیا "رغبة فسی تحصیل البر والاعوذ بالاونق"۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی حکم میں شک پڑ جائے تو یقین کے حصول تک توقف کرنا چاہئے اور یہ کہ تحصیل یقین میں کوشش تیز کرنی چاہئے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رقیہ پر اجرت لینا جائز ہے، اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں بحوالہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نقل کیا ہے کہ امر دنیاوی کی غرض سے شتم القرآن یا بخاری پر بھی عوض لینا جائز ہے جبکہ علامہ شامیؒ نے "شفاء العلیل" میں لکھا ہے کہ ایصال ثواب کے لئے تلاوة پر اجرت لینا حرام ہے، علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ پر شرح عقود رسم المفتی میں بھی بحث کی ہے بلکہ اس مسئلہ کا ذکر ان مسئلہ میں کیا ہے جو مصنفین حوالہ جات میں اصل کتاب کے مراجعت کے بغیر نقل کرتے ہیں جن کی تعداد علامہ شامیؒ نے تلاش اور تتبع کے بعد (۲۰) میں ذکر کی ہے، چنانچہ متعدد کتابوں میں تلاوة مجرودہ یعنی بغیر تعلیم کی غرض سے تلاوت پر اجرت لینے کو جائز لکھا ہے حالانکہ یہ خطا ہے۔ (دیکھئے شرح عقود رسم المفتی ص: ۶۷، یا شفاء العلیل وعلی العلیل فی بطلان الوصیۃ بالخشعات والتھلیل)

البتہ تعلیم القرآن پر اجرت لینا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تو جائز ہے ہی مگر متاخرین فقہائے حنفیہ نے بھی ضرورتاً جائز لکھا ہے گواصل مذہب میں جائز نہیں ہے، یہ مسئلہ اجرت علی الطاعات کے اوپر مبنی ہے۔

جمہور کا استدلال باب کی حدیث سے ہے جو بطور قیاس تعلیم پر اجرت کو جائز مانتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ رقیہ امر مباح ہے جبکہ تعلیم فرض ہے گو کفایہ ہے، نیز رقیہ کا نفع دنیوی و جسمانی ہے جبکہ تعلیم کا نفع اخروی اور دینی ہے، تعلیم عبادت ہے جو حق اللہ ہے اس پر مخلوق سے اجرت لینے کا کیا مطلب؟

چونکہ مال محبوب ترین عند اکثرین ہے اس لئے اجرت لینے میں اہل علم، لوگوں میں مبغوض شمار ہوتے

ہیں کہ محبوب کی طمع رکھنے والے سے تو حسد و عداوت بیشکی چیز ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام آتے ہی اعلان فرماتے ”لا اسئلكم علیہ اجرًا“ کت الایہ۔

بہر حال اب مسئلہ پر اتفاق ہو چکا ہے اس لئے فریقین کے دلائل ذکر کرنے میں کوئی معتد بہ فائدہ نہیں، نیز اس کی وضاحت کسی حد تک پہلے گزری ہے۔ (ظہیر جامع تشریحات ترمذی ج: ۱ ص: ۴۸۳، باب ماجاء فی کراہیۃ ان یاخذ المؤمنون علی اذانه اجراء) تاہم وہاں حوالہ کا مذہب مثل حنفیہ کے مذکور ہے جبکہ ان کا مذہب مثل الجہور ہے۔ فلجہبہ۔

اس حدیث سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ رقیہ سے تقدیر میں تبدیلی آ جاتی ہے کیونکہ رقیہ، دعا اور دوا یہ سب تقدیر کا حصہ ہیں کہ اللہ عزوجل نے جو بھی بیماری مقدّر فرمائی ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی متعین فرمایا کہ یہ شخص فلاں ذریعہ اختیار کرے گا تو ٹھیک ہو جائے گا جبکہ بعض کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ وہ باوجود یکہ اسباب اختیار کریں گے مگر ان کو فائدہ نہ ہوگا جیسا کہ اگلے باب میں آئے گا۔

باب ماجاء فی الرقی والادویۃ

”عن ابی ہریرۃ عن ایہ قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلت: یا رسول اللہ! أرأیت رقی؟ نسترقیہا و دواء؟ نتداوی بہ و نغفأ تنقیہا ہل تترد من قدر اللہ شیئاً؟ قال ”ہی من قدر اللہ“۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ اپنے والد حضرت عمر سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ بتادیجئے کہ جو جھاڑ پھونک ہم کرواتے ہیں اور دوا استعمال کرتے ہیں اور تھپار سے اپنا تحفظ کرتے ہیں کیا یہ اللہ کی قدر و قضا میں سے کسی چیز کو روک سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ (اسباب) بھی اللہ کی قدر و قضا میں سے ہیں۔

لغات: بقولہ ”ابو ہریرۃ“ بکسر الحاء و تخفیف الزاء بقولہ ”أرأیت“ ای أعیرنی بقولہ ”رقی“ جمع رقیۃ بقولہ ”نسترقیہا“ من و ما طلب کے لئے ہیں ”ای نفرہا لطلب الرقیۃ“ بقولہ ”دواء“ رقی پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے بقولہ ”نتداوی بہ“ ای نستعملہ بقولہ ”نغفأ“ بضم التاء و قی اور دقائہ سے ہے

یعنی سامان حفاظت جیسے ڈھال اور باقی ہتھیار وغیرہ۔ قولہ ”تنبیہا“ اسی لفظ سے ہے یعنی ان سے اپنی حفاظت کرتے ہیں اور بطور احتیاط رکھتے ہیں۔ قولہ ”ہی من قدر اللہ“ یعنی یہ تینوں اسباب بھی تقدیر میں سے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں سوال کا مطلب تو واضح ہے کہ جب کوئی چیز تقدیر میں مقدر و مقرر ہو جیسے موت اور قتل وغیرہ تو پھر اس کے روکنے کی تدبیر سے کیا وہ فیصلہ تبدیل ہو جاتا ہے؟ اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ نہیں ہرگز نہیں قضاء میں کسی طرح تبدیلی ممکن نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اسباب اور دفاع کا سامان بھی تقدیر ہی میں سے ہے کہ اللہ نے جس طرح کسی مرض وغیرہ کی تقدیر فرمائی ہے تو ساتھ ساتھ یہ بھی مقدر فرمایا ہے کہ فلاں کی بیماری فلاں ڈاکٹر کے علاج سے ٹھیک ہوگی یا فلاں کے جہاز بھونک سے شفاء نصیب ہوگی اور فلاں دشمن کا حملہ فلاں ہتھیار سے پسپا ہوگا، لہذا ان میں تعارض نہ سمجھا جائے۔

تاہم یہ اسباب بہر حال مؤثر نہیں ہیں کیونکہ بعض اسباب و ذرائع کے بارے میں اگرچہ یہ مقدر ہوتا ہے کہ ان کے استعمال سے فائدہ ہوگا مگر بعض کے متعلق یہ بھی فیصلہ ہوتا ہے کہ ان سے کوئی فائدہ نہ ملے گا جبکہ بعض امراض وغیرہ کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ یہ بغیر دوا و دعا کے ختم ہوں گے۔ عارضۃ الاخوڑی میں ہے:

”وذلك لان الله خلق الاشياء ورتبها وساقها في الوجود على تقدير معلوم ونظام متسق فمنته ما يوجب له ابتلاء ومنه ما يوجب له بعد غيره بحكمة هو اعلم بها لان الله كما قد يكون شفاء من غير دواء وقد يكون سقم بعد دواء وقد يكون شفاء بعد دواء وقد يكون كفاية بغیر تقيہ۔“

یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوا سے مرض حرید شدید ہو جائے جیسا کہ بعض مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، لہذا تقدیر میں یہ تمام صورتیں مندرج ہوتی ہیں، کسی بھی امر موجود کو تقدیر کے منافی قرار دینا درست نہیں۔

قولہ ”وقد روی عن ابن عیینہ“ اس یعنی اس حدیث کے بعض طرق میں ”عن ابن ابی خزیمہ“ آیا ہے جیسا کہ امام ترمذی نے ابواب القدر کے ”باب ما جاء لا ترد الزقي والدواء من قدر الله شيئا“ میں اسی سند سے ذکر کیا ہے۔

مگر صحیح یہ ہے کہ یہ ”عن ابن ابی خزیمہ“ ہی ہے جیسا کہ زیر بحث باب کی سند میں ہے۔ عارضہ میں ہے کہ حدیث کا معنی بالا جماع صحیح ہے۔

باب ماجاء فی الکماء والعجوة

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: العجوة من الجنة وفيها شفاء من السم والکماء من المن وماء هاشفاء للعین“۔^۱ (حدیث حسن غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بجوہ جنت (کے بھلوں) میں سے ہے اور اس میں زہر سے شفاء ہے اور کھنسی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔ (حدیث حسن غریب ہے، تاہم باب کی انگی حدیث پر حسن صحیح کا حکم لگایا ہے)

”عن ابی ہریرۃ ان ناساً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالوا: الکماء جلدی الارض، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الکماء من المن وماء هاشفاء للعین والعجوة من الجنة وهي شفاء من السم“۔ (حدیث حسن)

کھنسی (کھنسی) من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔

لغات: فقوله ”الکماء“ فتح الکاف وسكون الميم اس کے بعد مزہ مفتوحہ ہے، تاہم عام طور پر مزہ کے بجائے الف پڑھا جاتا ہے جیسا کہ حاشیہ پر ہے، اس کی جمع کما یا برکس یا اکموء آتی ہے، یہ ایک قسم کی نبات ہے جسے ٹکڑے اور ٹکڑے کہتے ہیں، اس کی شکل ہو ہو چھتری کی مانند ہوتی ہے، محذب سطح انتہائی نرم و ملائم ہوتی ہے جبکہ مقعر اور چھڑی کی طرح ہوتی ہے اس کو سانپ کی چھتری بھی کہا جاتا ہے، برسات میں بغیر بوئے نکلتی ہے، اس کو ساگ کے طور پر سالن بنا کر بھی کھایا جاتا ہے، راقم نے بھی کھائی ہے۔ فقوله ”العجوة مفتوح العین وسكون النجم، مدینہ منورہ کی وہ عمدہ کھجور جو سیاحی مائل ہوتی ہے، آج کل بہت مہنگی ملتی ہے، یہ لذیذ بھی ہے، اور امراض قلب، زہر اور سحر سے شفاء کے لئے بھی مفید ہے، مجمع البحار کے حوالے سے محشی نے نقل کیا ہے کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے لگایا ہے۔

فقوله ”جلدی الارض“ بضم النجم وفتح الدال وکسر الراء وتشدید الیاء چپک کو کہتے ہیں، یہ ایک وبائی بیماری تھی جو انتہائی مہلک تھی، بقول سائنس دانوں کے چپک زدہ مریض کے ساتھ کمرے میں صرف پانچ

باب ماجاء فی الکماء والعجوة

۱۔ ایضاً روی بمعناه احمد فی مسنده ص: ۳۷۵، ح: ۲۲۳۳۹، ص: ۳۸۲، ج: ۶، حدیث: ۲۲۳۶۳، جمع الفوائد

ص: ۲۵۰، ج: ۲، وفی رواية احمد والطبرانی فی الکبیر: الکماء من السلوی الخ، مجمع الزوائد ص: ۳۰۰۔

سکندر نے اسے اس کا وائرس خصل ہو جاتا ہے اور پھر مریض میں انتہائی سرعت سے پھیل جاتا ہے، اس سے کبھی کبھار اتنی اموات ہو جاتیں کہ پوری کی پوری ہستی خاموش ہو جاتی۔ اقوام متحدہ نے اس بیماری کے وائرس کو ختم کرنے کے لئے شدید محنت کی اور بالآخر ۱۹۷۷ء تک اسے قابو میں لا کر صومالیہ کے آخری مریض پر بفضلہ تعالیٰ اس کا خاتمہ ہوا ہے، اب یہ وائرس محض تجربات کی غرض سے صرف تین لیبارٹریوں جارجیا، روس اور اٹلانٹا (امریکہ) میں محفوظ و محصور کیا گیا ہے۔ تاہم ۱۹۷۸ء میں حادثاتی طور پر لیبارٹری کے اندر اس کے وائرس کے بوتل سے باہر آنے سے ایک آدمی کی موت واقع ہوئی تھی۔

قولہ "المن" لفظ من کا اطلاق احسان و انعام پر بھی ہوتا ہے، یہ معنی اکی ہیں۔ اور بمعنی پیانہ کے بھی آتا ہے، یہ معنی ظنی ہیں جس میں دو رطل آتے ہیں۔ اور تیسرے معنی ترنجبین کے آتے ہیں جو ایک میٹھا سفید گوند پاؤڈر ہوتا ہے جو کھایا جاتا ہے اللہ نے بطور نغذائی اسرائیل پر نازل کیا تھا۔ یہاں یہی تیسرا معنی مراد ہے۔ یہ زیتون نماد درخت میں بکثرت ہوتا ہے، ہم بچپن میں اس کو شوق سے کھاتے تھے۔

تشریح:- عجمہ کجور کے جنتی ہونے کا مطلب کیا ہے؟ تو اس بارے میں محشی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک تشبیہ ہے جس سے مراد اس کی عمدگی بیان کرتا ہے۔ المستر شد عرض کرتا ہے کہ اس تفسیر کے مطابق کہا جائے گا کہ جس طرح عربوں میں یہ عرف قائم تھا کہ عمدہ اور نفیس چیز کی تشبیہ اس چیز سے دیتے جو "عبر" جنات کے شہر سے در آمد کی گئی ہو اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ بہت نفیس ہے چنانچہ تفسیر ابی سعید میں آیت سورہ رطمن "عبقری حسان" کے تحت لکھا ہے کہ: "نزع العرب انه اسم بلل الحن فینسبون الیہ کل شئی عجیب"۔ (کذا فی تفسیر روح المعانی وغیرہ) اس کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے، اس بارے میں دوسری رائے یہ ہے کہ یہ حقیقی اطلاق ہے، اور محشی کو کب نے "جمع الغوائد" سے بحوالہ بزار و کبیر روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے اترے تھے تو اپنے ہمراہ کچھ جنتی پھل لے آئے تھے پھر ان کی گھٹلیوں سے موجودہ عجمہ وغیرہ معرض وجود میں آئی ہے، تاہم دنیا میں آنے کے بعد جنت کے اثرات دنیاوی ماحول کی وجہ سے کم یا ختم ہو گئے ہیں، دنیا کا ماحول بعض اشیاء پر زیادہ اثر انداز ہوا ہے جبکہ بعض دیگر پر کم۔ عجمہ کافی حد تک محفوظ ہے۔ واللہ اعلم

عجمہ میں زہر اور سحر سے شفاء بعض کے نزدیک اس کی خاصیت دتا شہر ہے مگر بذل الحیو میں ہے کہ امام

خطابی نے اس کی ذاتی خاصیت کی نفی کر کے فرمایا ہے کہ یہ اثر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت ہے، علاوہ ازیں عجمہ دل کی بیماری کے لئے بھی مفید ہے، چنانچہ ابو داؤدؒ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ میں بیمار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کی غرض سے تشریف لائے پھر اپنا دست مبارک میری دونوں چھاتیوں کے درمیان (یعنی دل پر) رکھا یہاں تک کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس کی، پھر فرمایا "انک رجل مفود" یعنی تجھے دل کی بیماری ہے۔ جاؤ حارث بن کلدہ کے پاس وہ طب کا کام کرنے والا آدمی ہے، تو وہ عجمہ کی سات کھجوریں مدینہ کی لئے کرٹھلیوں سمیت کوٹ لے اور تمہیں کھلا دے۔ نیز سحر اور زہر کے لئے بھی سات کھائے۔ (جیسا کہ ابو داؤد میں ہے، باب فی تمرۃ النجومین کتاب الطب)

فائدہ:- بذل النجوم میں ہے کہ حافظؒ نے "الاصابة" اور ابن ابی حاتمؒ دونوں نے فرمایا ہے کہ حارث بن کلدہ (طیب) کا مسلمان ہونا صحیح روایت سے ثابت نہیں، لہذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل ذمہ میں سے ڈاکٹر و طبیب سے علاج کروانا درست ہے۔ نیز اس حدیث میں طبیب کو کیفیت بھی بتلا دی۔

قوله "والکساء من العن" جیسا کہ باب کی تیسری حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، میں یہ تاثر بیان ہوا جو عربوں کا زعم تھا کہ کھنسی زمین کا چپک ہے یعنی فاسد مادہ سے پیدا ہوتی ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زعم کو رد فرمایا اور کھنسی کی مدح فرمائی، اور جدید تحقیق سے بھی یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ چپک خراب خون یا مادہ کی وجہ سے نہیں نکلتا بلکہ ایک دائرہ کے حلقے سے ہوتا ہے۔ اور اگر عربوں کی اس اصطلاح کا مقصد محض تشبیہ ہو کہ جس طرح چپک جسم کے ظاہری حصے پر ہوتے ہیں اسی طرح کھنسی دانوں کی شکل میں روئے زمین پر نکلتی ہے تو پھر حدیث میں اس تشبیہ کی نفی مراد ہوگی، کیونکہ اچھی چیزوں کے لئے بُری مثال بیان نہیں کرنی چاہئے۔ باقی رہی یہ بات کہ اس کا استعمال کس طرح ہے تو اس کے لئے مابعد والی حدیث میں کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کھنسیاں لیں اور ان کو نچوڑا اور ان کا پانی ایک بوتل (شیشی) میں ڈالا پھر اس سے اپنی باندی کو بطور سرمہ لگاتا رہا یعنی ڈالتا رہا تو وہ ٹھیک ہو گئی۔

عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ کھنسی کے پانی کی شفاء میں اس اعتبار سے اختلاف ہے کہ اسے کیسے استعمال کیا جائے؟ تو حضرت ابو ہریرہؓ اس کے خالص پانی کے استعمال کے قائل تھے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسے سرمہ میں ملا کر لگایا جائے۔ جبکہ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے ٹھیک ہیں، کبھی ایک طریقے سے فائدہ ہوتا

ہے، اور کبھی دوسرے سے، دونوں کا تجربہ کیا گیا ہے اور دونوں کے مثبت نتیجے نکلے ہیں۔

حضرت تھانوی صاحبؒ نے ”المسک الذکی“ میں اگلے سے ہوستہ ”باب ماجاء فی تمہید الحمی بالماء“ میں فرمایا ہے: ”پختگی عقیدے سے حق تعالیٰ شفاء دے ہی دیتے ہیں، عقیدے کا، انجارج حواجؒ میں بڑا دخل ہے۔“

باب کی آخری حدیث:- ”عن قتادة قال حَدَّثْتُ ابا هريرة قال: الشونيز حواء من كل داء الا السام قال قتادة ياخذ كل يوم احدى وعشرين حبة فيجعلهن في خرفة فينفعه فيستعط به كل يوم في منحره الايمن قطرتين وفي الايسر قطرة بوالثاني في الايسر قطرتين وفي الايمن قطرة، والثالث في الايمن قطرتين وفي الايسر قطرة“۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ شونیز (کلونچی) ہر مرض کی دوا ہے سوائے موت کے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ روزانہ اکیس دانے لے کر کپڑے میں لپیٹ دے اور پانی میں بھگو دے پھر اس (کے پانی) سے ناک کے دائیں نچھنے میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ڈالے، اور دوسرے دن بائیں میں دو قطرے اور دائیں میں ایک قطرہ پکادے، اور تیسرے دن دائیں میں دو قطرے اور بائیں میں ایک قطرہ ڈالے۔

یہ روایت ابو نعیم نے طب میں مرفوعاً نقل کی ہے، اس بارے میں پیچھے مستقل باب ”الحبة السوداء“ کے عنوان سے گزرا ہے۔ فلیراجع۔

لغات:- قولہ ”الشونيز“ ضم الشين وسكون الواو وكسر النون كلونچی کو کہتے ہیں، اور اسے حبة السوداء بھی کہتے ہیں۔ قولہ ”السام“ بروزان عام موت کو کہتے ہیں، وقد مر۔ قولہ ”فينفعه“ يفتح الياء مفتوح پانی میں بھگوئی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ پھر ان کو پانی میں اچھی طرح بھگوئے۔ قولہ ”فيستعط“ سحوط سے ہے، ناک میں ڈالنے والی دوا، وقد مر۔ قولہ ”منحر“ اس میں میم پر تینوں حرکات جائز ہیں مگر کسرہ مشہور ہے۔ کلونچی کے بہت سے فوائد مطولات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

باب ماجاء فی اجر الکاهن

”عن ابی مسعود قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: عن نمن الکلب ومہر البغی وٹحلوان الکاهن“۔^۱ (هذا حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت، زانیہ کے مہر (یعنی اجرت) اور کاهن کی شیرینی (یعنی اجرت) سے منع فرمایا ہے۔

لغات :- قولہ ”مہر البغی“ لٹی بردزن قوٹی، قاحشہ اور زنا کار عورت کو کہتے ہیں، یہاں مہر سے مراد اجرت ہے۔ قولہ ”ٹحلوان“ بردزن غفران، میٹھی چیز کو کہتے ہیں، اس سے مراد اجرت ہے، چونکہ یہ بغیر تعب و مشقت کے ملتی ہے اس لئے اس کو شیرینی سے تعبیر کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بلا عوض مفت میں ملتی ہے۔ قولہ ”الکاهن“ جو آدمی غیب کی خبر دینے کا دعویٰ کرتا ہے یا تاثر دیتا ہو جیسے آج کل کے اکثر عامل کرتے ہیں۔

تشریح :- اس حدیث سے ان تینوں اجرتوں کی ممانعت معلوم ہوگئی البتہ ٹمن الکلب ہمارے نزدیک مقید و مشروط بشرط ہے جبکہ باقی دونوں کی تحریم پر اجماع ہے، یہ تینوں مسائل تشریحات ترمذی میں اپنے اپنے متعلقہ ابواب میں گزاری ہے۔ (ٹمن الکلب کے لئے دیکھئے تشریحات ج: ۵، باب ماجاء فی ٹمن الکلب ص: ۲۰۶، مہر البغی کے لئے دیکھئے ج: ۳، باب ماجاء فی کراہیہ مہر البغی ص: ۵۰۵، اور ٹحلوان الکاهن کے لئے دیکھئے مذکورہ باب کے علاوہ، باب ماجاء فی کراہیہ اتان الحاکم ص: ۳۶۲)

اس باب میں کاهن کی تین قسمیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں:

(۱) جو دعویٰ کرے کہ مجھے جنات اخبار غیب بتلاتے ہیں۔

(۲) جو مقدمات سے نتائج اخذ کرنے کا دعویٰ کرے چاہے سائل کی باتوں، کپڑوں، ناخن وغیرہ سے

کرے یا کسی اور ذریعہ سے۔

(۳) جو نجوم کی حرکات سے معلوم کرنے کا دعویٰ کرے جس کو عرف میں نجومی کہتے ہیں۔ حضرت

تھانوی صاحبؒ نے عزافہ کو بھی کہانت کی ایک قسم کہا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

باب ماجاء فی احدا الکاهن

۱۔ التحلیف (معرجہ البخاری ص: ۲۹۸ ج: ۱) ”باب لمن الکلب“ کتاب البیوع، ابو داؤد کتاب البیوع باب: ۶۳، جامع

الترمذی باب: ۳۶ کتاب البیوع.

”یہ عمل عرافہ ہے جو کھانت کی ایک قسم ہے اور محض حرام ہے نیز فی نفسہ حرمت کے ساتھ عوام کے فتنہ میں پڑنے اور گمراہی کا موجب بھی ہے اور دل میں آجانا القاء شیطانی ہے، یہ جواب انہوں نے ایک فزی میں دیا ہے، سائل کہتا ہے کہ دو نصیحتیں کے نام اور عمر اگر مجھے معلوم ہو جائے تو میں جان لیتا ہوں کہ کون غالب ہوگا۔ (تکلم العلماء ص ۵۳۰، ناشر البرکات)

اسی طرح علم دل کے متعلق لکھتے ہیں:

”کہ متعارف دل کی تعلیم و تعلم حرام ہے۔“ (ایضاً ص ۵۳۲)

جبکہ مسریم اور علم الارواح والماضیات کو قوت خیالیہ کا تصرف قرار دیا۔

آج کل کے اکثر عامل بھی اسی قوت فکر یہ کے زور پر بعض لوگوں کے نفوس میں تصرف کرتے ہیں، واضح رہے کہ جس آدمی پر دوسرے کا تصرف چل سکتا ہے تو وہ اس کی عقل کی کمی کی نشانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عاملوں کا شکار عورتیں ہوتی ہیں۔

بہر حال علم غیب اللہ کا خاصہ ہے تاہم جو خاصہ ہے وہ حقیقی علم غیب ہے اس تک کسی بھی مخلوق کی رسائی ممکن نہیں اس کا دعویٰ کرنے والا کافر ہے خواہ اپنے لئے اثبات کا دعویٰ کرے یا کسی مقرب فرشتے یا بشر کے لئے جبکہ اس کی دوسری قسم مجازی اور اضافی علم غیب کہلاتا ہے اس کا دعویٰ حرام ہے اور کاہن اسی زمرے میں آتا ہے۔

حضرت تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ: غیب کے دو معنی ہیں: حقیقی اور اضافی۔ حقیقی: وہ ہے جس کے علم کا کوئی ذریعہ نہ ہو، یہ خاص ہے حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے لئے اس کا حصول محال عقلی و شرعی ہے۔ غیب اضافی: وہ ہے جو کسی ذریعہ سے بعض کو معلوم کر دیا جائے، کسی (عمل) سحر یا کسی جن کے واسطے سے یا کسی نجومی یا کسی پنڈت کے واسطے سے کسی خبر کا یقین کر لینا خصوصاً جب کہ اس خبر سے کسی بری شخص کو متہم کر دیا جائے ایسا شدید حرام ہے کہ کفر کے قریب ہے۔ جب ان ذرائع کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں اور جو ذرائع شریعت کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے، ان پر حکم لگانا کس درجہ سخت گناہ ہوگا جیسے حضرات کرتا، چور کا نام نکالنے کے لئے لوٹا گھماتا، یا آج کل جو عمل مسریم شائع ہوا ہے یہ تو بالکل مہمل اور خرافات ہیں جن میں اکثر جبکہ تو عامل کا دھوکہ عیا ہوتا ہے، اور بعض عامل تو دھوکہ باز نہیں ہوتا مگر وہ خود دھوکہ میں ہوتا ہے، اس کو ان اعمال کی حقیقت معلوم نہیں، اول تو چور کا نام لگانا اس عمل سے اس کا کچھ تعلق نہیں، یہ عامل کے یا کسی صاحب مجلس کے خیال کا تصرف ہے، اس کا سمجھنا مسریم کے جاننے پر موقوف ہے، اور حضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں، وہ اگر سب

نہیں تو اکثر اسی قبیل سے ہیں۔

پھر یہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزمایا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا (بشرطیکہ دوسرے عامل کو اس نامزد چور کا علم نہ ہو) خوب سمجھ لیتا چاہئے کہ یہ سب تصرقات قوت خیالیہ کے ہیں، تو جیسے کوئی شخص کسی واقعہ میں فکر و خیال کو صرف کر کے کوئی رائے قائم کرے، بس اس سے زیادہ ان اعمال کی کوئی حقیقت نہیں اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ بعض اعمال میں آیات قرآنیہ پڑھی جاتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان آیات کی تلاوت قوت خیالیہ کے یکسو کرنے کا محض حیلہ ہے در نہ اصل فعل قوت خیالیہ کا ہے گو آیات نہ پڑھی جائیں جب بھی وہ تصرقات ظاہر ہوتے ہیں، اور اگر صرف آیات پڑھی جائیں اور خیال کو دوسری طرف متصرف کر دیا جائے تو ہرگز یہ تصرقات ظاہر نہ ہوں، اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ فلاں دفعہ (عمل) اس کے مطابق نکلا، یوں تو آدمی کچھ بھی نہ کرے یوں ہی بکنا شروع کر دے کوئی نہ کوئی بات ٹھیک ہو ہی جاتی ہے، اسی طرح ان خرافات میں اگر ایک دفعہ کوئی بات سچ نکلتی ہے تو سو دفعہ جھوٹ نکلتی ہے الخ۔ (ایضاً ص ۵۳۳)

اگر طول کا خوف مانع تفصیل نہ بننا تو اس کی کلیات اور جزئیات اور واقعات کو وسط کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا۔

تنبیہ:- (۱) امور غیبیہ دو طرح کے ہیں: ایک کا تعلق احکام سے ہے اور دوسرے کا انوکھان سے، علم احکام کلی طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے جبکہ امور تکوینیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ حصہ ملا ہے، تاہم علم غیب تکوینی کلی طور پر یا کہنا چاہیے کہ اس کے اصول اور کلیات کا علم اللہ تبارک و تعالیٰ کا خاصہ ہے، جزئیات منتشرہ پر بہت سے لوگوں کو حسب استعداد اطلاع دی گئی ہے، لیکن یہ تمام جزئیات اللہ کے علم کے مقابلے میں قطرہ بہ مقابلہ سات سمندر سے بھی کم ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام جس کشتی پر سوار ہوئے تو ایک چڑیا نے آکر اپنی چونچ سمندر میں ڈبو کر نکالی جس پر حضرت خضر علیہما السلام نے فرمایا: ”ہا موسیٰ ما نقص علمی وعلمک من علم اللہ تعالیٰ الا کفرۃ ہذہ العصفور فی البحر“۔ (بخاری جلد اول ص: ۲۳، کتاب العلم)

قابل غور ہے کہ ان دو انبیاء علیہم السلام کے پاس انتہائی وسیع علم تھا مگر پھر بھی انہوں نے یہ تشبیہ تقریب الی القہم کے لئے دی ہے ورنہ اللہ کا علم تو لامتناہی ہے جبکہ سمندر متناہی ہے لہذا یہ نظیر ہے مثال نہیں ہے۔ ہر ہر ذرے اور پتے کا علم صرف اللہ کو ہے، البتہ انبیاء علیہم السلام کو جتنا حصہ ملا ہے اس میں شک کی کوئی

مکمل نہیں کیونکہ ان کے پاس علم بذریعہ وحی آتا ہے اور وحی ذرائع معرفت اور اسباب علم میں سب سے زیادہ مضبوط اور سو فیصد یقینی سبب ہے جبکہ کائناتوں اور نجومیوں کا دعویٰ محض خیال یا فراڈ اور دھوکہ پر مبنی ہوتا ہے، اس کے پاس کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہوتا پس جو چیز اندازوں اور انکلوں پر مبنی ہو اس کا دعویٰ کرنا یا اثبات کرنا غیر حقیقی غیر شرعی اور غیر عقلی ہی کہلانے کا مستحق ہے، یہ کوئی علم نہیں بلکہ تھمین اور دھوکہ دہی ہے۔ لہذا اس پر اجرت لینا بلا عوض لینے کی وجہ سے حرام ہے اگرچہ کوئی خوشی سے دے کیونکہ دھوکہ اسی کو تو کہتے ہیں کہ کسی کو ایسا چکر دے جس سے اس کے اوسان خطا ہو جائیں۔

تنبیہ ۲:- آلات کے ذریعہ جو چیز معلوم کی جاتی ہے جیسے الٹراساؤنڈ میں مرض یا رحم کے احوال معلوم کرنا، ہوا میں نمی کا تناسب معلوم کرنا، یا نبض سے بیماری یا دیگر آلات سے دل کی حرکات وغیرہ معلوم کرنا یہ علم غیب کے زمرے میں نہیں آتے، لہذا ان آلات کے ذریعہ کسی چیز کو معلوم کرنے کا دعویٰ علم غیب کے دعویٰ میں نہیں آتا کیونکہ یہ آلات انسانی دماغ اور عقل کے نتائج ہیں، لہذا ان کا حکم وہی ہے جو انسانی اعضاء کا ہے کہ فرع تابع اصل ہوتی ہے تو جس طرح کسی شے کا علم آنکھوں سے حاصل ہوتا علم غیب نہیں تو اسی طرح عینک دور بین اور اسکیرے وغیرہ سے حاصل کردہ علم بھی علم غیب نہیں۔

سوال:- سورہ قلم (آیت نمبر ۳۳) میں ہے ”ان اللہ عنده علم الساعة“ یونزل الغیث یرفع ما فی الارحام“۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رحم کے اندر کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

جواب:- اس میں لفظ ”ما“ عام ہے اس سے فقط لڑکے یا لڑکی ”ممن“ ہونے کا علم نہیں بلکہ نطفے کی ابتدائی احوال سے لے کر بچے کی ولادت تک تمام حالیہ حالات، اور مستقبل کے احوال حسین و جمیل ہونا، فصیح و بلیغ ہونا اور باقی تمام انسانی کردار کی استعدادات کا علم حتیٰ کہ اس کے علوم اور موت و حیات کی صلاحیت نطفے کے اندر معلوم ہونا سب مراد ہیں جبکہ انسانی ساخت کے آلات یہ جاننے سے قاصر ہیں اگر فی الجملہ کچھ ظاہری شکل نظر آجائے یا نطفے کے جین کی کچھ صلاحیتیں معلوم ہو جائیں تو اس سے تمام نیکیوں امور کا علم کہاں لازم آتا ہے۔ آگے چل کر بھی ایسا ممکن نہیں کہ نطفے کو کسی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اس کی تمام صلاحیتیں بالفعل فوراً معلوم کی جاسکیں۔

اگر بالفرض کوئی آلہ ایسا بنا لیا جائے کہ جس سے انسانی ہمہ خوبیاں و خامیاں معلوم کرنے کا کام لیا جاسکے تو پھر بھی کوئی اشکال وارد نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آیت کریمہ میں علم کی بات کی گئی جو یقین کا درجہ ہے جبکہ

آلات کے ذریعہ یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ جزوی یقین یا ظن، اور ظن غالب ہوتا ہے، ایسا بسا اوقات ہوتا ہے کہ ایک لیبارٹری کی رپورٹ ایک طرح آتی ہے اور دوسری کی دوسری طرح۔ راقم نے خود جگر کے دو اعلیٰ لیبارٹریوں سے ٹیسٹ کروائے تو ایک نے رپورٹ دی کہ جگر میں درم ہے جبکہ دوسری نے کہا کہ صحیح ہے، ڈاکٹر نے کہا کہ یہ دونوں اچھی لیبارٹریاں ہیں اب ممکن ہے کہ کسی تیسری سے رجوع کیا جائے۔ ایسے واقعات بے شمار رونما ہوتے ہیں۔ اور یہ اگر شک نہیں تو زیادہ سے زیادہ ظن ہے جبکہ علم کی تعریف شرح العقائد میں یوں کی گئی ہے: "هو صفة يتحلى بها المذکور لمن قامت هي به"۔ دوسری تعریف ہے: صفة توجب تميزه لا يحتمل النقيض"۔ اور پہلی تعریف کو دوسری کی طرف راجع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ولكن ينبغي ان يحتمل التحلى على الانكشاف التام الذي لا يشمل الظن لان العلم عندهم مقابل للظن"۔ (شرح العقائد ص: ۱۰) کون کہہ سکتا ہے کہ لیبارٹری رپورٹ میں نقیض کا احتمال نہیں ہے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التعليق

"عن عيسى وهو ابن عبد الرحمن بن ابي ليلى قال دخلت على عبد الله بن عكيم ابى معبد السخفني اعوده وبه حُمرة فقلتُ اَلَا تُعَلِّقُ شَيْئاً؟ قَالَ: الموت اقرب من ذلك فقال النبي صلى الله عليه وسلم: من تعلق شيئاً وُكِّلَ اليه"۔^۱

حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے صاحب زادے عیسیٰ سے روایت ہے کہ میں عبد اللہ بن عکیم کے پاس گیا تاکہ ان کی عیادت کروں جبکہ ان کے جسم پر سرخ دانے (یا درم کے اثرات) ظاہر ہو گئے تھے تو میں نے ان سے عرض کیا، آپ کوئی چیز (تعویذ) آویزاں نہیں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا موت اس سے قریب تر ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی تعویذ (وغیرہ) کو لٹکائے تو وہ اسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔

لغات: فقولہ "اعوده" عیادت، بیمار پر کسی کو کہتے ہیں۔ فقولہ "حُمرة" ایک قسم کے سرخ دانے ہیں جو چہرے اور بدن پر نکلتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ طاعون کی طرح جلد میں پھوڑے کی مانند درم ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی کراہیۃ التعليق

۱۔ رواه أيضاً النسائي ص: ۱۷۱ ج: ۲ کتاب المحاربة، أيضاً مستد احمد ص: ۳۰۳ ج: ۵ حدیث: ۱۸۳۰۳، جمع القوائد ص: ۲۵۳ ج: ۲۔

قولہ ”الاتعلق شیئاً“ تعلق کے معنی لٹکانے کے ہیں یعنی آپ گلے میں تعویذ وغیرہ نہیں باندھتے ہیں؟۔
 قولہ ”وکل الیہ“ بھینچہ مجہول، بضم الواو تخفیف الکاف المکسورۃ یعنی وہ اپنے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اللہ کی غیبی مدد اس سے اٹھ جاتی ہے یا مطلب یہ ہے کہ اس سے اعلیٰ توکل کی نعمت مرتفع ہو جاتی ہے۔

تشریح:- یہ روایت محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اپنے بھائی عیسیٰ سے نقل کرتے ہیں، عبد اللہ بن عکیم (بالصغیر) قنبر میں سے ہیں یعنی انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے مگر ملاقات نہیں ہوئی ہے،^۱ عارضۃ الاحوذی اور تحفۃ الاحوذی دونوں کے متن پر یہاں یہ اضافہ موجود ہے:

”وعبد اللہ بن عکیم لم یسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکان فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول کتب النبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔“
 ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس موجود ترمذی کے نسخ سے یہ عبارت ساقط ہوئی ہو۔

اس روایت کے مطابق تعویذ باندھنا ناپسندیدہ عمل ہے اور یہی بعض صحابہ کرام و علماء کا مذہب ہے جیسے ابن مسعود، ابن عباس، حذیفہ، اور عبد اللہ بن عکیم رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ، ان حضرات کا استدلال حدیث الباب کے علاوہ ابوداؤد وغیرہ کی حدیث سے بھی ہے جو عبد اللہ بن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے: ”ان الرق فی والتماکم والتولة شرک“۔ (ابوداؤد باب فی تعلق التماکم من کتاب الطب، ص: ۵۴۳، میر محمد کتب خانہ^۲)

اس کے برعکس صحابہ کرام کی ایک جماعت اور دیگر بعض اہل علم اس کے جواز کے قائل ہیں بشرطیکہ وہ تعویذ آیات قرآنیہ یا اسماء الحسنی وغیرہ پاکیزہ کلمات پر مشتمل ہو، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عائشہ کا مذہب اسی کے مطابق ہے، ان حضرات کے نزدیک جیسا حکم گویا پڑھنے کا ہے اسی طرح تعویذ کا ہے، جھاڑ پھونک کا مسئلہ پہلے گزرا ہے، تاہم تعویذ نہ باندھنا افضل ہے۔

ان کا استدلال ابوداؤد باب کیف الرقی من کتاب الطب میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت

سے ہے:

”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کان یعلمہم من الفرع کلمات ”احوذ

۱۔ وقال السخاوی فی تقریب التہذیب، عبد اللہ بن عکیم: بالصغیر الجہنی، ابو عبد الکولی مخضرم من الناہی، وقد سمع کتاب النبی ﷺ مات فی امرۃ الحجاج ص: ۵۱۵ ج: ۲، للہمی کتب خانہ کراچی

۲۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۵۲ ”باب تعلق التماکم“ ابواب الطب، مستدرک احمد ص: ۶۲۹ ج: ۱، حدیث: ۳۶۰۳۔

بکلمات اللہ الثامۃ من غضبه ومن شرعباده ومن همزات الشیطنین وان
یحضرون“ وکان عبداللہ بن عمرو یعلمہن من یعقل من بنیہ ومن لم یعقل کتبہ
فاعلقہ علیہ۔“

اس پر صاحب بذل الحجو دیکھتے ہیں: ”فیہ دلیل علی جواز کتابۃ التعاویذ والرقیٰ
وتعالیقہا۔“ (بذل ص: ۱۰ ج: ۶، کتاب الطب)

جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ عرف میں اسی باب کے تحت فرماتے ہیں: ”یحوز التعلیق باعوذہ کلمات
اللہ الثامۃ الخ۔۔۔ ولعل تعلیق ماہو محرب بالطب جائز۔“

عمر بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند پر بحث پہلے تفصیلاً گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۲
ص: ۱۵۰، باب ما جاء فی کراہیۃ البیوع والشراء وانشاد الضلۃ فی المسجد) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند درجہ حسن تک
کا پہنچتی ہے، لہذا یہ قائل حجت ہے، دوسری بات یہ ہے کہ تعویذ ڈالنے سے ایک گونہ تسلی ہو جاتی ہے، جو علاج
کا ایک مستقل مفید طریقہ ہے، کیونکہ بہت ساری بیماریوں کا زور نفسیاتی طور سے بھی ٹوٹ جاتا ہے، چنانچہ ابن قیم
زاد العاد کے حصہ طب میں لکھتے ہیں: ”کہ مستلمات میں سے ہے کہ جب روح میں قوت آ جاتی ہے تو نفس
اور طبیعت دونوں قوی ہو جاتے ہیں اور بیماری دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ (دیکھئے طب نبوی فصل: ۳ طریقہ
علاج ص: ۲۹)

جواب:۔ جن حضرات نے تعویذ کو ناجائز کہا ہے ان کی مستدل روایات کا جواب یہ ہے کہ ان میں
شربکۃ القاطا یا مشتبہ کلمات والے تعویذات کی نفی مراد ہے، یا یہ کہ اگر ان کے مؤثر حقیقی ہونے کا عقیدہ ہو تو یہ
عمل شرک ہے یا شرک کی طرف لے جاتے ہیں، چنانچہ صاحب بذل الحجو دیکھتے ہیں: ”قولہ: شرک ای من
أفعال المشرکین اولانہ یفرضی الی الشرک اذا اعتقد ان له تأثیراً حقیقۃ۔“ (بذل ص: ۷ ج: ۶)۔

ترمذی کی حدیث کا جواب حضرت گنگوہیؒ نے الکذکب میں یہ دیا ہے کہ یہ عمل توکل کے اعلیٰ درجات
یا توکل مطلق کے منافی ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس میں گناہ ہے۔

المستر شدرض کرتا ہے کہ ابوداؤد کی مندرجہ بالا روایت سے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ پڑھنے
پر قادر ہوں وہ بجائے تعویذ کے ان کلمات کو حفظ کر کے پڑھ لیا کریں جبکہ چھوٹے بچوں کے لئے اس کے
باندھنے میں کوئی حرج نہیں، نیز بچوں کا ذہن تعویذ کی تاثیر کی طرف نہیں جاتا ہے جبکہ بڑوں کے ذہن کا جلدی

گھڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے، نیز اس عمل کو فروغ دینا اور پیشہ بنانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ آدمی اس عمل سے پردے میں رہنے کی کوشش کرے، اگر کوئی زیادہ اصرار کرے تو اسے یہ کہہ کر دیا جائے کہ درحقیقت شفاء دینے والا صرف اللہ ہے، اللہ نے اپنے کلام پاک کو شفاء کا ذریعہ بنایا ہے لہذا اسباب کے درجے میں اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں تو جیسے اس درجہ میں دوا جائز ہے تو تعویذ بھی جائز ہے۔

تنبیہ:۔ آج کل کے غیر مقلدین اور عربوں میں سے حنا بلہ حضرات اس کو شرک کہتے ہیں حالانکہ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت تعویذ کے جواز کی ہے۔ دیکھئے تحفۃ الاحوذی:

اختلف العلماء... فی جواز تعلیق التمام التي من القرآن واسماء الله تعالى

وصفاته فقالت طائفة يجوز ذلك وهو قول ابن عمرو بن العاص وهو ظاهر

ماروی عن عائشة وبه قال ابو جعفر الباقر واحمد بن حنبل في رواية الخ-

غیر مقلدین کی مستدل حدیث کا جواب اوپر گزر چکا ہے۔ فلیجز کر

باب ماجاء فی تبرید الحمی بالماء

”عن عبادة بن رفاعه عن جده رافع بن خديج عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الحمى

فور من النار فابردوها بالماء“۔^۱

”وعن عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان الحمى من فيح جهنم فابردوها

بالماء“۔ (و كلا الحديثين صحيح)

عبادہ بن رفاعہ اپنے دادا حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بخار (جہنم کی) آگ کا (اثر) جوش ہے، پس اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔ اور حضرت عائشہ

رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ بخار دوزخ کی توش ہے پس اسے

پانی سے ٹھنڈا کرو۔

باب ماجاء فی تبرید الحمی بالماء

۱۔ روی بمعناه بخاری ص: ۴۶۴ ج: ۱ کتاب بدء الخلق، رواه مسلم فی کتاب السلام، سنن ابن ماجه فی ابواب الطب

باب: ۱۸، دارمی فی الرقاق باب: ۵۵، مؤطا مالک عن باب: ۱۶، ۱۵، مستند احمد ص: ۳۸۰ ج: ۱، حدیث: ۴۶۳۳۔

ج۔ المحدث اعرجه ايضاً ابن ماجه ص: ۲۵۱ ابواب الطب۔

لغات: بقولہ "الخُمس" بضم الخاء وتشدید الحیم والفاء المقصورہ، حاء اور میم کے مادہ میں حرارت کا معنی پایا جاتا ہے، یہاں مراد بخار ہے کیونکہ اس سے بھی درجہ حرارت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بقولہ "فور و فیح" دونوں میں فائین مفتوح اور عین کلیمتین ساکن ہیں، اور دونوں کے معنی ایک ہیں یعنی حرارت کی شدت اور جوش۔
تشریح:۔ بخار کو آگ یا دوزخ کی آگ کا اثر اور بھڑاس قرار دینے کا مطلب اس کی شدت حرارت بیان کرنا ہے جو تشبیہ کی ایک قسم ہے جیسے محاورہ میں کسی تنگ جگہ کو قبر اور محبوس جگہ کو ذیل کہا جاتا ہے۔

اس موقع پر زمانہ قدیم کے اطباء نے حدیث شریف پر اعتراض کیا تھا کہ غسل کرنے سے اور بخار والے مریض پر پانی ڈالنے سے تو بخار اور بھی بڑھ جاتا ہے پھر یہ کیسی صحیح ہو سکتی ہے؟؟؟ اس کے جواب میں علماء کرام اور شارحین عقلام نے مختلف اور متعدد توجیہات کی ہیں مثلاً یہ زم زم کے پانی کے بارے میں ہے، یا حجاز کے بخار کے متعلق ہے جیسے "شرق و اغربوا" الحدیث سب کے لئے نہیں یا گرمی سے لگنے والے بخار کے بارے میں ہے وغیرہ وغیرہ جن کا نقل کرنا تطویل بلا طائل ہے۔

بخار کے لئے غسل، جدید تحقیق کی روشنی میں:۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آج کل سائنسی دور ہے اور نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، ان تحقیقات سے ایک طرف قدیم نام نہاد حکماء کے بہت سارے نظریات غلط ثابت ہوئے تو دوسری جانب پیغمبر اسلام کے ارشادات کی تائید و تائید ہوئی، اگر ایسے مسائل کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد بن جائے گی۔ راقم کا اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ ہے اللہ قبول فرما کر اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

من جملہ ان امور میں سے موضوع بحث مسئلہ ہے، اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک سائنسی ضابطے کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ حرارت سے شئی پھیل جاتی ہے اور شہندک سے سکڑ جاتی ہے، اس کی بے شمار فرعیات ہیں مثلاً اگر سائیکل کی ٹائر میں ہوا بالکل پوری ہو مگر جب وہ گرم مرکز پر چلتی ہے تو وہ ہوا پھیل جانے سے ٹائر پھٹ جانے کا سبب بنتی ہے جبکہ گرم پانی برف خانہ میں منجمد ہو کر برف بن جاتا ہے، پس جب کسی چیز کے اندر حرارت جمع ہو جائے اور اس کے مسامات کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ حرارت باہر نکل جاتی ہے اس کے برعکس جب مسامات بند رہیں تو وہ حرارت باہر نہیں نکل سکتی پھر وہ اپنا رد عمل کسی نہ کسی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔

اگر تھوڑا اندر برکیا جائے اور غور سے کام لیا جائے تو انسانی معلوم ہوگا کہ سردیوں میں نظام ہضم تیز ہوتا ہے، پرانے مٹکے کا پانی گرم ہوتا ہے اور سردیوں میں زلزلوں کی شرح زیادہ ہوتی ہے، اس کے برعکس گرمیوں میں

ہاضمہ کمزور رہتا ہے، نئے منکے کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمیوں میں زلزلے کم ہوتے ہیں، کیونکہ پہلی صورتوں میں مسامات بند ہوتے ہیں اس لئے حرارت اندر رہتی ہے باہر نہیں نکلتی سکتی ہے کیونکہ سردیوں میں جسم کے مسامات بند ہوتے ہیں تو معدے کی حرارت تیز ہوتی ہے پرانے منکے کے مسامات بند ہوتے ہیں تو پانی، اندرونی گرمی کی وجہ سے ٹھنڈا نہیں رہ سکتا، یہی سردیوں کے چشموں کا راز ہے کہ اندر زہین گرم ہوتی ہے اس لئے پانی گرم نکلتا ہے اور گیس محبوس ہونے کی وجہ سے زلزلے کا سبب بنتی ہے، جبکہ گرمی میں مسامات کھل جاتے ہیں تو زمین کا پیٹ ٹھنڈا رہتا ہے اس لئے پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے، ہاضمہ کمزور ہو جاتا ہے اور زلزلے کم ہو جاتے ہیں، تازہ منکے میں بھی مسامات کھلے رہنے کی وجہ سے پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔

آج سے چند سال قبل تک ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ جب بخار تیز ہو جائے تو مریض کے جسم پر برف کے ٹکڑے رکھے جائیں یا ٹھنڈے پانی کی پٹی کی جائے مگر اب حال ہی میں انہوں نے مندرجہ بالا ضابطہ کی طرف لوٹ کر تسلیم کیا ہے کہ برف کا تجربہ غلط تھا، ہونا یہ چاہئے کہ ٹارل پانی سے تیز بخار کا ازالہ کیا جائے یعنی اگر موسم گرم ہو تو غل کا پانی تیز بخار والے مریض پر ڈالا جائے اس سے جسم کے مسامات کھل جائیں گے تو اندر کی حرارت مسامات کے ذریعے نکل کر بھاپ اور بخارات بن جائیں گی، اس طرح اندرون درجہ حرارت کم ہو جانے سے جو عبارت ہے بخار سے خود بخود مریض کو افادہ نصیب ہو گا اور یہ طریقہ کار ہر بخار اور ہر مریض کے لئے مفید ہے بشرطیکہ بخار تیز ہو جس کی طرف حدیث الباب میں اشارہ واضح موجود ہے، لہذا نہ تو یہاں کسی مکان کی قید کی ضرورت ہے اور نہ زمان کی، اور نہ ہی بخار کی تقسیم کی ضرورت ہے، اس بارے میں غلط فہمی کی بنیاد کم بخار یا ٹھنڈے پانی کے استعمال پر تھی۔ فہذا لک فلیفروا

اس کی مزید وضاحت ”باب اللہ اوی بالرماد“ سے پہلے والے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ زلزلوں کے اور بھی اسباب ہیں یہ بھی یاد رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک ضابطے کے مطابق ارشاد فرماتے ان میں بہت سے ضابطے عرفی ہوتے ہیں جو صحابہ کرامؓ کو معلوم ہوتے اس لئے وہ سمجھ پاتے مثلاً کوئی شخص غمی کے سامنے یہ کہے کہ ”زید قائم“ میں دونوں مرفوع ہیں تو اسے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں جو ضابطے طبی اور سائنسی ہوتے تو صحابہ کرامؓ اپنے بے مثال یقین کی بناء پر اس پر عمل کرتے اور ان کو فائدہ بھی ہوتا اور کوئی شک و اشکال بھی پیش نہیں آتا۔ مگر آج کل ہر آدمی اور خصوصاً پڑھے لکھے جاہل دعوے بہت کرتے ہیں مگر سمجھنے کی کوشش کم کرتے ہیں کہ سمجھنے کے لئے وسیع علم کی ضرورت ہے جو آج کل عقائد سے کم نہیں۔

حدیث آخر:- ”عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم : کان یعلّمُہم من الحمی ومن الاوجاع کلہا ان یقول: بسم اللہ الکبیر اعوذ باللہ العظیم من شر کل عرقٍ نَعَارٍ ومن شر حَرِّ النار“۔^۱ (حدیث غریب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بخار اور ہر دکھ درد سے شفاء کے لئے یہ دعاء پڑھنا سکھاتے تھے ”بسم اللہ الکبیر اعوذ باللہ العظیم“ ارجحاً یعنی میں پناہ مانگتا ہوں اللہ عظیم کی ہر بھڑکنی رگ کے شر سے اور آگ (بخار) کی حرارت (وشدت) کے شر سے۔

لغات:- قولہ ”الاجاع“ تفتح ثقیین کی جمع ہے ہر قسم کی تکلیف اور دکھ درد کو کہتے ہیں۔ قولہ ”عرق“ بکسر العین و سکون الراء، ہر شے کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں، رگ کو بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اصل ہے اور یہاں یہی رگ والا معنی مراد ہے۔ قولہ ”نعار“ بفتح النون وتشدید العین، یہ لفظ ”یاء“ کے ساتھ بھی منقول ہے، وہ رگ جس میں خون جوش مارنے لگے جیسے ہائی بلڈ پریشر میں ہوتا ہے۔ بعض نے اضطراب اور بے چینی کا ترجمہ بھی کیا ہے، یہ بھی بلڈ پریشر کے لوازمات میں سے ہے، گویا عرق، نعار بمعنی ہائی بلڈ پریشر کی بے چینی اور شر کے ہنے جس سے کبھی کبھار دماغ کی رگ پھٹ بھی جاتی ہے، تاہم اصل لغت میں ”نعار“ بکری کی آواز کو کہتے ہیں، پس مراد فقرہ لگانے اور آواز دینے والی رگ بھی ہو سکتی ہے۔

تشریح اور جدید تحقیق:- آج کل یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جو رگیں دل سے تمام بدن کو خون سپلائی کرتی ہیں جن کو شریان کہتے ہیں، وہ ہائی بلڈ پریشر اور سخت بخار میں آواز نکالتی ہیں جو آلات سے بہر کیف اور خالی کان سے بھی سنی جاسکتی ہے۔ (شمسان اللہ)

باب ماجاء فی الغيلة

”عن عائشة عن بنت وہب وہی بخدمة قالت سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: اردت ان انہی عن الغیال فاذا فارس والروم یفعلون ولا یقتلون اولادہم“۔^۱ (حدیث صحیح)

باب ماجاء فی الغيلة

۱۔ الحدیث اخرجہ ابنا ابن ماجہ عن: ۱۳۵ ”باب الغیل“ ابواب النکاح۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت جدامہ بنت وہب سے روایت کرتی ہیں فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سنا ہے کہ، میں دودھ پلانے والی کے ساتھ مجامعت سے روکنا چاہ رہا تھا مگر جب دیکھا کہ فارسی اور رومی لوگ ایسا کرتے ہیں اور (اس سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کرتے۔ (اس لئے میں نے منع نہیں کیا)

لغات: - قولہ ”غیلۃ بکسر الغین اس کی تفسیر امام ترمذی نے اسی باب میں امام مالکؒ سے نقل کی ہے: ”والغیلان، والغلیۃ ان یطأ الرجل امرأته وہی ترضع“، یعنی جب عورت بچے کو دودھ پلاتی ہو تو ان دونوں میں اس سے ہم بستری کرنا غیلا اور غیال ہے۔ علیٰ ہذا غیال بھی بکسر الغین ہے۔

تشریح: - عربوں میں یہ بات مشہور تھی کہ جب عورت کے ساتھ دوران رضاعت مجامعت کی جائے تو چونکہ اس سے حمل ٹہرنے کا امکان رہتا ہے پھر دودھ خراب یعنی نرم اور فاسد ہو جاتا ہے جس سے دودھ پیتے بچے کو صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے نقصان اور ضعف لاحق ہو جاتا ہے، پھر کل وہ گھوڑے پر شہواری میں کمزور ہوتا ہے اور یہ بات فی الجملہ کسی حد تک صحیح تھی کہ جن لوگوں کے بچے جلدی جلدی پیدا ہوتے ہیں وہ ماں کا دودھ پوری مدت تک نہیں پی سکتے ہیں، اگر پیتے بھی ہیں تو دونوں صورتوں میں ان کی ہڈیاں اور پٹھے مضبوط و طاقتور نہیں ہوتے ہیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا جیسا کہ نسائی و ابوداؤدؒ میں ہے: ”لا تسقنوا اولادکم مسراً فان الذنبل یدرک الفارس فیدعثرہ عن فرسہ“۔ (لفظ لابی داؤد، باب فی الغیل، کتاب الطب) یعنی اپنی اولاد کو خفیہ لہتے سے قتل مت کرو کہ زمانہ رضاعت میں جماع کا اثر گھڑسوار پر ظاہر ہو کر اسے گھوڑے سے بچھاڑتا ہے، تاہم ضروری نہیں ہے کہ زمانہ رضاعت میں جماع سے حمل ٹھہر جائے کیونکہ دودھ پلانے کی مدت میں عموماً ہوا ری نہیں آتی ہے، دوسرے حمل ٹھہرنے کا امکان ویسے بھی ان دنوں میں کم ہوتا ہے اور اسی نکتے کو آج کل خاندانی منصوبہ بندی والے ملحوظ رکھے ہوئے ہیں، پہلے وہ کہتے تھے کہ بچے کو بوتل کا دودھ پلاؤ مگر جب شرح پیداوار بڑھ گئی تو پریشان ہو کر اب کہتے ہیں کہ بچے کی صحت کے لئے سب سے اچھی غذا ماں کا دودھ ہے، نمبر تین حمل کی ابتدائی دنوں میں دودھ ٹھیک ہی رہتا ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل فارس اور رومیوں پر قیاس کرتے ہوئے اس نئی کو جزوی طور پر منسوخ فرمایا کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے ورنہ

توروی اور فارسی لوگ گھوڑے پر تھمنے سے قاصر ہوتے، نیز ان لوگوں کی طب پر نظر ہے اور آبادی بھی بڑی تعداد میں ہے جس سے معلوم ہوا کہ نقصان کا اندیشہ بہت کم ہے اس لئے اجازت عنایت فرمائی، ہاں عربوں کے مقابلے میں وہ کمزور تھے اس لئے پہلے منع فرمایا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیاس اور اجتہاد فرماتے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ (کذا فی البذل) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اللہ البائتہ میں لکھتے ہیں کہ کبھی نبی کی حکمت دفع مفسدہ ہوتا: ”وہیں فی مواضع ان الحکمة فیہا دفع مفسدۃ کالنبی عن الغیلة انما هو مخافة ضرر الولد“۔ (قاری فی مقدمۃ کتابہ)

باب ماجاء فی دواء ذات الجنب

”عن زید بن ارقم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کان ینعت الزیت والزمن من ذات الجنب قال قتادة وبلد من الجنب الذي يشنكه“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذات الجنب سے شفاء کے لئے زیتون کے تیل اور دروس کی تعریف فرماتے، قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ دو اس جانب سے منہ میں ڈال جائے جس جانب تکلیف ہو۔

لغات مع تشریح:۔ قولہ ”الزیت“ روغن زیتون۔ قولہ ”الزمن“ بر وزن شمس ایک قسم کا پودا جو رنگائی کے کام میں لایا جاتا ہے، ہندوستان، عرب اور ملک حبشہ (ایتھوپیا) میں پیدا ہوتا ہے، خصوصاً یمن میں۔ قولہ ”ذات الجنب“ یہ تسمیۃ الحال باسْم الحکل ہے، وودرد جو پسلیوں کے نیچے محسوس ہوتا ہے، اس کو ذات الرقۃ بھی کہتے ہیں یعنی پچھڑوں کی سوزش، بعض حضرات نمونیا پر بھی اس کا اطلاق کرتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں: ایک حقیقی جو درم اور سوزش کی وجہ سے ہو، دوسری جو رخ کی بناء پر ہو، حاشیہ پر حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہاں بھی عرفی یعنی وجع رخ مراد ہے، جبکہ حقیقی درد سینے کی جھلی میں سوزش، یا پچھڑوں کے متاثر ہونے یا دل کی دائیں جانب کے بڑا ہونے سے ہوتا ہے، اس کے ساتھ اکثر بخار بھی ہوتا ہے اور سانس لینے میں

دشواری بھی ہوتی ہے۔

امام ترمذیؒ نے باب کے آخر میں یہی معنی مراد لیا ہے، ”وَذَاتُ الْحَنْتَبِ يَعْنِي الْيَسِيلَ“ سئل پچھڑوں کی بیماری کو کہتے ہیں۔ جس میں یہ بیماری دُخم کی وجہ سے ہوتی ہے گویا نمونیا طرز کی بیماری ہوتی ہے لیکن حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مطلب زیادہ قرین قیاس ہے ہاں البتہ کھانسی (ٹی بی) کے لئے قسط بحرّی مفید ہے کہ گرم بھی ہے اور خشک بھی۔

باب کی اگلی حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم ذات الحجب کا علاج ٹٹ اور زیتون سے کریں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قسط بحرّی سے مراد ٹٹ ہے اس کو ”کوٹ“ اور ”کوٹھ“ بھی لکھتے ہیں، اسے بحرّی اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ہندوستان سے براستہ سمندر لائی جاتی تھی، مسلمؒ کی روایت میں عود ہندی کا لفظ آیا ہے اسے ٹٹ بھی کہتے ہیں، یہ ایک جڑی ہے جو کشمیر کے اونچے پہاڑوں میں پائی جاتی ہے عموماً چرواہے اس کو لاکر بازار میں بیچتے ہیں۔ راقم کو بچپن میں طاقت کی غرض سے اور سایہ سے شفاء کے لئے دی گئی تھی جس کا بڑا اثبت نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ عود ہندی کی دو قسمیں اور بھی ہیں مگر وہ خوشبو میں استعمال ہوتی ہیں، یہاں وہ دونوں مراد نہیں، ایک عود ہندی عطری کہلاتی ہے جسے ”اگر“ کہا جاتا ہے اور جس سے اگر بتیاں بھی بنائی جاتی ہیں، اور دوسری ”قسط اظفار“ اس کو ٹٹ بھی کہتے ہیں اور اظفار الطیب بھی، یہ بھی ایک قسم کی خوشبو ہے، یہ آخری دونوں قسمیں یہاں مراد نہیں۔

تکلمۃ فتح الہلم میں ہے کہ اظفار الطیب کو اردو میں ”نخ“ کہتے ہیں۔ (تکلمۃ فتح الہلم ص: ۳۳۹)

(ج: ۳)

بعض اطباء نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ ذات الحجب گرمی سے پیدا ہوتا ہے لہذا اس کا علاج کسی سرد دوا سے ہونا چاہئے کیونکہ علاج بالعد ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں کیونکہ علاج بالثل بھی ہوتا ہے اور علاج بالعد کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، علاوہ ازیں حاشیہ میں امام نوویؒ نے بحوالہ طبّی نقل کیا ہے کہ حکیم جالینوس وغیرہ نے بھی قسط بحرّی کو ذات الحجب کے لئے مفید قرار دیا ہے۔

باب

”عن عثمان بن ابی العاص انه قال اتانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی وجع قد کادیہ لکئی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: امسح بيمينک سبع مرات وقل اعوذ بعزة اللہ وقدرته وسلطانه من شر ما جدد قال ففعلت فاذهب اللہ ما کان بی فلم ازل آمره به اهلی وغیرهم۔“
(حسن صحیح) ۱

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے جبکہ مجھے درد کا ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جو قریب تھا کہ مجھے مار دیتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا داہنا ہاتھ درد والی جگہ پر سات مرتبہ پھیر دو اور یہ دعا پڑھو: اعوذ بعزة اللہ الخ حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ نے وہ درد دور فرما دیا پس میں تو ہمیشہ اپنے گھر والوں اور دوسروں کو اس کی تجویز دیتا ہوں۔

تشریح:- یہ ایک روحانی علاج ہے جس کے متعلق... ابن قیم زوال المعاد ”طب نبوی“ میں لکھتے ہیں کہ یہ مسلمات میں سے ہے کہ جب روح میں قوت آتی ہے تو نفس اور طبیعت دونوں قوی ہو جاتے ہیں اور بیماری کے دور کرنے میں اسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے میں پوری مدد دیتی ہے، اس سے چند سطور پہلے لکھتے ہیں: ادویہ قلبیہ ادویہ روحانی قوت قلب، اعتماد علی اللہ، اسی سے سب کچھ مانگنا، اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اقرار، اپنی بے کسی کا اظہار، بے چارگی کا بیان، صدقہ، دعا، توبہ، استغفار، مخلوق کے ساتھ بھلائی، درد مندوں کی فریادری، مصیبت زدگان کی یادری، یہ سارے طریقے علاج کے جو خود مذہب اسلام نے اور دینا کے دوسرے مذاہب کے متبعین نے بار بار آزمائے ہیں، ان میں شفا کا وہ انداز، تاثیر کی وہ تیزی انہیں نظر آئی کہ دنیا کے بڑے سے بڑے تجربہ کار اور حاذق طبیب بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔ (طب نبوی ص: ۳۱، فصل: ۳)

راقم نے خود اس کا تجربہ کچھ یوں کیا ہے کہ کلفتن اور نفیس کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے جو امریکہ سے پڑھ کر آیا تھا اس نے سو فیصد یقین سے میرے گلے میں کینسر کی تشخیص کی تھی اور آپریشن کرنے میں اتنی جلدی کر رہا تھا کہ عید کے دن سے بھی تاخیر کو جان لیوا قرار دیتا تھا اور کہتا کہ اگر کچھ ہوا تو ذمہ داری آپ کی اپنی

ہوگی، اللہ کے فضل سے میں آج اس کے بعد سات سال تک زندہ ہوں گو کہ میں نے پھر آغا خان ہسپتال سے آپریشن کروایا مگر وہ دانہ ختم نہیں ہوا، پھر میں نے سورۃ مجادلہ چالیس روز تک پڑھنے کا التزام کیا اور بفضلہ تعالیٰ 2003 سے 2010 تک زندہ ہوں۔ والحمد للہ علی ذالک

حال ہی میں جاپان کے ایک سائنس دان پروفیسر مسارو ایہوتو کی تحقیق آئی ہے کہ جب پانی پر بسم اللہ یا قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں تو خوردبین میں وہ پانی پھولوں کی طرح دکھائی دیتا ہے جبکہ شیطانی الفاظ پڑھ کر دم کرنے سے پانی کے قطرے ذراؤنی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

باب ماجاء فی السنۃ

”عن اسماء بنت عمیس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: سألہا بما تَسْتَمْشِین؟ قالت بالشُّبْرَمِ اقال: حارٌّ قالت: ثم استمشیتُ بالسناء فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: بلوان شیعاً کان فیہ شفاء من الموت لکان فی السنۃ“۔ (حدیث غریب)^۱

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم کوئی مسہل (جلاب) استعمال کرتی ہو؟ کہنے لگیں ”شبرم“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو بہت گرم کھینچنے والی چیز ہے فرماتی ہیں کہ پھر میں سنا سے اسہال لینے لگی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اگر کسی چیز میں موت سے شفاء ہوتی تو سنا میں ہوتی۔

لغات مع التشریح:۔ قولہ ”تَسْتَمْشِین“ واحد مؤنث مخاطبہ کا صیغہ ہے اس میں سین طلب کے لئے ہے اور مشی کے بارے میں پہلے گزرا ہے کہ دست آور دوا کو کہتے ہیں یعنی مسہل اور جلاب۔ قولہ ”الشبرم“ بضم الشین وسکون الباء وضم الراء یہ چنے کے دانوں کے برابر بچ ہوتے ہیں جن کو ابال کر پانی پیاجاتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ کسی درخت کی جڑ کا پھلکا ہوتا ہے۔ قولہ ”حار حار“ پہلا لفظ حار بغیر نقطے کے ساتھ ہے جس کے معنی گرم کے ہے مگر دوسرے لفظ میں متعدد روایات ہیں، بعض نے اس کو حاء کے ساتھ پڑھا ہے، علی ہذا یہ اول کی تاکید ہے۔ بعض نے اس کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، پھر یہ نکیہ کلام ہے۔ تیسرا قول وہی ہے جو ہمارے

نفسوں کے مطابق یعنی جیم کے ساتھ ہے، اس کو بھی اکثر شار جین نے تاکید اور تکیہ کلام پر محمول کیا ہے مگر حضرت گنگوہیؒ الکو کتب میں فرماتے ہیں کہ اس کو اول کا تابع یعنی تاکید بنانا صحیح نہیں بلکہ یہ تاہیں کے لئے ہے اور جر سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کہ ضرورت سے زیادہ دست آور ہے اور معدے کے تقریباً تمام مواد کو کھینچ کر ضرر اور ضعف کا موجب بنتا ہے۔ اوپر ترجمہ میں اسی کو لیا ہے۔ فقولہ ”بالسنہ“ ایک پودا ہے جس کی پتیاں دست آور اور مسہل ہیں۔ راقم اس کو کافی عرصہ سے استعمال کر رہا ہے، بہت مفید ہے قبض کشا بھی ہے، اور دیگر امراض کے ازالہ میں بھی معاون ہے خصوصاً سنائے مکی گو کہ اس کا نام پنساریوں نے سنائے مکی ہی مشہور کیا ہے، اس کے فوائد کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی چیز موت سے شفاء بخش ہوتی تو وہ سنا ہوتی، آخر یہ تعبیر ترغیب ہی کے لئے تو ہے کہ اسے استعمال میں رکھا جائے، اس لئے بعض اطباء تو اسے ہر نسخہ میں یا اکثر ادویات میں شامل کرتے ہیں البتہ اس کا استعمال اپنے طور پر نہیں بلکہ ماہر نباتات یا ماہر طبیب کے مشورے سے ہونا چاہئے۔

باب ماجاء في العسل

”عن ابى سعيد قال جاء رجل الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: اِنْ اَخِي اسْتَطْلَقَ بَطْنَهُ فَقَالَ: اِسْقِهِ عَسْلًا فَسَقَاهُ، ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! اِنِّي قَدْ سَقَيْتُهُ فَلَمْ يَزِدْهُ اِلَّا اسْتَطْلَاقًا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: صدق اللّٰہ وکذب بطنُ اَخِيكَ اِسْقِهِ عَسْلًا فَسَقَاهُ فَبَرًّا“۔ (حدیث حسن صحیح) ۱

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ چالو ہو گیا ہے (یعنی کثرت سے دست آرہے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُسے شہد پلاؤ چنانچہ اس نے پلا دیا، وہ شخص پھر آیا اور کہا اے اللہ کے رسول! میں نے اس کو پلا ہی دیا مگر اس نے تو پیٹ کی روانی میں اور اضافہ کر دیا، ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

باب ما جاء في الهسل

١. الحديث أخرجه البخاري من: ٨٣٨ ج: ٢ "باب الدواء بالعمل" كتاب الطب، أيضاً من: ٨٥١ ج: ٢ كتاب الطب، صحيح مسلم من: ٢٢٤ ج: ٢ كتاب السلام، مسند أحمد من: ٣٩٤ ج: ٣ حديث: ١٠٤٢٢، ١٠٤٢٣، ١١٣٦١ جميع الفوائد من: ٢٣٩ ج: ٢، الحنفى عفى عنه

وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے (کہ ”فیہ شفاء للناس“) مگر تیرے بھائی کا پیٹ غلط کرتا ہے، اس کو (پھر) شہد پلاؤ تو اس نے پھر پلایا چنانچہ وہ ٹھیک ہو گیا۔

لغات: ”بقولہ“ ”استطلق“ اس کو مجہول و معروف دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے یعنی پے درپے دست آرہے ہیں، بخاری کی روایت (ص: ۸۵۱ ج: ۲) میں اسی طرح ہے جبکہ دوسری (۸۳۸ ج: ۲) میں ”بمشتکی بطنہ“ ہے۔ بقولہ ”و کذب طبن امیك“ یہاں کذب کی نسبت بطن کی طرف مجازاً ہے کیونکہ صدق و کذب اقوال کے اوصاف ہیں مگر عرب خطا اور غلطی پر بھی کذب کا اطلاق کر کے قائل کے بجائے فاعل و عامل کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں یعنی تیرے بھائی کے پیٹ نے شفاء والی چیز کو قبول نہیں کیا۔

تشریح: بخاری نے کی روایت میں ہے کہ وہ شخص تین مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست روکنے کے لئے اسے شہد پلانے کا مشورہ دیا، اس پر بظاہر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ شہد تو گرم اور مسہل یعنی دست آور ہے پھر اس حکم کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ طریقہ کار کوئی قاعدہ کلیہ کے طور پر نہیں بتایا کہ گویا ہر اسہال کے مریض کو شہد پلایا جائے حتیٰ کی مذکورہ اعتراض وارد ہو جائے (گوکہ بعض صحابہ کرام نے اس سے حکم کلی سمجھا تھا اور وہ ہر بیماری میں شہد پیتے تھے) بلکہ کچھ مواد فاسد ہو کر پیٹ سے نکلنے والے تھے جس کے اخراج کے لئے شہد مفید و معاون ثابت ہوا، یہ نکتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ جب پیٹ فاسد مواد سے فارغ ہوگا تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا، وہ آدمی اس حکمت کو نہیں جانتا تھا، یہ طریقہ علاج بالمثل کہلاتا ہے جو بعض مواقع میں مفید ثابت ہوتا ہے لہذا یہ اس شخص کے لئے خصوصی طریقہ علاج تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یا طبی اصول سے معلوم ہوا تھا، یا پھر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار معجزہ کے لئے تھا جو فرق عادت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ (کذا فی العارضۃ)

پس نہ تو اس حدیث کو ضابطہ سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس آیت ”فیہ شفاء للناس“ کے کو عام لینا چاہئے کیونکہ بعض امراض شہد کے استعمال سے مزید بگڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں:

”ولم يذكره على العموم... وقد كان جماعة من الصحابة يتناولونه على ظاهره ويشربون في أدوائهم الغسل ممزوجاً بالماء والزيت... ولا يخفى ان من

الامراض ما اذا شرب صاحبه العسل خلق الله الالم بعده وان قوله (تعالى) في
العسل "فيه شفاء للناس" انما هو في الاغلب۔ الى آخر ما حررناه

باب

”عن ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال: ما من عبد مسلم يعو دمر يضالماً
يحضر اجله فيقول سبع مرات: يا سأل الله العظيم بالعرش العظيم ان يشفيك إلا عوفي“۔ (حسن
غريب)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جو شخص
کسی ایسے مریض کی عیادت کرے جس کی اجل پوری نہ ہوئی ہو اور وہ یہ دعا ”استل اللہ العظیم“ اٹھ سات
مرتبہ پڑھے تو اس کو ضرور شفاء ہوگی۔

باب

”ثوبان عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اذا اصاب احدكم الحمى فان الحمى قطعة
من النار فليطفها عنه بالماء فليستقع في نهر جار فليستقبل جرته، فيقول: بسم الله اللهم اشفي
عبدك وصدق رسولك، بعد صلوة الصبح وقبل طلوع الشمس وليغمس فيه ثلاث غمسات، ثلاثة
ايام فان لم يبرأ في ثلاث فغمس فان لم يبرأ في خمس فسمع فان لم يبرأ في سبع فسمع فانها
لا تكاد تتجاوز سمعاً باذن الله“۔ (هذا حديث غريب)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم میں سے
کسی کو بخار ہو جائے تو چونکہ بخار آگ کا ایک ٹکڑا ہے اس لئے اس کو پانی سے بچھا کر دور کرے یعنی جاری نہر میں
داخل ہو جائے اور اس کی بہاؤ کی جانب منہ کر کے یہ دعا پڑھے: ”بسم الله اللهم اشفي“، پھر یہ کام صبح کی نماز
کے بعد اور سورج نکلنے سے پہلے کرے اور چاہئے کہ (نہاتے وقت) تین غوطے لگائے، تین دن تک ایسا کرے،
پس اگر تین میں ٹھیک نہ ہو تو پانچ دنوں تک کرے، اگر پانچ میں اچھا نہ ہو جائے تو سات دن تک ایسا کرے،
اور اگر سات میں بھی ٹھیک نہ ہو جائے تو نو دن تک یہ عمل کرے کیونکہ اللہ کے حکم سے وہ نو دنوں سے زیادہ نہیں

بڑھ سکے گا۔

لغات :- ”فلیطنفھا“ اطفاء سے ہے بمعنی بجھانے، روایت اگرچہ بغیر ہمزہ کے ہے مگر قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ فاء کے بعد ہمزہ ہو ”فلیطنفھا“۔

قولہ ”فلیطنفع“ استفاع کے معنی پانی کے ٹالاب وغیرہ میں غسل کے لئے اترنے کے ہیں، یہ فلیطنفھا کا بیان ہے اور خود مبین ہے، اس کا بیان ”فلیطنقل“ نے کیا ہے۔ قولہ ”جریفہ یکسر الجیم پانی کی زرد اور بہاؤ کو کہتے ہیں۔

تشریح :- بخار کا علاج پانی کے ذریعہ کرنے کی بحث اور جدید تحقیق کی روشنی میں تفصیل ”باب ما جاء فی تبرید الحمی بالماء“ میں گذری ہے وہیں دیکھ لی جائے، مزید یہ ہے کہ جو ضابطہ وہاں بتلایا گیا تھا اس کے مطابق اصل بات جسم کی اندرونی گرمی کو خارج کرنا اور درجہ حرارت کو کسی نہ کسی طرح کم کرنا ہے۔

اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کے جسم میں ایک خود کار لیول ودیعت فرمایا ہے، اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جسم کے اندر ۹۸.۶ فارن ہیٹ درجہ حرارت کو محفوظ رکھتا ہے خواہ باہر کا موسم کیسا ہی ہو یعنی شدید گرمی ہو یا سخت سردی ہو مگر اندر کا درجہ حرارت اسی طرح ۳۶ سینٹی گریڈ رہتا ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جسم کے اندر اس قسم کے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں جو اس لیول کو متاثر کرتے ہیں نتیجہ جسم کی اندرونی گرمی کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور کھال کی سطح پر ٹھنڈی وجہ سے مساوات بند ہو جاتے ہیں اس طرح گرمی کے اخراج کا عمل لیل ہو جاتا ہے، چونکہ قوت حارہ کھال میں ہے اس لئے بخار میں مریض کو سردی لگتی ہے اگرچہ اندر شدید گرمی ہوتی ہے، بخار کے اتارنے کے لئے جو ادویات دی جاتی ہیں ان میں دو طرح کے اثرات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے (۱) جو ان جراثیم کو ختم کر دیں۔ (۲) جو اس لیول کے عمل کو بحال کر کے گرمی کا بیرون جسم منتقل کرنے کا عمل بحال کر کے گرمی کا اخراج کریں۔

صاف پانی میں اللہ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ ان جراثیم کو بچن و بچن کر ہلاک کر دیتا ہے، دوسرے اس سے مساوات کھل جانے سے اندر کی گرمی بھاپ بن کر خارج ہو جاتی ہے، لہذا حدیث باب میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ کئی فوائد پر مشتمل ہے مثلاً صبح کے وقت پانی صاف سہرا بھی ہوتا ہے اور صبح کے وقت غسل سے آدمی ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہو جاتا ہے جس کا اپنا اثر بھی ہے، اور نفسیاتی اعتبار سے بھی مفید ہے، نیز دعاء اور سنت کے مطابق روحانی علاج کے ثمرات بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

باب التداوی بالرماد

”عن ابی حازم قال سئل سهل بن سعد وانا سمعُ یأیی شیءٌ ذووی جرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ فقال: ما بقی احد اعلم به منی کان علی یأیی بالماء فی ثرسہ و فاطمة تغسل عنه الدم وأحرق له حصیر فحشیٰ به جرحہ“۔ (حدیث حسن صحیح) ۱

حضرت ابو حازم فرماتے ہیں کہ سهل بن سعدؓ سے دریافت کیا گیا جبکہ میں (یہ گفتگو) سن رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کا علاج کس چیز سے کیا گیا تھا؟ تو حضرت سهلؓ نے فرمایا کہ اس بارے میں مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں بچا ہے، علیؓ اپنی ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے اور فاطمہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون دھوتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک چٹائی (بوریا) جلادی گئی اور اسی (راکھ) سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم کو بھر دیا گیا۔

لغات: فقوله ”الرماد“ بالکسر راکھ کو کہتے ہیں۔ فقوله ”ذووی“ مجہول کا صیغہ ہے جیسے ذووی۔ فقوله ”جرح“ ضم النجم، چوٹ اور زخم کو کہتے ہیں، جمع جروح آتی ہے۔ فقوله ”ترسہ“ ضم التاء ترس، سپر اور ڈھال کو کہتے ہیں۔ فقوله ”حصیر“ بکجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی اور بوریا، ٹاٹ۔ فقوله ”فحشیٰ“ بصیغہ مجہول، جھو بھرتی کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جس سے کسی چیز کو بھرا جائے جیسے تکیہ میں روٹی وغیرہ۔

تشریح:- یہ روایت بخاری کی کتاب المغازی (ص: ۵۸۳ ج: ۲) پر بھی آئی ہے، اس میں یہ اضافہ ہے کہ جب اس زخم پر راکھ لگادی گئی تو ”فاستمسک الدم و کسرت رباعيته يومئذ و جرح وجهه و کسرت البیضة علی راسه“ مگر واضح رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ربا می دانت پورا شہید نہیں ہوا تھا بلکہ صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا الگ ہو گیا تھا اور ساتھ ٹچلا ہونٹ مبارک بھی زخمی ہوا تھا، یہ عتبہ بن ابی وقاص کے تیر لگنے کی وجہ سے ہوا تھا، اس خون دھونے کی وجہ بخاری کی روایت کے مطابق اسے روکنا تھا جبکہ ابن العریفی عارضہ میں لکھتے ہیں: ”أما غسل الدم فلازالة النجاسة إن قلنا إن دمه نجس، وإلا إزالة التلویث إن قلنا إن دمه

باب التداوی بالرماد

۱۔ التحلیث رواہ البخاری ص: ۵۸۳ ج: ۲ کتاب المغازی، ایضاً بخاری ص: ۸۵۲ ج: ۲ ”باب حرق الحصیر لسببہ الدم“ کتاب الطب، ایضاً رواہ مسلم کذا فی جمع الفوائد ص: ۲۳ ج: ۲۔

طاہر۔“

جہاں تک حصیر یعنی چٹائی یا بوریا اور ٹاٹ جلا کر اس کی راکھ زخم پر ڈالنے کا تعلق ہے تو یہ بھی بخاری کی روایت کے مطابق خون روکنے کے لئے تھا ”فلحسارات فاطمة ان الماء لا یزید الدم الا کثرة اخذت قطعة من حصیر فاحرقتها فألصقتها فاستمسک الدم“۔^۱

جدید تحقیق:- انسانی جسم میں کسی عضو کے زخمی ہونے کی صورت میں اور بالخصوص زنگ آلود لوہے یا آلودہ چیز سے چوٹ آنے سے زخم میں ایسے جراثیم داخل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جن سے تشنج (ٹینٹس) کا خطرہ ہوتا ہے جس کے لئے آج کل ٹیکے لگائے جاتے ہیں مگر آگ میں اللہ عزوجل نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ اگر کوئی جگہ یا چیز آگ سے جلادی جائے تو وہ جراثیم مکمل طور سے ختم ہو جاتے ہیں گویا پھر ٹیکہ لگوانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے کوئی سوتی کپڑے کو جلا کر گرم راکھ اگر زخم پر رکھ دی جائے یا گرم پانی سے دھویا جائے تو وہ جگہ جراثیم سے صاف ہو جاتی ہے۔

غرض یہ ایک روایتی علاج تھا اور ہمارے یہاں آج بھی مروج ہے اس کا مقصد صرف خون بند کرنا ہوتا تھا مگر آج ثابت ہوا کہ یہ جراثیم کش بھی ہے۔

اس حدیث میں حضرت ہبل بن سعدؓ کا یہ فرمانا کہ ”ما بقی احد اعلم به منی“ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی نیک غرض مثلاً ترغیب کے لئے یا مسئلہ کو موثر بنانے کے لئے ایسا دعویٰ داخل کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے عجب وغیرہ خرابی کا اندیشہ اپنے حق میں یا دوسرے کے حق میں پیدا نہ ہو اور اسی طرح دعویٰ بھی حقیقت پر مبنی ہو۔

حاشیہ بخاری پر بحوالہ کرمانی اس حدیث سے کچھ اور مسائل بھی مستنبط کئے گئے ہیں: (۱) اس نے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام پر آزمائشیں اور بیماریاں آتی تھیں تاکہ وہ اس کا اجر بھی حاصل کریں۔ (۲) اور تاکہ امت کو اس پر چلنا یعنی صبر کرنا آسان ہو۔ (۳) اور یہ کہ معلوم ہو کہ انبیاء بھی بشر ہیں ان کو وہ تمام عوارض لاحق ہو سکتے ہیں جو عام انسانی جسموں کو لاحق ہوتے ہیں۔ (۴) اور یہ کہ یقین ہو جائے کہ انبیاء علیہم السلام مخلوق ہیں اس طرح وہ معجزات دیکھنے سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ (جیسا کہ بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بعض نے نبی علیہ السلام کی بشریت سے انکار کر دیا ہے) (۵) اس میں خود وغیرہ ہتھیار پہننے کا استنباب معلوم

ہوا اور یہ کہ یہ تو کل کے منافی نہیں۔ (بخاری ص: ۵۸۴ ج: ۲، حاشیہ نمبر: ۲)

باب

”عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا دخلتم علی المريض فَنَفْسُوْاْهُ فِیْ اَجَلِهٖ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَا يَزِدُّ شَيْئًا وَّيُطَيِّبُ نَفْسَهٗ“۔ (هذا حديث غريب) ^۱

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو اس کے لئے دراز کی عمر کی بات (دعا) کرو کیونکہ تمہاری بات کوئی چیز (موت) دور تو کر نہیں سکتی مگر اس کے دل کو خوش کر لے گی۔

لغات: نفسوٰلہ ”نفیس سے ہے، اس کے صلہ میں ”عن“ بھی آتا ہے، اس کے معنی خوش کرنے، تسلی دینے اور سکون بخشنے کے ہیں۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی کی عیادت کرو تو اس مریض کے سامنے ہمت بڑھانے اور صحت و شفاء کی امید بیدار کرنے کی باتیں کرو مثلاً یہ تو معمولی بیماری ہے، آج کل تو اس سے زیادہ سخت بیمار یوں کا علاج ایسا آسان ہے جیسے چیونٹی کا دم وغیرہ، کیونکہ ان باتوں سے اگرچہ اسے تسلی تو نہیں ہوگی اور نہ ہی تقدیر و قضاء میں رد و بدل ممکن ہے مگر اس بیمارے کا دل تو خوش ہوگا اس کو تسلی تو ضرور ہوگی۔

اس سے ایک طرف یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اور خصوصاً پریشان حال کا دل خوش کرنا چاہئے۔ دوسری طرف عیادت کا طریقہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے سامنے خوش افزا باتیں کی جائیں، اس کے لئے دراز کی عمر اور شفاء کی دعا کی جائے اور اس کو مرض کے فضائل یعنی اس کا رفع درجات کا ذریعہ ہونا اور گناہ کا کفارہ ہونا بیان کرے، اور یہ کہ موقع کی مناسبت سے بیٹھنے میں یہ خیال رکھے کہ کہیں مریض کو یا گھروالوں کو زیادہ بیٹھنے سے تکلیف تو نہ ہوگی، اس لئے عام آدمی کو چاہئے کہ مقدار فوقیہ بقاۃ سے زیادہ نہ بیٹھے الا یہ کہ زیادہ بیٹھنے میں کوئی فائدہ پہنچے ملحوظ ہو۔

آخر ابواب الطب واول ”ابواب الفرائض“

باب

۱۔ الحديث أخرجه أيضاً ابن ماجه ص: ۱۰۴ ”باب ما جاء في عيادة المريض“ ابواب الجنائز. حفيظ الرحمن المحمدي

ابواب الفرائض

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء فی من ترک مالا فلورثتہ

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من ترک مالا فلأقرباہلہ ومن ترک ضیاعاً فالی“۔ (حدیث حسن صحیح) ۱

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے (موت کے بعد) مال چھوڑا تو وہ اس کے گھر والوں (ورثہ) کا ہے، اور جو شخص محتاج اولاد چھوڑے تو وہ میرے ذمہ ہے۔

لغات: فقولہ ”الفرائض“ فریضہ کی جمع ہے جیسے شرائط جمع ہے شرط کی، فرض لغت میں کانٹے کو کہتے ہیں خصوصاً جب اس کا مفعول بہ قابل قطع چیز ہو جیسے فرض العود والشوب وغیرہا، فرض بواسطہ حرف جر کے بھی متعدی ہوتا ہے جیسے فرض علیہ اس کے معنی لازم کر دینے کے ہیں اور جب صلہ میں ”ل“ آجائے تو بمعنی عطیہ یا حصہ مقرر کرنے کے آتا ہے جیسے ”ماکان علی النبی من حرج فیما فرض اللہ لہ“۔ (آیہ ۶) جبکہ اصطلاح میں فریضہ بندوں پر شارع کی طرف سے فرض و لازم کیا ہوا حق، عمل اور قانون کہلاتا ہے اور میراث کی تقسیم کو بھی کہتے ہیں کیونکہ احکام کی بھی حد بندی ہوتی ہے اور میراث کی بھی۔ اس لئے لغوی معنی قطع ان دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ علم میراث کے ماہر کو فاضل اور فرضی کہتے ہیں۔ قولہ ”ضیاعاً“ اس میں ضاد کا فتح و کسرہ دونوں جائز ہیں، یہ دراصل مصدر ہے مگر اس کا اطلاق میت کے ان ورثہ اور اولاد پر کیا گیا ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں، چونکہ ان کے ضائع ہونے کا خطرہ رہتا ہے اس لئے ان کو ضیاع سے تعبیر کیا، پس مطلب یہ ہوا ”من ترک اولاداً کو عیالاً فوی ضیاع“۔ عارضہ میں ہے: ”امال الضیاع فہو کل من لامال لہ ولا قوۃ“۔

ابواب الفرائض عن رسول اللہ ﷺ

باب ماجاء من ترک مالا الخ

تشریح:- یہاں فرائض سے مراد علم میراث اور اس کے مطابق عمل درآمد کرنا ہے، اس علم کی اہمیت اگلے باب میں بیان کی گئی ہے، یہ مستقل فن کے طور پر مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس کے اصول متعلقہ کتب سراجی وغیرہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہاں نہایت اختصار کے پیش نظر اتنی ہی بات کرنا مناسب ہے کہ میت کے ترکہ کے ساتھ چار قسم کے حقوق متعلق ہوتے ہیں، وہ حقوق بالترتیب یہ ہیں: (۱) سب سے پہلے عقیقین و تجنیز اور تدفین کے اخراجات ہیں جو میانہ روی سے ادا کئے جائیں گے گو ان سے ساری میراث ختم ہو جائے۔ (۲) پھر جتنا مال بچا ہے اس سے سارے دیون اور قرضے وغیرہ حقوق ادا کئے جائیں۔ (۳) ماہی کے ٹلٹ میں سے وصیت کے مطابق خرچ کیا جائے اگر وصیت کی ہو اور جائز مصرف میں خرچ کرنے کے لئے کی ہو۔ (۴) چوتھے نمبر پر جو کچھ بچ جائے وہ قرآن و سنت اور اجماع امت کی ہدایات کے مطابق مستحق وارثوں میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ (کذا فی السراجی)

ان تقسیمات کا ایک بڑا حصہ یہاں ترمذی کے ابواب الفرائض میں بیان ہوگا۔

حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے کوئی مال چھوڑا تو وہ مال اس کے ورثہ کا ہے یعنی ترتیب بالا کے مطابق مگر جو شخص اپنے پیچھے ایسے بچے وغیرہ چھوڑے جو غریب ہوں اور ان کا کوئی مالی یا جانی سہارا نہ ہو تو ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری میری ہے، امام ترمذی نے ”فالی“ کا مطلب یہی بیان کیا ہے ”و معنی قوله: من ترك ضیاعاً معنی ضیاعاً لیس له شیء فالی بقول انا عولہ وانفق علیہ“۔

اس ذمہ داری میں دیون کی ادائیگی بھی شامل ہے مگر امام نووی فرماتے ہیں جیسا کہ حاشیہ پر ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے، آج کسی حکومت کی ذمہ داری نہیں کہ وہ (بغیر کفالت کے) لوگوں کے دیون ادا کرتی رہے۔

شروع میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنازہ لایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے کہ اس پر دین ہے؟ اگر اثبات میں جواب ملتا اور اس کی ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام سے فرماتے ”صلوا علی صاحبکم فان علیہ دینا“۔^۱ یعنی تم نماز جنازہ پڑھو میں نہیں پڑھتا کہ اس پر دین

۱۔ رواہ ابو داؤد ص: ۱۱۹ ج: ۲ ”باب فی التشہید فی الدین“ کتاب البیوع، ایضاً سنن نسائی کتاب الجنائز باب: ۶۷، سنن دارمی کتاب البیوع باب: ۵۳۔

ہے، مگر جب اللہ نے مسلمانوں کو فتوحات سے نوازا اور بیت المال قائم ہوا تو غریب مدیون میت کے دیون اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھالی، عارضۃ الاحوذی میں ہے:

”قال ابن شہاب: فلما فتح الله عليه الفتح قال: من توفي من المؤمنين فعليّ

قضاءه ومن ترك ما لأفلورثته“ وانفرد ابن شہاب بلفظ القضاء... وفيها... قال

ابن شہاب هذا نسخ لتركه الصلوة عليه“ (على الميت)

گو کہ ابن العربی اس کو مرسل ہونے کی بناء پر سند کے لئے مانع کو تیار نہیں، مدیون میت کی طرف سے کفالت کی صحت اور عدم صحت کے حوالے سے اختلاف و دلائل اور قدرے تفصیل ”باب ما جاء في المدیون“ میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۳۹۵ ج: ۴، من ابواب البجائز)

باب ما جاء في تعليم الفرائض

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ

وَعَلَّمُوا النَّاسَ فَنَانِي مَقْبُوضٌ“۔ (هذا حديث فيه اضطراب النسخ) ۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فرائض اور قرآن سیکھئے اور لوگوں کو سکھائیے کیونکہ میں لیا جانے والا ہوں۔ (یعنی وفات پانے والا ہوں)

لغات و تشریح: فقوله ”الفرائض مغنیہ کی جمع ہے، کما مر۔ اس سے مراد یا تو علم میراث ہے جیسا کہ امام ترمذی کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کی تخریج میراث کے باب میں کی ہے، اور ابواب الفرائض کے عنوان میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہ علماء کی ایک جماعت کی بھی تفسیر ہے۔ اور یا مراد ہر وہ حکم ہے جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے، بخشی نے اسی احتمال کو ظاہر کیا ہے۔ اور لفظ قرآن بھی اس معنی کی تفسیر کا قرینہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمام طریقے و سنن مراد ہوں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (بحیثیت تشریع) صادر ہیں، علیٰ هذا مطلب یہ ہوا کہ قرآن و سنت سیکھو کیونکہ میں دنیا سے چلا جاؤں گا

ج: کذا فی حاشیۃ صحیح البخاری ص: ۳۲۳ ج: ۱

باب ما جاء في تعليم الفرائض

۱۔ الحديث روى بمسند ابن ماجه ص: ۱۹۳ ابواب الفرائض، سنن دارمی مقدمہ باب: ۲۴، مستدرک حاکم

ص: ۲۵۱ ج: ۵، حديث: ۸۱۱۶، ۸۱۱۷

پھر ان دونوں پر اطلاع کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ (کذا فی الحاشیۃ بحوالہ مجمع البحار) بقولہ "وَعَلِمُوا النَّاسَ" اس کا مفعول بہ مقدر ہے اسی الذکور۔ بقولہ "فَانِي مَقْبُوضٌ" ای سَيَقْبِضُنِي اللّٰهُ تَعَالٰی یعنی اللہ عنقریب مجھ پر موت کا پردہ ڈالنے والے ہیں، پھر یہ علم منقطع ہو جائے گا۔

اگر قرآن سے مراد میراث ہو تو اس علم کی اہمیت یہاں سے معلوم ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کے سیکھنے کی تاکید فرمائی بلکہ اس کے سکھانے پر بھی زور دیا ہے اور جلد حصول کی ترغیب دی۔ امام ترمذی نے اس حدیث میں اضطراب بیان کیا ہے، وجہ اضطراب یہ ہے کہ خوف سے یہ روایت مسند ابی ہریرۃ میں بھی مروی ہے جیسا کہ یہاں ہے اور مسند ابی مسعود میں بھی ہے، علاوہ ازیں محمد بن قاسم اور شہر بن حوشب کزور بھی ہیں، البتہ اس مضمون کی حدیث مسند احمد، نسائی اور مستدرک حاکم میں قابل اعتبار سند سے آئی ہے۔

باب ماجاء فی میراث البنات

"عن جابر بن عبد اللہ قال جاءت امرأة سعد بن الربیع بائنتیہا من سعد الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: یا رسول اللہ! انا انابتا سعد بن الربیع فقتل ابوہما معک یوم احد شهیداً وان عمہما اخذنما لہما فلم یدع لہما مالاً ولا تنکحان الا ولہما مال قال بقضی اللہ فی ذلک فنزلت اية الميراث فبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی عمہما فقال: أعطی ابنتی سعد الثلثین وأعطی امہما الثمن وما بقی فهو لک"۔ (ہذا حدیث حسن صحیح)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سعد بن الربیع کی بیوی سعد سے اپنی دونوں بیٹیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! یہ دونوں سعد کی بیٹیاں ہیں ان کا باپ آپ کے ساتھ معرکہ احد کے دن شرکت کی بناء پر قتل کر کے شہید کیا گیا ہے اور ان کے چچا نے ان کا (سارا) مال لے لیا ہے اور ان کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے، حالانکہ ان کی شادی بغیر مال کے نہیں ہو سکے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بارے میں اللہ فیصلہ فرمادیں گے چنانچہ میراث کی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چچا کے پاس حکم بھیجا اور فرمایا کہ سعد کی بیٹیوں کو دو تہائی حصے دے دو اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دو اور باقی (پانچ پانچویں، ۵/۲۴) آپ کا ہے۔

ترکیب:- بقولہ "قتل ابوہما معک الخ" اس میں معک ظرف مستقر ہے یعنی کا نام مقدر کے ساتھ

متعلق ہے ظرف لغوی یعنی قتل کے ساتھ متعلق کرنا مفسد معنی ہے کیونکہ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ شہید ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احد میں شہید نہیں ہوئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کے ساتھ احد کے میدان میں شریک تھے اور اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ تدبر

تشریح :- ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جس روایت میں ہے کہ ”ہاتان ابنتان ثابت بن قیس بن شماس“ تو وہ غلطی اور سو پر محمول ہے کیونکہ ثابت جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ عورتوں کو میراث میں سے حصہ نہیں دیا جاتا بلکہ مردوں اور عصبہ میں سے بھی عموماً اسی کو ملتا جو طاقت ور ہوتا، گویا زیادہ تر دار و مدار بازو کی طاقت پر تھی، ذوی الفروض اور عصبہ کی تقسیم اور تیز اس وقت نہیں تھی۔

جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانوں کے لئے زین اصول اور ضابطوں کے مطابق عادلانہ نظام بنام اسلام نازل فرمایا تو اس میں باقی مظلوم جماعات، انواع اور افراد کی طرح عورتوں کو بھی میراث میں متعین حق دینے کا حکم فرمایا۔

باب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا ہے ”یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساءً فوق الانثیین فلھن ثلثا مائرک ما کان کانت واحداً فلھا النصف“۔ (نساء آیت نمبر ۱۱، ۱۲)

اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ پہلے ذوی الفروض کے حصے دیئے جائیں، ذوی الفروض سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے قرآن میں حصے مقرر کئے گئے ایسے لوگ کل ملا کر بارہ ہیں، چار مرد اور آٹھ عورتیں، مرد یہ ہیں: (۱) باپ۔ (۲) جدہ صحیح یعنی دادا۔ (۳) ماں شریک بھائی اور (۴) شوہر۔ عورتیں یہ ہیں: (۱) بیوی۔ (۲) بیٹی۔ (۳) پوتی اگر چہ دور والی ہو۔ (۴) سگی بہن۔ (۵) سوتیلی بہن۔ (۶) ماں شریک بہن۔ (۷) ماں۔ (۸) جدہ صحیحہ (دادی اور نانی)۔ اگر ان سے مال بچ جائے یا ذوالفروض نہ ہوں تو پھر ماقبیلی صورت میں اور سارا ترکہ دوسری صورت میں عصبہ کو ملتا ہے، عصبہ کی متعدد صورتیں ہیں مگر اولین ترجیح عصبہ نسبیہ کو حاصل ہے ان میں الاقرب فاقرب کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ (راجع للفصل باب معرفۃ الفروض الخ و باب العصبات، من سرانی)

چونکہ دو بیٹیوں کو ثلثان ملے ہیں اور اولاد کی صورت میں بیوی کو ثلث ملتا ہے اس لئے حدیث الباب میں

مسئلہ ۲۳ (چوبیس) سے بنا، سولہ حصے بیٹیوں کو، تین بیوی کو، باقی پانچ رہ گئے، وہ عصوبت کی بناء پر چچا کو دے دیئے۔ یہاں یہ ضابطہ قابل لحاظ ہے کہ میراث میں تمام نسبتیں میت کی طرف ہوتی ہیں اور یہ کہ دو بیات اور دو سے زیادہ کا حکم ایک ہوتا ہے یعنی ایک کو نصف اور زیادہ کو ثلثان یہ اس وقت ہے کہ ان کے ساتھ مرد نہ ہو یعنی بلا تعصیب ورنہ تو پھر عورت کا حصہ مرد کے آدھے کے برابر ہوگا سوائے ماں شریک بہن کے کہ جب آدمی نکلا ہو یعنی اس کے اصول و فردغ نہ ہوں، اور ایک بہن اور بھائی ماں شریک ہوں تو ہر ایک کا حصہ سندس ہوگا اور اگر زیادہ ہوں تو سب ثلث مال میں برابر کے شریک ہوں گے جیسا کہ نساء آیت نمبر ۱۲ میں ہے۔

باب ماجاء فی میراث بنت الابن مع بنت الصلب

”عن هُزَيْلِ بْنِ شُرَجِيلٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى ابْنِ مُوسَى وَ سُلَيْمَانَ بْنِ رَبِيعَةَ فَسَأَلَهُمَا عَنْ ابْنَةِ ابْنَةِ ابْنِ بَوَاحِبٍ لَابٍ وَامٍ فَقَالَا لِلْإِبْنَةِ النِّصْفُ وَلِلْأَخِثِ مِنَ الْآبِ وَالْأُمِّ مَا بَقِيَ وَقَالَا لَمْ أَنْطَلِقْ إِلَى عَبْدِ اللَّهِ فَاسْأَلْهُ فَإِنَّهُ سَيُتَابِعُنَا فَأَتَى عَبْدُ اللَّهِ فَذَكَرَ لَهُ ذَلِكَ وَآخِرُهُ بِمَا قَالَا فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ: تَقْضِي لَهَا إِذَا وَمَا نَأْمَنُ الْمُتَهْتَمِينَ وَلَكِنِّي أَقْضِي فِيهَا كَمَا فَضَى رَسُولُ اللَّهِ لِلْإِبْنَةِ النِّصْفَ وَلِابْنَةِ الْإِبْنِ السُّلُسَ تَكْمَلَةُ الثَّلَاثِينَ وَلِلْأَخِثِ مَا بَقِيَ“۔ (هذا حديث حسن صحيح) ۱

ہزیل بن شرجیل سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص ابو موسیٰ (اشعری) اور سلیمان بن ربیعہ کے پاس آیا اور ان سے ایک بیٹی، ایک پوتی اور شگی بہن کی (میراث کی) بابت پوچھا، تو ان دونوں نے کہا کہ آدھا ترکہ بیٹی کا ہے اور باقی (آدھا) بہن کو ملے گا (یعنی پوتی کو نظر انداز کر دیا) پھر دونوں نے اس شخص سے کہا جاؤ عبداللہ (ابن مسعود) کے پاس اور ان سے پوچھو وہ بھی ہماری پیروی کریں گے (یعنی ایسا ہی جواب دیں گے) چنانچہ وہ آدمی عبداللہ بن مسعود کے پاس گیا اور ان سے اس فیصلے کا تذکرہ کیا اور ان دونوں کی بات سے بھی آگاہ کیا، تو عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اگر میں ایسا فیصلہ کروں تو غلطی کروں گا اور صحیح جواب دینے والوں میں سے نہ ہوں گا لیکن میں تو (ان کے مطابق نہیں بلکہ) اس بارے میں وہی فیصلہ کروں گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے بیٹی کے لئے آدھا ہے اور پوتی کو چھٹا ملے گا تا کہ ثلثین کو پورا کیا جائے اور باقی

باب ماجاء فی میراث بنت الابن مع بنت الصلب

۱۔ التحلیث الخرجہ البخاری و ابو داؤد و الترمذی و احمد و البیہقی بحوالہ متن دارمی ص: ۴۴ ج: ۲ حلیث: ۲۸۹۰، فیضاً سنن ابن ماجہ ص: ۱۹۵ ابواب الفرائض.

(دوسرے ۲/۶) بہن کے ہیں۔

تشریح: قولہ ”شرحییل“ بضم الشین وفتح الراء و سکون الحاء و کسر الباء۔ یہ واقعہ کوفہ میں اس وقت پیش آیا تھا جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بعد از ابن مسعودؓ گورنر بنایا گیا تھا، سلیمان بن ربیعہ کوفہ کے قاضی تھے۔ (قالہ الحافظ کذا فی التلخیص)

ان دونوں حضرات کا فیصلہ سورہ نساء کی دو آیتوں سے ماخوذ ہے چنانچہ انہوں نے بیٹی کو آدھا دینے کو کہا کیونکہ اس آیت میں ہے: ”وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ“ (نساء آیت ۱۱) اور بہن کو آدھا دینے کا حکم اس آیت سے لیا: ”إِنْ يَمُوتْ أَهْلُكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ اِثْنَانِ فَلَهَا النِّصْفُ مِمَّا تَرَكَ“۔ (نساء آیت نمبر: ۱۷۷)

پہلی آیت میں ہے کہ اگر بیٹی ایک ہے تو اس کو آدھا ملے گا، اور دوسری میں ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کی سگی بہن کو تمام ترکہ کا آدھا دیا جائے گا، اب جب دونوں کو آدھا آدھا مل گیا تو پوتی کے لئے کچھ بھی نہ بچا، یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے دوسری آیت سے مسئلہ اخذ کیا ہو اور غلط فہمی ”ولد“ کے لفظ سے ہوئی کہ انہوں نے اس سے مراد بیٹا یعنی نرینہ اولاد لے لی جبکہ علم میراث میں ولد بمعنی مولود یا بمعنی مطلق اولاد ہوتا ہے پھر ولد، پوتے اور پوتی کو بھی شامل ہے جبکہ ان حضرات نے صرف صلیبی اولاد تک محدود سمجھا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ پوتی کا حصہ قرآن میں نہیں ہے، جبکہ ابن مسعودؓ سمجھ رہے تھے کہ ولد بمعنی اولاد ہے اور پوتے، پوتیاں بھی اولاد ہوتی ہیں، اس لئے انہوں نے سابقہ فیصلہ کی موافقت سے انکار فرمایا، پھر دارقطنی کی روایت میں ہے کہ: ”وَقُلْتُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ الْخ“ چونکہ بیٹی بمقابلہ پوتی کے اقرب ہے لہذا قوت قرابت کی وجہ سے اس کو نصف ملا، چونکہ بنات کا حصہ عثمان سے زیادہ نہیں ہو سکتا، اس لئے پوتی کو سب سے دیا تاکہ عثمان کو پورا کیا جائے، باقی دوسرے بچے گئے وہ حقیقی بہن کے ہوئے، پس مسئلہ کی صحیح چھ (۶) سے ہوئی۔

مسئلہ نمبر ۲۰

بنت بنت الابن اُخت

۲ ۱ ۲ ۶=

باب ماجاء فی میراث الاخوة من الاب والام

”عن علی انه قال انکم تقرؤون هذه الآية ”من بعد وصية توصون بها ودين“ وان رسول الله صلى الله عليه وسلم قضی بالدين قبل الوصية وان اعيان بنی الأم یرثون دون بنی العلات الرجل یرث اخاه لایبه وامه دون اخیه لایبه“۔ (وکنز ارواه احمد والحمد لله وابن ماجه) ۱

حضرت علیؑ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو ”من بعد وصية توصون بها ودين“ (یعنی اس میں بظاہر وصیت مقدم ہے دین پر) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت سے پہلے دین کی ادائیگی کا حکم کیا ہے اور یہ کہ حقیقی (سگے) بہن بھائی وارث ہوں گے نہ کہ علاقائی (یعنی سوتیلے) آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے علاقائی (سوتیلے) کا نہیں۔

لغات: فقولہ ”اعیان بنی الام“ عین کی طرف منسوب ہے جو بمعنی نفس اور ذات کے آتا ہے، مراد حقیقی بھائی ہے کہ وہ گویا اس کی جڑ کی دوسری شاخ ہے۔ فقولہ ”دون بنی العلات“ علۃ سوکن کو کہتے ہیں تو بنو العلات سے مراد باپ شریک یعنی سوتیلے بھائی ہیں، ”عل“ لغت میں دوسری بار پینے کو کہتے ہیں، وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

تشریح:۔ علم بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کبھی کسی چیز کو اہمیت اور مقصدناہی حال کی بناء پر مقدم کیا جاتا ہے چونکہ انسان طبعاً بخیل ہوتا ہے اور وصیت میں مطالبہ کرنے والے لوگ بھی عموماً نہیں ہوتے ہیں بخلاف دین کے کہ دین میں خود اس کو وصول کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں، اور ورثہ کے لئے روکنا ممکن یا آسان نہیں ہوتا، اس لئے وصیت کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لئے اور تاکید کرنے کے لئے آیت میں اس کا ذکر دین پر مقدم کیا، غرض تقدیم ذکر کی سے یہ نہ سمجھا جائے، کہ یہ حکماً بھی مقدم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قاعدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صریح منقول پیش کر رہے ہیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

پھر اس آیت میں ”من بعد وصية توصون بها ودين“ لفظ ”او“ بمعنی واو کے ہے، کیونکہ کبھی دونوں بھی ہوتے ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ ”او“ مانع الجمع کے لئے نہیں ہے۔

باب ماجاء فی میراث الاخوة من الاب والام

۱۔ مسنن ابن ماجه ص: ۱۹۷ ”باب ميراث العقبه“ ابواب القرآن، مسند احمد ص: ۱۲۸ ج: ۱ حدیث: ۱۲۲۹، ایضاً ص: ۱۳۲ و ۱۳۱ ج: ۲ سورة النساء آیت: ۱۲۔

”الرجل يرث اخواه لایبه وامه دون اخیه لایبه“ یہ جملہ ماقبل کی تفسیر ہے یعنی اگر کسی کے ماں باپ شریک بھائی موجود ہوں تو وہ صرف باپ شریک بھائی پر مقدم ہوں گے، یعنی یعنی وحقیقی بھائی علاقائی و سوتیلے پر مقدم ہے حق میراث میں، چونکہ عربوں میں قرابت کا اصل دار و مدار باپ کے رشتے پر ہوتا تھا، عورت کی رشتہ داری کی نسب و حسب میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی، دوسری طرف قرآن میں لفظ ”انوة“ مطلق آیا تھا جس سے یہ توہم ہو سکتا تھا کہ گئے بھائی اور سوتیلے میراث کے استحقاق میں برابر و مساوی ہوں گے تو اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا: ”وان اعیان بنی الام یرثون دون بنی العلات“ اس میں ”ام“ کا ذکر بطور خاص کر کے واضح کر دیا کہ میراث میں کوئی بھی قرابت خواہ باپ کی وجہ سے ہو یا ماں کی طرف سے سرحدات میں سے ہے تو چونکہ اعیانی بھائیوں کے ساتھ دو قرابتیں ہوئیں اور سوتیلے کے ساتھ فقط ایک، اس لئے قوت قرابت کی وجہ سے اعیانی مقدم ہوں گے، سراجی میں ہے:

”ثم یرجحون بقوة القرابة اعنی ذاللقربانین اولی من ذی قرابة واحدة ذکر امان

اوانتی لقول علیه السلام ان اعیان بنی الام ینوارثون دون بنی العلات“۔

(سراجی ص: ۱۴، باب المعصات)

پس مطلب یہ نکلا کہ گئے بھائی نہ ہونے کی صورت میں سوتیلے مستحق ہوں گے، اس روایت میں اگرچہ حارث شکم فیہ ہے مگر پھر بھی روایت پر عمل متفقہ ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ روایت کی قوت اور ضعف کا دار و مدار صرف راویوں کی حالت پر نہیں ہے بلکہ امت اور مجتہدین کا تعامل بھی قابل لحاظ ہے:

”قال السخاوی فی فتح المغنی بشرح الفیہ الحدیث ہو کذا اذا تلقت الامه

الضعیف بالقبول یمعمل به علی الصحیح حتی انه ینزل منزلة المتواتر فی انه

ینسخ المقطوع به ولهذا قال الشافعی رحمہ اللہ فی حدیث: لا وصیة لوارث انه

لا یشبه اهل الحدیث ولكن العامة تلقتہ بالقبول وعملوا به حتی جعلوه ناسخاً

لآیة الوصیة“۔ (ماجمس الیہ الحاجہ لمن ینال سنن ابن ماجہ ص: ۲۴)

باب میراث البنین مع البنات

”عن جابر بن عبد اللہ قال جاءني رسول الله صلى الله عليه وسلم: يهودني وأنا مريض فني بنى سليمة فقلت يا بنى الله كيف أقسم مالي بين ولدي؟ فلم يرُدُّ عليَّ شيئاً فنزلت: ”يوصيكم الله في أولادكم للذكر مثل حظ الأنثيين“ الآية۔ (حسن صحيح)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس میری عیادت کے لئے تشریف لائے جبکہ میں بنی سلمہ میں بیمار پڑا تھا، میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! میں اپنا مال اپنے بچوں میں کس طرح تقسیم کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی ”يوصيكم الله الخ“۔^۱

تشریح:- بنو سلمہ فتح السنین وکسر اللام، خزرج کی شاخ اور حضرت جابرؓ کا قبیلہ ہے۔

پہلا اشکال:- یہاں یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اس وقت تو حضرت جابرؓ کی کوئی اولاد نہ تھی بلکہ نو (۹) بہنیں تھیں جیسا کہ اگلے باب کی روایت میں ہے، اور صحیحین^۲ کی روایت میں ہے: ”فقلت يا رسول الله انما يرثني كلالة“۔ اور بخاری کی ایک اور روایت میں بھی بہنوں کی تصریح ہے: ”انما لي اخوات“۔^۳ تو اس طرح ان روایات میں تعارض آگیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو ”ولدي“ کا لفظ حدیث باب میں راوی کے ”وہم“ پر مبنی ہے یا پھر چونکہ وہ بہنیں عمر میں ان سے چھوٹی تھیں اور چھوٹوں پر اولاد اور بچوں کا اطلاق ہوتا ہے گونجا رہا ہوتا ہے۔ (قالہ الکککوی فی الکوکب)

دوسرا اشکال:- یہ ہے کہ ”يوصيكم الله الخ“ یہ آیت تو حضرت سعد بن ریح کی بیوی کے استفسار کے جواب میں نازل ہوئی تھی اور خود حضرت جابرؓ کی حدیث بھی سابقہ ”باب ما جاء في ميراث البنات“ میں اس کی تصریح کرتی ہے، جبکہ حضرت جابرؓ کے قصہ میں تو سورۃ نساء کی آخری آیت نازل ہوئی تھی تو یہ بھی تعارض ہے، ابوداؤد میں بھی اس کی تصریح ہے: ”قال فنزلت آية الميراث يستفتونك قل الله يفتيكم في

باب ميراث البنين مع البنات

^۱ مسوۃ النساء آیت: ۱۱۔ ۲ صحیح بخاری ص: ۳۲۰ ج: ۱ ”باب ما یبئ علیہ وطوء الخ“ کتاب الوضوء،

صحیح مسلم ص: ۳۳ ج: ۲ کتاب القرائن ۳ صحیح بخاری ص: ۹۹۸ ج: ۲ ”باب ميراث الإخوة والإخوات“ کتاب القرائن۔

الکلالہ۔ (باب فی الکلالۃ، اول کتاب الفرائض وایضاً باب من کان لیس لہ الخ ص: ۳۹۹) اور ترمذی کے اگلے باب میں بھی ایسا ہی ہے۔

پہلا جواب:- اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ترمذی کی اس باب والی حدیث میں راوی سے وہم ہو گیا ہے، پس کہا جائے گا کہ اس حدیث میں دو موقعوں پر وہم پایا جاتا ہے۔

دوسرا جواب:- یہ ہے کہ اس روایت میں ”ہو صیکم اللہ“ الایہ سے مراد میراث کا حکم ہے جو سب کو شامل ہے۔ فلا اشکال

تیسرا جواب:- یہ ہے کہ کبھی ایک حکم کے نزول کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں لہذا کبھی راوی دیکھ کر ذکر کرتا ہے اور کبھی دوسرا۔ (قال السیوطی فی الاقان)

راقم نے اسباب نزول کی روایات میں تطبیق اور ترجیح کے اصول ”زاد البیر فی علوم التفسیر“ اور پرانے نام کے مطابق ”الزاد البیر فی مقدمۃ التفسیر“ میں ذکر کئے ہیں جن کو اس میں یا ”الاقان“ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

باب میراث الاخوات

”عن جابر بن عبد اللہ قال مرضت فأتانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمودنی فوجدنی قد أغوی علی فأتانی ومعہ ابوبکر وحماد اشیان فتوضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصب علی من وضوءہ فآفقت فقلت یا رسول اللہ کیف أقتضی فی مالی لو کیف اصنع فی مالی؟ فلم یجبتنی شیئاً وکان لہ تسع اخوات حتی نزلت آیۃ المیراث ”یستفتونک قل اللہ یمتیکم فی الکلالۃ“ الایہ قال جابر بنی نزلت۔ (حسن صحیح) ۱

حضرت جابرؓ سے محمد بن المنکدر نے یہ فرماتے سنا ہے کہ میں بیمار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے وہ میری عیادت کرنا چاہتے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پایا جبکہ میں بے ہوش ہو چکا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور ان کے ہمراہ ابوبکرؓ بھی تھے، دونوں بیٹل تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور وضو کے پانی میں سے کچھ میرے اوپر ڈالا تو مجھے اتفاق ہوا، میں نے

مع سورۃ النساء آیت: ۱۷۶۔

باب میراث الاخوات

۱۔ ایضاً أخرجه مسلم ص: ۳۴ ج: ۲ کتاب الفرائض.

فوراً پوچھا اے اللہ کے رسول! میں اپنے مال کے بارے میں کیسے فیصلہ کروں؟ یا فرمایا (راوی کو شک ہے) میں اپنے مال میں کیا طریقہ اختیار کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، اس وقت ان کی نو (۹) بہنیں تھیں یہاں تک کہ یہ آیت میراث نازل ہوئی: ”یَسْتَفْتُونَكَ الْخ“ (الایۃ)۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ یہ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی۔

تشریح:۔ کلام وہ ہے جس کے اصول و فروع یعنی والد اور ولد کوئی نہ ہو اور دیگر ورثہ ہوں، حضرت تمناوی صاحب ”المسک الذکی“ میں فرماتے ہیں کہ: اس میں تین صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ فقط ہمشیرہ ہی ہو۔ اور دوسری یہ ہے کہ فقط بھائی ہوں اور بہن کوئی نہ ہو۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ بھائی، بہن دونوں ہوں۔ پہلی صورت میں سب کو شمس، شمس سٹے گا۔ اور دوسری صورت میں سب کو برابر ملے گا۔ اور تیسری صورت میں لڑکے کو دوہرا اور بہن کو اکہرا، لیکن یعنی بھائی سے علاقائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں۔

اس حدیث سے ایک طرف عیادت کی سنت معلوم ہوئی اور دوسری طرف پیدل چلنے کی فضیلت یعنی ہو سکے تو پیدل چلنا افضل ہے جیسا کہ جمعے کے بارے میں ”ولم یرکب“ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، اور یہ کہ وضوء کا مستعمل پانی پاک ہے گو کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت الگ ہے کہ ان کے مستعمل پانی میں اللہ نے شفاء رکھی تھی، تاہم عام لوگوں کے مستعمل پانی سے پینا افضل ہے چنانچہ ”الاشباہ والنظائر“ میں ہے: ”الاولیٰ اَنْ لَا یصلىٰ علیٰ من دہل الوضوء الذی یمسح بہ“۔ (الاشباہ ص ۱۶۶، کتاب الصلوٰۃ) اسی طرح داڑھی وغیرہ کا پانی بھی مسجد میں نہ جھاڑے، اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت معلوم ہوئی، اور یہ کہ بڑے بھی چھوٹوں کی عیادت کریں۔

باب ماجاء فی میراث العصبۃ

”عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الْحَقُّوْا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوَّلَى رَجُلٍ ذَكَرَ“۔ (حدیث حسن)^۱

باب ماجاء فی میراث العصبۃ

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب الفرائض ”باب میراث الولد من ابیه وامه“ ومسلم فی کتاب الفرائض ”باب الحقوا الفرائض بأهلها“ ابو داؤد کتاب الفرائض ”باب فی میراث العصبۃ“ والنسائی وابن ماجہ واحمد فی مسنده بحوالہ سنن دارمی ص: ۴۶۳ ج: ۳، ایضاً رواه الحاكم فی المستدرک ص: ۲۵۷ ج: ۵ حدیث ۸۱۲۳

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ (پہلے) صحابہ فروض کو ان کے حصے دو اور جو مال رہ جائے تو وہ قریب تر آدمی کے لئے ہے۔

لغات: - قولہ ”العصبۃ“ نفقت میں عصب پٹھے کو کہتے ہیں جو ایک مضبوط واصل کو کہتے ہیں، مراد وہ ورثہ ہیں جو ذوی الفروض کے بعد باقی اور ان کی عدم موجودگی میں سارا مال لیتے ہیں۔ قولہ ”الحقوا“ فتح المیزان و کسر الخاء ”ای اوصلو“ یعنی پہنچاؤ اور دلاؤ اور دلاؤ وغیرہ۔ قولہ ”یا ولی“ ”ای یلاقرب“ یعنی میت کے سب سے قریب تر۔ قولہ ”ذکر“ یہ تعہید اس لئے ہے کہ مرد عصوبت میں اصل ہے اور عورت مرد کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے گویا یہ رجل کی تاکید ہے تاکہ ذکر ت کو ا جا کر کیا جائے۔

تشریح: - حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب فروض جب اپنے اپنے مقررہ حصے لے لیں اور پھر بھی کچھ بچ جائے تو اگر عصبہ موجود ہوں تو وہ بچا ہوا مال دوبارہ ذوی الفروض پر تقسیم نہ ہوگا بلکہ وہ عصبہ کو دیا جائے گا، پھر عصبہ میں سے اولاد اس کا حق بنتا ہے جو میت سے اقرب ہو ثم الاقرب فالاقرب مثلاً اگر میت کا بیٹا ہو تو وہ پوتے پر اور باقی بھائیوں اور چچا وغیرہ سب پر مقدم ہے، پھر پوتا ہے پھر باپ ہے۔

اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ عصبہ نسبیہ جو اصل ہے عصوبت میں، تین طرح کے ہیں: (۱) عصبہ بنفسہ (۲) بغیرہ (۳) مع غیرہ۔

عصبہ بنفسہ: - کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اور میت کے درمیان کسی عورت کا واسطہ نہ ہو لہذا کہا جائے گا کہ یہ قسم اول وہ مرد ہے جس کا نسب میت سے، بغیر واسطہ عورت کے ہو جبکہ دوسری اور تیسری قسمیں دونوں عورتوں پر مشتمل ہیں، پھر عصبہ بغیرہ جیسے بہن اپنے بھائیوں کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے اور عصبہ مع غیرہ جیسے بہن، بیٹی کی وجہ سے عصبہ بنتی ہے، پھر عصبہ بنفسہ کی آپس میں چار قسمیں ہیں، سرائی میں ہے:

”اما العصبۃ بنفسہ فکل ذکر لا تدخل فی نسبۃ الی المیت أنثی و ہم لاربعة

اصناف: (۱) جزء المیت (۲) واصلہ (۳) و جزء ایہ و جزء جدہ الاقرب

فالاقرب“۔

یعنی میت کی اولاد، اس کے اصول باپ دادا، میت کے باپ کے اجزاء یعنی بھائی اور اس کے دادا کے اجزاء یعنی چچا، اور اس کے ساتھ ان سب کے اصول و فروع۔

”وان علاوان سفلوا“۔ قال: یرجحون بقرب الدرجه اعنی أولہم بالمیراث جزء

المیت ای البنون ثم بنوهم وان سفلو اثم اصله ای الاب ثم الحد، ای اب الاب
وان علا ثم جزء ایہ ای الاخوان ثم بنوهم وان سفلو اثم جزء جلدہ ای الاعمام
ثم بنوهم وان سفلو اثم یرجحون بقوة القرابة اعنی به ان ذالقرابتین اولی من
ذی قرابة واحدة ذکر اکان اوائلی الخ۔ (سراج ص: ۱۳، باب المعصات)

باب کی روایت اگرچہ مرسل ہے مگر کثرت طرق کی وجہ سے اور بعض اسانید میں موصول ہونے کی
بنا پر قابل عمل و قابل حجت ہے۔

باب ما جاء فی میراث الجدة

”عن عمران بن حصین قال جاء رجل الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: إن ابن ابنتی
مات فمالی من میراثه؟ فقال لك السدس بثلث ما ولی دعاه فقال: لَكَ سدس آخر فثلث ما ولی دعاه
قال: ان السدس الآخر لك طعمة۔“ (حدیث حسن صحیح)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرا پوتا فوت ہو گیا ہے تو مجھے اس کی میراث میں سے کیا ملے گا؟ (یعنی کتنا ملے گا)
تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے لئے چھٹا حصہ ہے جب وہ شخص جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
بلایا اور فرمایا تجھے ایک سدس (چھٹا) اور ملے گا، چنانچہ جب وہ جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھر
لکایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوسرا سدس (چھٹا) تیرے لئے کھانے کو زاد دیا ہے۔

تشریح:۔ اس مسئلہ کی تصویر یہ ہے جیسا کہ حاشیہ پر ہے کہ میت کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک دادا، جیسا کہ
پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ لڑکیوں کو ثلثان سے زیادہ نہیں ملتا دوسری طرف دادا بمنزلہ باپ کے ہے اس لئے اولاد
کی صورت میں اس کا حصہ سدس یعنی چھٹا بنتا ہے، فقال اللہ تعالیٰ: وَلَا یَوَیْہِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا
تَرَکَ ان کان له ولد۔“ (نساء آیت نمبر: ۱۱) اس لئے مسئلہ کی تھیں چھ سے ہوئی، بیٹیوں کو ثلثین یعنی چار حصے ملے
اور سدس یعنی چھٹا دادا کو بطور فرض دیا، ایک بیٹی کو دادا کو بطور تعصیب دیا کیونکہ دادا ذوی الفروض اور عصب
دونوں میں سے ہے۔

مسئلہ ۶

بنان جد ع

۳ ۱ ۱ = ۶

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دونوں حصے ایک ساتھ اس لئے نہیں دیئے کہ ایسا کرنے سے سابقہ حکم کی تمسوخ کا شبہ پیدا ہو سکتا تھا، اس لئے دونوں حکموں کو اُجاگر کرنے کے لئے الگ الگ کر کے دیئے تاکہ صاف طور سے معلوم ہو کہ جد کا حصہ ثلث نہیں بلکہ سُدس ہے اور دوسرا سُدس بطور تعصیب کے ہے، پھر اس کو طمعه سے تعبیر کیا تاکہ مزید تصریح ہو کہ اس سے پہلا فرض متغیر نہ ہوگا وہ بدستور سُدس ہی ہے اور رہے گا۔

اس کی مثال ذخیرہ احادیث میں اور بھی ملتی ہیں مثلاً عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے اپنی نابینا پن کا عذر پیش کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر پر نماز نماز پر چھنے کی اجازت چاہی کہ مثلاً اندھیرے میں لانے والا کوئی نہ ہو تو میں گھر پر نماز پڑھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی مگر جب وہ جانے لگے تو پھر نکلا کر پوچھا کہ اذان سنتے ہوں انہوں نے فرمایا ”ہاں“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آیا کر، اس میں پہلے اجازت، عام حکم ہے کہ معذورین گھر پر نماز پڑھ سکتے ہیں اور دوسرا ابن ام مکتوم کی خصوصیت ہے، اگر یہی حکم پہلی بار ارشاد فرماتے تو یہی حکم معلوم ہوتا کہ دیگر معذورین بھی نماز کے لئے مسجد میں آیا کریں۔ تدبر

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جد کا مسئلہ انتہائی مشکلات میں سے ہے اور اس سے اصول شرع میں نظر اور قیاس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ دین میں قیاس ایک ذرین اصول ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر مسئلہ منصوص نہیں ہوتا ہے، یعنی بعض مسائل مستنبط بھی ہوتے ہیں، غیر مقلدین کو یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہئے کہ قیاس کتنا اہم ہے، نیز اہل قرآن کے نام سے جو لوگ انتشار پھیلاتے ہیں وہ بھی بتائیں کہ قرآن میں جد کا حصہ کیا ہے؟

”العرف الشدی“ میں ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک داد اباب کی طرح بھائیوں کے لئے حاجب بنتا ہے جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک داد بھائیوں کے ساتھ شریک ہوگا یعنی ان کا حصہ ساقط نہیں کر سکتا۔ امام صاحب کی طرح قول، ابو بکر صدیق، ابن عباس، حضرت عائشہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اور ابو داؤد اور بہت سے تابعین کا قول بھی یہی ہے کہ: ”ان الحدیث فقط الاحوة والاحوات کالاب“۔ جبکہ جمہور کا مذہب وہی ہے جو صاحبین کا ہے۔ (کذا فی التھذیب) تختہ میں یہ بھی ہے کہ صحابہ کرامؓ میں یہ مسئلہ اختلافی رہا اور بہت سے صحابہ کرامؓ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل المقرب صحابی بھی اس میں بحث سے بچتے تھے۔

”قال وهذا التحذير والوعيد وما قبل في شأنه في ذلك الوقت انما هو قبل تدوين المذاهب الاربعة واستقرار الامر عليها عند كل مجتهد من الائمة الاربعة ومقلديهم ولا صعوبة حينئذ في الافناء“ الخ۔

تفصیل کے لئے دیکھئے تحفۃ الاحوذی اسی باب کی شرح میں۔

غیر مقلدین کو ائمہ مجتہدین کے کام کی اہمیت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔

باب ماجاء فی میراث الجدة

”عن قبيصة بن ذؤيب قال جاء ت الجدة أم الأم، وأم الأب إلى أبي بكر فقالت: ان ابن ابني او (قالت) ان ابن ابنتي مات وقد أخبرت ان لي في الكتاب حقاً، فقال ابو بكر: ما أجِدُ لَكِ في الكتاب من حق وما سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى لَكِ بشئٍ، وسأُفَلِّ الناس فقال فسأل الناس فشهدوا بغيره بن شعبة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطاهما السدس، قال: ثم من سمع ذلك معك؟ قال محمد بن مسلمة قال: فاعطاهما السدس ثم جاء ت التي تخالفها إلى عمر قال: سُفِين وزادني فيه معمر عن الزهري ولم احفظه عن الزهري ولكن حفظته من معمر أن عمر قال: ان اجتمعما فهو لكما وإيتكما انفردت به فهو لهما“۔^۱

حضرت قبيصة بن ذؤيب (بالصغير) سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک جدہ ماں کی ماں (ثانی) یا باپ کی ماں (داوی) ابو بکرؓ کے پاس آکر کہنے لگی کہ میرا پوتا یا نواسا (یعنی اگر دادی تھی تو کہا میرا پوتا اور اگر نانی تھی تو کہا کہ نواسا) فوت ہو گیا ہے، اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب میں میرا حق بیان کیا گیا ہے، تو ابو بکرؓ نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تو میرا کوئی حق نہیں پا رہا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے تیرے (جدہ کے) حق میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے کچھ سنا ہے البتہ میں جلد لوگوں سے پوچھتا ہوں، راوی نے فرمایا کہ انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہ بن شعبہ نے گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کو سدس دیا تھا، ابو بکرؓ نے فرمایا تیرے ساتھ اور کس نے سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ محمد بن مسلمہ نے (باب کی اگلی روایت

باب ماجاء فی میراث الجدة

۱۔ روی بمعناه ابو داؤد وابن ماجہ، وابن حبان والبیہقی، قال ابن حجر: واساده صحيح لشفة رجاله الا ان صورته مرسل

بحوالہ سنن دارمی ص: ۴۵۶ ج: ۲ حدیث: ۲۹۳۹، ایضاً مستدرک حاکم ص: ۲۵۷ ج: ۵ حدیث: ۸۱۳۳۔

میں ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر مغیرہ بن شعبہ کی طرح بات کی (چنانچہ ابو بکرؓ نے جدہ کو سدس دے دیا پھر دوسری جانب والی جدہ حضرت عمرؓ کے پاس آئی (یعنی اگر حضرت ابو بکرؓ کے پاس دادی آئی تھی تو عمرؓ کے پاس تانی آئی و بالکس) سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ معمر نے زہری کے حوالے سے مجھے یہ اضافہ بھی بیان کیا ہے، جو میں نے خود زہری سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ مجھے معمر کی زبان سے سُن کر یاد ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم دونوں یعنی دادی و تانی جمع ہوں تو یہ سدس آپ کا مشترک ہوگا اور جو بھی اکیلی ہوگی تو سدس پورا اس کو ملے گا۔

تشریح:- حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ جدہ ایک ہو یا زیادہ، دادی ہو یا تانی اس کا حصہ سدس ہے، ایک ہونے کی صورت میں پورا اور زیادہ ہونے کی حالت میں برابر تقسیم کیا جائے گا، صحابہ کرامؓ کے سامنے ہوا اور کسی نے اعتراض نہیں کیا، لہذا یہ اجماع تصور کیا جائے گا۔

البتہ یہاں کچھ شرائط ہیں جو قابل ذکر ہیں جیسا کہ سراجی میں ہے:

”وَلِلْحَدَّةِ السَّدَسِ لَامُ كَانَتْ أُولَابٍ وَاحِدَةً كَانَتْ أَوْ أَكْثَرَ إِذَا كُنَّ ثَابِتَاتٍ مُتَحَاذِيَاتٍ فِي الدَّرَجَةِ وَتَسْقُطُنَ كُلُّهُنَّ بِالْأَمِّ وَالْأَبَوَاتِ أَيْضًا بِالْأَبِّ وَكَذَلِكَ بِالْحَدِّ إِذَا لَامُ الْأَبِّ وَأَنْ عُلْتُ فَانْهَارَتْ مَعَ الْحَدِّ لِأَنَّهَا لَيْسَتْ مِنْ قَبِيلِهِ وَالْقُرْبَى مِنْ أَيْ جِهَةٍ كَانَتْ تَحْتَبُ الْبُعْدَى مِنْ أَيْ جِهَةٍ كَانَتْ وَارِثَةً كَانَتْ الْقُرْبَى أَوْ مَحْجُوبَةً الْخ“۔

یعنی جدہ کا حصہ چھٹا ہے خواہ تانی ہو یا دادی، ایک ہو یا زیادہ بشرطیکہ صحیحات ہوں (یعنی درمیان میں جِدہ فاسد حاکم نہ ہو، جِدہ فاسد وہ ہے جس کے اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ ہو جیسے نانا) اسی طرح درجہ میں یعنی واسطوں میں مساوی ہوں، اگر ماں موجود ہو تو جدات ساری ساقط ہو جاتی ہیں جبکہ دادیاں باپ کی وجہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہیں، اسی طرح دادیاں، دادا کے ہوتے ہوئے بھی محروم ہوتی ہیں سوائے باپ کی ماں کے کہ وہ دادا کے ساتھ بھی وارث بنتی ہے کیونکہ اس کا قرب میت سے (یعنی اپنے پوتے سے) دادا کے واسطے سے نہیں (بلکہ اپنے بیٹے کے واسطے سے ہے) اور قریب والی جدہ کوئی بھی ہو درو والی کے لئے حاجب بنتی ہے خواہ کسی جہت سے بھی ہو، اسی طرح حاجب خود وارث ہو یا نہ ہو مگر درو والی کو محروم کرتی ہے۔ (راجع للفصل ان شئت السراجی ص ۱۲ و ص ۱۳ من فصل فی النساء)

اس روایت پر اگرچہ انقطاع کا اعتراض ہے کہ قبضہ کا سماع حضرت ابو بکرؓ سے ثابت نہیں مگر باب کی

اگلی روایت بلاشبہ صحیح ہے چونکہ مضمون دونوں کا ایک ہی ہے اس لئے یہ بھی صحیح ہوئی۔ ولذا قال الترمذی بعدہ
وہو اصح من حدیث ابن عیینہ۔

باب ماجاء فی میراث الجدة مع ابنہا

”عن عبد اللہ بن مسعود قال فی الجدة مع ابنہا: انہا اول جدة اطعمہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سند سماع ابنہا وابنہا حی“۔ (ہذا حدیث لانعرفہ مرفوعاً الا من ہذا الوجه الخ)
حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے جو دادی کے بارے میں جس کا اپنا بیٹا بھی موجود ہو فرماتے ہیں کہ وہ پہلی جدہ ہے جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کے ہوتے ہوئے سدس دیا ہے جبکہ بیٹا بھی زندہ تھا۔

تشریح:- پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ علم میراث میں تمام نسبتیں میت کی طرف ہوتی ہیں، لہذا اس حدیث میں ابن کی نسبت میت کی طرف نہ سمجھی جائے بلکہ جدہ کی طرف جیسا کہ ضمیر ”ہا“ سے واضح ہے پس جدہ کے بیٹے سے مراد میت کا باپ ہے

اس بارے میں جمہور کا مذہب اور مفتی بہ قول وہی ہے جو سابقہ باب میں گذرا کہ باپ کے ہوتے ہوئے دادی میراث نہیں لے سکتی ”والابوابات ایضاً (یسقطن) بالاب“۔ (سراجی) اور محشی نے بھی نقل کیا ہے اگرچہ اس بارے میں بعض صحابہ کرام جیسے حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم باپ کے ساتھ دادی کے حق وراثت کے قائل ہیں۔ حدیث الباب ان کی دلیل ہے، امام ترمذیؒ نے بھی اس بارے میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف نقل کیا ہے۔

جمہور کا اصولی استدلال یہ ہے کہ باپ موجود ہو تو وہ دادی کے لئے حاجب بنتا ہے اور حاجب کے ہوتے ہوئے محبوب وارث نہیں بن سکتا، چونکہ یہ استدلال بنیادی اور صحیح اصول و قواعد پر مبنی ہے اس لئے باب کی حدیث میں تاویل ناگزیر ہے جیسا کہ ابن العربی عارضۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں: ”ومراعات القواعد اولیٰ من مراعاة الالفاظ“۔ اسی قاعدے کی بناء پر وہ صوم عن المیت کے جواز والوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”فراعنی لفظاً وهدم اصلاً“۔ (دیکھئے عارضۃ الاحوذی ص ۱۹۱ ج ۳، باب ماجاء فی الصوم عن المیت)
یا تشریحات ترمذی ص ۲۶۰ ج ۳، باب ماجاء فی الصوم عن المیت)

باب کی حدیث کا جواب :- ایک تو یہ ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ امام ترمذی نے اشارہ کیا ہے، اسی باب کے تحت عارضہ میں: ”ولم یثبت“ یعنی یہ حدیث ثابت نہیں ہے، لہذا جمہور کے اصولی استدلال پر اثر نہیں پڑتا، کہ محمد بن سالم ضعیف ہے۔ یا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث یعنی باپ کی خوشی اور رضامندی سے وادی کو بطور نفل دے دیا تھا نہ کہ بطور فرض، لفظ ”أَطْعَمَهَا“ اس کا قرینہ ہے۔

باب ماجاء فی میراث الخال

”عن ابی أمامہ بن سہیل بن حنیف قال کتب معی عمر بن الخطاب الی ابی عبیدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اللہ ورسولہ مولیٰ من لامولیٰ له والخال وارث من لا وارث له۔“ (حدیث حسن صحیح)

ابو امامہ بن سہیل سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے میرے ہاتھ پر ابو عبیدہ کو لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے مددگار ہیں جس کا کوئی مددگار نہ ہو اور یہ کہ ماموں اس شخص (بھانجے) کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

تشریح :- یعنی عالم اسباب میں جس کا کوئی معاون نہیں تو اللہ اس کا بطور خاص مددگار ہے۔ یہ خط دراصل ابو عبیدہ بن جراح کے خط کا جواب تھا جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مقتول کی میراث کے بارے میں پوچھا تھا، جس کا سوائے ماموں کے کوئی دوسرا وارث نہیں تھا، حضرت عمرؓ کے جواب اور باحوالہ مرفوع حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ دیگر ورثہ نہ ہونے کی صورت میں ماموں وغیرہ ذوی الارحام میراث کے مستحق ہیں۔ امام ترمذی نے اس کو جمہور کا مذہب قرار دیا ہے، فرماتے ہیں: ”والی هذا الحدیث ذهب اکثر اهل العلم فی سوریث ذوی الارحام“ اس کے برعکس حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مالکیہ وشافعیہ کے نزدیک ذوی الارحام کی موجودگی کے باوجود میراث بیت المال میں جمع ہوگی ماموں وغیرہ کو نہیں دی جائے گی، حنفیہ کا مذہب وہی ہے جو جمہور اور اکثر اہل علم کا ہے یعنی ذوی الارحام کو میراث ملے گا۔

باب ماجاء فی میراث الخال

۱۔ رواہ النسائی والدارقطنی وابن ماجہ، قال الالبانی فی صحیح الجامع ۳۹۶/۱ ”حسن“ سنن داؤمی ص: ۳۳ ج: ۲

حدیث: ۲۹۷۷، ایضاً رواہ مستدرک حاکم ص: ۲۶۲ ج: ۵ حدیث: ۸۱۷۰

ذوی الارحام کون ہیں؟؟؟ تو سراجی میں ہے: ”ذوی الرحم ہو کل قریب لیس ہذی سهم ولا عصبہ“۔ (باب ذوی الارحام، ص: ۳۳)

یعنی ہر وہ عزیز ورشتہ دار جو ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ ہی عصبہ ہو جیسے ثانی کے علاوہ ماں کے توسط سے تمام رشتہ دار (نخیال) اور نواسے و نواسیاں، بھانجے و بھانجیاں اور پھوپھیاں وغیرہ۔

جمہور کا استدلال باب کی حدیث سے ہے جو صحیح بھی ہے اور صریح بھی، اسی طرح امام ترمذی نے وفی الباب میں جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب بھی جمہور کی متدل ہیں علاوہ ازیں ”واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض“ کے الایۃ اور ”للمرء حال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون والنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون“ (النساء آیت نمبر ۷) سے بھی جمہور کا استدلال ہے۔

اس کے برعکس مانعین کے پاس کوئی صریح اور صحیح نص نہیں ہے خصوصاً جب آج کل بیت المال بھی نہیں ہے اگر بے تو برائے نام بلکہ ناکام ہے، تو ایسے میں وہ اگر ذوی الارحام کو نہ دیں تو کہاں پھینکیں گے؟ اس لئے جمہور کا مذہب اور خصوصاً موجودہ حالات میں بہت مضبوط ہے، صاحب تحفہ فرماتے ہیں: ”وہو قول الراجح“۔ قاضی شوکانی نے بھی ”نیل“ میں اس کی بھرپور تائید کی ہے، ابن العربی نے عارضہ میں باب کی حدیث میں لفظ ”خال“ کو عصبہ اور سلطان پر حمل کر کے جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر صاحب تحفہ نے اس کو تعنف کہا ہے جیسا کہ ظاہر ہے، کیونکہ خال اور سلطان میں کوئی علاقہ نہیں۔

باب ماجاء فی الذی یموت ولیس له وارث

”عن عائشۃ ان مولیٰ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم وقع من عذق نخلة فمات فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أنظروا هل له من وارث؟ قالوا: ”لا“ قال: فادفعوه الی بعض اهل القرية“۔ (حسن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ غلام کھجور کے درخت (یا شاخ) سے گرا اور فوت ہو گیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تلاش کرو اس کا کوئی وارث ہے؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر (میراث) اس کے گاؤں کے بعض

(غریبوں) کو دے دو۔

لغات :- قولہ ”مولیٰ“ لغت میں اس کے تقریباً سترہ (۱۷) معانی ہیں مثلاً مالک، مددگار، دوست، حلیف، غلام، آزاد کردہ غلام اور آزاد کرنے والا آقا وغیرہ۔ یہاں آزاد کردہ غلام مراد ہے، اس کو مولیٰ اسفل بھی کہتے ہیں، جیسا کہ اگلے باب کے ترجمہ الباب میں ہے۔ قولہ ”غذقی“ اگر عین کو مفتوح پڑھ لیا جائے تو نفس کھجور کے پھل دار درخت کو کہتے ہیں، اور یکسر لعین چٹھوں اور خوشوں والی شاخ کو کہتے ہیں، دونوں صورتوں میں عین کلمہ یعنی ذال ساکن ہے۔

تشریح :- اصولی طور پر اس غلام کی میراث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنی چاہئے تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم متعلق (بکسر الاء) تھے مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام مادی اشیاء کی میراث نہ لیتے ہیں اور نہ ہی دیتے ہیں تاکہ لوگ ان کو دنیا دار نہ سمجھیں، اور ان کو دنیاوی اشیاء سے طویل واسطے کی ضرورت بھی نہیں، اس لئے یہ مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بیت المال میں جمع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بیت المال میں تصرف کے مالک تھے، دوسری طرف گاؤں والوں کو ایک گوشت تعلق تو تھا کہ جس کا بچپن جہاں گزرے وہاں سے اور وہاں والوں سے قلبی تعلق ہوتا ہے اسی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث گاؤں کے غریبوں کو دینے کا حکم دیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ میراث کی ملکیت غیر اختیاری سبب ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالک تو بن گئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشیاء کو ذخیرہ نہیں فرماتے اس لئے گاؤں والوں کو دینے کا حکم دیا تو یہ بھی صحیح وجہ بن سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔ بہر حال اگر کوئی آدمی ایسا ہو کہ اس کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو اس حدیث سے گاؤں والوں کو وارث نہ سمجھا جائے بلکہ وہ مال بیت المال میں جمع ہوگا۔

مگر جیسا کہ سابقہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آج کل تو بیت المال نہیں ہے تو پھر کیا کرنا چاہئے؟ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب عرف شذی میں فرماتے ہیں کہ اس کو دینی مدارس میں جمع کرا دیا جائے۔

”افتی ارباب الفتاویٰ بان بیوت الاموال انعمت فیدفع الوراثة الی من یدلی

الی السبب رضاعاً وافتی صاحب مجمع الانہر بوضعہافی المدارس الاسلامیة

وهذا یوافق اهل المعصرو بفتح دار باب الفتوی ”الفتح“ (العرف الشذی تحت باب الباب)

پھر اس تر کے کا مصرف مستحقین زکوٰۃ ہوں گے اس لئے ذمہ دار و محتاط مدارس میں دینا چاہئے۔

باب ماجاء فی میراث المولیٰ الاسفل

”عن ابن عباس ان رجلاً مات علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم بدع وارثاً إلا عبداً هو اعتقه فاعطاه النبی صلی اللہ علیہ وسلم میراثه“۔ (حدیث حسن)^۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فوت ہو گیا اور پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا مگر ایک غلام جس کو اس نے آزاد کیا تھا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی غلام کو اس کی میراث دے دی۔

تشریح:- اس حدیث کی شرح میں وہی اصول ہے جو سابقہ باب میں بیان ہوا کہ ایسے آدمی کی میراث بیت المال میں جمع ہوگی، اور آج کل دینی مدارس میں، مولیٰ اسفل یعنی آزاد کردہ غلام کی میراث تو مولیٰ اعلیٰ یعنی آزاد کرنے والے کو ملتی ہے نہ کہ مولیٰ اعلیٰ کی مولیٰ اسفل کو مگر یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو بیت المال کے مال کا مصرف سمجھ کر اور ایک گونہ تعلق کی بناء پر دیا۔ تدبر

باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والكافر

”عن اسامة بن زيد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا يرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم“۔ (حدیث حسن صحیح)^۱

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کافر کی میراث نہیں لے سکتا اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث بن سکتا ہے۔

تشریح:- امام ترمذی نے اس بارے میں کوئی اختلاف نقل نہیں کیا ہے بلکہ فرمایا: ”والعمل علی

باب فی میراث المولیٰ الاسفل

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً الحاكم في المستدرک من: ۲۶۵ ج: ۵، حدیث: ۸۱۸۱۔

باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والكافر

۱۔ رواه البخاری من: ۱۰۰۱ ج: ۲، ”باب لا يرث المسلم الکافر الخ“ کتاب الفرائض، صحیح مسلم من: ۳۳ ج: ۲، کتاب الفرائض و ابو داؤد فی کتاب الفرائض ”باب هل يرث المسلم الکافر“ و مالک فی الموطأ فی کتاب الفرائض باب میراث أهل الملل، أيضاً رواه أحمد و البیہقی بحوالہ سنن دارمی من: ۲۶۶ ج: ۲، حدیث: ۳۰۰۰، مستدرک حاکم من: ۲۶۳ ج: ۵، حدیث: ۸۱۸۳۔

هذا الحديث عند اهل العلم "البتہ مرتد کے بارے میں اختلاف نقل کیا ہے، لہذا اس باب میں دو مسئلے قابل ذکر ہیں: (۱) اصلی کا فر کی توریث کا۔ (۲) مرتد کی وراثت کا مسئلہ۔

پہلے مسئلے کی وضاحت یہ ہے کہ کافر تو بالا جماع مسلمان کا وارث نہیں بنتا، جبکہ اس کے برعکس مسلمان کے کافر کا وارث بننے میں اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں بنتا جبکہ بعض صحابہ کرامؓ جیسے معاذ بن جبل، معاویہ اور سعید بن المسیب وغیرہ رضی اللہ عنہم اس کے جواز کے قائل ہیں، جیسا کہ حاشیہ میں ہے اور امام نوویؒ نے شرح مسلم میں بھی ذکر کیا ہے۔^۱

جمہور کا استدلال:- اس بارے میں باب کی حدیث سے ہے جس میں دونوں جانبوں سے میراث کے استحقاق کی نفی کی گئی ہے اسی طرح اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث آنے والی ہے جس میں صاف کہا ہے: "لا یتوارث اهل ملیتن"۔^۲ نیز توارث موالات و نصرت پر مبنی ہے اور وہ مسلمان و کافر کے درمیان مفقود ہے۔

دوسرے فریق کا استدلال:- اس حدیث سے ہے: "الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ"۔^۳ لہذا مسلمان عالی ہونے کی وجہ سے وارث بننا چاہئے کافر کا۔

جواب:- مگر اس حدیث سے اس کا استدلال درست نہیں کیونکہ یہاں علو سے مراد حجت و افضلیت ہے یعنی اسلام تمام پہلوؤں کے اعتبار سے تمام ملل و ادیان سے افضل ہے کوئی مذہب اس کے مساوی یا فائق نہیں ہو سکتا، اس کے مقابلے میں جمہور کی متدل حدیث نفی توارث پر صریح ہے۔ بہر حال اب اس مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہیں ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ مسلمان اور کافر کے درمیان توارث نہیں ہے۔

دوسرے مسئلے میں کافی اختلاف ہے اور کل ملا کر اس میں چھ مذاہب ہیں لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اختلاف جانہین سے توارث کے بارے میں ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ مرتد مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا، پس یہ صرف مرتد کے بارے میں، اس حالت سے متعلق ہے جب وہ حالت ارتداد میں مرجائے یا مارا جائے یا دار حرب چلا جائے یعنی بغیر توبہ کے مرے۔

۱۔ النووی علی مسلم ص: ۳۳ ج: ۲۔

۲۔ ابی داؤد الرواحی فی سننہ عن عمر ص: ۴۶۵ ج: ۲ حدیث: ۲۹۹۲۔

۳۔ رواہ البخاری ص: ۱۸۰ ج: ۱ "باب اذا اسلم الصبی فمات الخ" کتاب الجنائز۔

مذہب کی تفصیل حاشیہ کو کتب پر بحوالہ ماوردی منقول ہے۔ سراجی میں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مرتد نے جو مال حالتِ یردّت میں کمایا ہو وہ بیت المال (دینی مدارس) میں جمع کر دیا جائے گا، اور جو ارتداد سے پہلے کا ہے وہ مسلمان ورثہ کو بطور میراث ملے گا۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ دونوں حالتوں کا مال مسلمان وارثوں کا ہے، اس کے برعکس امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں قسم کا مال بیت المال میں جمع ہوگا جبکہ مرتدہ عورت کا سارا ترکہ مسلمان وارثوں کا ہے بالا جماع۔ (فصل فی المرتد ص: ۵۸)

امام ترمذیؒ نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ امام احمدؒ، امام مالکؒ کا مذہب بھی امام شافعیؒ کے مذہب کی طرح ہے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک اگر ایک آدمی اپنے ورثہ کو محروم کرنے کی غرض سے مرتد ہو جاتا ہے تو پھر اس کی میراث مسلمان وارثوں کو ملے گی۔

امام شافعیؒ کی دلیل :- حدیث الباب ہے کہما نقلہ الترمذی عنہ۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جو مال اس نے حالتِ یردّت میں کمایا ہے اس کے متعلق تو یہ بات صحیح ہے مگر جو حالت اسلام کا ہے تو اس میں تو ریث کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ مرتد ہو گیا والعیاذ باللہ تو وہ حکماً میت قرار پایا کیونکہ اسی وقت اس کا قتل واجب ہو گیا تھا، جو تاخیر تین دنوں تک ہوئی وہ اس کے شبہ کے ازالے کے لئے ہوئی، مگر جب وہ واپس مسلمان نہ ہوا اور قتل کیا گیا تو یہ قتل وقتِ ردّت کی طرف منسوب ہوگا لہذا یوں سمجھا جائے کہ وہ ارتداد سے مر گیا تو یہ تو ریث المسلم من المسلم ہوئی۔ (تذکر) کچھ آثار بھی امام صاحبؒ کے مستدل ہیں جو حاشیہ تحفہ پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

حدیث آخر :- ”عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ”لا یتوارث اهل ملتين“۔

(حدیث غریب)

دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے۔

تشریح :- ایک نسخہ میں یہاں مستقل باب مع العوان موجود ہے جیسا کہ بین السطور دیا ہے: ”ہساب لا یتوارث اهل ملتين“۔ اس مسئلہ کی نوعیت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی مگر وہاں مسلمان اور کافر کے درمیان توارث زیر بحث تھا یہاں اس میں توسیع ہوئی اور کہا کہ دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

یہ حدیث بظاہر امام احمدؒ کے مذہب پر زیادہ صریح ہے کیونکہ ان کے نزدیک تمام اریان خواہ سماوی ہوں یا خود ساختہ سب مختلف ہیں لہذا کسی بھی ایک ملت والا دوسرے ملت والے کا وارث نہیں بن سکتا جبکہ حنفیہ و شافعیہ

کے نزدیک یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں، مالکیہ کے نزدیک ملل سادہ سارے آپس میں مختلف ہیں اور باقی خود ساختہ تمام ملل ایک ہیں، بظاہر یہ حدیث ان تینوں مذاہب کے خلاف ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک ملت ہے اور کفر خواہ وہ کسی بھی مذہب والوں کا ہو دوسری ملت ہے علی ہذا یہ حدیث سابقہ حدیث کی طرح ہوئی اور مطلب وہی ہوا جو سابقہ باب میں بیان ہوا یعنی اس میں مسلمان اور کافر کے ایک دوسرے سے توارث کی نفی کی گئی ہے باقی ملل کی بات اس میں نہیں کی گئی ہے لہذا وہ ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں۔ (کذا فی اللکوب وحاشیہ)

آج کل کے اہل بدعت کی وراثت و مناکحت کا حکم:۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ بدعت کی اصطلاح تداء کے نزدیک فکری اختراع اور اہل السنۃ والجماعت سے مختلف نظریات کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جبکہ متاخرین کے نزدیک اس کا اطلاق خلاف سنت کسی عمل کو ثواب کی غرض سے کئے جانے پر ہونے لگا، اور آج کل یہی متعارف ہے، اس لئے پھر بعض علماء کو تفصیل بتانے کی ضرورت پیش آئی کہ بدعت ایک مکفرہ ہے اور دوسری سیدھے ہے۔ تفصیل فتاویٰ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف یہ بات پیش نظر ہے کہ اگر کسی خاندان میں دیوبندی، بریلوی اور شیعہ تینوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے موجود ہوں تو ان کی توریث کا حکم کیا ہونا چاہئے؟

اس کا جواب خاصا مشکل ہے اور مفصل بھی، مگر اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یوں کہنا چاہئے کہ ایمان و اسلام یا توارث کا دار و مدار صرف ظاہری انتساب پر مبنی نہیں ہے کہ اگر کوئی شیعہ یا بریلوی ہے تو وہ کافر اور کوئی دیوبندی ہے تو وہ مسلمان ہے اصل چیز اعتقاد و اعمال ہیں گو کہ یہ نسبتیں شعار کا کام دیتی ہیں، کسی کی تکفیر کا اصول یہ ہے کہ جو شخص ضروریات دین کو نہیں مانتا یا ان میں تاویل کرتا ہے تو وہ اہل قبلہ یعنی مسلمان نہیں ہے، ضروریات سے مراد وہ احکام ہیں جو اتنے تواتر سے مروی و ثابت ہوں جو گویا بدیہی بن چکے ہوں اور بحیثیت مسلمان وہ مولیٰ مولیٰ باتیں کسی پر مخفی نہ ہوں جیسے توحید، رسالت، قیامت وغیرہ عقائد میں سے اور نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ اعمال میں سے، جن میں تاویل و احتمال دیگر کی گنجائش نہیں۔ اور جو شخص ضروریات کو مانتا ہے اور ان میں تاویل نہیں کرتا، بالفاظ دیگر قطعی الثبوت نصوص جو قطعی المعنی ہوں جیسے محکم و مفسر، ان کو بلا تاویل ماننے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی، شرح عقائد مع الہتمن میں ہے:

”وَرَدَّ النصوص بان ينكر الاحكام التي دلت عليها النصوص القطعية من الكتاب

والمسنة كحشر الاجساد مثلاً ككفر لكونه نكذياً صريحاً لله تعالى ورسوله (صلی اللہ علیہ وسلم) فمن قذف عائشة بالزنا كفر واستحلال المعصية صغيرة كانت او كبيرة كفر اذ اثبت كونها معصية بدليل قطعی۔ (شرح عقائد ص: ۱۲۰)

پھر اس اصول پر بہت سی تفریعات کی ہیں جس کی تفصیل شرح عقائد وغیرہ کتب عقائد میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علی ہذا جو شخص شتم نبوت کا مرتکب ہو، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل مانتا ہو، یا ان کی الوہیت کا قائل ہو، یا حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بابت یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وحی نازل کرنے میں ان سے چوک ہوئی اور بجائے حضرت علیؑ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے آئے، یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر ہو، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو زنا سے متهم کرتا ہو، یا کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرتا ہو، یا غیر اللہ کے لئے کلمی و محیط علم غیب مانتا ہو، یا اس قسم کی قطعیات کا انکار یا تاویل کرتا ہو تو وہ شخص مسلمان نہیں، نہ وہ کسی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی میراث مسلمان کو ملے گی، اسی طرح اس کے ساتھ ازواجی رشتہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا جائز نہیں بلکہ منعقد ہی نہیں ہوتا، جبکہ ایسے نام کے شیعہ یا بریلوی جن کے عقائد صریح مخصوصات سے متصادم نہ ہوں یا اگر متصادم ہوں تو ان نصوص میں قطعیت نہ ہو، اور اگر ثبوت میں قطعیت ہو لیکن معنی میں تاویل کی گنجائش ہو تو ان کی تکفیر نہیں کی جانی چاہئے لیکن پھر بھی ان کی وراثت اور مناکحت سے بچنا چاہئے خصوصاً اپنی لڑکی ان کے مردوں کے نکاح میں ہرگز نہیں دینی چاہئے کہ وہ غلط آدمی کے تسلط میں دینے کے مترادف ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح میں انتہائی احتیاط برتنی چاہئے کیونکہ یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ کس رافضی کا عقیدہ و عمل خراب ہے اور کس کا نسبتاً اچھا ہے تو جیسے بعض ظن گناہ ہے مگر قرآن نے اس قلیل کی وجہ سے ظن کثیر سے ممانعت فرمادی اس لئے ان تمام لوگوں کی وراثت و مناکحت سے بچنا چاہئے۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے:

”فإذا كان الرجل مُحْشِماً أو قسرياً أو ولده موحداً فمات هل يرثه أم لا؟

المسئلة على القول بتكفير المتأولين فان قلنا انهم غير كفار صلينا عليهم وجرى

الميراث، وان قلنا انهم كفار لم يصل عليهم ولا جرى الميراث فيهم۔“

پھر اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ عارث مجاہسی کا باپ میراث میں ستر ہزار درہم چھوڑ گیا تھا مگر انہوں نے

اس سے کچھ بھی نہیں لیا کہ باپ قدری تھا۔

قال ابن ہوازن: "قیل انه ورث من ابيه سبعین الف درهم فلم يأخذ منه شیئاً لان
اباه یقول بالقدر فرأى فی الورع ان لا يأخذ میراثه، فیحتمل احلوا جہین إماماً لانه
كان یری إکفار من ابتدع واما تنزه وتورع"۔ واللہ اعلم۔

حضرت تھانوی صاحبؒ کی تقریر "المسک الذی علی الترمذی" میں اس باب کے تحت فرمایا ہے:
"روافض وغیرہ جو فرماتے ہیں وہ سب اسلام میں داخل ہیں جب تک کہ ان کے عقائد کفر تک نہ پہنچیں
اور ان سے نکاح وغیرہ بھی جائز ہے، اور فتویٰ میں چونکہ ہر شخص خود مختار ہے جو چاہے لکھ دے مگر اس باب
میں بہت بڑی احتیاط کرنی چاہئے کہ تکفیر کے لئے نہایت قوی دلیل کی ضرورت ہے، اور جاننا چاہئے کہ
کفر کی دو قسمیں ہیں: ایک تو کفر زنا ہوتا ہے، اور ایک التزاماً مثلاً کوئی شخص عمل کفار کے کرتا ہے اور جب
اس سے دریافت کیا جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اس صورت میں کفر زنا ہے یہ شخص کافر نہیں
ہے، اور اگر کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم مسلمان ہو یا ہندو؟ اور وہ کہے کہ میں ہندو ہوں تو یہ کفر التزامی
ہے کہ وہ اپنے کافر ہونے کا التزام کرتا ہے، سو یہ شخص واقعی کافر ہے، کیونکہ ملتزم کفر ہے اگرچہ وہ عمل
مسلمان کے کرتے۔"

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ حضرت تھانوی صاحبؒ کا فتویٰ "امداد الفتاویٰ" میں اسے سے نسبتاً سخت ہے
ممکن ہے کہ جس زمانہ میں ترمذی پڑھا رہے ہوں تو اس وقت شیعیت کے غلو کے بارے میں زیادہ معلومات
یا مشاہدہ نہ ہوا ہو مگر بعد میں رائے تبدیل ہوئی ہو۔ آج کل کے شیعہ عموماً بہت غالی ہیں اس لئے عام اہل فتاویٰ
نے ان کی تکفیر کی ہے، میرے خیال میں جو ان پڑھ اور جاہل قسم کے شیعہ ہیں اور صرف نام کے شیعہ ہیں یا غالی
نہیں تو ان کی تکفیر میں احتیاط لازمی ہے اگرچہ آج کل ان میں سے ایسے افراد عملاً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ واللہ
اعلم وعلمہ اتم۔

تنبیہ:- جس طرح کسی کی تکفیر ایک خطرناک اور نازک ترین مسئلہ ہے تو اسی طرح تکفیر میں تساہل بھی
بہت سے مفسد کو جنم دیتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کی جن کے نظریات و اعمال ایمان سے خارج کر دینے والے
ہوں تکفیر نہ کی جائے تو سادہ لوح مسلمان ان کے اعمال کو قبیح نہ سمجھ کر اختیار کریں گے اس طرح وہ بے چارے
دارہ ایمان سے خارج ہو جائیں گے، چنانچہ حضرت تھانویؒ آغا خانوں کے نظریات و عقائد کے بارے میں

پوچھے گئے ایک سوال کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں: ”خلاصہ یہ ہے کہ جب ان کفریات کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلمان کہا جائے گا تو ناواقف مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قبح خفیف ہو جائے گا اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کے شکار ہو سکیں گے، تو کافروں کو اسلام میں داخل کہنے کا انجام یہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہو جائیں گے کیا کوئی مصلحت اس مفسدہ کی مقاومت کر سکے گی؟“ الخ۔

(برادری اور اصول: ۳۱، طابع اوارہ اسلامیات لاہور)

باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: القاتل لا یرث“۔^۱ (هذا حدیث

لا یصح... واسحق قد ترکہ بعض اهل العلم... والعمل علی هذا عند اهل العلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قاتل (مقتول کی) میراث نہیں لے سکتا ہے۔

تشریح:- یہ حدیث اگرچہ بترشح امام ترمذی صحیح نہیں مگر جیسا کہ پہلے بار ہا عرض کیا جا چکا ہے کہ کبھی روایت کی سند ضعیف ہوتی ہے مگر تعامل اللہ کی وجہ سے وہ صحیح ہوتی ہے، اس لئے امام ترمذی نے فرمایا کہ اس پر اہل علم کا عمل ہے، نیز یہ روایت ”عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ“ کی سند سے نسائی یا سنن ابی داؤد میں بھی مروی ہے،^۲ اس لئے قاتل حجت ہے۔ تاہم امام مالک فرماتے ہیں کہ قتل خطا میں قاتل کو مقتول مورث کی میراث میں سے مقررہ حصہ ملے گا دیت سے نہیں ملے گا جبکہ عمد میں وہ جمہور کے ساتھ ہیں، عارضہ میں ہے: ”وقال مالک لا یرث من العطاء الا من الدیۃ“۔^۳ خفیہ و شافعیہ وغیرہ عمد اور خطا ہر دو میں حرمان کے قائل ہیں۔

ان کا استدلال حدیث باب سے ہے چونکہ روایت مطلق ہے عمد کی قید سے، اس لئے اس کا عموم پر رکھنا اولیٰ بلکہ ضروری ہے، کیونکہ خطا کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں۔ سراجی میں ہے:

باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل

۱۔ ایضاً رواہ الدارمی ص: ۴۷۹ ج: ۲ حدیث: ۳۰۸۳، ایضاً سنن ابی داؤد ص: ۲۸۰ ج: ۲ کتاب الدیات، مسند احمد ص: ۸۰ ج: ۱ حدیث: ۳۳۸۔ ۲۔ لم یجدہ فی النسائی ولکن رواہ ابو داؤد عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ص: ۲۸۰ ج: ۲ ”باب دیات الاصاب“ کتاب الدیات۔ ۳۔ فی الدارمی: اذا قتل الرجل اخاه عمدًا لم یرث من میراثه ولا من دیته فاذا قتلہ خطأ ورث من میراثه ولم یرث من دیته الخ ص: ۴۷۸ ج: ۲۔

”المناع من الارث اربعة الرقی... والقتل الذی یتعلق به وجوب القصاص أو

الکفارة، واختلاف الدینین واختلاف الدارین“۔

یعنی ہر وہ قتل حرمان میراث کا سبب ہے جس سے یا قصاص لازم آتا ہو جیسے عمد یا کفارہ لازم آتا ہو جیسے

شہہ عمد اور خطاء۔

قتل کی تعریف یہ ہے کہ قتل کے ارادے سے کسی کو آگے قتل سے ہلاک کر دے اس سے قصاص لازم آتا ہے، باقی اقسام سے نہیں، اگر قتل کرنے کا ارادہ تو ہو مگر وہ آگے قتل اسلحہ یا اس کا قائم مقام نہ ہو جیسے پتھر یا ڈنڈا تو وہ شہہ عمد ہے، اور اگر مثلاً شکار سمجھ کر گولی چلائی وہ انسان کو لگ گئی تو وہ خطاء ہے جبکہ لیٹے ہوئے شخص کا کسی پر گرنا یا کروٹ کے نیچے سونے میں دبا کر مارنے کو جاری مجرئی خطا کہتے ہیں، آج کل گاڑی کا ڈرائیور بھی اسی حکم میں ہے جیسے جانور کا سوار ہوتا ہے۔ (کمانی الھدایہ ”باب جنایۃ الہیمیۃ والجنایۃ علیہا“ ص: ۵۳۳ جلد ۴) اقسام قتل کی تفصیل (تشریحات ج: ۵ ص: ۳۰۶) پر بھی گزری ہے۔

باب ماجاء فی میراث المرأة من دية زوجها

”عن سعید بن المسیب قال قال عمر الدیۃ علی العاقلۃ ولا ترث المرأة من دية زوجها

شیعاً فاحبره الضحاک بن سفیان الکلابی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب الیہ ان ورث امرأة أشیم الضبابی من دية زوجها“۔ (هذا حدیث حسن صحیح)^۱

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دیت عاقلہ پر ہے اور عورت اپنے شوہر کی دیت میں سے کچھ بھی وراثت نہیں لے سکتی، تو ضحاک بن سفیان نے ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس لکھ کر بھیجا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو ان کے شوہر کی دیت میں سے میراث دے دو۔

لغات:۔ قولہ ”دیه“ خون بہا کو کہتے ہیں، یہ اصل میں مصدر ہے ”وَدَى القتال“ اس وقت کہا جاتا ہے جب قاتل والوں کی طرف سے ولی مقتول کو جان کے بدلہ مال دیا جائے، مگر پھر اس کا اطلاق مال پر ہونے

لگا۔ فلولہ "العاقلة" عقل سے ہے عقل کے معنی دیت بھی آتے ہیں، پس عاقلہ وہ لوگ ہوئے جو دیت ادا کرتے ہیں۔ اور عقل روکنے کو بھی کہتے ہیں چونکہ آدمی کا قبیلہ اس کو سمجھانے اور قتل و قتال اور فساد سے روکنے کا پابند ہوتا ہے اس لئے ان کو عاقلہ کہتے ہیں لہذا اگر وہ آدمی کسی کو قتل کر دے تو ذمہ داری دیت کی سب پر عائد ہوگی۔

تشریح:۔ حضرت عمرؓ کا مذہب یہ تھا کہ بیوی شوہر کی دیت میں حصہ دار نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ ایک دقیق نکتے پر مبنی تھی کہ دیت تو شوہر کی موت کے بعد ملتی ہے لہذا یہ شوہر کی کمائی نہیں نیز موت سے نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے علاوہ ازیں جب عورتیں دیت کی ادائیگی میں شریک نہیں تو تو ریشہ دیت میں بھی ان کا حصہ نہیں ہونا چاہئے۔

مگر جب یہ حدیث ان کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے اپنے مذہب سے رجوع فرمایا، اور حدیث کا حکم جس وجہ پر مبنی ہے وہ ان کی وجہ سے زیادہ اوثق ہے، وہ یہ ہے کہ دیت اس مردے کی اسے زندہ تصور کر کے لگائی جاتی ہے کیونکہ لاش کی قیمت تو اتنی زیادہ نہیں ہوتی پس دیت بھی میراث کے مال میں شامل ہے اور نکاح بھی حکماً باقی ہے کہ عورت عدت گزارتی ہے۔ حدیث کی باقی تشریح "باب ماجاء فی المرأة ترث من ویة زوجها" میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی ص: ۳۲۵ ج: ۵، ابواب الدیات)

باب ماجاء ان الميراث للورثة

والعقل للعصبة (على العصبة)

"عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی فی حنین امرأۃ من بنی لحيان سقط مبتأثرة عبد او أمة ثم ان المرأة التي قضی علیہا بغرة توفیت فقضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میراثہا لبنیہا وزوجہا وان عقلہا علی عصبتہا"۔^۱

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو لحيان کی ایک عورت کے حمل کے بارے میں جو مردہ پیدا ہوا تھا فیصلہ فرمایا تھا، ایک غرہ دینے کا جو ایک غلام یا باندی ہے پھر جب وہ عورت مر گئی جس کے لئے غرہ کا فیصلہ ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بیٹوں

باب ماجاء ان الميراث للورثة الخ

۱۔ المحلیت اخرجہ ایضاً البخاری ص: ۹۹۸ ج: ۲ "باب میراث المرأة والزوجة الخ" کتاب الفرائض، ومسلم فی القسامة، ابوداؤد فی الدیات باب: ۱۹، والنسائی فی القسامة باب: ۲۹، مستد احمد ص: ۳۶۰ ج: ۳ حدیث: ۱۰۵۷۰۔

اور شوہر کی ہے اور اس کی دیت قاتلہ کے عصبہ پر واجب ہے۔

لغات :- قولہ ”جنین“ وہ بچہ جو ابھی تک پیٹ میں ہو پوشیدہ اور مستور ہونے کی وجہ سے اسے جنین کہتے ہیں کیونکہ جیم اور نون مادہ میں تسخّر عن الامین کے معنی پائے جاتے ہیں، جمع اَجْنَّةُ آتی ہے۔ قولہ ”لِحیان“ بکسر اللام وفتح۔ قولہ ”بغرة“ بضم الغین وتشدید الراء وتوین التاء المدوّرة، اصل میں گھوڑے کی پیشانی پر سفید نشان کو کہتے ہیں مگر توسعاً ہر عمدہ چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے غلام اور باندی افضل مالیت کی وجہ سے غرہ کہلاتے ہیں۔ قولہ ”عبد اوامہ“ جر اور رفع دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہیں، جر بنا بر بدیلت اور رفع بنا بر خبریت یعنی ”هو عبد اوامہ“۔ پھر کلمہ ”او“ شک کے لئے نہیں بلکہ اختیار کے لئے ہے۔

تشریح :- آج کل تو غلام نہیں پائے جاتے اس لئے مذکورہ بالا صورت میں پانچ سو درہم بطور دیت لازم ہوں گے جیسا کہ بعض روایات میں اس کا اضافہ بھی مروی ہے جو ایک سال میں ادا کئے جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ میں فریقین کی رعایت فرمائی ہے کیونکہ اگر زندہ بچے کی رعایت کر کے سوا دہ انت لازم فرماتے تو قاتل کے اہل قرابت کہتے کہ بچہ تو مرا ہوا تھا یعنی خود بخود، پھر ہم پر زندہ کی دیت کیسے؟ اور اگر مردہ فرض کر کے اس کا خون بہا معاف فرماتے تو بچے والے کہتے کہ ہمارا بچہ تو زندہ تھا وہ تو اس عورت کے وار کرنے سے ہلاک ہوا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین بین فیصلہ فرمادیا۔

قولہ ”ثم ان المرأة التي قضی علیها بغرة توفیت“ الخ اس عبارت میں اشکال ہے، وہ یہ ہے کہ اگر متوفیہ اس عورت کو قرا دیا جائے جو مضروبہ تھی تو سوال یہ ہے کہ فیصلہ تو اس کے خلاف نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے حق میں تھا پھر ”علیها“ کا کیا مطلب ہے حالانکہ ”علی“ تو اِثْرَام کے لئے آتا ہے اور اگر ضاربہ وجانیہ کو متوفیہ کہا جائے تو اول تو اس کی وفات کے تذکرہ کی کوئی وجہ نہیں اور دوم اس کی میراث کی تخصیص کذا کی بھی کسی بڑے فائدے پر مبنی نہیں۔ پس عام شارحین نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے اور فرمایا کہ متوفیہ دراصل مجبیہ یعنی مضروبہ تھی کیونکہ ایک روایت میں ہے ”فقتلها وما فی بطنها“ الخ اور جہاں تک ”علیها“ کا تعلق ہے تو یہاں علی بمعنی لام کے ہے کافی تو کہ تعالیٰ لکنکونوا شهداء علی الناس“ الخ اس صورت میں باقی تمام ضامتر کا مرجع بھی یہی مجبیہ

ع کذا فی روایۃ ابی داؤد ص: ۲۸۲ ج: ۲ ”باب دية الجنین“ کتاب الدیات. ع کذا فی روایۃ البخاری ”باب جنین المرأة“ کتاب الدیات، ومسلم فی القسامة ”باب دية الجنین“ ابو داؤد فی الدیات باب: ۱۹ والسامی فی کتاب القسامة باب دية الجنین المرأة، بحوالہ دارمی ص: ۲۵۸ ج: ۲ حدیث: ۲۳۸۰، وفی سنن ابن ماجہ: فضربت احدهما الاخری بمسطح فقتلها وفتلت جنینها الخ ص: ۱۹۰ ”باب دية الجنین“ ابواب الدیات. ع سورة البقرة آیت: ۱۷۳.

عورت ہوگی سوائے آخری ضمیر کے جو "علی غصبتہا" میں ہے کہ وہ جانیہ کی طرف راجع ہے، یہ تو جیہ اوپر ترجمہ میں بھی اختیار کی گئی ہے، طبیٰ نے اس کو ظاہر کہا ہے، شیخ نے لغات میں بھی اس کو اختیار کیا ہے، امام نوویؒ نے شرح مسلمؒ میں اس پر جزم کیا ہے کیونکہ دوسری حدیث میں اس کی تصریح کی گئی ہے کما مر۔

حضرت گنگوہی صاحبؒ نے الکواکب میں دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے۔ فمن شاء فليراجع۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر حکم نہیں لگایا ہے مگر یہ صحیح ہے کیونکہ اس کی اصل صحیحین میں موجود ہے۔ یہ حدیث "باب ماجاء فی ویتہ الجنین" میں بھی گذر رہی ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۵ ص: ۳۲۰، ابواب الديات)

باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل

"عن نسیم الداری قال سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما السنة في الرجل من اهل الشرك یسلم علی یدی رجل من المسلمین؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هو أولى الناس بمحواه ومناته"۔ (هذا حدیث لانعرفه الا من حدیث عبد الله بن وهب)

حضرت نسیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مشرکین کے اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو مسلمانوں میں سے کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے؟ (یعنی اس کی میراث کا مستحق کون ہوگا؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حق دار ہے (یعنی) زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔

تشریح:- جس کے ہاتھ پر کوئی شخص مسلمان ہو تو چونکہ مسلمان کرنے والے نے اس کو کفر سے نکالا اور اسلام میں داخل کیا تو گویا مردے کو زندہ کیا اس لئے وہ اس کے ساتھ اس کی حیات اور ممات میں زیادہ قریب سمجھا گیا اور وہ اس کی میراث بھی لے گا اور اس کی طرف سے دیت بھی ادا کرے گا، لیکن یہ حکم اس وقت ہے جبکہ نو مسلم نے باہم معاہدہ اس مسلمان کرنے والے کے ساتھ کر لیا ہو کہ تم میرے بعد میرا تمام مال لے لینا کیونکہ میرے درشہ کا فرہیں اور یہ کہ زندگی میں میرا ساتھ دینا، لہذا جب مسلمان اس نو مسلم کے نفع کا مالک ہو تو اس کے نقصان دیت وغیرہ کا بھی ذمہ دار ہوگا، اور اگر یہ معاہدہ نہ ہو تو بالافتق اس کا مال بیت المال میں اور آج کل جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ذمہ دار دینی مدرسہ میں جمع ہوگا، کیونکہ بیت المال دیگر خیراتی ادارے مسلمانوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں گویا ایسے لا وارث آدمی کے وارث

ضرورت مند مسلمان ہوں گے۔ یہ مذہب حقیقہ کا ہے اور باب کی حدیث ان کی دلیل ہے۔ خفیہ کے نزدیک مذکورہ معاہدے کو مولات یا مولی المولات کہتے ہیں پس اگر یہ معاہدہ نہ ہوا ہو یا اس نو مسلم کے مسلمان ورثہ بھی ہوں تو پھر مال وارثوں کو ہی ملے گا۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس شخص کا مال بیت المال میں جمع ہوگا، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ حدیث الباب کا حکم یا تو شروع اسلام سے متعلق ہے لہذا اب یہ منسوخ ہے یا مطلب اس کا نصرت و مدد کرنا اور نماز جنازہ پڑھانے کا حق ہے، نیز باب کی حدیث ضعیف ہے اس سے احتجاج نہیں ہو سکتا اس کے برعکس ان کا استدلال ”السواء یمن لعتق“ سے ہے جیسا کہ امام ترمذی نے ان سے نقل کیا ہے۔

صاحب بذل الحیو د نے اس حدیث پر کافی بحث نقل کی ہے اس میں ابو زرہ الدمشقی کا قول نقل کیا ہے:

”نری واللہ اعلم ان عبدالعزیز حدیث یحیی بن حمزہ من کتابہ وحدثہم بالعراق من حفظہ وھذا حدیث حسن متصل لم یرا احدا من اھل العلم ینقعه... وفیہ ”وقد احتج بعبدالعزیز المذکور بالبخاری فی صحیحہ وخرج لہ ھو و مسلم وقال یحیی ابن معین عبدالعزیز بن عمر ثقفی وقال ابن عمار ثقفی لیس بین الناس فیہ اختلاف“۔ (بذل ص: ۱۱۳ ج: ۵، کتاب الفرائض ۲)

ہماری طرف سے ان کی مسئلہ حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہر جگہ نہیں یہ تو اس غلام کے لئے ہے جس کے آقا نے اسے آزاد کیا ہو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی وراثت نہیں، غرض یہ حصر جو حضرت بربرہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بیان ہوا اضافی ہے کہ یہود نے شرط لگائی دلاء لینے کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصر اضافی کے طور پر ان کا دعویٰ استحقاق باطل فرمایا۔

اس کے علاوہ مولاۃ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی مجہول النسب آدمی دوسرے مجہول النسب شخص سے ارش (تاوان) اور ارث (میراث پانے) کا معاہدہ کرے، تو اگرچہ معاہدے پر عمل کرنے سے ہر فریق اس کو منسوخ کر سکتا ہے مگر عدم تنفیخ کی صورت میں بیت المال کے مقابلہ میں ان کا آپس میں توارث افضل ہے

باب ماجاء فی الرجل یسلم علی رجل

۱۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط عن علی بن وحی اللہ عنہ حدیث: ۸۵۹ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۴

حدیث: ۷۱۸۳، ایضاً روی بمعانہ الترمذی ص: ۳۸۷ ج: ۲۔

خصوصاً آج کل جب بیت المال و زیر خازنہ کی جیب المال بنا ہے، یہ معاہدہ یک طرفہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اگرچہ معروف المنسب ہو مگر دوسرا مجہول المنسب اپنی ذمہ داری اور وفاداری کا عہد دوسرے سے کرے جو پانچ شرائط سے مشروط ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ص: ۸۷۵ ج: ۱۰)

دوسری حدیث:- ”عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ايمار رجل عاقر بغيره او امة فالولد ولد الزنا لا يرث ولا يورث“۔^۱ (والعمل على هذا عند اهل العلم ان ولد الزنا لا يرث من ابيه)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی کسی آزاد عورت یا باندی سے زنا کرے تو وہ بچہ (جو زنا سے پیدا ہوا) زنا کا بچہ کہلائے گا جو نہ تو (باپ یعنی زانی کا) وارث بنے گا اور نہ ہی اس کی میراث زانی کو ملے گی۔

لغات:- قولہ ”عاقر“ عمر سے بھٹی زنا کے، چونکہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا اس لئے یہ بچہ زانی کے حوالے سے کالعدم تصور کیا جائے گا لہذا اس کا باپ سے اور اس کے اقربہ وغیرہ سے کسی قسم کا توارث نہیں چلتا و بالعکس حتیٰ کی اگر زانی اس بچہ کو اپنے گھر میں رکھ بھی لے اور پرورش بھی کرے جب بھی میراث ثابت نہ ہوگی، تاہم ملا عنہ عورت اپنے بچے کی وارث ہوتی ہے و بالعکس جیسا کہ باب کی آخری حدیث میں مصرح ہے۔

باب من يرث الولاء

”عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: يرث الولاء من يرث المال“۔^۲ (هذا حديث ليس اسناده بالقوى)

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ولاء کی وراثت اسی کی ہے جو مال کا وارث ہوتا ہے۔ لغات:- قولہ ”ولاء“ یفتح الواو غلام کا وہ مال جو آزاد ہونے کے بعد اس نے حاصل کیا ہو اور اس کے مرنے کے بعد رہ جائے، نیز اس استحقاق و کفالت کو بھی ولاء کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں لفظ ”نفس“ میں عصبہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ولاء کا حق صرف ان لوگوں

۱۔ بعضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۱۹۷ ابواب النکاح۔

باب من يرث الولاء

۲۔ رواہ احمد فی مسنده ص: ۶ ج: ۱ حدیث: ۳۲۶۱ وفی رواۃ: يرث المال من يرث الولاء۔ رواہ احمد ص: ۳۹ حدیث: ۱۳۸۔

کو ہے جو مال کے مستحق ہیں مگر بطور عصوبت کے لہذا عورتیں ولاء کی مستحق نہیں مثلاً کسی نے غلام آزاد کر لیا پھر دونوں مر گئے اور غلام کا کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو ولاء مستحق بالکسر کے بیٹے کو ملے گی بیٹی کو نہیں، ہاں اگر کوئی عورت غلام آزاد کر دے تو بلاشبہ وہ اپنے مولیٰ اسفل کی ولاء کی مستحق اور وارث ہوگی۔

یہ روایت دیگر طرق سے بھی مروی ہے لہذا قابل حجت ہے۔

آخری حدیث:۔ "عن واثلة بن الاسقع قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المرأة تحوز ثلاثة موارث عتيقها ولقيطها وولدها الذي لا عنت عنه"۔^۱ (هذا حديث حسن غريب)
حضرت واثلة بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ عورت تین قسم کی میراث جمع کر سکتی ہے اپنے آزاد کردہ غلام کی اور لا وارث بچے کی میراث جو وہ کسی جگہ سے اٹھائے ہوئی ہو اور اس بچے کی میراث جس کے حوالے سے وہ لعان کر چکی ہو۔
لغات:۔ بقولہ "تحوز" بمعنی تجمع وناخذ یعنی لیتی ہے۔

تشریح:۔ جہاں تک آزاد کردہ غلام کی میراث کا تعلق ہے تو اس کا بیان اوپر بھی ہوا کہ معتقہ بالکسر اپنے معتق بالفتح کی میراث لے گی، بشرطیکہ دوسرے ورثہ غلام کے نہ ہوں، اس پر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم کا عمل تھا اور صحیح حدیث میں ہے "الولاء لمرءى اعتق"۔^۲ اس میں "مرءى" عام ہے عورتوں کو بھی شامل ہے، البتہ لقیط کی میراث اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی کیونکہ یہ روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہے قوی روایات کو ترجیح دینا افضل ہے جن کے مطابق سب تو ریث نسب یا مولات ہے جو یہاں نہیں ہے البتہ چونکہ اس عورت نے بچے کی دیکھ بھال کی ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہے اگرچہ اصولی طور پر اس کی میراث بیت المال میں جمع ہونا چاہئے۔ کامرئی "باب ما جاء في الذي يموت وليس له وارث"۔ اور آخری حکم تو بدیہی ہے کیونکہ اگر شوہر نے لعان کی وجہ سے نسب سے انکار کیا ہے تو عورت تو منکر نہیں لہذا جزئیت کی بناء پر میراث ثابت ہوگی نیز ماں کا حصہ قرآن میں مقرر ہے اس میں لا عنت کا استثناء نہیں ہے۔ تدبر آخر الفرائض

۱۔ ابھارواہ ابو داؤد ص: ۳۷۰ ج: ۲ "باب میراث ابن المملأنة" کتاب الفرائض متن ابن ماجہ ص: ۱۹۷ ابواب الفرائض، ابھارواہ احمد فی مسندہ ص: ۵۳۳ ج: ۳ حدیث: ۱۵۵۷۳، رواہ الحاكم فی المستدرک ص: ۲۵۹ ج: ۵ حلیہ: ۸۱۵۴۔ ۲۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط، کلا فی مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۴۔

ابواب الوصایا

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

باب ماجاء في الوصية بالثلث

"عن عامرين سعد بن ابی وقاص عن ابيه قال مرضت عام الفتح مرضاً شفيبت منه على الموت فاتاني رسول الله صلى الله عليه وسلم يعودني فقلت يا رسول الله! إن لي مالاً كثيراً وليس يرثني إلا ابنتي فاوصاني بمالي كله؟ قال: "لا" قلت "فثلثي مالي؟" قال: "لا" قلت "فالشطر؟" قال: "لا" قلت "فالثلث؟" قال: "الثلث والثلث كثير" إنك ان تذر وراثتك اغنياء غير من ان تذرهم غالة يتكففون الناس، إنك لن تنفق نفقة إلا انحرت فيها حتى اللقمة ترفعها الي في امرأتك، قال قلت يا رسول الله أخلفت عن هجرتي؟ قال: إنك لن تخلف بعدى فتعمل عملاً تريد به وجه الله إلا ازددت به رفعة ودرجة ولعلك ان تخلف حتى يتفجع بك اقوام ويضربك آخرون، اللهم امض لاصحابي هجرتهم ولا تردهم على اعقابهم لكن البائس سعد بن خولة يرثي له رسول الله صلى الله عليه وسلم ان مات بمكة" (حسن صحيح)

حضرت عامر بن سعد اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں فتح مکہ والے سال بیمار ہو گیا، بیماری ایسی تھی کہ میں موت کے خطرے سے دوچار ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کرنے میرے پاس تشریف لائے، پس میں نے کہا اے اللہ کے رسول! میرے پاس بہت سارا مال ہے اور سوائے ایک بیٹی کے میرا کوئی دوسرا وارث (ذوی القروض میں سے)

ابواب الوصایا عن رسول الله ﷺ

باب ماجاء في الوصية بالثلث

۱۔ الحديث أخرجه أيضاً البخاري ص: ۳۸۳ ج: ۱ كتاب الوصايا، ومسلم في كتاب الوصية، وابوداؤد في كتاب الوصايا "باب ماجاء فيما لايجوز للوصي في ماله" والسائي في كتاب الوصايا "باب الوصية بالثلث" ومالك في الموطا في كتاب الوصية "باب الوصية بالثلث لا تصدى" بحواله سنن دارمي ص: ۵۰۰ ج: ۲ حديث: ۳۱۹۶.

نہیں ہے تو کیا میں پورے مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“۔ میں نے کہا دو تہائی مال کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“ میں نے کہا آدھے کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“ میں نے عرض کیا تو ایک تہائی مال کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کہ تہائی دے دو اور تہائی بھی بہت ہے“، بلاشبہ اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑ دو تو یہ ان کے محتاج چھوڑنے سے جو کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں افضل ہے، بے شک تم کوئی چیز خرچ نہیں کرتے مگر اس پر ضرور تمہیں ثواب دیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ نوالہ جسے اٹھا کر تم اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو (اس پر بھی اجر ملتا ہے) حضرت سعد فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنی ہجرت سے پیچھے رہ جاؤں گا؟ یا پیچھے ہٹ گیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک تم اگر میرے بعد زندہ رہے اور کوئی ایسا عمل کیا جس سے تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہو تو اس سے تیری بلندی اور مرتبے میں ضرور اضافہ ہوگا، اور امید رکھو کہ تم زندہ رہو گے اس وقت تک کہ فائدہ اٹھائیں گی تم سے کچھ قومیں اور نقصان پائیں گی دوسری اقوام، (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی) اے اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو باقی رکھ اور ان کو نہ لوٹا لے پاؤں لیکن بے چارے سعد بن خولہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افسوس فرماتے کہ ان کی موت مکہ میں ہوئی تھی۔ (بعد ہجرت ہوئی تھی یا قبل ہجرت؟ اس میں دونوں قول ہیں۔)

لغات: فقولہ ”الوصایا“ وصیہ کی جمع ہے جیسے عطایا جمع عطیہ وعدہ یا عہدہ کی، ہجر اور مزید دونوں سے استعمال ہوتا ہے، ہجر سے ملنے کے معنی میں اور مزید خواہ باب افعال سے ہو یا تفعیل سے ملانے، پہنچانے اور سوچنے کے معنی میں آتا ہے، گویا وصیت کرنے والے نے کسی کے ذمے کچھ حق پہنچانے کا کام لگایا ہے، جبکہ عربی معنی وہی ہیں جو مشہور ہیں۔

قولہ ”اشفیت“ یعنی قریب ہو گیا تھا خطرے کے درپیش ہونے کے وقت استعمال ہوتا ہے فقولہ ”عالة“ عائل کی جمع ہے بمعنی فقیر محتاج کے فقولہ ”تکففون“ تکف بمعنی تھیلی کے، مطلب یہ ہے کہ وہ تھیلیاں پھیلا کر مانگیں۔

قولہ ”احلف“ اسی اہمی خلافا یعنی میں اپنی ہجرت کو جاری نہ رکھ سکوں گا اور پیچھے مکہ ہی میں وفات پا کر رہ جاؤں گا؟ یا مطلب یہ ہے کہ آپ سب لوگ مدینہ منورہ چلے جائیں گے اور میں یہاں مکہ میں رہ جاؤں گا؟

قولہ "البائس" بقیس سے ہے خستہ حال محتاج اور مصیبت زدہ کو کہتے ہیں۔ قولہ "یونئی" رشیک الحیث مرثیہ نوحد سرائی کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث کی شرح پہلے گزری ہے۔ (دیکھیے تشریحات ج: ۳، ص: ۲۳۴، باب ماجاء فی الوصیۃ بالثلث والرابع) یہاں ضروری شرح پیش ہے۔ ترمذی کی روایت میں سفیان بن عیینہ سے وہم ہوا ہے کیونکہ امام زہریؒ کے باقی تمام شاگرد اسے حجۃ الوداع کا واقعہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ صحیحین میں ہے۔ اور حضرت سعدؓ نے جو فرمایا کہ میری صرف ایک بیٹی ہے تو مطلب یہ ہے کہ متعین حصہ صرف بیٹی لے سکتی ہے باقی عصبہ کی نفی مراد نہیں ہے اور چونکہ بیٹی کا نان نفقہ اور سنگنی تو شوہر کے ذمہ ہوتا ہے لہذا کیوں نہ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں؟

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا مقصد یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ثواب فقط صدقہ سے ملتا ہے بلکہ وہ تو خرچ کرنے سے بھی ملتا ہے خواہ آدمی اپنی زندگی کے بعد ورثہ کے پاس چھوڑے یا اپنی حیات میں بہ نیت ثواب کسی کو کھلائے حتیٰ کہ اپنی بیوی کو کھلانا جہاں خواہش کی تکمیل بھی ملحوظ ہوتی ہے باعث اجر و ثواب ہے۔

عام طور پر مریض موت کا تذکرہ کرتے وقت زیادہ خطرہ محسوس نہیں کرتا مگر جب دوسرے لوگ اس کے سامنے موت کا ذکر کریں تو وہ گھبرا جاتا ہے اس لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وصیت کو منظور فرمایا تو وہ موت کے بارے میں زیادہ حساس ہو گئے اور ڈر گئے کہ اگر مکہ میں موت آگئی تو سفر کی موت اور وہ بھی حرم مکی میں تو اپنی جگہ مگر ہجرت کا مرتبہ تو کہیں بلند ہے وہ فوت ہو جائے گا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان کو تسلی دلائی بلکہ خوشخبری بھی سنائی جو سو فیصد درست ثابت ہوئی کہ وہ بعد میں تقریباً ۵۰ھ تک بقید حیات رہے، فاتح قادیسیہ کے نام سے مشہور ہو گئے بلکہ فاتح فارس، ایران و عراق بن گئے، ان کی وجہ سے دشمنوں کو نقصان اٹھانا پڑا اور بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کو بے شمار غنائم ملے، اس کے بعد ان کا انتقال ہوا اور چار بیٹے چھوڑ کر منزل مقصود تک جا پہنچے۔ چنانچہ باب کی روایت بھی ان کے صاحبزادے سے مروی ہے۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ لوگ بعد میں راہ حق سے کنارہ کشی اختیار کریں گے خواہ کلی ہو یا جزوی جیسا کہ فقہ ارتداد میں ہوا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کے لئے دعا فرمائی جو اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوئی اور تمام مخلصین صحابہ کرامؓ اس فتنے سے محفوظ ہوئے۔ ابن العربیؒ عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ مرتدین انصار و مہاجرین کے علاوہ تھے: "وذلك في غير الرهط الكرم والوسط الصميم

من المهاجرین والانصار۔“

اس حدیث سے ان صحابہ کرامؓ کی رائے کو تقویت ملی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مابعد والے اعمال پر ثواب ملنے کے قائل تھے جبکہ حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی وہ سمجھتے تھے کہ ہماری نیکیاں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے کی ہیں اگر وہ کوتاہیوں کے برابر سراب ہوں گی تو بھی زہے قسمت۔

رہا وصیت بالثلث کا مسئلہ تو یہ پہلے گزرا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ثلث کی وصیت بالاتفاق جائز ہے، ابن العربیؒ نے اس کی نفی والے قول کو جہل کہا ہے البتہ اگر ثلث سے کم کی وصیت کر دے تو یہ افضل ہے خاص کر جب ورثہ محتاج ہوں عارضہ میں ہے: ”وقال الشافعی: ان كان ورثته فقراء أحییث ان لا یستوعب الثلث۔“ جبکہ متین ہدایہ میں ہے کہ ثلث سے کم کی بہر حال مستحب ہے:

”قال ای القسوری: ویستحب ان یوصی الانسان بثلث سواء كانت

الورثة اغنیاء او فقراء لان فی التتقیص صلة القربى بترك ماله علیهم“ فتح۔

البتہ اگر کسی نے ثلث سے زیادہ کی وصیت کی یا وارث کے لئے کی اور باقی ورثہ اس پر راضی ہوں ان میں بچہ اور یتیم نہ ہو یا کوئی وارث اپنے حق سے دستبردار ہو کر اجازت دیدے تو وہ بھی نافذ ہو جائے گی، متین ہدایہ اور ہدایہ میں ہے:

”ولا تحوز بما زاد علی الثلث الا ان یحیزها الورثة بعد موتہ وهم كبار لان الامتناع

لحقهم وهم اسقطوه... ولا تحوز لوارثه... الا ان یحیزها الورثة ولو جاز بعض

ورثہ بعض تحوز علی المحیز بقلہ حصتہ لولا یتہ علیہ وبطل فی حق الراذ الخ۔

(ہدایہ، کتاب الوصایا ج ۳: ص ۵۶۳)

اشکال:- نوہ سرائی سے تو ممانعت آئی ہے خصوصاً میت کے مرثیہ کے بارے میں تو مسند احمد میں

روایت ہے: ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المراثی“۔^۱

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ ممنوع مرثیہ وہ ہے جو موت کا صدمہ دوبارہ بیدار کرے یا اجتماعی

۱۔ مسند احمد ص: ۴۷۵ ج: ۵ حدیث: ۱۸۶۵۹، ایضاً ص: ۵۱۸ ج: ۵ حدیث: ۱۸۹۲۵، ایضاً رواہ ابن ماجہ فی

سننہ ص: ۱۱۳ عن ابن ابی اوفی قال نہی رسول اللہ ﷺ عن المراثی ”باب ماجاء فی البكاء علی الميت“ ابواب الجنائز۔

دائیاتام کے ساتھ ہو یا کثرت سے ہو، جیسا کہ محرم الحرام میں شیعہ کرتے ہیں یا عام لوگوں میں بری منانے کا رواج فروغ پا چکا ہے، جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن خولہؓ پر اظہارِ افسوس کر رہے ہیں نو حد سرائی نہیں فرما رہے کیونکہ ان کی وفات ہجرت کے بعد مکہ میں ہوئی تھی جیسا کہ عارضہ میں ہے: "لَسَافَاتِهِ مِنَ الثَّوَابِ فِی مَوْتِهِ بِمَكَّةَ النَّبِیِّ كَانَ خَرَجَ عَنْهَا مَكْرَمًا"۔ یعنی یہ افسوس ہجرت کے ثواب کے فقدان پر ہے کہ کاش ان کو یہ ثواب بھی پورا مل جاتا۔

باب ماجاء فی الضرار فی الوصیة

"عن ابی ہریرۃ انه سئل عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الرجل ليعمل للمرأة بطاعة اللہ ستین سنة ثم يحضرهم الموت فیضار ان فی الوصیة فیحب لهما النار ثم قرأ علی ابو ہریرۃ "من بعد وصیة یوصی بہا الوثن غیر مضار" وصیة من اللہ الی قوله... ذلک الفوز العظیم"۔ (حسن غریب)

شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرد یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں پھر جب ان کو موت آنے لگتی ہے تو وہ وصیت کرنے میں ضرر پہنچاتے ہیں اس طرح ان کے لئے جہنم واجب ہو جاتی ہے، پھر ابو ہریرہؓ نے یہ آیت پڑھ کر مجھے سنائی "من بعد وصیة" الخ۔

تشریح:- ہمارے پاس موجود ترمذی کے نسخوں میں یہاں باب کا عنوان نہیں ہے مگر امام ترمذیؒ کے طرزِ عمل کے مطابق باب ہونا چاہئے جیسا کہ صاحب عارضہ و تحفہ دونوں نے نقل کیا ہے اس کی وجہ پہلے رفع یدین عند الركوع کے باب میں گذری ہے، نیز ان دونوں شروح کے متن پر اس حدیث کی تصحیح منقول ہے: "قال ابو عیسیٰ هذا حدیث حسن صحیح غریب" الخ۔

یہاں ساٹھ سال سے اوسط عمر مراد ہے اور جہنم کا واجب ہونا از قبیل خاصیت المفرد ہے جس کا تذکرہ بارہا گذرا ہے یعنی اس عمل کی اپنی خاصیت اور تاثیر یہ ہے کہ ایسا کرنے والا لازمی طور پر جہنمی ہو اگرچہ حساب تو تمام اعمال کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے گا۔ تدر

وصیت میں ضرر کا مطلب وارث کو کسی طرح حق تلفی کر کے ناراض کرنا ہے جس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً وارث کو کلّی یا جزوی طور پر محروم کرنا کسی کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے جھوٹا اقرار بالمال کرنا وغیرہ۔

باب ماجاء فی الحث علی الوصیة

”عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما حق إمير مسلم بيت ليلتين وله ما يوصى فيه الا ووصية مكتوبة عنده“۔^۱ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لائق نہیں ہے کسی مسلمان کے لئے کہ وہ دو راتیں گزارے اور اس کے پاس قابل وصیت کوئی چیز موجود ہو مگر اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہئے۔

تشریح:۔ اس متن حدیث حدیث کی دو ترکیبیں ”باب ماجاء فی الحث علی الوصیة“، ”من ابواب البجائز“ میں گذری ہیں۔ (ظہیر الحج تشریحات ترمذی ج ۳ ص ۲۳۲) اس حدیث کی جو تشریح وہاں کی گئی ہے وہ کافی ہے، یہاں اس کا خلاصہ پیش ہے: ظاہر یہ کہ نزدیک وصیت کرنا واجب ہے۔ حدیث باب سے ان کا استدلال ہے، علاوہ ازیں یہ آیت بھی بظاہر ان کی مستدل ہے: ”کُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اَنْ تَرِثَ خَيْرَ اَنْ الْوَصِيَّةِ لِلْاَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ“۔^۲ ”جمہور کے نزدیک اگر کسی کے مرنے کا واجب الاداء حقوق ہوں تو پھر تو اس کے متعلق آگاہی اور وصیت واجب ہے ورنہ ضروری نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر صحابہ کرامؓ نے وصیتیں نہیں کی ہیں، جو عدم وجوب کی بڑی دلیل ہے۔ حدیث الباب کا جواب یہ ہے کہ مسلم کی روایت میں ”لہ شیء یرید ان یوصی فیہ“۔^۳ کے الفاظ ہیں اور ارادہ وجوب کی نفی کرتا ہے، آیت کا حکم منسوخ ہے ناخ یأیت ہے: ”یوصیکم اللہ فی اولادکم“۔^۴ الخ یا یہ حدیث ہے ”لا وصیة لوارث“۔^۵ جبکہ آیت میں والدین کا ذکر ہے جو کہ ورثہ ہیں۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے

باب ماجاء فی الحث علی الوصیة

۱۔ الحدیث أخرجه البخاری ص: ۳۸۲ ج: ۱ کتاب الوصایا، صحیح مسلم ص: ۳۹ ج: ۲ کتاب الوصیة، ابو داؤد کتاب الوصایا ”باب ماجاء فیما یؤمر به من الوصیة“ متن نسائی کتاب الوصایا ”باب الکراهیة فی تأخیر الوصیة“ موطا مالک کتاب الوصیة ”باب الامر بالوصیة“ متن دارمی ص: ۳۹۵ ج: ۲ حدیث: ۳۱۷۵۔ ع۔ سورة البقرة آیت: ۱۸۰۔ ع۔ صحیح مسلم ص: ۳۹ ج: ۱ کتاب الوصیة۔ ع۔ سورة النساء آیت: ۱۱۔ ع۔ رواہ ابن ماجہ ص: ۱۹۵ ابواب الوصایا، متن ابی داؤد ص: ۴۰ ج: ۲ کتاب الوصیة، متن نسائی ص: ۲۳۱ ج: ۲ ”باب ابطال الوصیة للوارث“ ابواب الوصایا، ابیہ مستند احمد ص: ۲۰۳ ج: ۵ حدیث: ۱۷۲۱۰، اعلاء السنن ص: ۳۰۱ ج: ۱۸ کتاب الوصایا۔

کہ امام شافعیؒ اس حدیث کو باوجود ضعف کے ناسخ مانتے ہیں تعامل الائمة والامة یہ۔

امام ترمذیؒ نے بھی جمہور کے موقف کے مطابق دونوں جگہوں میں ایک ہی طرح باب کا ترجمہ مرتب کیا ہے اور اس میں ”حش“ کا لفظ لائے ہیں جو ترغیب اور ابھارنے کے لئے آتا ہے نہ کہ وجوب کے لئے، نیز آگے باب باندھا ہے۔

باب ماجاء ان النبی ﷺ لم یوص

”عن طلحة بن مصرف قال قال ابن ابی اوفی: أوصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال ”لا“ قلت وکیف نکیبت الوصیة وکیف أمر الناس؟ قال اوصی بکتاب اللہ تعالیٰ“۔ (حسن صحیح) ۱

طلحہ بن مصرفؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن ابی اوفیؒ سے دریافت کیا کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، میں نے پوچھا پھر (قرآن میں) وصیت کیسے فرض کی گئی؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کا حکم کیسے دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ پر عمل کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔

تشریح:- حضرت طلحہ بن مصرفؒ کا سوال یا تو مالی وصیت کے بارے میں تھا جیسا کہ دوسرے سوال کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے جو دو حوالے دیئے ہیں ان دونوں میں مالی وصیت مراد ہے یا پھر حضرت علیؑ کی خلافت کے متعلق پوچھنا مقصود تھا کیونکہ شیعہ نے یہ بات مشہور کر دی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ کے بارے میں خلافت کی وصیت فرمائی تھی اور ٹکٹ مال کی بھی، چنانچہ یہی سوال حضرت علیؑ اور حضرت عائشہؓ سے بھی ہوا تھا اور دونوں نے نفی میں جواب دیا تھا۔

بہر حال جب حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؒ نے نفی میں جواب دیا تو اگرچہ یہ نفی والا جواب عام نہیں تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی وصیتیں فرمائی تھیں جیسے یہود و نصاریٰ کا جزیرۃ العرب سے اخراج، وفود سے حسن سلوک، لشکر اسامہ کی روانگی، انصار کے ساتھ نیک برتاؤ وغیرہ مگر بظاہر یہ لفظ یعنی کلمہ

”لا“ عموم نفی پر دلالت کرتا ہے اس لئے انہوں نے پھر سوال کیا کہ قرآن میں جو وصیت کا حکم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو وصیت کا جو حکم فرمایا تو کیوں نہ انہوں نے خود ایسا کیا؟

جواب ثانی کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں تو یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس خیر یعنی مال ہو تو وہ وصیت کرے، وہ بھی منسوخ ہے۔ کلمہ۔ اور حدیث کا بھی وہی مطلب ہے جیسا کہ باب سابق میں گذرا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مال تھا ہی نہیں اور جتنا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کیا اور صدقہ کرنے کا حکم دیا، ہاں البتہ نفس وصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جو کتاب اللہ کو تھامنے اور اس پر عمل کرنے کے بارے میں ہے، اور اس حدیث سے باقی وصایا کی نفی مراد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علاوہ کوئی وصیت نہیں فرمائی بلکہ پہلے سوال کے جواب میں لفظ ”لا“ عام والمراد منه الخاص اور دوسرے میں کتاب اللہ خاص والمراد منه العام ہے اور بلاغت میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کبھی مراد متکلم مراد کلام سے عام ہوتی ہے اور کبھی خاص۔ والقاعدة مشہورۃ ومعروفة۔ تو جس طرح ”من قال لا اله الا الله دخل الجنة“ کے میں رسالت بھی مراد ہے کیونکہ لا اله الا الله تو حید و رسالت دونوں کے لئے اسم علم بن گیا ہے جیسے الحمد شریف پوری فاتحہ کا نام ہے تو اسی طرح کتاب اللہ بھی قرآن و سنت دونوں کا اسم علم ہے۔ لفظ

باب ماجاء لا وصية لوارث

”عن ابی امامۃ الباہلی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی خطبته عام حجة الوداع: ان اللہ تبارک وتعالیٰ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث، والولد للفراش وللمعاهر المحرور حسابہم علی اللہ تعالیٰ ومن ادعی الی غیر ابیہ وانتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ التابعة الی یوم القيمة لا تنفق امرأۃ من بیت زوجها الا باذن زوجها قبل یرسل اللہ ولا الطعام؟ قال: ذاک افضل اموالنا وقال العارۃ مؤذاة والمنحة مردودة والدين مقضى والزعم غارم۔“

(هذا حديث حسن)

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ج. انخرجه الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۱۶۳، والاوسط حدیث: ۲۴۲۶ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۳۴ ج: ۱

حدیث: ۲۲، ایضاً راجع للاحدیث جمع الفوائد ص: ۱۶ ج: ۱ کتاب الایمان، دار الکتب العلمیۃ بیروت.

کو حجۃ الوداع کے سال فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا پس اب کسی وارث کے لئے وصیت نہیں، اور بچہ صاحب فراش (خاوند) کا ہے اور زانی کے لئے پھر ہے اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے اور جو شخص اپنی نسبت غیر باپ کی طرف کرے یا کوئی غلام اپنا انتساب غیر آقاؤں کی جانب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت ہوگی جو قیامت تک اس کے درپے رہے گی، کوئی عورت خرچ نہ کرے اپنے شوہر کے گھر (مال) سے مگر اپنے شوہر کی اجازت سے، دریافت کیا گیا ”اے اللہ کے رسول کھانا بھی نہیں دے سکتی؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو ہمارے اسواں کا بہتر حصہ ہوتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مائگی ہوئی چیز واپس کی جائے گی (یعنی بلا کی بیٹی کے) اور دودھ والے جانور کو (یا مثلاً درخت وغیرہ) واپس کیا جائے گا اور دین ادا کیا جائے گا اور کفیل ذمہ دار ہے۔

تشریح:۔ قوله ”ان الله تبارک و تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث“ قدیم عربوں میں وصیت کا دستور تھا اسلام کے اوائل میں یہ حکم فرض تھا مگر جب میراث کے احکام نازل ہوئے تو وارث کے لئے وصیت ختم کر دی گئی کیونکہ جب ہر آدمی کو اس کا حصہ مل گیا تو پھر اس کے لئے وصیت کی ضرورت ختم ہو گئی لہذا اب ماں باپ وغیرہما کے لئے وصیت کی چنداں ضرورت نہیں، یہ حدیث معنی کے اعتبار سے محکم و متواتر ہے مگر چہ سند آتی تو یہ نہیں، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں: ”صحیح اجمعت الامۃ علی صحۃ الخبر و هو ناسخ الآیۃ بالاجماع“ اسی طرح امام شافعی اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

”حدیث لا وصیۃ لوارث انه لا یثبتہ اهل الحدیث ولكن العامة تلقیہ بالقبول

و عملوا به حتی جعلوه ناسخاً لآیۃ المیراث“۔ (تفسیر المصابیح: ۲۳)

قوله ”الولد للفراش“ الخ یعنی جس کے فراش پر بچہ پیدا ہو خواہ وہ فراش بیوی ہو یا باندی تو اس کی نسبت شوہر یا آقا کی طرف ہوگی زانی محروم ہوگا۔ قوله ”و حسابہم علی اللہ“ یہ دفع تو ہم ہے کہ اگرچہ اس میں ولد الزنا ہونے کا احتمال ہے مگر وہ تو ایک خفیہ معاملہ ہے، اس کا حساب اللہ کے پاس ہے۔ جہاں تک ضابطے کی بات ہے تو وہ یہ ہے کہ حتی الامکان بچے کا نسب صاحب فراش سے ثابت مانا جائے گا۔ قوله ”ومن ادعی ہٰی غیرہ“ الخ یعنی اس واضح اور صاف ضابطے کے باوجود جو شخص اپنا نسب غیر شرعی باپ یا آقا کی طرف منسوب کرے گا تو وہ ملعون ہوگا۔ الولد للفراش کی تفصیل پہلے گزری ہے (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۳۳، باب ما جاء ان الولد للفراش، من ابواب الرضاع)

قوله "لا تنفق امرأة من بيت زوجها إلا باذن زوجها" یعنی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے اور اپنے من پسند لوگوں کو شوہر کے مال میں سے کچھ نہیں دے سکتی کیونکہ ملک زوج کی ہے اور کسی کی ملک میں اس کے اذن کے بغیر تصرف جائز نہیں البتہ اذن، عام ہے خواہ صراحتاً ہو یا دلالت دونوں صورتوں میں بقدر اذن دے سکتی ہے اس میں پکا ہوا کھانا اور طعام یعنی غیر مطبوخہ چیز جس کے بارے میں سوال پوچھا گیا ہے برابر ہے۔ یہ مسئلہ بھی تفصیلاً پہلے گزرا ہے اگر چاہیں تو دیکھئے (تشریحات ج ۳ ص ۱۵۷، باب ما جاء في نفقة المرأة من بيت زوجها، من ابواب الزکوة)

قوله "العارة مؤداة" یعنی مستعار اور مانگی ہوئی چیز مالک کو واپس دینا ضروری ہے۔ قوله "والمنحة مرسودة" منحة اور منیجہ وہ جانور یا درخت اور قرض پیسے وغیرہ ہیں جو کسی کو اپنی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے دیئے جائیں مثلاً دودھ کچھ مدت کے لئے حاصل کر لیا یا پھل دار درخت دے دیا اور جب اس نے دودھ کچھ مدت کے لئے حاصل کر لیا اور درخت کا پھل توڑ لیا تو پھر اصل کو واپس دے دیا یہ جائز ہے اور مستفید کو اس پر قبضہ یا دعویٰ ملک کی اجازت نہیں ہے۔

قوله "والذم من مفضی" دین واجب الاداء ہے۔ قوله "والزعم غارم" کفیل ذمہ دار اور ضامن ہے حدیث کے یہ آخری تینوں احکام اتفاقی ہیں جبکہ "العارة مؤداة" میں اختلاف ہے کہ آیا بلا تعدی ہلاک ہونے کی صورت میں تاوان ہے یا نہیں؟ جبکہ تعدی میں بالاتفاق تاوان ہے تو شافعیہ و حنابلہ کے نزدیک دونوں صورتوں کا حکم یکساں ہے یعنی تاوان بھرنا پڑے گا جبکہ حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک بغیر تعدی کی صورت میں تاوان اس لئے نہیں ہے کہ یہ امانت ہے فحکمہا حکمہا اس مسئلے کی تفصیل بھی پہلے گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۱۹۸، باب ما جاء ان العارية مؤداة، من ابواب المہر)

حدیث عمرو بن خارجہ: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب علی ناقته و انتاحت جرائنا و هو تقصع بحرثنا و ان لعابها یسبل بین یمینی فسمعتہ یقول ان اللہ عزوجل اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیة لوارث والولد للفراش وللعاهر المحرم۔^۱

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر خطبہ

باب ما جاء لا وصیة لوارث

ارشاد فرمایا جبکہ میں اس کے گلے کے نیچے تھا اس وقت وہ جگالی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے دونوں شانوں کے درمیان فیک رہا تھا پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ اللہ عزوجل نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے پس وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں اور بچہ صاحب فراش کا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے۔

تشریح: قولہ ”جران“ ہنسی کی ہڈی سے لے کر گلے کے اس حصے تک ہوتا ہے جس میں اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے یعنی مذبح و منحر کے مابین۔ قولہ ”تفصع“ بمعنی تجلّع۔ قولہ ”بجرتھا“ الحجرة بالکسر، وہ محلول جو سفید جھاگ کی مانند ہوتا ہے اسے جگالی کہتے ہیں، یہ وہ جانور کرتے ہیں جن کے اوجھ میں دو خانے ہوتے ہیں اس سے حلال و حرام کے فرق کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

قولہ ”وان لعاہا یسیل“ الخ راوی کا اس طرح بیان کرنا یا تو تلذذ کے لئے ہوتا ہے کہ وہ منظر کتنا حسین ہوگا کہ جہاں رحمۃ اللعالمین اور شفیق المذنبین ہوں اور جان نثاران مؤمنین کا ٹھہر مٹ اور حرم پاک کی سرزمین ہو یہ نظارہ یقیناً ستاروں کے درمیان ماہتاب کے جلوے سے زیادہ پر نور ہوگا جو اس میں ایک بار حاضر رہا آفتاب دو عالم کے بعد وہ اس منظر کو کیسے بھول سکتا ہے اور اسے یاد کر کے کیوں نہ وہ محظوظ ہوگا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بتلانا مقصود ہو کہ یہ روایت مجھے اچھی طرح یاد ہے حتیٰ کہ وہ وقت اور حالت بھی مجھے یاد ہے تو کیوں ضروری و بنیادی بات یاد نہ ہوگی۔ وغیرہ الک من الوجہ۔

اونٹنی پر خطبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے در نہ عام لوگوں کے لئے جانور کی پشت بطور منبر استعمال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے۔

باب ماجاء یبدأ بالدين قبل الوصية

”عن علی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی بالدين قبل الوصية وانتم تقرؤن الوصية قبل الدين“۔^۱

باب ماجاء یبدأ بالدين قبل الوصية

۱۔ وفی الدارمی: حدثنا قہیصہ حدثنا سفیان عن سمع ابراہیم قال یبدأ بالکفن ثم بالدين ثم بالوصية ص: ۵۰ ج: ۲ حدیث: ۳۲۳۹۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی ادائیگی کا فیصلہ وصیت (پر عمل درآمد) سے پہلے فرمایا تھا اور تم تو وصیت دین سے پہلے پڑھتے ہو، یعنی اس آیت "من بعد وصیة یوصین بہا لدین" کے بغیر ہائیں۔

تشریح:- جیسا فرماتے ہیں یہ اخبار بمعنی انشاء ہے یعنی تم لوگ اس آیت میں وصیت جو پہلے پڑھتے، سنتے اور دیکھتے ہو تو اس کا مطلب سمجھا کرو کہ دین مقدم ہے حکماً واداءً مگو مؤخر ہے ذکر، پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وصیت کی تقدیم اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے ہے۔ (دیکھئے "باب ماجاء فی میراث الاخوان من الاب والام"۔ نیز وہاں حدیث کی سند کے متعلق بھی کلام دیکھا جاسکتا ہے۔)

باب ماجاء فی الرجل یتصدق او یعتق عند الموت

"عن ابی حبیبة الطائی قال اوصی الی اخی بطائفة من ماله فلقیت ابالدرءاء فقلت ان اخی لوصی الی بطائفة من ماله فاین ترى لی وضعة فی الفقراء والمساکین والمجاهدین فی سبیل اللہ؟ قال: اما انا فلو کنک لم اقبل بالمجاهدین سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: منقل الذی یعتق عند الموت تمکل الذی یهدی اذ اشبع"۔ (حسن صحیح)

ابو حبیبة طائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے کچھ حصے کی مجھے وصیت کی تھی (یعنی صدقہ کرنے کی) تو میری ملاقات حضرت ابو درداء (رضی اللہ عنہ) سے ہوئی، میں نے ان سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنے مال کے ایک حصے کے بارے میں مجھے وصیت کی ہے تو آپ کی رائے میں میرے لئے وہ کس مد میں خرچ کرنا مناسب ہے فقراء و مساکین میں یا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں میں؟ انہوں نے فرمایا جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو میں مجاہدین کے برابر کسی کو نہیں سمجھتا مگر بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کی مثال جو موت کے وقت آزاد کرتا ہے اس شخص کی مانند ہے جو پیٹ بھرنے کے بعد یہ کرتا ہے۔

تشریح:- ابو حبیبة کے بھائی نے ان کو وصی تو بنالیا تھا مگر کسی مد کا حقین نہیں کیا تھا کہ فلاں جگہ خرچ کرلو اس لئے انہوں نے بہتر جگہ اور موزوں ترین مد کی تلاش میں حضرت ابو درداء سے مشورہ کیا بلکہ استخاء کیا، جواب

میں حضرت ابو درداءؓ نے جو تعبیر فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ بجائے آخری گھڑی کے حالت صحت میں صدقہ افضل ہے کیونکہ ایسے میں آدمی کے ذہن کا پتہ چلتا ہے جبکہ آخری سانسوں میں صدقہ کرنے سے تو اپنے آپ کو دانتوں پر مقدم کرنا ہے جس سے بجائے ایثار کے حقوق سے غرار کا عندیہ ملتا ہے جو مستحسن نہیں۔ گویا یہ بدی بصورت نیکی ہی معلوم ہوتی ہے یا یوں کہا چاہئے کہ جب اشیاء میں رغبت تھی تو ان کو اپنے پاس رکھا اور جب رغبت کم یا ختم ہو گئی تب ان کو اللہ کی راہ میں چلا کر دیا یہ تو ایسا ہے جیسے آدمی خود کھانا رہے اور صدقہ کی فکر نہ کرے مگر جب بچ جائے تب ہدیہ یا صدقہ کرے، تاہم اگر کوئی شخص ایسا کرے تو پھر بھی بذات خود یہ ایک اچھا قدم ہے مگر پہلی صورت کی طرح نہیں اس لئے اس کے ثواب کو بڑھانے کی تدبیر ہونی چاہئے اس لئے حضرت ابو درداءؓ نے ایک بہترین مد کی نشاندہی فرمائی کہ جب وہ صدقہ جو بذات خود روحانی طاقت میں کمزور ہے اگر اسے جہاد جیسے عمل میں لگایا جائے اور اس سے حیات اسلامی کو تقویت ملے تو اس سے صدقہ کی روح بھی طاقت ور ہو جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ احیاء اسلام اور ابقائے دین کے مادی کوئی مصرف نہیں اس لئے مجاہدین کے گھوڑے کی لید اور پیشاپ بھی ترازوئے اعمال میں تو لا جائے گا، طالب علم جب اپنے اوپر خرچ کرتا ہے تو قوی امید ہے کہ وہ اس کا صدقہ شمار ہوگا اور جو لوگ طلبہ پر خرچ کرتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں بڑی خوشخبری ہے ”فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا“۔

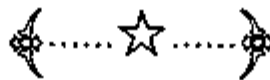
باب

”عن عروة عن عائشة أخبرته ان بريرة جاءت تستعين عائشة في كتابتها ولم تكن قضت من كتابتها شيئا فقالت لها عائشة ارجعي الي اهليلك فان احببوا ان اقضي عنك كتابتك ويكون لواء لك يبي فعلت فذكرت ذلك لبريرة لاهلها فأتوا وقالوا ان شاء ان تحسب عليك ويكون لنا ولائك فلتفعل فذكرت ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فقالها رسول الله صلى الله عليه وسلم: ابتاعني فاعتقني فانما الولاء لمن اعتقني ثم قام رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ما بال اقوام يشترطون شروطا ليست في كتاب الله؟ من اشترط شرط ليس في كتاب الله فليس له وان اشترط مائة مرة“۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت عروہ اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ

نے ان کو خبر دی ہے کہ بریرہ آئی وہ اپنی کتابت میں حضرت عائشہؓ سے مدد مانگ رہی تھی (یعنی بدل کتابت کی) جبکہ انہوں نے خود بدل کتابت میں سے کچھ بھی ادا نہیں کیا تھا، پس حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا جاؤ اپنے موالی کے پاس (اور ان سے پوچھو کہ) اگر وہ یہ پسند کریں کہ میں تیرا بدل کتابت ادا کر دوں اور تیری ولاء میری ہو جائے گی تو میں ایسا ہی کر لوں گی چنانچہ بریرہ نے اس کا تذکرہ اپنے موالی سے کیا، تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہنے لگے اگر عائشہؓ تجھ پر ثواب کمانا چاہیں اس شرط پر کہ تیری ولاء ہماری ہی رہے گی تو وہ کر لیں چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا خرید لو اور آزاد کر دو کیونکہ ولاء بے شک اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ارشاد خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی شرائط لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہوتی ہیں (یعنی ردائیں) جو شخص ایسی شرط لگائے جو اللہ کی کتاب میں نہ ہو تو وہ شرط اس کے حق میں نہ ہوگی اگرچہ وہ سو (۱۰۰) شرائط لگا کر لے۔

تشریح: حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ایک یہودی کی باندی تھیں اس نے ان کو مکاتبہ بنایا مگر ان کے پاس بدل کتابت کا بندوبست نہ تھا وہ اس غرض سے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ جب مکاتبہ ادا کئے کتابت سے قاصر ہو اور عجز کا اظہار کرے تو اس کی خرید و فروخت جائز ہو جاتی ہے اس لئے ام المؤمنین نے خریدنے کی ہامی بھری کہ تم جاؤ اور اپنے آقاؤں سے بات کر دو مگر ان لوگوں نے یہ شرط لگا لی کہ اگر ام المؤمنین خرید کر آزاد کرنا چاہیں تو ٹھیک ہے مگر ولاء پھر بھی ہماری ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو رد فرمایا۔ اس حدیث کی مزید وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔



ابواب الولاء والہبۃ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق

"عن عائشةؓ انها ارادت ان تشتري بريرة فاشتروا الولاء فقال النبي صلی اللہ علیہ وسلم:

الولاء لمن اعطى الثمن اول من ولي النعمة"۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بریرہ کے خریدنے کا ارادہ فرمایا تو ان لوگوں (بریرہ کے موالی) نے ولاء اپنے پاس رکھنے کی شرط لگا دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولاء تو اسی کی ہے جو قیمت ادا کرے یا فرمایا کہ نعمت حاصل کرے۔

تشریح:۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا (بروزن کریمہ) انصار کے ایک قبیلہ والوں کی کنیز تھیں، شیخ نے لغات میں لکھا ہے کہ ان کے موالی یہود تھے، جمع ممکن ہے کہ انصار میں اولاً یہودی تھے۔ یہ حضرت عائشہؓ کی خدمت کیا کرتی تھیں، صاحب فراست تھیں، اس لئے انہوں نے عبد الملک کو عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی خلافت کی خوشخبری سنا دی تھی، موالی نے ان کو مکاتبہ بنایا تھا البتہ اس بارے میں روایات میں تھوڑا سا اختلاف ہے کہ عقد کتنے پیسوں کے عوض ہوا تھا لیکن بہر حال وہ ادائیگی سے قاصر تھیں، اس لئے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آئیں جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث میں گذرا ہے، حضرت عائشہؓ نے خریدنے کا ارادہ فرمایا مگر ان کے موالی نے ولاء کی شرط اپنے لئے لگا دی چونکہ یہ ایک باطل شرط تھی کیونکہ بیع مع الشرط جائز نہیں اور سود کے زمرے میں داخل ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سختی سے رد فرمایا۔ باب کی حدیث میں لفظ "او" راوی کے شک پر محمول ہے، عام روایات میں لفظ "واو" یعنی بغیر ہمزہ کے ہے "الولاء لمن اعطى الثمن وولى النعمة" مطلب

ابواب الولاء والہبۃ عن رسول اللہ ﷺ

باب ماجاء ان الولاء لمن اعتق

۱۔ أخرجه أيضاً بخاری ص: ۹۹۹ ج: ۲ کتاب الفرائض، سنن ابی داؤد ص: ۴۸ ج: ۲ "باب فی الولاء" کتاب الفرائض،

مسند احمد ص: ۲۶۷ ج: ۷ حدیث: ۲۵۰۰۶ ج: ۷ کذا فی رواية ابی داؤد حوالہ بالا۔

یہ ہے کہ ولاء اس مالک کی ہے جو خرید کر آزاد کر دے لہذا نعمت سے مراد اعتاق ہے جو ولاء کی نعمت و حصول کو مستلزم ہے۔ لیکن اس حدیث میں بعض مقامات کو سمجھنے میں کافی الجھن محسوس ہوتی ہے، چنانچہ:

پہلی الجھن:۔ یہ پیش آتی ہے کہ جب حضرت بریرہ مکاتبتھیں تو حضرت عائشہؓ نے ان کو کیسے خرید لیا جبکہ حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں، یہ اعتراض مالکیہ وحنابلہ پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ ان کے یہاں بیع المکاتب جائز ہے، اس لئے ہر فریق نے اس کی الگ الگ تشریح کی ہے۔ مالکیہ وحنابلہ کہتے ہیں کہ مکاتب قابل بیع ہے اور بعدالبیع بھی کتابت باقی رہے گی لہذا جب وہ مشتری کو اقتساط ادا کر دیا تو آزاد ہو جائے گا، جبکہ ہمارے یہاں اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مکاتب ادائے بدل کتابت سے قاصر آجائے اور مولیٰ اسے عاجز قرار دے کر عقد کتابت باہم رضامندی سے ختم کر دیں تب ہی وہ تبن بن کر قابل بیع ہو جاتا ہے، اور یہاں حدیث میں یہی صورت پیش آئی تھی جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

دوسری الجھن:۔ دوسری الجھن یہ پیدا ہوئی کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس شرط کی سختی سے تردید فرمائی جیسا کہ سابقہ باب کی حدیث میں ہے: "ما سال اقوام بمشروطون شروطا لبست فی کتاب اللہ" الخ کتاب اللہ سے مراد خدا کا حکم ہے یا قرآن کا اقتضاء ہے یعنی ایسی شرائط کی کوئی حیثیت نہیں جو شریعت میں ممنوع ہوں جبکہ مسلمؓ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "اشتريها واعتقها واشترطی لہم الولاء فان الولاء لمن اعتق" الخ یعنی ولاء تو بہر حال تیری ہے مگر یہ شرط ان کی مان کر خرید لو اور آزاد کر لو۔ بظاہر اس پر دھوکہ دہی کا شبہ وارد ہوتا ہے جیسا کہ حاشیہ میں ہے۔ اس کا ایک جواب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے دیا ہے کہ یہ از قبیل ارخاء العنان کے ہے۔ دوسرا جواب امام نوویؒ نے شرح مسلم میں دیا ہے کہ اگرچہ اصولی طور پر بیع مع الشرط تو منع ہے مگر یہ قضیہ اس سے مستثنیٰ ہے اور ایسے قضیے کا عموم نہیں ہوتا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو ظاہری شرط کے ساتھ بطور خاص جائز فرمادیا تاکہ بعد میں اس کو باطل قرار دیں اور ایسا طرز عمل و طرز تعلیم زیادہ مؤثر ہوتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حجۃ الوداع میں احرام حج کی اجازت دے دی اور پھر اسے نسخ فرمادیا کہ ان کو عمرہ کی ادائیگی کے بعد حلال ہونے کا حتمی حکم دیا تاکہ ان کی زمانہ جاہلیت والی عادت پوری طرح ختم ہو جائے۔ تو یہاں بھی مبالغہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرط کو جاری رکھا اور پھر اسے ختم فرمادیا گویا خطبہ شہداء سے مؤخر

ہے۔

دونوں جواہروں کا مال و مرجع ایک ہی ہے کہ یہ شرط باطل تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نظر انداز یا بظاہر جاری فرمادیا اور پھر اس کی نئی فرمادی: ”وَقَدْ تَحْتَمِلُ الْمَغْضَاةُ الْبَسِيرَةَ لِتَحْصِيلِ مَصْلَحَةِ عَظِيمَةٍ“۔ اس سے معلوم ہوا کہ عظیم فائدے کی خاطر معمولی نوعیت کا نقصان اٹھانا جائز ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر عورت ہوشیار ہو تو وہ اپنے مال میں خرید و فروخت وغیرہ کا اختیار رکھتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب معاشرے میں کوئی منکر رونما ہو تو امام اس پر تنبیہ کر کے اس سے منع کر دے۔ وعظ و نصیحت میں نرمی برتنے اور عام خطاب کی ترغیب بھی معلوم ہوئی وغیرہ۔ بہت سے فوائد کی حامل اس حدیث پر امام نوویؒ نے تفصیل سے بحث فرمائی ہے، چھ موضوع اور تیس فوائد بیان کئے ہیں۔ (جو چاہے تو وہ دیکھے شرح مسلم للنووی ص: ۴۹۳ و ص: ۴۹۴ جلد ۱، باب بیان الولاء لمن احق)

باب النہی عن بیع الولاء و ہبتہ

”عبداللہ بن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الولاء و ہبتہ“۔ (حسن)

صحیح

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاء بیچنے اور ہبتہ کرنے سے ممانعت فرمائی ہے۔

تشریح:۔ ایک روایت میں ہے ”الولاء لحمة تکلمحة النسب“ یعنی جس طرح نسب بیچا اور ہبتہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک جڑی ہوئی حقیقت ہے اسی طرح ولاء بھی ہے اور جس طرح بیٹا باپ کی وجہ سے گویا حیات سے سرفراز ہو جاتا ہے اسی طرح آزاد کردہ غلام اپنے آقا کی وجہ سے رقیق جو ایک گونہ موت و عدم حیات ہے سے چھٹکارا پاتا ہے۔

اس حدیث کے مضمون پر اجماع ہے، ابن العربیؒ عارضہ میں فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ ولاء کی بیع

باب النہی عن بیع الولاء والہبتہ

۱۔ رواہ السنۃ واحمد، سنن دارمی ص: ۴۹۰ ج: ۲ حدیث: ۴۱۵۶۔

۲۔ رواہ الدارمی ص: ۴۹۰ ج: ۲ حدیث: ۴۱۵۹، ایضاً مجمع الزوائد ص: ۴۹۹ ج: ۴ حدیث: ۱۸۱۔

اور یہ کہ جواز کے قائل تھے مگر حدیث الباب ان کے خلاف حجت ہے تاہم آج کل نہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور نہ ہی عملی اختلاف کے لئے کوئی محل و میدان ہے۔

فولہ ”وہروئی عن شعبۃ قال لوددت ان عبد اللہ بن دینار“ الخ یعنی شعبہ فرماتے ہیں کہ میری خواہش تھی کہ عبد اللہ بن دینار یہ حدیث بیان کرتے وقت مجھے اجازت دیتے تو میں اٹھ کر ان کے سر کو چومتا کیونکہ یہ واحد شخص ہے جن پر اس حدیث کی تمام اسانید جن کی تعداد بیستیس (۲۵) تک پہنچتی ہے جا کر ملتی ہیں اور جنہوں نے بغیر ان کی وساطت کے نقل کی ہے وہ ان کے وہم پر مبنی ہے جیسے حکمی بن سلیم کے طریق میں ہے۔ عارضہ میں ہے کہ جب صحابی کہے کہ ”امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکذا“ تو وہی ”توہ“ روایت بالمعنی ہوتی ہے جو بالاجماع قبول ہے۔

باب ماجاء فی من تولی غیر موالیہ او ادعی الی غیرابیہ

”عن ابراہیم التیمی عن ابیہ قال خَطَبْنَا عَلِیًّا فَقَالَ: مَنْ زَعَمَ اَنْ عِنْدَنَا شَيْءٌ نَقْرُؤُہُ الْاَكْثَابِ اللّٰهُ وَهَذِهِ الصَّحِیْفَةُ صَحِیْفَةٌ فِیْہَا اَمْسَانُ الْاَبْلِ وَاَشْیَاءٌ مِنَ الْحِرَاحَاتِ فَقَدْ كَذَبَ وَقَالَ فِیْہَا قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: الْمَدِیْنَةُ حَرَمٌ مَا بَیْنَ عَوْرَتِیْ ثَوْرٍ فَمَنْ اَحْدَثَ فِیْہَا حَذَنًا وَاَوْیَ مُحَدِّثًا فَعَلِیْہِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْہُ یَوْمَ الْقِیَمَةِ صِرَافًا وَلَا عَدْلًا وَمَنْ اَدْعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْہِ اَوْ تَوَلٰی غَیْرِ مَوَالِیْہِ فَعَلِیْہِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ لَا یُقْبَلُ مِنْہُ صِرَافًا وَلَا عَدْلًا وَذَمَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَاحِدًا یَسْعٰی بِہَا دِنَاہُمْ“۔ (حسن صحیح)

حضرت ابراہیم التیمی اپنے والد حضرت یزید بن شریک التیمی تیم الباب الکوفی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت علی نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ جس شخص کا یہ غلط گمان ہو کہ ہمارے (اہل بیت کے) پاس کتاب اللہ اور اس صحیفے کے علاوہ کوئی دستاویز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں تو وہ جھوٹا ہے۔ اس صحیفے میں تو اونٹوں کی عمروں کی بابت اور زخموں کی دیت کے متعلق کچھ احکام ہیں اور فرمایا کہ اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے ٹوریک پارہ مدینہ حرم ہے پس جو شخص اس میں نئی باتیں گھڑے گا یا ایسا کرنے والے کو جگہ (پناہ) دے گا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور سارے فرشتوں اور لوگوں کی لعنت ہے قیامت کے دن اللہ نہ اس کی فرض عبادت قبول فرمائیں گے اور نہ نقلی، (بعض نے اس کا ترجمہ بالعکس بھی کیا ہے) اور جو

شخص اپنا نسب غیر باپ کی طرف منسوب کرے یا کوئی موالی (آزاد شدہ غلام) اپنا انتساب غیر آقا کی جانب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور سب فرشتوں اور لوگوں کی بھی، نہ تو اس کی نفل عبادت قبول ہوگی اور نہ ہی قرض، (والحکمہ اور علی عکسہ کما مر) اور سب مسلمانوں کی امان ایک ہی ہے ایک ادنیٰ مسلمان بھی امان دینے کا حق رکھتا ہے۔

لغات: مقولہ ”المدينة حرم“ مدینہ منورہ کا نام تہن سے نہیں ہے جیسے عام شہروں کے لئے مدینہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ مدینہ بمعنی اطاعت سے ہے یعنی وہ شہر جہاں اللہ عز وجل کی اطاعت سب سے زیادہ ہوئی ہے اور ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی حتیٰ کہ اسلام سانپ کی طرح سمٹ کر حرمین میں واپس آ جائے گا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ والوں نے کما حقہ مقام نہیں دیا اور اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تنگ کر دیا تو یثرب والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے پیش کر دیا انہوں نے بے مثال ایثار کا ثبوت دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے ان کی اولاد، باغات اور آب و ہوا کی اصلاح کی دعائیں فرمائیں جن کی بدولت مدینہ یثرب نہیں رہا بلکہ طیبہ اور مدینہ منورہ بن گیا اور اس کے ساتھ وہ حرم بھی بن گیا، حرم مفتوحین بمعنی حرمت و احترام والی جگہ۔ قولہ ”عبیر الی ثور“ دونوں بفتح الاول و سکون الثاني ہیں، مدینہ منورہ کی دو پہاڑیوں کے نام ہیں، بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ثور تو مکہ کرمہ میں ہے مگر یہ صحیح نہیں۔

(کذا قال صاحب القاموس کما بین السطور و حاشیة القوت و صاحب النہایہ کما فی الحاشیة علی الترمذی) ثور احد کے شمال مشرق میں ہے۔ قولہ ”حدثنا“ یقتضیٰ وہ امر جدید جو اخیر القرون المشہور و لھا بالخیرۃ میں نہ خود موجود ہو اور نہ ہی اس کا کوئی منشأ استنباط موجود ہو، یعنی کسی طرح سنت سے ثابت نہ ہو۔ قولہ ”صرفا ولا عدلا“ ان کے معنوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے جمہور کے نزدیک صرف فرض کو اور عدل نفل کو کہتے ہیں جیسا کہ اوپر پہلے ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ حسن بصریؒ نے اس کے برعکس موقف اپنایا ہے جیسا کہ دوسرے ترجمہ میں لیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے صرف بمعنی توبہ اور عدل بمعنی فدیہ لیا ہے۔ اس میں مزید اقوال بھی ہیں۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ مراد ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے عذاب دور ہو جائے۔

تشریح: اس ارشاد پاک میں کئی مسائل ہیں، اختصار کے پیش نظر یہاں ان کے پیچیدہ پیچیدہ مباحث پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) پہلی بحث: روانہ اپنی فہمت کے مطابق یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ حضرت علیؑ کے پاس

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصیت نامہ ہے جس میں علم الاسرار، خلافت بلا فصل کے لئے ان کا انتخاب اور دیگر بہت ساری اشیاء جو اہل بیت کے لئے مخصوص ہیں درج ہیں، یہ محض ایک غلط تاثر تھا مگر اس تشکیک سے بعض حضرات کے ذہن میں شک نے جنم لیا اور بعض نے چہرہ گوئیاں بھی کیں، اس حوالے سے ”باب ماجاء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یوص“ میں بھی ایک روایت گزری ہے، حضرت عائشہؓ سے بھی سوال ہوا تھا چونکہ یہ ایک بے بنیاد بات تھی اس لئے ہر مجیب کی طرف سے سائل کوئی میں جواب ملا ہے، حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث بھی صاف بتا رہی ہے کہ اہل بیت کے لئے کوئی مخصوص دستاویز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لکھوائی ہے، یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے، عارضہ میں ہے: ”مروی من طرق مجمع علی صحته ونقلہ“ امام بخاریؒ نے بھی کتاب العلم میں اس کی تخریج فرمائی ہے:

”عن ابی حنیفۃ قال قلت لعلیؓ: هل عندکم کتاب؟ قال ”لا یلا کتاب اللہ“

اوفہم أعطیہ رجل مسلم او مافی ہذہ الصحیفۃ“ قال قالت و مافی ہذہ

الصحیفۃ؟ قال العقل وفکاک الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر۔“^۱

غرض دو ورق کے اس صحیفے میں کوئی خاص حکم جو اہل بیت نبوت کے لئے مخصوص ہو نہیں تھا، اگر اس کے جواب میں شیعہ یہ کہیں کہ وہ تفسیر کرتے تھے تو جواب یہ ہے کہ پھر ان کی شجاعت پر آپ نے جو بزدلی کا بد نما داغ لگایا اس سے آپ کی عقیدت کہاں گئی؟؟ باب کی روایت میں ”فقد کذب“ صاف تردید ہے۔

(۲) دوسری بحث:- اس پر اتفاق ہے کہ مدینہ منورہ مکہ کی طرح حرمت والی جگہ ہے۔ اس کا احترام ہر مکہ کو پر فرض ہے، مگر اس میں اختلاف ہے کہ آیا جس طرح مکہ کے احکام ہیں کہ وہاں کے درخت کا شواہر شکار کھیلنا جائز نہیں ہے تو اسی طرح مدینہ کا حکم بھی ہے؟ تو جمہور یعنی ائمہ ثلاثہ دونوں کا حکم ایک مانتے ہیں البتہ شافعیہ و مالکیہ کے ماہر المشہور مذہب کے مطابق جانی پر تاوان یعنی ضمان و جزاء نہ ہوگی کیونکہ یہاں نسک ادا نہیں ہوتے اس لئے یہ چراگاہ کی مانند صرف ممنوع ہے، جبکہ بعض حضرات جزاء کے بھی قائل ہیں، ان کا استدلال باب کی حدیث سے ہے۔

حنفیہ کے نزدیک اس کی حرمت بمعنی تعظیم و تکریم کے ہے جیسے مسجد کی تعظیم ہوتی ہے۔ ہاں مدینہ کی

ہریالی اور رونق کی خاطر درخت اور کنوئیں اور درود یو ارسب چیزیں محفوظ ہونی چاہئیں مگر مع ہذا اگر کسی نے کوئی شاخ کاٹ دی تو اس نامناسب حرکت کی کوئی سزا مقرر نہیں ہے اسی طرح شکار کا حکم ہے۔ ان کا استدلال ”یا ابا عمیر ما فعل النعیر“ سے ہے۔ اس کے جواب میں جمہور کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ باہر کی بلیبل تھی مگر یہ جواب کارگر نہیں کیونکہ جب باہر کا پرندہ حرم میں آجائے تو اس کا حکم حرم کے جانوروں کی طرح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تحریم سے پہلے کا واقعہ ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۳) تیسری بحث:- حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے مدینہ منورہ میں بدعت کی یا کوئی جنایت کی یا مبتدع کو جگہ دی یعنی اسے روکا نہیں اور مدینہ سے باہر نکالا نہیں یا کم از کم اپنے مقدور بھرا خراج یا روک تھام کی کوشش نہ کی تو حدیث کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص ہمیشہ کے لئے ملعون ہوگا۔ والعیاذ باللہ۔

تو یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ مدینہ میں بدعت گناہ کبیرہ ہے کیونکہ یہ مدینہ کی حرمت کے منافی ہے تاہم اگر وہ بدعت منکرہ نہ ہو تو بلحاظ تحریم وہ کفر نہیں ہے اس لئے لعنت سے مراد کافروں والی لعنت نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح قاتل مؤمن کی سزا طویل ہوتی ہے اسی طرح اگر یہ مبتدع توبہ نہ کرے تو قیامت تک یعنی طویل مدت تک مستحق لعن رہے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے خاتمہ بالخیر کی توفیق نصیب نہ ہو کہ بعض اعمال کی نحوست تباہ کن ہوتی ہے، ابن العربی نے مختلف توجیہات کے بعد لکھا ہے: ”اوفی شخص یقترون بفعله سوء العاتمة لانتھالک الحرمۃ“ اس صورت میں دوام لعن اپنے حقیقی معنی پر ہوگا۔

پھر اللہ کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی رحمت خاصہ یا عامہ سے دور فرما دے۔ فرشتوں کی لعنت کا مطلب ترک استغفار یا اس کے لئے بددعا کرنا ہے جیسا کہ لوگوں کی لعنت سے بھی یہی مراد ہے یا لوگوں کی لعنت سے مراد ہجران یعنی ترک تعلق ہے۔

(۴) چوتھی بحث:- جو شخص اپنا نسب یا کوئی غلام اپنی موالات کی نسبت تبدیل کر دے تو وہ بھی ملعون ہے چونکہ زمانہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ ایک آدمی کسی کو جتنی بنا کر اپنی طرف منسوب کرتا اور وہ جتنی بھی اس

۲۔ رواہ البخاری ص: ۹۱۵ ج: ۲ ”باب الکتبۃ للصبی الخ“ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۲۱۰ ج: ۲ کتاب الادب،

ایضاً سنن ابی داؤد کتاب الادب باب: ۶۹، سنن ابن ماجہ کتاب الادب باب: ۲۳، مسند احمد ص: ۵۵۹ ج: ۳

پر راضی ہوتا، پھر سورۃ احزاب میں اس رسم کو باطل قرار دے دیا گیا لہذا اب جو ایسا کرے گا وہ اسلام میں جاہلیت کو پروان چڑھائے گا اس لئے وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے کہ اپنے باپ کے احسان کو فراموش کرتا ہے اور اپنا نسب غیر جگہ مقرر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح غلام بھی احسان فراموشی کے ساتھ جھوٹی نسبت ظاہر کرتا ہے، اس لئے وہ دونوں اللہ کو پسند نہیں، اللہ نے ماں باپ کا حق مقرر کیا ہے، فرمایا: "ان اشکر لی ولوالدہک" اور مولیٰ کی سوالات کو بھی احسان کہا ہے "واذنقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ" "تو ایسا کرنے والا کفران اور ظلم کرتا ہے کہ" وضع شی فی غیر محلہ" کرتا ہے، "وقال اللہ ان لعنة اللہ علی الظالمین" یہ آیت فرشتے بھی پڑھتے ہیں اور مسلمان بھی، اس لئے یہ بھی لعنت کرنے والے بن گئے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده

"عن ابی ہریرۃ قال جاء رجل من فزارة الى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا رسول اللہ! ان امرأتی ولدت غلاماً اسود فقال له النبی صلی اللہ علیہ وسلم: هل لك من اهل؟ قال "نعم" قال فما الوانها؟ قال "حمر" قال فهل فیہا اوزق؟ قال: "نعم ان فیہا لوزقاً" قال: اثنی اناھا ذالک؟ قال "لعل عرقاً نزعها" قال فهذا لعل عرقاً نزعہ۔" (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص قبیلہ فزارہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میری بیوی نے کالے رنگ کا بچہ جنا ہے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا "ہاں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ان کے رنگ کیسے ہیں؟ اس نے کہا "سرخ" رنگ کے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ان میں کوئی خاکی رنگ کا بھی ہے؟ اس نے کہا "ہاں" ان میں سیاہی مائل بھی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کالا رنگ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا شاید کسی رگ نے اتار لیا ہو۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس کو بھی کسی رگ نے اتار لیا ہو گا۔ (یعنی کھینچ لیا ہو گا)

لغات:- قولہ "حمر" بضم الحاء وسكون الهميم احمر کی جمع ہے، سرخ رنگ کا اونٹ یعنی اسمر۔ قولہ "اوزی" لغات:-

ج سورة لقمان آیت: ۱۴۔ ج سورة الاحزاب آیت: ۳۷۔ ج سورة الاعراف آیت: ۳۳۔

باب ماجاء فی الرجل ینتفی من ولده

۱۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۱۳۳ "باب الرجل یشک فی ولده" کتاب النکاح۔

بروزن افضل اس کی جمع ”ورق“ بضم الواو و سکون الراء آتی ہے جیسا کہ اگلے جملے میں جو ہاؤ کور ہے، گندمی اور خاکی رنگ کو کہتے ہیں، گندمی رنگ کے آدمی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کا رنگ سیاہی مائل ہو، یہاں یہی مراد ہے۔ قولہ ”عیرقا“ بکسر العین رگ کو کہتے ہیں ”نزعہ، جذنبہ“۔

تشریح:۔ بخاری نے کی روایت میں ہے کہ یہ آدمی اعرابی تھا اور اس کا نام ضمضم بن قداوہ تھا، یہ اور ان کی بیوی دونوں میں کالا کوئی نہیں تھا مگر بیٹا کالے رنگ کا پیدا ہوا تھا چونکہ عام لوگ ایسے حالات میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں اس لئے انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی وجہ دریافت فرمائی کیونکہ ان کو بذات خود بھی شک لاحق ہوا تھا مگر مع ہذا یہ سوال یا اخبار قذف نہیں، مالکیہ کے نزدیک نہ صراحۃً قذف ہے اور نہ ہی تعریض جیسا کہ ابن العربی نے عارضہ میں لکھا ہے: ”کیس فی سوال الاعرابی قذف لاهلہ لا تعریض ولا بتصریح“ الخ۔ چونکہ ان کے نزدیک تعریض قذف بھی موجب حد ہے اس لئے دونوں کی نفی فرمائی جبکہ جمہور کے نزدیک صرف تصریح سے قذف متحقق ہوتا ہے تعریض سے نہیں اس لئے ان پر کسی طرح کا اشکال اور اس سے بچنے کے لئے تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو اونٹوں پر قیاس کرتے ہوئے اس اعرابی کو مثال سے سمجھایا کہ جس طرح سُرخ اونٹوں سے کالے رنگ کا بچہ جنم لے سکتا ہے تو اسی طرح انسانوں کا حال بھی ہے کیونکہ ”مسئل شئی یرجع الی اصلہ“، لہذا اگر کسی کے آباء و اجداد میں کوئی آدمی کالا گذرا ہوگا تو وہ رنگ اولاد کی کسی پشت میں ظاہر ہونا غیر معمولی یا غیر فطری اور غیر طبعی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ الوان تو علامات ہیں اور علامت ذی العلامت سے مختلف بھی ہو سکتی ہے لہذا ماں باپ اور اولاد کے الوان مختلف ہونا تو عام مشاہدہ ہے دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں کتنی تبدیلی آ چکی ہے رنگت کے علاوہ قد و قامت اور شکلوں میں واضح تفرقے موجود ہیں، الحاصل کسی بچے کو باپ کے رنگ سے مختلف ہونے کی وجہ سے منفی نہیں کیا جاسکتا۔

”قال النووی فی شرح مسلم وفی هذا الحدیث ان الولد یلحق الزوج وان خالف

لونہ، لونہ، حتی لو کان الاب ایض والولد اسود وعکسہ لحقہ ولا یحل لہ نغیہ

بمجرد المخالف فی اللون وکذا لو کان الزوجان ایضین فحاء الولد اسود

او عکسہ لاحتمال انه نزعہ عرق من اسلافہ "الخ۔ (کتاب اللعان ص: ۳۹۱ ج: ۱)
کچھ وضاحت اگلے باب میں ملاحظہ ہو۔

باب ماجاء فی القافۃ

"عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل علیہا مسروراً أثر قُتِلَ اسارى وجهہ فقال:
اَلَمْ تَرَ اَنْ مُحْجَزًا نَظَرَ اِنْفَا لِي زید بن حارثہ واسامۃ بن زید فقال: هذه الاقدام بعضہا من بعض"
(حسن صحیح) ۱

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اندر (حجرہ) میں
تشریف لائے اُس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش تھے (اتنے خوش تھے کہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ
انور (پیشانی) کی لکیریں چمک رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے نہیں پتہ کہ مجوز (قیافہ شناس) نے
ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید دونوں کو دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ پاؤں ایک دوسرے سے ہیں۔

اگلی روایت کا مطلب ہے کہ ان دونوں حضرات باپ بیٹے نے چادر اوڑھ رکھی تھی صرف پاؤں نظر
آ رہے تھے تو قیافہ شناس نے پاؤں کو دیکھ کر یہ تجزیہ کیا۔

لغات :- قولہ "القافۃ" قاف کی جمع ہے قفا سے ہے، قافیہ یا قیافہ شناس خدا و خال سے معلوم کرنے
والا کہلاتا ہے۔ قولہ "سبرق" بضم الراء برق سے باب نصر سے واحد مؤنث کا صیغہ ہے جو جمع کے لئے بھی
استعمال ہوتا ہے، بجلی اور چمکنے کو کہتے ہیں یعنی خوشی کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک چمک رہا تھا
جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی۔

قولہ "اسارى" جمع الجمع کا صیغہ ہے واحد سر یا سر آتا ہے اور جمع اسرار و اسرۃ ہے، وہ لکیریں جو پیشانی
میں بنتے اور ہموار ہوتی رہتی ہیں۔ قولہ "الم تری" اصل میں ترین واحد مؤنث مخاطبہ کا صیغہ ہے لم جازمہ کی وجہ
سے نون کو حذف کر دیا ہے ای الم نعلمی؟۔ قولہ "محجزاً" بضم الحیم و کسر الراء المعجمة المشددة و بعد حازاء

باب ماجاء فی القافۃ

۱۔ الحدیث اخرجہ البخاری ص: ۱۰۰۱ ج: ۲ "باب القافۃ" کتاب الغرائض، ایضاً رواہ مسلم فی کتاب الرضاع، سنن
ابی داؤد ص: ۳۱۶ ج: ۱ کتاب الطلاق، سنن نسائی کتاب الطلاق باب: ۵۱، مسند احمد ص: ۱۴۰ ج: ۴
حدیث: ۲۵۳۶۷ و ۲۳۰۰۵۔

آخری۔ اگلی روایت میں راء مہملہ کے ساتھ ہے مگر صحیح زاء مجملہ کے ساتھ ہے۔

مجزز بن الاعوار اللہ لہی کا خاندان قیافہ شناسی میں مشہور تھا اس لئے لوگ ان کے قول کو زمانہ جاہلیت میں بحث مانتے تھے۔

تشریح: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ السابقون الاولون میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت رکھنے والوں میں سے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس وقت متبنیٰ بنالیا جب انہوں نے اپنے والد اور چچا کے ساتھ واپس جانے سے انکار فرمایا، یہ اصلاً غلام نہ تھے مگر رسم جاہلیت کے مطابق ان کو زبردستی غلام بنا کر بیچا گیا تھا، تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف ان کے صاحب زادہ حضرت اسامہؓ پر لوگ یہ تہمت یا کم از کم یہ شک کرتے تھے کہ ان کے والد زیدؓ انیس یعنی سرخ و سپید ہیں تو یہ کیسے ان کا بیٹا ہو سکتا ہے کیونکہ اسامہؓ جب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ کالا ہے البتہ ان کی والدہ ام ایمن کے بارے میں شارحین کی دورائے ہیں کہ وہ کالے رنگ کی تھیں یا سفید؟ درحقیقت اور اصولی طور پر اسامہؓ زید بنی کے صاحب زادہ تھے کہ ”الولد للفراس“ کما مر۔ مگر دوسری طرف زمانہ جاہلیت کی یہ رسم اور علم القیافہ کی گردش ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی، کیونکہ شریعت شریفہ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں آئی تھی تو گویا یہاں دو طرح کے دلائل باہم متعارض ہو گئے تھے، ظاہری رنگ والا قرینہ لفظی نسب پر دلالت کرتا تھا اور اصول ”الولد للفراس“ اثبات کو مقتضی تھا لیکن عام لوگ تو ظاہر کو ہاسانی جانتے اور اس پر اعتماد کرتے ہیں دیکھئے اگر ایک آدمی بہت بڑا ولی اللہ ہو مگر جب اس کے مقابلے میں اس سے کئی گنا چھوٹے آدمی سے کرامت ظاہر ہو جائے تو عام لوگ اسی صاحب کرامت پر زیادہ اعتقاد کرنے لگتے ہیں، اس لئے یہ ایک مسئلہ تھا جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان تھے مگر جب قائف مجزز نے یہ بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بہت زیادہ خوشی ہوئی کیونکہ وہ غلط تاثر مکمل طور پر ختم ہوا، واضح رہے کہ یہ شبہ خواص کو ہرگز نہ تھا۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ قیافہ شناسی حجت ہے؟ اس سے نسب ثابت ہو جاتا ہے یا نہیں؟ تو امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ حنفیہ امام ثوریؒ اور امام اعظمؒ قیافہ شناسی کو حجت نہیں مانتے جبکہ باقی ائمہ ثلاثہ اس کی حجیت کے قائل ہیں۔ امام مالکؒ سے اس بارے میں مختلف اقوال اور بھی ہیں۔ ثمرۃ اختلاف یہ ہو گا کہ اگر کسی باندی سے مختلف لوگ جماع کریں جیسے زمانہ جاہلیت میں لوگ کرایہ پر باندیاں حاصل کرتے تھے یا بائع و مشتری میں اختلاف ہو جائے تو ان حضرات کے نزدیک فیصلہ قائف کے قول پر ہونا چاہئے۔ تاہم امام

شافعی زنا سے نسب کے ثبوت کے قائل نہیں چنانچہ امام نوویؒ نے اسی صفحے پر لکھا ہے کہ نہ تو زنا سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ محرم نکاح ہے حتیٰ کہ زانی اپنے نطفے سے پیدا شدہ لڑکی سے خود بھی نکاح کا مجاز ہے:

”وفال مالک والشافعی وابو ثور وغیرہم لا یترو لوطی الزناہل للزانی ان یتزوج ام

الزنی بہا و بنتہا بل زاد الشافعی فحوز نکاح البنت المتولدة من مائہ بالزنا“۔

بہر حال ان حضرات کا استدلال باب کی حدیث سے ہے کہ مجر ز نے کہا ”ان هذه الاقدام بعضها من بعض“ اس کی نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی بلکہ اس پر اظہار مسرت بھی فرمایا۔ (ص: ۴۷۱ ج: ۱، باب العمل بالمحاق القائف الولد)

حنفیہ کہتے ہیں کہ قیافہ شناسی ایک ظنی چیز ہے لہذا یہ مدار حکم خصوصاً نسب جیسے نازک مسئلے میں ہرگز نہیں بن سکتا۔ دیکھئے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے سے پردہ کرنے کا حکم تو دے دیا جس کے بارے میں حضرت سعدؓ اور عبد بن زمرہ کے درمیان جھگڑا ہوا تھا، سعد بن ابی وقاص کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ میرا بھتیجا ہے کہ اس نے مجھے اس کی وصیت کی ہے اور یہ اس (عتبہ بن ابی وقاص) کے ساتھ مشابہت بھی رکھتا ہے جبکہ عبد بن زمرہ کہہ رہے تھے کہ ”هذا احبى ہا رسول اللہ اولد علی فراش ابی من ولیدتہ“۔ تو مشابہت کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”واحتجی منہ بامسودۃ بنت زمعہ“۔ مگر اس مشابہت کی بناء پر سعدؓ کے حق میں فیصلہ نہیں فرمایا، اسی طرح اگر قیافہ قابلِ حجت بات ہوتی تو پھر لعان کا حکم نازل نہ ہوتا بلکہ قیافہ شناس کو بلایا جاتا اور اسی سے معلوم کیا جاتا، نیز یہ کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں قیافہ شناس ماہر ہے اور فلاں غیر ماہر ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور جہاں تک حدیث الباب کا تعلق ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ اصول کو حسی تقویت ملی اور تقویت دتا نہ تو کمزور دلیل سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور مجر ز کی بات کو اس لئے رد نہیں فرمایا کہ یہاں تردید فی نسب کو مستلزم ہوتی جبکہ نفس تردید حضرت سعدؓ کے قصے میں ہوئی ہے اور وہ بھی کافی ہے۔ ہاں حضرت سودہؓ کو احتیاطاً پردے کا حکم بھی دے دیا۔

ع: کذا فی مسند ابن ماجہ ص: ۱۴۴ ”باب الولد للفراش واللعان الحجر“ کتاب النکاح وموطا مالک ص: ۲۴۱

”انقضاء بالمحاق الولد بابہ“ کتاب الانقضاء ولفظہ: فقال احبى ابن ولیدۃ ابی ولد علی فراشہ الخ۔

باب ماجاء فی حث النبی ﷺ علی الهدیۃ

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال تہادوا فان الہدیۃ تذهب وحر الصدر ولا تحفرن حارۃ لحار تہاولو شیئ فیرین شاة“۔ (غریب) ۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دوسرے کو ہدایا دیا کرو کہ ہدیہ سینے کی جلن (کینہ) کو دور کرتا ہے اور کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو کوئی چیز دینا معمولی نہ سمجھے خواہ وہ بکری کے گھر کا ٹکڑا ہی ہو۔

لغات:۔ قولہ ”حث“ فتح الحاء وتشدید الاء، ترغیب دینا اور ابھارتا دیا کسانا۔ قولہ ”تہادوا“ فتح الدال، امر کا صیغہ تہادی بمعنی المحادثات سے ہے، جا نہیں سے ہدیہ دینے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”وآخر“ فتح الواو والحاء، دل کے میل اور کسی سے نفرت وغیرہ کو کہتے ہیں۔ قولہ ”لا تحفرن“ کا مفعول بہ مقدر ہے یعنی ہدیۃ۔ قولہ ”یرین“ بکسر الفاء والسين وینھما راء ساکنہ، گھر اور سُم کو کہتے ہیں۔ (یعنی گھر کے دونوں حصوں کے درمیان معمولی گوشت کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو)

تشریح:۔ یعنی باہمی خوش گو اور تعلقات کو استوار کرنا جو اسلامی معاشرے کا کلیدی عنصر ہے آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے سے مزید مستحکم ہو جاتا ہے چونکہ عورتوں میں طبعی طور پر افتخار کا مزاج پایا جاتا ہے اس لئے اندیشہ تھا کہ عورتیں ایک دوسرے کو معمولی ہدیہ دینا باعث شرم و عار جانیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی دینے والی، اسی طرح لینے والی ہدیہ کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ گھر کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس سے نیچے درجے کی کوئی چیز ہو نہیں سکتی اس لئے یہ تمثیل ہوئی کہ اپنے پڑوسیوں کو ضرور دیا کریں۔ مزید تفصیل راقم نے ”نقش قدم کامل“ میں لکھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دل میں مال کی محبت ہوتی ہے جب کوئی مال دیتا ہے تو اسی مقدار میں اس کے لئے دل نرم ہو جاتا ہے اور لازمی بات ہے کہ اس سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

باب ماجاء فی حث النبی ﷺ علی الہدیۃ

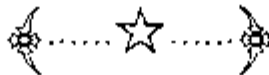
۱۔ وفي المعجم الاوسط للطبرانی: ياتساء المؤمنون تهادوا ولو بفارس شاة فانه ثبت المودة ويذهب الضغائن، ايضاً في الاوسط ياتسائر الانصار تهادوا فان الہدیۃ تزل السخيمة وتورث المودة الخ بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۱۸۵ ج: ۴ حدیث: ۶۷۱۵۔

باب ماجاء فی کراہیۃ الرجوع فی الہبة

”عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَنْ ثَلَّ الَّذِي يُعْطَى الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا كَالْكَلْبِ أَكَلَ حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فَرَجَعَ فِي قَبْعِهِ“۔^۱

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس شخص کی مثال جو کوئی ہدیہ دے کر پھر اسے واپس لیتا ہے اس گتے کی مانند ہے جو کھائے یہاں تک کہ جب پیٹ بھر جاتا ہے تو تے کر دیتا ہے اور پھر (بھوک لگتے وقت دوبارہ) رجوع کرتا ہے اپنی تے کی طرف۔

تشریح:- جیسا کہ اوپر والے باب میں گزرا ہے کہ ہدیہ کا مقصد اچھے تعلقات اور قرب حاصل کرنا ہے جبکہ رجوع سے اس کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے، اس لئے رجوع کرنے سے آدمی کی مثال اتنی بُری بن جاتی ہے جیسے کتے کی مذموم حالت۔ باقی مسئلہ کی تفصیل پہلے گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج ۵ ص ۲۲۱ ”باب ماجاء فی کراہیۃ الرجوع من الہبة“ من ابواب البیوع)



باب ماجاء فی کراہیۃ الرجوع فی الہبة

۱۔ رواہ ابیضا ابن ماجہ عن ابی ہریرۃ ص: ۱۷۲ ”باب الرجوع فی الہبة“ ابواب الہبات وابدؤذ فی البیوع باب: ۸۱، والنسائی فی الہبة باب: ۲، بحوالہ الترغیب والترہیب ص: ۲۶۱ ج: ۳ کتاب البر والصلۃ.

ابواب القدر

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

”قَسْرُ“ بفتح القاف والدال اور سکون دال بھی جائز ہے یعنی بروزن قمر بھی جائز ہے اور بروزن شمس بھی، تقدیر اندازے کو بھی کہتے ہیں یعنی ہر چیز کے لئے مقدار مقرر کرنا خواہ کیت کے لحاظ سے ہو یا کیفیت اور وقت وغیرہ کے لحاظ سے، اور قدرت کے معنی میں بھی آتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنی قدرت کاملہ سے عجیب و غریب اور عظیم نظام کو پیدا اور جاری فرمایا ہے۔

جاننا چاہئے کہ اللہ جبارک و تعالیٰ کی ذات پاک میں وحدت ہی وحدت ہے اس لئے نہ تو اس کا ثانی اور شریک فی الذات ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مظہر ہے نہ اس تک رسائی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا تصور بالکلہ و کتبہ ممکن ہے کہ وہ فنا و خارجاً بسیط ہی بسیط ہے البتہ تصور بالوجد و بوجہ ہو سکتا ہے بایں طور کہ اس کی ذات پر اس کی صفات دال ہیں اور صفات پر اسماء حسنی دال ہیں نیز ان صفات کے مظاہر بھی ہیں لہذا ذات تک رسائی علم یا یوں کہنا چاہئے کہ تصور بالوجد ان اسماء حسنی، صفات اور مظاہر کی وساطت سے ممکن ہے جو لوگوں کی استعدادات کے مطابق متفاوت ہے۔

حجۃ اللہ البائتہ میں حضرت شاہ ولی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ عزوجل کی صفت ابداع سے عالم بغیر کسی شے آخر کے معرض وجود میں آیا، پھر صفت تخلیق سے باقی خلقت اور موالید ثلاثہ یعنی حیوانات بشمول انسان کے، نباتات اور معدنیات معرض وجود میں آئے کہ یہ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں اور صفت تدبیر سے ان امور کا انتظام و انصرام جاری و ساری ہے جو آج تک محار العقل بتا ہوا ہے۔

بہر حال کائنات اور مخلوق کی تخلیق سے قبل عالم کا جو علم یا اس کا نقشہ ہے کہ کیا کیا چیزیں پیدا ہوں گی؟ اور کب اور کیسے پیدا ہوں گی؟ پھر ان معلومات کو لوح محفوظ میں لفظ بلفظ درج کیا گیا ہے اس کا نام ہے ازلی فیصلے اور تقدیر ہے۔ لفظ قضاء بھی اس کے ہم معنی ہے جبکہ بعض حضرات نے اجمالی حکم ازلی کو قضاء اور اس کی تفصیل و جزئیات کو تقدیر سے تعبیر کیا ہے، بعض نے اس کے برعکس تعبیر کو اختیار کیا ہے۔

علم بالمعدوم تو جائز ہے مگر اس کے باوجود اس مسئلہ میں عقول حیران ہیں اور صحیح صورت حال سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے بڑے بڑے ارباب عقل کے قدم یہاں آکر پھسل جاتے ہیں، قاضی محمد مبارک رحمہ اللہ نے اللہ کے علم ازلی کے بارے میں تمام مذاہب نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”نف کسرفی هذا المقام فانه من منزلة الافدام“۔ اس لئے اس مسئلہ میں ازروئے عقل بحث کرنا ممنوع بھی ہے اور خطرناک بھی، تجربہ شہادہ ہے کہ جس نے اس کی تہہ تک جانے کی کوشش کی ہے وہ غرق و ہلاک ہوا ہے، کوئی قدری بن گیا یعنی منکر اللہ پر اور کوئی جبری بن گیا ہے جو انسان کو پتھر کی طرح مانتے لگا ہے، حالانکہ تحقیق ان دونوں کے درمیان ہے کہ انسان کا سبب ہے مگر خالق نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے شرح عقائد اور نیز اس وغیرہا۔

حاشیہ کو کب پر مرقعات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؑ سے تقدیر کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا ”طریق مظلّم لا تسلكه“ یعنی تاریک راستہ ہے تم اس پر نہیں جاسکتے ہو، اس نے پھر سوال کیا تو فرمایا: ”بحر عمیق لا تلجہ“ یعنی گہرا سمندر ہے تم اس میں غوطہ زن نہیں ہو سکتے ہو، اس نے پھر سوال کیا تو فرمایا ”یسر اللہ خفی علیک فلا تفتشہ“ یعنی اللہ کا پوشیدہ راز ہے اس کی تعقیبش حال مت کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ جو اللہ کے راز کو افشاء کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ رسوا کر دیا جاتا ہے۔^۱

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اہل سنت والجماعت کی تعریف یہ کی ہے جو ظاہر کتاب وسنت کو تھامے رکھے اگرچہ وہ عقل کے دائرہ کار سے باہر ہو یعنی ایسی نصوص جن میں عقل حیران رہ جاتی ہو ان پر کسی تاویل کے بغیر ایمان لاتے ہوں۔

”اختار قوم ظاہر الكتاب والسنة وعضوا بنوا حزم علی عقائد السلف ولم

یبالوا بموافقتها لاصول العقلية ولا لمخالفتها لها.... وهم اهل السنة“۔

(مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ)

یعنی اگرچہ شریعت کی کوئی چیز عقل کے منافی نہیں لیکن ایسا ممکن ہے کہ کوئی مسئلہ کسی کی عقل سے بالاتر ہو ایسے میں صحیح اور صریح نص کے اندر کسی قسم کی تاویل جائز نہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ محال عقل تو نہیں لیکن

ابواب القدر عن رسول اللہ ﷺ

۱۔ کذا فی مرقعات المفاتیح ص: ۲۵۶ ج: ۱ ”باب الایمان بالقدر“۔ ۲۔ ایضاً جامع للروایات مجمع الزوائد ص: ۲۹۲

ج: ۷ کتاب القدر۔

مخارعتقل ہے اور میرا اس پر ایمان ہے۔

تقریب الی الفہم کی غرض سے ایک نظیر پیش کی جاتی ہے، اس سے تقدیر کے مسئلہ کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔

جس طرح کوئی فاعل مختار اپنے اختیار سے اور ارادے سے، اور پوری بصیرت اور مہارت کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے تو اس سے پہلے اس کے ذہن میں یعنی علم میں اس کام کا نقشہ ہوتا ہے، اور اس کام کا فائدہ اور وجہ بھی ملحوظ ہوتی ہے جس کو علت غائی کہتے ہیں، پھر اگر وہ کام بہت بڑا ہو تو اس کا نقشہ بھی تیار کر لیا جاتا ہے جیسے بہت بڑی بلڈنگ بن رہی ہو یا کوئی کارخانہ تعمیر ہو رہا ہو تو انجینئر اس کا ماڈل تیار کرتا ہے اور جب کام شروع ہو جاتا ہے تو اس کی تمام کاروائی اور تفصیلات اس نقشے اور ماڈل کے مطابق نظر آتی ہیں، ایسا ہی (بلا تشبیہ) ازل میں جو فیصلے ہوئے اور مستقبل کی تمام تفصیلات جو ازل میں لکھی گئی ہیں ان کا نام تقدیر ہے جس سے ذرا بھی آگے پیچھے ہونے کا کوئی امکان نہیں اگرچہ اللہ کو انجینئر کی طرح ماڈل تیار کرنے کی ضرورت نہیں مگر چونکہ اللہ کا ہر کام ضابطے سے ہوتا ہے اس لئے یہ تفصیلات لوح محفوظ پر اتاری گئی ہیں تاکہ اللہ کے لامتناہی علم اور بے انتہا قدرت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کیا جائے، کہ لامتناہی اوقات کا علم ازل میں رکھتا ہے اور ازل ہی سے ایک نظام مقرر کیا اب اس میں کبھی بھی سر موگڑ بڑ نہیں ہوتی۔ ”فسبحان اللہ احسن العالین“۔ کچھ مزید وضاحت ابواب کے ضمن میں آئے گی۔

باب ماجاء من التشديد في الخوض في القدر

”عن ابی ہریرۃ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نتنازع فی القدر فغضب حتی احمر وجہہ حتی کأنما فقی فی وجنتہ الرمان فقال: أبهذا أمرتم؟ أم بهذا أرسلت الیکم؟ انما هلك من كان قبلکم حين تنازعوا فی هذا الامر عزمت علیکم ألا تنازعوا فیہ“۔^۱
(حدیث غریب یعنی صالح المزنی کی وجہ سے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف

لائے جبکہ ہم تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا یہاں تک کہ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اتنا زیادہ سرخ ہو گیا کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں رخساروں میں اتنا نچوڑا گیا ہو، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے؟ یا پھر میں اس کے ساتھ تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں؟ بے شک تم سے پہلے لوگ اس وقت ہلاک (گمراہ) ہوئے جب انہوں نے اس معاملے میں باہمی منازعت اختیار کر لی، میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اس بارے میں جھگڑے (یعنی مباحثے) مت کرو!۔

لغات:۔ قولہ ”فُئِی“ بصیغہ مجہول بمعنی عصر یعنی نچوڑ دیا گیا ہو یا توڑ دیا گیا ہو۔ قولہ ”وَجَنَّتْ“ ای خدیہ، دونوں رخسار۔ قولہ ”الرَّعْمَانُ“ بضم الراء اتار، ”حتی احمر“ غضب کا غایہ ہے اور ”حتی کسانما الخ“ احمر کا غایہ ہے۔ قولہ ”أَبْهَذَا الخ“ دو استفہام ہیں، دونوں انکاری ہیں اور انکار بعد الانکار ترقی اور مبالغے کے لئے ہے۔ قولہ ”غَرَمْتُ“ ای افسست و اوجبت، یعنی میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور تم پر لازم کر دیتا ہوں۔

تشریح:۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ تنازعہ تقدیر کے ماننے اور نہ ماننے میں تھا ہرگز نہیں کیونکہ ایمان بالقدر تو فرض اور ایمان کا حصہ ہے بلکہ تقدیر کے اسباب اور حکمتوں کے جاننے اور اس حوالے سے عمل کی اہمیت کے بارے میں تھا مگر یہ مسئلہ اتنا نازک ہے کہ اس میں بحث سے لامحالہ افراط و تفریط جنم لیتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا کہ جب پہلے لوگ اس مباحثے کے نتیجے میں تباہ ہو چکے، تو پھر ایسا تلخ تجربہ کیوں دہراتے ہو، اس لئے سلامتی اور ایمان کی حفاظت بس اسی میں ہے کہ ہر خیر اور شر کا خالق، اللہ ہی کو مانیں اور جو اس نے حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے کا التزام کیا جائے، آگے اللہ کیا کرتا ہے یہ تقدیر سے بحث پر منحصر نہیں بلکہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہیں تو اپنے فضل سے جنت دے دیں اور چاہیں تو دوزخ میں ڈالیں جو اس کا عدل ہے، کہ مالک کو اپنی ملک میں تصرف کا اختیار ہے۔

باب

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: احتج آدم وموسى فقال موسى: یا ادم انت الذی خلقک اللہ ببیدہ ونفع فیک من روحہ أغویت الناس وأخرجتهم من الجنة؟ قال فقال ادم انت موسى الذی اصطفاک اللہ بکلامہ أتولونی علی عمل عملتہ کتبہ اللہ علیّ قبل ان یخلق

السموات والارض؟ قال فخلق آدم موسى۔ (حسن عریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم و موسیٰ علیہما السلام دونوں نے آپس میں مدلل بحث کی پس موسیٰ نے کہا اے آدم! آپ وہی ہیں کہ اللہ نے آپ کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور آپ کے اندر اپنی طرف سے روح ڈالی، آپ نے لوگوں کو بھٹکا دیا اور ان کو جنت سے نکال باہر کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم نے اس کا جواب یوں دیا کہ تو وہی موسیٰ ہے کہ تجھے اللہ نے اپنے کلام کے ساتھ مخصوص کیا ہے، کیا تو مجھے ایسے عمل پر ملامت کرتا ہے جو میں نے کیا ہے! مگر اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے پہلے ہی میرے لئے لکھ دیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پس آدم حجت (دلیل) میں موسیٰ پر غالب آگئے۔

لغات: مقولہ ”احتج“ احتجاج کے معنی حجت قائم کرنے اور استدلال کے ہیں۔ مقولہ ”بیدہ“ متشابہات میں سے ہے جس پر پہلے بحث گذری ہے، متاخرین اس کا ترجمہ قدرت سے کرتے ہیں۔ مقولہ ”من روحہ“ ”من“ ابتدا یہ ہے اور روح کی اضافت برائے تشریف و تعظیم ہے جیسے بیت اللہ، یعنی اللہ نے اپنی طرف سے ایک پاک روح آپ کے اندر ڈالی۔ مقولہ ”اغویت“ اغواء تخت گمراہ کرنے کو کہتے ہیں یعنی مراد سے بہت دور لے جانا ہے یعنی جنت سے دنیا تک۔ مقولہ ”اصطفاك“ ای اختارک، تجھے منتخب کیا ہے اور چن لیا ہے۔

تشریح: بعض نسخوں میں اس باب کو مترجم بترجمہ ”باب ماجاء فی تجان آدم و موسیٰ علیہما السلام“ کیا گیا ہے، حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے درمیان یہ مناظرہ کب اور کہاں ہوا ہے؟ تو اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ملتی اس لئے شارحین نے مختلف احتمالات بیان کئے ہیں مثلاً عالم ارواح میں، عالم برزخ میں، ایک کی حیات کے زمانہ میں دوسرے کی روح کے ساتھ، شب معراج میں وغیرہ جبکہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ مناظرہ قیامت کے دن ہوگا مگر یقینی ہونے کی وجہ سے الفاظ ماضی کے استعمال کئے گئے جیسا کہ بلاغت کا اصول ہے، جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ تمثیل ہے۔

بہر حال حدیث کی صحت کے بعد زمان و مکان کے ابہام سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تاہم اس حدیث کے

باب (بلا ترجمہ)

۱۔ رواہ ابوصفاً أحمد فی مسنده ص: ۲۲۷ ج: ۳ حدیث ۹۹۶۳ و الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۱۶۶۳، مجمع الزوائد ص: ۲۸۱ ج: ۷ حدیث: ۱۱۸۰۲، ابوصفاً روی بمعناہ بخاری ص: ۳۸۳ ج: ۱ کتاب الامیاء۔

سمجھنے کے لئے چند باتیں ملحوظ رکھنا اہم ہیں:

ایک بات :- یہ کہ اللہ عزوجل کی صفات کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں کسی پر جلال کا غلبہ ہوتا ہے اور کسی پر جمال کا، حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر تھے اور باپ اپنی اولاد کے لئے جمال کا مظاہرہ کرے تو خوب ہوتا ہے گو کبھی کبھی جلال بھی ہونا چاہئے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش سے مباحثے کے لئے مختص کیا جاتا تھا جس کا تقاضا تھا کہ جلال کا اظہار ہو پس یوں کہا جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام پر جمال کا غلبہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جلال کا، اور خصوصاً امور تشریحی کے حوالے سے۔

دوسری بات :- یہ ہے کہ اس کون یعنی اس عالم میں دو طرح کے امور بیک وقت جاری ہیں ایک تکوینیہ اور دوسرے تشریعیہ، اللہ عزوجل نے اپنی کامل حکمت کے تقاضے سے امور تکوینیہ پر پردہ ڈالا ہے ورنہ نظام دنیا نہ چلا، جبکہ امور تشریعیہ کو کھل کر بیان فرمایا ہے، انسان امر تکوینی کے آگے مجبور اور بے بس ہے جبکہ امور تشریعیہ میں با اختیار ہے۔

تیسری بات :- یہ ہے کہ انسان جس طرح امور تشریعیہ پر بذات خود عمل کرنے کا پابند ہے اسی طرح دوسرے سے عمل کروانے کا بھی بقدر وسعت واستطاعت مکلف ہے۔

چوتھی بات :- یہ ہے کہ ہر امر وجوب کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوامر ارشاد کے لئے اور بعض اوامر کسی اور غرض کے لئے ہوتے ہیں جیسا کہ اصول فقہ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے، اسی طرح نواہی میں بھی درجات ہیں۔

اس حدیث سے پہلے اگر ہم حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ سامنے رکھیں تو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی، ہاں صورت کہ حضرت خضر علیہ السلام نے تین کام ایسے کئے جن کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صبر نہ ہو سکا اور فوراً انکیر فرمائی حتیٰ کہ نوبت فراق تک جا پہنچی، حالانکہ ان کے اندر راز کی باتیں تھیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھیں کہ عالم الغیب صرف اللہ ہی ہے۔

پس یہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جلالی شان کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ اتنی قدر دانی کے باوجود آپ نے لوگوں کو جنت سے نکالا یعنی شجرہ ممنوعہ میں سے کھا کر آپ کو نکالا گیا جس کی وجہ سے آپ کی اولاد دنیا میں پیدا ہوئی پس کوئی کافر و مشرک بن گیا اور کوئی فاسق، اگر آپ یہ خطا نہ کرتے تو سب لوگ جنت ہی میں ہوتے، جیسے حضرت خضر سے فرمایا تھا "قوم حملو نسا بفسر نول عمدت الی

سفیتہم فخرتہا لتغرق اہلہا؟“ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے وہی جواب دیا جو حدیث میں ہے یعنی یہ تو میرے لئے پہلے سے مقدر تھا میں اس سے کیونکر بچ سکتا تھا؟ اسی بناء پر حضرت آدم علیہ السلام مناظرہ میں غالب رہے، یعنی اول تو ”ولا تنقربا هذه الشجرة“ کہ دنیا میں آنے سے پہلے کا حکم ہے جبکہ ابھی تک انسان کے اوپر تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالا گیا تھا اور جنت تو دارالخلیف نہیں ہے ہاں اس سے پہلے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دنیا میں ہوا تھا، ثانیاً یہ حکم ایک نکلونی امر سے وابستہ کیا گیا تھا لہذا اس کی حیثیت اسی امر نکلونی کی ہوگئی تھی یعنی یہ حکم نکلونی اور تشریحی کے بین میں تھا، تشریحی امور کی خلاف ورزی کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں اور نکلونی کی جداگانہ ہوتی ہیں اس لئے آدم علیہ السلام کی اولاد کو اگر اس کا بوجھ اٹھانا پڑے تو اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں، اگر ایک آدمی جہنم میں جاتا ہے تو وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی وجہ سے نہیں، حضرت آدم علیہ السلام پر الزام اس وقت آتا کہ شجرہ منوعہ میں سے کھانے کے بعد ان کی اولاد سیدھی جہنم میں چلی جاتی حالانکہ ایسا نہیں ہوا بلکہ اللہ نے ان کو جنت میں دوبارہ جانے کے تمام اسباب کا انتظام فرمایا ہے بلکہ پہلے کی جنت میں اور بعد کی جنت میں ایک واضح فرق ہے کہ اگر انسان یوں ہی جنت میں پیدا ہوتا تو اس سے انسانی صلاحیت کا پتہ کیسے چلتا؟ حتیٰ کہ ابن قیمؒ نے اس موضوع پر مستقل کتاب ”مفتاح دار السعادة“ لکھ کر موقف اختیار کیا ہے کہ انسان کو جنت کے عوض نعم البدل ”علم و ارادہ“ یعنی کسب و عمل دیا گیا ہے:

والمقصود ان الله سبحانه وتعالى لما اقتضت حكمته ورحمته اخراج ادم
وخرجه من الجنة أعاضهم افضل منها^۱ الخ۔ (مس: ۳۸، دارالکتب العلمیہ)

یہ طویل جواب اس لئے اختیار کیا گیا کہ جو جواب اس موقع پر مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جواب عالم آخر سے متعلق ہے اس لئے وہاں تقدیر کا حوالہ دینا صحیح ہے۔
راقم کو اس سے شرح صدر نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو قبر اور محشر میں فساق یہی استدلال کرتے حالانکہ صریح نصوص کے مطابق ان کا کوئی عذر اور تقدیر کا حوالہ عند اللہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم وعلیہ اتم

۱۔ رواہ البخاری ص: ۳۸۲ ج: ۱ ”باب حدیث المغضر مع موسیٰ علیہما السلام“ کتاب الانبیاء۔

۲۔ سورة البقرة آیت: ۳۵۔

باب ماجاء فی الشقاء والسعادة

”سالم بن عبد اللہ محدث عن ابیہ قال قال عمر بنارسل اللہ اُزایت مانعمل فیہ امر مبتدع او مبتدأ او فیما قلن فرغ منه؟ قال فیما قلن فرغ منه یا بن العطاء وکتل میسر امامن کان من اهل السعادة فانه یعمل للسعادة وامامن کان اهل الشقاء فانه یعمل للشقاء“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت سالم اپنے والد حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس بارے میں ارشاد فرمادیں کہ جو عمل ہم کرتے ہیں وہ نیا ہوتا ہے یا فرمایا (شک الراوی) کہ ابتدائی ہوتا ہے یا پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے فراغت حاصل کی جا چکی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ایسا ہے جس سے فراغت ہو چکی ہے، اے ابن الخطاب! اور ہر ایک کو آسانی دی گئی ہے پس جو نیک بختوں میں سے ہو تو وہ بلاشبہ خوش نصیبی کا کام کرتا ہے، اور جو شخص بد نصیبوں میں سے ہو تو وہ بلاشبہ بد بختی کا عمل کرتا ہے۔

لغات:- قولہ ”مبتدع او مبتدأ“ لفظ ”او“ راوی کے شک کے لئے ہے کہ اصل لفظ مبتدع ہے یا مبتدأ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے یعنی جو کام ہم کرتے ہیں وہ اسی وقت وجود پذیر ہوتا ہے؟ قولہ ”قلن فرغ منه“ یعنی اس کا ریکارڈ اور قبل العمل کوئی دوسرا وجود بھی ہوتا ہے۔ قولہ ”میسر“ اسم مفعول کا صیغہ ہے، آسانی و سہولت دیا ہوا شخص یعنی ہر آدمی کو تقدیر کے مطابق عمل کی آسانی دی گئی ہے۔

تشریح:- جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ علم بالمعدوم جائز ہے جیسے قیامت ابھی قائم نہیں ہوئی ہے مگر ہمیں اس کے متعلق بہت ساری اشیاء سے آگاہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح ازل میں انسان نہیں تھا مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کو انسان کی رگ و رگ اور اول تا مرگ تمام بیرونی و اندرونی کیفیات، اعمال اور ارادوں کا علم تھا یہ ایسا ہے جیسے بلا تشبیہ کوئی ڈیم بن رہا ہو اور انجینئر پانی کی سطح پہلے سے معلوم کر کے نشانات لگائے تو جب وہ ڈیم تیار ہو جائے تو پانی اسی سطح تک پہنچ جاتا ہے نہ کم ہوتا ہے اور نہ زیادہ، البتہ یہاں تھوڑی بہت غلطی کا امکان رہتا ہے جبکہ تقدیر میں اور مابعد کے واقعات میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ کما حقہ لفظ ہر

باب ماجاء فی الشقاء والسعادة

۱۔ رواہ مفصلاً احمد فی مسنده، بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۸۵ ج: ۷ حدیث: ۱۸۱۶۔

اسی بناء پر انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ پہلے سے اللہ کو معلوم اور لوح محفوظ میں مکتوب و موجود ہوتا ہے اور چونکہ تقدیر انسانی مزاج اور چاہتوں کے مطابق ہے اور ہر شخص اپنے مزاج کا کام شوق سے اور آسانی سے کرتا ہے اس لئے یہ اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے انسان کے لئے آسان ہوتے ہیں مثلاً اگر کوئی ازلا علم الہی میں چور تھا تو اس کے لئے چوری لکھی گئی ہے اور آج اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ کام بڑی خوشی سے کرتا ہے، اور اس سے کوئی جبر بھی لازم نہیں آتا کیونکہ اگر کسی کو معلوم ہو کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور پھر پانی چھوڑ دے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پانی اس لئے نیچے کی طرف جا رہا ہے کہ فلاں آدمی نے پہلے معلوم کیا تھا یا پیش گوئی کی تھی۔ تدبر

دوسری حدیث:- "عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علیؑ قال: بینما نحن مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو یبکت فی الارض اذ رفع رأسہ الی السماء ثم قال ما منکم من احد الا قد علیکم قال وکیع الافدھیک مقعدہ من النار و مقعدہ من الجنة قالوا: أقللنا تکمل یا رسول اللہ؟ قال: لا اعملوا فکل مئسراً لما خلق لہ۔" (حسن صحیح)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں اٹھا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین کرید رہے تھے اچانک اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر فرمانے لگے تم میں سے کوئی نہیں مگر معلوم کیا گیا ہے، امام و کج فرماتے ہیں کہ مقرر کیا (یعنی نکھا) گیا ہے اس کا نکھانا دوزخ میں سے اور جنت میں سے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! تو کیا ہم اسی پر تکیہ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! بلکہ عمل کرتے رہو کہ ہر شخص کو اس عمل کی آسانی دی گئی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

تشریح: سقوله "یبکت" وہ کرید رہے تھے، ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ جنت البقیع میں جنازہ کے وقت پیش آیا تھا، قبر ابھی تیار نہیں ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد صحابہ کرامؓ بیٹھے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لکڑی سے زمین کو کرید رہے تھے چونکہ یہ عمل عموماً سوچ و پچار کے دوران ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اس وقت عالم بالا کے ساتھ تھا اس لئے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر مذکورہ ارشاد فرمایا۔

علامہ طبریؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے سوال واستیذان کا غشایہ تھا کہ کیوں نہ ہم تقدیر پر بھروسہ کر دیں کیونکہ ہوگا تو وہی جو تقدیر میں ہے ہم خواہ کچھ بھی کریں لیکن تقدیر کو تو تبدیل نہیں کر سکتے ہیں۔ اور جواب کا مطلب یہ ہے کہ تم قانون شریعت میں دخل اندازی مت کرو جس میں عمل کرنے کا مکلف بنایا گیا لہذا تم عمل کرو۔ علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا مطلب یہ تھا کہ جنت یا دوزخ میں جانے کے لئے دو موثر ہیں ایک عمل، یہ ظاہری موثر ہے اور دوم اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارادہ یہ اصل اور حقیقی موثر ہے تو ہم بجائے ظاہری موثر کے حقیقی پر کیوں بھروسہ اور تکیہ نہ کریں؟ اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا دار الاسباب ہے اور ظاہری اسباب حقیقی موثر کے ساتھ مربوط ہیں لہذا عمل کرتے رہنا کیونکہ اچھے اعمال نیک بختی کی علامات ہیں جبکہ بُرے اعمال بد بختی کی نشانیاں ہیں اس لئے بُرے اعمال سے بچنا چاہئے، اور نیک اعمال چھوڑنا نہیں چاہئے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے عمل کی مشقت کا سہارا لیتے ہوئے عرض کیا کہ ہم تقدیر پر بھروسہ کر لیں گے تو آسانی ہو جائے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیک بختوں کے لئے کیا مشکل ہے ان کے لئے تو اعمال آسان بنا دیئے جاتے ہیں جیسا کہ بزرگوں کے احوال سے نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قَرَّةٌ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ“، ”تذکرہ۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آدمی کے دو ٹھکانے ہوتے ہیں اگر وہ جنت میں جائے تو دوزخ والی رہائش گاہ خالی رہتی ہے اور دوزخ میں جانے سے جنت والی خالی رہتی ہے۔ حاصل حدیث یہ ہے کہ اگرچہ سب کچھ تقدیر میں تو ہے مگر توکل ترک اسباب کا نام نہیں بلکہ تم تقدیر پر تکیہ یوں کرو کہ خلوص نیت کے ساتھ عمل کر کے تقدیر اور قضاء پر راضی رہو۔

باب ماجاء ان الاعمال بالخوايم

”عن عبد الله بن مسعود قال حدثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو الصادق المصدوق ان احداكم يجمع خلقه في بطن امه في اربعين يوما ثم يكون علقه مثل ذالك ثم يكون مضغاً مثل ذالك ثم يرسل الله اليه الملك فينفخ فيه الروح ويؤمر اربع ملكب رزقه واجله وعمله

و شقی او سعید فوالذی لا الہ غیرہ ان احدکم لیعمل بعمل اهل الجنة حتی ما یکون بینہ و بینہما الا ذراع ثم یسقی علیہ الکتاب فیختم لہ بعمل اهل النار فیدخلہا الخ۔ (حسن صحیح)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بات بتائی اور وہ سچے ہیں اور ان کی سچائی مانی ہوئی ہے کہ تم میں سے ایک کی خلقت (کے مادہ) کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک جمع کیا جاتا ہے پھر وہ اتنی ہی مدت میں گاڑھا خون بن جاتا ہے پھر اسی طرح وہ لوتھڑا بن جاتا ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے پھر اسے چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے وہ اس کا رزق لکھتا ہے، اس کی اجل، اس کا عمل اور یہ کہ وہ بد بخت ہے یا نیک بخت، پس اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ تم میں سے ایک جنتیوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز سے زیادہ فاصلہ نہیں پڑتا کہ اتنے میں اس پر (تقدیر کا) لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے تو اس کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہو جاتا ہے پس وہ اسی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بے شک تم میں سے ایک دوزخ والوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ذراع سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا پھر اس پر (تقدیر کا) لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے تو اس کا خاتمہ جنت والوں کے عمل پر ہوتا ہے اس طرح وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

لغات:- ”وہو الصادق المصلوق“ جملہ معترضہ ہے، صادق کے معنی تو ظاہر ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ان صفات میں سے ایک ہے جن کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبل النبوت بھی مشہور ہو چکے تھے۔ ”مصدق“ کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی تسلیم کی گئی ہے حتیٰ کہ ابوسفیان نے ہر قل کے دربار میں اس کا برملا اقرار کیا حالانکہ اس وقت ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت و مخالفت چل رہی تھی اور خود ابوسفیان فرماتے ہیں کہ اگر ساتھیوں کا ڈر نہ ہوتا کہ یہ بعد میں میری طرف غلط نسبت مشہور کر دیں گے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بولتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچ ہی کہا گیا ہے کیونکہ وہ نبی ہیں اور نبی تو وحی سے بات کرتا ہے جو سراسر درست اور سو فیصد صحیح اور سچ ہی سچ پر مبنی ہوتی ہے۔ قولہ ”بجمع خلقہ مخلق“ سے مراد نطفہ ہے جو انسانی تخلیق کا مادہ اور بنیادی عنصر ہے۔ اور جمع سے مراد یہ ہے کہ رحم جسے حیوان مشتاق الی الذکر کہتے ہیں جماع کے وقت منہ کھولتا ہے اور جماع کے بعد بند کرتا ہے۔ قولہ ”ان معین یوما“ یہ اوسط اور عام مدت ہے کیونکہ عام انسانوں میں چالیس دنوں میں تغیر اور تبدیلی آتی

ہے۔ بعض کی استعداد اچھی ہوتی ہے وہ اس سے پہلے اور بعض اس کے بعد تبدیل ہو جاتے ہیں جیسا کہ زندہ انسانوں میں اس کا مشاہدہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ قولہ ”علقہ“ اسی دماغی غلیظہ جامدہ یعنی گاڑھا خون جلی کی طرح۔ قولہ ”مضغہ گوشت کا توغڑ اور نکڑا، مضغ اصل میں چبانے کو کہتے ہیں چونکہ یہ توغڑ ایک بوٹی کی بقدر ہوتا ہے جس کو چبایا جاسکتا ہے اس لئے مضغ سے تعبیر کیا۔

تشریح:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس حدیث کے بیان کے وقت ایک منفرد انداز کلام اختیار کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی تخلیق تین اندھیروں میں ہوتی ہے، جس کا مشاہدہ خالی آنکھ سے ممکن نہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ نبی ہیں اس لئے وہ ہی ایسے معاملات کی خبر دے سکتے ہیں، لہذا اس کے ماننے میں تردد کی گنجائش نہیں۔

احادیث میں اربعینیات کے الفاظ اور تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر اس کو تعارض نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ اختلاف نطفے کی استعداد کے اختلاف پر مبنی ہے جیسا کہ اوپر لغات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ تبدیلی اکثری و اقلی ہے اور شریعت کے احکام چونکہ اغلب حالات پر وارد ہوتے ہیں اس لئے حدیث میں اربعینیات ثلاثہ کا ذکر بکثرت آیا ہے اگرچہ اس مدت میں کی نشی متوقع ہے، چنانچہ ابن رجب ضحلی نے شرح الخمسین میں یہ عمل دوسرے اربعین کے اول میں ہونے کے بارے میں بھی روایت نقل کی ہے:

فنفی صحیح مسلم.... اذا مر بالنطفة اثنتان واربعون ليلة بعث الله اليها ملكاً
فصورها الخ.... وفيه وحديث مالك بن الحويرث يدل على ان التصوير
يكون للنطفة ايضاً في اليوم السابع..... (راجع للتفصيل شرح الخمسین من
ص: ۶۲ الى ۷۵)

بہر حال ضابطے کے تحت فقہاء نے چار مہینے جو کہ تین اربعینات ہیں، سانس لینے کی حد مقرر کی ہیں۔
(تفکر و لا تجمل)

اگرچہ کچھ نہ کچھ حیات تو نطفے میں بھی ہوتی ہے مگر یہاں بنے بنائے انسان کی بات ہو رہی ہے اس حوالے سے ایک سو بیس دنوں میں پورا ڈھانچہ تیار ہو کر سانس لیتا ہے، اسی دوران ایک فرشتہ جو ارحام پر مقرر ہے اور اللہ کی جانب سے مامور ہوتا ہے آکر اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کی زندگی کا ریکارڈ بنا کر فائل میں درج کرتا ہے، ابن العربیؒ نے عارضہ میں یہ موقف اختیار فرمایا ہے کہ ”وہو مر بالبع“ میں حکمت یہ ہے کہ اللہ عز و جل

کے اوامر پر تنبیخ کا پردہ آ سکتا ہے جبکہ اخبار میں نسخ ممکن نہیں گویا رحم مادر میں جو تقدیر ہوتی ہے اس میں تبدیلی ممکن ہے البتہ لوح محفوظ میں تغیر کا امکان نہیں، یہ مسئلہ تقدیر معلق و مبرم کی طرف راجع ہو جاتا ہے۔

الرابعة قوله "ويؤمر" هذه الفائدة العظمى: لانه لو اخبر فقال: احله كذا ورزقه كذا و هو شقى او سعيد ما تغير خبره ابدان لان خبر الله لا يجوز ان يوحده بخلاف مخبره لوجوب الصدق له ولو لکنه يا مريدك كله والله سبحانه ان ينسخ امره ويقلب ويصرف العباد فيه من وجه الى وجه فافهموا هذا فانه نفيس وفيه يقع المحو والتبديل وامافى الخبر فلا يكون ذالك ابدان كذا لثبوت يقع المحو فى صحائف الملك ويرفع الى مافى ام الكتاب وهو تأويل قوله "يمحو الله ما يشاء ويثبت" (عارضه الاحوذى)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ تقدیر مبرم اور معلق کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اسی طرح امکان کذب کا مسئلہ بھی پہلے سے کم نہیں یہ موقع اس کے بیان کا نہیں تاہم عارضہ کی اس عبارت سے بہت ساری روایات میں تطبیق آسان ہو جاتی ہے۔ فاغتنم هذا

وہ مزید لکھتے ہیں کہ لوگوں کی چار قسمیں ہیں: ایک وہ جو عمر بھر مؤمن رہے۔ دوم اس کے برعکس جو زندگی بھی کافر رہے۔ سوم جو پہنے مؤمن ہو اور موت کے قریب کافر ہو جائے۔ اور چہارم اس کے برعکس جو پہلے کافر ہو اور موت کے قریب مؤمن بن جائے۔ اس حدیث میں آخری دونوں قسموں کا بیان ہے۔
محمی نے ملا علی قاریؒ کی مرقاتؒ سے ایک جامع عبارت نقل کی ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنے نیک اعمال کی وجہ سے عجب اور کبر وغیرہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے اور گناہوں کی بناء پر مایوس نہیں ہونا چاہئے، نہ کسی بظاہر نیک آدمی پر جنتی کا حکم لگایا جائے اور نہ ہی کسی گناہ گار کو دوزخی قرار دینا چاہئے کہ اعتبار تو خاتمہ کو ہے نہ معلوم کون آخر میں کیسے رہتا ہے؟ غرض بین الخوف والرجاء رہنے کی پابندی کرے۔

باب ماجاء ان الاعمال بالخواصم

۱۔ سورة الرعد آیت: ۳۹۔ ع قال الملا علی قاری فی المرقاة: اقول فی الحدیث تنبہ علی ان السالک یبغی ان لا یعتبر باعماله الحسنه ویجتنب العجب والتکبر والاعلاق السبۃ ویكون بین الرجاء والخوف ومسلماً بالرضا تحت حکم القضاء الخ ص: ۲۶۷ ج: ۱، مکتبہ حقانیہ ملتان

اشکال:- یہ تو بڑا مشکل معاملہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی عبادت میں اور اللہ کی اطاعت میں گزر جائے اور جب موت قریب ہو جائے تو سب نیکیاں نیست و نابود ہو جائیں اور آدمی عمل بد (کفر) کی وجہ سے دوزخ میں چلا جائے؟

حل:- یہ بد انجامی صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے اعمال میں مخلص نہیں ہوتے ہیں ان کے اعمال اگرچہ ظاہری شکل میں بہت اچھے اور زیادہ محسوس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ جان سے خالی ہوتے ہیں وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود دھوکے میں ہوتے ہیں: "قَالَ اللَّهُ تَعَالَى "يُخٰدِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَا يَخٰدِعُونَ الْاِنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ فِى قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا الْخ" گویا موت کے وقت ان کی دوسوت آجاتی ہیں ایک جسمانی اور دوسری روحانی۔

اس کے برعکس جو لوگ مخلص اور قضاء پر راضی ہو کر عمل میں مگن رہتے ہیں وہ اللہ کے فضل کرم سے سوء خاتمہ سے محفوظ ہوتے ہیں، تاہم یہاں یہ سوال بھی باقی رہتا ہے کہ غلوں کی حد کیا ہے؟ اس کے جواب میں ابن قیمؒ مفتاح دار السعاده میں لکھتے ہیں:

"ان خواص الامۃ ولبابہا المشہدت عقولہم حسن ہذا الذین وجلالتہ وکمالہ وشہدت قبح ما خالفہ ونقصہ ورداء تہ خالط الایمان بہ ومحبتہ بشاشۃ قلوبہم فلو خیر بین ان یلقی فی النار و بین ان یختار دیناً غیرہ لا یختار ان یقذف فی النار و یقطع اعضاءہ ولا یختار دیناً غیرہ وهذا الضرب من الناس ہم الذین استقرت اقدامہم فی الایمان وہم ابعد الناس عن الارتداد عنہ واحقہم بالثبات علیہ الی یوم لقاء اللہ الخ۔ (ص: ۳۳۱)

یعنی اگر کسی کا ایمان اس حد تک پختہ ہے کہ وہ ایمان کو جان و مال اور اعضاء و ابکار ہر چیز سے عزیز و لذیذ سمجھتا ہے تو وہ خاتمہ بالسوء سے محفوظ ہے اب ہر آدمی خود ہی فیصلہ کرے کہ اس کا ایمان اس کے نزدیک کتنا قیمتی ہے؟

باب ماجاء کل مولود یولد علی الفطرة

”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کل مولود یولد علی الفطرة فابیہوہ یہودانہ ویمسیرانہ ویمنیانہ یقبل ہار رسول اللہ! فمن ہلک قبل ذلک؟ قال: اللہ اعلم بما کانوا عاملین بہ۔“^۱ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ ملت (اسلامیہ کی استعداد) پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے والدین اس کو یہودی بناتے ہیں اور نصرانی بنادیتے ہیں اور اسے مشرک بنادیتے ہیں، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! جو اس (بلوغت) سے پہلے مر جائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے تھے۔

• لغات: ”ملت“ صحیحین^۲ کی روایت میں لفظ ”فطرت“ آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی کی روایت بالسنی ہے اور شیخین کی بلفظ ہے، فطرت سے مراد ملت اسلامیہ ہے یا اس کی استعداد، اس میں اختلاف ہے، تفصیل تشریح میں ملاحظہ ہو۔ البتہ لغت میں فطرت بمعنی اشتقاق اور تقطیع یعنی پھنسنے اور پھاڑنے کے بھی آتا ہے۔ اور بمعنی ابتداء کے بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ قولہ ”یہودانہ“ الخ یہ تینوں صیغے مضارع کے ہیں اور باب تفعیل سے ہیں یعنی وہ بچے ماں باپ کی تعلیم اور اثر ماحول کی وجہ سے بے دین کر دیئے جاتے ہیں۔

تشریح:۔ اس حدیث شریف میں تین باتیں اہم ہیں: پہلی یہ کہ جیسا کہ فطرت کے لغوی معنی سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی تخلیق کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے تو وہ کون سی ابتداء ہے۔ دوسری یہ کہ انسانی بچے کی یہ حالت کس نوعیت کی مراد ہے آیا اس سے مراد اسلام ہے یا استعداد وغیرہما۔ تیسری بات یہ ہے کہ کافروں کے نابالغ بچے کہاں ہوں گے؟

(۱)۔ پہلی بات کے متعلق ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اس کتابت کی طرف اشارہ ہے جب اللہ عزوجل نے قلم پیدا فرمایا تھا، یا پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو ذر کی شکل میں

پیدا فرمایا تھا اور ان کو اللہ کی ربوبیت پر مقرر اور گواہ بنایا تھا، ”وقال بعضهم من لم يعلم هو المكتوب عليه وهو في الرحم“ الخ اس تیسری رائے کو انہوں نے لاطینی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ عام شارحین نے صرف اسی کو لیا ہے کہ جب انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ فطرت اور طبع کے مطابق ہوتا ہے اور حدیث میں لفظ ”یولد“ بھی اس کی طرف مشیر ہے۔

(۲)۔ دوسری بات میں اختلاف ہے مگر قائل ذکر اقوال دو ہیں: (۱) امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس فطرت سے مراد دین اسلام ہے پس مطلب یہ ہوگا کہ ہر انسانی بچہ مسلمان یعنی عقائد اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کے والدین غلط پرورش کر کے اسے گمراہ کر دیتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ فطرت سے مراد اسلام قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ”والاصح ان معناه ان کل مولود یولد فطرتاً للإسلام“ الخ۔ (ص: ۳۳۷ ج: ۲)

عارضۃً الاحوذی میں ہے:

”و معنی ولادته علی ذالک کلہ یرجع الی انه یولد سلیمًا عن عیب غیر مکسب
لشئ منی كما قال اللہ: ”واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لاتعلمون شیئاً“
(النحل: ۷۸) ثم یعود الی ما أقر اللہ به او کتبہ من عملہ بالتیسیر الی ذالک اما علی
بدی ابویں و هذا لا کثرو عنہ وقع الخبر و اما بقریں وقد أخبر اللہ عنہ فقال:
”و قَبَضْنَاهُمْ قُرْنًا“ و الابویں قرین۔“

یعنی انسانی بچہ یہودیت، نصرانیت اور شرک وغیرہ ہر قسم کے عیوب سے پاک پیدا ہوتا ہے جیسا کہ جانور سلیم الاعضاء پیدا ہوتے ہیں مگر جس طرح ان کے مالک ان کے کان وغیرہ کاٹ دیتے ہیں اور ان کو معیوب بنادیتے ہیں اسی طرح انسانی بچے کو ماں باپ معیوب اور گمراہ کر دیتے ہیں جو حدیث بالا میں بیان ہوا یا اس کے ساتھی اور غلط ماحول کے اثرات گمراہ کر دیتے ہیں جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے۔

یہی رائے علامہ تورپشتی، علامہ طیبی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہم اللہ اور اس سے ملنے جلتے معنی کے فاکل حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہم بہت سے حضرات کی ہے۔

فریق اول کا استدلال سورہ روم کی اس آیت سے ہے: ”فطرت اللہ النبی فطرت الناس علیہا لا تبدل لخلق اللہ ذالک الدین القیم“ (روم آیت ۳۰) اس میں گویا فطرت کی تفسیر دین قیم سے کی گئی ہے۔

ان کا دوسرا استدلال عیاض بن حماد کی مرفوع حدیث سے ہے، یہ حدیث قدسی ہے: "انسی خلقت عبادی خنفاء کلہم فاجتالہم الشیطان عن دینہم" گئے بعض طرق میں "خنفاء مسلمین" کے الفاظ ہیں جو زیادہ صریح ہیں، نیز حدیث الباب میں بھی لفظ ملت آیا ہے، معلوم ہوا کہ فطرت سے مراد ملت اور اسلام ہی ہے۔

فریق ثانی کا استدلال یہ ہے کہ اگر انسانی بچہ مسلمان ہی پیدا ہوتا تو پھر غیر مسلموں کے بچے اپنے ماں باپ کے تابع نہ ہوتے حالانکہ اس بارے میں روایات تو اتنی حد تک پہنچی ہیں کہ ان کے احکام قبل البلوغت وہی ہیں جو ان کے بڑوں کے ہیں لہذا ان کا قبرستان الگ ہے، ان کی نماز جنازہ نہیں ہے، کیا کسی بھی ایک روایت سے ثابت ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی یہودی بچے یا مشرک بچے کی نماز پڑھی ہو حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ کا بڑا اہتمام بلکہ التزام فرماتے، نیز مسلمان کی نماز جنازہ تو فرض ہے تو اس عہد پاک میں جو بچے بغیر جنازہ گئے دفن ہوئے اور آج تک ہو رہے ہیں؟ کیا سب مسلمان جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ سے تارک فرض ہوں گے؟ اسی طرح وہ بچے جب ماں باپ کے ساتھ گرفتار ہو جائے تو وہ غلام تصور کئے جاتے۔ غرض یہ بات انتہائی جلی ہے کہ عملی طور پر کسی بھی غیر مسلم کے بچے کے ساتھ مسلمانوں کے بچوں کا سلوک نہیں کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان پیدا نہیں ہوتے۔

فریق اول کے استدلال کا جواب:- ان حضرات کی دونوں دلیلوں کا جواب اور حدیث الباب کا مطلب یہ ہے جیسا کہ ابن العربی نے فرمایا کہ ہر انسانی بچہ کفر اور شرک کے عیوب سے پاک اور صاف ستھرا پیدا ہوتا ہے بس وہ ایک خالی لوح کی طرح ہوتا ہے مگر دین اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے انسان فطری طور پر اللہ کی ربوبیت، توحید اور الوہیت کا قائل اور نجاستوں سے متنفر رہتا ہے اس لئے اگر اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہ ہوتا تو وہ صاف ستھرا مودہی بنا جیسا کہ پہلے مسلم الثبوت کا حوالہ گذر گیا ہے اور چونکہ یہ صلاحیت انتہائی تیز اور بالفعل موثر ہے اس لئے اسے ملت سے تعبیر فرمایا، جیسے ایک گاڑی بالکل زریعہ میٹر ہو مگر اس میں دو سو میل فی گھنٹہ رفتار والا میٹر فٹ کیا گیا ہو تو وہ اگرچہ ابھی تک روڈ پر چلی نہ ہو مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ گاڑی دو سو میل کی رفتار سے چلنے والی ہے، ہاں اگر اسے ضائع کر دیا جائے تو وہ الگ بات ہے اسی طرح اس خالی لوح اور سادہ لوح بچے کے دل و دماغ پر کچھ درکنہ کیا جائے تو وہ قبول کر لے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات میں اسلام بالقوة کو قوت امکان کی وجہ سے اسلام بالفعل سے تعبیر کیا ہے۔

تدبر و تشکر

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھار ماہیت کے مقتضی سے تخلف بھی ممکن ہے یعنی بعض افراد ماہیت کے اقتضاء سے نکل بھی جاتے ہیں جیسے شہد کی مکھڑوں کا ایک نوعی مزاج ہے کہ وہ پھولوں پر بیٹھتی ہیں لیکن ایک دوکھیاں پیٹھاپ پر بھی بیٹھتی ہیں اسی طرح کھیرا بعض کڑوا بھی ہوتا ہے چنانچہ حضرت فخر علیہ السلام نے جس بچے کو قتل کیا تھا وہ ماہیت کے اس ضابطے سے مستثنی تھا یہ اللہ کی قدرت کا اظہار ہے تاکہ مادہ پرست اور دھری لوگ سمجھ جائیں کہ یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر کوئی تصرف کرنے والا موجود ہے جو محض اپنی مرضی سے تصرف کرتا ہے۔

اعتراض:- یہاں یہ اشکال پیش آتا ہے کہ فطرت سے خواہ کوئی بھی معنی لئے جائیں لیکن مذکورہ بالا آیت میں تصریح ہے کہ: "لا تبدل لخلق الله" جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے بھی بگڑ جاتے ہیں بلکہ ان کی غالب اکثریت اسلام سے دور بھاگتی ہے۔

جواب:- اس کا حل یہ ہے اور یہ حل ان لوگوں کی طرف سے زیادہ آسان اور بے غبار ہے جو فطرت بمعنی استعداد لیتے ہیں کہ وہ صلاحیت تبدیل نہیں ہوتی ہے بلکہ ماں باپ اور ماحول اس کو دبا لیتے ہیں، یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کو دوسری جانب موڑ لیتے ہیں جیسے کسی پودے کو انتہائی ٹھنڈے یا انتہائی گرم کمرے میں رکھ دیا جائے تو وہ بڑھ نہیں سکے گا اور جو شخص اس کو بجائے بلندی کے دائیں بائیں موڑے گا تو وہ اپنا راستہ تبدیل کر دے گا اسی طرح جیسے ایک ذہین بچے کو مہمل چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا آدمی نہیں بن سکتا حالانکہ ان تمام صورتوں میں اصل صلاحیت موجود ہوتی ہے مگر بے اثر ہو جاتی ہے آج بھی اگر سب کفار خواہ صغار ہوں یا کبار اگر تعصب کی عینک اتار دیں تو چند دنوں میں ساری دنیا میں ایک خدا اور دین اسلام کے ماننے والوں کے سوا کوئی بھی نہیں بچے گا۔

(۳) تیسری بات:- غیر مسلموں کے نابالغ بچوں کے بارے میں کوئی واضح حکم ثابت نہیں بلکہ مختلف موقعوں میں ایک دوسرے سے جداگانہ ارشادات وارد ہوئے ہیں، اس لئے بعض علماء نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے، ملا علی قاریؒ مرقات میں لکھتے ہیں کہ بعض نے ان کو ماں باپ کی وجہ سے جہنمی قرار دیا ہے۔

بعض نے کہا ہوں گے تو جنت میں مگر ”لامنعمین ولا معذبین“۔ بعض نے کہا کہ اللہ کے علم میں جو بڑا ہو کر ایمان لاتا اور اسی پر مرنے والا تو وہ جنت میں جائے گا اس کے برعکس اگر وہ کافر بن کر مرے گا تو وہ دوزخ میں ہوگا۔ ”وقال ابن حجر هذا قبل ان ينزل فيهم شئ فلا ينافي ان الاصح انهم من اهل الجنة“۔ (حاشیہ مکتوۃ ص: ۱۲۱ از مرقاۃ ۵)

یعنی اخیراً حکم یہی ٹھہرا ہے کہ وہ جنت میں ہوں گے، امام نووی شرح منہج میں لکھتے ہیں:

”الاصح انه من اهل الجنة والحواب عن حديث: الله اعلم بما كانوا عاملين انه

ليس فيه تصريح بانهم في النار الخ“۔ (ص: ۳۳۷ ج: ۲)

المستر شد عرض کرتا ہے کہ عام اصول و روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے لہذا جو روایات ان کے دوزخی ہونے کی طرف مشیر ہیں یا تو ان میں تاویل کی جائے گی یا وہ دوسرے اصول سے از روئے اجتہاد مستحیط ہیں مگر ترجیح ان روایات لٹکے ہوئے جو جنت میں جانے پر ناظر ہیں کہ اللہ عز و جل بغیر عمل کے کسی کو محض اپنے علم کی بناء پر نہیں پکڑتا، اور یہ کہ تکلیف بعد الملوغمت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

باب ما جاء لا يردُّ القدر إلا الدعاء

”عن سلمان قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يردُّ القضاء إلا الدعاء ولا يزيدني

العمر إلا البر“۔ (حسن غریب)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قضاء کو نہیں ٹال سکتی مگر دعا اور عمر میں زیادتی نہیں کرتی مگر نیکی۔

تشریح:۔ اس حدیث سے استدلال کر کے بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ اجل میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے، جبکہ ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ازل میں معلوم تھا کہ فلاں شخص اگر دعائے مانگے یا فلاں نیکی نہ کرتا تو اس کی عمر مثلاً چالیس سال ہوتی مگر بوجہ دعائیا نیکی کے ساتھ ہوگی لہذا یہ کی بیشی اس دعا یا طاعت کی طرف منسوب کی گئی اور چونکہ تقدیر میں آگے پیچھے ہونے کا امکان نہیں ہے اس لئے اب جو بھی مرے گا وہ اپنے وقت

۵ مرقاۃ المفاتیح ص: ۲۷۱ ج: ۱ قال ابن حجر: ولعل هذا كان قبل ما نزل عليه في ولدان المؤمنين والكفار اذ هم في الجنة اجتمعوا في الاول وعلى الاصح في الثاني. ۶ راجع للمؤلفات مجمع الزوائد ص: ۳۱۸ ج: ۷ کتاب القدر.

مقررہ ہی پر مرے گا چنانچہ عقائد انفسیہ میں ہے: ”والحقنول میت باجلہ والموت قائم بالمیت مخلوق اللہ تعالیٰ والاجل واحد“۔ معتزکہ کو علامہ قسطلانی نے جواب دیا ہے:

”والجواب عن الاول (ای استدلال المعتزلة بان بعض الطاعات یزیدنی العمی) ان اللہ تعالیٰ کان یعلم انه لولم یفعل هذه الطاعات لکان عمره اربعین سنة لکنه علم انه یفعلها ویكون عمره سبعین سنة فنسب هذه الزیادات الی تلك الطاعة بناءً علی علم الله تعالیٰ انه لولاها لما كانت تلك الزیادة“۔ (شرح عقائد ص: ۷۳)

جیسے نقد اور ادھار کی دو مختلف قیمتوں میں سے ایک ہی طے ہو جائے تو ثانی برائے نام رہتی ہے۔

مذہب

باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن

”عن انس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُکثرُ ان یقول: یَا مُعَلِّبَ الْقُلُوبِ بَیْتُ قَلْبِی عَلٰی دِیْنِكَ اَفْعَلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اَمَانًا لِّکَ وَبِمَا جِئْتُ بِهِ فَهَلْ تَخَافُ عَلَیْنَا؟ قَالَ: نَعَمْ اِنَّ الْقُلُوبَ بَیْنَ اَصْبَعِیْنِ اللّٰهُ یُعَلِّبُهَا کَیْفَ شَاءَ“۔ (حسن صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دعا فرماتے: اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ پس میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر اور جو کچھ آپ لائے ہیں سب پر ایمان لائے ہیں تو کیا آپ ہمارے بارے میں خائف ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں کیونکہ سب دل اللہ کے اصابع میں سے دو اصبعیں کے درمیان ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے، (یعنی کبھی طاعت کی طرف اور کبھی گناہ کی جانب)۔

تشریح:- چونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اعلیٰ یقین جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اس لئے وہ اس قسم کی ادعیاں صرف امت اور خصوصاً صحابہ کرام کے لئے فرماتے ہیں اس لئے حضرت انسؓ نے

باب ماجاء ان القلوب بین اصبعی الرحمن

۱۔ رواہ ایضاً ابن ماجہ ص: ۲۷۲ ”باب دعاء رسول اللہ ﷺ“ ابواب الدعاء، مسند احمد ص: ۱۹۷ ج: ۵
حلیہ: ۱۷۱، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴

پوچھا کہ آپ کو ہمارے بارے میں بے راہروی کا خطرہ و اندیشہ ہے؟ جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں الخ۔ جواب کا مقصد یہ ہے کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ اگر ایک آدمی کسی وقت میں ایک کیفیت پر کائن ہے اور کسی حالت سے وقتی طور پر گزر رہا ہے تو وہ ہمیشہ اسی حالت پر قائم رہے گا، کیونکہ یہ دل تو اللہ کے دست قدرت میں ہیں وہ لمحہ سے کم آن میں ان کو تبدیل کر سکتا ہے اس لئے ہر وقت اللہ کا خوف دل میں رکھ کر بڑی عاجزی سے ہدایت پر استقامت کی دعائیں مانگنی چاہئے تاکہ اللہ کی توفیق ہر وقت شامل حال رہے۔ اصبغین کا اطلاق متشابہات میں سے ہے جس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے۔ (دیکھئے تشریحات: ج ۲ ص ۳۰۷)

”باب ماجاء فی نزول الرب تبارک وتعالی الی السماء الدنیا کل لیلۃ، فقیل ابواب الوتر“

خلاصہ یہ ہے کہ متقدمین ایسی نصوص میں تزییع مع التوفیض کے قائل ہیں جبکہ متاخرین تزییع مع التاویل کے۔ قال ابن العریفی فی العارضة: ”ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان ینکلم بالحقیقة والمعجاز“۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ افضل یہ ہے کہ متشابہات میں وہی منصوص الفاظ نقل کئے جائیں اور کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ نہ کیا جائے کہ اس سے ذہن جوارج کی طرف جاتا ہے اگرچہ عوام کے سامنے متشابہات بیان کرنے سے امام مالکؒ نے منع فرمایا اور امام بخاریؒ نے صحیح میں کتاب العلم کے آخر میں دو باب قائم کر کے اس پر زور دیا ہے کہ لوگوں سے ان کے فہم کے مطابق بات کرنی چاہئے، اور ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:

”ما انت بمحدث قوم أحد بشأ لا تبسلخه عقولهم الا کان لبعضهم فتنة“۔ (رواہ مسلم فی مقدمہ ص ۹) مگر بوقت ناگزیر ضرورت اگر توبت آہی جائے تو ان کے لئے تاویل کی ضرورت ہے جیسا کہ متاخرین نے کیا ہے کیونکہ یہ وقت روشن خیالی کا ہے لوگ ایمان کے بارے میں بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے ہیں جس سے علماء کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوا ہے۔

باب ماجاء ان اللہ کتب کتاباً لاهل الجنة والنار

”عن عبد اللہ بن عمرو قال خرج علينا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفی یدہ کتابان فقال: اتقدرون ما هذان الکتابان؟ قلنا: لا یا رسول اللہ الا ان تُخبرنا فقال: للذی فی یدہ البُئی: هذا کتاب من رب العظیمین فیہ اسماء اهل الجنة واسماء آبائهم وقبائلهم ثم أُجِیل علی اخرهم فلا یزاد فیهم ولا ینقص منهم ابدأ، ثم قال للذی فی شمالہ هذا کتاب من رب العظیمین فیہ اسماء

اهل النار واسماء آبائهم وقبائلهم ثم أُحِيلَ على آخرهم فلا يُزاد فيهم ولا يُنقص منهم ابداً فقال أصحابه فقيم العمل؟ يا رسول الله! إن كان امرؤ قد فرغ منه فقال سيّدو أو قاربوا فان صاحب الجنة يُخْتَمُ له بعمل اهل الجنة وإن عَمِلَ أَىَّ عَمَلٍ، وإن صاحب النار يُخْتَمُ له بعمل اهل النار وإن عَمِلَ أَىَّ عَمَلٍ، ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ: فَرَّغَ مِنْكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ۔ (حسن صحيح غريب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف لائے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ (اور مشکوٰۃ میں تثنیہ کا صیغہ ہے یعنی دونوں ہاتھوں) میں دو کتابیں تھیں پس فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تم لوگ جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا نہیں اے اللہ کے رسول! الایہ کہ آپ ہمیں آگاہ فرمائیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کے متعلق جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہاتھ میں تھی فرمایا کہ یہ رب الغلین کی جانب سے ایک کتاب ہے اس میں بہتییوں کے نام ہیں اور ان کے آباؤ قبائل کے نام ہیں اور پھر آخر میں ٹوٹل (میزان) ذکر کیا گیا ہے پس نہ تو ان میں کبھی زیادتی ہوگی اور نہ ہی کبھی کمی ہوگی۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا یہ (بھی) رب الغلین کی جانب سے ایک کتاب ہے اس میں دو زخیوں کے نام اور ان کے آباء اور قبیلوں کے نام ہیں پھر ان کے آخر میں مجموعہ عدد دکھا گیا ہے پس نہ تو کبھی ان میں زیادتی ہوگی اور نہ ہی کوئی کمی ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول! پھر عمل کس لئے کیا جائے؟ کہ جب صورت حال طے شدہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا استقامت پر رہو اور درمیانی راہ اختیار کرو کہ بلاشبہ جنتی کا خاتمہ جنت والوں کے عمل پر ہوگا خواہ وہ (پہلے) کوئی بھی عمل کرتا رہے اور بلاشبہ جہنمی کا خاتمہ دوزخ والوں کے عمل پر ہوتا ہے خواہ وہ کیسا ہی عمل کرے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرما کر وہ کتابیں (عالم بالا کے) حوالہ کر دیں پھر فرمایا تمہارے پروردگار بندوں سے فارغ ہو گیا ہے ایک فریق جنت میں ہوگا اور دوسرا جہنم میں رہے گا۔

لغات:۔ قولہ "أُحِيلَ" بصیغہ مجہول میزان اور ٹوٹل کو کہتے ہیں جس میں کُلّی عدد کا مجموعہ پیش کیا جاتا ہے۔ قولہ "سَدَدُوا" سدّ اور فراط و تفریط کے درمیانی حالت یعنی اعتدال کو کہتے ہیں۔ قولہ "وقاربوا" سداد کے قریب رہو یعنی اگر بالکل سیدھا چلنا اور راستے کے پتوں بیچ سے گزرتا مشکل لگے تو کم از کم اس کے قریب تو رہو،

یا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرو جبکہ علامہ طبری نے اس کو ”سبأ“ کی تائید قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اعتقادی اعتدال یہ ہے کہ تناقض فی الخصوص سے بچے اور اعمال میں افراط و تفریط سے بچے۔

تشریح:۔ آپ علیہ السلام کے ہاتھوں میں جو کتابیں تھیں ان کے بارے میں دو احتمال ہیں: ایک احتمال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تمثیل فرما رہے ہوں کہ یوں سمجھو جیسے میرے ہاتھوں میں دو کتابیں ہیں چونکہ آپ علیہ السلام پر ان کتابوں کے بارے میں اور تفصیلات کے متعلق کشف تام حاصل تھا اس لئے اشارہ صریح ہو جیسے ایک ماہر مصنف کتاب کے شروع میں کہتا ہے ”هذا کتاب باہذہ رسالۃ“ وغیرہ بلکہ اس سے زیادہ ظاہر مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں کا تعلق عالم مثال سے ہو جس کا مشاہدہ آپ علیہ السلام فرما رہے تھے اور صحابہ کرامؓ کو نظر نہیں آرہی تھی عالم مثال کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ الباقیہ میں مستقل باب قائم کیا ہے فلیراجع۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ کتابیں حسی ہوں اور آج کے دور میں یہ کوئی ناقابل فہم بات نہیں کہ ایک عام کمپیوٹر میں بھی سارے انسانوں کے اعداد و شمار جمع ہو سکتے ہیں تو ان کتابوں کا کیا حال ہوگا تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو وہ نام نہیں بتلائے کیونکہ پھر عالم ملکوت کے بہت سے امور سے پردہ ہٹ جاتا حالانکہ یہ اللہ کی حکمت کے منافی ہے۔

اس حدیث شریف میں صحابہ کرامؓ کے سوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے متعلق تشریح ”باب ماجاء فی الثناء والاعادة“ میں عنقریب گذری ہے۔

قولہ ”فنبذھما“ اگر یہ حسی کتابیں تھیں تو منہ کے معنی یہاں پھینکنے کے نہیں بلکہ عالم بالا کے حوالے کرنا ہے جس کے لئے ہاتھوں کو کھولنا پڑتا ہے اور دیکھنے والے کو تذبذب محسوس ہوتا ہے۔ اور اگر غیر محسوس تھیں تو مطلب ہاتھوں کو جھانڑنا ہے جو عموماً حتمی فیصلہ سناتے وقت خاص اشارہ ہوتا ہے۔

حدیث آخر:۔ ”عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ اذا اراد بعبد خیراً استعمله فقبل کیف يستعمله یا رسول اللہ؟ قال: یؤقّفہ لعمل صالح قبل الموت“۔ (صحیح)

باب ماجاء ان اللہ کتاب کتابا الخ

۱۔ رواہ ابنا احمد فی مسندہ ص: ۵۴۵ ج: ۳ حدیث: ۱۱۶۲۵۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ جب کسی بندے کی خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے (اچھا) کام لے لیتا ہے، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! کیسے کام لیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو موت سے پہلے نیک عمل کی توفیق دیتا ہے۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے ”ثم یقبضہ علیہ“ یعنی پھر اسے اسی عمل خیر کے دوران موت دے کر جنت میں داخل کر دیتا ہے۔

باب ماجاء لا عدوی ولا ہامۃ ولا صفر

”عن ابن مسعود قال قام فیہنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: لا یعدی شیئاً فقال اعرابی: ہمارا رسول اللہ! البعیر احرب الحشفۃ نذینہ فیحرب الابل کلہا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نعمن احرب الاول؟ لا عدوی ولا صفر خلق اللہ کل نفس فکتب حیاتہا ورزقہا ومصائبہا۔“

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان (خطبے کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کوئی شے (بیاری) کسی چیز کی طرف سرایت نہیں کرتی پس ایک اعرابی نے کہا اے اللہ کے رسول! جب ہم ایسے اونٹ کو باڑے میں داخل کرتے ہیں جس کے موضع پیشاپ میں خارش ہو تو وہ سب اونٹوں کو خارش بنا دیتا ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلے اونٹ کو کس نے خارش زدہ بنایا تھا؟ سرایت نہیں، صفر (کی نحوست) نہیں اللہ نے ہر نفس کو پیدا کیا ہے تو اس کی حیات و رزق اور مصیبتوں کو لکھا ہے۔

لغات: - قولہ ”لا یعدی“ اعدا اور غد قری سے ہے، بیماری کی سرایت اور دوسرے کو لگنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”احرب الحشفۃ“ جرب بروزن قر خارش اور کھلی کے مرض کو کہتے ہیں، جبکہ حشفۃ آلہ قاتل کے اگلے حصے کو کہتے ہیں جو غتھ کے بعد کھلا رہتا ہے، یہاں مراد پورا عضو ہے کیونکہ خارش پھر پورے کو لگتی ہے اگرچہ حشفہ میں

زیادہ ہوتی ہے۔ قولہ ”ندبہ“ یہ لفظ مختلف حروف کے ساتھ محفوظ کیا گیا ہے، مذکورہ لفظ ”دبن“ مفتوح الدال وسکون الہاء سے بمعنی بازے کے آتا ہے اگرچہ اصل لغت میں یہ لفظ بکریوں کے بازے کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں بمعنی معطن ہے یعنی اونٹوں کا بازو مراد ہے، پس ”ندبہ“ بصیغہ جمع مشکلم ادبان سے ہے، ترجمہ دہی ہوگا جو اوپر لکھا ہے یعنی ہم اسے بازے میں داخل کرتے ہیں تو وہ سب کو خارش بنا دیتا ہے لہذا ”فیحرب“ بضم الیاء باب افعال سے محروف کا صیغہ ہوگا اور ”اہل“ مفعول بہ ہے ”کلھا“ منصوب برائے تاکید ہے۔

دوسرا نسخہ: ”یذبہ“ ہے اس میں باء سمیت کے لئے ہے اور ”ذنب“ سے مراد دم یا پھر پھوڑے پھنسیاں ہیں یعنی ایک اونٹ پھنسی کی وجہ سے یا اپنی دم کی بناء پر خارش میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر باقی اونٹ بھی خارش کے مریض بن جاتے ہیں اس صورت میں ”فیحرب“ فعل لازمی اور ”الابل کلھا“ فاعل ہوگا۔

تشریح:۔ سائل کا سوال یہ ہے کہ آپ تعدی امراض کی نفی فرما رہے ہیں جبکہ مشاہدہ سے اس کا ثبوت معلوم ہوتا ہے، تو کیا یہ ایک سرسری خیال اور جائزہ ہے، یا پھر کیا مطلب ہے؟ اور جواب کا مقصد یہ ہے کہ باقی اونٹوں کی بیماری کو پہلے اونٹ کی ذمہ داری قرار دینا نہیں چاہئے ورنہ پھر پہلے کو کس نے بیمار بنایا؟ بلکہ یہ سب از خود بیمار ہو جاتے ہیں۔

”لَاعِدُوْنِ“ پر تفصیلی بحث پہلے گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ج: ۵ ص: ۳۶۷) باب ماجاء فی الطیرۃ ”من ابواب السیر“ اور اسی (جلد نمبر ۶) میں ”باب ماجاء فی الاکل مع الحزوم“ میں۔

قولہ ”ولاهامة“ اس کے متعلق بحث گزری ہے۔ (دیکھئے ابواب الطب جلد ۶ میں ”باب ماجاء ان لعین حق والغسل لھا تحت قوله ولاشی فی الهام“) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربوں میں جو عقیدہ مشہور تھا کہ مقتول کی روح آلو کی شکل میں قبرستان سے آکر دوا دیا کرتی ہے کہ میرا بدلہ لیا جائے تو یہ غلط اور من گھڑت ہے۔ اس بارے میں محشی نے بیان کیا ہے کہ عرب بومہ یعنی الو کو منخوس سمجھتے تھے یہ رات کو جس کے گھر کی چھت پر گرنا پائیٹھتا تو وہ اس کو بر اشگون اور موت کا اشارہ سمجھتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی بلکہ ابطال فرمایا۔

قولہ ”ولا صفر“ صفر کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک ماہ صفر اور دوم سانپ یا پھنسی۔ اگر مہینہ مراد ہو تو اس نفی کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ عرب ماہ صفر کو منخوس سمجھتے تھے جیسے آج کل بہت سے عوام کا عقیدہ ہے کہ اس میں شادی بیاہ کو منخوس سمجھتے ہیں، نئے گھر میں منتقل ہونا وغیرہ بر اشگون مہراتے ہیں وغیرہ وغیرہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بد اعتقادی کی تردید فرمائی۔ بعض حضرات نے اس کی وجہ تسمیہ میں لکھا ہے کہ صفر کے معنی خالی کے

ہیں چونکہ اشہر الحرم کے بعد لوگ جنگی مہم دوبارہ شروع کرتے اس لئے مرد گھروں سے نکل کر سب گھران سے خالی ہو جاتے۔ واللہ اعلم

بعض کہتے ہیں کہ لوگ نسیا کرتے ہیں یعنی صفر کو حرم میں تبدیل کرتے جس کی نفی آگئی۔

پھر جس طرح صفر کے مہینہ کو مخوس سمجھنا بے بنیاد ہے بعینہ اسی طرح اس کے آخری بدھ کو خوشی اور سیر و تفریح کی تقریبات بھی بے بنیاد ہیں لوگوں نے جو یہ مشہور کیا ہے کہ آخری بدھ کو آپ علیہ السلام نے غسل صحت فرمایا تھا یہ درست نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آخری بدھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع سے رات کو جب تشریف لا کر گھر پہنچے تو سردر و دروازہ بخار شروع ہوا۔ اور مسلسل تیرہ (۱۳) ایام بیماری میں گزرے تا آنکہ بارہ ربیع الاول پیر کے دن اختتام پر منگل کی رات وصال ہوا۔ (اللہ وانا الیہ راجعون)

چونکہ یہود نے اس دن (بدھ) کو خوشی منائی تھی اسی طرح ایران کے مجوس نے بھی جشن سامنایا تھا پھر وہ روایت ہندوستان آگئی اور سادہ لوح مسلمان نیکی کے نام پر بدی اور خوشی کے نام پر غم کے موقع پر خرافات میں جنس گئے لہذا اس کی حیثیت بھی باقی رسومات کی طرح ایک بے بنیاد روایت پر مبنی ہے اس سے بچنا چاہئے۔ بعض شارحین کہتے ہیں کہ صفر ایک دانہ پیٹ کے اندر تصور کیا جاتا تھا لوگ اسے عدوی گمان کرتے تھے یا ایک کیڑا یا سانپ تصور کیا جاتا جو ان کے بزم پیٹ کے اندر مفروضے کے تحت بھوک کے وقت کاٹا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں سے ممانعت فرمادی۔ (باب کی روایت صحیح ہے)

باب ماجاء فی الایمان بالقدر خیرہ وشرہ

”عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یؤمن عبد حتی یؤمن بالقدر خیرہ وشرہ حتی یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیعطہ وان ما اعطاه لم یکن لیصیہ۔“^۱

(غریب)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

باب ماجاء فی الایمان بالقدر خیرہ وشرہ

۱۔ وفی مسند احمد ص: ۴۸۸ ج: ۲ حدیث: ۶۶۶۳ لا یؤمن المرء حتی یؤمن بالقدر خیرہ وشرہ، ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۴۸۹ ج: ۷ کتاب القدر.

فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ تقدیر اور اس کے خیر و شر پر ایمان نہیں لاتا اور یہاں تک کہ وہ یقین نہ کرے کہ جو کچھ اسے لاحق ہوا وہ چوکنے والا نہ تھا اور جو کچھ چوک گیا وہ اسے پہنچنے والا نہ تھا۔

تشریح:- یعنی ایمان کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ نعمت و راحت یا زحمت و مصیبت خواہ جسمانی ہو یا روحانی ہو، نفسی ہو یا آفاقی جو چیز ان میں سے جس بندے کے لئے مقدر ہو تو وہ ضرور اس کا سامنا کرے گا اور اگر کوئی چیز مقدر نہیں تو کوئی امکان نہیں کہ اسے ممکن بنایا جائے چہ جائے کہ اسے حاصل کیا جائے۔

دوسری حدیث:- ”عن علیؑ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یؤمن عبد حتی یؤمن بأربع یشہد ان لا الہ الا اللہ و انی رسول اللہ بعثنی بالحق، ویؤمن بالموت ویؤمن بالبعث بعد الموت ویؤمن بالقدر“۔^۱

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک چار باتوں پر ایمان نہ لائے (۱) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اس نے مجھے سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت پر ایمان لائے۔ (۳) موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لائے۔ (۴) اور تقدیر پر ایمان لائے۔

تشریح:- باب کی دونوں روایتوں میں ”لا یؤمن“ اور ”لا“ نفی کمال کے لئے نہیں بلکہ نفی جنس اور نفی ذات کے لئے ہے۔ یعنی جس آدمی کا یہ عقیدہ نہ ہو وہ دوسرے سے مؤمن اور مسلمان نہیں۔ قالہ القاری۔ ایمان بالموت سے مراد قیامت کا یقین اور تصدیق کرنا ہے۔

باب ماجاء ان النفس تموت حیث ما کتب لها

”عن مطرب بن عکامس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا قضی اللہ لعبد ان یموت بارض جعل له البها حاجة“۔^۲ (حسن غریب)

ج. رواہ ابیضا ابن ماجہ ص: ۹ ”باب القدر“ مقدمہ و مسلم فی کتاب الایمان.

باب ماجاء ان النفس تموت حیث ما کتب لها

۱. وفی مسند احمد عن مطرب بن عکامس قال قال رسول اللہ ﷺ اذا قضی اللہ مینہ عبد بارض من جعل له البها حاجة ص: ۲۹۹ ج: ۲ حدیث: ۲۱۴۷.

حضرت مطرب بن عکاس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ کسی بندے کے بارے میں کسی جگہ موت کا فیصلہ فرماتا ہے تو اس کو وہاں جانے کی ضرورت درپیش فرماتا ہے۔

تشریح:۔ اس باب میں انہی الفاظ سے دوسری روایت بھی ہے جو ابو عروہ سے مروی ہے، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ جہاں موت مقدر ہو تو اس جگہ کی مٹی انسان کے خیر میں اس وقت شامل کر دی جاتی ہے جب وہ ابتدائی توہم کی حالت میں ہو پھر عند الموت وہ وہیں چلا جاتا ہے۔ قال اللہ: ”منہا حلقنا کم وفيہا نعید کم ومنہا نخرجکم تارۃ۔“ الخ تاہم اس آیت کا دوسرا مطلب بھی ہے کہ مراد نفس ارض اور جنس زمین ہو، اس بارے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کا واقعہ بھی مشہور ہے جو اسرائیلی روایات کا حصہ ہے۔

باب ماجاء لا ترد الرقی والدواء من قدر الله شیئاً

”عن ابن ابی عزمۃ عن ابیہ ان رجلاً اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: أرأیت رقی نسترفیہا ودواء نستداوی بہ ونقلدہ نستقیہا هل ترد من قدر اللہ شیئاً؟ قال: ہی من قدر اللہ۔“

ملاحظہ:۔ اس حدیث کا ترجمہ و مطلب اور ضروری تشریح ابواب الطب میں گذری ہے۔ (دیکھئے ماجاء فی الرقی والدواء) البتہ یہاں سائل ایک رجل کو قرار دیا ہے جبکہ وہاں ہے ”سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ الخ مگر روایات میں ایسا ہونا کوئی اضطراب نہیں کیونکہ راوی کبھی خود کو عتاب بھی فرض کرتا ہے، نیز یہاں لفظ ابن کا اضافہ وہم راوی پر مبنی ہے اصل روایت میں ”عن ابنی عزمۃ“ الخ ہے جیسا کہ وہاں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، اور یہ کہ اس حدیث کا مضمون بالا جماع صحیح ہے۔ قالہ ابن العربی فی العارضۃ

باب ماجاء فی القدریة

”عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صنفان من امتی ليس لهما فی الاسلام نصيب المرجئة والقدریة“۔ (حسن غریب) ۱

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کی دو قسمیں (گروہ یا جماعتیں) ایسی ہیں کہ جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں وہ مرجئہ اور قدریہ ہیں۔

لغات:۔ قولہ ”صنفان“ صنف بکسر الصاد کا شنیہ ہے نوع اور قسم کو کہتے ہیں۔ قولہ ”مرجئہ“ ارجاء سے ہے بمعنی تاخیر کے اور کبھی ہمزہ کو یا سے بھی تبدیل کیا جاتا ہے جیسے مرجئہ، یہ لوگ کس چیز کی تاخیر کے قائل ہیں؟ تو اس بارے میں متعدد اقوال ہیں، کسی نے کہا کہ یہ عمل کو ایمان سے الگ کرتے ہیں کہ نفس تصدیق کی صورت میں جتنے بھی گناہ کیوں نہ ہوں مگر اس سے عذاب مؤخر یعنی نفی ہوگا، مگر یہاں جو معنی مناسب ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان کو تقدیر کے آگے بالکل جماد کی مانند مجبور محض اور بے اختیار قرار دیا ہے لہذا وہ احکام باری تعالیٰ کی تاخیر کے قائل ہیں کہ بقول ان کے انسان کی نہ کوئی مرضی چلتی ہے اور نہ ہی اپنا اختیار چلتا ہے بس وہ تقدیر کے آگے بے بس ہے اس لئے ان لوگوں کا دوسرا نام جبریہ بھی مشہور ہوا ہے۔ قولہ ”القدریہ“ یہ لوگ تقدیر میں زیادہ بحث کی وجہ سے گویا انکار کے قریب ہو گئے اگرچہ انہوں نے صریح انکار تو نہیں کیا ہے جسے التزام کفر قرار دے کر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے مگر اس کے قریب جانے کی وجہ سے مجازاً ان کو منکرین قدر کہا جاتا ہے۔ گویا لزوم انکار کو مباحثۃ التزام قرار دیا۔

تشریح:۔ اس حدیث پر محشی ترمذی نے تفصیل سے بحث فرمائی ہے اور مختلف اقوال وضع تضعیف اور مخدوش توثیق کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”ولا شک ان تحسین“ ت” (ترمذی) ملہ مقدم علی

باب ماجاء فی القدریة

۱۔ وعن ابی سعید قال قال رسول الله ﷺ: صنفان من امتی ليس لهما فی الاسلام نصيب، المرجئة والقدریة، ایضاً روی مثله عن اجابر وعن والدة بن الاسقع قال قال: رسول الله ﷺ صنفان من هذه الامة لا تلتا لهما شفاعتی، المرجئة والقدریة، راجع للروایات مجمع الزوائد ص: ۳۰۱ ج: ۷ کتاب القدر.

هذه الاشياء مع ما اشار اليه من شواهد عن ذكر من الصحابة انتهى "۔ غرض اس بارے میں علی بن نزار باپ بیٹا دونوں، اسی طرح سلام بن ابی عمرہ کے ضعف کے باوجود روایت درجہ حسن پر فائز ہے۔ کما قالہ الترمذی۔

بیانِ مذاہب :- انسان کہاں تک با اختیار ہے اور کہاں تک بے بس، اس بارے میں کافی اختلاف ہے، یہ اختلاف جیسے اہل قبلہ کے درمیان ہے اسی طرح اہل قبلہ کا دوسروں سے بھی ہے۔

(۱) ... دہریہ اور مادہ پرستوں کا زعم تو اس بارے میں واضح ہے کہ وہ کسی تقدیر یا خالق و مالک کے قائل نہیں ہیں، پھر ان میں بھی بہت سارے نظریات ہیں کوئی ڈاروین وغیرہ کے پیروکار ہیں اور عالم کے وجود کی اپنے طور پر تشریح کرتے ہیں اور انسان کے ارتقائی عمل کے قائل ہیں۔ کوئی اجزائے دیمقرطسیہ کو بنیاد بنا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ راقم کا اس موضوع پر ایک مستقل کتابچہ بنام ”الصحیح الاولیٰ“ ہے۔

(۲) ...مجس کہتے ہیں کہ خالق و مالک دو ہیں: ایک خالق خیر جو بھلائی کا خالق ہے جو دوسرا خالق شر جو بُرائی کا، خالق خیر کو یزدان کہتے ہیں اور خالق شر کو کُہنرُسن۔ بذلِ انجود میں اس کی تعبیر ذرا مختلف ہے: ”فان المحسوس قالون بخالقین وهما النور والظلمة، فخالق الخیر النور وخالق الشر الظلمة“۔ چنانچہ اسی وجہ سے ایرانی زمانہ قدیم سے آگ کی عبادت کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ نور ہے اور نفع رساں ہے، یعنی بقول ان کے۔

(۳)۔ فرق اسلامیہ میں سے معتزلہ کہتے ہیں انسان اپنے تمام افعال کا خالق ہے، شرع عقائد میں ہے کہ ان کے اوائل انسان پر خالق کے بجائے موجود اور مخترع کا اطلاق کرتے تھے مگر جبائی اور اس کے اتباع کے بعد والوں نے سوچا کہ یہ سب الفاظ ہم معنی ہیں اس لئے انہوں نے صاف طور سے عہد یعنی انسان کو خالق سے تعبیر کیا۔

(۴)۔ قدریہ جن کا نظریہ مختصر آؤپ لکھا جا چکا ہے ان کے بارے میں دورائے ہیں: ایک یہ کہ قدریہ معتزلہ کی قسم اور ذیلی شاخ ہے۔ دوسری رائے ان کے بارے میں یہ ہے کہ یہ خوارج کی ایک جماعت و گروہ کا نام ہے۔ بہر حال ان کا زعم یہ ہے کہ انسانی افعال و طرح کے ہیں: ایک اچھے اور دوم بُرے، پس اچھے اعمال کا خالق اللہ ہے اور قبیح کا بندہ خود ہے، تاہم ابواؤد کی روایت میں ہے: ”القدریہ محسوس هذه الامة“۔^۱

تا ہم قدر یہ اوپر کی استثنائی صورت کے علاوہ باقی تمام مخلوقات خواہ وہ شرعی کیوں نہ ہو سب کا خالق اللہ کو مانتے ہیں، بذل الحمود میں ہے:

”وَالْقَدَرَةُ كَذَلِكَ فَانْهَم بِقَوْلِهِمْ اِنْ خَالِقُ الْخَيْرِ وَالْشَّرِّ هُوَ اللَّهُ تَعَالَى وَخَالِقُ الشَّرِّ... وَجَمِيعِ الْمَخْلُوقَاتِ مِنَ الْخَيْرِ وَالشَّرِّ الْقَبَائِحِ مَخْلُوقٌ لِلَّهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى لَا شَرِيكَ لَهُ غَيْرٌ“۔ (ص: ۲۱۰ ج: ۶ کتاب النبی)

(۵)۔... جبریہ جو جہمیہ کے نام سے مشہور ہیں انسان کو مجبور مانتے ہیں ان کا موقف اور لغات کے تحت مرحہ کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔

(۶)۔ اہل السنۃ والجماعت یہ نہ تو انسان کو خالق مانتے ہیں اور نہ ہی مجبور اور جبراً کی طرح تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ حضرات افراط و تفریط کے درمیان درجہ اعتدال کے قائل ہیں کہ بندہ کا سب تو ہے مگر خالق نہیں ہے۔ دلائل:۔ جو لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں ان کے نظریات کی تشریح، ان کے استدلالات اور پھر ان کے جوابات طویل سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اس لئے ان کو یہاں درج کرنا تطویلِ بمل سے خالی نہیں کہ اس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ جہاں تک باقی جماعات کا تعلق ہے تو ان کے آپس میں اختلاف کا دار و مدار دو طرح کے دلائل پر ہے: ایک نقلیہ اور دوم عقلیہ، نقلیہ میں دو قسم کی آیات ہیں، بعض میں افعال کی نسبت اللہ عزوجل کی جانب کی گئی ہے: جیسے ”مضلل من مشاء ونهدي من مشاء“۔ جبکہ بعض عبد کی طرف منسوب کی گئی ہیں: مثلاً ”اعملوا ما شئتم“۔ پس ایک فریق نے اول کو حقیقت اور دوسری کو مجاز پر محمول کیا ہے یہ اہل السنۃ والجماعت ہیں، جبکہ معتزلہ و قدریہ نے اس کے برعکس موقف اپنایا ہے۔

یہ مسئلہ شرح عقائد میں تفصیل سے بیان ہوا ہے اس لئے جو حضرات تفصیل کے خواہشمند ہوں وہ وہیں دیکھ لیں، یہاں اختصار کے پیش نظر خلاصہ اولہ پیش کیا جا رہا ہے۔

معتزلہ کی پہلی دلیل:۔ یہ ہے کہ اگر سب افعال اللہ عزوجل کی تخلیق ہیں تو پھر انسان مجبور ہو گیا کہ وہ اللہ کی تکوین و تخلیق کے آگے اپنا اختیار تو استعمال کر نہیں کر سکتا ہے، پھر تکلیف کا فائدہ نہ رہا اور ثواب و عقاب کا استحقاق ختم ہوا۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا استدلال جبریہ کے خلاف تو چل سکتا ہے مگر ہمارے خلاف

نہیں کہ ہم باوجود عدم خالقیت عبد کے اس کے اختیار کے قائل ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

دوسری دلیل :- وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ افعال عباد کا خالق ہو تو پھر وہ قائم و قادر، آکل و شارب وغیرہ بھی ہوگا، علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ یہ تو بڑی جہالت کی بات انہوں نے کی ہے کیونکہ ان افعال سے وہی متصف ہوتا ہے جس کے ساتھ یہ صفات قائم ہوں نہ یہ کہ وہ خالق ہو "اولا یرون ان اللہ تعالیٰ هو العالق للسوداء والبیاض و سایر الصفات فی الاجسام ولا یتصف بذلك" یعنی اگر آپ کی بات صحیح ہوتی تو پھر عبد کے افعال غیر اختیاریہ کے بارے میں کیا کہو گے کیا اللہ کو ان سے موصوف مانو گے؟ والعیاذ باللہ۔

تیسری دلیل :- "وربما یتسلک بقولہ تعالیٰ: فیتبارک اللہ احسن العالقین،

واذنخلق من الطین کھینۃ الطیر" ^۱ والحواب ان المعلق ہونا بمعنی التقدير۔

یعنی اس قسم کی آیات میں خلق کی نسبت مجازی بمعنی التقدير و اندازے کے ہے۔

قد یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کے برے افعال کا خالق مان لیا جائے تو ان قبائح کی نسبت اللہ کی جانب ہوگی، اور اس سے ملتا جلتا استدلال مجوس کا بھی ہے۔

جواب :- اس کا جواب یہ ہے کہ کسی قبیح فعل کی نسبت کا سب کی طرف ہوتی ہے، خالق کی جانب نہیں کیونکہ خلق تو فیضان الوجود کا نام ہے جو بذات خود حسن ہی حسن ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ خلق اور کسب میں کیا فرق ہے؟ تو یہ آگے آ رہا ہے۔

جبر یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ نے کوئی چیز تقدیر میں لکھی ہو اور عبد اس کے خلاف پر قادر ہو جائے تو اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کا عاجز ہونا لازم آتا ہے نیز یہ اللہ کے علم ازیلی کے بھی منافی ہے اور ارادے کے بھی خلاف ہے۔ وغیرہ وغیرہ، بہت سارے استحالے لازم آئیں گے، چونکہ یہ سب تو الی محال ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ عبد، اللہ کے حکم کے آگے اور تقدیر کے سامنے مجبور ہے۔

جواب :- اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو آپ کا موقف مشاہدے اور حس کے خلاف ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رعشہ کی حرکت اور پکڑنے کی حرکت میں فرق ہے اول غیر اختیاری ہے جبکہ دوم بدلتہ ارادی و اختیاری ہے، مانتا پھر تو عبد کی تکلیف بمالایطاق ہوئی جس پر نہ ثواب ملتا ہے اور نہ گناہ۔ نیز یہ موقف لغوی استعمالات اور اصطلاحی محاورات کے بھی خلاف ہے کہ لوگ نماز وغیرہ کی نسبت عبد کی طرف کرتے ہیں اور اسے

حقیقی نسبت گردانتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ صریح نصوص کے بھی خلاف ہے۔

یہ بات کہ عبد اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تو یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے جبر لازم نہیں آتا کیونکہ اللہ نے اپنا ارادہ اور علم بندے کے ارادے کے ساتھ متعلق کیا ہے جب ازل میں اللہ نے دیکھا کہ فلاں فلاں کام بندہ فلاں فلاں وقت پر کرے گا تو اللہ کو واقعہ کے مطابق معلوم ہونا جبر کو مستلزم نہیں ہوا بلکہ اس سے تو انسانی ارادہ اور بھی پختہ ہوا: "قلنا یعلم ویریدان العبد یفعلہ او یرکہ باختياره فلا اشکال" (راجع المفصل ان شئت شرح العقائد النسفیہ)

اہل السنۃ والجماعۃ یا شاعرہ و ماترید یہ کے استدلالات درج ذیل ہیں۔

(۱).... پہلا استدلال :- یہ ہے کہ اگر بندہ کو خالق مانا جائے جیسا کہ معتزلہ و قدریہ مانتے ہیں تو پھر تو یہ عقیدہ مجوس سے بھی زیادہ جاہلانہ ہوگا کہ وہ دو خداؤں کے قائل ہیں اور اسلام میں زیادہ کے معتقد ہوں گے۔

(۲).... دوسرا استدلال :- یہ ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کی تفصیل سے آگاہی لازمی ہے جبکہ مثلاً کراچی سے لاہور تک پیدل چلنے والے کو اپنے قدموں کی تعداد اور عضلات کی حرکات تک کا پتہ نہیں ہوتا پھر یہ کیسی خلقت ہوئی؟

(۳).... تیسرا استدلال :- اس بارے میں نصوص صاف بتا رہی ہیں کہ بندہ کے افعال کا خالق بھی خدائے ذوالجلال ہے: مثلاً "واللہ خلقکم و ما تمعملون" کے بغیر ہا۔

اس کے برعکس اگر بندے کو مجبور اور بالکل بے اختیار مانا جائے تو تکلیف بمالایطاق لازم آتی ہے، اس لئے بیچ کا درجہ ماننا پڑے گا کہ عبد کا سب تو ہے مگر خالق نہیں یعنی جب وہ اپنا ارادہ کسی فعل سے متعلق کرتا ہے تو اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے فیضان وجود ہوتا ہے، اور چونکہ ایسے میں عبد اپنے آپ کو قادر سمجھتا ہے اور تکلیف کے لئے اتنی ہی قدرت بھی کافی ہے اس لئے کوئی استحالہ خلقت کا یا جبر کا لازم نہیں آتا، غرض تعلق ارادہ کسب ہے جبکہ وجود بنا خلق۔ خلق اور کسب کے درمیان مزید جو فرق کے لئے شرح عقائد دیکھئے۔

حضرت تھانویؒ بوار النوار میں فرماتے ہیں کہ افعال اختیار یہ میں انسان کا یہ اعتقاد کہ اگر چاہوں تو کر لوں گا اور نہ چاہوں تو نہیں ہوگا، ایسا اختیار ہے جو دلیل کا محتاج نہیں بلکہ بدیہی ہے اور یہی فعل کے صدور کی

علت قریبہ ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس اختیار کی صفت بھی، اور اس صفت کا فعل کے ساتھ تعلق بھی دونوں مخلوق ہیں حق تعالیٰ کے، اس طرح سے کہ تخلیق حق کے بعد ان کا عدم وقوع، قدرتِ عید سے خارج ہے اور یہ تخلیق علت بعیدہ ہے صدور افعال اختیاریہ کی، جس شخص نے افعال مذکورہ کی صرف علت قریبہ پر نظر کی وہ قدری ہو گیا اور جس نے صرف علت بعیدہ پر نظر کی وہ جبری ہو گیا اور جس نے دونوں پر نظر کی وہ کہہ کر کہ ”لا جبر — رای محضاً ولا قدر ای محضاً“ ولكن الامر بین بین“ سنی ہو گیا۔ (ص: ۹۳، اذکار اسلامیات لاہور)

ارادے کے متعلق مائتد یہ اور اشاعرہ کے درمیان بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ (راجع للتفصیل کتب العقائد من شرح العقائد وشروح المواقف وغیرھا) شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ارادے کا سبب خیالات ہیں اور خیالات کے کم از کم پانچ اسباب ہیں۔ (راجع للتفصیل حجتہ اللہ البالغہ، باب فی اسباب الخواطر الباعثہ علی الاعمال)

اشکال:- اگر معتزلہ و قدریہ خالقیتِ عید کے قائل ہیں تو پھر تو وہ مشرک ہوئے حالانکہ ان پر اسلاف نے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا ہے ایسا کیوں ہوا؟

جواب:- اس کا جواب شرح عقائد میں دیا ہے کہ شرک یہ ہے کہ کسی کو اللہ کے ساتھ الوہیت بمعنی وجوب الوجود یا استحقاق العبادت میں شریک مانا جائے جبکہ معتزلہ وغیرہ اس کے قائل نہیں بلکہ وہ بندے کی خالقیت کو بھی اللہ کی خالقیت کی طرح نہیں مانتے ہیں کیونکہ وہ بندے کو اسباب و آلات کا محتاج تسلیم کرتے ہیں۔ (ص: ۶۱)

علیٰ ہذا حدیث الباب میں ”کیس لہما فی الاسلام نصیب“ تغلیظ پر محمول ہے، یہی جمہور اور محققین کا مذہب ہے۔

باب

”عن مُطَرِّف بن عبد اللہ بن الشَّحْرِ عن ابيه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مُثِّلَ ابن ادم والی جنبہ تسعة وتسعون منیة ان اخطأ نه المنا یا وقع فی الہرم حتی یموت“۔^۱ (حسن غریب)

باب (بلا ترجمہ)

۱۔ ایضاً رواہ الترمذی فی القیامۃ باب: ۲۲۔

حضرت مطرف اپنے والد عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آدم زاد کو بنایا (یعنی پیدا کیا) جاتا ہے دریاں حالیکہ اس کے پہلو میں (اروگرد) ننانوے مہلکات ہوتے ہیں اگر یہ سب چوک جائیں تو بالآخر وہ بڑھاپے میں پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ مر جاتا ہے۔

لغات:- قولہ ”مطرف“ بضم المیم وتشدید الراء المکسورة بصيغة اسم فاعل۔ قولہ ”الشخیر“ بکسر الشین وکسر الخاء المشددة وسکون الیاء، حضرت عبداللہ بن الشخیر عامری ”یَعُدُّ فِی الْبَصَرِیْن وَفِی الدَّالِی النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی بَنِی عَامِرٍ“۔ قولہ ”مُتَلِّ“ بضم المیم وکسر الشاء بصيغة مجهول ای صُوِّرَ وَخُلِقَ، ابن ادم اس کا نائب فاعل ہے۔ قولہ ”منیة“ بفتح المیم، ہلاکت خیز مصیبت اور بلا کو کہتے ہیں جو موت کا سبب قوی ہو اس لئے اس کا اطلاق عین صحت پر بھی کیا جاتا ہے۔ قولہ ”الہرم“ بر وزن قمر شدید بڑھاپے کو کہتے ہیں۔

تشریح:- ننانوے کا عدد تکثیر کے لئے ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی صورت میں موت سے بچ نہیں سکتا کیونکہ پیدا ہوتے ہی وہ امراض و آفات کی لپیٹ میں آ جاتا ہے خواہ وہ بچنے کی جتنی بھی تدابیر کرے مگر وہ بچ نہیں سکتا اس لئے عام لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی بیماریوں یا حادثوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں مگر بالفرض اور شاذ و نادر جو بچ جاتے ہیں تو انہی (۸۰) سو (۱۰۰) سال کے بعد وہ شدید بڑھاپے کی آغوش میں خود بخود خوائی و ناخوائی چلے جاتے ہیں اور یہی ان کا آخری مرحلہ ہوتا ہے اس کے بعد کوئی امکان بچنے کا نہیں رہتا کما ہوا الشہد، کسی نے خوب کہا ہے۔ ”لِنُؤَلِّمُوت“ دنیا میں آنا ہی جانے کا پیغام و پیش خیمہ بلکہ مستلزم للذہاب ہے۔

باب ماجاء فی الرضاء بالقضاء

”عن سعلقال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سعادة ابن آدم رضاه بما قضى الله له ومن شقاوة ابن آدم تركه استخارة الله ومن شقاوة ابن آدم سحقه بما قضى الله له“۔^۱ (غریب)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: کہ آدمی کی نیک بختی میں سے ہے اس کا راضی ہونا اللہ کے فیصلہ پر جو اس کے حق میں کیا ہے اور آدمی کی بد بختی میں سے ہے اللہ سے خیر نہ مانگنا اور آدمی کی اس کے بارے میں اللہ کے فیصلہ پر ناراضگی، بد بختی میں سے ہے۔

تشریح:- حدیث میں دو امرین کا ذکر ہے: ایک اللہ کے فیصلہ پر راضی ہونا اور دوم راضی نہ ہونا ان کے درمیان بطور جملہ معترضہ طلب خیر چھوڑنے کو بھی بد بختی کی علامت قرار دیا ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ کوئی راضی ہونے کا مطلب یہ نہ لے کر بیٹھے کہ ہوگا تو ویسے بھی وہی جو میرے رب نے لکھا ہے پھر طلب و محنت کی کیا ضرورت ہے چونکہ سابقہ ابواب میں بارہا گذرا ہے کہ تقدیر کے ساتھ ساتھ عمل بھی لازمی ہے اس لئے ترک عمل کو بد بختی قرار دیا۔ رضاء بالقضاء میں ایک حکمت و فائدہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے غضب سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ راضی ہونے والا اپنی عہدیت کا بزبان قال و حال اقرار کرتا ہے جبکہ ناراض ہونے والا گویا شرکت کا دعویدار ہے کہ میرا حصہ مجھے کیوں نہیں دیا وغیرہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ جب تقدیر پر راضی ہوگا تو اسے ہر حالت میں اطمینان قلبی اور سکون نصیب ہوگا تو وہ اپنی عبادت و جمعی کے ساتھ کر سکے گا۔

اعتراض:- یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک طرف رضاء بالقضاء واجب ہے جیسا کہ عقائد کی کتب میں ہے، دوسری طرف کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ کفر مقہی ہے جبکہ رضاء قضاء پر واجب ہے مقہی پر نہیں۔

شرح عقائد میں ہے:

”لا يقال لو كان الكفر بقضاء الله تعالى لوجب الرضاء به لان الرضاء بالقضاء

واجب والالزام باطل، لان الرضاء بالكفر كفر، لانا نقول: الكفر مقضى لا لقضاء

والرضاء انما يجب بالقضاء دون المقضى“۔ (ص: ۶۳)

تاہم اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی ملحوظ ہو کہ اگرچہ قضا اللہ کی صفت ہے اور کفر بندے کا وصف اور فعل ہے مگر رضاء بالکفر کی صورت میں اللہ کی صفت پر رضا تو مراد نہیں ہو سکتی اس لئے بعض محققین نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ رضاء بالكفر من حیث انہ کفر یعنی من حیث ذات الکفر، کفر ہے اور من حیث انہ مقہی بہ کفر نہیں بلکہ رضاء بالقضاء ہے۔ تدبر فائدہ دیتا و باحفظ۔ طبع

باب

”نافع ان ابن عمر جاءه رجل فقال: ان فلاناً يقرأ عليك السلام فقال: انه بلغني انه قد احدث فان كان قد احدث فلا تقره مني السلام فاني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: يكون في هذه الامة اوفى امتي الشك منه حسف او مسخ او قذف في اهل القدر“۔
(حسن صحيح)

حضرت نافع نے بیان کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آ کر کہنے لگا کہ فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے، تو انہوں نے فرمایا (یعنی ابن عمرؓ نے) کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ اس نے دین میں بدعت نکالی ہے تو اگر واقعی اس نے کوئی نئی بات نکالی ہو تو میری طرف سے اس کو سلام نہ کہنا (یعنی جواب سلام مت پہنچاؤ کہ میں اس کا سلام نہیں لیتا) کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس امت میں یا فرمایا کہ میری امت میں (راوی کو شک ہے) دھنسا ہو گا یا چروں کا بگڑنا ہو گا یا سنگ باری ہو گی، یہ اہل قدر میں ہو گی۔

لغات:۔ قولہ ”فی هذه الامة اوفى امتي“ یہاں پر لفظ ”اوفى“ شک من الراوی کے لئے ہے جیسا کہ اس کے بعد تصریح ہے شک کی، کہ آیا نبی علیہ السلام نے ”فی هذه الامة“ فرمایا یا ”فی امتي“۔ قولہ ”حسف او مسخ او قذف“ اس مقام پر ”اوفى“ میں دونوں احتمال ہیں: شک کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور تنویع کے لئے بھی۔ ”حسف زمین میں دھنسا جانے کو کہتے ہیں اور مسخ شکل بگڑنے کو جیسے بندریا خنزیر وغیرہ کی شکل اختیار کرنا اور قذف پتھر برسنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فی اهل القدر“ فی امتی سے بدل بعض باعادة الجار ہے۔

تشریح:۔ یہ آدمی جو تقدیر کے متعلق نئی نئی باتیں کرتا تھا کوئی منکر تقدیر نہ تھا مگر چونکہ اپنی عقل سے بحث کرتا تھا جو ممنوع ہے اس لئے یہ بدعت کا مرتکب ہوا۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بدعتی کو سلام کرنا جائز نہیں ہے اور چونکہ جواب دینا فرض ہے تو باوجود اس کے جب جواب نہ دینا چاہئے تو سلام کرنا بطریق اولیٰ نہ چاہئے کیونکہ ابتداء بالسلام سنت ہے واجب یا فرض نہیں ہے۔ (المسک الذکی)

باب (بلا ترجمہ)

۱۔ روی بسننہ ابوداؤد کثافہ مشکوۃ المصابیح ص: ۲۲ ”باب الايمان“ ابضاً رواه احمد بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۹۶ ج: ۴۔

ابن قیم رحمہ اللہ زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کے سلام کا جواب علی الاصح واجب ہے جبکہ مبتدع کا ممنوع ہے:

”واعتلّف فی الرد علیہم (ای علی البہود والنصارى) بالصواب وجوبہ والفرق بینہم وبين اهل البدع انما أمورون بهجرهم“ (ای المبتدعة)۔

(مختصر زاد المعاد ص: ۱۰۹، فصل فی حدیۃ علیہ الصلوٰۃ والسلام فی السلام علی اہل الکتاب)

سوال:- اس حدیث میں اہل قدر یعنی تقدیر میں بے جا بحث کرنے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان پر حنف وغیرہ کا عذاب آئے گا جبکہ دوسری روایات سے ثابت ہے کہ آنحضور علیہ السلام کی امت پر اس قسم کا عذاب نہیں آئے گا، پس یہ تو بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے؟

جواب:- اس کے متعدد جوابات ہیں: ایک یہ کہ ممنوع عام عذاب ہے جبکہ یہاں خاص فرقے کی بات کی گئی ہے۔

دوسرا جواب:- دوسرا جواب یہ ہے کہ جب تک امت مرحومہ کے لوگ بحالی اتباع شریعت رہیں گے تو وہ بخفاقت ہوں گے مگر جب وہ بگڑ جائیں گے تو پھر ان کے چہرے بھی بگڑ سکتے ہیں کہ باطن کا اثر ظاہر پر رونما ہوتا ہے۔

باب کی دوسری حدیث:- حضرت عبدالواحد بن سلیم فرماتے ہیں کہ میں مکہ آیا تو عطاء بن ابی رباح سے میری ملاقات ہوئی، میں نے ان سے کہا اے ابامحمد! اہل بصرہ تقدیر کے بارے میں بحث کرتے ہیں (یعنی عقلی انداز سے) تو حضرت عطاء نے فرمایا اے میرے بیٹے! کیا تم قرآن پڑھتے ہو (یعنی حافظ ہو یا مطلب تلاوت کرتے ہو؟) میں نے عرض کیا ”ہاں“ آپ نے فرمایا تو پھر ”زخرف“ پڑھو، کہتے ہیں میں نے ”حسم والکتاب المبین انما جعلناه قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون وانہ فی ام الکتاب للہنالی حکیم“ ع۔ تک پڑھا، عطاء نے فرمایا تم جانتے ہو کہ ”ام الکتاب“ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ”اللہ ورسولہ اعلم“، انہوں نے فرمایا بے شک یہ ایک کتاب ہے جس کو اللہ نے آسمان کے پیدا کرنے سے پہلے اور زمین کے پیدا کرنے سے بھی پہلے لکھا ہے، اس میں ہے: ”ان فرعون من اهل النار“ اور اس میں ہے: ”نبت بدالی لب ونب“ ع۔ حضرت عطاء نے فرمایا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت ولید بن عبادہ سے میری

ملاقات ہوئی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے والد نے وفات کے وقت آپ کو کیا وصیت کی تھی؟ ولید نے کہا کہ انہوں نے مجھے بکا کر فرمایا اے بیٹے! اللہ سے ڈرتے رہنا اور یقین جانو (حاشیہ کے نسخے کے مطابق) کہ تم اس وقت تک اللہ سے ڈرنے والا نہیں ہو گے جب تک اللہ پر ایمان نہ لائے اور ساری تقدیر پر، اس میں خیر و شر پر ایمان نہیں لاتا، پس اگر تم اس کے علاوہ دوسرے عقیدے پر مرد گے تو دوزخ میں جاؤ گے، بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا، پھر اس سے فرمایا: لکھو، قلم نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ تقدیر لکھو جو ہوا اور جو کچھ ہمیشہ یعنی قیامت تک ہونے والا ہے۔ (حدیث غریب)

تشریح:۔ اس حدیث میں جو آیت سورہ زخرف کی آئی ہے اس میں ”ام الکتاب“ سے مراد لوح محفوظ ہے اور آخر حدیث میں قلم کا ذکر آیا ہے، لہذا مطلب یہ ہوا کہ قلم نے جو کچھ لکھا ہے وہ لوح محفوظ پر منقش اور مکتوب ہے، تاہم لفظ ”ماکان وما هو کائن الی الابد“ سے مراد اگلی پچھلی سب کائنات یا سب معلومات و مقدمات وغیرہ نہیں کیونکہ ماکان بھی لاحق تھا ہی ہیں کہ اللہ کی صفات اور معلومات ازل میں بھی لاحق تھیں اور ماہو کائن الی الابد بھی غیر متناہی ہیں جبکہ لوح محفوظ متناہی ہے، اس لئے ماکان سے مراد آنحضور علیہ السلام کے اس ارشاد سے پہلے کا زمانہ مراد ہے اور ماہو کائن سے اس کے بعد آنے والا زمانہ تا قیام قیامت، کیونکہ ابد بمعنی مدت طویلہ بھی آتا ہے جو یہاں مراد ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ماکان سے مراد قلم سے پہلے کی مخلوقات ہیں جیسے عرش و کرسی وغیرہ علیٰ ہذا ”اول ما خلق اللہ القلم“ سے مراد قبلیت اضافی ہوگی یعنی اس محسوس عالم سے قبل۔

چونکہ اس بارے میں بہت سی روایات میں اول کا لفظ وارد ہوا ہے اس لئے کسی چیز کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہی حتماً مقدم ہے۔

باب کی روایت سے قلم کی اولیت ثابت ہوتی ہے جبکہ مسلم ۵ کی روایت سے عرش اور پانی کی تقدیم

۱۱ رواہ رزمین کذا فی جمع الفوائد ص: ۴۷۷ ج: ۲ ”کتاب بدء الخلق وعجائبہ“ حدیث: ۹۱۷۳، ابیضا رواہ ابویعلیٰ ورجاله ثقات بحوالہ مجمع الزوائد ص: ۴۷۹ ج: ۷ کتاب القدر.

۱۲ رواہ البخاری ص: ۳۵۳ ج: ۱ کتاب بدء الخلق، ابیضا رواہ الترمذی فی کتاب التفسیر، جمع الفوائد ص: ۴۷۷ ج: ۲، صحیح مسلم ص: ۳۳۵ ج: ۲.

ثابت ہوتی ہے تاہم پانی میں تو یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد غلاء ہے کیونکہ غلاء کو دیکھتے وقت پانی محسوس ہوتا ہے۔ بعض روایات سے آنحضور علیہ السلام کی روح کی اولیت معلوم ہوتی ہے۔^۱

ان روایات میں تطبیق اسی طرح ممکن ہے کہ اولیت سے مراد اضافی لی جائے چونکہ ہر چیز بالنسبۃ الی المبدأ خراول و مقدم کہلاتی ہے اس لئے سب روایات بیک وقت باہم موافق ہیں کہ بعض سب سے پہلے ہیں اور بعض سموات والارض پر مقدم ہیں۔

ملفوظ:۔ ترمذی کے بعض نسخوں میں یہاں اس حدیث سے پہلے ایک اور حدیث کا اضافہ ہے جیسے متن عارضہ اور متن تحفہ دونوں پر موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے:

”عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سِنَّةٌ لَعَنَتْهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ
وَكُلُّ نَبِيٍّ بِحَابٍ، الزَّالِفِيُّ كِتَابُ اللَّهِ، وَالْمَكْذِبُ بِقَدْرِ اللَّهِ وَالْمُتَسَلِّطُ
بِالْجَبَرُوتِ يُعَزَّ بِذَلِكَ مِنَ اللَّهِ وَيُذَلُّ مِنْ أَعَزَّهُ اللَّهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللَّهِ
وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عَتَرَتِي مَاحَرَّمُ اللَّهِ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي“۔^۲

تاہم مشکوٰۃ میں اس روایت کے بعد لکھا ہے: ”رواہ البیہقی فی المدخل ووزین فی کتابہ“۔
اس میں ترمذی کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔

حدیث عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ:۔ ”بقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم
بقول: قدر الله المقادير قبل ان يخلق السموات والارضين بخمسين الف سنة“۔^۳ (حسن
صحيح غريب)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ نے تقادیر کو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے
مقرر (حسین) فرمایا۔

۱ اور وزین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اصل کو بنایا گیا، عن ابن مسعود رفعه اول ما خلق الله العقل الخ جمع
الفوائد ص: ۳۷ ج: ۲۔

۲ رواہ ابیضا الطبرانی فی الکبیر حدیث: ۲۸۸۳ وصحیحہ ابن حبان بمعوالہ مجمع الزوائد ص: ۲۹۹ ج: ۷
حدیث: ۱۱۸۷۶۔ ۳ ابیضا رواہ احمد علی مسئلہ ص: ۴۵۸ ج: ۲ حدیث: ۶۵۳۳۔

لغات :- قولہ ”المقادیر“ مقدار کی جمع ہے، بیانے کو بھی کہتے ہیں خواہ وہ کسی بھی چیز کی پیمائش کا ہو اور قدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔

تشریح :- پچاس ہزار سال کا عدد کثیر بلکہ لاتناہی کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور محدود وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے ہاں اگرچہ اس وقت شب و روز کا وجود نہ تھا کیونکہ یہ تو زمین کی سورج کے گرد گھوری حرکت سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ بھی صرف اٹھارہ فرسخ یعنی تقریباً چوں میل کی بلندی تک ہیں، اس سے اوپر کوئی دن رات کا فرق نہیں مگر یقیناً ازل میں اور دنیا کے خاتمے کے بعد بھی کوئی نہ کوئی اندازہ تو ہوگا اگرچہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے مگر اللہ عزوجل کے لئے تو کوئی مشکل نہیں۔

متعدد روایات میں تطبیق :- یہاں بظاہر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ بعض روایات سے مذکورہ عدد کے علاوہ بھی تقدیر کا لکھنا ثابت ہے مثلاً حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے جس مناظرے کا ذکر ترمذی میں گزرا ہے اس کے مسلم شریف والے طریق میں ہے: ”قَبِیْکُمْ وَجَدْتُ اللّٰهَ کَتَبَ التَّوْرَةَ قَبْلَ اَنْ اَخْلَقَ قَالَ مُوسٰی بَارِئِیْنَ عَامًا“۔ (مشکوٰۃ ص: ۱۹، ۹)

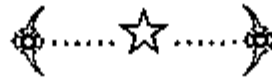
حل :- اس کا حل یہ ہے کہ اللہ عزوجل کو اگرچہ کسی چیز کے لکھنے کی ہرگز ضرورت نہیں مگر اللہ عزوجل کا ہر کام ضابطے کے مطابق ہوتا ہے، ایسے امور میں کیا کیا حکمتیں ہو سکتی ہیں ہماری عقل ان تک رسائی سے قاصر ہے، تاہم اپنی قدرت کا ہرہ اور حکمت کا ہرہ کے اظہار کے لئے اور فرشتوں کو نظام چلانے میں سہولت دینے کے لئے تقدیر کا نظام مرتب فرمایا جیسے قیامت کے دن وزن اعمال میں لوگوں کے سامنے ان کے اچھے بُرے عمل میں تمیز کی خاطر اور یہ کہ اللہ عادل بادشاہ ہے اظہار کے لئے میزان قائم کر دی ہے، علیٰ ہذا کہا جائے گا کہ تقدیر ایک اذلی ہے، پھر آسمانوں اور زمینوں سے پہلے زمینوں اور آسمانوں و مافیہما کے احوال دوبارہ الگ سے لکھ دیئے ہیں، پھر جب بچہ ماں کے پیٹ میں سانس لینے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی سے متعلق تقدیر مرتب کی جاتی ہے اور ہر سال کے لئے جو فیصلے ہوتے ہیں وہ بھی تحریر کئے جاتے ہیں، اور انسان کی روزانہ کی کارروائی بھی لکھی جاتی ہے، گویا ایک کلی نظام کی تقدیر کے بعد مختلف فائلیں تیار کی جاتی ہیں جو خاص درعام کے ذمے میں آتی ہیں، جیسے جنس کے اندر انواع اور انواع کے ضمن میں افراد ہوتے ہیں۔ تدبر و تشکر

”عن ابی ہریرۃ قال جاء مشرکوا قریش الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یخاصمون

فی القدر فنزلت هذه الآية: "يوم يُسحبون في النار على وجوههم ذوقوا مس سقرانا كل شئ خلقناه بقدر"۔ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ قریش کے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر تقدیر کے بارے میں بحث کرنے لگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (ترجمہ) جس روز یہ لوگ اپنے مونہوں کے بل جہنم میں مھینے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا کہ) (دوزخ کی آگ) کے لگنے کا مزہ چکھو، ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا ہے۔ (قرآن نمبر: ۴۸، ۴۹)

تشریح:- اس آیت کریمہ میں "بقدر" سے یہی تقدیر مراد ہے جس کے لئے امام ترمذی نے اتنی ساری احادیث ذکر فرمائی ہیں، اگرچہ علامہ باجی مالکی نے اس تفسیر میں کچھ اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے مگر وہ قابل التفات نہیں لہذا کہا جائے گا کہ قرآن و سنت دونوں اثبات تقدیر پر صریح ہیں، اس لئے عقیدہ تقدیر ایمان کا حصہ ہے، تاہم جو لوگ اس میں بحث کرتے ہیں ان کو احتیاطاً کا فرض نہیں کہنا چاہئے جیسا کہ سابقہ اوراق میں گذرا ہے۔



ابواب الفتن

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قوله "الفتن" فتنہ کی جمع ہے جس کے تقریباً درجن بھر معنی آتے ہیں، اصل لغت میں سونے، چاندی یا دیگر معدنیات کو جاڑنے کے لئے آگ پر تپانے اور پگھلانے کو کہتے ہیں، دیگر معانی یہ ہیں: آزمائش، گمراہی، فساد و ہنگامہ، فریبگی و گرویدگی، دیوانگی، جنگ و جدال، پریشانی و مصیبت اور عذاب وغیرہ۔ یہاں مراد وہ امور ہیں جن کی وجہ سے آدمی کے ایمان کا امتحان ہو جاتا ہے کیونکہ نامساعد حالات میں کھرے مومن اور کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، تاہم توسعاً اس کا اطلاق ہر ناپسندیدہ شے پر بھی ہوتا ہے، لہذا یہاں دونوں قسم کے واقعات اور آنے والے حالات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

باب ماجاء لایحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث

"عن ابی اسامہ بن سہل بن حنیف ان عثمان بن عفان اشرف یوم الدار فقال: أَنَشُدُكُمْ بِاللَّهِ أَنَعْلَمُونَ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث، زنی بعد احصان او ارتداد بعد اسلام او قتل نفس بغير حق فَقُتِلَ به؟ فواللہ ما زنیْتُ فی جاهلیة ولا فی اسلام، ولا ارتددت مُنذُ بایعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا قتلْتُ النفس التي حرم اللہ أَفَیْمَ تَقْتُلُونِی"۔ (حسن) ۱

حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے گھر کے محاصرے والے دن اوپر سے جھانک کر فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں

ابواب الفتن

باب ماجاء لایحل دم امرئ مسلم الخ

۱۔ رواہ ایضاً نسائی، ابن ماجہ و حاکم بحوالہ سنن دارمی ص: ۲۲۵ ج: ۲، مستدرک احمد ص: ۹۹ ج: ۱ حدیث: ۴۳۹

۲۵۳ و ۳۰۷ و ۱۳۰۵

معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کا خون کرنا سوائے تین صورتوں کے جائز نہیں؟ (۱) احسان کے بعد زنا کرنا۔ (۲) اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہونا۔ (۳) یا ناجائز طریقے سے کسی کو قتل کرنا، جس کے بدلے میں اسے قتل (قصاص) کیا جائے گا، پس بخدا میں نے نہ تو جاہلیت میں کبھی زنا کیا ہے اور نہ ہی اسلام میں اور جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے تب سے میں کبھی مرتد بھی نہیں ہوا ہوں اور نہ ہی میں نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا ہے جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہو، تو پھر تم لوگ مجھے کس بناء پر قتل کرنا چاہتے ہو؟؟؟

لغات: - قولہ "اشرف" شین، راء اور فاء میں بلندی کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی وہ گھر کے اوپر درجہ یا دیوار سے جھانک کر بولے۔ قولہ "یوم الدار" گھر کے محاصرے کے دوران جس کا پس منظر تشریح میں آ رہا ہے۔ قولہ "انشدکم" اسی افسمکم، میں تمہیں قسم دیتا ہوں۔ قولہ "اتعلمون" ہمزہ استفہام برائے تقریر ہے یعنی تم تعلمون، تم تو جانتے ہی ہو۔ قولہ "احسان" حفاظت کی تدبیر اور مضبوط و مستحکم بنانے کو کہتے ہیں، اصطلاح میں بھسن کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے، آزاد یعنی خرپر، پاک دامن اور شادی شدہ پر، یہاں یہی آخری معنی مراد ہے۔ قولہ "فبم تقتلون" بقتلہ النون کیونکہ بعض طرق میں دونوں میں کے ساتھ آیا ہے فبم تقتلون یعنی جبکہ امرء کی راہ کی حرکت ہمیشہ بالحد حرف یعنی ہمزہ کی تابع رہتی ہے۔

تشریح: - ابو امامہ بن سہل بن حنیف (بالصغیر) صحابی ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع ثابت نہیں۔

اس واقعے کا مختصر پس منظر جو ابن خلدون نے (جلد اول کے باب اٹھارہ) میں تفصیل سے لکھا ہے: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن (سودا) سہابیہودی امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بطمع مال و زر (بلکہ بیت فساد) ایمان ظاہر کر کے اہل بیت کی محبت کی آڑ میں لوگوں کو امیر المؤمنین حضرت عثمان اور شیخین رضی اللہ عنہما کے خلاف اُکساتا، اور ان کے خلاف بہتان تراشتا، اس نے بصرہ، کوفہ اور بالآخر مصر میں ان خیالات کا بھرپور انداز اور شاطرانہ طریقے سے پرچار کیا، بہت سے لوگ اس کے خیالات کی جانب مائل ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کے خلاف خیالات جنم لینے لگے، ان کے الزامات میں سے مثنیٰ میں چار رکعات نماز پڑھنا، مصاحف کو جلانا، اپنے امراء اور عاملوں سے نرمی کا برتاؤ کرنا وغیرہ شامل تھے مگر سب سے زیادہ پروپیگنڈہ اقرہ پروری کا کامیاب ہوا اور بصرہ و کوفہ اور مصر سے ایک ایک ہزار کا لشکر آ کر مدینہ منورہ کا گھیراؤ اور

خصوصاً حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر بیٹھا۔ حضرت علیؓ اور محمد بن مسلمہؓ نے ان بلوایان مصر وغیرہ کو نشیب و فراز سمجھا کر واپس لوٹایا مگر راستہ میں مروان کا ایک جعلی خط ان کے ہاتھ لگا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بلوایان مصر واپس مدینہ آ کر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذریعہ بنے۔

حضرت تھانویؒ نے المسک الزکی میں بحوالہ تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ لکھا ہے کہ مروان حضرت عثمانؓ کی خدمت میں رہتے تھے، آپؓ کی مہر وغیرہ ان کے پاس رہتی تھی، اس نے حاکم مصر کو ایک خط لکھا اور اس پر حضرت عثمانؓ کی نمبر لگادی، اور یہ خط غلام کو دے کر مصر روانہ کر دیا، وہ غلام راستہ میں گرفتار ہوا اور خط برآمد ہوا، چنانچہ تاریخ ابن خلدون میں ہے کہ جب بلوایان مصر دوبارہ مدینہ کی طرف لوٹے تو محمد بن مسلمہؓ نے واپسی کا سبب پوچھا، فتنہ پردازوں نے وہ خط دکھایا (جو مروان نے جعلی طریقے سے از طرف امیر المؤمنین لکھا تھا) اس خط میں بعض لوگوں کے نام متعین کر کے لکھا تھا کہ ان کو قید اور سزا اور داڑھیاں مونڈنے کی سزا دی جائے اور بعض کو سولی دیئے کو لکھا تھا۔

جب خط کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے آیا تو انہوں نے قسم کھا کر اس سے لاعلمی کا اظہار کیا، محمد بن مسلمہؓ نے تصدیق کرتے ہوئے فرمایا بے شک یہ کام مروان کا ہے، بہر حال اس واقعے پر بلوایان مصر مشتعل ہو کر واپس مدینہ آئے تھے اور ان کے ساتھ بلوایان بصرہ و کوفہ بھی آئے تھے۔ باب کی حدیث میں اسی محاصرہ ثانیہ کا بیان ہے، ان لوگوں کا مطالبہ حضرت عثمانؓ کی معزولی کا تھا اور دلیل یہ پیش کی کہ آپؓ کا غلام آپؓ کی مہر شدہ خط لے کر جائے اور آپؓ کو اس کا پتہ بھی نہیں اس لئے آپؓ خلافت کے حق دار نہیں، آپؓ معزول ہو جائیں، ان کو تو بہانہ درکار تھا۔

المسک الذکی میں ہے کہ جس روز حضرت سیدنا عثمانؓ شہید ہوئے ہیں اس روز آپؓ کا روزہ تھا اور اس دن کی رات میں آپؓ نے حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے عثمان! تمہارا کیا حال ہے؟ آپؓ نے عرض کیا کہ آپؓ کی امت میری خون ریزی کے درپے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میرے پاس آ کر روزہ افطار کرو گے یا دنیا میں؟ عرض کیا کہ آپؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر روزہ افطار کروں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم آج میرے پاس آ جاؤ گے، پھر آپؓ بیدار ہوئے اور فرمایا کہ آج میں شہید ہوں گا، چنانچہ اسی روز آپؓ شہید ہو گئے، جب آپؓ شہید ہو رہے تھے

تو آپ ﷺ تلاوت فرما رہے تھے اور خون کا قطرہ اس آیت پر آپکا: ”فَسَبِّحْهُمْ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ“ سے اور یہی آیت آپ کی زبان پر بھی تھی۔ (بحوالہ تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ) وحاشیہ ابن خلدون مترجم) کہتے ہیں کہ زمانہ جنگ عظیم میں یہ معصوف جسے امام کہتے ہیں لندن کے میوزیم میں پہنچ گیا ہے۔ واللہ اعلم

سوال:- حضرت عثمانؓ نے جو مرفوع حدیث بیان فرمائی ہے اس میں صرف تین آدمیوں کے قتل کا جواز معلوم ہوتا ہے جبکہ بعض دیگر روایات سے ان کے علاوہ بھی بعض لوگ مباح الدم قرار دیے گئے ہیں مثلاً کوئی شخص حملہ آور ہو جائے تو اپنا دفاع جائز ہے اگرچہ اس دفاع میں صائل یعنی حملہ آور کی جان چلی جائے، ہاں دفاع کم از کم حد تک ہونا چاہئے جس سے صرف جان بچانا ملحوظ ہو، اس کے علاوہ بھی بعض صورتیں جواز کی ہیں۔

جواب:- جن روایات سے اباحت قتل معلوم ہوتی ہے تو وہ یا ان صورتوں میں ہے جو تعزیر اور قتل سیارہ پر محمول ہیں یا تغلیظ ہیں یا مرتد کے حکم میں ہیں جیسے باغی، یا مدافعتاً ہیں نہ کہ تعمد قتل، اور یا ان میں لفظ قتال آیا ہے جس سے مراد لڑنا ہے نہ کہ مارنا۔ یہ مسئلہ پہلے گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۳۱۳ ج: ۵ ابواب الدیات ”باب ما جاء لا یسئل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث“)

باب ما جاء فی تحریم الدماء والاموال

عن سليمان بن عمرو بن الاحوص عن ابيه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: في حجة الوداع للناس اى يوم هذا؟ قالوا: يوم الحج الاكبر، قال فان دماءكم واموالكم واعراضكم بينكم حرام كحرمة يومكم هذا في بلدكم هذا الا لامحنى جان الا على نفسه الا لامحنى جان على ولده ولا مولود على والده الا وان الشيطان قد ايس ان يعبد في بلادكم هذه ابداً ولكن ستكون له طاعة فيما تحقرون من اعمالكم فسيرضى به“۔ (حسن صحيح)

حضرت سليمان بن عمرو اپنے والد حضرت عمرو بن الاحوص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ لوگوں سے فرما رہے تھے: آج کو نسا دن ہے؟ لوگوں نے جواب دیا حج اکبر کا دن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک تمہارا خون اور تمہارے اموال اور ناموس ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں (یعنی حرمت والے ہیں) جیسے تمہارے

آج کے دن کی حرمت آپ کے اس شہر میں، تم آگاہ رہو کہ کوئی مجرم نہیں کرتا مگر صرف اپنے اوپر خبردار! کوئی آدمی جنایت نہیں کرتا اپنی اولاد پر اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ پر، آگاہ رہو کہ شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمہارے ان شہروں میں پھر کبھی اس کی عبادت کی جائے گی البتہ اس کی فرمانبرداری آپ کے ان اعمال میں ہوگی جن کو تم معمولی سمجھتے ہوں گے بس وہ اسی پر راضی ہو جائے گا (کیونکہ یہی چھوٹے اعمال سیلاب کی شکل اختیار کر کے امت کو غرق کر دینے کا موجب نہیں گئے کما ہوا المشاہد)۔

لغات :- قولہ ”حجۃ الوداع“ بروزانِ جنۃ یعنی بفتح الحاء بھی جائز ہے جس کے معنی ایک حج کے آتے ہیں جیسے اس وزن کی خاصیت ہے جبکہ بکسر الحاء بھی جائز ہے اس کے معنی بھی ایک حج کے یا مطلق حج کے آتے ہیں۔ قولہ ”الوداع“ بفتح الواو رخصتی کے معنی میں ہے اس میں واؤ کا کسرہ بھی جائز ہے چونکہ یہ آپ علیہ السلام کا آخری حج تھا اس میں آپ نے جتنے خطبات ارشاد فرمائے تھے عموماً سب یا اکثر میں رخصتی کی طرف اشارہ تھا اور کہیں کہیں صریح الفاظ میں رخصت لے لی تھی۔ قولہ ”الحج الاکبر“ بعض نے عرفہ کے دن کو حج اکبر کہا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ عمرے کے مقابلے میں حج کو کہتے ہیں گویا عمرہ حج اصغر ہے اور حج حج اکبر ہے، او عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ حج اکبر وہ ہے جو جمعہ کے دن آجائے تو یہ بلا اصل ہے۔ قولہ ”واعراضکم“ عرض بکسر العین کی جمع ہے موضع مدح والذم کو کہتے ہیں خواہ آدمی کی ذات سے متعلق ہو یا باپ دادا وغیرہ سے جس کو آدمی کہتے ہیں۔ قولہ ”حان“ اسم فاعل کا صیغہ ہے رام کی طرح، جنایت سے ہے جرم اور قصور کو کہتے ہیں۔ قولہ ”ایس“ بفتح الهمزة وکسر الیاء آئسا دایا سآ یوس ہوتا یعنی شیطان ناامید ہوا ہے۔

تشریح :- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے حج کے موقعہ پر متعدد خطبات ثابت ہیں مگر غالباً اس حدیث کے خطبے کا تعلق یوم النحر یعنی دس تاریخ سے ہے جو حجرات کے قریب آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا، ممکن ہے کہ کسی اور دن کا خطبہ ہو۔

زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا جو آج تک ہمارے قبائلی نظام میں رائج ہے کہ مقتول والے قاتل کے کنبے سے جو بھی ملتا اور خصوصاً سرکردہ آدمی کو انتقام کا نشانہ بناتے تھے اگرچہ قتل اس کے بیٹے یا باپ نے کیا ہو آپ علیہ السلام نے اس سے ممانعت فرمادی کہ ایک آدمی (قاتل و مجرم) کے جرم میں دوسرے کو سزا نہیں دینی چاہئے ہاں اگر اس جرم میں وہ شریک ہو یا اس کی کوئی کوتاہی ہو تو شریعت کی بتائی ہوئی حدود کے اندر اسے سزا بھگتنا پڑے گی جیسے قاتل کے عاقلہ پر دیت کا مسئلہ ہے۔

پھر آپ علیہ السلام نے حرمت میں حج کے دن اور شہر حرام کے ساتھ جو تشبیہ دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سامعین کے ذہنوں میں ان کی حرمت مسلم اور راسخ ہو چکی تھی پہلے عارضہ کے حوالہ سے گزرا ہے کہ ایک آدمی مطاف میں اپنے بھائی کے قاتل کے ساتھ طواف میں شریک ہوتا مگر اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان جزیرۃ العرب میں دوبارہ شرک کے فروغ پانے سے مایوس ہو گیا ہے البتہ باقی گناہ ہوتے رہیں گے بایں طور کہ تم ان گناہوں کو معمولی سمجھ کر کرتے رہو گے اور شیطان اسی میں سے اپنا کام نکالے گا کیونکہ جب گناہ چھوٹے ہوں مگر جب کثرت سے ہوں گے تو وہ طوفانی شکل اختیار کریں گے کہ لاصغیرۃ مع الاستمرار اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہ بڑے گناہوں کے پیش خیمہ ہوتے ہیں پہلے معمولی سمجھ کر کر دو گے پھر اس کا خوف دلوں سے نکل کر تم ایک قدم آگے بڑھو گے پھر آہستہ آہستہ کبار دون الشریک میں منہمک ہو جاؤ گے جس کا آج مشاہدہ عام کیا جاسکتا ہے، اور یہی چیز شیطان کی خوشی کے لئے کافی ہے۔

اس کی قدرے تفصیلی بحث اسی جلد کے ابواب البر والصلة میں گذری ہے دیکھئے ”باب ماجاء فی التباغض“ وفیه : ان الشیطان قد ایس ان یعبده المصلون ولكن فی التحریض بینہم۔

باب ماجاء لایحل لمسلم ان یروع مسلماً

عبداللہ بن السائب بن یزید عن ابیہ عن جدہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یأخذ احدکم عصا اخیه لاعباً حاداً فمن اخذ عصا اخیه فلیردھا الیہ۔^۱ (حسن غریب)

حضرت یزید بن سعید بن ثمامہ^۲ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی بھی اپنے بھائی کی لاٹھی بطور مذاق یا تنجیدگی کے (بغیر اجازت کے) نہ لے لے پس اگر کسی نے اپنے بھائی کی چھڑی لی تو تو اسے (فوراً) واپس کر دے۔

لغات: بقولہ ”یروع“ باب التعمیل سے معروف کا صیغہ ہے ڈرانے کو کہتے ہیں۔ بقولہ ”لاعباً“ بمعنی اسم قاتل لعب سے بمعنی مذاق (مزاح)۔ بقولہ ”حاداً“ یہ بھی اسم قاتل کا صیغہ ہے جڈ بکسر الحکم وتشدید

باب ماجاء لایحل لمسلم ان یروع مسلماً

۱۔ رواہ ابیہ ابوداؤد فی الادب باب: ۸۵، مسند احمد ص: ۲۵۸، ج: ۵، حدیث: ۱۷۴۸۱، ۱۷۴۸۲۔

العدل مقابل مذاق کو کہتے ہیں یعنی شجیدگی اور واقعیت سے کوئی کام کرنا، اس کا اسم فاعل محذ بھی آتا ہے۔ ابو داؤد کے کی روایت میں ”لعباً ولا جاداً“ کے الفاظ ہیں لہذا کہا جائے گا کہ ترمذی کی روایت میں تقدیر ہے یعنی ”لعباً ولا جاداً“ پھر یہ دونوں لایا خذ کے فاعل سے حالین ہیں متداخلہ یا مترادف دونوں قول ہیں۔ اگر عطف کو مقدر نہ مانا جائے تو پھر متداخلہ ہیں جبکہ ابو داؤد کی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے حالین مترادفین ہوں گے، متداخلہ کا مطلب یہ ہے کہ جاداً کو ضمیر لا عباً سے حال بنایا جائے۔

تشریح:- ایک مطلب یہ ہے ”جاداً“ کا کہ کسی کی چیز بغیر بتائے لے لے اگر چہ واپس کرنے کا ارادہ ہو مگر اپنا کام کر کے، یا مطلب یہ ہے کہ کسی کی اطلاع اور اجازت کے بغیر کوئی چیز نہیں لینا چاہئے نہ بطور مذاق اور نہ اس نیت سے کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں کہوں گا کہ میں تو مذاق کر رہا تھا اور نہیں دیکھا تو ہضم کر لوں گا، اگر بالفرض ارادہ مذاق ہی کا ہو پھر بھی ایسا کرنا ممنوع ہے کہ کسی کی چیز لے کر مذاق میں اسے چھپا کر کہیں رکھ دیا اور وہ بے چارہ پریشان حال پھر رہا ہو چونکہ اس میں ایذائے مسلم ہے اس لئے یہ جائز نہیں اور اگر بقصد چوری کے ہو تو پھر تو حرام ہے، اور لاشعی کا ذکر حکم کی تخصیص کے لئے نہیں بلکہ یہ واقعہ چونکہ بعض روایات کے مطابق سفر میں ایک ساتھی کے ساتھ مذاق میں لاشعی ہی کے متعلق پیش آیا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمادی چونکہ علت ترویج یعنی پریشان اور خوف زدہ کرنا ہے اس لئے یہ حکم ہر شے کو شامل ہے، اور جب لوٹانے کی نیت کے باوجود منع ہے تو چوری کی نیت سے بطریق اولیٰ منع ہے۔

قابل غور ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی کو اتنی دیر کے لئے پریشان کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے تو مذاق سے زیادہ اور طویل مدت کے لئے لاشعی سے بڑھ کر دوسری اشیاء میں کتنا گناہ ہوگا؟؟؟

باب ماجاء فی اشارۃ الرجل علی اخیه بالسلاح

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من اشار علی اخیه بحدیدۃ لعنہ الملائکۃ“۔^۱ (حسن صحیح)

۱۔ لا باعین احدکم متاع اخیه لا عباً جاداً وقال سلیمان لعباً ولا جاداً من ابی داؤد ص: ۳۳۵ ج: ۲ کتاب الادب.

باب ماجاء فی اشارۃ الرجل الی اخیه الخ

۲۔ رواہ مسلم ص: ۳۲۸ ج: ۲ ”کتاب البر والصلة“ ایضاً روای بمعناہ سند احمد ص: ۵۰۳ ج: ۲ حدیث: ۴۲۷۷.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی پر لوہا نان لے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

تشریح:۔ لوہے سے اشارے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات میں کسی پر تلوار اٹھادی یا بندوق کا رخ اس کی طرف کیا اسی طرح دیگر کوئی ہتھیار یا دھار والا بوہاد وغیرہ کوئی چیز جس سے چوٹ یا زخم لگنے کا اندیشہ ہو تو یہ ممنوع ہے اور آدمی اس سے فرشتوں کی لعنت کا مستحق بن جاتا ہے اور جب مذاق کا یہ حال ہے تو جب بارادہ ضرر ہو تو اس کا کیا حال ہوگا؟

پھر ابن العریثی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب اشارے سے مراد ڈرانا ہو: ”فہذا قد استعق اللعن بالاشارة فمما ظنك بالاصابة“ الخ۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ ایسے بے شمار واقعات پیش آئے ہیں کہ مذاق میں کسی پر بندوق خالی سمجھ کر چلائی اور گولی نکل کر لگ گئی، ہمارے کے قریب گاؤں ایک گاؤں میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، ایک لڑکے نے اپنی بہن کو اسی طرح قتل کیا تھا، یہ مذاق جائز نہیں اس لئے اس روایت کے بعض طرق میں یہ اضافہ ہے: ”وان كان احصاء لايه وامه“۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ تلامعہ کی تحمیم کے لئے فرمایا یعنی اگر چہ وہ اشارہ واقعی مذاق میں ہو کیونکہ اپنے بھائی کو عموماً قتل نہیں کیا جاتا مگر جب اس کے ساتھ یہ مذاق منع ہے جس میں یہ دنیا پوری احتیاط ملحوظ ہوگی تو اجانب کے ساتھ تو بطریق اولیٰ ممنوع ہوا۔

باب النهی عن تعاطی السیف مسلولا

”عن جابر قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان يتعاطی السیف مسلولا“۔^۱

(حسن غریب)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگی تلوار کے لینے دینے سے ممانعت فرمائی ہے۔

۱۔ کذا فی رواية مسلم حوالہ بالا۔

باب النهی عن تعاطی السیف مسلولا

۱۔ ایضاً رواہ ابو داؤد ص: ۳۵۶؛ ۲۔ ”باب فی النهی ان يتعاطی السیف مسلولا“ کتاب الجہاد مسند احمد ص: ۳۲۹

ج: ۳، حدیث: ۱۳۷۸۹، ۱۳۷۹۰۔

تشریح:- اگر تکلی ہوئی اور تنگی تلوار کسی کودے تو ممکن ہے کہ دوسرا آدمی تھامنے نہ پایا ہو اور دینے والا چھوڑ دے تو وہ گر کر پاؤں پر لگ جائے گی، اسی طرح دونوں کو یا ایک کو زخم لگ جائے گا، اس لئے آداب بتلائے، یہی آداب بندوق دینے کے بھی ہے کہ دیتے ہوئے اس کا رخ آسمان یا زمین کی جانب ہونی چاہئے کہیں خدا نخواستہ اگر گولی چل جائے تو کسی کو لگ نہ جائے بے احتیاطی سے بہت سے لوگ قمرہ اجل بنے ہیں۔

چاقو، چھری وغیرہ اشیاء میں بھی یہی ضابطہ ہے کہ چاقو وغیرہ یا تو بند کر کے دے دیا جائے یا زمین وغیرہ پر رکھ کر دوسرا اٹھائے، اسی طرح کسی کے اوپر چائے، پانی، شربت وغیرہ بھی نہیں دینا چاہئے ازاں جملہ یہ بھی ہے کہ کتاب وغیرہ اہم اشیاء کے اوپر پانی یا چائے وغیرہ مانع چیزیں ہرگز نہیں دینا چاہئے، ممکن ہے کہ ایک قطرہ بھی گر جائے کپڑے خراب ہو جائیں گے، اور اگر کوئی مصنف ہو تو اس کی محنت بھی ضائع ہو جائے گی کہ لکھا ہوا مضمون دوبارہ لکھنا انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔

غرض تکلیف اور ضرر کے جملہ امور سے بچنا چاہئے، حضرت تھانویؒ ہشتی زیور میں لکھتے ہیں:

”چاقو یا قینچی یا سوئی یا کسی اور ایسی چیز سے مت کھیلو شاید غفلت سے کہیں لگ جائے، جہاں اور آدمی بھی بیٹھے ہوں وہاں بیٹھ کر مت تھوکو، ناک مت صاف کرو، اگر ضرورت ہو تو ایک کنارے پر جا کر فراموش کر آؤ۔ جب کسی کے ہاتھ میں کوئی چیز دینا ہوتا ہو تنگید وہ دوسرا آدمی اس کو اچھی طرح سنبھال نہ لے اپنے ہاتھ سے مت چھوڑ، بعض دفعہ یوں ہی سچ میں گر کر نقصان ہو جاتا ہے۔“ (حصہ ۱۰، بعض باتیں سلیقہ اور آرام کی)

باب من صلی الصبح فہو فی ذمة اللہ عزوجل

”عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من صلی الصبح فہو فی ذمة اللہ فلا ینبغیکم اللہ بشئ من ذمته“۔^۱ (حسن غریب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ اللہ کی ذمہ داری میں داخل ہو گیا، پس اللہ تمہارے درپے نہ ہو جائے اپنی ذمہ داری کے بارے

باب من صلی الصبح فہو فی ذمة اللہ عزوجل

۱۔ رواہ ایضاً مسلم فی کتاب المساجد، والترمذی فی الصلاة باب: ۵۱، سنن ابن ماجہ ۲۸۳، ”باب المسلمون فی ذمة اللہ عزوجل“ ابواب الفتن، مستطاب احمد ص: ۳۰۸، ج: ۴، حدیث: ۱۸۳۵۔

میں کسی طرح (یعنی پناہ توڑنے کے سبب)

تشریح:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح مسلمان کو کلہ تو حید پڑھنے سے امان حاصل ہوتی ہے اسی طرح جزوی اعمال سے بھی خصوصی حفاظت ملتی ہے ازاں جملہ ایک صبح کی نماز ہے جس سے آدمی کو اللہ کی حفاظت و امان ملتی ہے پس جو شخص اس آدمی سے تعرض کرے گا خواہ اس کی جان و مال کے اعتبار سے ہو یا عزت و آبرو کے حوالے سے، تو اس سے قیامت کے دن انتقام لیا جائے گا، یہاں ایک خفیہ تشبیہ ہے وہ یہ کہ جس طرح ایک شخص کسی سردار کی پناہ حاصل کرتا ہے یا جیسے آج کل لوگ کسی ملک سے سیاسی پناہ لیتے ہیں تو وہ شخص اس سردار اور اس سیاسی پناہ دینے والے ملک کی حفاظت میں ہوتا ہے، وہ اس کے جان و مال وغیرہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں، پھر اگر کوئی دوسرا شخص اسے نقصان پہنچاتا ہے تو اس کی گرفت ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نمازی کو پناہ دیتا ہے، حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اس کو نقصان پہنچانے کی صورت میں اللہ ضرر پہنچانے والے کے درپے آزار ہو جاتا ہے لہذا اتم اللہ کی امان اور عہد کو مت توڑو۔

تبیہ:۔ بعض شارحین نے ”یتبعنکم“ کو مزید سے بناتے ہوئے تاء کو مشدّد لکھا ہے مگر حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب میں تصریح فرمائی ہے کہ یہ مجرد سے ہے لہذا تاء کو ساکن پڑھا جائے گا اور تالیح ہونے کا مطلب مطالبہ کرنا ہے چنانچہ مسلمؒ کی روایت میں ”فلا یصلبنکم“ کے الفاظ ہیں۔ آیت کریمہ میں ہے: ”ثم لا تحلوکم علیہا تبیعاً“۔

باب فی لزوم الجماعة

”عن ابن عمر قال عطينا عمر بالحماية فقال: يا ايها الناس اني قمت فيكم كمقام رسول الله صلى الله عليه وسلم فمنا فقال: اوصيكم باصحابي ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم نفسوا الكذب حتى يحلف الرجل ولا يستعلف ويشهد الشاهدين ولا يستشهد الا الا يحلوا رجل بامرأة الا كان ثالثهما الشيطان عليكم بالجماعة واياكم والفرقة فان الشيطان مع الواحد وهو من الاثنين ابعد من اوائد حبو حة الحنة فليلازم الجماعة من سرته حسنته وساءتة سيئته فذا لكم

المؤمن۔“ (حسن صحیح غریب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے جابیہ مقام میں ہم کو خطبہ دیا، پس فرمایا اے لوگو! میں تمہارے درمیان اس طرح کھڑا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مابین جلوہ افروز ہوئے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں اپنے صحابہ کی اطاعت کی وصیت کرتا ہوں پھر ان کی جو ان سے ملے ہوئے ہوں اور پھر ان کی جو ان سے ملے ہوئے ہوں، پھر جموٹ عام ہو جائے گا یہاں تک کہ ایک شخص قسم کھائے گا حالانکہ اس سے حلف اٹھانے کو نہیں کہا گیا ہوگا (یعنی قسم کے مطالبے کے بغیر قسمیں کھائے گا) اور گواہ (از خود) گواہی دے گا حالانکہ اس سے گواہی کا تقاضا نہیں کیا گیا ہوگا خبردار! کوئی آدمی ہرگز کسی عورت کے ساتھ تنہا نہیں رہتا مگر ان کا تیسرا ضرور شیطان ہوتا ہے تم جماعت کے ساتھ ہی رہو اور اختلاف سے خود کو دور رکھو کیونکہ شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دوسے دور ہوتا ہے، جو شخص جنت کے پتوں پہنچنا چاہے تو وہ جماعت ہی کے ساتھ رہے، جس شخص کو اس کی نیکی خوش کر دے اور برائی غم ناک کر دے تو وہ پکا مؤمن ہے۔

لغات: بقولہ ”بالحابة“ جابیہ شام میں دمشق کی ایک بستی کا نام ہے۔ بقولہ ”باصحابی“ ای بباطاعتہم والحراد الوالامر۔ بقولہ ”یفشو“ ای بظہرو وبتشر یعنی پھیل جائے گا اور عام ہو جائے گا۔ بقولہ ”یحلف ولا یتحلف ویشهد ولا یتشهد“ ہر دو جملوں میں اولین صیغہ معروف کے ہیں اور آخرین مجہول کے۔ بقولہ ”بحبوحۃ“ بضم الباء، درمیان کو کہتے ہیں، جنت کے درمیان سے مراد وسعت اور کشادگی ہے یعنی جو جنت میں اچھے اور کشادہ مقام کو پسند کرتا ہو۔

تشریح:۔ اس ارشاد پاک میں متعدد احکام بیان ہوئے ہیں تاہم امام ترمذی نے باب صرف ایک حکم یعنی لزوم الجماعت کے لئے باندھا ہے، لہذا یہاں پہلے ضمنی احکام کو نہ بند کیا جاتا ہے، بھر اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں:

(۱)... اس حدیث سے پہلا حکم یہ ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امراء اور ولایہ مقرر فرمائے تھے ان کی اطاعت باقی صحابہ کرام پر لازمی تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب صحابہ کرام تھے تو جب ان

سے کیا گیا کہ ”اوصیکم بما صاحبہ“ تو لامحالہ مراد امراء ہیں، اسی طرح تابعین اور پھر تبع تابعین میں سے جو دلائے ہوئے ان کی اطاعت بھی لازمی ہوئی۔ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام مخاطب ہوں مگر یہ حکم ان کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ آئندہ امت کے لئے ایک ضابطہ بیان کرنا مراد ہو کہ میرے صحابہ کی پیروی کرو جو حکم ان سے نہ ملے تو پھر تابعین اور تبع تابعین کی پیروی کرو، اس مطلب کے مطابق ائمہ مجتہدین کی پیروی و اطاعت بھی اس حدیث کی مراد میں شامل ہوگی۔

(۲)۔ دوسرا حکم یہ معلوم ہوا کہ تین زمانے مشہور لمحا بالخیریت ہیں ان کے بعد جھوٹ اور فراڈ شائع ہو جائے گا، پھر حدیث جبرئیل کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جائے گا کہ حج عیسیٰ بن جائے گا اور جھوٹ خوبی، کیونکہ حدیث جبرئیل کے متعلق ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے یہی لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طامات قیامت کی بتلائی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قلب الامور والحقائق ہو جائے گا چنانچہ آج ایسا ہی ہوا ہے کہ جو آدمی حج بولتا ہے لوگ اسے سادہ یعنی بے وقوف سمجھتے ہیں اور سب سے زیادہ ہوشیار وہ سمجھا جاتا ہے جو زیادہ مکار ہو اگر آپ اس کی مثال یا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں تو سیاسی لیڈروں کو دیکھ لیجئے، اس مسئلہ کے لئے آگے ابواب النہن میں مستقل ”باب اجاء فی القرن الثالث“ آ رہا ہے۔

(۳)۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ کسی غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت نشینی کی صورت میں شیطان ان کو گناہ پر اکساتا ہے بایں صورت کہ شہوت کو ابھارتا ہے اور حیاء کو اٹھاتا ہے اور جو موانع دیکر ہوتے ہیں ان کے بارے میں قہقہے کرتا ہے کہ کچھ نہیں ہوگا بالآخر آدمی اندھا بن کر ہٹ کر رہتا ہے اور خوف خداوندی کو پس پشت ڈالتا ہے اس لئے سد باب کے لئے فرمایا کہ بس ایسے مواقع میں جملنا ہونے سے پہلے ہی خود کو بچا لیا جائے یعنی خلوت سے بچے، اس لئے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ”ولا تقربوا الزنا“ مگر قریب جانا اسباب زنا سے گزرتا ہے۔ (تذکرہ) یہ مسئلہ مضامین ”کرامیۃ الدخول علی المغنیات“ میں گزرا ہے۔ (تشریحات ص: ۳۶ ج: ۵)

(۴)۔ چوتھا حکم یہ ہے کہ مومن وہ ہے جس کو تنگی سے خوشی ہو اور بدی سے رنج اور ڈکھ ہو، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ کلام فصیح و بلیغ اور صحیح ہے کیونکہ جب ایمان ہوگا تو تنگی کی قدر ہوگی اور قابل قدر چیز کے حصول سے خوشی ہوتی ہے اور بدی و گناہ سے ڈر ہوگا کیونکہ اس کا انجام بُرا ہوتا ہے مگر ایمان نہ ہونے یا ناقص ہونے کی صورت میں اسے تنگی کا خاطر خواہ فائدہ اور گناہ کا نقصان ملحوظ خاطر نہ ہوگا، اس لئے کوئی فرق نہیں پڑے

گا چنانچہ آگے ترمذی میں آجائے گا کہ مؤمن اپنا گناہ ایسا دیکھتا ہے جیسے وہ پیاز کے دامن میں گزر رہا ہو اور وہ اس پر گرنے والا ہو جبکہ منافق وغیرہ کے لئے گناہ کی حیثیت اتنی سی ہے جیسے کبھی ناک پر بیٹھ گئی اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اڑا دیا۔

(۵)۔ اس باب کا مقصودی مسئلہ لزوم الجماعت ہے، اگر کوئی جماعت سے الگ ہو جاتا ہے تو وہ شیطان کا اس طرح شکار ہو جاتا ہے جیسے ریوڑ سے علیحدہ بکری بھیر یا کا۔

جماعت سے مراد کون ہیں؟ اس باب میں امام ترمذی نے جماعت کے لزوم کے حوالے سے تین احادیث کی تخریج کی ہے جس سے لزوم الجماعت کی اہمیت تو معلوم ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ جماعت سے کن لوگوں کی جماعت مراد ہے؟؟؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنا آج کل خاصا مشکل ہے مگر جو اتوال قائل ذکر ہیں، وہ یہاں پیش کئے جا رہے ہیں:

(۱)۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ مراد اجماع امت ہے، باب کی اگلی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے یعنی جب امت اجابت کی غالب اکثریت بشرطیکہ وہ صلحاء پر مشتمل ہو یعنی صلحاء اس کے خلاف نہ ہوں کسی قول یا عمل پر متفق ہو تو اسے چھوڑ کر الگ راستہ اختیار کرنا جائز نہ ہوگا، ظاہر ہے کہ ایسا اجماع خلاف شریعت نہیں ہو سکتا ہے۔

(۲)۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ مراد صحابہ کرام ہیں یعنی ان کا راستہ اختیار کیا جائے۔

(۳)۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مراد ہر زمانے کے اہل علم و صلحاء ہیں اور قرآن میں ”وكونوا مع الصادقين“ کے رمز سے بھی اس کی تائید معلوم ہوتی ہے، عارضہ میں ہے کہ عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما، سائل نے کہا کہ وہ تو انتقال کر چکے ہیں آپ نے فرمایا فلاں و فلاں (یعنی صلحاء کے نام لئے) پھر سوال ہوا کہ وہ بھی زندہ نہیں رہے۔ ”فقال ابو حمزة السکری جماعة و هو محمد بن میمون و کان شیعاً صالحاً“ یعنی اب ابو حمزہ جماعت ہے اسی کے ساتھ رہنا چاہئے۔

ابن العربی فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن مبارک کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور جس میں ارکان دین جمع ہوں گے بس وہی جماعت ہے اور یہ امام عادل ہے یا پھر عالم فاضل ہے گو وہ تنہا ہو کیونکہ ”بدأ الاسلام غریباً“

وسعود غریباً^۱ وجماعته العلم والعدالة۔

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت ”اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم“۔ (الآیۃ النساء نمبر: ۵۹) اسی پر زور دیا ہے کہ اولی الامر سے مراد علماء ہیں کیونکہ حکام اس وقت مقتدی وقابل اطاعت ہیں جب وہ علماء کے فراہمن کے تابع ہوں گے گویا عوام حکام کے تابع ہیں اور حکام علماء کے نتیجہ یہ نکلا کہ اصل طاعت علماء کی ہوگی۔

(۳) ...چوتھا قول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مراد خلفاء و امراء ہیں چنانچہ ابن العربی عارضہ میں ”علیکم بالجماعة“ کے بعد لکھتے ہیں:

”یمتثل معنیں یعنی ان الامة أجمعت علی قول فلا یحوز لمن یعلمہم ان یحدث قولاً آخر (یہ احتمال وہی ہے جو اوپر پہلے نمبر پر بیان ہوا) الثانی اذا اجتمعوا علی امام فلا تحل منازعته ولا یحلعه وهذا یس علی العموم بل لو عقده بعضهم لحازلہ یحل لاحد ان یعارضہ“۔

یعنی جب چند لوگ (قابل بھروسہ) کسی آدمی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسے خلیفہ یا امام منتخب کر لیں تو باقی سب لوگ اس کی اطاعت کے پابند ہوں گے اس کے خلاف خروج یا حکم عدولی ان کے لئے جائز نہ ہوگی۔ یہ حکم اس وقت تو اتفاقاً ہے جب امام حکم شرعی کے مطابق اور نیک و صالح شخص ہو لیکن اگر وہ فاسق یا جائز ہو تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا پھر بھی اس کی اطاعت ضروری ہے یا نہیں اگر نہیں تو اس کے خلاف خروج بھی ہوگا یا نہیں؟ یہ مسئلہ ”باب ما جاء فی بیعة النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ من ابواب السیر کے تحت گزرا ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص: ۴۵۴ ج: ۵)

جمہور کے نزدیک پھر بھی خروج جائز نہیں یا کم از کم واجب نہیں، ہاں خلاف شرع حکم کی تعمیل نہیں کی جائے گی۔

آج کل یہ مشکل درپیش ہے کہ مسلمانوں کا کوئی ایک امام یعنی لیڈر متعین نہیں ہوتا، ہر ملک اور ہر پارٹی

۱۔ رواہ مسلم فی کتاب الایمان ”باب بیان ان الدین نصیحة“ ابو داؤد کتاب الادب ”باب فی النصیحة سنن نسائی کتاب البیعة“ ”باب النصیحة للامام“ عن تمیم الدارمی، ورواہ البزار عن ابن عمر ورجالہ رجال الصحیح بحوالہ سنن داؤمی ص: ۴۰۲ ج: ۲ حدیث: ۲۷۵۵، مستدرک ص: ۲۵۷ ج: ۱ حدیث: ۳۷۷۵۔

کا الگ لیڈر ہوتا ہے ایسے میں کیا کرنا چاہئے؟ تو جہاں تک مختلف ممالک کا تعلق ہے اس کی تصویر تو آسان ہے کہ جو مسلمان جس ملک میں ہیں وہ اپنے اپنے ملک کے حکمرانوں کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں بشرطیکہ وہ خلاف شرع نہ ہوں ہاں البتہ حتی الامکان کفار کے ممالک میں جانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ (تشریحات ص: ۵۸ ج: ۳)

مگر ایک ہی ملک کے مختلف لیڈروں کا حکم بخاری شریف (ج: ۱ ص: ۴۹۱) کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے: ”فَوَابِيعَةُ الْاَوَّلِ فَاَلَاوَل“ یعنی جو پہلے منتخب ہو اسی کی حکمرانی ہوگی اور تعمیل اسی کی بشرط ہوگی اگرچہ فاسق کے مباح احکام میں وہ لزم نہ ہوگا جو عادل کے احکام میں ہوتا ہے، یہ مسئلہ بھی تفصیل سے گزرا ہے فلائید حلا۔ (دیکھئے تشریحات ص ۵۲۱ ج ۵ 'باب ماجاء لا طاعة للخلق في معصية الخالق' من ابواب الجہاد)

اگر طوائف المسلمو کی کا دور آجائے جیسے آج کل اس کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اور ہر آدمی یا ہر گروپ اپنی ذیہ انت کی مسجد بنالے تو پھر کیا ہونا چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے واللہ اعلم، کہ حتی الامکان جماعت کے ساتھ رہنے کی کوشش جاری رکھے مگر تمام راستے مسدود ہونے کی صورت میں پھر علیحدگی اختیار کر کے یکسو ہو جائے جیسا کہ بخاری شریف کی ایک طویل روایت میں ہے:

”قُلْتُ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا اِمَامٌ قَالَ فَاعْتَرِلْ تِلْكَ الْفِرْقَ كُلَّهَا وَلَوْ اَنْ
نَعَضَ بِاصْلِ الشَّجَرَةِ حَتَّى يَنْزِلَ الْمَوْتُ وَانْتَ عَلَى ذَالِكَ“۔

(بخاری ص: ۵۰۹ ج: ۱، باب علامات النبوة فی الاسلام)

عزالت اور تنہائی اختیار کرنے کے حکم کے لئے دیکھئے تشریحات ص ۴۲۱ ج ۳ 'باب ماجاء فی انھی عن
اجتہل' مگر پھر بھی صحبت صالح تلاش کرنا ہے۔

باب کی دوسری حدیث:- ”عن ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان الله
لا يجمع أمتي اوقال أمة محمد على ضلالة وبذل الله على الجماعة ومن شذَّ شذَّ الى النار“۔^۵
(غریب من هذا الوجه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ میری
امت کو یا فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کو اگر اسی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ

ہے اور جو شخص تنہا ہاں اس کو اکیلا ہی دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

لغات: - قوله "ومن شد شد الى النار" پہلا معروف اور دوسرا مجهول کا صیغہ ہے جبکہ وال دونوں میں مشدو ہے، شدوذ کے معنی الگ تھلگ ہونے کے ہیں۔ قوله "بداللہ" متشابہات میں سے ہے، مراد نصرت و مدد ہے یعنی جماعت پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور شیطان ان سے دور رہتا ہے، تاہم ثانی یعنی شد بعض طرق میں معروف بھی آیا ہے۔

تشریح: - امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب من ہذا لوجہ کہا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ضعیف ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ غریب بھی صحیح ہو سکتی ہے چنانچہ یہ روایت بھی صحیح ہے کہ ایک تو اس کے راوی ثقافت ہیں دوسرے اس کے کئی متابع و شاہد ہیں، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں: "وان لم یکن لفظہ صحیحاً فان معناه صحیح جداً"۔

امت کی دو قسمیں ہیں: ایک امت اجابت، دوم امت دعوت، جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر کے ان پر ایمان لایا وہ امت اجابت کہلاتے ہیں جبکہ منکرین، امت دعوت میں شامل ہیں، اس حدیث میں امت اجابت کے متعلق فرمایا کہ وہ کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، تاہم قیامت کے قریب اگر چہ سب لوگ کفر پر مجتمع ہوں گے مگر وہ امت اجابت نہیں ہوں گے۔

اس حدیث سے اجماع کی معصومیت عن الطغلات بھی معلوم ہوئی مگر سب امت کی نہیں بلکہ اہل علم کی ورنہ فاسق تو بہت سارے گناہوں اور گمراہی کے کاموں پر شغف ہو جاتے ہیں، مرقاۃ میں ہے:

"والمراد اجماع العلماء منهم ولا عبرة باجماع العوام وفي اضافة الامة الى

اسمه الشريف اشارة الى ان هذه الامة هي التي امتاز بهذه الفضيلة من بين سائر

الامم۔"

اجماع کی اقسام اور ان کے الگ الگ احکام مطولات میں دیکھے جاسکتے ہیں، بہر حال اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جماعت کو ترک کرنے والا شخص قیامت کے روز اہل جنت کی جماعت سے الگ کر کے جہنم میں پھینکا جائے گا، یہ بھی ممکن ہے کہ جنتیوں سے علیحدہ کئے جانے کے ساتھ وہ جہنم میں بھی تنہا رکھا جائے جیسا کہ حدیث مبارک کے الفاظ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے، اس طرح مصیبت ڈبل ہو جائے گی دوزخی ہونا اور تنہائی کی زندگی بسر کرنا۔ والعیاذ باللہ، بنا بریں ہر آدمی پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ امت کے سوا داء عظیم کے

ساتھ ہی رہے، اہل حق کے عقائد، اقوال اور افعال پر استقامت کے ساتھ قائم و دائم رہے تاکہ اسی پر موت نصیب ہو۔

باب ماجاء فی نزول العذاب اذالم یغیر المنکر

”عن ابی بکر الصدیق انه قال: یا ایہا الناس انکم تقرءون هذه الآية: ”یا ایہا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا هتدیتم“^۱ وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان الناس اذا راوا الظالم فلم یأخذوا علی یدیه أو شک ان یعقہم اللہ بعقاب منه“۔ (حسن صحیح کذا جزم علیہ فی تفسیر سورة المائدہ)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو: ”اے ایمان والو! اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا“۔ (مائدہ آیت نمبر ۱۰۵) (مگر اس کو ظاہری مطلب پر حمل کر کے خوش فہمی میں نہ پڑھو کیونکہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں (یعنی ظلم کرتا ہوا) اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں (یعنی اسے ظلم سے نہ روکیں) قریب ہے کہ اللہ ان پر عام عذاب نازل فرمائیں۔

لغات: ”فولہ“ ”أو شک“ ”فتح الحمزہ“ وسکون الواو وفتح الشین بمعنی قسارت و”أسرع“ یعنی قریب ہے اور ایسا بہت جلد ہوگا۔

تشریح:۔ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے بارے میں یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں لوگ اس آیت کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ نہ بیٹھیں، اس لئے مندرجہ بالا حدیث بیان فرمائی کہ جب لوگ نہی کی کو حسب استطاعت نہیں روکیں گے تو عام عذاب آئے گا۔

عارضہ میں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین کا بنیادی اصول اور مقصود اعظم ہے اسی کے لئے تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی ہے۔ ”و هو فرض علی الناس منی وفراڈی بشرط القدرۃ علیہ والامن علی النفس والعمال معہ“ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں جو عذاب کی بات کی گئی ہے اس میں عظیم فتنہ ہے

کیونکہ بعض گناہوں کی عقوبت جلد ملتی ہے، مگر سے نہ روکنا ان گناہوں میں سے ہے جس پر فوری سزا مرتب ہوتی ہے جو مال کی کمی، بچوں کی قلت، جانوں کے ضیاع اور ذلت و ظلم کی صورت میں ہوتی ہے۔ (یعنی مافی العارضۃ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج مسلمان ان تمام جاہلوں کا سامنا کر رہا ہے کوئی دن قتل و قتل کے بغیر نہیں گزر رہا، بارشیں یا تو ہوتی نہیں یا پھر جاہلی مچاتی ہیں، دریائے سندھ آج کل خشک پڑا ہوا ہے جو دنیا کے بڑے دریاؤں میں بیسیوں نمبر پر ہے، ظلم کا عالم یہ ہے کہ کوئی مظلوم نہ اپنی داستانِ ظلم تھانے میں جا کر پولیس کو سنا سکتا ہے کہ وہ خود پھنس جاتا ہے اور لینے کے دینے پڑتے ہیں اور نہ ہی کسی عدالت کا دورازہ کھٹکا سکتا ہے کہ عدالتیں تو امیروں اور وزیروں جیسے لوگوں کے لئے ہیں، وکلاء کی فیسیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں ایک ہزار کی وصولی کے لئے لاکھوں دینار عقل میں آتا ہے اور نہ غریب کی رنج و قدرت میں ہے۔

اعتراف:۔ اس طرح تو بظاہر اس حدیث اور اس آیت میں تعارض سا ہو گیا کہ آیت سے چھوٹ معلوم ہوتی ہے جبکہ حدیث سے لزوم معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہر صورت لازمی ہے ورنہ عذاب یقینی ہے۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کے الگ الگ محال ہیں اس لئے کوئی تعارض نہیں، ان کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱)۔ اس آیت کا تعلق ابتدائے اسلام سے ہے جبکہ حدیث کا تعلق قوتِ اسلامی کے حصول کے زمانے سے ہے، گویا یہ منسوخ یا از قبیل منسأ ہے، منسا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی ایک حکم پر عمل ہو جب حالات اس کے مطابق ہوں اور کبھی دوسرے پر عمل ہو جب حالات سازگار نہ ہوں جیسے جہاد کی آیات اور صبر کی تلقین میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان میں اس طرح کی تطبیق دی ہے۔

(۲)۔ "من ضل" سے مراد وہی لوگ ہیں یعنی جب مسلمان اپنے دین پر قائم ہوں تو وہیوں کی لاوینیت ان کے لئے نقصان دہ نہیں۔

(۳)۔ "من ضل" سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

(۴)۔ امام ترمذیؒ نے سورۃ مائدہ کی تفسیر میں ایک حدیث کی تخریج کی ہے جس کے مطابق یہ اس زمانے سے متعلق ہے جب لوگ خواہشات میں منہمک ہو کر احکامِ شرع پر کان دھرنے لگے اور چھوڑ دیں گے ایسے میں

امر بالمعروف کا اثر ختم ہو جائے گا اس لئے اس کا لزوم ختم ہو کر صرف اپنا فکر و عمل کافی ہوگا۔

ولغظه: "عن ابی امیۃ الشعبانی قال أتیت ابی العباس الخشنی فقلت له کیف تصنع فی هذه الآیة؟ قال آیة آتت؟ قلت قوله تعالیٰ یا ایها الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا هتدیتم" قال: أما والله لقد سألت عنها شیئاً سألت عنها رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنکر حتی اذا رأیت شحاً مطاعاً و هو یُشبعاً و دنیا مؤثرة و اعجاب کل ذی رأى برأیه فعلیک بخاصة نفسك و دَعِ العوامَ فان من و زائیکم اکیماً الصبر فیہن مثل القبض علی الحجر للمعامل فیہن مثل اجر خمسمین رجلاً یعملون مثل عملکم" الخ۔^۱ (ابواب الغیر ص: ۱۳۶، ج ۱، ایم سعید)

ایسے میں سابقہ باب میں بخاری شریف کی حدیث پر عمل کا وقت ہوگا کہ: "فاعتزل تلك الفرق كلها" الخ۔^۲ اس حدیث کی تشریح ان شاء اللہ متعلقہ باب میں آئے گی۔

باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

"عن خدیجۃ بن الیمان عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: والذی نفسی بیدہ لتأمرن بالمعروف و لتنهون عن المنکر و لیوشکن الله ان یمعث علیکم عذاباً منہ فتدعونہ فلا یمستجیب لکم"۔^۱ (حسن)

حضرت خدیجہ بن یمان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا تو تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرتے رہو یا پھر اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب نازل کرے گا پھر تم اس سے دعائیں مانگو گے مگر تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔

^۱ ابیضا رواہ ابو داؤد ص: ۲۳۹ ج: ۲، کتاب الملاحم.

^۲ صحیح بخاری ص: ۱۰۳۹ ج: ۲، "باب کیف الامر اذا لم تکن جماعۃ" کتاب الفتن رواہ مسلم فی کتاب الامارۃ، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۶، ابواب الفتن.

باب ماجاء فی الامر بالمعروف

^۱ ابیضا رواہ احمد فی مسنده ص: ۵۳۷ ج: ۶، حلیث: ۲۲۷۹۰.

لغات:۔ بقولہ ”بالمعروف“ امام راغب رحمہ اللہ المفردات القرآن میں لکھتے ہیں: ”والمعروف اسم لكل فعل يُعرف بالعقل أو الشرع حسنه والمنكر ما ينكر بهما۔ بقولہ ”المنكر“ مفردات القرآن میں ہے: ”والمنكر كل فعل تحكّم العقول الصحيحة يُقبّحه أو تتوقف في استقباحه واستحسانه العقول فتحكّم بقبحه الشرعية“ یعنی عقل سلیم جس چیز کو غور و خوض سے مستحسن قرار دے اور شریعت اس کا حکم کرے یا کم از کم اجازت دیدے تو وہ معزوف ہے اور جو چیز ان دونوں کے نزدیک بالکل نئی اور قبیح ہو وہ منکر ہے یعنی عقل و نقل سے ناشائس۔ یہاں یہ نکتہ بھی قارئین کے فائدے کے لئے لکھا جاتا ہے کہ معروف معرفت سے ہے جو علم ہے انھیں ہے ”کما قال الراغب والمعرفان ادراك الشيء بتفكر وتدبر وهو اخص من العلم وبضاده الإنكار وبقال: فلان يعرف الله ولا يقال يعلم الله... ويقال: الله يعلم ولا يقال يعرف بكذا“۔

تشریح:۔ عارضۃ الاحوذی میں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے اسلام کی تین حالتیں ہیں: (۱) حالت بلا و ٹر ب و ذالک بلکہ فی الاوئی یعنی ایک حالت وہ تھی جس میں مصائب کی بھرمار تھی وہ کمی دور ہے۔ (۲) پھر مدنی دور آیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر ہوئے۔ (۳) کم ضعف ذالک الی الان حتی صبار فی المعاصی والمظالم کما کان فی الجاهلیۃ الاولیٰ یعنی اس قدرت و طاقت میں پھر کمزوری آتی رہی تا آنکہ دور حاضر میں وہ سب یا کم از کم بہت کچھ ایسا ہی ہونے لگا جیسے زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔

قارئین یہ تو اس شخص نے اپنے زمانے کی بات کی ہے جو ۵۴۳ھ میں وفات پانچے ہیں، آج ہمارا دور وہ زمانہ ہے جس میں قیامت کی آمد بہت ہی قریب ہے کہ علامات مغربی سب ظاہر ہو چکی ہیں صرف علامات کبریٰ کا آنا باقی ہے، ان منکرات میں سب سے خطرناک چیزیں تین ہیں اور یہی تین امریکہ و یورپ کے اصل اہداف ہیں (۱) موسیقی عام کرنا۔ (۲) بے پردگی و فحاشی کو فروغ دینا اور ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا بلکہ عزت افزائی کرنا جو اس کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ (۳) سود کو ضرورت بنانا، ان تینوں میں سے ایک پر بھی قابو پانا بظاہر ناممکن لگتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب عرف شذی میں فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے مگر اس کے اثر نہ ہونے کے یقین ہو جانے سے ترک جائز ہو جاتا ہے مگر ایسے میں بھی عزیمت یہ ہے کہ اس پر عمل

کیا جائے الایہ کہ اذیت یا مسرت کا اندیشہ ہو تو پھر چھوڑ دے۔ اس کے ساتھ باب سابق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔
بہر حال اس حدیث میں بطور قضیہ شرطیہ منفصلہ حقیقیہ کے اعدا الامرین پر حکم لگایا گیا ہے کہ یا تو
امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرو گے یا پھر تم پر عذاب آئے گا نہ تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع ہوں گی اور نہ ہی
رفع ہوں گی بلکہ اگر ایک نہ ہوگی تو دوسری ہوگی۔ تدبیر

دوسری حدیث:- عن حذیفہ بن الیمان ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: والذی
نفسی بیدہ لا تقوم الساعة حتی تقتلوا امامکم وتحتلوا باسما فکم ویرث دنیاکم اشرارکم۔
(حسن) ۲

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی
قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم قتل کر لو گے اپنا امام اور یہ کہ تم آپس
میں تلواروں سے لڑو گے اور تمہاری دنیا (حکومت وغیرہ) پر تمہارے بدترین لوگ قابض ہو جائیں گے۔

لغات:- قولہ "تحتلوا" اجتلبوا یا لیسف، اس وقت کہا جاتا ہے جب لوگ آپس میں پناہ کھیل
رہے ہوں یا تلواروں سے لڑ رہے ہوں۔ قولہ "اشرارکم" شریر کی جمع ہے جو شر سے مشتق ہے، شر کے معنی فتنہ
وفساد اور بد اخلاقی و گناہ کے آتے ہیں، غنہ گردی کرنے والے کو بھی شریر کہتے ہیں، اشرار اور اشرار بھی جموع آتی
ہیں۔

تشریح:- اس حدیث کو بعض شارحین نے سابقہ حدیث کے ساتھ جوڑا ہے کہ دونوں کاما خدا ایک ہی
ہے اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ راوی ہیں علی ہذا امام سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں مگر حدیث
میں چونکہ دو امرین کا ذکر ہے قتل امام اور تسلط اشرار تو پہلا امر اس زمانے میں آچکا تھا جبکہ اب دوسرے کی
آمد آمد ہے۔

مگر عام شارحین کہتے ہیں کہ امام سے مراد سلطان ہے اور یہ واقعہ حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد سے
قبل پیش آئے گا یہ تو جیسے اس لئے بہتر ہے تاکہ دونوں علامتیں قریب قریب ہو جائیں، تاہم اس صورت میں یہ
ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ قتل اور حضرت مہدی کی آمد کے درمیان کافی وقفہ ہو گا جس میں اشرار شرارتوں کی انتہاء

کریں گے، یہ بھی ممکن ہے کہ اشرار کا تسلط مابعد نزول عیسیٰ علیہ السلام دو فواتیر مراد ہو یعنی لوگ اپنا سلطان قتل کریں گے، یہ ایک اہم نشانی ہے پھر زمانہ امن آجائے گا پھر جب وہ دور ختم ہو جائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو جائے گی تو پھر جو حالت اس دنیا کی ہوگی تو اللہ بچائے، الامان والحفیظ، اس میں انسان نہا جانور تخت و دولت پر قابض ہوں گے اور ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔ واللہ اعلم، اس حدیث کو اہل حریمین کے ساتھ جوڑنا افضل ہے۔

بہر حال اس حدیث کو باب ہذا میں لانے کی وجہ ہیں: ایک یہ کہ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر معطل ہوگا تو انجام یہ نکلے گا کہ اشرار غالب آجائیں گے، یا مطلب یہ ہے کہ آمر و نوالنا ہوں اچھے لوگ ہیں مگر جو لوگ آخری زمانے میں تخت و سلطنت کے مالک ہوں گے وہ اچھائی و بھلائی سے محروم ہوں گے کہ وہ تو گناہوں کو فروغ دینے والے ہوں گے نہ کہ منع کرنے والے۔

تیسری حدیث: "عن ام سلمة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انه ذکر الحیث الذی یُعَسَفُ بہم فقالت ام سلمة: لَعَلَّ فیہم المَکْرَہُ؟ قال: انہم یُعَثُّونَ عَلٰی نِیَاتِہِمُ" (حسن غریب) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کا ذکر فرمایا جس کو زمین میں دھنسیا جائے گا پس ام سلمہ نے پوچھا شاید ان میں سے کوئی ایسا بھی ہو جسے زبردستی شامل کیا گیا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو اپنی اپنی نیتوں کے مطابق (قبروں سے) اٹھایا جائے گا۔ لغات: بقولہ "یُعَثُّونَ" بحث کے معنی بھیجے، نیند سے بیدار کرنے، پھیلانے، آزاد کرنے، آمادہ کرنے اور موت کے بعد زندہ کرنے وغیرہ کے آتے ہیں، یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔

تشریح:۔ یعنی ایسے لوگ جو شر پسندوں اور مفسدین کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کئے جاتے ہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تعلق نہیں کر سکتے مثلاً نہ جانے کی صورت میں ان کو نا قابل برداشت تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو ایسے میں اگرچہ قیامت کے دن ان کی نیت معتبر ہوگی یعنی اگر وہ واقعی مجبور تھے اور کسی مسلمان یا مجاہد پر گولی چلا نا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی بندوق کا رخ عداً مسلمانوں کی طرف رکھتے بلکہ حتی الامکان ہوا میں گولیاں چلاتے رہے تو وہ نفس شرکت جبری پر مأخوذ نہ ہوں گے تاہم جہاں تک دنیوی عذاب کا تعلق ہے تو وہ سب کو شامل ہوگا "قال اللہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُغَصِّبُ الذِّہِنَ ظَلَمُوا مِنْکُمْ حَاصَّةً" (الآیہ نمبر ۲۵، سورہ

انفال) یعنی جب مجرموں کی وجہ سے دنیا میں عذاب آتا ہے تو اس میں بچوں سمیت غیر مجرم بھی لپیٹ دیئے جاتے ہیں مگر آخرت میں ہر ایک کا حساب کتاب الگ ہوگا۔

باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید او باللسان او بالقلب

”عن طارق بن شہاب قال اول من قدم الخطبة قبل الصلوة مروان فقام رجل فقال لیسرون خالفت السنة فقال بافلان اترك ما هناك فقال ابو سعید: لما هذا فقد قضی ما علیہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول: من رأى منكم منكراً فليغيره بيده ومن لم يستطع فبلسانه ومن لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت طارق بن شہاب سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے نماز (عید) سے پہلے خطبہ دیا وہ مروان تھے چنانچہ ایک شخص نے اٹھ کر مروان سے کہا: تم نے سنت کی خلاف ورزی کی ہے تو مروان نے کہا اے فلان! وہ (سنت مطلوبہ) چھوڑ دی گئی ہے، پس ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا بلا شہد اس شخص نے وہ حق ادا کر دیا جو اس کے ذمے تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر ڈالے (یعنی روکے) اور جو اس کی طاقت نہ رکھے وہ اپنی زبان سے روکے اور جو اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ اپنے دل سے (روکنے کا ارادہ رکھے کہ عند القدرت میں اسے روکوں گا اور یہ تب ہوگا جب فی الوقت اسے کمر امانے اور یہ درجہ کزور ایمان کا ہے۔

تشریح:۔ چونکہ حضرت مروان بالاتفاق تابعی ہیں بلکہ بعض نے تو ان کی صحابیت کا بھی دعویٰ کیا ہے اور امام بخاریؒ نے ان سے روایات بھی لی ہیں اس لئے ان کے اس جواب اور کلام میں یہ تاویل و توجیہ ضروری ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ اب لوگ عید کی نماز کے بعد خطبہ نہیں سنتے اور اس میں ہم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں جو واجب اور فرض ہے اس لئے اس کو مقدم کیا تاکہ لوگ سن لیں اور ہماری ذمہ داری پوری ہو جائے گویا یہ ایک اطاعت سے اعلیٰ کی طرف انتقال ہے بالکل ترک نہیں ہے، اگرچہ یہ حیلہ ان کے عمل کے جواز کے لئے کافی نہیں لیکن کلام کی توجیہ کے لئے کافی ہے، اور لوگوں کے نہ سننے کی وجہ سے اسکا بار عن الحق نہیں

باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید الخ

۱۔ الحدیث أخرجه أيضاً مسلم فی الايمان: ۷۸، نسائی ایمان باب: ۱۷، مسند احمد ص: ۳۹۷ ج: ۳ حدیث: ۱۰۷۶۶،

ایضاً ص: ۳۴ ج: ۳ حدیث: ۱۰۶۸۸،

بلکہ بعض بنو امیہ اپنے خطبوں میں اہل بیت پر تنقید کرتے اس لئے لوگ اٹھ کر چلے جاتے۔

اس حدیث پر ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے شرح الخمسین (جامع العلوم والکلیم فی شرح خمسین حدیث من جوامع الکلم) میں تفصیل سے بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عدم قدرت کی صورت میں وجوب بالاتفاق ساقط ہو جاتا ہے تاہم پھر بھی جو شخص اس پر عمل کرے تو وہ عزیمت اور باعث فضیلت ہے کیونکہ معذورین اگرچہ ترک عمل سے گناہ گار تو نہیں ہوتے ہیں مگر ان کے مقابلے میں عاملین افضل ہوتے ہیں، اصحاب المسبت کو ایک جماعت نے رد کا اور دوسری نے وعظ میں تاثیر نہ سمجھ کر سکوت اختیار کیا مگر افضل واعظین تھے، عورتیں اگرچہ ماہواری کے ایام میں نماز پڑھنے سے معذور ہوتی ہیں مگر مردوں کے مقابلے میں ان کو بتائیں ناقصات الدین قرار دیا گیا ہے، پھر عدم استطاعت سے مراد کیا ہے تو وہ لکھتے ہیں کہ جسے قتل کئے جانے یا کوڑے لگنے یا قید کئے جانے یا مال وغیرہ کا خطرہ لاحق ہو جیسے حکام کے متعلق کوئی منکر ہو تو وہ معذور سمجھا جائے گا جبکہ برا بھلا سننے کی پرواہ نہیں کرے گا ہاں البتہ حکام سے قتال نہیں کرے گا (یعنی کفر برباہ سے کم درجے میں) البتہ اگر ہو سکے تو ان کے اقدامات غیر شرعیہ کو ہاتھ سے ختم کر دے جیسے شراب کے برتن توڑنا یا آلات موسیقی وغیرہ توڑنا۔

المسیر شد عرض کرتا ہے کہ آج کل تو یہ کام یعنی توڑنے والا انفرادی طور پر تقریباً ناممکنات میں سے ہے ہاں کوئی جماعتی شکل میں کر سکے جیسے کوئی مضبوط سیاسی پارٹی کے کارکن ہوں تو وہ الگ بات ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ آج کل جمہوریت کا راج ہے اور اس میں فساق کی زیادہ چلتی ہے لہذا ہاتھ سے روکنے کی کوشش شاید کسی بھی جگہ زیادہ نقصان کا باعث بنے، زبان کا حکم بھی وہی ہے جو ہاتھ سے روکنے کا ہے یعنی اگر منکر پر اعتراض کی ہمت نہ ہو بوجہ خطرات کے تو یہ دوسرا درجہ بھی اس کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے، اس کے بعد قلبی نفرت کا درجہ رہتا ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے، آج کل اگرچہ بعض منکرات پر بعض مقامات میں تنقید تو ہو سکتی ہے مگر سب کے سب منکرات اور تمام مقامات میں روکنا یا ان پر ٹوکنا ناممکن ہے، کیونکہ عام منکرات اب مقامی نہ رہے بلکہ عالمی بن گئے ہیں۔

شرح الخمسین میں ہے:

”و كذلك روى عن طائفة من الصحابة في قوله تعالى: ”عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اعتديتم“ قالوا لم يأت تأويلها، انما تأويلها اني

آخر الزمان الخ۔

بہر حال یہ بات اچھی طرح ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ نبی عنہ اس مکر میں نرمی اور شفقت کا عنصر غالب

ہونا چاہئے:

”وكان اصحاب ابن مسعود اذا مروا بقوم يرون منهم ما يكرهون، يقولون: مهلاً رحمكم الله مهلاً رحمكم الله“۔

پھر اجماعی یعنی متفقہ منکرات سے روکنا بقدر طاقت واجب ہے جبکہ اختلافی مسائل میں غلو سے بچنا چاہئے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے شرح المحسن کی حدیث ص: ۳۴)

ہاں اگر وہ اختلاف ضعیف ہو جیسے رہائش یا نکاح یا تکفیر وغیرہ تو وہ بھی ان منکرات میں شمار ہوگا جس کی نکارت پر اتفاق ہے، شرح المحسن میں اس کی مثالیں دینے کے بعد لکھا ہے کہ اگر ایک شخص لفظ واحد کے ساتھ تین طلاقیں دیدے اور کوئی قاضی بغیر نکاح زوج آخر کے رجوع کا حکم دیدے تو وہ فیصلہ نامنظر اور ایسا کرنے والا سزا کا مستحق ہوگا۔

دل سے بُرا سمجھنے کا مطلب:۔ اس حدیث پاک میں منکر کو فقط دل سے نفرت کرنے اور بُرا سمجھنے کو اضعاف الایمان کہا ہے اور مسلم وغیرہ کی ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے: ”وفیه: من جاهدہم بقلبه فهو مؤمن ولیس وراء ذالک من الایمان حجة عند الله“۔

لیکن سوال یہ ہے کہ دل سے روکنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا جواب ایک تمہید پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ ایمان کی مثال ایک کسوٹی کی سی ہے جب اس پر اچھائی وارد ہوتی ہے تو یہ اسے قبول کرتا ہے اور اس پر خوش و مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ بُرائی کو رد و نامنظر کرتا ہے، پیچھے گزرا ہے کہ مکروہ ہے جو بنظر عقل و نقل بُرا ہو یا عقل کو اس میں توقف ہو اور شریعت اسے ناپسند قرار دیدے مثلاً بعض اشیاء ایسی ہیں جو طبعیت کو پسند ہوتی ہیں جبکہ بعض اشیاء کی قباحت معقول ہوتی ہے مگر بعض میں انفاء ہوتا ہے ایسے میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ غیر مشروع چیز کو ناپسند کرے گویا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز طبعی اعتبار سے مرغوب ہو لیکن عقلاً و شرعاً ناپسندیدہ ہو یا عقل کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہو اور شریعت نے اسے ممنوع قرار دیا ہو مثال کے طور پر کسی نے موسیقی کے سُر کے ساتھ سُر ملی آواز میں گانا بنایا کسی انتہائی خوب صورت لڑکی پر نظر پڑ گئی تو اگرچہ کالمین تو اس چیز کو طبعاً بھی بُرا سمجھتے ہیں مگر عوام دھینا اس سے محظوظ ہوتے ہیں، ایسے میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے عواقب پر نظر ڈالے اور نفس پر پاؤں

رکھ کر اس آواز کو بند کر دے یا اس سے دور چلا جائے اور اپنی نگاہ پست کر دے گواہ اس میں تکلف کرنا پڑے۔

اس تمہید کے بعد سمجھنا چاہئے کہ مؤمن کو اچھے بُرے کی تمیز کرنا لازمی ہے، بُرائی بظاہر کتنی ہی اچھی لگے اور طبیعت کو کتنی ہی پسند ہو لیکن منظر عقل و شرع اس کو بُرا جانتا ضروری ہے اس کے بعد اس سے خود بچنا چاہئے اور دوسروں کو بچانا چاہئے لیکن اگر وہ دوسروں کو نہیں بچا سکتا تو کم از کم خود تو بچے، اور اگر کوئی مجبوری ایسی ہے کہ وہ عملی طور پر خود بھی نہیں بچ سکتا مثلاً کسی کا پڑوسی اونچی آواز میں گانے سننے کا شوقین ہے اور اس کی آواز دوسرے گھروں تک بھی پہنچ جاتی ہے اور روکنے کی قدرت نہیں اور ہجرت کی استطاعت نہیں تو کم از کم اس عمل کو بُرا ماننا ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے، اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

شرح عقائد مع التمتن میں ہے:

”ويحوز العقاب على الصغرة والعفوة عن الكبيرة اذ لم تكن عن استحلال، والاستحلال

كفر لما فيه من التكذيب المنافي للتصديق“ (ص: ۸۷، مکتبہ علوم اسلامیہ پشاور)

خلاصہ یہ ہوا کہ دل سے بُرا سمجھنا باعتبار عقل و نقل ہے نہ کہ طبعاً اور یہ کہ اسے ممنوع سمجھے، چارہ حلال نہ سمجھے۔

باب منہ

”عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَنْ ثَلَّ الْقَائِمَ عَلَى حُدُودِ اللَّهِ وَالْمُسْلِمِينَ فِيهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهْمُوا عَلَى سَفِينَةٍ فِي الْبَحْرِ فَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَعْلَاهَا وَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَسْفَلُهَا فَكَانَ الَّذِينَ فِي أَسْفَلِهَا يُصْعِدُونَ فَيَسْتَقُونَ الْمَاءَ فَيَصُبُّونَ عَلَى الَّذِينَ فِي أَعْلَاهَا فَقَالَ الَّذِينَ فِي أَعْلَاهَا: لَأَنذَعُكُمْ نَصْعَدُونَ فَنُؤْذِنُ أَقَالَ الَّذِينَ فِي أَسْفَلِهَا قَالُوا نَنْقِيهِمْ فِي أَسْفَلِهَا فَاسْتَقَى قَائِمٌ أَعْلَى أَيْدِيهِمْ فَمَنْعُوهُمْ نَحْوًا جَمِيعًا وَأَنْ تَرَكَوهُمْ غَرِقُوا جَمِيعًا“ (حسن صحيح)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی حدود کی پابندی کرنے والے اور ان میں کوتاہی کرنے والے کی مثال ان لوگوں کی حالت کی مانند ہے جنہوں نے ایک سمندری کشتی میں بیٹھنے کے لئے قرعہ اندازی کی پس بعض کو اس کا بالائی حصہ (منزل)

باب منہ

۱۔ روی بمعناه البخاری ص: ۳۳۹ ج: ۱ کتاب الشركة، وص: ۳۶۹ ج: ۱ کتاب الشهادات، مسند احمد ص: ۳۳۳

ج: ۵ حدیث: ۱۷۹۷، ۱۷۹۸، ۱۷۹۹، ۱۸۰۰، ۱۸۰۱، ۱۸۰۲، ۱۸۰۳، ۱۸۰۴، ۱۸۰۵، ۱۸۰۶، ۱۸۰۷، ۱۸۰۸، ۱۸۰۹، ۱۸۱۰، ۱۸۱۱، ۱۸۱۲، ۱۸۱۳، ۱۸۱۴، ۱۸۱۵، ۱۸۱۶، ۱۸۱۷، ۱۸۱۸، ۱۸۱۹، ۱۸۲۰، ۱۸۲۱، ۱۸۲۲، ۱۸۲۳، ۱۸۲۴، ۱۸۲۵، ۱۸۲۶، ۱۸۲۷، ۱۸۲۸، ۱۸۲۹، ۱۸۳۰، ۱۸۳۱، ۱۸۳۲، ۱۸۳۳، ۱۸۳۴، ۱۸۳۵، ۱۸۳۶، ۱۸۳۷، ۱۸۳۸، ۱۸۳۹، ۱۸۴۰، ۱۸۴۱، ۱۸۴۲، ۱۸۴۳، ۱۸۴۴، ۱۸۴۵، ۱۸۴۶، ۱۸۴۷، ۱۸۴۸، ۱۸۴۹، ۱۸۵۰، ۱۸۵۱، ۱۸۵۲، ۱۸۵۳، ۱۸۵۴، ۱۸۵۵، ۱۸۵۶، ۱۸۵۷، ۱۸۵۸، ۱۸۵۹، ۱۸۶۰، ۱۸۶۱، ۱۸۶۲، ۱۸۶۳، ۱۸۶۴، ۱۸۶۵، ۱۸۶۶، ۱۸۶۷، ۱۸۶۸، ۱۸۶۹، ۱۸۷۰، ۱۸۷۱، ۱۸۷۲، ۱۸۷۳، ۱۸۷۴، ۱۸۷۵، ۱۸۷۶، ۱۸۷۷، ۱۸۷۸، ۱۸۷۹، ۱۸۸۰، ۱۸۸۱، ۱۸۸۲، ۱۸۸۳، ۱۸۸۴، ۱۸۸۵، ۱۸۸۶، ۱۸۸۷، ۱۸۸۸، ۱۸۸۹، ۱۸۹۰، ۱۸۹۱، ۱۸۹۲، ۱۸۹۳، ۱۸۹۴، ۱۸۹۵، ۱۸۹۶، ۱۸۹۷، ۱۸۹۸، ۱۸۹۹، ۱۹۰۰، ۱۹۰۱، ۱۹۰۲، ۱۹۰۳، ۱۹۰۴، ۱۹۰۵، ۱۹۰۶، ۱۹۰۷، ۱۹۰۸، ۱۹۰۹، ۱۹۱۰، ۱۹۱۱، ۱۹۱۲، ۱۹۱۳، ۱۹۱۴، ۱۹۱۵، ۱۹۱۶، ۱۹۱۷، ۱۹۱۸، ۱۹۱۹، ۱۹۲۰، ۱۹۲۱، ۱۹۲۲، ۱۹۲۳، ۱۹۲۴، ۱۹۲۵، ۱۹۲۶، ۱۹۲۷، ۱۹۲۸، ۱۹۲۹، ۱۹۳۰، ۱۹۳۱، ۱۹۳۲، ۱۹۳۳، ۱۹۳۴، ۱۹۳۵، ۱۹۳۶، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۰، ۱۹۴۱، ۱۹۴۲، ۱۹۴۳، ۱۹۴۴، ۱۹۴۵، ۱۹۴۶، ۱۹۴۷، ۱۹۴۸، ۱۹۴۹، ۱۹۵۰، ۱۹۵۱، ۱۹۵۲، ۱۹۵۳، ۱۹۵۴، ۱۹۵۵، ۱۹۵۶، ۱۹۵۷، ۱۹۵۸، ۱۹۵۹، ۱۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۶۲، ۱۹۶۳، ۱۹۶۴، ۱۹۶۵، ۱۹۶۶، ۱۹۶۷، ۱۹۶۸، ۱۹۶۹، ۱۹۷۰، ۱۹۷۱، ۱۹۷۲، ۱۹۷۳، ۱۹۷۴، ۱۹۷۵، ۱۹۷۶، ۱۹۷۷، ۱۹۷۸، ۱۹۷۹، ۱۹۸۰، ۱۹۸۱، ۱۹۸۲، ۱۹۸۳، ۱۹۸۴، ۱۹۸۵، ۱۹۸۶، ۱۹۸۷، ۱۹۸۸، ۱۹۸۹، ۱۹۹۰، ۱۹۹۱، ۱۹۹۲، ۱۹۹۳، ۱۹۹۴، ۱۹۹۵، ۱۹۹۶، ۱۹۹۷، ۱۹۹۸، ۱۹۹۹، ۲۰۰۰، ۲۰۰۱، ۲۰۰۲، ۲۰۰۳، ۲۰۰۴، ۲۰۰۵، ۲۰۰۶، ۲۰۰۷، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹، ۲۰۱۰، ۲۰۱۱، ۲۰۱۲، ۲۰۱۳، ۲۰۱۴، ۲۰۱۵، ۲۰۱۶، ۲۰۱۷، ۲۰۱۸، ۲۰۱۹، ۲۰۲۰، ۲۰۲۱، ۲۰۲۲، ۲۰۲۳، ۲۰۲۴، ۲۰۲۵، ۲۰۲۶، ۲۰۲۷، ۲۰۲۸، ۲۰۲۹، ۲۰۳۰، ۲۰۳۱، ۲۰۳۲، ۲۰۳۳، ۲۰۳۴، ۲۰۳۵، ۲۰۳۶، ۲۰۳۷، ۲۰۳۸، ۲۰۳۹، ۲۰۴۰، ۲۰۴۱، ۲۰۴۲، ۲۰۴۳، ۲۰۴۴، ۲۰۴۵، ۲۰۴۶، ۲۰۴۷، ۲۰۴۸، ۲۰۴۹، ۲۰۵۰، ۲۰۵۱، ۲۰۵۲، ۲۰۵۳، ۲۰۵۴، ۲۰۵۵، ۲۰۵۶، ۲۰۵۷، ۲۰۵۸، ۲۰۵۹، ۲۰۶۰، ۲۰۶۱، ۲۰۶۲، ۲۰۶۳، ۲۰۶۴، ۲۰۶۵، ۲۰۶۶، ۲۰۶۷، ۲۰۶۸، ۲۰۶۹، ۲۰۷۰، ۲۰۷۱، ۲۰۷۲، ۲۰۷۳، ۲۰۷۴، ۲۰۷۵، ۲۰۷۶، ۲۰۷۷، ۲۰۷۸، ۲۰۷۹، ۲۰۸۰، ۲۰۸۱، ۲۰۸۲، ۲۰۸۳، ۲۰۸۴، ۲۰۸۵، ۲۰۸۶، ۲۰۸۷، ۲۰۸۸، ۲۰۸۹، ۲۰۹۰، ۲۰۹۱، ۲۰۹۲، ۲۰۹۳، ۲۰۹۴، ۲۰۹۵، ۲۰۹۶، ۲۰۹۷، ۲۰۹۸، ۲۰۹۹، ۲۱۰۰، ۲۱۰۱، ۲۱۰۲، ۲۱۰۳، ۲۱۰۴، ۲۱۰۵، ۲۱۰۶، ۲۱۰۷، ۲۱۰۸، ۲۱۰۹، ۲۱۱۰، ۲۱۱۱، ۲۱۱۲، ۲۱۱۳، ۲۱۱۴، ۲۱۱۵، ۲۱۱۶، ۲۱۱۷، ۲۱۱۸، ۲۱۱۹، ۲۱۲۰، ۲۱۲۱، ۲۱۲۲، ۲۱۲۳، ۲۱۲۴، ۲۱۲۵، ۲۱۲۶، ۲۱۲۷، ۲۱۲۸، ۲۱۲۹، ۲۱۳۰، ۲۱۳۱، ۲۱۳۲، ۲۱۳۳، ۲۱۳۴، ۲۱۳۵، ۲۱۳۶، ۲۱۳۷، ۲۱۳۸، ۲۱۳۹، ۲۱۴۰، ۲۱۴۱، ۲۱۴۲، ۲۱۴۳، ۲۱۴۴، ۲۱۴۵، ۲۱۴۶، ۲۱۴۷، ۲۱۴۸، ۲۱۴۹، ۲۱۵۰، ۲۱۵۱، ۲۱۵۲، ۲۱۵۳، ۲۱۵۴، ۲۱۵۵، ۲۱۵۶، ۲۱۵۷، ۲۱۵۸، ۲۱۵۹، ۲۱۶۰، ۲۱۶۱، ۲۱۶۲، ۲۱۶۳، ۲۱۶۴، ۲۱۶۵، ۲۱۶۶، ۲۱۶۷، ۲۱۶۸، ۲۱۶۹، ۲۱۷۰، ۲۱۷۱، ۲۱۷۲، ۲۱۷۳، ۲۱۷۴، ۲۱۷۵، ۲۱۷۶، ۲۱۷۷، ۲۱۷۸، ۲۱۷۹، ۲۱۸۰، ۲۱۸۱، ۲۱۸۲، ۲۱۸۳، ۲۱۸۴، ۲۱۸۵، ۲۱۸۶، ۲۱۸۷، ۲۱۸۸، ۲۱۸۹، ۲۱۹۰، ۲۱۹۱، ۲۱۹۲، ۲۱۹۳، ۲۱۹۴، ۲۱۹۵، ۲۱۹۶، ۲۱۹۷، ۲۱۹۸، ۲۱۹۹، ۲۲۰۰، ۲۲۰۱، ۲۲۰۲، ۲۲۰۳، ۲۲۰۴، ۲۲۰۵، ۲۲۰۶، ۲۲۰۷، ۲۲۰۸، ۲۲۰۹، ۲۲۱۰، ۲۲۱۱، ۲۲۱۲، ۲۲۱۳، ۲۲۱۴، ۲۲۱۵، ۲۲۱۶، ۲۲۱۷، ۲۲۱۸، ۲۲۱۹، ۲۲۲۰، ۲۲۲۱، ۲۲۲۲، ۲۲۲۳، ۲۲۲۴، ۲۲۲۵، ۲۲۲۶، ۲۲۲۷، ۲۲۲۸، ۲۲۲۹، ۲۲۳۰، ۲۲۳۱، ۲۲۳۲، ۲۲۳۳، ۲۲۳۴، ۲۲۳۵، ۲۲۳۶، ۲۲۳۷، ۲۲۳۸، ۲۲۳۹، ۲۲۴۰، ۲۲۴۱، ۲۲۴۲، ۲۲۴۳، ۲۲۴۴، ۲۲۴۵، ۲۲۴۶، ۲۲۴۷، ۲۲۴۸، ۲۲۴۹، ۲۲۵۰، ۲۲۵۱، ۲۲۵۲، ۲۲۵۳، ۲۲۵۴، ۲۲۵۵، ۲۲۵۶، ۲۲۵۷، ۲۲۵۸، ۲۲۵۹، ۲۲۶۰، ۲۲۶۱، ۲۲۶۲، ۲۲۶۳، ۲۲۶۴، ۲۲۶۵، ۲۲۶۶، ۲۲۶۷، ۲۲۶۸، ۲۲۶۹، ۲۲۷۰، ۲۲۷۱، ۲۲۷۲، ۲۲۷۳، ۲۲۷۴، ۲۲۷۵، ۲۲۷۶، ۲۲۷۷، ۲۲۷۸، ۲۲۷۹، ۲۲۸۰، ۲۲۸۱، ۲۲۸۲، ۲۲۸۳، ۲۲۸۴، ۲۲۸۵، ۲۲۸۶، ۲۲۸۷، ۲۲۸۸، ۲۲۸۹، ۲۲۹۰، ۲۲۹۱، ۲۲۹۲، ۲۲۹۳، ۲۲۹۴، ۲۲۹۵، ۲۲۹۶، ۲۲۹۷، ۲۲۹۸، ۲۲۹۹، ۲۳۰۰، ۲۳۰۱، ۲۳۰۲، ۲۳۰۳، ۲۳۰۴، ۲۳۰۵، ۲۳۰۶، ۲۳۰۷، ۲۳۰۸، ۲۳۰۹، ۲۳۱۰، ۲۳۱۱، ۲۳۱۲، ۲۳۱۳، ۲۳۱۴، ۲۳۱۵، ۲۳۱۶، ۲۳۱۷، ۲۳۱۸، ۲۳۱۹، ۲۳۲۰، ۲۳۲۱، ۲۳۲۲، ۲۳۲۳، ۲۳۲۴، ۲۳۲۵، ۲۳۲۶، ۲۳۲۷، ۲۳۲۸، ۲۳۲۹، ۲۳۳۰، ۲۳۳۱، ۲۳۳۲، ۲۳۳۳، ۲۳۳۴، ۲۳۳۵، ۲۳۳۶، ۲۳۳۷، ۲۳۳۸، ۲۳۳۹، ۲۳۴۰، ۲۳۴۱، ۲۳۴۲، ۲۳۴۳، ۲۳۴۴، ۲۳۴۵، ۲۳۴۶، ۲۳۴۷، ۲۳۴۸، ۲۳۴۹، ۲۳۵۰، ۲۳۵۱، ۲۳۵۲، ۲۳۵۳، ۲۳۵۴، ۲۳۵۵، ۲۳۵۶، ۲۳۵۷، ۲۳۵۸، ۲۳۵۹، ۲۳۶۰، ۲۳۶۱، ۲۳۶۲، ۲۳۶۳، ۲۳۶۴، ۲۳۶۵، ۲۳۶۶، ۲۳۶۷، ۲۳۶۸، ۲۳۶۹، ۲۳۷۰، ۲۳۷۱، ۲۳۷۲، ۲۳۷۳، ۲۳۷۴، ۲۳۷۵، ۲۳۷۶، ۲۳۷۷، ۲۳۷۸، ۲۳۷۹، ۲۳۸۰، ۲۳۸۱، ۲۳۸۲، ۲۳۸۳، ۲۳۸۴، ۲۳۸۵، ۲۳۸۶، ۲۳۸۷، ۲۳۸۸، ۲۳۸۹، ۲۳۹۰، ۲۳۹۱، ۲۳۹۲، ۲۳۹۳، ۲۳۹۴، ۲۳۹۵، ۲۳۹۶، ۲۳۹۷، ۲۳۹۸، ۲۳۹۹، ۲۴۰۰، ۲۴۰۱، ۲۴۰۲، ۲۴۰۳، ۲۴۰۴، ۲۴۰۵، ۲۴۰۶، ۲۴۰۷، ۲۴۰۸، ۲۴۰۹، ۲۴۱۰، ۲۴۱۱، ۲۴۱۲، ۲۴۱۳، ۲۴۱۴، ۲۴۱۵، ۲۴۱۶، ۲۴۱۷، ۲۴۱۸، ۲۴۱۹، ۲۴۲۰، ۲۴۲۱، ۲۴۲۲، ۲۴۲۳، ۲۴۲۴، ۲۴۲۵، ۲۴۲۶، ۲۴۲۷، ۲۴۲۸، ۲۴۲۹، ۲۴۳۰، ۲۴۳۱، ۲۴۳۲، ۲۴۳۳، ۲۴۳۴، ۲۴۳۵، ۲۴۳۶، ۲۴۳۷، ۲۴۳۸، ۲۴۳۹، ۲۴۴۰، ۲۴۴۱، ۲۴۴۲، ۲۴۴۳، ۲۴۴۴، ۲۴۴۵، ۲۴۴۶، ۲۴۴۷، ۲۴۴۸، ۲۴۴۹، ۲۴۵۰، ۲۴۵۱، ۲۴۵۲، ۲۴۵۳، ۲۴۵۴، ۲۴۵۵، ۲۴۵۶، ۲۴۵۷، ۲۴۵۸، ۲۴۵۹، ۲۴۶۰، ۲۴۶۱، ۲۴۶۲، ۲۴۶۳، ۲۴۶۴، ۲۴۶۵، ۲۴۶۶، ۲۴۶۷، ۲۴۶۸، ۲۴۶۹، ۲۴۷۰، ۲۴۷۱، ۲۴۷۲، ۲۴۷۳، ۲۴۷۴، ۲۴۷۵، ۲۴۷۶، ۲۴۷۷، ۲۴۷۸، ۲۴۷۹، ۲۴۸۰، ۲۴۸۱، ۲۴۸۲، ۲۴۸۳، ۲۴۸۴، ۲۴۸۵، ۲۴۸۶، ۲۴۸۷، ۲۴۸۸، ۲۴۸۹، ۲۴۹۰، ۲۴۹۱، ۲۴۹۲، ۲۴۹۳، ۲۴۹۴، ۲۴۹۵، ۲۴۹۶، ۲۴۹۷، ۲۴۹۸، ۲۴۹۹، ۲۵۰۰، ۲۵۰۱، ۲۵۰۲، ۲۵۰۳، ۲۵۰۴، ۲۵۰۵، ۲۵۰۶، ۲۵۰۷، ۲۵۰۸، ۲۵۰۹، ۲۵۱۰، ۲۵۱۱، ۲۵۱۲، ۲۵۱۳، ۲۵۱۴، ۲۵۱۵، ۲۵۱۶، ۲۵۱۷، ۲۵۱۸، ۲۵۱۹، ۲۵۲۰، ۲۵۲۱، ۲۵۲۲، ۲۵۲۳، ۲۵۲۴، ۲۵۲۵، ۲۵۲۶، ۲۵۲۷، ۲۵۲۸، ۲۵۲۹، ۲۵۳۰، ۲۵۳۱، ۲۵۳۲، ۲۵۳۳، ۲۵۳۴، ۲۵۳۵، ۲۵۳۶، ۲۵۳۷، ۲۵۳۸، ۲۵۳۹، ۲۵۴۰، ۲۵۴۱، ۲۵۴۲، ۲۵۴۳، ۲۵۴۴، ۲۵۴۵، ۲۵۴۶، ۲۵۴۷، ۲۵۴۸، ۲۵۴۹، ۲۵۵۰، ۲۵۵۱، ۲۵۵۲، ۲۵۵۳، ۲۵۵۴، ۲۵۵۵، ۲۵۵۶، ۲۵۵۷، ۲۵۵۸، ۲۵۵۹، ۲۵۶۰، ۲۵۶۱، ۲۵۶۲، ۲۵۶۳، ۲۵۶۴، ۲۵۶۵، ۲۵۶۶، ۲۵۶۷، ۲۵۶۸، ۲۵۶۹، ۲۵۷۰، ۲۵۷۱، ۲۵۷۲، ۲۵۷۳، ۲۵۷۴، ۲۵۷۵، ۲۵۷۶، ۲۵۷۷، ۲۵۷۸، ۲۵۷۹، ۲۵۸۰، ۲۵۸۱، ۲۵۸۲، ۲۵۸۳، ۲۵۸۴، ۲۵۸۵، ۲۵۸۶، ۲۵۸۷، ۲۵۸۸، ۲۵۸۹، ۲۵۹۰، ۲۵۹۱، ۲۵۹۲، ۲۵۹۳، ۲۵۹۴، ۲۵۹۵، ۲۵۹۶، ۲۵۹۷، ۲۵۹۸، ۲۵۹۹، ۲۶۰۰، ۲۶۰۱، ۲۶۰۲، ۲۶۰۳، ۲۶۰۴، ۲۶۰۵، ۲۶۰۶، ۲۶۰۷، ۲۶۰۸، ۲۶۰۹، ۲۶۱۰، ۲۶۱۱، ۲۶۱۲، ۲۶۱۳، ۲۶۱۴، ۲۶۱۵، ۲۶۱۶، ۲۶۱۷، ۲۶۱۸، ۲۶۱۹، ۲۶۲۰، ۲۶۲۱، ۲۶۲۲، ۲۶۲۳، ۲۶۲۴، ۲۶۲۵، ۲۶۲۶، ۲۶۲۷، ۲۶۲۸، ۲۶۲۹، ۲۶۳۰، ۲۶۳۱، ۲۶۳۲، ۲۶۳۳، ۲۶۳۴، ۲۶۳۵، ۲۶۳۶، ۲۶۳۷، ۲۶۳۸، ۲۶۳۹، ۲۶۴۰، ۲۶۴۱، ۲۶۴۲، ۲۶۴۳، ۲۶۴۴، ۲۶۴۵، ۲۶۴۶، ۲۶۴۷، ۲۶۴۸، ۲۶۴۹، ۲۶۵۰، ۲۶۵۱، ۲۶۵۲، ۲۶۵۳، ۲۶۵۴، ۲۶۵۵، ۲۶۵۶، ۲۶۵۷، ۲۶۵۸، ۲۶۵۹، ۲۶۶۰، ۲۶۶۱، ۲۶۶۲، ۲۶۶۳، ۲۶۶۴، ۲۶۶۵، ۲۶۶۶، ۲۶۶۷، ۲۶۶۸، ۲۶۶۹، ۲۶۷۰، ۲۶۷۱، ۲۶۷۲، ۲۶۷۳، ۲۶۷۴، ۲۶۷۵، ۲۶۷۶، ۲۶۷۷، ۲۶۷۸، ۲۶۷۹، ۲۶۸۰، ۲۶۸۱، ۲۶۸۲، ۲۶۸۳، ۲۶۸۴، ۲۶۸۵، ۲۶۸۶، ۲۶۸۷، ۲۶۸۸، ۲۶۸۹، ۲۶۹۰، ۲۶۹۱، ۲۶۹۲، ۲۶۹۳، ۲۶۹۴، ۲۶۹۵، ۲۶۹۶، ۲۶۹۷، ۲۶۹۸، ۲۶۹۹، ۲۷۰۰، ۲۷۰۱، ۲۷۰۲، ۲۷۰۳، ۲۷۰۴، ۲۷۰۵، ۲۷۰۶، ۲۷۰۷، ۲۷۰۸، ۲۷۰۹، ۲۷۱۰، ۲۷۱۱، ۲۷۱۲، ۲۷۱۳، ۲۷۱۴، ۲۷۱۵، ۲۷۱۶، ۲۷۱۷، ۲۷۱۸، ۲۷۱۹، ۲۷۲۰، ۲۷۲۱، ۲۷۲۲، ۲۷۲۳، ۲۷۲۴، ۲۷۲۵، ۲۷۲۶، ۲۷۲۷، ۲۷۲۸، ۲۷۲۹، ۲۷۳۰، ۲۷۳۱، ۲۷۳۲، ۲۷۳۳، ۲۷۳۴، ۲۷۳۵، ۲۷۳۶، ۲۷۳۷، ۲۷۳۸، ۲۷۳۹، ۲۷۴۰، ۲۷۴۱، ۲۷۴۲، ۲۷۴۳، ۲۷۴۴، ۲۷۴۵، ۲۷۴۶، ۲۷۴۷، ۲۷۴۸، ۲۷۴۹، ۲۷۵۰، ۲۷۵۱، ۲۷۵۲، ۲۷۵۳، ۲۷۵۴، ۲۷۵۵، ۲۷۵۶، ۲۷۵۷، ۲۷۵۸، ۲۷۵۹، ۲۷۶۰، ۲۷۶۱، ۲۷۶۲، ۲۷۶۳، ۲۷۶۴، ۲۷۶۵، ۲۷۶۶، ۲۷۶۷، ۲۷۶۸، ۲۷۶۹، ۲۷۷۰، ۲۷۷۱، ۲۷۷۲، ۲۷۷۳، ۲۷۷۴، ۲۷۷۵، ۲۷۷۶، ۲۷۷۷، ۲۷۷۸، ۲۷۷۹، ۲۷۸۰، ۲۷۸۱، ۲۷۸۲، ۲۷۸۳، ۲۷۸۴، ۲۷۸۵، ۲۷۸۶، ۲۷۸۷، ۲۷۸۸، ۲۷۸۹، ۲۷۹۰، ۲۷۹۱، ۲۷۹۲، ۲۷۹۳، ۲۷۹۴، ۲۷۹۵، ۲۷۹۶، ۲۷۹۷، ۲۷۹۸، ۲۷۹۹، ۲۸۰۰، ۲۸۰۱، ۲۸۰۲، ۲۸۰۳، ۲۸۰۴، ۲۸۰۵، ۲۸۰۶، ۲۸۰۷، ۲۸۰۸، ۲۸۰۹، ۲۸۱۰، ۲۸۱۱، ۲۸۱۲، ۲۸۱۳، ۲۸۱۴، ۲۸۱۵، ۲۸۱۶، ۲۸۱۷، ۲۸۱۸، ۲۸۱۹، ۲۸۲۰، ۲۸۲۱، ۲۸۲۲، ۲۸۲۳، ۲۸۲۴، ۲۸۲۵، ۲۸۲۶، ۲۸۲۷، ۲۸۲۸، ۲۸۲۹، ۲۸۳۰، ۲۸۳۱، ۲۸۳۲، ۲۸۳۳، ۲۸۳۴، ۲۸۳۵، ۲۸۳۶، ۲۸۳۷، ۲۸۳۸، ۲۸۳۹، ۲۸۴۰، ۲۸۴۱، ۲۸۴۲، ۲۸۴۳، ۲۸۴۴، ۲۸۴۵، ۲۸۴۶، ۲۸۴۷، ۲۸۴۸، ۲۸۴۹، ۲۸۵۰، ۲۸۵۱، ۲۸۵۲، ۲۸۵۳، ۲۸۵۴، ۲۸۵۵، ۲۸۵۶، ۲۸۵۷، ۲۸۵۸، ۲۸۵۹، ۲۸۶۰، ۲۸۶۱، ۲۸۶۲، ۲۸۶۳، ۲۸۶۴، ۲۸۶۵، ۲۸۶۶، ۲۸۶۷، ۲۸۶۸، ۲۸۶۹، ۲۸۷۰، ۲۸۷۱، ۲۸۷۲، ۲۸۷۳، ۲۸۷۴، ۲۸۷۵، ۲۸۷۶، ۲۸۷۷، ۲۸۷۸، ۲۸۷۹، ۲۸۸۰، ۲۸۸۱، ۲۸۸۲، ۲۸۸۳، ۲۸۸۴، ۲۸۸۵، ۲۸۸۶، ۲۸۸۷، ۲۸۸۸، ۲۸۸۹، ۲۸۹۰، ۲۸۹۱، ۲۸۹۲، ۲۸۹۳، ۲۸۹۴، ۲۸۹۵، ۲۸

ملا اور بعض کو پگھلی منزل ملی، پس وہ لوگ جو پگھلی منزل میں ہیں بالائی منزل پر چڑھ کر پانی لاتے ہیں تو وہ ان لوگوں پر جو اوپر کی منزل میں ہیں پر پانی گراتے ہیں تو اوپر والوں نے کہا کہ ہم آپ کو اوپر چڑھنے اور ہمیں اذیت دینے نہیں دیں گے تو اس کے تحتانی حصے والوں نے جواب دیا کہ پھر ہم اس کی پگھلی منزل میں سوراخ کر دیتے ہیں اور وہیں سے پانی لیں گے، پس اگر انہوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور ان کو روکا تو سب بچ جائیں گے لیکن اگر انہوں نے ان کو چھوڑا تو سب کے سب ڈوب جائیں گے۔

لغات:- قولہ "القائم علی حدود اللہ" حد کی جمع ہے، لغت و اصطلاح دونوں میں اس کے بہت سے معانی آتے ہیں مثلاً عِدْ مَنْطِقِ، حَدِّ حُکْمِ اور عِدْ عَرَفِ، یہاں حد شرعی مراد ہے یعنی وہ احکام جن کو اللہ نے ادا فرمایا ہے ذریعہ مقرر کیا ہے ان پر قائم کے معنی پابندی کرنے اور تحفظ کرنے کے ہیں۔ قولہ "المعدن" اس کو مدائن بالالف بھی کہتے ہیں، دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں، یہ لفظ گویا دہن بمعنی تیل سے مشتق ہے، بدھنت حق پوشی اور چالوسی کو کہتے ہیں یعنی منکر کو دیکھ کر باوجود قدرت کے نہ روکنے والا، گویا اس نے باطل پر خاموشی اختیار کر کے اس پر جواز کا تیل لگا کر اس کو چمکیلا بنانے کی کوشش کی ہے۔ قولہ "استهموا" یعنی قرعہ اندازی کے ذریعے اس میں بیٹھنے کی نشستیں اور منزلیں تقسیم کیں۔ قولہ "تمصعلون" ففتح الیاء صعود سے بمعنی چڑھنے کے ہے جبکہ إصعاد باب افعال سے ہوا زمین میں چلنے کو کہتے ہیں: ففی الایۃ الکرمۃ "اذتصعلون" ارجع ۱۱ بضم التاء ہے، مدبر۔ قولہ "فیستفون" استثنیٰ فلاناً کسی سے پانی یا سیرابی چاہنا۔ قولہ "فیصّبون" علی کا صلہ میں آنے کی وجہ سے متعدی کا ترجمہ کیا ہے۔

تشریح:- اس حدیث مبارک میں ایک مثال کے ذریعہ آگاہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ بُرائی کے مرکب ہونے والوں کے ہاتھ نہیں پکڑتے اور ان کو اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل سے باز نہیں رکھتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ جانیں اور ان کا کام جانے کیونکہ جب ان پر عذاب آئے گا تو وہ سب کو تباہ کر کے رکھ دے گا جیسے مذکورہ بالا مثال میں اگر بالائی منزل والے تحتانی منزل والوں کو نقب اور سوراخ سے نہیں روکیں گے تو کشتی میں پانی داخل ہو جائے گا اور اس طرح اوپر نیچے جتنے سوار لوگ ہیں سب غرق آب ہو جائیں گے۔

غرض دین اسلام کی مثال ایک کشتی کی طرح ہے اس میں سب لوگ بیٹھے ہوتے ہیں مگر اس کی حفاظت

اس سے مشروط ہے کہ کشتی میں نقب و سوراخ نہ کیا جائے ورنہ سب فرق ہوں گے لہذا منکرات سے اہل اسلام کی زندگیوں کو خطرہ ہے عظمیٰ کا تقاضا ہے کہ اگر قدرت ہو تو انہیں روکا جائے۔

باب افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر

”عن ابی سعید الخدری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان من اعظم الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر“۔^۱ (حسن غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بڑا جہاد ہے۔

لغات: ”قولہ“ ”من اعظم“ ایک روایت میں ”افضل“ کا لفظ ہے۔^۲ ”قولہ“ ”کلمۃ عدل“ ایک روایت^۳ میں لفظ ”کلمۃ حق“ آیا ہے لہذا عدل سے مراد حق ہے۔ ”قولہ“ ”جائر“ جور سے بمعنی ظلم کے ہے۔ تشریح: ظالم بادشاہ کے سامنے حق گوئی کو افضل جہاد اس لئے قرار دیا کہ ایسا کرنے والا میدان جنگ کے مجاہد سے زیادہ بڑا اور دلیر ہوتا ہے کیونکہ مجاہد کے شہید ہونے اور نہ ہونے کے دونوں امکانات ہوتے ہیں جبکہ اس کا بچا بظاہر مستبعد لگتا ہے، اور اگر اس کی بات پر عمل کرتا ہو سلطان جائر ظلم سے باز آجائے تو بھی اس کا بڑا فائدہ ہوگا جو مسلمانوں کو نفع دے گا۔

باب سوال النبی ﷺ ثلاثا فی امتہ

”عن عبد اللہ بن حبیب بن الازرق عن ابیہ قال: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ فاطا لہا فقالوا: یا رسول اللہ اصلیت صلوۃ لم تکن تصلیہا قال: أجل أنها صلوۃ رغبۃ ورہبۃ انی سئلۃ اللہ فیہا ثلاثا فاعطانی التین ومنعنی واحده سألته ان لا یہلک امتی بسنة فاعطانیہا و سألته ان لا یسقط علیہم عدوا من غیرہم فاعطانیہا و سألته ان لا یتذیب بعضہم باس

باب افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر

۱۔ رواہ ابن ماجہ ص: ۲۸۹ ابواب الفتن وفیہ: افضل الجہاد کلمۃ عدل الخ مستد احمد ص: ۳۳۲ ج: ۶۔

۲۔ کذا فی رواۃ ابن ماجہ حوالہ بالا۔

۳۔ کذا فی رواۃ مستد احمد ص: ۳۳۲ ج: ۶ حدیث: ۲۱۶۵۳۔

بعض فَمَنْعَیْهَا۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز پڑھائی تو اسے طویل فرمایا پس صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسی نماز پڑھائی جو پہلے اس طرح آپ نہیں پڑھاتے؟ فرمایا جی ہاں یہ امید و بیم کی نماز تھی کہ میں نے اس میں اللہ سے تین چیزیں مانگی تھیں دو تو مجھ کو عطا کر دیں اور تیسری منع کر دی، میں نے اللہ سے سوال کیا کہ میری امت کو (عام) قحط (خشک سالی) سے ہلاک نہ فرما تو اللہ نے قبول فرمایا اور میں نے اس سے یہ بھی سوال کیا کہ مسلط نہ کیجئے ان پر ان کے علاوہ کوئی (بیرونی) دشمن تو اللہ نے اس کو بھی شرف قبولیت بخشا اور میں نے اللہ سے یہ بھی دعا مانگی کہ ان کو ایک دوسرے کے جھگڑے نہ چکھائے تو یہ منظور نہ ہوئی۔

مختصر تشریح:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے اس مرتبہ اتنی لمبی نماز پڑھائی جو آپ کی سابقہ عادت شریفہ سے مختلف لگتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ رغبت و رعبت یعنی امید و جا اور خوف و اندیشہ کی نماز تھی، امید دعا کی قبولیت کی تھی اور خوف عدم قبولیت کا تھا مطلب یہ ہے کہ عام نمازوں میں دعاؤں کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا تھا جبکہ اس نماز میں اللہ عز و جل سے امت کے لئے تین دعائیں مانگیں جن میں دو قبول ہو گئیں مگر ایک قبول نہ ہوئی جس کی وجہ اگلی روایت میں آ رہی ہے کہ ازل میں یہ مقدر مقرر نہ تھا کہ اس امت مرحومہ میں آپس کے جھگڑے اور مصائب ہوں گے، جس میں اللہ عز و جل کی کوئی حکمت ہوگی جو بظاہر اللہ اعلم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان میں باہمی جھگڑے نہ ہوتے تو پھر اسلام ہمیشہ غالب رہتا حالانکہ اللہ نے قیامت کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے جس سے وہ مؤخر نہیں ہوگی اور اس کی آمد ہر خیر کے فنا ہونے پر موقوف ہے لہذا آپس کے جھگڑوں اور منکرات کے فروغ سے خیر میں کمی آتی رہے گی یہاں تک کہ ایمان پر چلن و شور ہو جائے گا اور منکرات کا راج قائم ہوگا اس طرح ہر شخص ایمان سے بھاگے گا حتیٰ کہ جب ایک بھی مؤمن نہیں بچے گا تو ان انسان نما جانور صفت لوگوں پر قیامت قائم ہو جائے گی۔

دوسری حدیث:۔ "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ زوی لی الارض

باب سوال النبی ﷺ ثلاثاً فی امته

۱۔ ابضاً روی ابن ماجہ ص: ۲۸۳ "باب ما یكون من الثن" ابواب الثن روی بمعناه احمد فی مسنده ص: ۱۱۳ ج: ۴

فرأيت مشارفها ومغاربها وان امتي سيلغ ملوكها ما زوي لي منها وأعطيت الكنزين الأحمر والأبيض
وانى سألت ربى لأمتى ان لا يهلكها بسنة عامة وان لا يسلط عليها عدو آمن بسوى انفسهم فيستبيح
بيضتهم وان ربى قال: يا محمد انى اذا قضيت قضاء فانه لا يرد وانى أعطيتك لامتك ان لا يهلكهم
بسنة عامة ولا تسلط عليهم عدو آمن بسوى انفسهم فيستبيح بيضتهم ولو اجتمع عليهم من
بأقطارها او قال: من بين أقطارها حتى يكون بعضهم يهلك بعضهم ويسبي بعضهم بعضاً“۔^۱
(هذا حديث حسن صحيح)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ
بے شک اللہ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا پس میں نے اس کے مشرقی و مغربی حصوں کو دیکھ لیا اور بلاشبہ
میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں تک پھیلے گی جو میرے لئے لپیٹ دیئے گئے تھے، اور یہ کہ مجھے دو خزانے
سرخ و پیید کے دیئے گئے اور یہ کہ میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے سوال کیا کہ وہ میری امت کو عام
قحط سالی سے ہلاک نہ فرمائیں اور ان کے سوا کوئی (بیرونی) دشمن ان پر مسلط نہ کریں جو ان کی مرکزیت
(جماعت) کو تباہ کر دیں، اور بے شک میرے رب نے فرمایا اے محمد! میں جب کوئی فیصلہ کرتا ہوں تو وہ رد نہیں کیا
جاسکتا تحقیق میں تجھے اطمینان دلاتا ہوں تیری امت کے حق میں کہ نہ تو میں ان کو عام قحط کے ذریعہ ہلاک کروں
گا اور نہ ہی ان پر ان کے علاوہ کوئی (بیرونی) ایسا دشمن مسلط کروں گا جو ان کی اجتماعیت کو منتشر کرے اگرچہ وہ
سب لوگ ان کے خلاف اکٹھے ہو جائیں جو زمین کے (چاروں طرف) کناروں پر رہتے ہیں یا فرمایا کہ اطراف
و کناروں کے اندر جو لوگ رہتے ہیں، تا آنکہ یہ لوگ خود ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے
کو قید کریں گے۔

لغات: - قولہ ”زَوَى“ زویت کے معنی سمیٹنے اور لپیٹنے کے ہیں بظاہر یہاں سکیڑنا مراد نہیں بلکہ دکھانا
مراد ہے، اس کی ایک صورت اگرچہ یہ ہو سکتی ہے کہ زمین کو سکیڑ دیا گیا ہو مگر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ
جو یہاں بظاہر مراد ہے کہ نظر میں حدت و قوت پیدا کر دی گئی یہاں تک کہ وہ پوری زمین یا مفتوحہ علاقوں تک پہنچ
گئی یا اس زمین کی شبیہ دکھا دی گئی ہو جیسے آج کل کے آلات سے نظر آتی ہے، راقم نے ”شعاعی تصویر کی حقیقت“

اور شرعی حیثیت میں نظر کے اصول اور آپ علیہ السلام کی نظر کی قوت تحریر کی ہے، فمن شاء الاطلاع فليراجع۔
 قولہ ”مازوی لسی منها“ اگر ”من“ کو جمعیت کے لئے مانا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا کہ زمین میں سے جتنے حصے
 اور ممالک مجھے دکھائیے گئے تھے ان سب پر میری امت کا قبضہ ہو جائے گا جیسے مشاہدہ ہے، اور اگر
 ”من“ کو تفصیل کے لئے لیا جائے تو پھر ترجمہ یوں ہوگا کہ زمین کے جتنے حصے جو کہ پوری زمین پر مشتمل ہیں
 مجھے دکھائے گئے ان سب پر میری امت کی حکومت قائم ہوگی تو پھر یہ حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد اور حضرت
 عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا۔

قولہ ”الکسزین الاحمر والابيض“ دونوں کنزین سے بدلیں ہیں اس لئے منصوب پڑھے جائیں
 گے، یہ ذکر خاص بعد العام ہے کیونکہ جب مفتوحہ علاقوں پر قبضہ ہو گیا تو کنزین پر بھی ہو گیا مگر اہمیت کے پیش
 نظر اور اظہار معجزہ کے لئے ارشاد فرمایا کہ روم اور فارس اور ان کے فزانوں پر بھی ہمارا جہنڈا لہرائے گا، احمر سے
 مراد سونا ہے جو سرخ رنگ والے رومیوں کا سکہ تھا جبکہ ابیض سے مراد چاندی ہے جو فارسی النسل سفید رنگ کے
 حامل لوگوں کی کرنسی تھی۔ قولہ ”فيسبىح بيضتهم“ بیضہ سے لغوی معنی انڈا امر انہیں بلکہ اجتماعیت ہے کیونکہ
 جب انڈا ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے اندر سب کچھ بے معنی سا ہو جاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم و ملت کی مرکزیت
 و اجتماعیت منتشر کر دی جاتی ہے تو اس کے بعد ان کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں، بعض حضرات نے بیضہ کو خود سے
 کنایہ بنایا ہے جو بمعنی عسکری طاقت کے ہے، جو حکومت کے لوازمات میں سے ہے تو جب فوجی طاقت نہیں رہتی
 تو حکومت بھی نہیں بچتی۔ قولہ ”اقطارها“ قطر کی جمع ہے بمعنی طرف و کنارہ کے۔ قولہ ”اوقال“ و شک من
 الراوی کے اظہار کے لئے ہے۔

تشریح:- یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے کیونکہ اس میں جو پیش گوئی
 آج سے تقریباً چودہ سو بیس سال پہلے کی گئی وہ اس پورے عرصہ میں واقعہ کے عین مطابق رہی ہے کہ ہر دور میں
 کفار نے انفرادی و جماعتی اور بین الاقوامی سطح پر طرح طرح کی بارہا کوششیں کی ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں
 کا استباحہ کریں یعنی ان کو جڑ سے اکھاڑ دیں مگر تادم تحریر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اگر کسی محاذ پر ان
 کو اہل اسلام کے گناہوں کی وجہ سے کامیابی مل جاتی ہے تو کسی اور جگہ مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہتا ہے جب
 مسلمانوں میں صلاح اور وحدت تھی تب تو کفار ان کے سامنے بچ تھے مگر جب گناہوں کو فروغ ملا تب بھی حالت
 یہ ہے کہ افغانستان پر اس وقت بیالیس ملکوں کے فوجی جن کی تعداد ہزاروں میں ہے سابقہ اسلامی حکومت کے

خلاف مصروف عمل ہیں اور تقریباً نو سال سے ان کو کوئی کامیابی نہیں مل رہی ہے بلکہ الٹا نقصان غیر ملکی افواج کو اٹھانا پڑ رہا ہے اگر بالفرض وہ کامیاب بھی ہو جاتی ہیں تو اللہ عزوجل اس کے بدلے مسلمانوں کو کہیں اور غلبہ عطا فرمادیں گے۔ وما زالک علی اللہ بھریز

باب ماجاء فی الرجل یكون فی الفتنۃ

عن ام مالک البہزۃ قالت: ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتنۃ فقرتہا قالت: قلت: یا رسول اللہ! من خیر الناس فیہا؟ قال: رجل فی ماشیتہ یؤدّی حقہا ویعبد ربہ ورجل اخذ برأس فرسہ یحییف العدو ویخوفونہ۔^۱ (غریب من هذا الوجه)

حضرت ام مالک، ہمزہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فتنے کا تذکرہ فرمایا اور اسے (ہمارے خیال میں) بہت قریب کر دیا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس میں لوگوں میں سے کون بہتر ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جو اپنے سونپی کے ساتھ (دور افتادہ جنگل میں) ہو وہ ان جانوروں میں سے حق (واجبی) ادا کرتا ہو اور اپنے رب کی عبادت میں مصروف ہو اور وہ شخص (بھی بہتر ہے) جو اپنے گھوڑے کا سر (لگام) پکڑے ہوئے ہو کبھی وہ شخص دشمن کو ڈرائے اور کبھی دشمن اس کو ڈرائیں۔

لغات:- قولہ ”فقرتہا“ باب تفعلیل سے تشدید الراء ہے قریب لانے کو کہتے ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر ایسے بلیغ انداز سے فرمایا کہ سامعین کو وہ بہت قریب آنے والا محسوس ہوا جیسا کہ قوت و اہم و خیالی کا تقاضا ہے۔ قولہ ”فی ماشیتہ“ اگرچہ اس کا اطلاق مطلق موسیٰوں پر ہوتا ہے مگر بخاری شریف وغیرہ کی روایات میں غنم کی تصریح ہے لہذا یہاں بھی بھیڑ، بکریاں مراد ہیں کیونکہ ان کے پالنے میں مومن کم اور منفعت زیادہ ہے ان میں لباس بھی ہے اور طعام بھی اور آدمی جہاں جانا چاہے اپنے ہمراہ لے جاسکتا ہے۔ قولہ ”یحییف العدو الخ“ یعنی وہ جہاد میں مصروف عمل رہے جو کبھی دشمن پر غالب رہتا ہے اور کبھی دشمن اس پر غالب آ جاتا ہے، یا نفس سرحدات کی پہرہ داری مراد ہے۔

تشریح:- اس فتنے سے کیا مراد ہے؟ تو اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ باہمی جھگڑے مراد ہوں۔ دوم یہ کہ منکرات کا ہنگامہ مراد ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں بیک وقت مراد ہوں کیونکہ جیسے جیسے عہد پاک سے دوری آتی رہتی ہے تو ان برکات میں کمی آتی رہتی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں اور بعد کے صلحاء کی وجہ سے تھیں حتیٰ کہ ان اثرات کی کمی کے تناسب سے باہمی لڑائیوں اور منکرات کی رفتار میں اضافہ آتا رہتا ہے جو بالآخر اُثرات کی تاریکی کی طرح چھنا جائیں گے یا ایسی صورت حال میں لوگوں کو چھوڑ کر اپنا دین بچانا اہم عمل ہوگا خواہ جنگل میں پناہ گزین بن کر یا محاذ جنگ میں مجاہد بن کر ہو کیونکہ اس میں لوگوں کی ہمنشین ایمان کے لئے خطرناک ہوگی اور عزت نشینی و علیحدگی دین کی حفاظت کی واحد راہ ہوگی چنانچہ امام بخاری نے کتاب الایمان اور بدائع الخلق میں اس کے لئے مستقل باب قائم کئے ہیں:

”باب من الدین الغیر ان الفتن“ وفیه... یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم

یتبع بها شعث الحبال ومواضع القطر یغر بدنہ من الفتن۔“ (ص: ۷۱ ج: ۱)

رہبانیت اور عزت نشینی میں فرق:- بظاہر یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث سے تنہائی کی ترغیب معلوم ہوتی ہے حالانکہ تنہائی جس کا دوسرا نام رہبانیت ہے نصوص کی زد سے مذموم معلوم ہوتی ہے قال اللہ تعالیٰ: ”وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوا مَا كَتَبْنَا عَلَيْهَا إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا“۔ (المائدہ آیت نمبر ۲۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ رہبانیت مذموم ہے لیکن باب کی حدیث میں جس مقصد کی طرف اشارہ ہے اس تنہائی کو اختیار کرنے اور نصاریٰ کی رہبانیت میں فرق ہے۔ نصاریٰ نے جو رہبانیت اختیار کر لی تھی وہ مقصد اعلیٰ کو چھوڑ کر بلا کسی مجبوری کے اپنی گئی تھی جو خلاف فطرت اور خلاف شریعت ہے، فطرت کے خلاف تو اس لئے ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے باقی جانداروں کی طرح انسان میں تامل و تدبیر کی نہ صرف صلاحیت و دینیت فرمائی ہے بلکہ اس کے شدید جذبات بھی اس کے اندر رکھے ہیں تو نہ تو آدمی ان جذبات کو ہمیشہ کے لئے دبا سکتا ہے اور نہ ہی رہبانیت کی صورت میں نوع انسانی کی بقاء ہو سکتی ہے پس ایسی رہبانیت بالآخر پلٹ کر فساد معاشرے کا سبب بنتی ہے کیونکہ راہب پر جب قوت شہوانیہ کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ اندھا بن کر طلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر وہی کرتا ہے جو نصاریٰ کے راہبوں نے راہبوں کے ساتھ کیا کہ گرجوں کی جھانریوں

میں جا بجانا جائز نومولود بچے ملا کرتے تھے۔ اور خلاف شریعت اس لئے ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو لے کر لوگوں میں پھیلا نا اور خود بھی ان پر عمل کرنا اور دوسروں سے بھی ان پر عمل کرنا انسانی زندگی کا بنیادی مقصد ہے جو معاشرے میں رہ کر ہی ممکن ہے، نیز جس طرح دوسروں پر عمل کی محنت ضروری ہے تو اسی طرح شادی کر کے بچے جنماتا بھی اس نیک سلسلے کی اہم کڑی ہے تاکہ ان کی صحیح پرورش کر کے دوسروں کے لئے راہنما بنایا جاسکے، یہ کام بھی معاشرتی و تمدنی زندگی میں ممکن ہے علاوہ ازیں نوعی منفعت شخصی فائدے پر مقدم ہے لہذا خود کو لوگوں سے دور رکھ کر صرف اپنی ہی خدمت میں لگا رہنا معیوب ہے۔

لیکن اگر یہ مقاصد فوت ہو جائیں اور معاشرہ اتنا بگڑ جائے کہ انسانیت کا نصب العین ہی تباہ ہو جائے اور صورت حال اس طرح بن جائے کہ معاشرہ میں رہتے ہوئے اس کے وجود سے کسی کو کوئی دینی فائدہ نہ ہو بلکہ الٹا اس کے دین کو ضرر پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو تو ایسے میں اگر نوعی فائدہ یکسر ختم ہو اور انفرادی و شخصی فائدے کو بھی دائر پر لگایا جائے تو یہ شرع شریف میں کوئی کمال یا محمود و ممدوح نہیں بلکہ اس حدیث کے مطابق لوگوں سے بعد ضرورت علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے یعنی یا محدود وقت کے لئے جیسے آپ علیہ السلام کا غار حراء میں قیام کرنا تھا یا مستقل طور پر جیسے اصحاب کہف نے کیا تھا اور آیت کریمہ میں نصاریٰ کی رہبانیت کی جو مذمت کی گئی ہے تو اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے لئے حالات نامساعد نہ تھے بلکہ یہ لوگ نارمل حالات میں اللہ کی رضا جنگوں اور رہبانیت میں تلاش کرتے تھے جو سراسر غلط فہمی تھی اور پھر جو طریقہ انہوں نے خود ایجاد کیا تھا اس کا حق بھی ادا نہیں کیا۔

رہا یہ مسئلہ کہ عزلت نشینی فطرت اور حکمت الہی کے منافی ہے تو یہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض عیث لوگوں کو جنماتا بائیں طور کہ ساری دنیا مہمل لوگوں سے بھر جائے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ فرض یہ کیا گیا ہے کہ معاشرہ اپنی برائی کے آخری کنارے کو چھو رہا ہو تو اس میں اگر بچے پیدا بھی ہوں تو وہ بھی ماحول کے رنگ میں رنگے جائیں گے اس لئے جہنم کا ایندھن بڑھانے کے بجائے بچوں کی پیداوار کے اقدامات سے دور رہنا ہی منشاء الہی کے مطابق ہونا چاہئے، اور جہاں تک جذبات کو قابو کرنے کا تعلق ہے تو یہ بھی کوئی ناقابل عمل مسئلہ نہیں ہے کیونکہ جو لوگ شادی کرنے پر قادر نہ ہوں ان کے لئے ریاضتیں اور روزے ہیں، بگڑے ہوئے معاشرے کی عورتوں سے شادی کی اگرچہ بظاہر مالی قدرت ممکن ہے مگر اخلاقی جواز ختم ہو جاتا ہے جس سے قدرتِ حکمی کی نفی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم وعلما اتم۔ اس کی کچھ تفصیل ”باب الہی عن

”ابنخل“ میں گزری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ص ۳۲۱ ج ۴)

باب کی دوسری حدیث:- ”عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: تكون الفتنة تستظف العرب فتلاها في النار اللسان فيها اشد من السيف“۔ (غریب)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ایک فتنہ ہوگا جو عربوں کو گھیر لے گا اس میں مارے جانے والے جہنم میں ہوں گے، زبان اس میں تلوار سے زیادہ خطرناک ہوگی۔

قولہ ”تستظف“ بمعنی تستوعب گھیر لے گا، استظاف کے معنی کسی چیز کو پورا لینے کو بھی کہتے ہیں اور صاف ستھری لینے کو بھی کہتے ہیں جو نظافت سے ہے علی ہذا مطلب یہ ہوگا کہ عربوں کو صاف کر دے گا یعنی ایچھے بُرے کی تمیز کر دے گا۔ قولہ ”فتلاھا“ قتل جمع قتل کی بمعنی مقتول ہے۔ قولہ ”فی النار“ ای ستکون فی النار کیونکہ ان کا یہ عمل دخول نار کا موجب اور سبب ہے کہ اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لئے نہیں ہے۔

تشریح:- بعض محققین و شارحین کی رائے میں اس فتنے سے مراد جنگ صفین یعنی حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان ہونے والی لڑائی ہے، مگر اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں اکثریت صحابہ کی تھی تو ”فتلاھا فی النار“ کا کیا مطلب ہے پھر اس کی توجیہات پیش کی گئی ہیں کہ یہ حکم زجر و غلطی پر محمول ہے یا مذکورہ حکم خاصۃً العمل کے قبیل سے ہے یا یہ حکم صرف ان کا ہے جو اس لڑائی میں مارا جائے یا جانے والوں کا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن راجح قول یہ ہے کہ اس حدیث میں کوئی اشارہ نہیں کہ یہ صحابہ کرامؓ کے مابین کسی لڑائی کے بارے میں پیش گوئی ہے بلکہ یہ غیر متعین زمانے میں پیش آنے والی کسی لڑائی کا ذکر ہے جس میں مسلمان باہم لڑ پڑیں گے چونکہ ان کے قتل و قتال کا مقصد اعلیٰ کلمۃ اللہ نہیں ہوگا بلکہ مال و جاہ اور عصبیت و قومیت ہوگی اس لئے وہ مذموم مقصد میں مرنے کی وجہ سے دوزخی ہوں گے، تاہم حدیث میں غلو و کا کوئی ذکر یا اشارہ نہیں ہے۔

بہر حال اگر یہ صحابہ کرامؓ کے مابین لڑائی پر محمول کی جائے تو پھر اس میں زبان کو تلوار سے زیادہ سخت

کہنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ دورانِ جنگ لڑائی کو ہوا دینا اور جنگ کو بھڑکانا جنگ کرنے سے زیادہ بُرا ہے اور بعد میں صحابہ کرامؓ پر لعن و طعن کرنا ایمان کا صفایا کر دینے کے مترادف ہے اس لئے شرح عقائد میں ہے:

”وَبَكَفَ عَنْ ذِكْرِ الصَّحَابَةِ الْإِبْعِيرِ لِمَا وَرَدَ مِنَ الْإِحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ فِي مَنَاقِبِهِمْ وَوَجُوبِ الْكَفِّ عَنِ الطَّعْنِ فِيهِمْ كَقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أَحَدِ ذَهَبًا مَبْلَغَ مُقَاتِلَتِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ.... إِلَى أَنْ قَالَ.... وَمَا وَفَّقَ بَيْنَهُمْ مِنَ السَّنَازِعَاتِ وَالْمَحَازِبَاتِ فَلَهُ مُحَاسِنٌ وَتَاوِيلَاتٌ فَسَبُّهُمْ وَالطَّعْنُ فِيهِمْ إِنْ كَانَ مِمَّا يَخَالِفُ الْإِدْلَةَ الْقَطْعِيَّةَ فَكَفْرٌ كَقَذْفِ عَائِشَةَ وَالْإِفْكِ دَعَا وَفَسْقٌ“ الخ۔ (ص: ۱۱۶)

محدثی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول نقل کیا ہے: ”تَمْلِكُ دِمَاءَ طَهْرَةِ اللَّهِ مِنْهَا إِبْدَانًا فَلَا تُؤْتَوِ الْمُسْتَأْهِمُ“۔

غرض اہل سنت والجماعت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے مشاجرات و منازعات میں گفت و شنید جائز نہیں۔

اور اگر یہ حدیث کسی اور لڑائی کی طرف مشیر ہو تو پھر کسی تاویل کی ضرورت نہیں اور اس میں زبان کی تاثیر کو اثرِ شمشیر سے زیادہ سخت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے جنگ کو ہوا دینا مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنے گا جبکہ تلوار سے آدمی زیادہ لوگوں کو قتل نہیں کر سکتا ہے۔

باب ماجاء فی رفع الامانة

”عَنْ حَدِيثِهِ قَالَ ثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثَيْنِ قَدَرَايْتُ أَحَدَهُمَا وَأَنَا أُنْتَظِرُ الْآخَرَ حَدَّثَنَا الْأَمَانَةُ نَزَلَتْ فِي حُلِيِّ قُلُوبِ الرِّجَالِ ثُمَّ نَزَلَ الْقُرْآنُ فَعَلِمُوا مِنَ الْقُرْآنِ وَعَلِمُوا مِنَ السُّنَّةِ“۔

ثم حدثنا عن رفع الامانة فقال: بنام الرجل النومة فتقبض الامانة من قلبه فيظلل اثرها مثل الوكت ثم بنام نومة فتقبض الامانة فيظلل اثرها مثل اثر المحل كحمر دحرجته على رجله فكسفت فتراه متغيرا وليس فيه شيء ثم اخذ حصاة فدحرجها على رجله قال فيصبح الناس يتبايعون

لَا يَكَادُ أَحَدٌ يُوَدِّي الْأَمَانَةَ حَتَّى يَقَالَ إِنَّ فِي بَنِي فَلَانٍ رَجُلًا آمِنًا وَحَتَّى يَقَالَ لِلرَّجُلِ: مَا أُجَلِّدُهُ وَأُظَرِّقُهُ
وَأَعْقِلُهُ وَمَا فِي قَلْبِهِ مَثْقَلٌ خَبِيَّةٌ مِنْ حُرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ، قَالَ وَلَقَدْ أَتَنِي زَمَانٌ وَمَا بِالْبَالِي أَتَيْكُمْ بَايَعْتُ
فِيهِ لِنَسْنِ كَانَ مُسْلِمًا كَبِيرُ دُنْهُ عَلَيَّ وَدِينُهُ وَلَكِنْ كَانَ يَهُودِيًّا وَنَصَرَ انِّيَا لِكَبِيرُ دُنْهُ عَلَيَّ سَاعِيَهُ فَمَا الْيَوْمُ
فَمَا كُنْتُ أَبَايَعُ مِنْكُمْ إِلَّا فَلَانًا وَفَلَانًا“۔^۱ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے
دو حدیثیں بیان فرمائی ہیں: ان میں سے ایک تو میں نے دیکھ لی ہے (یعنی ایک کا مضمون آچکا ہے) اور دوسری
(کے مصداق) کا میں انتظار کر رہا ہوں (۱) آپ علیہ السلام نے ہم سے کہا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی پتہ
میں نازل ہوئی، پھر قرآن نازل ہوا پس لوگوں نے قرآن میں سے سیکھا اور سنت میں سے سیکھا۔ (۲) پھر آپ
علیہ السلام نے ہم سے رفع امانت کے بارے میں بیان فرمایا (یہ وہ دوسری حدیث شروع ہوئی) پس آپ علیہ
السلام نے فرمایا کہ ایک آدمی سوئے گا تھوڑا سا تو امانت اس کے دل سے لے لی جائے گی تو اس (امانت کی جگہ
خیانت لے لی گی جس) کا اثر بلکہ نشان (دھبے) کی مانند رہ جائے گا، وہ پھر دوسری بار سوئے گا تو امانت لے لی
جائے گی پس رہ جائے گا اس کا منفی اثر آبلہ کی طرح (یعنی ایسا ہی) جیسے تم اپنے پاؤں پر چنگاری لڑھکا دے تو اس
سے چھالا پڑ جائے تم اس کو پھولا ہو اور کھو گے حالانکہ اس میں کچھ نہیں ہوتا، پھر آپ علیہ السلام نے ایک کنکری لی
اور اسے پاؤں (کی پشت) پر لڑھکایا آپ علیہ السلام نے فرمایا پھر (حالت یہ ہو جائے گی اور) لوگ ایسے
ہو جائیں گے کہ وہ خرید و فروخت کریں گے ایسا نہیں لگتا کہ کوئی ایک امانت ادا کرے گا یہاں تک کہ کہا جانے
لگے گا کہ فلاں قبیلے میں ایک امانت دار شخص ہے اور یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ ایک آدمی کے بابت کہا جائے گا
کہ: کس قدر پخت اور ولیر ہے، کس قدر ہوشیار ہے اور کس قدر عقلمند ہے، دریاں حالیکہ اس کے قلب میں رائی
کے دانے کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے شک میرے اوپر ایسا زمانہ
آچکا کہ اس کے اندر میں تم میں سے خرید و فروخت کی پروا نہیں کرتا، اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس کا دین اسے میرے
پاس لوٹا دیتا اور اگر وہ یہودی یا نصرانی ہوتا تو اس کا ذمہ دار (ضامن) اس کو میرے پاس لوٹا دیتا، جبکہ آج میں تم

باب ماجاء فی رفع الامانة

۱۔ رواہ البخاری ص: ۱۰۴۹ ج: ۲ "باب اذا بقى في حضانة من الناس" ابواب الفتن، ابصار رواه في المرفاق باب: ۳۵،
صحيح مسلم ص: ۸۲ ج: ۱ کتاب الايمان حديث: ۲۳۰.

سے فلاں فلاں کے علاوہ کسی سے معاملہ نہیں کرتا ہوں۔

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت پر ائمہ کا اتفاق ہے۔

لغات :- قولہ ”حدیثیں“ یعنی امانت کے بارے میں ورنہ ان کی احادیث کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ قولہ ”الامانة“ اس امانت سے کیا مراد ہے؟ تو اس بارے میں بہت سارے اقوال ہیں: قابل ذکر تین ہیں: پہلا قول جو زیادہ مشہور ہے اور عام حواشی و شروح میں مستور ہے یہ ہے کہ مراد وہ قوت استعداد ہے جس کی بناء پر انسان بربان حال بڑی ذمہ داری یعنی مکلف ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: ”اتَّاعَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ“ (آیہ ۷۲) کیونکہ صلاحیت جب اپنی اصلیت پر قائم و دائم ہو تو وہ ایمان میں تبدیل ہو کر دونوں کجیاں متحد ہو جاتے ہیں۔

دوسرا قول :- یہ ہے کہ مراد ایمان ہے، ابن العربی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تو لیں مالا ایک ہیں:

”الامانة هي معان تحصل في القلب فيامن بها المرء من الردى في الآخرة

والدنيا واصلها الايمان ويلبها الوفاء بالمعهد“ الخ۔ (کذا فی العارضہ)

تیسرا قول :- تیسرے قول کے مطابق امانت سے مراد مقابل خیانت یعنی دیانت داری ہے۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ ان تینوں اقوال میں کوئی خاص فرق نہیں کیونکہ یہ تینوں بیک وقت انسانی خوبیوں کا حصہ ہیں جیسے حیاء ہے پھر جس طرح حیاء کے انتفاء سے اعمال صالحہ اور پھر ایمان کی نفی ہو جاتی ہے اسی طرح امانت بمعنی دیانت داری کا تقاضا بھی ایمان ہی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ”لا دين لمن لا امانة له“۔

قولہ ”جَنُزْر“ بفتح الجیم و سکون الذال، بعض نے جیم کو مسور بھی جائز کہا ہے، کسی بھی چیز کی جز کو کہتے ہیں، عارضہ میں ہے: ”جَنُزْرٌ، اصل کل شیء من خشب او حساب او نبات“۔ قولہ ”الوکت“ یہ لفظ بفتح الواو و سکون الکاف بروزن شمس ہے، معمولی اثر و نشان کو کہتے ہیں جیسے خال جس کا رنگ سابقہ رنگ سے مختلف

ہو۔ قولہ ”المحل“ یہ بھی شمس کے وزن پر ہے، ہاتھوں پر محنت طلب کام سے یا پاؤں پر بوٹ کے تنگ ہونے سے جو چھالے پڑتے ہیں جسے آبلہ بھی کہا جاتا ہے، بہر حال غرض یہ ہے کہ یہ دوسرا اثر پہلے اثر سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ آبلہ خال سے زیادہ نمایاں اور بڑا ہوتا ہے۔ قولہ ”دحر جتہ“ دحرج کے معنی لڑھکانا۔ قولہ ”فَنَفَطُتْ“ ضرب و سحر دونوں سے آتا ہے مگر یکسر الفاء بعد النون زیادہ رائج ہے نفططت القدر نطفأ اس وقت بولا جاتا ہے جب ہانڈی سے تیز بھاپ کی دھاریں نکلیں، یہاں مطلب پھول جانا ہے۔

قولہ ”مستبراً“ بصیغہ اسم فاعل بمعنی ابھرا ہوا چنانچہ منبر کو بھی اس لئے منبر کہتے ہیں کہ وہ بلند و نمایاں ہوتا ہے۔ قولہ ”مسا جلدہ و اطرفہ و اعقلہ“ تینوں فعل تعجب کے صیغے ہیں جلد یضم اللام فی الماضي و جلد افتح اللام فی المصدر صابر، باہمت اور جرأت مند کو کہتے ہیں یعنی بہادر، جبکہ ظریف ہوشیار کو کہتے ہیں، ظرافتہ کے معنی ذہانت و تیزی طبع کے ہیں۔ قولہ ”ساعیہ“ ملک اور سردار کو کہتے ہیں جیسا کہ قبائلی نظام میں ہوتا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک بڑا ہوتا ہے سب قبیلے والے اس کی بات کے پابند ہوتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد اس پر مقرر مسلمان والی و مگراں ہو۔

تشریح:- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانی خوبیاں جو انسان کا اصل سرمایہ ہیں ناپید ہونا شروع ہوئی ہیں جو کسی وقت میں اپنے عروج پر تھیں چنانچہ انہیں خوبیوں کی وجہ سے جن میں سے ایک امانت ہے انسان قرآن و سنت کو سمجھنے کے قابل ہوا اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہا کیونکہ اسلامی تعلیمات وہاں جذب ہوتی اور کارگر ثابت ہوتی ہیں جہاں ان کے لئے ماحول سازگار ہو جیسے بارش سے صرف ذریعہ زمین فائدہ اٹھاتی اور نفع پہنچاتی ہے اب حال یہ ہوا ہے کہ لوگ ان خوبیوں سے اور خصوصاً امانت داری سے دنیا داری کی طرف بڑھ رہے ہیں ان کا سطح النظر دنیا ہے خواہ اس کے لئے دھوکا دینا پڑے یا خیانت کرنا پڑے، ان کی نظروں میں دنیا ہی کی قدر ہے دین کی قدر کم ہونا شروع ہوئی ہے حتیٰ کہ حالت یہ ہو جائے گی کہ جو آدمی دنیاوی مال و متاع جمع کرنے میں ماہر ہو تو اندر سے خواہ انسانی خوبیوں سے کتنا ہی خالی کیوں نہ ہو لوگ اس کی تعریف کریں گے کہ وہ اتنا بڑھ رہا ہے، ہوشیار ہے اور عقلمند ہے جیسے آج کل کاروباری لوگوں اور سیاسی لیڈروں اور کارکنوں میں اس کا مشاہدہ عام کیا جاسکتا ہے قوم کے یہ ہیرا اپنی مکاری کی وجہ سے ہی تو لیڈر بن گئے ہیں، ملک کا خزانہ لوٹ کر بیرون ملک منتقل کر دیتے ہیں مگر ان کے دو درزان پر اپنی جان فدا کرتے ہیں کہ وہ اس چیز کو کمال و ہنر، دلیری اور عقلمندی سمجھتے ہیں، اس سے بڑا بگاڑ کیا ہو سکتا ہے؟

عام طور پر اعمال نسیان کی وجہ سے زائل ہو جاتے ہیں مگر ابن العربی فرماتے ہیں کہ جب اعمال بہت کمزور ہو جائیں تو وہ نیند سے بھی ختم و کمزور ہو جاتے ہیں چنانچہ زمانے کے مرد کے ساتھ لوگوں کی حالت یہ ہو جائے گی کہ جب آدمی سو کر اٹھے گا تو اس کے دل میں فرق آیا ہوگا پہلے مرحلہ میں یہ ہوگا کہ ایمان کا جتنا نور اٹھے گا تو اس کی جگہ ایک ظلمت و تاریکی پکڑ لے گی مگر اس کی مقدار کم ہوگی جبکہ دوسری بار سونے سے یعنی دوسرے مرحلے میں اس ظلمت کا اثر گہرا ہو جائے گا جیسے چھالہ کی نسبت ہے خال اور نقطہ سے، چنانچہ اس کا مشاہدہ آج کل یوں ہو سکتا ہے کہ بچے عام طور پر جھوٹ، دھوکے اور خیانت سے پاک ہوتے ہیں جبکہ جوانی میں ان کی کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے اور بڑھاپے میں ان کی خباثتیں مکمل پکی ہو جاتی ہیں، اگر کسی کو شک ہو تو اس کا تجربہ کر لے کہ کسی بھی میدان اور فیلڈ کے لوگوں کو آزمائے خواہ دوکاندار ہو یا سرکاری ملازمین یا پھر سیاسی لیڈر شروع میں ان لوگوں کو حرام خوری میں جھجک محسوس ہوتی ہے مگر آگے جا کر اس کی قیامت دل سے نکل جاتی ہے اور رشوت ستانی، دھوکہ دہی اور خیانت ان کی طبیعت ثانیہ راخہ بن جاتی ہے چنانچہ چھوٹا لیڈر چھوٹا فراڈ کرتا ہے اور بڑا، بڑا کرتا ہے۔ الا ماشاء اللہ وقلیل ماہم

وقت گزرنے کے ساتھ ایمانی وردہانی کیفیت اتنی تیزی سے زائل ہوگی جیسے پاؤں پر چنگاری یا کنکری لڑھک جائے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۳۶ھ کے اوائل میں بعد شہادت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہوئی ہے مگر وہ اپنے وقت میں اس تبدیلی کے آثار دیکھ کر فرماتے ہیں کہ پہلے میں کسی سے معاملہ میں کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرتا خواہ وہ کوئی بھی ہوتا اگر مسلمان ہوتا تو اس کا ایمان میرا حق دلانے پر اس کو مجبور کرتا اور اگر ذمی ہوتا تو اس کا بڑا میرا حق بحفاظت مجھے دلاتا مگر اب وہ بھروسہ متزلزل ہو گیا، اور میں معاملات میں بڑی احتیاط کرتا ہوں۔

جب اس زمانے کی یہ حالت ان کو پسند نہ آئی حالانکہ وہاں دیانت داروں کی اکثریت تھی تو آج کی حالت کو کون قسلی بخش اور اسلام و انسانیت سے ہم آہنگ قرار دے سکتا ہے؟؟؟

غرض ان کے دور میں خائن لوگ خال خال پائے جاتے تھے مگر وہ اس پر بھی تشویش ظاہر فرما رہے ہیں اور مرفوع حدیث کی پیش گوئی ذکر فرما رہے ہیں کہ پھر امانت دار لوگ خال خال ملیں گے، یہ پیش گوئی بالکل صاف آئی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے۔

باب لَتَرَكِبْنِ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ

”عن ابی واصل اللبثی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما خَرَجَ اِلَى حُنَيْنٍ مَرَّ بِشَجَرَةٍ لِّلْمَشْرَكِيْنَ یُقَالُ لَهَا ذَاتُ اَنْوَاطٍ یُعَلِّقُوْنَ عَلَیْهَا اَسْلِحَتَهُمْ قَالُوا: یَا رَسُولَ اللّٰهِ اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ كَمَا لَهُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ هَذَا كَمَا قَالَ قَوْمُ مُوسَى: ”اجْعَلْ لَنَا اِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ اِلَٰهَةٌ“ الَّذِیْ یَبْدُو لَتَرَكِبْنِ سُنَّةَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ“۔ (حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو واصل اللبثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حنین کی جانب نکلے تو مشرکین کے ایک درخت سے گزرے اس پر کھڑکوات الانواط کہا جاتا تھا اور وہ لوگ اس پر اپنا اسلحہ لٹکاتے تھے (پس یہ دیکھ کر) لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے بھی ایک ذات الانواط مقرر فرما دیجئے جیسا کہ ان لوگوں کے لئے ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سبحان اللہ“ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: کہ ہمارے لئے ایک معبود بنادیں جیسے ان (مشرکین) کے معبود ہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم لوگ ضرور ان لوگوں کے طریقوں کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے تھے۔

لغات:۔ قولہ ”حنین“ بروزن زبیر، مکہ و طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے: ”و یوم حنین“۔ قولہ ”ذات انواط“ ای ذات تعلیق، نوط کے معنی تعلیق اور لٹکانے کے ہیں چونکہ جاہلیت میں لوگ اس سے اپنے ہتھیار لٹکاتے اس لئے یہ ذات انواط سے معروف ہو گیا یعنی وہ درخت جس پر اسلحہ لٹکایا جاتا ہے، حاشیہ کوکب میں برویہ درمنثور وغیرہ کے ہے کہ یہ درخت بئر کا تھا، ^۱ اَلْکُؤْب الدَّرِیْ میں ہے کہ خوشی اور تہوار کے موقع پر لوگ اس کے پاس جمع ہوتے، اسلحہ اس پر لٹکا کر اس پاس کھاتے پیتے اور کھیلتے رہتے۔ قولہ ”لترکبن“ ای لتبعن اس میں لام تاکید کے لئے ہے رکوب بمعنی چلنے کے ہے از قبیل ذکر طرہوم والمراد منه الملازم۔

باب لَتَرَكِبْنِ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ

۱۔ رواہ احمد فی مسنده ص: ۲۸۶ ج: ۶ حدیث: ۲۱۳۹۳ وفیہ: انکم لو کون سنن الذین من قبلکم۔

۲۔ مستدرک حوالہ بالا میں بھی ہے کہ وہ بئر کا درخت تھا جس پر کفار اپنا اسلحہ لٹکاتے تھے اور اس کے گرد احکاف کرتے تھے۔

تشریح:- یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ علیہ السلام فتح مکہ کے بعد طائف تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں جنین کے مقام پر یہ درخت دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے یہ عرض پیش کیا، بظاہر عرض کرنے والے وہ صحابہ کرامؓ تھے جو ابھی ابھی فتح مکہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے جن کی تعداد وہ ہزار تھی جبکہ مدینہ منورہ سے صحابہ کرامؓ کی تعداد دس ہزار تھی، ابن خلدون وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ کل بارہ ہزار تھے چونکہ ایک ہفتہ میں تمام تعفیہ طلب امور کا صفایا نہیں ہو سکتا اس لئے یہ سوال نو مسلموں کی طرف سے اٹھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں کیونکہ ان کا مقصد شرک کرنے کی اجازت طلب کرنا تھا بلکہ ایک قومی روایت سمجھ کر اس کی اجازت چاہی تھی، تاہم اس قسم کی تخطیلات چونکہ مفہمی الی الشریک یعنی شرک کی طرف لے جانے والی ہوتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمادیا کہ اس قسم کی خواہشات کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، مگر تمام انسانوں اور آنے والی پوری امت کے دلوں کو اس عنصر سے خالی رکھنے کی کوشش سو فیصد کہاں کامیاب ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی بڑی حکمت ہے اس لئے فرمایا کہ تم لوگ گزرے ہوئے لوگوں کے راستوں پر ضرور چلو گے۔

بعض روایات جیسے صحیحین وغیرہماؒ میں اس پر یہ اضافہ ہے: ”شیر آبشیر و ذرا عابد ذرا عابد حتی لو دخلوا جحر ضب لذہلحلتہ“ یعنی تمہاری پیروی و اتباع کا عالم یہ ہوگا کہ تمہارے اور یہود و نصاریٰ کے درمیان ایک بالشت کا اور ایک ذراع کا فرق بھی نہیں رہے گا حتیٰ کہ اگر وہ لوگ گوہ کے بل و سوراخ میں داخل ہوں تو تم لوگ بھی اسی میں داخل ہوں گے اس سے بڑھ کر کمال اتباع کیا ہو سکتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ امت سابقہ ام کے نقش قدم پر چلے گی، اس کے تاجران کے تاجروں کی راہ لیں گے، اس کی عورتیں ان کی عورتوں کا طور و طریقہ اپنائیں گی اور اس کے علماء ان کے علماء اور اس کے حکمران ان کے حکمرانوں کے پیچھے ہوں گے، یہ پیش گوئی بھی جوں کی توں صحیح نکلی ہے جو آپ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔

ہاں البتہ اس میں کفر کی پیروی کی بات نہیں کی گئی ہے باقی تمام معاصی و نافرمانیاں مراد ہیں حتیٰ کہ ان

۱۔ صحیح بخاری ص: ۳۹۱ ج: ۱ ”باب ما ذکر عن بنی اسرائیل“ کتاب الانبیاء، ایضاً رواہ فی الاعتصام باب: ۱۴،

صحیح مسلم ص: ۳۳۹ ج: ۲ کتاب العلم و رواہ ابن ماجہ ابواب الفتن باب: ۱، مسند احمد ص: ۲۰۳ ج: ۳،

ص: ۳۱۲ ج: ۳ حدیث: ۱۰۶۶۳ و ۳۳۰ ج: ۳ و ۵۰۶ ج: ۳،

لوگوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا اور جب انبیاء نہ ہوتے تو ان کے خلفاء کو قتل کر دیتے اس امت میں بھی ایسا ہی ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ورثہ خلفاء و علماء کو نہیں بخشا گیا۔

اشکال :- اس روایت میں لڑکیوں کے لام تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ اتباع ناگزیر ہے جبکہ بہت سی روایات میں یہود و نصاریٰ کی مشابہت سے ممانعت بھی آئی ہے تو امر لازم سے نبی تو تکلیف بمالایطاق سی لگتی ہے۔

حل :- اس کا جواب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ اگرچہ امت کی غالب اکثریت تو پیروی کرے گی مگر اس کے ساتھ ایک طاقت منصورہ کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے علیٰ ہذا اتباع کی پیش گوئی اکثریت کے حوالے سے ہے جبکہ نبی کا مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہئے اور یقیناً ہوگی بھی جو ان یہود و نصاریٰ کی مشابہت سے گریزاں ہوگی: "ففسی النہی عن ذالک (التشبیہ) نکثیر لہذہ الطائفۃ المنصورۃ وتنبیہا و زیادۃ ایمانہا"۔ ("اقتضاء الصراط المستقیم، مؤلفہ اصحاب الجعیم" ص: ۴۴) یعنی نبی میں ترغیب ہے کہ طاقت منصورہ کے ساتھ رہو چنانچہ آج عام مسلمانوں کے لباس اور اطوار کو دیکھیں گے تو حدیث باب کا مصداق نظر آئے گا مگر جب کسی مدرسہ میں جائیں گے تو آپ کو پاکیزہ ماحول ملے گا۔

باب ماجاء فی کلام السَّبَّاح

"عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: والذی نفسی بیدہ لانقوم الساعۃ حتی تکلم السَّبَّاحُ الانس و حتی یکلم الرجل عذبتہ سوطہ و یشراک نعلہ و تحبر فحجۃہ بما احدث اہلہ بعدہ"۔^۱ (حسن صحیح غریب)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ باتیں نہ کریں درندے انسان سے اور جب تک بات نہ کرے آدمی کے کوڑے کا بھندنا اس سے اور اس کے جوتے کا تسمہ اس سے بات نہ کرے اور اس کی ران خبر نہ دے اس کی جو اس کے گھروالوں نے اس کے (گھر سے نکلنے

کے) بعد کیا ہے۔

لغات :- قولہ ”السباع“ بکسر السین، سباع مفتوح السین وضم الباء کی جمع ہے درندے کو کہتے ہیں۔
قولہ ”عذبة“ یہ اور ”شر اک اور فخذ“ تینوں سباع کی طرح مرفوع ہیں کہ سب فواعل ہیں علیٰ ہذا انس اور زحل دونوں مفعولیت کی بناء پر منصوب ہیں، عذبة مفتوح الھین و سکون الذال، بروزن رحمۃ، بعض نے ذال کا فتح و کسرہ بھی جائز کہا ہے، کسی چیز کے کنارے کو کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہے، اس کے معنی اس ڈوری کے بھی آتے ہیں جس کے ذریعہ ترازو اٹھائی جاتی ہے مگر وہ یہاں مراد نہیں۔ قولہ ”شیراک“ بکسر الشین، تسمہ۔

تشریح :- حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بول چال کا فن ترقی میں اپنے عروج پر پہنچ جائے گا حتیٰ کہ وہ اشیاء بھی ناطق و گویا ہو جائیں گی جن میں بظاہر بولنے کی صلاحیت نہیں ہے، آج کے دور میں ثابت ہو گیا کہ لوہا بھی بولتا ہے اور پلاسٹک بھی، اگر اس حدیث کا مطلب یہ لیا جائے کہ بطور خرق عادت ایسا ہو گا تو پھر تو کوئی اشکال نہیں کہ عالم میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں تو جس طرح ماضی کے صحیح واقعات و روایات سے غیر ناطق کا بولنا ثابت ہے جیسے گائے اور بچے کا گہوارے میں بولنا تو مستقبل میں بھی ایسا ہو سکتا ہے جیسے بھڑیا کا جروا ہے سے بات کرنا وغیرہ علیٰ ہذا پھر حدیث باب حقیقی کلام پر محمول ہوگی۔

لیکن اگر اسے ایک امر معتاد کے طور پر لیا جائے تو پھر معنی مجازی مراد ہونگے اور یوں کہا جائے گا کہ اس تعبیر میں کسی معنی دیگر کی طرف اشارہ ہے کہ مثلاً سائنسی ترقی اس حد تک پہنچ جائے گی کہ مذکورہ بالا چار اشیاء بھی بولنے لگیں گی تو اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ بولنے سے مراد صوتی حروف ہوں جیسے ہم موبائل فون وغیرہ پر سنتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد کوئی اشارہ و شکل دینا ہو چنانچہ آج کل موبائل فون پتلون کی جیب میں ہوتی ہے اور اس سے تار کے ذریعہ منہ اور کانوں سے رابطہ رہتا ہے اور کسی بھی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ لوگ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گھر سے باتیں کرتے رہتے ہیں، مزید بریں آج کل ”ٹریلنگ ڈیوائس“ پر بھی کام و تحقیق جاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جیسے عام طور پر ران میں فٹ کیا جائے گا جو صوتی و تصویری وغیرہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جاسوسی نظام کے لئے تیاری کے مراحل میں ہے۔

جہاں تک درندوں کی بات چیت کا تعلق ہے تو اگرچہ یہ موضوع بھی زیر غور ہے مگر اس میں کامیابی بظاہر مشکل ہے کیونکہ سائنس دانوں کے پیش نظر اس وقت یہ بات ہے کہ جانوروں کے خلیوں میں D.N.A

میں تبدیلی کر کے اس میں انسانی D.N.A شامل کر لیا جائے جیسا کہ وہ چوہے پر انسانی کان اگانے میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ بولنے بھی لگیں مگر یہ امر خاص پیچیدہ ہے کیونکہ اس کے لئے نفس گویائی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو سمجھنا اور زبان کی ساخت کو تبدیل کرنا وغیرہ بہت مشکل مراحل کو طے کرنا پڑے گا مع ہذا یہ کام سائنس دان چوری چھپے کرتے ہیں کیونکہ علانیہ طور پر کرنے سے ان پر مذہبی طبقے کی طرف سے منصوبہ ترک کرنے کے لئے دباؤ بڑھتا ہے، البتہ انسانی جسم میں D.N.A کی تبدیلی سے نسبتاً زیادہ آسانی سے انسان جانوروں کی زبان سمجھنے کے قابل بن سکتا ہے، کیونکہ انسان باصلاحیت ہے جبکہ جانور بات سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں، اس پیراگراف سے یہ بات آسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ کوزے کا کنارہ اور جوتے کا تسمہ کس طرح بولے گا؟؟؟

اور اگر مراد مطلق دلالت لی جائے تو پھر تو مطلب بہت ہی آسان ہو جائے گا کیونکہ آج کل پالتو کتے جن کو خاص تربیت دی جاتی ہے وہ بھی بولتے ہیں۔ تدر

باب ماجاء فی انشقاق القمر

”عن ابن عمر قال انشق القمر على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اشفقوا“۔ (حسن صحيح)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم گواہ رہو۔

لغات:۔ بقولہ ”انفلق“ ای انشق یعنی چاند پھٹ گیا اور دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ قولہ ”انقر“ کسی سیارے کے گرد سیارچے کا گھومنا اس سیارے کا قمر یعنی چاند کہلاتا ہے، مختلف سیاروں کے متعدد مثلاً درجن اور ڈیڑھ درجن تک چاند دریافت ہوئے ہیں، زمین کا ایک ہی چاند ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔

تشریح:۔ جمہور کے نزدیک سورہ قمر کی پہلی آیت: ”انفلق القمر والانشقاق القمر“ سے بھی یہی مذکور فی الحدیث کا واقعہ مراد ہے اگرچہ عند بعض اس سے قیامت کے قیام کے وقت انفلاق مراد ہے۔

زمانہ قدیم میں فلاسفہ نے یہ غلط نظریہ مشہور کر دیا تھا کہ چاند نچلے آسمان میں اسی طرح چوست ہے جیسے چھت میں کوئی کیل ہوتی ہے نیز ان کے نزدیک افلاک میں خرق والقیام کی گنجائش نہیں ہے یعنی یہ ممکن نہیں کہ

آسمان پھٹ جائیں یا پھر جڑ جائیں، مگر آج کل کی تحقیق سے یہ بات سو فیصد یقین تک پہنچ گئی ہے کہ چاند ہمارے کرہ ارض کے گرد گھومنے والا ایک چھوٹے سائز کا قمر ہے بلکہ آج تو انسان کی رسائی بھی چاند تک ممکن بن گئی ہے بلکہ غالباً واقع ہو چکی ہے اور اگر ہم امریکہ کا دعویٰ اس حوالے سے جھوٹا قرار دے جیسا کہ ایک رائے ماہرین کی یہی ہے تو آئندہ تو یہ ممکن ہے کہ انسان چاند پر چڑھ بیٹھے۔

بہر حال یہ واقعہ خلاف عادت ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور اسی چیز کا نام معجزہ ہے اور یہاں کفار کو یہی بتانا تھا چنانچہ جب قریش کی ایک جماعت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مطالبہ کیا کہ اگر آپ ساحر و جادوگر نہیں تو آپ چاند کو شق کر دیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بزرگم (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر گردانتے تھے) ان کا جادو آسمانوں میں تو چل نہیں سکتا تو ہمارے اس مطالبہ سے آپ لا جواب ہو جائیں گے، مگر حضور علیہ السلام تو نبی تھے جادوگر نہیں تھے اس لئے ان کا مطالبہ پورا فرمایا اور ان کو دکھا بھی دیا کہ تم گواہ رہو، چنانچہ یہ دیکھ کر بعض لوگوں کا مسلمان ہونا ثابت ہے جیسا کہ تفسیر عثمانی میں ہے: ”ہجرت سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبنی میں تشریف فرماتے کفار کا مجمع تھا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی طلب کی.... و غیرہ.... تاریخ فرشتہ وغیرہ میں اس کا ذکر موجود ہے کہ ہندوستان میں مہاراجہ ”مالیبار“ کے اسلام کا سبب اسی واقعہ کو لکھتے ہیں۔

بہر حال یہ واقعہ غیر معمولی ضرور ہے کہ معجزہ ہے مگر ناممکن نہیں اور صحیح اخبار سے ثابت ہونے کی بناء پر اس کا ماننا ضروری ہے اور جہاں تک یہ کہنا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ساری دنیا والے دیکھتے تو یہ سوال ایسا ہی جا بلا نہ ہے جیسا کہ فلاسفہ کا پہلا والا اعتراض اور نظریہ احتمال تھا، یہ نظام افقی سے ناواقفیت پر مبنی ہے، پھر یہ واقعات کو پیش آیا کیا ضروری ہے کہ ان لمحات میں لوگوں کی نگاہیں آسمان پر ٹکی ہوئی ہوں اور یہ بھی لازمی نہیں کہ ہر جگہ کا مطلع صاف ہو، مع ہذا مکہ سے باہر مسافروں کی ایک جماعت کا دیکھنا ثابت ہے کہ جب قریش نے یہ بہانہ بنایا کہ اگر یہ جادو نہیں تو ہمارے علاوہ دوسروں نے بھی دیکھا ہو گا چنانچہ معلوم کرنے پر اسی کا ثبوت ملا تھا، تاہم بعض کے اسلام لانے کی وجہ سے عام عذاب نہیں آیا یا چونکہ سب نے نہیں دیکھا تھا اس لئے بعض کے انکار ایمان پر عذاب نہیں آیا۔

باب ماجاء فی الخسف

”عن حذیفہ بن اسید قال اشرف عینار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غرفة ونحن نذاکر الساعة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تقوم الساعة حتی تروا عشرایات، طلوع الشمس من مغربها، ویا جوج ما جوج، والذابة، وثلاث خسوف، وخسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف بحزيرة العرب، ونازل تخرج من فعر عدن تسوق الناس او تحضر الناس فقیبیت معهم حيث باتوا وتقیل معهم حيث قالوا“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانے سے ہماری طرف جھانکا دریاں حالیکہ ہم آپس میں قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ (۱) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (۲) اور یا جوج و ما جوج (کا برآمد ہونا) (۳) اور دابہ (کا خروج) اور تین خسوف (۴) ایک خسف مشرق میں (۵) اور ایک خسف مغرب میں (۶) اور ایک یعنی تیسرا جزیرۃ العرب میں (۷) اور ایسی آگ جو عدن کی گہرائی (والی جگہ) سے نکلے گی ہانکے گی لوگوں کو یا فرمایا کہ (اوللشک من الراوی) جمع کرے گی لوگوں کو تو جہاں لوگ رات گزاریں گے وہ بھی ان کے ساتھ وہیں رات گزارے گی اور وہیں قیلولہ کرے گی جہاں لوگ قیلولہ کریں گے۔

اس روایت میں سات علامات کا تذکرہ مکمل ہو چکا، دوسری سند میں دسواں مذکور ہے اور تیسری سند میں دواں کے ساتھ دجال کا ذکر ہے گویا یہ نو ہونگیں جبکہ دسویں نشانی یا تو ہوا ہے جو لوگوں کو آواز کر سمندر میں پھینک دے گی یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یعنی آسمان سے اترنا ہے جیسا کہ ابو موسیٰ محمد بن اسلمی کی روایت میں ہے۔

نغات:۔ قولہ ”اشرف“ اشرف بلند جگہ سے نمودار ہونا اور جھانکنا، سسم^۲ میں بجائے اشرف کے ”اطلَعَ علینا“ کے الفاظ ہیں۔ قولہ ”غرفة“ بغضم الغین بلندی پر بنا ہوا کمرہ جسے فارسی میں بالا خانہ کہتے

باب ماجاء فی الخسف

۱۔ الحدیث أخرجه مسلم ص: ۳۹۳ ج: ۲ کتاب الفتن، سنن ابی داؤد کتاب الفتن والملاحم باب: ۱۲، سنن ابن ماجہ

ابواب الفتن باب: ۲۱، مستدرک احمد ص: ۵۷۳ ج: ۳ حدیث: ۱۵۷۱۱۔

۲۔ مسلم والہ بالا اس میں دونوں الفاظ ہیں پہلی روایت میں الطع کا لفظ ہے دوسری روایت بخاری میں ہے اس میں قاشرف کا لفظ ہے۔

ہیں، قرآن کریم میں اہل جنت کے محلات کے لئے ”غرفات“ کے لفظ میں اسی بلندی کی طرف اشارہ ہے۔
 قولہ ”ما جوج وما جوج“ الف اور حمزہ ساکنہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے الف کی قرأت اکثر ہے،
 دو قبیلوں کے نام ہیں اس کے لئے آگے مستقل باب آ رہا ہے۔ قولہ ”مخسوف“ اور ”مخفف“ بسکون السین
 دونوں مصدر ہیں، زمین میں دھنس جانے کو کہتے ہیں۔

قولہ ”بحجزيرة العرب“ جزیرہ دراصل وہ قطعہ زمین کہلاتا ہے جو چاروں اطراف سے پانی میں
 گھرا ہوا ہو مگر عرفاً و مجازاً عرب کو بھی جزیرہ کہتے ہیں اگرچہ یہ جزیرہ نما ہے حقیقی جزیرہ نہیں ہے۔ قولہ ”میں
 قعر عدن“ قعر کے معنی جڑ اور گہرائی کے ہیں اور عدن یمن کا مشہور شہر اور علاقہ ہے، بعض نے یمن کا ایک جزیرہ
 قرار دیا ہے جو صومالیہ اور جنوبی مغربی یمن کے درمیان بحر ہند اور بحر احمر کے ملنے کی جگہ خلیج عدن کے نام سے
 بہت مشہور ہے جہاں سے تقریباً دنیا بھر کے سمندروں کے جہاز گزرتے ہیں۔ قولہ ”تغلب اور قالوا“ دونوں قیلولہ
 سے مشتق ہیں، دو پہر کی استراحت کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس حدیث میں سات علامات قیامت کا ذکر ہے ان میں سے اولین یعنی سورج کے مغرب
 سے طلوع ہونے اور یا جوج و ما جوج کے لئے اس باب کے بعد امام ترمذی نے بالترتیب دو باب قائم کئے
 ہیں، اس پر بحث دیں ہوگی۔

تیسری نشانی دابہ کا خروج ہے، لغوی اعتبار سے تو زمین پر چلنے والے ہر جانور کو دابہ کہا جاتا ہے مگر عرف
 عام میں وہ چوپایا جو سواری یا مال برداری کے لئے استعمال ہوتا ہے دابہ کہلاتا ہے۔

اس حدیث میں مراد وہی دابہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے: ”واذوقع القول علیہم
 اخرجناہم ذابۃ من الارض تکلمہم ان الناس کنا نوابلینا لا یوقنون“۔ (سورہ نمل آیت نمبر: ۸۲)

قیامت اس موجودہ نظام اور محسوس عالم کا سب سے بڑا سانحہ و حادثہ ہے تو جس طرح کوئی بڑا واقعہ پیش
 آتا ہے اس سے پہلے اس کی نشانیاں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں مثلاً جب طوفان آتا ہے تو اس سے بہت پہلے
 تیز ہوائیں اور بارش ہونا ایک عام سی بات ہے جس کی شدت کا دار و مدار طوفان کے صغرو کبر پر ہوتا ہے،
 لہذا قیامت سے پہلے علامات کا ظاہر ہونا لازمی بات ہے۔

پھر ان علامات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک قسم کی علامات صغریٰ ہیں اور دوسری قسم کی کبریٰ

ہیں، علاماتِ صغریٰ کی تعداد بیڑھ سو کے لگ بھگ ہے، راقم نے ”راہ معرفت“ میں ان کا اجمالاً تذکرہ کیا ہے جبکہ اس حدیث میں علاماتِ کبریٰ کا ذکر ہے جن کی تعداد کم از کم دس ہے، علاماتِ کبریٰ اس وقت رونما ہوں گی جب قیامت بہت زیادہ قریب ہو جائے گی جبکہ صغریٰ تو کافی پہلے سے وجود پذیر ہیں۔ پھر باب کی حدیث میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، بہر حال کبریٰ میں سے ایک خروجِ دابہ ہے جس کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں مندرجہ بالا آیت کے تحت لکھتے ہیں:

”هذه الدابة تخرج في آخر الزمان عند فساد الناس وتركهم أوامر الله وتبديلهم الدين الحق يخرج الله لهم دابة من الارض...“

یعنی جب آخری زمانہ میں لوگ بگڑ جائیں گے اور احکامِ خداوندی کو چھوڑ جائیں گے اور دین حق کو تبدیل کر جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے لئے زمین میں سے ایک دابہ نکال دیں گے پھر اس بارے میں متعدد احادیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سب علامات لگاتار رونما ہوں گی: ”واينها كانت قبل صاحبها فالأخرى على اثرها قريباً“۔

ابن کثیرؒ نے ابوداؤد طیالسی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا خاتم (انگوٹھی) ہوگا، عصا سے کافر کی ناک توڑے گا اور خاتم (کی مہر) سے مؤمن کا چہرہ روشن ہوگا یعنی چمکے گا یہاں تک کہ لوگ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر مؤمن و کافر کی تمیز کر سکیں گے تاہم ترمذی کے حاشیہ میں عصا و خاتم کا عمل و اثر اس کے برعکس بتلایا ہے۔ (کذا فی روایۃ احمد وابن ماجہؒ) اور اس میں یہ بھی اضافہ ہے کہ مؤمن کے چہرہ پر ”مؤمن“ لکھا جائے گا اور کافر پر مہر لگانے سے کافر لکھے گا، پھر ظاہر یہ ہے کہ یہ دابہ کوہ صفا سے برآمد ہوگا، اس کی لمبائی ساٹھ گز کے برابر بتائی گئی ہے، یہ چوپایوں کی طرح چار ٹانگوں پر چلے گا بدن پر چشم یعنی آنکھیں ہوں گی اور مختلف متعدد جانوروں کے نمونوں پر مشتمل ہوگا، کوئی آدمی اس کو پکڑ نہیں سکے گا اور نہ ہی کوئی اس سے بھاگے گا میں کامیاب ہوگا۔

حدیث الباب میں تین خسوف کا ذکر ہے حضرت گنگوہی صاحب رحمہ اللہ نے الکوکب میں فرمایا ہے کہ

۱۔ سنن ابن ماجہ ص: ۲۹۵ ابواب الثنن باب دابة الارض قال يخرج الدابة ومعها خاتم سليمان بن داود وعصا موسى بن عمران عليهما السلام فتجلبو اوجه المؤمن بالعصا ونختم انف الكافر بالخاتم الخ، مسند احمد ص: ۲۷۵ ج: ۳ حدیث: ۹۹۸۸، ايضاً رواه الترمذی فی كتاب التفسير سورة: ۲۷.

یہ تینوں ایک ہی نشانی ہیں علیٰ ہذا حدیث الباب میں راوی نے دس کا احاطہ نہیں کیا ہے۔

بعض شارحین حدیث کی رائے یہ ہے کہ یہ تینوں خسوف واقع ہو چکے ہیں، مگر ظاہر یہ ہے کہ ان کا واقع ہونا ابھی باقی ہے کیونکہ پیچھے عرض کیا جا چکا کہ اس حدیث میں علامات کبریٰ کا ذکر ہے اور یہ کہ علامات لگاتار اور قریب بقیامت رونما ہوں گی، حاشیہ کو کب پر ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے اپنے رسالے سماۃ بہ "اشرار الساعۃ" میں میلان ظاہر کیا ہے کہ یہ تینوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوں گی۔

قولہ "وَنَارُ تَخْرُجُ مِنْ قَعْرِ عَدْنٍ" اس ظاہر یہ ہے کہ یہ آخری نشانی ہے کیونکہ لوگوں کو محشر کی طرف یعنی شام کی جانب جہاں محشر ہوگا لے جانے سے مراد ان کو میدان محشر کی طرف ہانکنا ہے، جن روایات میں ہے کہ: "تَخْرُجُ مِنَ الْأَرْضِ الْحِجَازُ" شے تو دونوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ حجاز راستہ میں پڑتا ہے اس لئے تطبیق یوں ہوگی کہ یمن سے آنے والی آگ حجازی آگ سے آٹے گی، آج کل جزیرہ نماعرب تیل کی سیال دولت اور زیر زمین بلکہ زیر سمندر ذخائر سے لبالب ولبریز ہے لیکن ہے کہ اس میں مزید اضافہ ہونے کی وجہ سے یہ خطہ کسی وقت آگ پکڑ لے مگر اس آگ کا لوگوں کے ساتھ ساتھ ان کی رفتار کے مطابق چلنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دابہ الارض کی طرح اللہ کی طرف سے کوئی زندہ نشانی یا کم از کم دنیاوی آگ سے مختلف شے ہے۔ واللہ اعلم

قولہ "وَزَادَ فِيهِ الدِّخَانُ" ظاہر یہ ہے کہ یہ وہی دخان ہے جو سورۃ دخان میں مذکور ہے: "فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُبِينٍ، يَغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ"۔ (آیت نمبر: ۱۰، ۱۱) اگرچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے اس آیت کے متعلق یہ ہے کہ اس سے مراد وہ خیالی دھواں ہے جو بھوک کی وجہ سے ضعف بصارت کی بناء پر اور فضاء میں خشک سالی کی وجہ سے آلودگی کی بناء پر نظر آتا ہے جو قریش کے بانیکاٹ کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بدوعاء کی بدولت قریش مکہ کو فضاء میں نظر آتا تھا غرض یہ دھواں گزرا ہے اب یہ آنے والا نہیں ہے۔

مگر باب کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علامات قیامت میں سے ہے جس کا آنا باقی ہے، بہت سے محققین نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور بہت سارے صحابہ کرامؓ نے بھی ان کی موافقت کی ہے جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں ہے، علاوہ ازیں اس میں کچھ قرآن

کا بھی سہارا دیا گیا ہے مثلاً آیت میں لفظ ”مبین“ سے ظاہر آیہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دکان کو ہر ایک دیکھنے کا جبکہ پہلی تفسیر میں یہ صرف بھوکے کو بطور خیال نظر آتا، اسی طرح لفظ ”یغشی الناس“ سے بھی اس کا عام اور کثیف ہونا معلوم ہوتا ہے یہ صرف اہل مکہ کے لئے نہیں ہے نیز ”هذا عذاب الیم“ سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے۔

ترمذی کے محشی نے لمعات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ دھواں مشرق تا مغرب ہوگا یعنی بہت زیادہ ہوگا، چالیس دن تک رہے گا، مؤمن اس سے صرف اتنا سامتاثر ہوگا جیسے زکام میں ہوتا ہے یعنی چھینکیں آتی ہیں جبکہ کافر از خود رفتہ بن جائیں گے، بظاہر یہ دھواں ایٹمی جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آلودگی و تابکاری سے مختلف ہے کیونکہ ایٹمی اثرات سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔

قولہ ”والعاشرة اماریح تطرحهم فی البحر واما نزول عیسیٰ بن مریم“ اس سے سابقہ روایت میں دجال کا بھی ذکر ہے جس کے لئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے لئے آگے مستقل الگ الگ ابواب آرہے ہیں۔ جہاں تک اس طوفانی ہوا کا ذکر ہے جو لوگوں کو سمندر میں پھینکے گی تو شارحین حدیث سے اس بارے میں تفصیل مروی نہیں ہے البتہ آگے ترمذی میں ”باب ما جاء فی قتلة الدجال“ کے تحت ایک طویل حدیث کے آخر میں اس ریح کا ذکر آیا ہے جو یا جوج و ماجوج کے بعد نچنے والے مسلمانوں کی جانوں کے قبض کا سبب بنے گی، اسی طرح مسلم جلد اول میں کتاب الایمان کے باب فی الریح التي فی قرب القیمة الخ اور جلد ثانی ص ۳۹۴ پر بھی یہ حدیث ہے: ”ثم یبعث اللہ ریحاً طیبة فتوفی کل من فی قلبه مثقال حبة من خردل من ایمان فیبقی من لا یموت فیہ فیرجعون الی دین ابائهم“ جبکہ کتاب الایمان میں ہے کہ یہ ہوا ریشم سے زیادہ نرم ہوگی، ایک روایت میں ہے کہ یہ یمن سے آئے گی جبکہ دوسری میں شام کی تصریح ہے، امام نووی فرماتے ہیں:

”ویجاب عن هذا یوحیہن اھلھما یحتمل انھما ریحان شامیة ویمانیة ویحتمل ان

مبدأھما من أحد القلعین ثم تصل الآخر وتنتشر عنده بواللہ اعلم۔ (مسلم ص ۵: ج ۱)

ممکن ہے کہ حدیث الباب میں مذکورہ ہوا اس ریح طیبہ سے بھی مؤخر ہو جو کفار کو اڑا کر ادھر سے ادھر اور خشکی سے بحر و صحرا میں پھک دے گی کما قال اللہ تعالیٰ: ”یوم یكون الناس کالغراش المبثوث وتكون الحبال کالمنفوش“۔^۱

حدیث آخر: ”عن صفیة قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا ینتھی الناس عن

غزوہ ہذا البیت حتی یغزو جیش حتی اذا كانوا ابی البیداء او بیداء من الارض حیث یأولہم و آخرہم
ولم یسجد اوسطہم قلت یا رسول اللہ فمن نکرہ منهم قال: یریعنہم اللہ علی ما فی انفسہم۔ (حسن
صحیح) کے

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگ
اس گھر (کعبہ) پر حملے سے نہیں رکھیں گے یہاں تک کہ ایک لشکر حملہ آور ہوگا جب یہ لشکر بیداء مقام یا فرمایا کہ کسی
اونچے میدان تک پہنچ جائے گا تو اس کا اگلا حصہ اور پیچھا دھنسا دیا جائے گا اور درمیانہ بھی نہیں بچے گا، میں نے
عرض کیا اے اللہ کے رسول! ان میں جو اپنی مرضی سے نہیں آیا ہوگا؟ (یعنی اس کا کیا بنے گا؟) آپ صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا اللہ ان کو اپنی اپنی نیوٹوں کے مطابق اٹھائے گا۔

لغات:۔ قولہ ”غزو“ حملہ کرنے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”البیداء“ بدوؤ سے بمعنی ظاہر ہونے کے، وہ
میدان جو کھلا اور اونچائی پر ہو، راوی کو شک ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ بیداء فرمایا جو مسجد ذوالحلیفہ کے
قریب مشہور و معروف مقام ہے یا مطلق بیداء فرمایا جو کہیں بھی ہو۔

تشریح:۔ جیسا کہ لغات کے عنوان میں عرض کیا گیا کہ غزوہ حملہ کرنے کو کہتے ہیں لہذا ”لا یمتہسی
الناس عن غزوہ البیت“ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار و فجار کی طرف سے کعبہ شریفہ زادھا اللہ شرفا و عزاً پر
متعدد حملے ہوں گے یا کم از کم منصوبے بنائے جائیں گے۔ مذکورہ بالا حدیث میں صرف ایک حملہ آور لشکر کا ذکر
ہے جو سب زمین میں دھنس جائے گا البتہ مسلم ^۵ کی روایت کے مطابق ایک سرکش کو بچا لیا جائے گا تا کہ وہ
واپس جا کر لوگوں کو اطلاع کر سکے، بعض روایات میں ہے کہ دو آدمی بھیجیں گے ان میں سے ایک اپنے حکمرانوں
کو اطلاع کرے گا اور دوسرا حضرت مہدی کو خوشخبری دے گا۔ پھر ظاہر یہ ہے کہ لشکر کعبہ کی طرف جاتے ہوئے
راستہ میں ٹالوڈ ہو جائے گا، تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ کب رونما ہوگا مگر جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ
علامات گمبری لگا تا رونما ہوں گی علیٰ ہذا اگر اس نصف کو کبریٰ میں شمار کیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ یہ حضرت
مہدی کے زمانہ میں ہوگا۔

آخری حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف، مسخ اور قذف کا تذکرہ فرمایا تو ام

المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اس وقت بھی ہلاک ہوں گے جب ہمارے درمیان نیک لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نعم اذا ظهر الحبث“ ہاں جب گناہ عام ہو جائیں گے، حبث بفتح حاء تین۔ فوراً یا زنا کو کہتے ہیں اور اگر ہم بضم الحاء وسکون الباء ہو تو خباثت بھی گندگی اور شرارت کو کہتے ہیں یعنی جب بد باطنی کے ساتھ گندے کام عام ہوں تو پھر سب پر عذاب آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بُرے لوگوں کی معیت و دوستی بھی بد انجامی کا سبب ہے اس لئے حتی الامکان بُرائی کی جگہ اور بُرے لوگوں سے دور رہنا چاہئے۔

اس مسئلہ کی کچھ وضاحت ”باب ماجاء فی الامر بالعروف والنہی عن المنکر“ میں گزری ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها

”عن ابی ذر قال دخلت المسجد حين غابت الشمس والنبي صلى الله عليه وسلم جالس فقال: يا ابا ذر! اتسرى امين نذهب هذه؟ قال قلت: الله ورسوله اعلم قال بغناها نذهب لئن استأذن في السجود فليؤذن لها وكانها قد قيل اطلعي من حيث حيث فتطلع من مغربها، قال ثم قرأ: واذالك مستقر لها وقال ذالك قراءة عبد الله بن مسعود“۔^۱ (حسن صحيح)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں اس وقت داخل ہوا جب سورج اوجھل ہو رہا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ذر! کیا تو جانتا ہے کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی اللہ ورسوله اعلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک یہ جاتا ہے تاکہ سجدہ کرنے کی اجازت طلب کرے تو اسے اجازت مل جاتی ہے اور گویا اس کو حکم ملا کہ وہیں سے طلوع ہو جا جہاں سے تم آئے ہو، پس یہ مغرب کی جانب سے طلوع ہو گا فرمایا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: ”وذاک مستقر لها“ (اور یہ اس کا ٹھکانا ہے) اور حضرت ابو ذر نے فرمایا: یہ عبد اللہ بن مسعود کی قراءت ہے۔

باب ماجاء فی طلوع الشمس من مغربها

۱۔ ایضاً روی بحسنہ مستند احمد ص: ۷۹ ج: ۶ وص: ۲۰۸ ج: ۶ حدیث: ۲۰۹۲۸ عن ابی ذر الغفاری، ورواہ الترمذی فی کتاب الغیبر ایضاً۔

لغات:۔ قولہ ”وكانها اقليل لها“ علم بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی مستقبل کی چیز یقینی ہو تو اس کو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرتے ہیں قرآن شریف میں اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں جیسے: ”اتسنى امر الله فلا تستعجلوه“۔ (نحل آیت نمبر ۱) چونکہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا طے شدہ امر ہے اس لئے ”قيل“ ماضی کا صیغہ ذکر کیا ہے جبکہ ”تكانها“ میں قرب کی طرف اشارہ ہے۔ قولہ ”مستغرلها“ قرار سے ہے جائے سکون یعنی ٹھکانا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مستقر سے مراد یومیہ حرکت کا منتہی ہے جبکہ بعض حضرات نے سالانہ حرکت میں انقلاب صلی و شتویٰ کو لیا ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ مراد اس سے نظام شمسی کا منتہی ہے کیونکہ یہ کہکشاں رواں دواں ہے، علاوہ ازیں بھی بہت سارے اقوال ہیں۔

تشریح:۔ دو اصولی اعتراضات اور ان کے اصولی جوابات:۔

(۱)۔ زمین گول ہے:۔ پہلا اعتراض: یہ ہے کہ زمین گول ہے اور وہ اپنے محور کے گرد محوری حرکت کرتی ہے جبکہ سورج اپنی جگہ ساکن ہے پس اس محوری حرکت کے نتیجہ میں دن رات پیدا ہوتے ہیں بایں طور کہ اس گردش میں جو حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو اوجھل رہتا ہے وہاں رات ہوتی ہے، علیٰ ہذا نہ تو سورج چلتا ہے اور نہ ہی طلوع و غروب کسی مخصوص گھڑی میں منحصر ہیں بلکہ ہر آن بیک وقت سورج طالع بھی ہے اور غارب بھی، پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

جواب:۔ یہ جواب ایک اصول و تمہید پر مبنی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے خطاب میں عام لوگوں کی فہم کی بہت زیادہ رعایت کی گئی ہے اس لئے عام بات متفہم الناس کے مطابق کی جاتی ہے اور یہ طرز کلام امثال، تذکیر یا ملامت، صفات باری تعالیٰ اور کائناتی نظام سب میں اختیار کیا گیا ہے کیونکہ اگر بطور تحقیق الحقیقت بات کی جاتی تو بجز خاص الخاص لوگوں کے کوئی بھی اس کا مطلب نہ سمجھ پاتا مثلاً اگر طلوع کی نسبت بجائے سورج کے زمین کے افق یا زمین والوں کی طرف کی جاتی تو یقیناً یہ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی۔

علیٰ ہذا چونکہ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ سورج چلتا اور طلوع و غروب ہوتا ہے اس لئے یہ نسبت سورج ہی کی طرف مناسب ہے تاکہ جو اصل مطلوب ہے یعنی لوگوں کو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر لا تا وہ پورا ہو سکے اس لئے ہر آدمی اپنی سمجھ کی بساط کے مطابق اللہ جل شانہ پر ایمان کا مکلف ہے جو تفصیلی ایمان سے قاصر ہے اس کے لئے مجمل بھی کافی ہے۔ اس اصولی تمہید کے بعد اصل اعتراض کا جواب یہ ہے کہ مستقر سے مراد ٹھہرنے کی جگہ نہیں

جو حقیقی مستقر ہوتی ہے بلکہ اضافی ہے یعنی سورج جس افق پر ہوتا ہے اس سے بجانب مشرق رہنے والوں کے لئے وہی مستقر و مغرب ہے جیسا کہ عارضۃً الاحوذی میں ہے:

”فالمراد بذلك ان كل قوم تغرب عليهم او تطلع فان ذلك استقرار لها بالاضافة
اليها وان كانت هي حركتها الدائمة الغائبة عنا وهو استقرار في المشاهدة
غنا فعبّر عن زوال الحركة المشاهدة بالاستقرار بالاضافة اليها“ الخ۔

یعنی سورج جن لوگوں کے حس و مشاہدہ سے غائب ہو جاتا ہے ان کی نسبت وہی مغرب سورج کا مستقر ہے اگرچہ سورج اس وقت بھی جاری و ساری رہتا ہے، علیٰ ہذا سورج کے عہدہ سے مراد ہر وقت اللہ کے حکم سے چلتا ہے کہ جب طلوع و غروب ہر آن میں لازمی ہیں تو اجازت بھی اتفاقاً نا ضروری اور قیام بھی لازمی ہے جس کو عہدہ سے تعبیر کیا اور یہی مطلب عرش کے نیچے جانے کا ہے کیونکہ وہ ہر وقت عرش کے نیچے ہی ہوتا ہے لہذا امر کہہ سکتے ہیں کہ سورج ہر وقت اللہ کے حکم کے ماتحت چلتا ہے، اسی کے ملک و سلطنت میں رواں دواں ہوتا ہے اور اسی کے حکم کا ہر وقت منقاد ہوتا ہے اور جب اسے واپسی کا حکم ہوگا تو وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا بلکہ واپس پلٹ کر مغرب سے غروب ہوگا جو جمعہ کی رات ہوگی لوگوں پر بہت طویل ہوگی اور جب نصف النہار کے دائرے تک مثلاً بارہ گھنٹے واپس چلے گا تب اس کو معمول کے مطابق چلنے کا حکم ہوگا۔

سورج کے واپسی کے ساتھ ہی توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا البتہ ایک قول کے مطابق اس کے بعد نئے گناہوں سے توبہ قبول ہوگی مگر توبہ کرنے والے کہاں ہوں گے؟ کہ لوگ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھیں گے پھر توبہ کس چیز سے کریں؟

(۲)۔ نیوٹن کا اصول:۔ نیوٹن ایک مشہور سائنس دان گذرے ہیں ان کے اصول دنیا میں آج تقریباً اتنے ہی مقبول ہیں جتنے کسی زمانے میں افلاطون وغیرہ کے مقبول عام تھے اگرچہ افلاطون والوں کے بہت سے اصول آج غلط ثابت ہوئے ہیں مثلاً فلک الافلاک کی گردش، ستاروں کا چمکنے آسمان میں ہونا، سورج کا چوتھے اور چاند کا نچلے آسمان میں ہونا وغیرہ وغیرہ مگر نیوٹن کا حال سائنس کی دنیا کے ہیرو شمار ہوتے ہیں، ان کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو حرکت دی جائے تو جب تک کوئی مانع حرکت پیش نہ آئے وہ حرکت دائمی ہوگی علیٰ ہذا چونکہ زمین سورج سے ایک دھماکے کے نتیجے میں علیحدہ ہو گئی تھی تو اس وقت جو رفتار اس کی محوری حرکت کی تھی وہ اب الا بد تک باقی رہے گی، علیٰ ہذا یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب دن رات زمین کی محوری گردش کا نتیجہ

ہیں اور یہ گردش دائمی ہے تو پھر سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے لئے زمین کی حرکت میں تبدیلی چاہئے۔

علم طبیعیات کے قوانین کا جائزہ: دراصل یہ قانون ایک بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اگر اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے تو اصل حقیقت باسانی منکشف ہو جائے گی، غلط فہمی یہ ہے کہ جب دو چیزوں کے درمیان تسلسل سے معیت دیکھی جائے تو وہاں لزوم کا یقین سا ہو جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان تلازم ہے اور یہ نفسیات صرف آج کے انسان کی ہی نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے انسان اس بیماری کا شکار چلا آ رہا ہے مثلاً ہزاروں سال پہلے نام نہاد حکماء نے عالم کے قدیم ہونے کا نظریہ اس لئے پیش کیا تھا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے قیامت برپا ہوتی ہوئی نہیں دیکھی تھی، مشرکین عرب نے کسی مردے کو قبر سے اٹھتا ہوا میدان محشر کی جانب جاتا ہوا نہیں دیکھا تھا تو پہلے فریق نے کہا کہ عالم قدیم ہے کیونکہ اگر حادث ہوتا تو اب تک ختم ہو جانا چاہئے تھا جبکہ دوسرے نے حشر اجساد کا انکار کیا کیونکہ ان کے بزم اگر قیامت کی بات سچ ہوتی تو اب تک آجانی چاہئے تھی۔

علیٰ ہذا القیاس لوگ جب بھی آگ کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ حرارت کا بھی تصور کرتے ہیں اور دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں اسی پر باقی اشیاء کو قیاس کر لیا جائے مگر حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ اجسام طبعیہ کو دیکھتے ہوئے یہ غلط فہمی پیدا ہونا اگرچہ متبادر ہے لیکن یہ قاعدہ اس وقت درست ہوتا جب یہ تقاضے ان اجسام کے ذاتی ہوتے اور ان میں کسی طرح بیرونی قدرت کا عمل دخل نہ ہوتا، پس جن لوگوں نے ان مقتضیات کو اجسام طبعیہ کی ذوات تک محدود رکھا انہوں نے ان قواعد کو کلیات کی حیثیت دیدی اور کلیات بھی ایسی جن سے کسی طرح کبھی بھی تخلف و انفکاک نہ ہو سکے حالانکہ یہ ضروری ہے کہ ان مقتضیات میں کبھی کبھار انفکاک و تخلف بھی آئے۔

چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عادت شریفہ تو یہی ہے کہ جب اشیاء پیدا فرماتے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ تاخیرات ضرور پیدا فرماتے ہیں مگر یہ لزوم عادی ہے یہ نہ تو تولیدی ہے جیسے معتزلہ کہتے ہیں اور نہ ہی اعدادی ہے جیسے حکماء کہتے ہیں جس کی وضاحت ”باب کرہیۃ البول فی المنفصل“ میں گذری ہے۔ (دیکھئے تشریحات ترمذی جلد اول ص: ۱۳۸)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی صفت تدبیر سے اشیاء میں ایک ترتیب مقرر فرمائی ہے طعام میں بھوک

مارنے اور پانی میں پیاس بجھانے کی خصوصیت ضرور رکھی ہے جس سے لزوم کا تاثر ملتا ہے مگر یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر ماہیت میں اس قاعدہ سے کچھ استثناء بھی ہوتی ہے تاکہ لوگ اس تلازم کو مادہ اور جسم کی طبیعت کی طرف منسوب نہ کریں بلکہ اللہ عزوجل کو اس کا خالق و مالک مانیں جس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جس آگ میں ڈالے گئے تھے تو وہ اس تاثیر سے خالی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے جس بچے کو قتل کر دیا تھا وہ ماہیت انسانی یعنی فطرت سے معرا تھا، لاشی غیر جاندار چیز ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اثر دھابن کر ساحروں کی لاشیوں اور رسیوں کو ہڑپ کر گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے، بعض دفعہ آدمی بغیر اسباب ظاہریہ کے ہوا میں معلق ہوتا ہے جس کو ٹیلی پتھی کا اصول بھی تسلیم کرتا ہے جو برطانیہ و جاپان میں جاسوسی کے حوالے سے خاصا مقبول ہے۔

غرض اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسباب تو پیدا کئے ہیں مگر اپنا وجود منوانے کے لئے بعض دفعہ ان کی تاثیرات کو سلب کرتا ہے اور بعض دفعہ افراد کو ماہیت کے حکم و تقاضا سے الگ کرتا ہے، اس لئے شہد کی مکھیاں میں پھولوں کا رس چوسنے کا مزاج ڈالا مگر بعض پیشاپ پریشی ہیں، بعض کھیر اکڑا ہوتا ہے اسی طرح ہسپتال کے ڈاکٹر جمع ہو جاتے ہیں اور ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے ہیں مگر ان کے درمیان سے مریض کی جان پرواز کرتی ہے ان کا سارا نظام قفل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک روز ایسا آئے گا جب دنیا کے معاملات و حقائق الٹ جائیں گے کینے اشراف بن جائیں گے اور اشراف بے قدر کر دیے جائیں گے تو اللہ عزوجل اس نظام زمان کو پلٹ دے گا تاکہ لوگوں کے لئے درس عبرت ہو مگر اس وقت صرف بصارت ہوگی بصیرت نام کی کوئی چیز باقی نہ ہوگی، اگر طول کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس موضوع کو تھوڑا سا اور آجا کر کرتا مگر ”العاقل نکفیه الاشارة، وللجاهل لا تکفی العنارة“۔

باب ماجاء فی خروج یا جوج و ما جوج

”عن زینب بنت جحش قالت استبغظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نوم مُحَمَّرٌ وَجْهُهُ وَهُوَ يَقُولُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَرُدُّهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَيَلُحُّ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرِّ قَدَاتٍ تَبْرَحُ فَتُفْتَحُ الْيَوْمَ مِنْ رَدَمٍ بِأَجُوجٍ وَمَاجُوجٍ مِثْلَ هَذِهِ وَعَقْدَ عَشْرٍ أَقَالَتْ زَيْنَبُ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَنَهْلِكُ وَفِينَا

الصالحون؟ قال: نعم اذا كثرت الخبيثات۔^۱ (هذا حديث حسن صحيح)

حضرت ام المؤمنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ تین بار اس کو دہرایا، ہلاکت آگئی عربوں کی ایک قریب آنے والے شر سے، آج یا جوج و ما جوج کی دیوار میں اتنی جگہ کھل گئی اور (اس کے ساتھ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس کا عقد بنالیا، حضرت زینب فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ہلاک ہوں گے جبکہ ہمارے سر میان نیک لوگ بھی ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں جب گناہ عام ہو جائیں گے۔

نکات: بقولہ ”محرم“ بروزن مضطر یعنی بتشدید الراء اجماعاً اشیٰ اس وقت کہتے ہیں جب وہ بدرجہ سرخ ہو جائے۔ قولہ ”ردم“ بروزن شمس، سد سکندری مراد ہے یعنی وہ دیوار جس کو ذوالقرنین نے بنایا تھا۔ قولہ ”یا جوج و ما جوج“ یہ لفظین اور ہمزتین دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، دونوں عجی نام ہیں، بعض نے عربی کہا ہے اگر ان کو عربی مانا جائے تو پھر یہ دونوں کس سے مشتق ہیں، اس میں اختلاف ہے کسی نے کہا کہ اجبیج النار سے ماخوذ ہے، اَجَبَ الشَّارَاجُ وَأَجَبَ حَا اس وقت کہتے ہیں جب آگ بھڑک جائے، بعض نے کہا کہ اَجَبَ بمعنی اختلاط کے ہے، وفیہ اقوال آخر بقولہ ”و عقد عشر“ اس کا عقد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی کے ناخن کا سراہا ہاتھ کے جوڑے اندر کی جانب ملا کر حلقہ بنایا جائے۔

تشریح:۔ اس حدیث مبارک میں جس قرہی شر کا ذکر ہے اس میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ یا جوج و ما جوج کے علاوہ کسی دوسرے فتنے کی طرف اشارہ ہو جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی ناپاک جسارت مثلاً۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد وہی یا جوج و ما جوج کا فتنہ ہو اور عربوں کی تخصیص ان کے علاوہ مقام کی وجہ سے ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت عجی دنیا سے اسلام کی بساط لپیٹ دی گئی ہوگی اور صرف عربوں بلکہ جزیرہ نما عرب تک باقی ہوگی جیسا کہ باقی روایات سے ثابت ہے کہ اسلام سمٹ کر حجاز کی طرف ایسا ہی آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں، اور جنگی بکری پہاڑ کی چوٹی میں پناہ لیتی ہے۔

اس روایت میں اور بخاری شریف کی روایت میں بظاہر تعارض سا معلوم ہوتا ہے جس میں ہے: ”دعِل

علیہا یومافزعاً“ مگر ان میں تطبیق آسان ہے کہ آپ علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے اور جلد ہی ان کے گھر میں تشریف لے گئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور گلاب کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔

اسی طرح اس روایت کا اس سے بھی تعارض نہیں ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسعین یعنی نوے کا عقد بنایا تھا^۱ کیونکہ اصل مقصد عدد بتانا نہیں تھا بلکہ حلقہ اور سرائخ کا اندازہ بتانا تھا، عارضہ میں ہے: ”وفقهہ انہ لم یقصده العدد فی عارض قولہ: ”انما امة“ وانما جاء لبیان صورة معينة خاصة“۔

اس باب میں تین باتیں قابل ذکر ہیں، ان ہر سہ مسائل پر مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ نے قصص القرآن میں بڑی تفصیل سے بحث فرمائی ہے یہاں اس کا خلاصہ پیش ہے۔ حدیث باب میں اگرچہ ذوالقرنین کا تذکرہ نہیں ہے مگر یہ تینوں مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اس لئے کچھ عرض مناسب ہے۔

(۱) ذوالقرنین کے نام اور نسب میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ سکندر نام کی دو شخصیتیں گذری ہیں، بعض مفسرین و مؤرخین نے ان کو خلط ملط کر کے پیش کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے اصل صورت حال اس طرح پیش کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا، دوسرا شخص اسکندر بن فیلیس (مقدونی) تھا لوگ اس دوسرے مقدونی کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے حالانکہ دونوں کے درمیان دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ حائل ہے، مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے گذرا ہے اور اس کا وزیر ارسطاطالیس (ارسطو) فلسفی تھا، یہ ایک بت پرست، مشرک، ظالم بادشاہ تھا، یہ شخص رومی و یونانی تھا جبکہ ذوالقرنین جن کا تذکرہ قرآن میں ہے، عربی سامی مؤحد عادل بادشاہ تھا ان کا وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ امام بخاری کے طرز سے بھی اس کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین کے معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو اہل مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال مغفور چین کی جانب ہے اور نہ اہل مغرب میں سے تھا اور نہ ہی یمن والوں میں سے تھا بلکہ مشرق اور مغرب کے درمیان علاقہ کا باشندہ تھا بلکہ وہ سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے

۱ حوالہ بالا ۳۵ کذا فی روایۃ البخاری ص ۳۷۲ ج ۱ کتاب الانبیاء عن ابی ہریرۃ ایضاً ۷۹۸ ج ۲ ”باب الاشارة

فی الطلاق“ کتاب الطلاق، مسند احمد ص ۱۳ ج ۳ حدیث: ۸۲۹۶ ولفیہ: وعقد وحب نسین۔

تھا جن کا نسب قدیم ساسانی عرب تک پہنچتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ نے اس پر بہت زور لگایا ہے کہ ذوالقرنین کے بارے میں اکثر روایات تاریخی اعتبارات سے صحیح نہیں ہیں، اس لئے ان کی اپنی تحقیق یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا وہ بادشاہ ہے جو ۵۵۹ قبل از مسیح علیہ السلام گزرے ہیں جن کا نام خورس (سائرس) ہے ان کو یہود خورس، یونانی سائرس اہل فارس گورس اور عرب مؤرخین خسرو کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ شخص اس دور میں گزرے ہیں جب وسیع تر ایران دو حصوں میں منقسم تھا، شمالی مغربی حصہ کو میڈیا (مابہات) اور مغربی حصہ کو فارس کہا جاتا تھا، یہ شخص اپنی مقبولیت کی بناء پر ان دونوں حکومتوں، بابل اور نیوٹی کو باہم ملانے میں کامیاب ہوا، اسی نے بخت نصر کے جانشین نیل شازار کو شکست دی اور یہود کو دوبارہ بیت المقدس میں آباد کیا اور آسمانی مذہب کو پروان چڑھایا، اس کی دلیل مولانا نے یہ دی ہے کہ قرآن میں ذوالقرنین کا قصہ یہود کے سوال کے جواب میں بیان ہوا ہے لہذا اس کا مصداق ایسا شخص ہونا چاہئے جس سے یہود کے حالات و مفادات وابستہ ہوں اور وہ یہی خورس ہیں کیونکہ بخت نصر نے یروشلم (بیت المقدس) کو تاخت و تاراج کر کے یہود کو قتل و قیدی بنایا، ان میں سے ایک حضرت دانیال علیہ السلام بھی تھے، پھر جب بخت نصر مر گیا تو ذوالقرنین یعنی خورس بابل کو فتح کر کے یہود کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوئے۔

(۲).... دوسرا امر: ذوالقرنین کی دیوار سے متعلق ہے، بقول مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کے خورس (ذوالقرنین) کی مغربی فتوحات کے متعلق سے مراد بحر اسود ہے جبکہ مشرق سے مراد کرمان ہے کہ یہاں کی آبادی ہر طرح کی انسانی سہولیات درختوں اور چھتوں سے خالی تھی، تیسرا سفر بجانب شمال کر کے بحر کسپین سے آگے کوہ قاف کے پہاڑی سلسلوں کے ایک درے کے درمیان مضبوط دیوار قائم کر کے مشرقی ایشیائی ممالک چین اور منگول کے لوٹ مار کرنے والوں کا راستہ بند کر دیا چونکہ وہ پہاڑی سلسلے انتہائی دشوار گزار اور برف پوش ہیں اس لئے درے کے بند ہونے سے زمینی رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔

المستر شد عرض کرتا ہے کہ چونکہ ایشیا اور یورپ کے درمیان حد فاصل کوہ قاف جسے ”کاؤکاس“ کہتے ہیں کا پہاڑی سلسلہ ہے جس کی لمبائی شمال و جنوباً بارہ سو کلومیٹر ہے، یہ بحیرہ کسپین سے آذربائیجان، آرمینیا اور جارجیا کے مغرب میں اور مغربی روس تا بحر اسود پھیلا ہوا ہے، اور اس کے مشرق میں دوسرا سلسلہ ”اورال“ کا ہے

یہ انتہائی شمال یعنی قطب شمالی کے قریب سے شروع ہوتا ہے اور جنوب کی طرف بڑھتا ہوا ماسکو کے مشرق میں قازقستان کے انتہائی جنوب میں جا کر ختم ہو جاتا ہے اس کی لمبائی دو ہزار چار سو (۲۴۰۰) کلومیٹر ہے۔

دوسری طرف چین، افغانستان اور تاجکستان کے سنگم پر پامیر دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلوں کا مصدر و منبع ہے اس سے کوہ ہمالیہ، قراقرم اور کوہ ہندو کش بھی نکلتے ہیں جن میں اول الذکر برما تک پہنچتا ہے، یہ بھی دو ہزار چار سو کلومیٹر لمبا ہے، جبکہ قراقرم پاکستان میں اور ہندو کش افغانستان میں جا نکلتے ہیں، اسی پامیر سے دو اور پہاڑی سلسلے نکلتے ہیں، یہ دونوں چین کے اندر ہیں، ایک بجانب مشرق جاتا ہے اس کو ”کولون“ کہتے ہیں، یہ تقریباً سولہ سو کلومیٹر لمبا ہے جبکہ اس کے ساتھ دوسرا بھی تقریباً سولہ سو کلومیٹر ہے، یہ پہلے شمال میں کرغیزستان میں داخل ہوتا ہے اور پھر مشرق کی جانب مڑ جاتا ہے۔

اس کے برعکس ”اورال“ کے مشرق جو روس کا مغربی حصہ بنتا ہے سے بحر شمالی کے ساحلی علاقے یعنی شمالی مشرقی روس سمندر یا بحیرہ کاسپین اور علاقہ میدانی و صحرائی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ چین اور منگولیا سے پیدل سفر کرنے والوں کے لئے مشرق وسطیٰ تک رسائی کا آسان راستہ شمالی ایشیاء کی ساحلی پٹی اور ماسکو کے راستے پہاڑی دروں سے ہوتا ہوا بحر کاسپین تک ہی تھا بالفاظ دیگر چائنا اور منگولیا کے لوگ شمال میں ساحلی علاقے میں پہلے مغرب کی جانب جا کر پھر جنوب کی طرف مرکز دروں میں سے ہوتے ہوئے آرمینیا، آذربائیجان اور دیگر علاقوں کی طرف جا نکلتے اور وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کرتے، جس کی روک تھام کے لئے ذوالقرنین نے پانک بند کر دیا، اور اس قسم کی دیواریں اس زمانے میں تحفظ کا کامیاب ذریعہ تھا چنانچہ چینیوں نے بھی منگولیوں سے بچنے کے لئے دیواریں بنائی تھیں جو آج تک قائم ہے۔

(۳).... یا جوج و ما جوج کون ہیں؟ بقول مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کے یہ دراصل اسی خطے کے دو قبیلے ہیں جس کا ذکر ابھی اوپر گزر گیا یعنی منگولیا تاتار اور چینی، ان کے دو بڑے قبیلے ہیں ایک کا نام ”موگ“ ہے اور دوسرے کا نام ”یوچی“ (یوچی) ہے، موگ تقریباً چھ سو برس قبل از مسیح یونان میں میک اور میاگ بنا اور عربی میں ”ما جوج“ ہوا جبکہ غالباً یہی یوچی (یوچی) یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یا جوج کہلایا۔ (تفسیر القرآن ص: ۹۵ تا ۹۷ جلد: سوم و چہارم، دارالاشاعت)

المسترشد عرض کرتا ہے کہ مولانا موصوف کی یہ تحقیق اپنی جگہ بہت وقیع سرمایہ ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ کے عین مطابق ہو مگر اس میں جو بڑی خامی رہ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں ان احادیث کی طرف کوئی

اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے جو صحیح ہے ٹھیک ہیں کہ یا جوج و ما جوج کے بارے میں بہت ساری من گھڑت روایات بھی پائی جاتی ہیں جن میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا مگر جہاں تک باب کی روایت ہے تو یہ صحیح ہے، شیخین نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ امام دارقطنی نے اپنی اس کتاب ”العلل الواردة فی الاحادیث الضعیفہ“ میں جہاں امام بخاری کی بہت سی احادیث پر اعتراضات کئے ہیں، باب کی حدیث ان میں شامل نہیں۔

بہر حال اگر مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تحقیق کو صحیح مانیں تو آج کے حالات کی روشنی میں یہ کہنا شاید بجا ہو کہ روس اور چین دونوں گرم پانیوں کی تلاش میں عرصہ سے مارے مارے پھر رہے ہیں، چین، پاکستان کی آوجھت کر رہا ہے تاکہ اس کو کراچی اور گوادریک رسائی حاصل ہو مگر دوسری طرف امریکہ نے پاکستان کو اپنی آغوش میں دبایا ہوا ہے، معذبہ بھارت امریکہ کے اشارے پر قراقرم پر قبضہ کرنے کا خواہاں ہے، ممکن ہے کل حالات ایسے بنیں کہ چین کے لئے یہ واحد راستہ بند ہو جائے اور وہ روس کے ساتھ مل کر شمالی روس کی ساحلی محفوظ پٹی کا راستہ استعمال کر کے اس پانک کو دوبارہ کھولیں جس کو ذوالقرنین نے بند کیا تھا، چونکہ چین، منگول اور روس نظریاتی اعتبار سے بھی ایک ہیں اور سیاسی اعتبار سے بھی امریکہ و یورپ کے حریف ہیں اس لئے مستقبل میں ان کا اتحاد اور گرم پانی تک رسائی کے لئے سد ذوالقرنین کو دوبارہ کھولنا مستبعد نہیں، یہ وہ زمانہ ہوگا جب مشرق وسطیٰ کی سیال دولت تیل میں دنیا والوں کے لئے بہت جاذبیت ہوگی ملکوں اور قوموں کی موت و حیات کا دار و مدار تیل پر ہوگا، اس لئے لڑنا اور مرنا ایک ضروری اقدام سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم وعلیہ السلام

سوال: رہا یہ سوال کہ باب کی روایت کے مطابق یا جوج و ما جوج اس سورت یعنی دیوار میں سراخ کر چکے ہیں اور یہ بات تو سابق الذکر کہیں منکر سے مطابقت نہیں رکھتی؟

جواب: تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں خواب کا ذکر ہے اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بلا شک و شبہ اگرچہ وحی ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ خواب عالم مثال میں دیکھا جاتا ہے اور عالم مثال میں اشیاء دنیا میں وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی محسوس ہو کر دکھائی دینے لگتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ خواب میں جو بات دکھائی جائے وہ اسی وقت عالم مشاہدہ میں واقع ہو چکی ہو یا جلد واقع ہو جائے بلکہ اس میں سالہا سال بھی لگ سکتے ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمر سے کا خواب ہے، علی ہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرب قیامت کے مناظر، اشرار و فتن عالم مثال میں دیکھتے تھے اور قیامت تک پورا منظر ان کے

سامنے تھا اس کا یہ مطلب لینا کہ جو کچھ انہوں نے بیان فرمایا، وہ فوراً اور بالفعل رونما ہو شاید صحیح نہ ہوگا، پس مطلب یہ ہوا کہ جب یا جوج و ما جوج اس دیوار کو گرانے کی کوشش کریں گے تو اس میں وہ اپنے آلات کے ذریعہ سوراخ کریں گے مگر ان کو کامیابی نہیں ملے گی، ایک دن وہ ان شاء اللہ کہیں گے خواہ عمد ہو یا غیر ارادی طور سے پس وہ اس سوراخ کو بڑا کرنے میں کامیاب ہوں گے اور سب تفتاز، کوہ قاف اور دیگر پہاڑوں سے ہوتے ہوئے مشرق وسطیٰ میں داخل ہوں گے۔ واللہ اعلم وعلہ اتم

مگر اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جس کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پراسرار مخلوق ہو جو اللہ نے اپنے حکم و حکمت سے ہماری نظروں سے اوجھل رکھی ہو اور جب حکم ہوگا تو وہ کوہ پڑے گی، اس لئے قدیم شارحین حدیث نے اس مسئلہ پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے چنانچہ امام نوویؒ کی عادت خوب تشریح کرنا ہے مگر وہ اس مسئلہ پر خاموشی سے گزرے ہیں۔

ملفوظ:- اگر کسی کو پہلی تحقیق پسند ہو تو حدیث کی جو شرح راقم نے عالم مثال کے حوالے سے کی ہے اس کے لئے عالم مثال کی حقیقت سمجھنا لازمی ہے جو حجۃ اللہ البالغہ لشاہ ولی اللہ اور تحقیق الرکب لشاہ عبدالعزیز کے دیکھنے اور سمجھنے پر موقوف ہے۔

روایات سے جو امر مترشح ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اولاً اہل مغرب کے ساتھ مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کی لڑائی ہوگی اور میدان جنگ مشرق وسطیٰ کا علاقہ ہوگا، شروع میں مسلمانوں کو برتری نصیب ہوگی پھر یہود جو کہ آج کل امریکہ و یورپ پر بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اپنے دجال کے ساتھ میدان میں کوہ پڑیں گے پھر وہ حالات رونما ہوں گے جن کا تذکرہ ان شاء اللہ آگے ابواب میں آ رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل فرمائیں گے اور یہود کا خاتمہ فرمائیں گے ثانیاً اتنے میں یا جوج و ما جوج کا طوفان اٹھ آئے گا، گویا پہلا سیلاب مغرب سے آئے گا اور دوسرا مشرق سے۔ واللہ اعلم وعلہ اتم

باب ماجاء فی صفة المارقة

”عن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يخرج في آخر الزمان قوم احدثت الاسنان سفهاء الاحلام، يقرءون القرآن لا يجاوز تراقيهم يقولون من قول خير البرية يفرقون من الدين كما يفرق السهم من الرمية“۔^۱ (حسن صحيح)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آخری زمانہ میں ایک ایسی قوم نکلی گی جو کہ جوں سال ہوگی خفیف العقل ہوگی وہ لوگ قرآن پڑھیں گے وہ ان کی ہنسی کی ہڈی سے آگے نہیں بڑھے گا (یعنی گلے سے) وہ خیر البریہ کے مطابق بات کریں گے (یعنی آیات کو نقل کریں گے) نکلیں گے وہ دین سے ایسے جیسے تیر نشانہ سے گذرتا ہے (یعنی پار ہو جاتا ہے)۔

لغات:۔ قولہ ”احداث“ حدث بروزن ترکی جمع ہے نئی اور تازہ کو کہتے ہیں مراد چھوٹی عمر ہے۔ قولہ ”الاسنان“ سن کی جمع ہے بمعنی عمر کے۔ قولہ ”سفهاء الاحلام“ حلم بکسر الحاء کی جمع ہے عقل کو کہتے ہیں اور سفہاء سفیہ کی جمع ہے جیسے فقہاء جمع فقیہ اور حکماء جمع حکیم کی ہے، سفہ خفت و ہلکا پن کو کہتے ہیں، سفیہ وہ آدمی ہوتا ہے جس کی عقل کم اور رائے ناقص ہو جو نفع نقصان کے مواقع نہ جانتا ہو چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر بچوں اور عورتوں کو سفہاء کہا گیا ہے قال اللہ تعالیٰ: ”ولا تلووا السفهاء اموالکم النہی جعل اللہ لکم قیاماً“۔^۲ قولہ ”ترافیہم“ ترقوتہ کی جمع ہے ہنسی کی ہڈی کو کہتے ہیں اور مجازاً حلق و گلے پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو یہاں مراد ہے۔ قولہ ”من قول خیر البریہ“ مراد اس سے قرآن پڑھنا ہے جیسے کہ مسلم کی متعدد روایات میں تصریح ہے۔ قولہ ”الرمیہ“ بمعنی مفعول یعنی مرمیہ، نشانے کو کہتے ہیں یعنی جیسے حیر یا آج کل گولی نشانے کو چیر پھاڑ کر نکلتی ہے اسی طرح یہ لوگ بھی دین سے یا اطاعت خلیفہ سے بنا برا اختلاف تو لین نکلیں گے۔

تشریح:۔ چونکہ اسی باب میں آگے اس کی تفسیر خوارج سے کی گئی ہے جو حوراء کے رہنے والے تھے، یہ مقام کوفہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے، یہ خوارج کا مرکز تھا اور مسلم کتاب الزکوٰۃ کے آخر میں

باب ماجاء فی صفة المارقة

۱۔ الحديث أخرجه البخاری ص: ۴۷۲ ج: ۱ کتاب الانبیاء، ایضاً فی المنالب والمغازی والتوحد وغیرہ، ومسلم فی کتاب الزکوٰۃ، ابوداؤد کتاب السنۃ باب: ۲۸، سنن نسائی زکوٰۃ باب: ۷۹، ابن ماجہ مقدمہ باب: ۱۲، مؤطا مالک مس القرآن باب: ۱۰، مسند احمد ص: ۳۷۱ ج: ۳ حدیث: ۱۰۶۲۵۔ ع سورة النساء آیت: ۵۔

”باب اعطاء الخوارج... و بیان الخوارج“ کے میں بھی متعدد روایات بعض اشارہ اور بعض صراحت اس پر ناطق ہیں کہ اس کا مصداق خوارج ہیں اس لئے آخر الزمان سے مراد اس خلافت کا آخری دور لیا جائے گا جو بطرز نبوت تھی، چنانچہ صحیح ابن حبان میں ہے: ”الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم تصیر ملكاً“۔ کے حافظ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء کے مقدمہ میں اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں: ”انخرجه اصحاب السنن وصححه ابن حبان وغيره“۔ (ص: ۸، قدیمی کتب خانہ) اور خوارج کا خروج ۲۸ میں ہوا ہے۔

خوارج نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی مصالحت پر اعتراض کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ جملہ کہا: ”ان الحكم الا الله“ جس کے متعلق مشہور ہے: ”كلمة حق واريدها الباطل“ اس کے ساتھ انہوں نے الگ ہو کر مستقل مذہب کی تاسیس کی اور مرکب کبیرہ کو کافر کہنے لگے، بعد میں حرید غلو کرتے ہوئے بعض مرکب صغیرہ کو بھی کافر ٹھہرانے لگے اس طرح ان کے میں فرتے بن گئے۔

جو حضرات ان کی تکفیر کرتے ہیں وہ: ”يمسرقون من الدين“ میں دین سے مراد ایمان و اسلام لیتے ہیں، ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ: ”اختلف العلماء قديماً (یعنی ان کی تکفیر میں)... والصحيح انهم كفار بلقوله صلى الله عليه وسلم: يمسرقون من الدين“ الخ مگر جو حضرات ان کو کافر نہیں کہتے ہیں یعنی احتیاطاً جو کہ جمہور سلف کا مذہب ہے وہ یہاں دین سے مراد اطاعت لیتے ہیں یعنی یہ لوگ خلیفہ وقت کی طاعت سے ایسے خارج ہوں گے جیسے تیر نشانہ میں داخل ہونے کے بعد فوراً نکل جاتا ہے، یہ تشبیہ ہے کہ یہ لوگ پہلے داخل ہوں گے مگر پھر جلد ہی نکل جائیں گے، اور قرآن پر ہمیں گے مگر وہ ان کے حلق سے آگے تباد نہیں کرے گا یعنی دل میں داخل نہ ہوگا تا کہ اس کو سمجھیں یا اس پر عمل کریں یا اوپر کی طرف نہیں جائے گا یعنی قبولیت کے لئے نہیں جائے گا کہ مقبول کلمات و عبادات صعود کرتے ہیں قال الله تعالى: ”اليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصالح يرفعه“ ۵ خوارج بحیثیت جماعت آج موجود نہیں ہیں۔

باب ماجاء فی الاثرۃ

”عن أمییدین خضیران رجلاً من الانصار قال: یا رسول اللہ! استعملت فلاناً ولم تستعملنی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انکم سترون بعدی اثر قفاصبروا حتی تلفونی علی الحوض“۔ (حسن صحیح)

حضرت امید بن خضیر (دونوں مصغریں) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں کو عامل بنایا اور مجھے مقرر نہیں کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک عنقریب تم میرے بعد ترجحات دیکھو گے پس مہر کرتے رہنا یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر مجھ سے آلو!۔
لغات: استعملت، استعمل بمعنی عامل بنایا۔ قولہ ”اثرۃ“ بغضات بمعنی ترجیح کے، ایثار سے ہے یعنی آنے والے اکثر امرا مستحقین کو ان کا حق نہیں دیں گے بلکہ مستحقین پر خود کو اور اپنے متعلقین کو ترجیح دیں گے۔

تشریح:۔ ان صحابی کو آپ علیہ السلام نے یہ جواب اس لئے دیا کہ وہ گھبرا گئے تھے کہ شاید آپ علیہ السلام نے دوسرے کو مجھ پر ترجیح دے کر مجھے ناپسند کیا، حاصل جواب یہ ہے کہ ایثار تو امور دنیا میں ہوتی ہے جبکہ عامل مقرر کرنا امور مسلمین میں سے ہے نیز ہم کسی خواہشمند یا مطالبہ کرنے والے کو نہیں بتاتے ہیں مگر جب آپ کو اس پر بھی مہر نہیں تو بعد میں جب مشترکہ حقوق میں بہت سارے لوگوں کو یا انصار کو نظر انداز کیا جائے گا ان پر کیسے مہر ہوگا حالانکہ ترجحات کا علاج صبری ہے لہذا جب بعد میں تم کو تمہارے حقوق نہیں ملیں گے تو مہر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے قیامت کے دن آلو، پھر وہاں آپ کے لئے آپ کا حق وصول کیا جائے گا یا مطلب یہ ہے کہ اس مہر پر اتنا بڑا اجر مقرر ہے کہ آپ کوثر اور ساقی کوثر سے شرف ملاقات نصیب ہوتا ہے۔

حدیث آخر:۔ ”عن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: انکم سترون بعدی اثرۃ وامور اُتکرو نہا قالوا فما تاتامرنا قال: اتوا الیہم حقہم واسألوا اللہ الذی لکم“۔ (حسن صحیح)

باب ماجاء فی الاثرۃ

۱۔ اعرجہ لہذا البخاری ص: ۱۰۳۵۔ کتاب الفتن، ایضاً فی کتاب المسائل باب: ۱۳، الخمس باب: ۱۹، الجزیۃ باب: ۲، وصحیح مسلم کتاب الزکوۃ حلیث: ۱۳۲، سنن نسائی ص: ۳۰۳، ج: ۲، کتاب ادب الفقہاء باب: نوک استعمال من یحرم علی الفقہاء“۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپ میرے بعد تریجات دیکھیں گے اور ایسی چیزیں دیکھیں گے جو آپ کو نا آشنا لگیں گی، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں (یعنی ایسے میں ہم کیا کریں؟ ان سے لڑیں یا صبر کریں؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو ان کے حقوق ادا کرتے رہئے اور اپنے لئے اس چیز کی دعا مانگیں جو آپ کے لئے ہے۔

تشریح:- یعنی ولایت اور حکمرانوں کے خلاف کاروائی سے اجتناب کرتے رہو اور ان کی اطاعت میں لگے رہو اور اللہ سے سوال کرتے رہو کہ ان کی اصلاح فرمائے یا کوئی متبادل قیادت نصیب فرمائیں، یہ بھی ممکن ہے کہ: ”و اسالو اللہ الذی لکم“ سے مراد صبر ہو یعنی اللہ سے صبر و استقامت مانگو۔

یہ مسئلہ پیچھے کر رکھنا ہے کہ حکومت وقت سے باقاعدہ لڑائی اور جنگ سے اجتناب کرنا چاہئے خصوصاً جب کامیابی کا امکان کم ہو یا البتہ اگر خطرہ نہ ہو تو ان کے منکرات کو بڑا دردناک روکنا چاہئے پھر خطرے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ صرف اپنی حد تک ہو، دوسرا یہ کہ اس کی وجہ سے دوسروں کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہو، پہلی صورت جائز بلکہ عزیمت ہے جبکہ دوم جائز نہیں چنانچہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ شرح الحسین میں لکھتے ہیں:

”ولیس هو من باب قتالهم ولا من الخروج عليهم الذی ورد النهی عنه ...

... و اسال الخروج عليهم بالسيف فيحشى منه الفتن التي تؤدى الى سفك دماء

المسلمين، نعم ان عشى في الاقدام على الانكار على الملوك ان يؤذى اهله

او حيرانه لم ينع له التعرض لهم حينئذ لعافيه من تعدى الاذنى الى غيره“ الخ۔

(ص: ۳۹۲، دار ابن حزم حدیث نمبر: ۳۳)

ہاں البتہ اگر حکمرانوں کے منکرات ایسے ہیں جو رعایا پر لاگو کرنا چاہتے ہیں تو اس میں نہ ان کی اطاعت جائز ہے اور نہ ہی ان کو قبول کیا جاسکتا ہے، غرض لڑائی سے گریز کرتے ہوئے اپنا دامن بچانا لازمی ہے، خواہ اس کے لئے عہدہ چھوڑنا پڑے یا ہجرت کرنا پڑے۔ تاہم اگر حالات ایسے آجائیں کہ علماء متفقہ طور پر خروج کا فتویٰ جاری کریں جو بظاہر ناممکن لگتا ہے تو اس وقت فتویٰ پر عمل کیا جانا چاہئے بشرطیکہ اسباب کی رو سے غلبہ کا قوی امکان ہو اور لڑائی کا مفید شرہ یقینی ہو مگر یہ شرائط آج کل ناممکن نظر آتی ہیں کہ اتنے اسباب جمع کرنا بعید از تصور ہے اور تقویٰ والی جنگ بھی آج نہیں ہو سکتی اور پھر جنگ کے بعد ثمرات و مفادات کی لڑائی بھی تقریباً یقینی ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

کھڑے ہوئے اور قیامت تک آنے والی کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر ہمیں اس سے آگاہ فرمایا (یعنی موئے مونے تمام واقعات و حالات کے بارے میں بتلایا) یاد رکھا اس کو جس نے یاد کیا اور بھلا دیا اسے اُس نے جو بھولا پس آپ علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس میں (ایک فرمان) یہ تھا کہ بے شک دنیا ہری ہری میٹھی میٹھی ہے اور یقیناً اللہ نے تم کو اس کا جانشین بنایا ہے تاکہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو پس دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو! اور اس ارشاد میں یہ بھی تھا کہ: خبردار لوگوں کا رعب کسی شخص کو حق بات کہنے سے ہرگز نہ روکنے پائے بشرطیکہ وہ اس کا حق ہونا جانتا ہو، راوی کہتا ہے کہ ابوسعید روئے اور فرمانے لگے بلاشبہ بخند اہم نے بہت سی چیزیں دیکھ لیں مگر ہم بیت زدہ ہو گئے (یعنی ان منکرات کو روک نہ سکیں کہ ان کی پشت پر حکام تھے) اس خطبے میں یہ بات بھی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگاہ ہوا کہ قیامت کے روز ہر بے وفا کے لئے اس کی غداری کے بقدر ایک جھنڈا گاڑا جائے گا (یعنی بطور علامت کے) اور عام سربراہ کی غداری سے بڑا کسی کا غدور نہیں اس کا علم غدور اس کے سرین کے پاس نصب کیا جائے گا، اور ہم نے اس دن جو کچھ یاد کیا اس میں یہ بھی تھا: باخبر ہو کہ آدم کی اولاد مختلف طبقوں میں (تقسیم کر کے) پیدا کی گئی ہے ان میں بعض ایسے ہیں جو ایماندار پیدا کئے جاتے ہیں اور مؤمن رہتے ہیں اور بحالت ایمان مرتے ہیں، جبکہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کافر پیدا کر دیئے جاتے ہیں، کافر رہتے ہیں اور حالت کفر میں مرتے ہیں، اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو مؤمن پیدا کئے جاتے ہیں، ایماندار رہتے ہیں اور کافر بن کر مرتے ہیں جبکہ ان میں بعض ایسے ہیں جو کافر پیدا ہوتے ہیں، کافر رہتے ہیں (یعنی اسی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں) اور ایماندار بن کر مرتے ہیں۔

آگاہ ہو جاؤ! کہ ان میں بعض ایسے ہیں جن کو دیر سے غصہ آتا ہے اور جلد ہی غصہ سے لوٹ جاتے ہیں، ان میں بعض ایسے ہیں جو جلدی غضبناک ہو جاتے ہیں اور جلدی واپس ہو جاتے ہیں پس ایک -الت دوسری کے بدلے میں برابر سراہ ہو جاتی ہے، آگاہ ہو! بعض ایسے ہیں جو جلدی غصہ ہو جاتے ہیں اور دیر سے لوٹ جاتے ہیں (یعنی غصہ سے) آگاہ رہو! کہ ان میں سب سے اچھے وہ ہیں جو دیر سے غصہ ہو اور جلدی باز آ جائیں اور ان میں بُرے وہ ہیں جو جلدی غصہ ہوں اور دیر سے باز آ جائیں، باخبر ہو! کہ ان میں بعض ایسے ہیں جو ادائیگی میں بھی اچھے ہیں اور مطالبے میں بھی اچھے ہیں جبکہ بعض ان میں سے ادائیگی میں اچھے نہیں طلب میں اچھے ہیں، بعض ان میں سے دینے میں اچھے ہیں مانگنے میں اچھے نہیں ہیں پس ایک حالت دوسری کا بدلہ ہے، خبردار! بعض ان میں ایسے ہیں جو دینے میں بھی اچھے نہیں اور مانگنے میں بھی اچھے نہیں ہیں خبردار! ان میں

سب سے اچھے وہ ہیں جو دینے اور مانگنے دونوں میں اچھے ہوں، اور باخبر ہوں کہ ان میں بُرے وہ ہیں جو ادا کرنے میں بھی بُرے ہوں اور حق مانگنے میں بھی بُرے ہوں۔

خبردار! کہ غصہ آدمی کے دل میں ایک چنگاری (کی مانند) ہے کیا تم نے (دوران غصہ) اس کی آنکھوں کی سرخی اور گردن کی پھولی ہوئی رگیں نہیں دیکھیں پس جو شخص تھوڑا سا غصہ بھی محسوس کرے تو وہ زمین سے لگ جائے (مثلاً لیت جائے) حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم سورج کی طرف دیکھنے لگے کہ اس کا کچھ حصہ باقی ہے؟ (یعنی سارا غروب ہوا یا کنارہ ابھی افق کے اوپر ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باخبر ہو کہ دنیا کے گذشتہ زمانے کے مقابلے میں اتنی ہی زندگی باقی ہے جتنا تمہارے آج کے دن کا باقی ماندہ حصہ ہے گزرنے والے حصے کے مقابلے میں۔

لغات مع تشریح:۔ قولہ "ان الدنیا خضرة حلوة" الخ خضرة فتح الحاء وکسر الصاد جبکہ حلوة بضم الحاء وکون اللام وفتح الواو ہے، اول کے معنی ہرے اور سبز کے ہیں جو دل کشی و جاذبیت سے کنایہ ہے کہ سرسبز منظر حسین لگتا ہے، اور حلوة سے مراد لذیذ ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا بظاہر بھی خوب صورت لگتی ہے اور نفس بھی اسے اچھا سمجھتا ہے، اب تم لوگ اس دنیا کے باسی اور حکمران بنادیئے گئے ہو مگر اس کی لذات میں انہماک سے بچو، اس کی محبت سے دور رہو، بس ضرورت کے تحت اسے حاصل کرو، غرض و مقصد سمجھ کر اس کے پیچھے مت لگو کہ اس میں آپ کا امتحان لیا جا رہا ہے، پھر آپ علیہ السلام نے خاص الخاص فتنے کا ذکر بطور خاص بعد العام کر کے فرمایا کہ عورتوں سے بچو یعنی ان پر دین قربان کرنے سے بچو، کہ اس سے مقصد اصلی فوت ہو جائے گا، تفسیر خازن میں ہے:

"لان الجمع بین لذات الدنیا والآخرۃ غیر ممکن فمن اشتغل بتحصيل لذات

الدنیافاته لذات الآخرۃ"۔ (جلد نمبر ۱ ص ۶۳) تحت آیہ "وَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ

الدنیا بالآخرۃ" من سورة البقرة

قولہ "آلَا تَأْمَنُّونَ رَحْلَاهِیۃَ النَّاسِ الْخ" یعنی حق بات کہنے کے لئے نقصان اٹھانا پڑے تو برداشت کر لیا کرو مگر لوگوں تک حق ضرور پہنچاؤ تا کہ قیامت کے دن کوئی لاعلمی کا عذر پیش نہ کر سکے تاہم اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں خطرہ زیادہ ہو جس کی وضاحت پیچھے گزر چکی ہے تب آدمی معذور ہوگا، عارضۃ الاحوذی میں ہے:

"ان الحروف ان كان من اذابة قليلة لم يسقط عند ذلك فرض القول، فان كان ضرراً كثيراً تعين عليه ترك القول ولزمته خاصة نفسه۔"

قولہ "ينصب لكل غادر الخ" یہ جھنڈا اس کی نشاندہی اور اعلام کے لئے ہوگا تاکہ لوگ اس کو بحیثیت غدار دیکھیں اور یاد کریں اور چونکہ امام عام اور حکمران کی دھوکہ دہی و غداری بہت ہی شنيع اور وسیع تر ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ حقوق و متعلقات کی زیادہ پامالی ہوتی ہے اس لئے اس کی تشہیر جداگانہ انداز سے ہوگی تاکہ شہرت کذائی کے ساتھ اس کی ذلت بھی ہو اور خلقِ سیئہ کے ساتھ اس کے خلق پوشیدہ کا بھی اظہار ہو۔

قولہ "آلان بنی آدم مخلوقا علی طبقات شتى الخ" شتیت کی جمع ہے بمعنی مختلف کے جیسے مرضی جمع مریض، آپ علیہ السلام نے لوگوں کے مختلف درجات و طبقات بتائے اور بلاشبہ حقیقت بھی یہی ہے کہ سب لوگ برابر نہیں ہوتے، ہر دور میں دیکھا جاسکتا ہے کہ کوئی آدمی انتہائی خود غرض اور شریر ہوتا ہے جبکہ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو خیر رسائی کے جذبے سے لبریز و مرشار ہوتے ہیں، شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ الباقیہ میں اس پر فلسفیانہ بحث فرمائی ہے، تفصیل تو وہاں دیکھی جاسکتی ہے، تاہم آسان لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح سارے درخت یعنی نباتات مساوی نہیں اور نہ ہی تمام جاندار ایک جیسے ہوتے ہیں بلکہ ہر نوع کے افراد بھی یکساں نہیں ہوتے، ایسا ہی حال انسانوں کا بھی ہے، انسانیت کی سطح زمین بلکہ جانوروں سے شروع ہوتی ہے اور درجہ بدرجہ یہ سلسلہ عرش معلیٰ یعنی ملا باللائک پہنچتا ہے۔ (مد برو تشکر)

اس حدیث میں غصے کو انگارے سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ غصہ حرارت غریزہ کا اثر ہے جب آدمی خلاف طبع بات سنتا ہے یا خلاف مرضی کوئی چیز دیکھتا ہے تو اس حرارت میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اس لئے اس کا علاج پانی سے کیا جاتا ہے خواہ وہ پیئے یا وضوء کرے اور چونکہ کبھی غصہ تکبر کی وجہ سے بھی آتا ہے اس لئے زمین پر لیٹنے سے بھی وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ زمین میں تواضع و خاکساری ہے اور صحبت کا اثر تو ہوتا ہی ہے اس لئے ان ہر دو طریقوں سے غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، محب دنیا اور غصہ کی مزید تفصیل درکار ہو تو راقم نے "نقش قدم" میں دی ہے۔ فلیراجع

باب ماجاء فی اهل الشام

”عن معاوية بن قرة عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذا فسد اهل الشام فلا خير فيكم لانزال طائفة من امتي منصورين لا يضرهم من خذلهم حتى تقوم الساعة“۔^۱ (حسن صحيح)

حضرت معاویہ بن قرہ اپنے والد قرہ بن ایاس المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب شام کے لوگ بگڑ جائیں گے تو پھر تم میں بھی خیر نہیں بچے گی، میری امت کی ایک جماعت (ضرور) ہمیشہ منصور (مدد کی ہوئی) رہے گی وہ لوگ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے جو ان کی مدد کرنا چھوڑیں گے تا آنکہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

لغات:- قولہ ”منصورین“ جن کی سن جانب اللہ نبی مدد کی جاتی رہے گی جس سے ان کے حوصلے بلند رہیں گے اور مکارہ و آزمائشوں پر صبر کرتے رہیں گے اس طرح ان کا کام جاری رہے گا اگرچہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں۔ قولہ ”من خذلهم“ جو ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے اور مدد کرنا بند کر دیں گے جیسا کہ موجودہ حالات میں مشاہدہ عام ہے۔

تشریح:- اس حدیث میں اہل شام کی منقبت کا ذکر ہے اور یہ کہ جب شام والے بگڑ جائیں تو پھر باقی لوگوں میں بھلائی کی موجودگی ختم ہو جائے گی، اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ شام مجاہدین کی ارض ہے اور مجاہدین کے فساد کے بعد دنیا میں خیر و بھلائی کا ناپید ہونا لازمی بات ہے، کسی نے کہا کہ شام مرکز حکومت ہے اور حکام کی خرابی رعیت کی تباہی ہے۔

مگر جو وجہ ابن خلدونؒ نے مقدمہ میں لکھی ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، یہ بنیادی طور پر جغرافیائی تاثیرات سے تعلق رکھتی ہے، یہاں اس کا انتہائی مختصر خلاصہ پیش ہے:

”علامہ عبدالرحمن بن خلدونؒ وقت اقلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ چوتھی اقلیم تمام آباد علاقے میں سب سے زیادہ معتدل ہے اور اسے گھیرے ہوئے تیسری اور پانچویں اقلیمیں قریب بہ اعتدال ہیں... چونکہ

عراق و شام تمام دنیا میں وسط میں ہیں اس لئے یہ اعتدال میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں... اور ان معتدل اقلیم کے باشندے انتہائی کامل ہوتے ہیں... انبیاء کرام انہی لوگوں میں بھیجے جاتے ہیں جو نوع انسان میں اپنی پیدائش و اخلاق کے اعتبار سے انتہائی کامل ہوتے ہیں... انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو شریعت لے کر آئیں اسے یہ لوگ برضا و رغبت قبول کرتے ہیں۔ (تیسرا مقدمہ اقلیم معتدلہ وغیرہ معتدلہ بتقدیم و تاخیر)

غرض یہ لوگ فطرت کے بہت قریب ہیں ای وجہ سے ان میں بکثرت انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے کہ ان کا حال گویا کچھ اس طرح ہے کما قال اللہ تعالیٰ: "مَنْ شَجَرَةٌ مَبَارَكَةٌ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يَضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُّورٌ عَلِيُّ نُوْرٌ"۔ (النور آیت نمبر: ۳۵) پس جب معتدل لوگ بے اعتدالی و بگاڑ کا شکار ہوں گے تو اندازہ لگائیں کہ باقی اقلیم کا حال کیا ہوگا؟ اگر آپ کا ذہن کسی اشکال کی طرف جائے تو اس کے جواب کے لئے حوالہ بالا مطالعہ کیجئے۔

ملاحظہ:- اس قسم کی احادیث میں قیامت تک کے الفاظ کا مطلب تا قیام قیامت نہیں لینا چاہئے بلکہ قیامت کا قرب لینا چاہئے یعنی وہ وقت جس کے بعد دوبارہ اصلاح نہ ہوگی بلکہ یہ ارضی کشتی ذوب ہی جائے گی۔ رہا یہ مسئلہ کہ یہ طائفہ منصورہ جس کا یہاں ذکر آیا ہے کون ہے؟؟ اس سے کون لوگ مراد ہیں تو امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے "قال علی بن المدینی: هم اصحاب الحدیث"۔ اسی طرح اور بھی بہت سارے اقوال ہیں: کسی نے کہا کہ مراد فقہاء ہیں، کسی نے مجاہدین کو اس کا مصداق بنایا ہے اور کسی نے صوفیاء کرام کو، مگر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اہل حق مراد ہیں خواہ وہ کسی بھی نام سے یاد کئے جائیں۔

باب لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض

"عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب

بعضکم رقاب بعض"۔^۱ (حسن صحیح)

باب لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض

۱۔ ایضاً رواہ البخاری ص: ۱۰۳۸ ج: ۲ "باب قول النبی ﷺ لا ترجعوا بعدی الخ" کتاب الفتن، ایضاً رواہ فی کتاب العلم باب: ۴۳، وفی الصحیح باب: ۱۳۳ وفی المغازی باب: ۷۷، وفی الاضاحی باب: ۵، ادب باب: ۹۵، جمود باب: ۹۰، صحیح مسلم کتاب الایمان، سنن نسائی تحریم باب: ۲۹، سنن ابن ماجہ باب: ۵، ابواب الفتن، سنن دارمی ص: ۹۵ ج: ۲، حدیث: ۱۹۲۱ عن جریر بن عبد اللہ، مستدرک احمد ص: ۲۸۱ ج: ۱۰، حدیث: ۲۰۳۷، ایضاً ص: ۶۶۴ ج: ۱، حدیث: ۳۸۰۵،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد کفار مت بننا کہ ایک دوسرے کی گرونیں مارنے لگو۔

تشریح:- ”لا تفرحوا“ بمعنی لاتصبروا کے ہے اور بعدی یعنی میری وفات کے بعد۔ کفار یعنی کالکفار یا ایک دوسرے کی تکفیر مت کرو کیونکہ اس سے تم ایک دوسرے سے قتال میں پڑ جاؤ گے، ”وقیل السمراد کفران النعمة“۔ (کذا فی حاشیۃ البخاری جلد اول ص: ۲۳۳) یضرب کو مجروح پڑھنا بھی جائز ہے کہ جواب نمی ہے یا باء اول ثانی میں مدغم ہے، اور رفع بھی جائز ہے کہ جملہ محل صفت میں واقع ہے یا جملہ بدل عن الجملہ ہے۔ (کذا فی العارضة) غرض یضرب یا حال وغیرہ بن کر ماقبل سے متعلق ہے یا جملہ مستأنفہ ہے۔

خلاصۃ المراد یہ ہے کہ میرے بعد تم لوگ ایمان و اسلام پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کفار کی مشابہت خصوصاً مقاتلہ سے بچتے رہو کہ اس سے دین بھی خراب ہوگا اور دنیا بھی۔

باب ماجاء انه تكون فتنة القاعد فيها خير من القائم

”عن بسر بن سعيد بن ابی وقاص قال عن فتنة عثمان بن عفان اشهد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: انهما ستكون فتنة القاعد فيها خير من القائم والقائم خیر من الماشی، والماشی خیر من الساعی قال اقرايت ان دخل علي بيتي وبسط يده الي ليقتلني؟ قال كن كباين ادم“۔^۱ (حسن)

بسر بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کے فتنے کے وقت فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ بات یہ ہے کہ عنقریب ایک ایسا (ہولناک) فتنہ ہوگا کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑے ہوئے شخص سے بہتر ہوگا اور کھڑا شخص چلنے والے سے افضل ہوگا اور چلنے والا تیز رو سے بہتر ہوگا حضرت سعدؓ نے عرض کیا بتائیے (یعنی میری رہنمائی کیجئے) اگر کوئی شخص (فتنہ باز) میرے خلاف میرے گھر میں داخل ہو کر اپنا ہاتھ میری طرف

باب ماجاء فتنة القاعد فيها خير من القائم

^۱ روی بمعناه البخاری ص: ۵۰۸ ج: ۱ کتاب المناقب، وص: ۱۰۳۸ ج: ۲ کتاب الفتن، صحيح مسلم ص: ۳۸۹ ج: ۲ کتاب الفتن، سنن ابی داؤد ص: ۲۳۵ ج: ۲ ”باب النهي عن السعي في الفتنة“ كتاب الفتن، سنن ابن ماجه ص: ۳۸۵ ابواب الفتن باب: ۱۰۔

بڑھائے تاکہ مجھے قتل کر ڈالے (تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن آدم (ہائیل) کی طرح بن جاؤ۔

تشریح:- اس حدیث کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ شروفساد میں جس کا حصہ ہوتا تھا اس شخص کی نسبت افضل ہوگا جو اس میں زیادہ سرگرم ہو کیونکہ ثواب و عقاب بقدر اعمال ہوتے ہیں علیٰ ہذا ان سب لوگوں کو شریک تصور کیا جائے گا مگر قاعد کا حصہ قائم سے کم اور قائم کا ماشی سے کم اور ساری سب سے زیادہ ہے۔

دوسرا مطلب جو کہ اظہر ہے، یہ ہے کہ فتنے سے جو شخص بچتا دور ہوگا وہ اتنا ہی محفوظ ہوگا پس قاعد تو اس لئے بہتر ہے کہ وہ بالکل لا تعلق ہے جبکہ قائم سے مراد تماشا دیکھنے والا ہے اور یہ بھی ایک گونہ شرکت ہے تو جس طرح گناہ کرنا جرم ہے اسی طرح گناہ کرنے والوں کا تماشا دیکھنا بھی حسب گناہ جرم و قبیح ہے جبکہ گناہ و فتنے کی طرف آہستہ و پیدل چلنے والا دوڑ کر شامل ہونے والے سے افضل ہے کہ دوڑنے والا زیادہ سرگرم ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر فتنہ گھر کے اندر داخل ہو جائے تب بھی آدمی کو اپنا دفاع نہیں کرنا چاہئے بلکہ حضرت ہائیل کی طرح عزیمت پر عمل کرتا ہوا جام شہادت خاموشی سے نوش کر لینا چاہئے جبکہ بعض دیگر روایات سے اور فقہاء کی عبارات سے اپنے دفاع کا حق ثابت ہے، بظاہر یہ تعارض ہے۔

اس کا جواب حضرت منگو ہی رحمہ اللہ نے الکوکب الدری میں یوں دیا ہے کہ اگر اپنے دفاع میں کسی بڑے فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر دفاع کرے اور اگر خطرہ ہو تو پھر دفاع کئے بغیر خوشی سے یا ناخوشی سے موت کو گلے لگا لے، لہذا دفاع کے جواز کی روایات عدم فتنے کی صورت پر محمول ہیں جبکہ باب کی روایت فتنے کے برپا ہونے کے اندیشے پر، مثلاً اگر آدمی سمجھتا ہے کہ اگر میں اپنے دفاع میں گولی چلاؤں تو حملہ آور میرے گھر کو بارود سے اڑا دیں گے جس سے میرے علاوہ اہل خانہ بھی نشانہ بن جائیں گے، یا مجھے قتل کر کے گھر والوں کو قیدی بنالیں گے اس طرح ان کی ایذا و آبروریزی کا سبب میں بن جاؤں گا تو پھر کوئی مزاحمت نہ کرے، غرض اہل بیتین کو اختیار کر لینا چاہئے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

باب ماجاء ستكون فتنة كقطع الليل المظلم

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: یادرؤبالاعمال یتننا کقطع اللیل المظلم یتصیح الرجل مؤمناً ویمسی کافرأؤیمسی مؤمناً ویصبح کافرأؤیبيع احلہم دینہ بعرض من الدنیا“۔^۱ (حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال (صالح) سرانجام دینے میں جلدی کرو ایسے فتنوں کی آمد سے پہلے پہلے جو تاریک رات کی مانند ہوں گے آدمی صبح مؤمن اٹھے گا اور شام کو کافر بنے گا اور شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کو کافر اٹھے گا، ان میں سے ایک اپنا دین دنیاوی مال و متاع کے عوض بیچے گا۔

لغات:۔ قولہ ”یادرؤ“ ای سار عواو سابقوا یعنی بٹائی و جلدی کرو۔ قولہ ”بالاعمال“ الف لام عہد کے لئے ہے، مراد اعمال صالحہ ہیں، ای بالاشتغال بالاعمال الصالحہ۔ قولہ ”کقطع“ بکسر القاف و فتح الطاء قطعہ کی جمع ہے کٹڑے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”المظلم“ بصیغہ اسم فاعل، ظلمت اندھیرے کو کہتے ہیں۔ قولہ ”فتننا“ بفتح التاء فتنہ کی جمع ہے۔

تشریح:۔ اس حدیث میں فتنوں کی تشبیہ تاریک اور اندھیری رات کے ساتھ دی گئی ہے اور رات بھی ایسی جس میں جوق در جوق اندھیروں کا جھوم ہو، ظاہر ہے ایسے میں بصارت کام نہیں کر سکتی ہے ایسا ہی ان فتنوں میں بصیرت قلیل اور اندھیری ہی ہو جائے گی اور کچھ معلوم نہ ہوگا کہ حق کون سا ہے اور باطل کون سا؟ ایسے میں ذہنی انتشار اور پریشانیوں کی بھرمار ہوتی ہے اور اعمال کی طرف توجہ کم یا کم از کم دلجمعی ختم ہو جاتی ہے، مثلاً نماز باجماعت دشوار ہو جائے گی، حج کرنا مشکل بن جائے گا وغیرہ وغیرہ، لہذا ان حالات کے پیش آنے سے پہلے ہی عمل تیز کرو مثلاً ایک آدمی یہ سوچتا ہے کہ عمر کے اخیر میں حج کر لوں گا تو اول تو زندگی کی کوئی ضمانت نہیں، دوم حالات کا کیا بھروسہ شاید چند سال کے بعد حالات نامساعد بن جائے۔

پھر آپ علیہ السلام نے ان حالات کی ایک جھلک ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ ایک آدمی صبح کو مؤمن ہوگا مگر شام کو کافر بن جائے گا، اس ارشاد کا صحیح مطلب تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر جو کچھ ظاہری مطلب ہو سکتا ہے

باب ماجاء ستكون فتنة كقطع الليل المظلم

۱۔ ایضاً رواہ مسلم ص: ۷۵ ج: ۱ ”باب الحث علی الصادقۃ بالاعمال الخ“ کتاب الایمان ورواہ الترمذی فی الزہد باب: ۳۔

وہ امام ترمذی نے اسی باب میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صبح وہ اپنے مسلمان بھائی کا خون اور آبرو اور مال محترم سمجھے گا مگر شام کو یہ چیزیں حلال سمجھنے لگے گا یعنی صبح کامل مؤمن ہوگا تو شام کو ایمان کا کمال اڑ جائے گا، یا مطلب یہ ہے کہ وہ کافروں والا عمل شروع کر دے گا یا کافروں کی طرح طرز زندگی اپنالے گا۔

المستتر شد عرض کرتا ہے کہ روایت میں کافر کے لفظ کو معنی حقیقی و اصلی پر محمول کرنے میں بھی کوئی زیادہ قباحت نظر نہیں آتی کیونکہ دور حاضر میں ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھا جن کے نظریات ایک ہی دن میں تبدیل ہو گئے، ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے سے پہلے (جوناٹن ایون کے واقعہ سے مشہور ہے) لوگوں کے ایمانی جذبات اچھے تھے مگر جیسے ہی امریکی صدر کا پاکستانی صدر پر دیر مشرف کو دھمکی آمیز فون آیا تو پورے ملک کی پالیسی بھی تبدیل ہو گئی اور اکثریت کا رویہ بھی یکسر پلٹ گیا، اس سے اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ جب دجال کا فتہ اور اس سے پہلے دوسرے فتنے آئیں گے تو یقیناً ایسی مثالیں دیکھنے کو ملیں گی۔ پھر اس کا مزید بیان کرتے ہوئے آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی اپنا ایمان معمولی دنیاوی متاع کے عوض بیچے گا۔

آج کل ایمان کی جو حالت ہے اور عام لوگوں کے دلوں میں اس کی جو قدر ہے اس کے تناظر میں اس جملے کو ظاہر پر محمول کرنا آسان لگتا ہے اور کسی قسم کی تاویل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ آج معمولی فیشن کا مقام ایمان کے مقام سے اونچا سمجھا جاتا ہے، ایک بازاری عورت یا بازاری مرد کے سامنے کوئی ایسی حدیث بیان کرنا جو اس کی خواہش کے منافی ہو خواہ وہ فیشن سے متعلق ہو یا مال و نوکری سے کوئی موثر حیثیت نہیں رکھتی بلکہ بہت سے لوگ تو حدیث کو ماننے نہیں اور قرآن میں مرضی کی تاویلات کرتے ہیں جس کے پیچھے دنیوی متاع کا لالچ ہوتا ہے، بے شمار لوگ ایسے ہیں جو دنیا کے لئے آغا خانی بن گئے، لاقعد اقلادیانی بن گئے اور بہت سے روشن خیال بن گئے یہاں تک کہ اہل علم میں بھی فتویٰ بیچنے والے پیدا ہو گئے گویا کسی نے پورا دین فروخت کیا اور کسی نے اس کے حصے بچھ دیئے ہیں مگر پھر بھی اللہ کا شکر ہے آج تک اہل حق علماء بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ کا برعلائے دیوبند کو جزائے خیر عطا فرمائیں جن کی محنت کے ثمرات تا حال باقی ہیں جن کی بدولت ہم محفوظ و مستفید ہو رہے ہیں۔

حدیث آخری: ”عن ام سلمة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم: استیقظ لیلة فقال سبحان اللہ ما اذا انزل الہیلة من المفتنة ما اذا انزل من العزائم من یوقظ صواحب الحشرات یارب کاسیة فی

الدنيا عارية في الآخرة“۔ (حسن صحیح)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات (نیند سے) بیدار ہوئے تو فرمایا سبحان اللہ! کس قدر فتنے آج رات نازل کئے گئے اور کس قدر خزانے نازل کئے گئے ہیں کون ہے جو ان حجروں والیوں کو جگادے دنیا میں بہت سی آراستہ آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

لغات:۔ بقولہ ”ماذا أنزل“ الخ بصیغہ مجهول اس میں ما استفہامیہ تعجب اور تخم کے لئے ہے۔ بقولہ ”یارب“ منادی مخذوف ہے تقدیر یہ یا سامعین! جبکہ رُب بکثیر کے لئے ہے۔ بقولہ ”کاسبہ“ کسی کیسی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے کاسبہ لباس پہنے ہوئی کو کہتے ہیں جو ”عاریہ“ کے مقابل ہے، عاریہ کے اعراب میں دو احتمال ہے، جر بھی جائز ہے کاسیہ کے تابع (صفت) ہونے کی وجہ سے، اور رفع بنا بر خبریت بھی صحیح ہے ای ہی عاریہ فی الآخرة۔

تشریح:۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یا بواسطہ ملائکہ بتایا گیا کہ مستقبل میں فتنوں اور فزانوں کا نزول ہونے والا ہے، فتنوں سے تو مراد ہلا دینے والے واقعات اور نئی ایجادات وغیرہ اوزان پر مرتب عذاب ہے جبکہ فزانوں سے مراد حتمیں بھی ہو سکتی ہیں اور روم و فارس کے خزانے بھی ہو سکتے ہیں، چونکہ فتنوں کے پیش آنے کی صورت میں اثابت الی اللہ میں تیزی لانے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور تبلیغ و تعلیم اور دفع مضرت میں اپنے نفس و اہل خانہ اور قرب و جوار سے آغاز کرنا چاہئے اس لئے فرمایا کہ کون ہے؟ جو صواحب حجرات یعنی امہات المؤمنین کو جگادے، لہذا اس کلام کا رخ امہات المؤمنین کی طرف نہیں ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”یارب کاسبہ فی الدنیا عاریہ فی الآخرة“ تو اگرچہ یہ حکم عام ہے مردوں کو بھی شامل ہے مگر عورتیں اس میں پیش پیش رہتی ہیں۔ اس لئے ان کی تخصیص فرمائی کہ عورتوں کے مزاج میں ریاکاری، تفاخر اور نمائش کا تناسب مردوں سے زیادہ ہوتا ہے، ایک روایت میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے ”نساء کاسیات عاریات مائلات مہملات رؤسهن کاسمتہ البعث“۔ اگر دونوں حدیثوں کا مورد ایک مانا جائے تو پھر کہا جائے گا کہ باب کی حدیث مختصر ہے، جیسا کہ اوپر لغات کے ضمن میں عرض کیا گیا کہ کاسیہ اور عاریہ متضاد الفاظ ہیں اس لئے یہاں کاسیہ کے جو بھی معنی مراد ہوں عاریہ سے اس کے مخالف معنی مراد ہوں گے پس یا تو اس کا ظاہری مطلب مراد ہے، یا پھر مجازی معنی۔ اس لئے یہاں کئی احتمالات ہو سکتے ہیں جو مندرجہ

ع۔ رواہ البخاری ص: ۲۲ ج: ۱ کتاب العلم، ایضاً ص: ۱۰۷۴ ج: ۲ کتاب الفتن، ایضاً روی بحضارہ المالک فی الموطا

ص: ۷۰۹ کتاب الجمع، ع۔ رواہ مسلم ص: ۲۰۵ ج: ۲ کتاب اللباس، مستدا احمد ص: ۳۷ ج: ۳ حلیت: ۸۴۵۱۔

ذیل ہیں۔

(۱)...کاسیہ سے مراد کپڑوں میں لمبوٹ ہوتا ہے گردہ کپڑے ستر کے مقصد سے خالی ہونے اور زینت کی خاطر زیب تن کرنے کی وجہ سے آخرت میں پردے کا کام نہ دیں گے، پھر محض زینت موٹے کپڑوں اور باریک دونوں سے مذموم ہے۔

(۲)...یا سرا دلہاس التقویٰ ہے مگر حقیقی تقویٰ نہ ہونے کی بناء پر وہ متقی آخرت میں عاری عن التقویٰ شمار ہوگا۔

(۳)...مال دولت و دیگر نعمتوں سے مالا مال ہوں گی دنیا میں مگر ناشکری کی وجہ سے آخرت میں شکر کے ثمرات سے محروم ہوں گی۔

(۴)...بظاہر ازواج کے لباس میں مستور ہوں گی مگر اغیار کی یاری اور شوہر کے ساتھ مکاری و عیاری کی وجہ سے آخرت میں سب مکرو فریب اور زنا سے پردہ اٹھ جائے گا۔

پھر جس روایت میں مائعات ممیلات الخ کا اضافہ ہے اس کی تشریح میں ابن العربی نے عارضہ میں متعدد احتمالات ذکر کئے ہیں مثلاً چلنے میں دائیں بائیں جھکاؤ، یا چادر او روپٹ کو چہرے سے ہٹانا، یا اپنی باتوں میں مٹھاس ظاہر کرنا وغیرہ جس سے دوسرے کے دل ان کی طرف مائل ہوں تاہم اپنے گھر میں شوہر کا دل جیتنے اور لکھانے کے لئے یہ جائز ہے، عارضہ میں ہے: "ومعناه ان المرأة اذا كانت فی بیتها مع زوجها فلیس شیء من هذا مذموماً علی الاطلاق" الخ۔

باب کی آخری حدیث:- "عن علقمة بن وائل بن حجر عن ابیہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجل یسأله فقال: أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَيْنَا أَمْرَاءُ يَمْنَعُونَا حَقَّنَا وَيَسْأَلُونَا حَقَّهُمْ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَسْمَعُوا وَأَطِيعُوا فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا خَلَعُوا وَعَلَيْكُمْ مَا خَلَعْتُمْ"۔ (حسن صحیح)

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا دراں حالیکہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر رہا تھا، پس اس شخص نے عرض کیا بتائے گا کہ اگر ہمارے اوپر ایسے امراء ہوں جو ہم سے تو ہمارا حق روکیں اور اپنا حق ہم سے مانگیں؟ (یعنی ایسے میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنا کرو اور فرمانبرداری کیا کرو بے شک ان پردہ لازم ہے جو ان پر لادا

گیا ہے (یعنی عدل و انصاف اور امن و امان وغیرہ کی ذمہ داری) اور تم پر وہ لازم ہے جو تم پر لا دیا گیا ہے (یعنی اطاعت و معاونت)۔

تشریح:۔ یہ مضمون پیچھے بارہا گذرا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ امر ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نافرمانی و بغاوت اور خروج کی اجازت دیدی جائے تو اس طرح ہمیشہ کے لئے طوائف الملوکی کا راج قائم رہے گا اور مسلمان چھوٹی چھوٹی ریاستوں بلکہ ٹولیوں تک محدود ہو کر رہ جائیں گے اس لئے امام کی اطاعت کو والدین کی فرمانبرداری سے زیادہ مؤکد قرار دیا، اور بڑی حد تک ان کی زیادتیوں کو برداشت کرنے کی تلقین کی گئی، تاہم جس طرح مسلمان ماں باپ اور کافر ماں باپ کی تعمیل یکساں واجب نہیں اسی طرح عادل اور فاسق حکمرانوں میں بھی فرق ہے کہ عادل کی اطاعت موافق شریعت واجب ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے تو ان کے مباح احکام کو بھی واجب التعمیل قرار دیا مگر فاسق حکمرانوں کی اطاعت کا حکم ماننا گواجب تو نہیں خاص کر جب وہ شریعت کے خلاف ہو مگر ان کے خلاف خروج بھی واجب نہیں بلکہ آج کل تو یہ کہنا چاہئے کہ جائز ہی نہیں کیونکہ آج بارود کا دور ہے اور خروج کی صورت میں نہ صرف مرد، حکومت کے ظلم کا شکار بن جاتے ہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی اس کی زد میں آتے ہیں جیسا کہ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۰ء کا تجربہ سب نے دیکھا کہ حکومت پاکستان کے ہاتھوں بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے یا غائب ہو گئے یا فروخت کئے گئے، بتائیں جب تک کفر و ارج نہ ہو تو صبر کا دامن تھامنا ہی عقلمندی ہے تاکہ یہ مقولہ صادق نہ آئے: ”کسمن بنافصرا وھدم مصرأ“۔ مزید تفصیل پہلے گذری ہے اس سے بھی زیادہ درکار ہو تو ”المسائرہ اور المسامرہ“ وغیرہ دیکھیں۔

باب ماجاء فی الهرج

”عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم: ان من ورائکم اقاما یرفع فیہا العلم ویکفر فیہا الهرج قالوا: ہا رسول اللہ! ما الهرج؟ قال: القتل“۔ (حسن صحیح)

باب ماجاء فی الهرج

۱۔ ابضا رواہ البخاری ص: ۸۹۳ ج: ۴ کتاب الادب، صحیح مسلم ص: ۳۴۰ ج: ۲ ”باب رفع العلم وقبضہ الخ“ کتاب العلم، سنن ابن ماجہ ص: ۲۹۳ ”باب ذهاب القرآن والعلم“ ابواب الفتن، مسند احمد ص: ۶۴۳ ج: ۱ حدیث: ۳۶۸۷، ص: ۵۱۴ ج: ۲ حدیث: ۷۴۹۶۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارے بعد ایسے دن ہوں گے جن میں علم اٹھا لیا جائے گا اور ہرج (قتل یا فجور) بڑھ جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! "ہرج" کیا ہے؟ فرمایا "قتل"۔

لغات: بقولہ "الہرج" اس کی تفسیر و مراد وہی ہے جو خود ہی حدیث میں آئی ہے یعنی باہمی قتل و قتال، تاہم بعض روایات میں ہرج کا اطلاق فسق و فجور پر بھی ہوا ہے جیسا کہ ترمذی "باب ما جاء فی فتنۃ الدجال" کی ایک لمبی حدیث کے ضمن میں آرہا ہے: "ویسقی سائر الناس یتھارجون کما یتھارج الحمر فعلیہم تقوم الساعة"۔ (ص: ۴۹) غرض لغت میں اضطراب کو کہتے ہیں، قتل اس کا کامل فرد ہے، حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے دونوں روایتوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ اگر بارہ ائمہ سے مراد قوت اسلام کا زمانہ لیا جائے تو پھر مطلب یہ ہے کہ اسلام کی قوت و شوکت کی کمزوری کی صورت میں باہمی قتل و قتال عام ہو جائے گا: "فعلى هذا التاويل يكون المراد بقوله "ثم يكون الهرج" یعنی القتل الناشئ عن الفتن وقوعاً ناشئاً ويستمر ويزداد وكذا كان"۔

اور اگر بارہ ائمہ سے مراد نفس اسلام کے پھیلے ہوئے زمانے پر منقسم ذور لیا جائے تو "على هذا فالمراد بقوله "ثم يكون الهرج" اى الفتن المؤذنة بقيام الساعة من الخروج الدجال وما بعده" انتہی ای کلام ابن حجر۔ (تاریخ الخلفاء ص: ۹، ص: ۱۰)

تشریح: بعض نسخوں میں ترجمۃ الباب اس طرح ہے: "باب الهرج والعبادة فیہ" یہ حدیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا ہی فرمایا تھا ویسا ہی ہوا کہ علم گھٹ گیا اور قتل و غارت کا بازار خوب گرم ہے، علم کے رفع کی صورت تو یہ ہے کہ جب بھی کوئی عالم وفات پاتا ہے تو اس کے پیچھے رہ جانے والے خلفاء پر کرنے کے لئے کوئی نہیں ہوتا اس طرح مسلسل گراؤ ہمارے مشاہدے میں ہے اور جب علم نہ رہے اور اس پر عمل نہ ہوگا تو لازمی بات ہے کہ جہل بڑھے گا اور زمانہ جاہلیت کا ذرہ در ذرہ شروع ہوگا کیونکہ جاہلیت زمانے کے کسی مخصوص وقفے کا نام نہیں بلکہ ذہنی و دماغی فطور کا نام ہے کہ جب وہ معیار قائم نہیں رہے گا جو دین اسلام نے قائم کر رکھا تھا تو کہا جائے گا کہ جاہلیت کا دور آگیا، اور انسانی سوچ پھر جاہلیت کی تاریکی میں ڈوب گئی۔

ابن العربی عارضہ میں لکھتے ہیں کہ یہ امت قتل و غارت گیری سے معصوم و مامون تھی مگر جب اس کے امام حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو فتنوں کا بند دروازہ کھول دیا گیا: ”وَقَدْ قَالَ لَهُمْ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَلَامٍ: لَا تَسْلُوا سَيْفَ الْفِتْنَةِ الْمَغْمُودَ عَنْكُمْ“۔

ایسی صورت حال میں کہ جب اصلاح ممکن نہ ہو کیا کرنا چاہئے اس کو اگلی حدیث میں بیان کیا گیا ہے: ”الْعِبَادَةُ فِي الْهَرَجِ كَهَجْرَةِ الْإِي“۔ گئے (حسن صحیح) ”فتنوں میں عبادت ایسی ہی ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا“۔ ابن العربی اس تشبیہ کی وجہ بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ پہلے لوگ دین کی حفاظت کی خاطر ہجرت کر کے دارالکفر سے دارالایمان کی طرف جاتے تھے مگر جب فتنے ہوں (یعنی کوئی جگہ محفوظ نہ رہے) تو اس وقت تحفظ دین کی خاطر لوگوں سے الگ ہو کر عبادت کرنا متعین ہو جاتی ہے جو ہجرت کی ایک قسم ہے، سند میں ”رُؤْيَا“ بمعنی نَبَا ہے یعنی اس کو منسوب کیا۔

حدیث آخر: ”عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا وَضَعَ السَّيْفُ فِي أَمْتِي لَمْ يَرْفَعْ عَنْهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ“۔ گئے (صحیح)

جب میری امت کے درمیان تلوار رکھ دی جائے گی (یعنی چلنے لگے گی) تو قیامت تک اٹھائی نہیں جائے گی۔

تشریح:۔ کیونکہ ہر گناہ کا یہ ضابطہ ہے کہ آدمی جب تک اس سے دور رہتا ہے تو اس کی شاعت، بُرائی اور ہولناکی و بدانجامی کا تصور ذہن پر غالب رہتا ہے مگر ایک دو دفعہ اس کے ارتکاب سے اس کا خوف ختم ہو جاتا ہے اور وہ عام معمولات زندگی کی طرح زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے علیٰ ہذا جب قتل کا اقدام کیا جاتا ہے تو اس کے بعد اس علاقے یا قوم میں قتل فردِ غِیاثا ہے۔ والعیاذ باللہ

۱۔ ابصارِ رواہ مسلم ص: ۲۰۶ ج: ۲ ابواب الفتن، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۷ ”باب الوقوف عند الشبهات“ ابواب الفتن، مسند احمد ص: ۶۶۰ ج: ۵ حدیث: ۱۹۷۷۷ ولفظہ: العمل فی الهرج كَهَجْرَةِ الْإِي۔

۲۔ رواہ ابصارِ ابوداؤد ص: ۲۳۳ ج: ۲ کتاب الفتن والملاحم، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۳ ابواب الفتن: وإذا وضع السيف في امتي فلم يرفع عنهم إلى يوم القيامة، مسند احمد ص: ۱۰۴ ج: ۵ حدیث: ۱۶۶۶۶ عن شداد بن اوس۔

باب ماجاء فی اتخاذ السیف من خشب

”عن عُدیسة بنت أهبان بن صیفی الغفاری قالت جاء علی بن مطالب إني أبيع فداءه إلى الخروج معه فقال له إني: إن علبلی وابن عمك عهد إلي إذا اختلف الناس أن أتخذ سيفاً من خشب فقلنا: أتخذته فإن شئت خرجت به معك؟ قالت فتَرَكه“۔ (حسن غریب)

حضرت عُدیسہ (بالقصر) فرماتی ہیں کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) میرے والد (یعنی اُہبان بن صیفی رضی اللہ عنہ) کے پاس آئے اور ان کو اپنے ہمراہ نکلنے (یعنی جنگ کرنے) کی دعوت دی تو میرے والد نے ان سے کہا کہ میرے دوست اور آپ کے چچا زاد بھائی نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ جب لوگ آپس میں اختلاف کرنے لگیں تو میں لکڑی کی تلوار بنالوں، پس میں نے وی بنائی ہے پس اگر آپ چاہیں تو اسی کو لیجئے آپ کے ساتھ نکلوں؟ فرماتی ہیں کہ انہوں (حضرت علیؑ) نے ان کو (میرے والد کو) چھوڑ دیا۔

تشریح:- حضرت اُہبان (برزن نعمان) رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے لکڑی کی تلوار بنائی تھی جبکہ حدیث کا اصل مطلب یہ ہے کہ قتال سے اجتناب کیا جائے مگر کبھی کبھار ایسا جاتا ہے کہ راوی حدیث کے ظاہری مطلب کو بھی شامل مراد کر لیتا ہے جیسا کہ ابو داؤدؒ نے میں حضرت ابو سعید الخدریؓ کی روایت ہے:

”انه لما حضره الموت دعا ثياب جُدِّ قَلْبَسَها ثم قال سمعت رسول الله صلى

الله عليه وسلم يقول: ”الميت يُبعث في ثيابه التي يموت فيها“۔

حالانکہ محققین کے نزدیک حدیث بالا میں ثياب، عمل سے کنایہ ہے۔

غرض فتنے کے زمانہ میں اگرچہ ہتھیار رکھنا دفاع و تحفظ کی غرض سے جائز ہے مگر اس کے غلط استعمال کا احتمال بردہت رہتا ہے اس لئے عزیمت و بہتر یہ ہے کہ آدمی بالکل خالی ہاتھ رہے کہ مظلوم بننے میں کوئی حرج نہیں مگر ظالم بننا آخرت کی بربادی کا سبب ہے۔

باب ماجاء فی اتخاذ السیف من خشب

۱۔ ایضاً رواہ ابن ماجہ ص: ۲۸۳ ابواب الفتن، مستدرک احمد ص: ۶۳ ج: ۶ حدیث: ۲۰۱۳۔

۲۔ ص: ۸۸ ج: ۲ ”باب ما یستحب من تطهیر ثياب الميت عند الموت“ کتاب الجنائز

دوسری حدیث:- ”عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انه قال فی الفتنۃ کسروا فیہا قیسیکم وقطعوا فیہا اوتارکم والزموا فیہا اجواف بیوتکم وكونوا کابن ادم“۔ (ہذا حدیث حسن غریب)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ فتنے میں اپنی کماتوں کو توڑ دو اور اپنے تانت اس میں کاٹ دو اور گھروں کے اندرون کو لازم پکڑو اور ابن ادم (ہاتیل) کی طرح بن جاؤ۔

لغات:- قولہ ”فی الفتنۃ“ ای فی ایامہا وازمنہا، یہ اگلے افعال کے لئے ظرف ہے۔ قولہ ”کسروا“ نکسیر سے ہے یعنی توڑ دو۔ قولہ ”قیسیکم“ مقیس بکسر القاف والسمین وتشدید الیاء، قوس کی جمع ہے بمعنی کمان کے۔ قولہ ”وقطعوا“ یہ بھی تفعیل سے ہے، دونوں صیغے مبالغے کے لئے ہیں یعنی ضرورت توڑ دو اور ضرور کاٹو یا مطلب یہ ہے کہ ریزہ ریزہ کرو۔ قولہ ”والزمکم“ وتر کی جمع ہے، کمان کے تانت کو کہتے ہیں۔

تشریح:- اس اشاد پاک کا مطلب یہ ہے کہ فتنے سے گریز اس رہو بایں صورت کہ اپنے گھروں کے اندر ہی رہو کہ وہی نسبتاً سب سے محفوظ جگہ ہے، اور اگر کوئی شخص آپ پر ہاتھ اٹھائے تو تم بجائے دفاع و مزاحمت کے ہاتیل کی مانند عزیمت پر عمل پیرا رہو، کیونکہ مظلوم بننا آسان اور محفوظ ترین راستہ ہے، عارضۃ الاحوزیٰ میں ہے کہ بعض شامی لوگ یوم الحزہ میں ایک غار میں ابو سعید خدریؓ کے تعاقب میں گھس گئے اور ان سے کہا کہ نکلو تو ابو سعید خدریؓ اپنی تواران کی طرف پھینکتے ہوئے نکلے، پھر اس شخص نے ابو سعید خدریؓ سے پوچھا تم ابو سعید ہو؟ انہوں نے کہا ”ہاں“ تو وہ شخص ان کے قتل سے رک گیا۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ آدمی کو دفاع کا حق ہے مگر عارضہ میں ہے کہ ایسے میں قضائے باری تعالیٰ پر صبر کرنا چاہئے۔

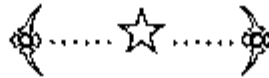
المسترشد عرض کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن فتنوں کی پیش گوئی فرمائی تھی وہ آج اسی رنگ میں سامنے آگئے اور اسلامی دنیا میں وقفے وقفے سے یا باری باری مسلسل گردش کرتے رہتے ہیں، آج کل ہمارا ملک پاکستان شدید فتنوں کی لپیٹ میں ہے، حد یہ ہوگئی کہ ایک موبائل فون کے حصول کے لئے بھرے بازار

۳۔ روی بمعناہ ابو داؤد ص: ۲۴۵ ج: ۲ ”باب الذہی عن الفتنۃ“ کتاب الفتن، سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۵ ابواب الفتن۔

مسند احمد ص: ۵۵۹ ج: ۵ حدیث: ۱۹۱۶۳، ص: ۵۴۰ ج: ۵ حدیث: ۱۹۳۱۰، حفیظ الرحمن العنقی عفی عنہ

میں آدمی کو قتل کیا جاتا ہے اور کبھی کسی گھریا دوکان وغیرہ میں گھس کر حقیر چیز چھیننے میں بھی جان لینے سے گریز نہیں کیا جاتا، سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول یا قومیت و عصبيت کی خاطر قتل و قتل کو تو عبادت سمجھا جاتا ہے، بعض لوگ شوقیہ طور پر بھی گولیاں چلا کر بے گناہ کا خون کرتے ہیں۔

ایسے میں اپنا دفاع کیسے ممکن ہے نہ دشمن کا تعین ہو سکتا ہے جس سے بچا جائے اور نہ ہی وضاحت کرنے کا موقع ملتا ہے، اس لئے چاہئے کہ ہم ہر وقت توبہ تائب رہیں، عبادت میں سرگرم ہو جائیں اور موت کے لئے تیار رہیں تاکہ ناگہانی موت، گناہ میں نہ آئے۔ **ووفقنی اللہ وایاکم، وجعل الجنة مثواى و مثواکم**



بَيْتُكَ الْمَلْجَأُ

فِي حِلِّ ابْنِ كَاوُدَ

تَأْلِيفُ

الْعَلَّامَةُ الْمُحَدِّثُ خَلِيلُ أَحْمَدَ السَّهَّارَنفُورِيِّ

(وُلِدَ سَنَةَ ١٢٦٩ هـ وَتَوَفَّى سَنَةَ ١٣٤٦ هـ)

مَعَ تَعْلِيقَاتِ

الْعَلَّامَةِ الْمُحَدِّثِ الشَّيْخِ مُحَمَّدِ زَكْرِيَّا الْكَانْدَهْلُويِ الْمَدِينِيِّ

الْمَجْلَدُ الْأَوَّلُ

الْمَحْتَوَى:

كِتَابُ الطَّرِيقَةِ

الْأَوَّلُ : ١ - ١٤٨

قَدْ سَمِعْتُ كِتَابَ خُتَابَةِ

زَكْرِيَّا زَكْرِيَّا - صَبْرِي

الجزء الاول

تحفة الأحوزي

للإمام الحافظ محمد عبد الرحمن المباركفوري
المتوفى ١٣٥٣ هـ

بشرح

جاء مع الترمذي

ومع

شفاء الغسل في شرح كتاب الغسل
والشمايل المحدثية والنصائص المصطفوية
للإمام أبي عيسى الترمذي نفسه

حَقَّقَهَا وَوَضَعَ حَوَاشِيَهَا

علي محمد معوض ٥ عادل احمد عبد الموجود

تدري كتب خانہ - آغا امام باغ - کراچی